زیر نظر

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

انتخاب

تفسیر نمونہ جلد اول

ترجمہ

حجۃ الاسلام والمسلمین

علامہ سید صفدر حسین نجفی رح

انتخاب و تلخیص

حجۃ الاسلام والمسلمین

مولانا سید فیاض حسین نقوی دام ظلہ

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: انتخاب تفسیر نمونہ

تالیف اصل تفسیر نمونہ: زیر نظر حضرت آیۃ حضرت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی مدظلہ العالی

ترجمہ اصل تفسیر نمونہ: حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ سید صفدر حسین نجفی قدس سرہ

انتخاب و تلخیص: مولانا سید فیاض حسین نقوی (جامعہ علمیہ ڈیفنس کراچی)

جلد: اول

طبع اول: 2007ء

طبع ثانی: 2012ء

کمپوزنگ: مجاہد حسین حر۔0345-2401125

ناشر: مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور۔ پاکستان

قیمت مکمل سیٹ 3000روپے

اس کتاب کی اشاعت کیلئے مدینۃ العلم مشن کراچی نے بطور قرضِ حسنہ تعاون فرمایا ہے ہماری دعا ہے کہ خداوند عالم ان کی توفیقاتِ خیر میں اضافہ فرمائے اوران کے مرحومین کی مغفرت فرمائے۔آمین۔ادارہ۔

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

عرض ناشر

قارئین محترم !۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔۔۔۔۔عرصہ دراز سے دورِ حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

اس ٹرسٹ نے اپنے آغاز کار میں موجودہ دور کی شہرہ آفاق تفسیر۔۔۔تفسیر نمونہ۔۔۔کو فارسی سے اردو زبان میں ترجمہ کروا کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر محسن ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی قبلہ اعلی اللہ مقامہٗ کی غیر معمولی مساعی، مالی معاونین کی فراخدلانہ اعانت اور کارکنان کی شبانہ روز محنت کی بدولت پانچ ہی سال کے قلیل عرصے میں کم و بیش دس ہزار صفحات پر محیط یہ تفسیر صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ستائیں جلدوں (مختصراً پندرہ جلدیں موجودہ) میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔شکراً اللہ

اس ادارے نے نہ صرف تفسیر نمونہ کے عظیم منصوبے کو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بیسیوں علمی کتب کے علاوہ سید العلماء السید علامہ علی نقی النقوی اعلی اللہ مقامہ کی سات جلدوں (مختصراً تین جلدیں موجودہ) پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب شائع کی۔اردو زبان کو پہلی مرتبہ تفسیر قرآن کے جدید اسلوب سے روشناس کراتے ہوئے تفسیر موضوعی کے دو طویل سلسلوں یعنی ''پیام قرآن'' از آیت اللہ العظمٰی ناصر مکارم شیرازی اور ''قرآن کا دائمی منشور'' از آیت اللہ جعفر سبحانی کی اشاعت کو بھی تیزی سے مکمل کیا۔

تفسیر نمونہ چونکہ بلا امتیاز پوری امت مسلمہ کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کیلئے بیدار و تیار کرنے کیلئے لکھی گئی ہے' لہٰذا سبھی مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔یہی وجہ ہے کہ ہر جلد کے کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود اس کی طلب میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ادارہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔بعض باذوق اہل علم کی تجویز پر ہم نے تفسیر نمونہ کی طباعت کے ضمن میں ایک مفید تبدیلی کرتے ہوئے، اسے ستائیں جلدوں کی بجائے پندرہ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا ہے تاکہ قارئین محترم کیلئے مزید آسانیاں پیدا کی جاسکیں۔

پندرہ جلدوں میں تفسیر پیش کرنے کے بعد حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا سید فیاض حسین نقوی پرنسپل جامعہ علمیہ کراچی کو زحمت دی گئی کہ پانچ جلدوں میں اس کی تلخیص فرمائیں۔یاد رہے کہ ایران میں فارسی زباب میں تلخیص کی گئی ہے لیکن اس سے پہلے مولانا موصوف خلاصہ مکمل کر چکے تھے۔مزید برآں مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ ''اَپ لوڈ نگ'' کے مراحل میں ہے۔بہت جلد آپ ہماری تمام کتب ہماری ویب سائٹ www.misbahulqurantrust.com کے ذریعے گھر بیٹھے پڑھ سکیں گے۔ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم و تحقیق حسبِ سابق ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اس گوہر نایاب سے بھر پور علمی و عملی استفادہ فرمائیں گے۔اور ادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز و آراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔۔والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

فہرست کتاب

موضوع	صفحہ نمبر
عرض ناشر	
پیش لفظ	i
معلوماتی صفحات برائے قرآن	xxi
مقدمہ	۲
اساس قرآن	۲
پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے اعزاز	۳
سورہ حمد کے موضوعات	۳
سورہ حمد کی فضیلت	۳
سورہ حمد کا نام ''فاتحۃ الکتاب'' کیوں ہے؟	۵
کیا ''بسم اللہ'' سورہ حمد کا جزء ہے؟	٦
خدا کے ناموں میں ''اللہ'' جامع ترین نام ہے	٦
خدا کی رحمت عام اور خاص	۷
خدا کی دیگر صفات بسم اللہ میں کیوں مذکور نہیں؟	۷
سارا جہان اس کی رحمت میں ڈوبا ہوا ہے۔	۹
قیامت پر ایمان ہے	
انسان دربار خدا میں	۱۰
صراط مستقیم پر چلنا	۱۰
صراطِ مستقیم کیا ہے ؟	۱۱
سورہ بقرہ کے موضوعات	۱۴
سورہ بقرہ کی فضیلت	۱۴
حروف مقطعات کے متعلق تحقیق	۱۵
ہدایت کیا ہے؟	۱۷
قرآنی ہدایت پرہیز گاروں کے ساتھ کیوں مخصوص ہے؟	۱۷
روح جسمِ انسانی میں آثار تقویٰ	۱۸
مومنین کی صفات	۱۸
حقیقت تقویٰ کیا ہے؟	۲۱
کیا تشخص کی قدرت کا چھن جانا دلیل جبر نہیں؟	۲۲
قرآن میں قلب سے کیا مراد ہے؟	۲۳
معنی نفاق کی وسعت	۲٦

موضوع	صفحہ نمبر
منافقین کے حالات واضح کرنے کیلئے دو مثالیں	۲۸
ہر معاشرہ میں منافقین کی پہچان	۲۹
نعمت آسمان و زمین	۳۰
بت پرستی مختلف شکلوں میں	۳۱
قرآن ہمیشہ رہنے والا معجزہ ہے	۳۲
قرآن جاودانی ہے اور جہانی بھی	۳۳
بہشت کی نعمات کی خصوصیات	۳۴
جنت کی مادی و معنوی نعمات	۳۵
کیا خدا بھی مثال دیتا ہے؟	۳۶
حقیقی زیاں کار	۳۷
فاسقین کی صفات	۳۸
اسلام میں صلح رحمی کی اہمیت	۳۹
زندگی ایک اسرار آمیز نعمت ہے	۳۹
زمین میں خدا کا نمائندہ ... انسان	۴۲
فرشتے امتحان کے سانچے میں	۴۴
ابلیس نے مخالفت کیوں کی؟	۴۶
سجدہ خدا کے لئے تھا یا آدمؑ کے لئے؟	۴۶

موضوع	صفحہ نمبر
آدمؑ کس جنت میں تھے؟	۴۸
خدا نے شیطان کو کیوں پیدا کیا ہے؟	۴۸
خدا کی طرف آدم کی بازگشت	۴۹
توبہ کا معنی	۵۰
خدا کی نعمتوں کو یاد کرنا	۵۰
حضرت یعقوبؑ کی اولاد کو بنی اسرائیل کیوں کہتے ہیں؟	۵۱
یہودیوں کی دولت پرستی	۵۲
لقاء اللہ سے کیا مراد ہے؟	۵۴
مشکلات میں کامیابی کا راستہ	۵۵
یہودیوں کے باطل خیالات	۵۵
قرآن اور مسئلہ شفاعت	۵۶
شرائط شفاعت	۵۷
نعمت آزادی	۵۷
کیا نت نئی چیز کی خواہش انسانی مزاج کا خاصہ نہیں؟	۶۷
نجات کا کلی قانون	۶۷

صفحہ نمبر	موضوع
۶۹	کوہِ طور سروں پر مسلط کرنے سے کیا مقصود تھا؟
۷۳	بنی اسرائیل کی گائے کا واقعہ
۷۷	عوام کو لوٹنے کی یہودی سازش
۷	بلند پروازی اور کھوکھلے دعوے
۸۳	روح القدس کیا ہے؟
۸۳	بے خبر اور غلاف میں لپٹے دل
۸۸	خود پسند گروہ
۹۰	بہانہ ساز قوم
۹۲	پیمان شکن یہودی
۹۴	سلیمانؑ اور بابل کے جادوگر
۹۵	کوئی شخص اذن خدا کے بغیر کسی چیز پر قادر نہیں
۹۶	دشمن کے ہاتھ بہانہ مت دو
۱۰۱	بہشت کی انحصار طلبی
۱۰۲	وہ اختلاف جو انحصار طلبی سے پیدا ہو جاتے ہیں
۱۰۴	جس طرف رخ کرو خدا موجود ہے
۱۰۵	یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکین کی خرافات
۱۰۸	دشمن کی رضا کا حصول

صفحہ نمبر	موضوع
۱۰۸	حق تلاوت کیا ہے ؟
۱۱۰	کلمات سے کیا مراد ہے؟
۱۱۱	امام کسے کہتے ہیں ؟
۱۱۱	نبوت رسالت اور امامت میں فرق
۱۱۳	طہارت و پاکیزگی سے مراد کیا ہے؟
۱۱۳	بارگاہ خدا میں حضرت ابراہیمؑ کی درخواستیں
۱۱۴	حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں خانہ کعبہ کی تعمیر نو
۱۱۷	سب اپنے اپنے اعمال کے جواب دہ ہیں
۱۲۰	غیر خدائی رنگ دھو ڈالو
۱۲۱	قبلہ کی تبدیلی کا واقعہ
۱۲۴	جہاں کہیں ہو کعبہ کی طرف رخ کر لو
۱۲۵	عیسائی و یہودی کسی قیمت پر سر تسلیم خم نہیں کرینگے
۱۲	ہر امت کے لئے ایک قبلہ ہوگا
۱۳۰	ذکر خدا کیا ہے؟
۱۳۲	برزخ کی زندگی اور روح کی بقاء
۱۳۴	خدا لوگوں کی آزمائشوں کیوں کرتا ہے؟
۱۳۵	آزمائشوں میں کامیابی کا راز

موضوع	صفحہ نمبر
جاہلوں کے اعمال تمہارے مثبت اعمال میں حائل نہ ہوں	۱۳۵
احادیث اسلامی میں حق کو چھپانا	۱۳۹
آسمان و زمین میں اللہ کے جلوے ہیں	۱۴۱
آباء و اجداد کی اندھی تقلید	۱۴۵
حق پوشی کی مذمت	۱۴۸
تمام نیکیوں کی اساس	۱۵۰
قصاص تمہاری حیات کا سبب ہے	۱۵۲
کیا مرد کا خون، عورت کے خون سے زیادہ قیمتی ہے؟	۱۵۴
شائستہ اور مناسب وصیتیں	۱۵۵
وصیت کا فلسفہ	۱۵۶
وصیت میں عدالت	۱۵۶
روزہ تقویٰ کا سرچشمہ ہے	۱۵۷
روزے کے تربیتی و اجتماعی اثرات	۱۵۹
روزے کے معاشرتی اثرات	۱۵۹
روزے کے طبی اثرات	۱۵۹
روزہ گذشتہ امتوں میں	۱۶۰
رمضان مبارک کی خصوصیت اور امتیاز	۱۶۰
دعا اور تضرع و زاری	۱۶۱
دعا اور زاری کا فلسفہ	۱۶۲
حکم روزہ میں وسعت	۱۶۳
رشوت خوری ایک مصیبت	۱۶۵
جنگ کیوں اور کس سے؟	۱۶۸
ابتدائی جہاد آزادی	۱۷۰
دفاعی جہاد	۱۷۱
شرک و بت پرستی کے خلاف جہاد	۱۷۱
خرچ کرنا معاشرے کو ہلاکت سے بچاتا ہے	۱۷۳
موسم حج میں اقتصادی کارکردگی	۱۷۷
عرفات کو عرفات کیوں کہتے ہیں؟	۱۷۷
عالمی صلح و آشتی صرف ایمان کے سائے میں ممکن ہے	۱۸۴
سخت حوادث خدائی سنت ہیں	۱۹۰
عفو سے کیا مراد ہے؟	۱۹۶

موضوع	صفحہ نمبر
ماہواری میں جنسی ملاپ کے نقصانات	۲۰۱
نوعِ بشر کی حفاظت کا ذریعہ	۲۰۲
زمانۂ جاہلیت کے ایک طرزِ عمل کا خاتمہ	۲۰۴
خدا کے قوانین کا مذاق نہ اڑاؤ	۲۱۰
ایک اور زنجیر ٹوٹ گئی	۲۱۲
دودھ پلانے کے احکام	۲۱۳
رجعت کی طرف اشارہ	۲۲۴
خدا بندوں سے قرض لیتا ہے	۲۲۵
ایک عبرت خیز واقعہ	۲۲۸
خدا کی مالکیتِ مطلقہ	۲۳۷
طبقاتی تفاوت کا ایک حل	۲۴۵
راہِ خدا میں خرچ کرنے کے اسباب و نتائج	۲۴۹
خرچ کیسے کرنا چاہئے	۲۵۵
انفاق کا بہترین موقع	۲۵۸
سودخوری قرآن کی نظر میں	۲۶۱
تجارتی دستاویزات	۲۶۷
بندگی کا اعتراف	۲۷۲
طاقت کے مطابق ذمہ داری	۲۷۳
سورہ آل عمران	۲۷۵
ایک صریح پیشن گوئی	۲۸۳
خدا کی اپنی یکتائی پر شہادت سے کیا مراد ہے؟	۲۸۹
علما کی حیثیت و وقعت	۲۸۹
حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہی روحِ دین ہے	۲۹۰
واقعہ کفالت حضرت مریم علیہا السلام بصورت قرعہ	۳۰۹
خدائی مکر سے کیا مراد ہے؟	۳۱۶
مقدس عہد و پیمان	۳۳۵
اسلام تمام موجوداتِ عالم کا دین ہے	۳۳۷
فضول کفارہ	۳۴۰
آیاتِ قرآنی کا مسلمانوں کے دلوں پر اثر	۳۴۱
حج کی اہمیت	۳۴۶
نفاق ڈالنے والے	۳۴۸
تقویٰ اور پرہیز گاری کی دعوت	۳۵۰
حق تقویٰ سے کیا مراد ہے؟	۳۵۰

موضوع	صفحہ نمبر
حبل اللہ (اللہ کی رسی) سے مراد کیا ہے؟	۳۵۱
آگ سے مراد جہنم کی آگ ہے یا اس دنیا کی؟	۳۵۲
حق کی دعوت اور فساد کا مقابلہ	۳۵۲
نورانی اور تاریک چہرے	۳۵۴
فتنہ وفساد کا مقابلہ کرنے اور دعوت حق کی یاددہانی	۳۵٦
اغیار کو رازواں نہ بناؤ	۳٦۲
سودخوری کی حرمت کے چند مراحل	۳٦۷
سعادت کی راہ میں ایک دوسرے پر سبقت	۳٦۹
پرہیز گاروں کی نشانیاں	۳۷۰
گذشتہ لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ	۳۷۲
جنگ اُحد کے نتائج	۳۷۴
شخصیت پرستی کی ممانعت	۳۷۸
گذشتہ زمانوں کے مجاہدین	۳۷۹
کامیابی کے بعد شکست	۳۸۳
زمانہ جاہلیت کے وسوسے	۳۸۴
ایک گناہ دوسرے گناہ کا سرچشمہ ہے	۳۸٦
منافقین کی مفاد پرستی	۳۸۷
عام معافی کا حکم	۳۸۸
توکل کا نتیجہ	۳۸۹
ہر قسم کی خیانت ممنوع ہے	۳۹۰
جہاد میں شرکت نہ کرنے والے	۳۹۱
خدا کی بہت بڑی نعمت	۳۹۱
مختلف گروہوں کو الگ الگ پہچانا جانا چاہئے	۳۹۳
منافقین کی بے بنیاد باتیں	۳۹۵
غزوۂ حمراء الاسد	۳۹۸
پیغمبر کیلئے تسلی	۴۰۰
ایک سوال اور اس کا جواب	۴۰۱
مسلمانوں کی تطہیر	۴۰۲
یہودیوں کی بہانہ تراشی	۴۰٦
موت کا اٹل قانون	۴۰۷
مقابلے اور پامردی سے تھک نہ جاؤ	۴۰۹
علماء کی عظیم ذمہ داری	۴۱۰
خود پسندی	۴۱۱
خدا شناسی کا روشن ترین راستہ	۴۱۳

موضوع	صفحہ نمبر
ایک تکلیف وہ سوال	۴۱۸
سب اہل کتاب ایک جیسے نہیں	۴۲۰
سورہ نساء کا محل نزول	۴۲۵
سورہ نساء کے اہم موضوعات	۴۲۵
سورہ نساء کی فضیلت	۴۲۵
طبقاتی تقسیم اور گروہ بندی کے خلاف جہاد	۴۲۶
حضرت آدم علیہ السلام کے بچوں کی شادیاں کس طرح ہوئیں؟	۴۲۷
ایک سے زیادہ شادیوں کی شرائط	۴۳۰
حق مہر عورت کے لئے ایک معاشرتی سہارا ہے	۴۳۱
سفیہ کسے کہتے ہیں ؟	۴۳۲
یتیموں پر لطف و کرم کی بارش	۴۳۶
ہمارے اعمال کا باطنی چہرہ	۴۳۷
مرد کی میراث عورت سے دوگنی کیوں ہے؟	۴۴۰
ماں باپ کی میراث	۴۴۰
میراث وصیت اور قرض کے بعد ہے	۴۴۰
میراث میں میاں بیوی کا ایک دوسرے سے حصہ	۴۴۱

موضوع	صفحہ نمبر
قبولیت توبہ کے لئے شرطیں	۴۴۴
حقوق نسواں کا دفاع	۴۴۶
محارم سے نکاح کی حرمت	۴۴۹
محارم رضاعی کی حرمت کا فلسفہ	۴۵۰
اسلام میں وقتی شادی	۴۵۲
کنیزوں سے نکاح	۴۵۴
نکاح سے متعلق پابندیاں کس بنا پر ہیں	۴۵۶
معاشرے کی سلامتی کا دارومدار اقتصادی سلامتی پر ہے	۴۵۸
گناہانِ صغیرہ و کبیرہ	۴۵۹
گناہ صغیرہ کس طرح گناہ کبیرہ میں تبدیل ہو جاتا ہے؟	۴۶۰
گھریلو نظام میں سر پرستی	۴۶۲
نافرمان عورتیں	۲۶۳
خاندان کی مصالحتی عدالت	۴۶۴
دکھلاوا اور رضائے الٰہی	۲۶۹
''ذرہ'' کیا چیز ہے؟	۴۷۰

موضوع	صفحہ نمبر
چند فقہی احکام (نماز سے متعلق)............	۴۷۲
یہودیوں کے کردار کا ایک اور رخ............	۴۷۴
ہٹ دھرم افراد کی سرنوشت......................	۴۷۵
گناہوں کی بخشش کے اسباب..................	۴۷۷
خود ستائی...	۴۷۸
سازشی لوگ..	۴۸۰
دو اہم اسلامی قانون امامت اور عدالت......	۴۸۴
اولوالامر کون ہیں؟.................................	۴۸۵
طاغوت کا فیصلہ......................................	۴۸۶
طاغوت کے فیصلے کا نتیجہ.....................	۴۸۷
حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنا.................	۴۸۹
جنت کے ساتھی.....................................	۴۹۲
مومنین کو جہاد کے لئے آمادہ کرنا............	۴۹۴
انسانی جذبوں کو مظلوموں کی مدد کے لئے ابھارا گیا ہے............................	۴۹۵
وہ جو صرف باتیں کرنا جانتے ہیں............	۴۹۸
کامرانیوں اور ناکامیوں کا سرچشمہ	۴۹۹

موضوع	صفحہ نمبر
اعجاز قرآن کی زندہ مثال.................	۵۰۲
افواہیں پھیلانا.......................................	۵۰۲
غلط خبریں اور افواہیں پھیلانے کے نقصانات	۵۰۳
ہر شخص اپنے فرائض کا جوابدہ ہے.................	۵۰۴
اچھے یا برے کام کی تحریک دلانے کا نتیجہ......	۵۰۵
احترام محبت..	۵۰۶
سلام عظیم اسلامی تحیہ ہے........................	۵۰۶
صلح کی پیش کش کا استقبال......	۵۱۱
طرفین سے ساز باز رکھنے والوں کی سزا......	۵۱۲
قتل اشتباہ کے احکام.............................	۵۱۴
قتل عمد کی سزا.....................................	۵۱۶
مستضعف کون ہے؟.............................	۵۲۱
ہجرت اسلام کا ایک اصلاحی حکم............	۵۲۲
نماز مسافر..	۵۲۳
فریضہ نماز کی اہمیت............................	۵۲۶
ہر ہتھیار کے مقابلے میں اس جیسا ہتھیار......	۵۲۸
خیانت کرنے والوں کی حمایت نہ کرو	۵۳۰

موضوع	صفحہ نمبر
سرگوشیاں	۵۳۴
شرک ... نا قابل معافی گناہ	۵۳۶
شیطانی سازشیں	۵۳۷
سچے اور جھوٹے امتیازات	۵۴۰
حقوق نسواں کے بارے میں مزید گفتگو	۵۴۲
صلح بہتر ہے	۵۴۳
ایک سے زیادہ شادیوں کیلئے عدالت شرط ہے	۵۴۴
عدالت اجتماعی	۵۴۷
ہٹ دھرم منافقین کا انجام	۵۵۰
بری مجلس میں نہ بیٹھو	۵۵۱
خدا کی سزا انتقامی نہیں	۵۵۶
اسلام کے چند اخلاقی احکام	۵۵۷
انبیاء میں فرق نہیں ہے	۵۵۸
یہودیوں کی بہانہ سازی	۵۶۰
یہودیوں کی کچھ اور کارستانیاں	۵۶۲

موضوع	صفحہ نمبر
یہودیوں میں سے صالح اور غیر صالح افراد کا انجام	۵۶۴
یہودیوں میں سے اہل ایمان	۵۶۵
تثلیث اور الوہیت مسیح علیہ السلام کا ابطال	۵۷۰
عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بندے ہیں	۵۷۲
نور مبین	۵۷۳
بہن بھائی کی میراث کے چند احکام	۵۷۵
سورہ مائدہ کے مضامین	۵۷۷
ایفائے عہد ضروری ہے	۵۷۸
ایک آیت میں آٹھ احکام	۵۸۰
گوشت کے استعمال میں اعتدال	۵۸۴
دین کس روز اپنے کمال کو پہنچا	۵۸۵
اضطراری کیفیت میں حرام گوشت کا حکم	۵۸۶
حلال شکار	۵۸۷
اہل کتاب کا کھانا کھانا اور ان میں شادی بیاہ کرنا	۵۸۸
غیر مسلم عورتوں سے شادی	۵۸۸

موضوع	صفحہ نمبر
جسم اور روح کی پاکیزگی	۵۸۹
خدا سے باندھے گئے پیمان	۵۹۱
قیام عدالت کا تاکیدی حکم	۵۹۲
دائمی دشمن	۵۹۶
کیسے ممکن ہے کہ مسیح علیہ السلام خدا ہو ؟	۵۹۸
بنی اسرائیل اور سر زمین مقدس	۶۰۲
روئے زمین پر پہلا قتل	۶۰۴
ظلم پر پردہ پوشی	۶۰۶
انسانی رشتہ	۶۰۷
لوگوں کی جان و مال پر حملہ کرنے والوں کی سزا	۶۱۰
توسل کی حقیقت	۶۱۰
چور کی سزا	۶۱۳
دوست اور دشمن کے درمیان فیصلہ	۶۱۶
قصاص اور در گذر	۶۲۰
وہ جو قانون الٰہی کے مطابق حکم نہیں کرتے	۶۲۲
آیۂ ولایت	۶۲۹
انتخاب جانشین پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی آخری کار رسالت تھا	۶۳۸
واقعہ غدیر کا خلاصہ	۶۳۹
اسلام کے پہلے مہاجرین	۶۵۲
یہودیوں کی کینہ پروری اور عیسائیوں کی نرم دلی	۶۵۵
حد سے تجاوز نہ کرو	۶۵۸
قسم اور اس کا کفارہ	۶۵۹
شراب کے بارے میں قطعی حکم اور اس کے تدریجی مراحل	۶۶۱
حالت احرام میں شکار کرنے کے احکام	۶۶۶
حالت احرام میں شکار کی حرمت کا فلسفہ	۶۶۷
اکثریت پاکیزگی کی دلیل نہیں	۶۶۹
غیر مناسب سوالات	۶۷۰
ہر شخص اپنے کام کا جواب دہ ہے	۶۷۳
مسیح علیہ السلام پر انعامات الٰہی	۶۷۸
حواریوں پر مائدہ کے نزول کے واقعہ	۶۷۹

ابتدائیہ

مسلمانوں کا بزرگ ترین علمی سرمایہ قرآن مجید ہی ہے اسلام کے تمام شرعی عقیدتی اور سیاسی احکام نیز قرب خداوندی کے حصول کے تمام ذرائع اس عظیم آسمانی کتاب میں موجود ہیں ارشاد ہوتا ہے:

''وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ''(سورہ نحل......۸۹)

''ہم نے آپ کی طرف کتاب نازل کی جس میں ہر چیز کا واضح بیان موجود ہے''

سورہ بقرہ آیت ۱۸۵ میں فرماتا ہے:

''هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ ''

یہ قرآن لوگوں کے لئے ہادی و رہنما ہے اس میں ہدایت کی واضح نشانیاں ہیں اور یہ حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔

اس پرآشوب دور میں تو قرآن مجید سے تمسک نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے اس ضمن میں حضرت ختمی مرتبت پیغمبر آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

''اِذَا الْتَبَسَتْ عَلَيْكُمُ الْفِتَنُ كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ فَعَلَيْكُمْ بِالْقُرْآنِ ''

''جب حوادث روزگار تمہیں چاروں طرف سے اس طرح گھیر لیں جس طرح تاریک رات چھا جاتی ہے تو اس وقت تم پر لازم ہے کہ قرآن کا دامن تھام کر رکھو''۔

یقیناً قرآن کا دامن تھامنے سے ہی ہم زمانے کی تیرہ دستیوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ قرآن کی ہی برکت سے ہم اپنی حالت چاہے وہ معاشرتی ہو یا انفرادی سدھار سکتے ہیں حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''تَفَقَّهُوْا فِيْهِ فَاِنَّهٗ رَبِيْعُ الْقُلُوْبِ وَ اسْتَشْفَعُوْا بِنُوْرِهٖ فَاِنَّهٗ شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ''

''قرآن میں غور وفکر کیا کرو کیونکہ (سمجھنے سے ہی) یہ دلوں کی بہار ہے اور قرآن کے نور سے تمسک

کرو کیونکہ یہ دلوں کی بیماریوں کی شفا ہے''۔

بنابرایں ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی اس دینی کتاب کا علم حاصل کرے اور اسے سمجھے۔ البتہ سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم اور تفسیر کہاں سے حاصل کی جائے؟ جب ہم قرآن مجید اور احادیث پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خداوند عالم نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلم اور مفسر قرآن قرار دیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد یہ مقام آئمہ اطہار علیہم السلام کو حاصل ہے۔ ارشاد رب العزت ہے:

''وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡهِمۡ ''

''ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا تا کہ آپ (اس کی تفسیر و تشریح کریں اور) لوگوں کو بتائیں کہ ان کے لئے کیا نازل کیا گیا ہے''(سورہ نحل.....۴۴)

اور سورہ جمعہ کی آیت ۲ میں واضح طور پر بیان فرمایا ہے:

''وَ یُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَةَ ''

یعنی لوگوں کو کتاب و حکمت کی تعلیم دینا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعد تعلیم اور تفسیر قرآن کی ذمہ داری آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے سپرد کر دی ہے ایک متفقہ حدیث میں ارشاد فرمایا:

''اِنِّیۡ تَارِکٌ فِیۡکُمُ الثَّقَلَیۡنِ کِتَابَ اللّٰهِ وَ عِتۡرَتِیۡ اَهۡلَ بَیۡتِیۡ مَا اِنۡ تَمَسَّکۡتُمۡ بِهِمَا لَنۡ تَضِلُّوۡا بَعۡدِیۡ اَبَدًا وَ اِنَّهُمَا لَنۡ یَّفۡتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الۡحَوۡضَ ''

''میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور دوسری اپنی اہل بیت۔ اگر تم نے ان دونوں سے تمسک اختیار کیا تو تم ہرگز گمراہ نہ ہو گے اور یہ دونوں (قرآن و اہل بیت علیہم السلام) بھی ایک دوسرے سے کبھی جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر آ جائیں گے''۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حدیث میں اپنی امت کو قرآن و اہل بیت علیہم السلام کے ساتھ تمسک اختیار کرنے اور قرآن کی تعلیم و تفسیر کو اہل بیت علیہم السلام سے حاصل کرنے کا حکم دیا ہے۔

محسن ملت علامہ سید صفدر حسین نجفی قدس سرہ نے مسلمانوں کو بالعموم اور مومنین کو بالخصوص مفاہیم قرآن سے آشنا کرنے کے لئے تفسیر نمونہ کا ترجمہ کیا جو سلیس اور رواں ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت پر معنی بھی ہے اس تفسیر کو مصباح القرآن ٹرسٹ نے شائع کیا اور بحمد اللہ مومنین کی ایک بڑی تعداد اس سے استفادہ کر رہی ہے لیکن ۲۷ جلدوں پر مشتمل اس تفسیر کو خریدنا

اور بعض حالات میں اس کا بطورکلی مطالعہ مشکل ہوجاتا ہے اس بات کے پیش نظر یہ تجویز سامنے آئی کہ اس عظیم تفسیر کا خلاصہ کر دیا جائے تاکہ اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ ہوسکے اور دینی مراکز میں بطور درسی نصاب اس کا اجراء آسان ہوجائے۔ حضرت آیت اللہ حافظ سید ریاض حسین نجفی دامت برکاتہ کے حکم کے تحت یہ سعادت حقیر کونصیب ہوئی ۔ ابھی میں نے کام شروع کیا ہی تھا کہ معلوم ہوا ایران میں تفسیر نمونہ کا خلاصہ پانچ جلدوں میں کر دیا گیا ہے جو زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے' یہ خلاصہ حجۃ الاسلام والمسلمین آقای احمد علی بابائی نے مؤلف تفسیر نمونہ حضرت آیت اللہ العظمی آقای ناصر مکارم شیرازی مدظلہ العالی کی زیرنگرانی انجام دیا' چنانچہ میں نے اس خلاصہ کو بنیاد بنا کر اردو ترجمہ کی تلخیص شروع کی لیکن اسکے ساتھ ہی خلاصہ کی بعض خامیوں کی اصلاح بھی کر دی جو میرے خیال میں ضروری تھی ۔مثلاً اس پانچ جلدی (فارسی) خلاصہ میں اصل تفسیر نمونہ کی طرح آیات اوران کے ترجمہ کو اکٹھا نہیں لکھا گیا تھا بلکہ ہر آیت کو الگ الگ کر کے اس کی تفسیر کی گئی ہے۔ہم نے اس پہلو سے خلاصہ کو اصل تفسیر کے مطابق کر دیا ہے تاکہ قارئین محترم پہلے اصل آیات کی تلاوت اوران کا ترجمہ پڑھیں بعد میں ان آیات کی تفسیر کا مطالعہ ان کے لیے زیادہ مفید، زودفہم اور مؤثر ثابت ہو۔ اسکے علاوہ جس مقام پر مناسب سمجھا گیا کسی عنوان یا موضوع کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح ربط مطلب کے لیے بعض جگہوں پر مختصر اضافہ کیا گیا ہے۔

واضح ہے کہ یہ تمام امور انجام دینے کے لیے ایک گروہ کی ضرورت ہوتی ہے اس بات کے پیش نظر میں نے فارسی خلاصہ کے ساتھ اردو ترجمہ کی تطبیق اور دیگر امور میں مندرجہ ذیل علماء کرام کا تعاون بھی حاصل کیا:

(۱) جناب مولانا سید مہدی موسوی صاحب نے فارسی خلاصہ کی جلد اول کی تطبیق میں

(۲) جناب مولانا سید نعمت اللہ محمودی صاحب نے جلد دوم میں

(۳) جناب مولانا مختار حسین ثقفی صاحب نے جلد سوم میں

(۴) جناب مولانا سید نثار حیدر نقوی صاحب نے فارسی خلاصہ کی جلد چہارم و پنجم کی تطبیق میں تعاون فرمایا ہے۔

(۵) جناب مولانا مجاہد حسین حرؔ صاحب کو کمپوزنگ اور دیگر اصلاحی امور سونپے گئے۔

(۶) جناب مولانا سید علی رضا نقوی صاحب نے تلخیص کے ابتدائی مراحل میں لائق تحسین خدمات انجام دیں۔

ان تمام حضرات نے جس لگن اور محنت سے اس کام میں معاونت فرمائی ہم ان کے شکر گزار ہیں اور خداوند عالم سے ان کی توفیقات میں اضافے کے خواہاں ہیں۔

خلاصہ تفسیر نمونہ کی اشاعت کے سلسلہ میں جناب محترم محمد امین صاحب دام عزہ نے شب و روز کی کوشش اور محنت ولگن سے مختصر مدت میں پرینٹنگ سے پہلے تک کے تمام مراحل کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ خداوند عالم ان کی توفیقات میں اضافہ

اوران کے والد معظم کی مغفرت، والدہ محترمہ کوصحت وسلامتی عطا کرے اورانہیں اپنے بچوں اوراہل خانہ سمیت اپنے حفظ وامان میں رکھے۔

خلاصہ تفسیر نمونہ کا کام مورخہ ۱۱ ذیعقدہ ۱۴۲۱ھ بروز ولادت باسعادت امام ہشتم حضرت امام علی رضا علیہ السلام بمطابق ۶۔فروری ۲۰۰۱ء کوشروع ہوا اور بروز عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۱۷۔ربیع الاول ۱۴۲۵ ہجری بمطابق ۱۸۔مئی ۲۰۰۴ عیسوی کو جامعہ علمیہ ڈیفنس سوسائٹی کے اساتذہ بلاک میں اختتام پزیر ہوا۔

خداوند عالم محسن ملت مرحوم علامہ سید صفدر حسین نجفی قدس سرہ کی مغفرت اوران کے درجات بلند فرمائے۔

اصل تفسیر نمونہ کے ترجمہ اوراس کی اشاعت میں محسن ملت کے معاون خاص جناب محترم سیٹھ نوازش علی صاحب دام عزہ کوصحت وسلامتی عطا فرمائے اوراپنے حفظ وامان میں رکھے۔

خلاصہ تفسیر نمونہ کی تکمیل میں میری تشویق اور رہنمائی کرنے والی شخصیت اور میرے مربی حضرت آیۃ اللہ حافظ ریاض حسین نجفی دامت برکاتہ کوصحت وسلامتی اورطول عمر بابرکت عنایت فرمائے اوراپنے حفظ وامان میں رکھے اوراس کار خیر کو ہمارے اور ہمارے والدین کیلئے ذخیرہ آخرت قرار دے۔

سید فیاض حسین نقوی
ابن مرحوم سید خادم حسین نقوی
جامعہ علمیہ ڈیفنس سوسائٹی فیز۴۔کراچی
(۱۷ربیع الاول ۱۴۲۵ھ بمطابق ۱۸۔مئی ۲۰۰۴ء)

گفتار مترجم

(تفسیر کی ضرورت واہمیت اور تفسیر نمونہ کے ترجمہ سے متعلق مترجم تفسیر نمونہ حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین محسن ملت مرحوم آقای سید صفدر حسین نجفی قدس سرہ کی تمہید کا خلاصہ)

قرآن کے بارے میں کی جانے والی ہر کوشش سے کچھ نہ کچھ فوائد تو ضرور حاصل ہوئے ہیں لیکن قرآن مجید تمام علوم کی جامع کتاب ہے اس کے تمام موضوعات کو اس طرح سے بیان کرنا کہ ہر علم کا تشنہ سیراب ہو جائے اس نظر سے دیکھا جائے تو نہ فقط پاکستان میں شیعوں کے پاس کچھ نہیں بلکہ دیگر مکاتب فکر کا بھی یہی حال ہے۔

ایران کے عظیم الشان اسلامی انقلاب نے ہمارے نوجوانوں میں قرآن شناسی کے لئے ایک نئی تڑپ پیدا کر دی ہے اور ان کے دلوں میں ایک تازہ جوت جگا دی ہے۔ اکثر نوجوان پوچھتے کہ قرآن فہمی کے لئے کس تفسیر کا مطالعہ کریں تو ہمارے پاس اس کا جواب نہ ہوتا۔ شدت سے احساس ہوا کہ اردو میں کوئی مفید ترین اور جامع تفسیر لکھی جائے جو دور حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو اور تمام عالمی افکار ونظریات اور علوم وکمالات کے سامنے اسلامی عظمت اور قرآنی سربلندی وبالاتری کا حقیقی مظہر ہو اور جس کے ذریعے قرآنی مفاہیم سے آشنائی بھی ہو اور اس الٰہی والہامی کتاب سے حقیقی عشق بھی پیدا ہو سکے۔ چند ایک علماء کرام سے اس ضرورت کا تذکرہ کیا اور ایران میں مختلف علماء کرام سے اس بات پر مشورہ کیا کہ اس وقت کونسی تفسیر دورِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے اور روزمرہ کے سوالات کا آسان اور مناسب جواب مہیا کرتی ہے۔ ہمارے لئے یہ خوشگوار حیرت کی بات تھی کہ سب نے بالاتفاق تفسیر نمونہ کا نام لیا۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ اسی تفسیر کا ترجمہ کیا جائے گا۔

آج بھی ایران میں ایسے علماء موجود ہیں جنہوں نے قرآن کی تفسیر میں ڈیڑھ سو سے زائد جلدیں لکھی ہیں۔ لیکن ہم نے دقیق علمی اور فلسفیانہ بحثوں کی حامل اور خالص علمی لہجے اور اصلاحات میں لکھی گئی تفاسیر کو اپنی موجودہ ضرورت سے ہم آہنگ نہیں سمجھا اور خاص طور پر دورِ حاضر کے نوجوان ذہنوں کی تشنگی کو پیش نظر رکھا۔ اسی معیار اور تقاضے کو "تفسیر نمونہ" پورا کرتی ہے۔

ترجمے کے کٹھن مراحل میں بالعموم لفظی ترجمے کا اسلوب اپنایا گیا ہے اگرچہ بعض مقامات پر قارئین کی سہولت اور عبارت کی روانی کے لئے آزاد ترجمے کا طریقہ بھی اختیار کیا گیا ہے ہم مفہوم کو منتقل کرنے میں کس حد تک کامیاب رہے اس سوال کا جواب قارئین ہی بہتر طور پر دے سکتے ہیں۔

خدایا!

ہمیں توفیق دے کہ ہم صرف تیری رضا کے لئے کام کریں۔ جیسے تیرے بندے اصل تفسیر سے استفادہ کر رہے ہیں اس کے ترجمے سے بھی صحیح طور پر فائدہ اٹھائیں۔ اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر کرتے ہوئے اپنی راہ میں اس کام کو ہماری آخرت کے لئے بہترین ذخیرہ قرار دے۔

جلد اول تفسیر نمونہ کا ترجمہ صبح ساڑھے پانچ بجے بروز جمعرات
۲۲ شوال ۱۴۰۲ ہجری بمطابق ۱۲۔ اگست ۱۹۸۲ء کو قم میں
اختتام پذیر ہوا۔

اللهم صل علی محمد و عترته المعصومین و عجل فرجهم

صفدر حسین نجفی قدس سرہ

قرآن سے متعلق معلومات

نمبر شمار	نام سورہ	مقام نزول	ترتیب نزول	تعداد آیات	تعداد کلمات	تعداد حروف	پارہ نمبر
۱	الفاتحہ	مکہ	۵	۷	۲۹	۱۴۲	۱
۲	البقرہ	مدینہ	۸۷	۲۸۶	۶۲۲۱	۲۵۵۰۰	۱_۲_۳
۳	آل عمران	مدینہ	۸۹	۲۰۰	۳۴۸۰	۱۴۵۲۵	۳_۴
۴	النساء	مدینہ	۹۲	۱۷۶	۳۷۴۵	۱۶۰۳۰	۴_۵_۶
۵	المائدہ	مدینہ	۱۱۲	۱۲۰	۲۸۰۴	۱۱۹۳۳	۶_۷
۶	الانعام	مکہ	۵۵	۱۶۵	۳۸۵۰	۱۲۲۵۴	۷_۸
۷	الاعراف	مکہ	۳۹	۲۰۶	۳۸۲۵	۱۳۸۷۷	۸_۹
۸	الانفال	مدینہ	۸۸	۷۵	۱۰۹۵	۵۰۸۰	۹_۱۰
۹	التوبہ	مدینہ	۱۱۳	۱۲۹	۴۰۹۸	۱۰۴۸۸	۱۰_۱۱
۱۰	یونس	مکہ	۵۱	۱۰۹	۱۸۳۲	۷۵۶۷	۱۱
۱۱	ہ ود	مکہ	۵۲	۱۲۳	۱۷۱۵	۷۵۱۳	۱۱_۱۲
۱۲	یوسف	مکہ	۵۳	۱۱۱	۱۷۶۶	۷۱۶۶	۱۲_۱۳
۱۳	الرّعد	مدینہ	۹۶	۴۳	۸۵۵	۳۵۰۶	۱۳
۱۴	ابراهیم	مکہ	۷۲	۵۲	۸۳۱	۳۴۳۴	۱۳
۱۵	الحجر	مکہ	۵۴	۹۹	۶۵۴	۲۷۶۰	۱۳_۱۴

نمبرشمار	سورہ	مقام نزول	ترتیب نزول	تعداد آیات	تعداد کلمات	تعداد حروف	پارہ
۱۶	النحل	مکہ	۷۰	۱۲۸	۲۸۴۰	۷۷۰۷	۱۴
۱۷	الاسراء	مکہ	۵۰	۱۱۱	۱۵۳۳	۶۴۶۰	۱۵
۱۸	الکھف	مکہ	۶۹	۱۱۰	۱۵۷۹	۶۳۶۰	۱۵۔۱۶
۱۹	مریم	مکہ	۴۴	۹۸	۹۸۲	۳۸۰۲	۱۶
۲۰	طٰہٰ	مکہ	۴۵	۱۳۵	۱۳۴۱	۵۲۴۲	۱۶
۲۱	الانبیاء	مکہ	۷۳	۱۱۲	۱۱۶۸	۴۸۹۰	۱۷
۲۲	الحج	مدینہ	۱۰۳	۷۸	۱۲۹۱	۵۰۷۰	۱۷
۲۳	المومنون	مکہ	۷۴	۱۱۸	۱۸۴۰	۴۸۰۲	۱۸
۲۴	النور	مدینہ	۱۰۲	۶۴	۱۳۱۶	۵۶۸۰	۱۸
۲۵	الفرقان	مکہ	۴۲	۷۷	۸۹۲	۳۷۳۳	۱۸۔۱۹
۲۶	الشعراء	مکہ	۴۷	۲۲۷	۱۲۹۷	۵۵۲۲	۱۹
۲۷	النمل	مکہ	۴۸	۹۳	۱۱۴۹	۴۷۹۹	۱۹۔۲۰
۲۸	القصص	مکہ	۴۹	۸۸	۱۴۴۱	۵۸۰۰	۲۰
۲۹	العنکبوت	مکہ	۸۵	۶۹	۱۹۸۱	۴۱۹۵	۲۰۔۲۱
۳۰	الرّوم	مکہ	۸۴	۶۰	۸۱۹	۳۵۳۴	۲۱
۳۱	لقمان	مکہ	۵۷	۳۴	۵۴۲	۲۱۱۰	۲۱
۳۲	السّجدہ	مکہ	۷۵	۳۰	۳۸۰	۱۵۰۰	۲۱
۳۳	الاحزاب	مدینہ	۹۰	۷۳	۱۲۸۰	۵۷۹۶	۲۱۔۲۲

نمبر شمار	سورہ	مقام نزول	ترتیب نزول	تعداد آیات	تعداد کلمات	تعداد حروف	پارہ
۳۴	سبا	مکہ	۵۸	۵۴	۸۸۳	۱۵۱۲	۲۲
۳۵	الفاطر	مکہ	۴۳	۴۵	۷۹۷	۳۱۳۰	۲۲
۳۶	یٰسٓ	مکہ	۴۱	۸۳	۷۲۹	۳۰۰۰	۲۲_۲۳
۳۷	الصافات	مکہ	۵۶	۱۸۲	۸۲۰	۳۸۲۳	۲۳
۳۸	صٓ	مکہ	۳۸	۸۸	۷۳۲	۳۰۲۹	۲۳
۳۹	الزّمر	مکہ	۵۹	۷۵	۱۱۹۲	۴۷۰۸	۲۳_۲۴
۴۰	المؤمن	مکہ	۶۰	۸۵	۱۱۹۹	۴۹۶۰	۲۴
۴۱	فصلت (حمٰ سجدہ)	مکہ	۶۱	۵۴	۷۹۶	۳۳۵۰	۲۴_۲۵
۴۲	الشّوریٰ	مکہ	۶۲	۵۳	۸۶۶	۳۵۸۸	۲۵
۴۳	الزّخرف	مکہ	۶۳	۸۹	۸۳۳	۳۴۰۰	۲۵
۴۴	الدخان	مکہ	۶۴	۵۹	۳۴۶	۱۴۳۱	۲۵
۴۵	الجاثیہ	مکہ	۶۵	۳۷	۴۸۸	۲۱۹۱	۲۵
۴۶	الاحقاف	مکہ	۶۶	۳۵	۶۴۴	۲۵۹۸	۲۶
۴۷	محمدؐ	مدینہ	۹۵	۳۷	۵۳۹	۲۳۴۹	۲۶
۴۸	الفتح	مدینہ	۱۱۱	۲۹	۵۶۰	۲۴۳۸	۲۶
۴۹	الحجرات	مدینہ	۱۰۶	۱۸	۳۴۳	۱۴۹۶	۲۶
۵۰	قٓ	مکہ	۳۴	۴۵	۳۵۷	۱۴۹۴	۲۶
۵۱	الذاریات	مکہ	۶۷	۶۰	۳۶۰	۱۲۸۷	۲۶_۲۷

نمبرشمار	پارہ	مقام نزول	ترتیب نزول	تعداد آیات	تعداد کلمات	تعداد حروف	پارہ
۵۲	الطور	مکہ	۷۶	۴۹	۳۱۲	۱۵۰۰	۲۷
۵۳	النجم	مکہ	۲۳	۶۲	۳۰۸	۱۴۰۵	۲۷
۵۴	القمر	مکہ	۳۷	۵۵	۳۴۲	۱۴۲۰	۲۷
۵۵	الرحمٰن	مدینہ	۹۷	۷۸	۳۵۱	۱۶۲۶	۲۷
۵۶	الواقعه	مکہ	۴۶	۹۶	۳۷۸	۱۷۰۳	۲۷
۵۷	الحدید	مدینہ	۹۴	۲۹	۵۴۴	۲۴۷۶	۲۷
۵۸	المجادله	مدینہ	۱۰۵	۲۲	۴۷۳	۱۷۹۲	۲۸
۵۹	الحشر	مدینہ	۱۰۱	۲۴	۴۴۵	۱۹۱۳	۲۸
۶۰	الممتحنه	مدینہ	۹۱	۱۳	۳۴۸	۱۵۱۰	۲۸
۶۱	الصّف	مدینہ	۱۰۹	۱۴	۲۲۱	۹۰۰	۲۸
۶۲	الجمعه	مدینہ	۱۱۰	۱۱	۱۸۰	۷۲۰	۲۸
۶۳	المنافقون	مدینہ	۱۰۴	۱۱	۱۸۰	۷۷۶	۲۸
۶۴	التغابن	مدینہ	۱۰۸	۱۸	۲۴۱	۱۰۷۰	۲۸
۶۵	الطلاق	مدینہ	۹۹	۱۲	۲۴۸	۱۰۶۰	۲۸
۶۶	التحریم	مدینہ	۱۰۷	۱۲	۲۴۶	۱۱۶۰	۲۸
۶۷	الملك	مکہ	۷۷	۳۰	۳۳۰	۱۳۰۰	۲۹
۶۸	القلم	مکہ	۲ (۵)	۵۲	۳۰۰	۱۲۵۶	۲۹
۶۹	الحاقه	مکہ	۷۸	۵۲	۲۵۶	۱۰۸۴	۲۹

نمبرشمار	سورہ	مقام نزول	ترتیب نزول	تعداد آیات	تعداد کلمات	تعداد حروف	پارہ
۷۰	المعارج	مکہ	۷۹	۴۴	۲۱۶	۱۰۶۱	۲۹
۷۱	نوح	مکہ	۷۱	۲۸	۲۲۴	۹۲۹	۲۹
۷۲	الجن	مکہ	۴۰	۲۸	۲۳۵	۸۷۰	۲۹
۷۳	المزمل	مکہ	۳	۲۰	۲۸۵	۸۳۸	۲۹
۷۴	المدثر	مکہ	۴	۵۶	۲۵۵	۱۰۱۰	۲۹
۷۵	القیامہ	مکہ	۳۱	۴۰	۱۹۹	۶۵۲	۲۹
۷۶	الدھر	مدینہ	۹۸	۳۱	۲۴۰	۱۰۵۴	۲۹
۷۷	المرسلات	مکہ	۳۳	۵۰	۱۸۱	۸۱۶	۲۹
۷۸	النباء	مکہ	۸۰	۴۰	۱۷۳	۷۷۰	۳۰
۷۹	النازعات	مکہ	۸۱	۴۶	۱۳۹	۷۵۳	۳۰
۸۰	عبس	مکہ	۲۴	۴۲	۱۳۳	۵۳۳	۳۰
۸۱	التکویر	مکہ	۷	۲۹	۱۱۴	۵۳۳	۳۰
۸۲	الانفطار	مکہ	۸۲	۱۹	۸۰	۳۲۷	۳۰
۸۳	المطففین	مکہ	۸۶	۳۶	۱۷۷	۸۳۰	۳۰
۸۴	الانشقاق	مکہ	۸۳	۲۵	۱۰۹	۴۳۰	۳۰
۸۵	البروج	مکہ	۲۷	۲۲	۱۰۹	۴۵۸	۳۰
۸۶	الطارق	مکہ	۳۶	۱۷	۶۱	۲۴۵	۳۰
۸۷	الاعلیٰ	مکہ	۸	۱۹	۷۲	۲۷۰	۳۰

نمبر شمار	سورہ	مقام نزول	ترتیب نزول	تعداد آیات	تعداد کلمات	تعداد حروف	پارہ
۸۸	الغاشیہ	مکہ	۶۸	۲۶	۷۲	۳۳۰	۳۰
۸۹	الفجر	مکہ	۱۰	۳۰	۱۳۷	۵۷۷	۳۰
۹۰	البلد	مکہ	۳۵	۳۰	۸۲	۳۳۰	۳۰
۹۱	الشمس	مکہ	۲۶	۱۵	۵۴	۲۴۷	۳۰
۹۲	اللیل	مکہ	۹	۲۱	۷۱	۳۰۲	۳۰
۹۳	الضحیٰ	مکہ	۱۱(۴)	۱۱	۴۰	۱۹۲	۳۰
۹۴	الانشراح	مکہ	۱۲	۸	۲۷	۱۰۳	۳۰
۹۵	التین	مکہ	۲۸	۸	۳۴	۱۰۵	۳۰
۹۶	العلق	مکہ	۱	۱۹	۹۲	۲۸۰	۳۰
۹۷	القدر	مکہ	۲۵	۵	۳۰	۱۱۲	۳۰
۹۸	البینہ	مدینہ	۱۰۰	۸	۹۴	۳۹۲	۳۰
۹۹	الزلزال	مدینہ	۹۳	۸	۳۵	۱۴۹	۳۰
۱۰۰	العادیات	مکہ	۱۴	۱۱	۴۰	۱۶۳	۳۰
۱۰۱	القارعہ	مکہ	۳۰	۱۱	۳۶	۱۵۰	۳۰
۱۰۲	التکاثر	مکہ	۱۶	۸	۲۸	۱۲۰	۳۰
۱۰۳	العصر	مکہ	۱۳	۳	۱۴	۶۸	۳۰
۱۰۴	الهمزه	مکہ	۳۲	۹	۳۳	۱۳۰	۳۰
۱۰۵	الفیل	مکہ	۱۹	۵	۲۳	۹۶	۳۰

نمبر شمار	سورہ	مقام نزول	ترتیب نزول	تعداد آیات	تعداد کلمات	تعداد حروف	پارہ
۱۰۶	القریش	مکہ	۲۹	۴	۱۷	۹۳	۳۰
۱۰۷	الماعون	مکہ	۱۷	۷	۲۵	۱۲۵	۳۰
۱۰۸	الکوثر	مکہ	۱۵	۳	۱۰	۴۲	۳۰
۱۰۹	الکافرون	مکہ	۱۸	۶	۲۶	۹۴	۳۰
۱۱۰	النصر	مدینہ	۱۱۴	۳	۱۹	۷۷	۳۰
۱۱۱	لھب	مکہ	۶	۵	۲۰	۷۷	۳۰
۱۱۲	الاخلاص	مکہ	۲۲	۴	۱۵	۴۷	۳۰
۱۱۳	الفلق	مکہ	۲۰	۵	۲۳	۷۴	۳۰
۱۱۴	النّاس	مکہ	۲۱	۶	۲۰	۷۹	۳۰

قرآن مجید کی سورتوں کی فہرست بہ لحاظ ترتیب نزول

اور سورتوں کے دیگر نام

نمبر شمار	نام سورہ	قرآن میں سورہ کا نمبر
۱	العلق (اقراء بھی کہتے ہیں)	۹۶
۲	القلم (نون بھی کہتے ہیں) آیات ۔۱۷، ۳۳، ۴۸ اور ۵۰ مدنی ہیں۔	۶۸
۳	المزمل ۔(آیات ۱۰، ۱۱ اور ۲۰ مدنی ہیں)۔	۷۳
۴	المدثر	۷۴

نمبرشمار	سورہ	قرآن میں سورہ کا نمبر
۵	الفاتحہ (السبع المثانی، ام القرآن، فاتحۃ الکتاب، الشفاء، ام الکتاب، الشافیہ، فاتحۃ القرآن، الحمد، الوافیہ، الاساس، الکافیہ، الصلاۃ اور الکنز بھی کہتے ہیں).	۱
۶	لھب (ابی لھب، المسد اور تبت بھی کہا جاتا ہے).	۱۱۱
۷	التکویر (کورت بھی کہا جاتا ہے).	۸۱
۸	الاعلیٰ	۸۷
۹	اللیل	۹۲
۱۰	الفجر	۸۹
۱۱	الضحیٰ	۹۳
۱۲	الانشراح (الم نشرح اور شرح بھی کہا جاتا ہے)۔	۹۴
۱۳	العصر	۱۰۳
۱۴	العادیات	۱۰۰
۱۵	الکوثر	۱۰۸
۱۶	التکاثر	۱۰۲
۱۷	الماعون (اریت اور الدین بھی کہا جاتا ہے۔آیت نمبر۴ اور ۷ مدنی ہیں).	۱۰۷
۱۸	الکافرون (جحد بھی کہا جاتا ہے).	۱۰۹
۱۹	الفیل (الم تراکیف ،بھی کہا جاتا ہے).	۱۰۵
۲۰	الفلق	۱۱۳

قرآن میں سورہ کا نمبر	سورہ	نمبر شمار
۱۱۴	الناس	۲۱
۱۱۲	الاخلاص (التوحید،الصمد اور الرب بھی کہا جاتا ہے).	۲۲
۵۳	النجم (آیت نمبر۳۲ مدنی ہے).	۲۳
۸۰	عبس(السفرۃ اعمٰی بھی کہا جاتا ہے).	۲۴
۹۷	القدر (انا انزلناہ بھی کہا جاتا ہے).	۲۵
۹۱	الشمس (الناقہ اور صالح بھی کہتے ہیں).	۲۶
۸۵	البروج	۲۷
۹۵	التین	۲۸
۱۰۶	القریش (ایلاف بھی کہتے ہیں).	۲۹
۱۰۱	القارعہ	۳۰
۷۵	القیامۃ	۳۱
۱۰۴	الھمزہ (لمزہ بھی کہتے ہیں).	۳۲
۷۷	المرسلات (العرف بھی کہا جاتا ہے)(آیت نمبر۴۸ مدنی ہے).	۳۳
۵۰	قٓ(الباسقات بھی کہتے ہیں)(آیت نمبر۳۸ مدنی ہے).	۳۴
۹۰	البلد	۳۵
۸۶	الطارق	۳۶
۵۴	القمر (اقتربت الساعۃ بھی کہتے ہیں)(آیت نمبر۴۴اور۴۶ مدنی ہیں).	۳۷
۳۸	صٓ	۳۸

قرآن میں سورہ کا نمبر	سورہ	نمبر شمار
۷	الاعراف (المص بھی کہتے ہیں)(آیت نمبر۱۶۳اور۱۷۰مدنی ہیں).	۳۹
۷۲	الجن	۴۰
۳۶	یٰسٓ (آیت نمبر۴۵مدنی ہے).	۴۱
۲۵	الفرقان (آیت۶۸اور۷۰مدنی ہے).	۴۲
۳۵	الفاطر (الملائکہ بھی کہتے ہیں).	۴۳
۱۹	مریم (آیت۵۸اور۷۱مدنی ہیں).	۴۴
۲۰	طٰہٰ (آیت۱۳۰اور۱۳۱مدنی ہیں).	۴۵
۵۶	الواقعہ (آیت۸۱اور۸۲مدنی ہیں).	۴۶
۲۶	الشعراء (طسم بھی کہتے ہیں)آیت۱۹۷،۲۲۴اور۲۲۷مدنی ہیں۔	۴۷
۲۷	النمل	۴۸
۲۸	القصص (موسٰی و فرعون بھی کہتے ہیں)آیت۵۲،۵۵اور۸۵مدنی ہیں۔	۴۹
۱۷	الاسراء (بنی اسرائیل بھی کہتے ہیں) آیت ۲۶،۳۲،۳۳،۵۷،۷۳اور۸۰ مدنی ہیں۔	۵۰
۱۰	یونس (آیت۴۰،۹۴ اور۹۶مدنی ہیں).	۵۱
۱۱	ھود (آیت۱۲،۱۷اور۱۱۴ مدنی ہیں).	۵۲
۱۲	یوسف (احسن القصص بھی کہتے ہیں) آیت۱،۲،۳ اور۷مدنی ہیں۔	۵۳
۱۵	الحجر (آیت نمبر۸۷مدنی ہے)	۵۴
۶	الانعام (آیت نمبر۲۰،۲۳،۹۱،۹۳،۱۱۴،۱۴۱،۱۵۱اور۱۵۳مدنی ہیں).	۵۵

نمبرشمار	سورہ	قرآن میں سورہ کا نمبر
۵۶	الصافات	۳۷
۵۷	لقمان (آیت نمبر ۲۷ اور ۲۹ مدنی ہیں).	۳۱
۵۸	سباء (آیت نمبر ۶ مدنی ہے).	۳۴
۵۹	الزمر (الغرف بھی کہا جاتا ہے) آیت نمبر ۵۲ اور ۵۴ مدنی ہیں۔	۳۹
۶۰	المومن (الغافر اور الطول بھی کہتے ہیں) آیت نمبر ۵۶ اور ۵۷ مدنی ہیں۔	۴۰
۶۱	فصلت (حٰم سجدہ اور المصابیح بھی کہتے ہیں).	۴۱
۶۲	الشّوریٰ (حمعسق بھی کہتے ہیں) آیت نمبر ۲۳، ۲۵ اور ۲۷ مدنی ہیں۔	۴۲
۶۳	الزخرف (آیت ۵۴ مدنی ہے).	۴۳
۶۴	الدخان	۴۴
۶۵	الجاثیہ (الشّریعہ بھی کہتے ہیں) آیت ۱۴ مدنی ہے۔	۴۵
۶۶	الاحقاف (آیت ۱۰، ۱۵ اور ۳۵ مدنی ہیں).	۴۶
۶۷	الذاریات	۵۱
۶۸	الغاشیہ	۸۸
۶۹	الکھف (آیت ۲۸، ۸۳ اور ۱۰۱ مدنی ہیں).	۱۸
۷۰	النحل (النعم بھی کہتے ہیں) آیت ۱۲۶ اور ۱۲۸ مدنی ہیں۔	۱۶
۷۱	نوح	۷۱
۷۲	ابراھیم (آیت ۲۸ اور ۲۹ مدنی ہیں).	۱۴
۷۳	انبیاء	۲۱

نمبرشمار	سورہ	قرآن میں سورہ کا نمبر
۷۴	المؤمنون	۲۳
۷۵	السجدہ (المضاجع، سجدہ لقمان، جزر اور الم تنزیل بھی کہتے ہیں) آیت نمبر۱۶ اور ۲۰ مدنی ہیں۔	۳۲
۷۶	الطور	۵۲
۷۷	الملك (المنجيه، الواقعيه اور تبارك بھی کہا جاتا ہے).	٦۷
۷۸	الحاقه	٦۹
۷۹	المعارج (سئل سائل بھی کہتے ہیں).	۷۰
۸۰	النباء (عمّ التّساؤل اورالمعصرات بھی کہتے ہیں).	۷۸
۸۱	النازعات	۷۹
۸۲	الانفطار (انفطرت بھی کہتے ہیں).	۸۲
۸۳	الانشقاق (انشقّت بھی کہتے ہیں).	۸۴
۸۴	الرّوم (آیت نمبر۱۷ مدنی ہے).	۳۰
۸۵	العنكبوت (آیت نمبر۱ اور ۱۱ مدنی ہیں).	۲۹
۸٦	المطفّفين (التطفيف بھی کہتے ہیں).	۸۳

مدینہ میں نازل ہونے والی سورتیں

۱	البقره (فسطاط القرآن بھی کہا جاتا ہے) آیت نمبر۲۸۱ منیٰ میں حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی۔	۲

نمبر شمار	سورہ	قرآن میں سورہ کا نمبر
۲	الانفال (آیت نمبر۳۰اور۳۶ مکی ہیں).	۸
۳	آلِ عمران	۳
۴	الاحزاب	۳۳
۵	الممتحنه (الامتحان اورالمودّه بھی کہا جاتا ہے).	۶۰
۶	النساء	۴
۷	الزلزله (الزلزال بھی کہتے ہیں).	۹۹
۸	الحدید	۵۷
۹	محمدؐ (القتال بھی کہتے ہیں)آیت نمبر۱۳ ہجرت کے موقع پر راستے میں نازل ہوئی۔	۴۷
۱۰	الرعد	۱۳
۱۱	الرحمٰن	۵۵
۱۲	الدھر (الانسان، حل اتٰی اورالابرار بھی کہتے ہیں).	۷۶
۱۳	الطلاق (النساء القصری بھی کہتے ہیں).	۶۵
۱۴	البینه (البریه، لم یکن اورالقیامه بھی کہتے ہیں).	۹۸
۱۵	الحشر	۵۹
۱۶	النور	۲۴
۱۷	الحج (آیت ۵۲ اور ۵۵ مکہ اور مدینہ کے درمیان نازل ہوئیں).	۲۲
۱۸	المنافقون	۶۳

نمبر شمار	سورہ	قرآن میں سورہ کا نمبر
۱۹	المجادله	۵۸
۲۰	الحجرات	۴۹
۲۱	التحریم (یا ایھا النبی بھی کہتے ہیں).	۶۶
۲۲	التغابن	۶۴
۲۳	الصف (الحواریین اور عیسٰی بھی کہتے ہیں).	۶۱
۲۴	الجمعه	۶۲
۲۵	الفتح (صلح حدیبیہ سے لوٹتے وقت راستے میں نازل ہوئی).	۴۸
۲۶	المائدہ (العقود اور المنقذة بھی کہتے ہیں) آیت نمبر ۳ عرفات میں حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی۔	۵
۲۷	التوبه (الفاضحه المقرة المبحوث المدمدمه المشقشقة المبعشره البرائة الحافرة المشيرة العذاب بھی کہتے ہیں) آخری دونوں آیتیں مکی ہیں۔	۹
۲۸	النصر (التودیع بھی کہتے ہیں) منیٰ میں حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی۔	۱۱۰

سورتوں سے متعلق بعض اصطلاحات اوران کی وضاحت

۱ ...... السبع الطوال (سات لمبی سورتیں)

۱۔بقرہ ۲۔ آلِ عمران ۳۔نساء ۴۔ مائدہ ۵۔انعام
۶۔اعراف ۷۔انفال و توبہ

۲ ......المئین

(وہ سورتیں جن کی آیات ایک سو کے قریب یا ایک سو سے زیادہ ہیں)

۱۔مومنون ۲۔ انبیاء ۳۔حجر ۴۔ کھف
۵۔اسراء ۶۔یوسف ۷۔نحل ۸۔طٰہٰ
۹۔شعراء ۱۰۔صافات ۱۱۔ ھود ۱۲۔یونس

۳...... المفصّل

مفصّل سورتوں کی تین قسمیں ہیں

۱۔طوال (لمبی سورتیں): حجرات، بروج اوران جیسی دیگر لمبی سورتیں۔
۲۔اوساط (متوسط سورتیں): طارق، بیّنہ اوران جیسی دیگر متوسط سورتیں۔
۳۔قصار (چھوٹی سورتیں): زلزال، ناس اوران جیسی دیگر چھوٹی سورتیں۔
۴۔المثانی (باقی سورتیں)

الممتحنات:

۱۔ الفتح	۲۔ الحشر	۳۔السجدہ	۴۔الطلاق
۵۔القلم	۶۔ الحجرات	۷۔ الملك	۸۔التغابن
۹۔ المنافقون	۱۰۔الجمعہ	۱۱۔الصف	۱۲۔الجن
۱۳۔نوح	۱۴۔المجادلہ	۱۵۔الممتحنہ	۱۶۔التحریم

سُوَرِ الم

الف،لام اور میم سے شروع ہونے والی سورتیں

۱۔بقرہ	۲۔آلِ عمران	۳۔اعراف	۴۔ عنکبوت	۵۔روم
۶۔لقمان	۷۔سجدہ			

سُوَرِ مسبّحات

مادہ تسبیح (یعنی لفظ سبح ، یسبح اور سبحان وغیرہ) سے شروع ہونے والی سورتیں:

۱۔ اسراء	۲۔حدید	۳۔حشر	۴۔صف	۵۔ جمعہ
۶۔ تغابن	۷۔ اعلیٰ			

سُوَرِ حوامیم

ح،م سے شروع ہونے والی سورتیں

۱۔مومن	۲۔ فصلت	۳۔شوریٰ	۴۔زخرف	۵۔ دخان
۶۔ جاثیہ	۷۔ احقاف			

سُوَرِ الر

الف۔لام۔را سے شروع ہونے والی سورتیں

۱۔یونس	۲۔ھود	۳۔یوسف	۴۔رعد	۵۔ابراھیم
۶۔حجر				

سُوَرِ حمد

۱۔فاتحہ ۲۔انعام ۳۔ کہف ۴۔ سباء ۵۔ فاطر

سُوَرِ عزایم

واجب سجدہ والی سورتیں

۱۔سجدہ ۲۔ فصلت ۳۔ نجم ۴۔علق

سُوَرِ قل

۱۔ کافرون ۲۔اخلاص ۳۔فلق ۴۔ ناس

المعوذتین

۱۔الفلق ۲۔الناس

قَلِیْلُ الْعَمَلِ یَنْفَعُ مَعَ الْعِلْمِ وَ کَثِیْرُ الْعَمَلِ لَا یَنْفَعُ مَعَ الْجَھْلِ۔

علم کے ساتھ تھوڑا عمل بھی فائدہ مند ہے اور جہالت کے ساتھ بہت سارا عمل بھی فائدہ نہیں دیتا۔(نہج الفصاحۃ۔ حدیث ؏)

سورہ

فاتحۃ الکتاب حمد

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے

اس کی سات آیات ہیں

سورہ حمد کی خصوصیات

۱۔لب ولہجہ اور اسلوب بیان

یہ سورہ قرآن مجید کی دیگر سورتوں سے لب ولہجہ اور اسلوبِ بیان کے لحاظ سے واضح امتیاز رکھتی ہے کیونکہ اس سورہ میں خداوند عالم نے بندوں کو خدا سے گفتگو اور مناجات کا طریقہ سکھایا ہے۔

سورہ کی ابتدا حمد وثنا سے کی گئی ہے۔خدا شناسی اور قیامت پر ایمان کے اظہار کے ساتھ ساتھ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بندوں کے تقاضوں،مناجات اور ضروریات پر کلام ختم کیا گیا ہے۔

۲۔اساس قرآن

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں الحمد ''ام القرآن'' یعنی سورہ حمد اساس قرآن ہے۔ایک مرتبہ جابر بن عبد اللہ انصاری آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''کیا تمہیں سب سے فضیلت والی سورت کی تعلیم دوں جو خدا نے اپنی کتاب میں نازل فرمائی ہے؟ جابر نے عرض کیا جی ہاں میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں مجھے اس کی تعلیم دیجئے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورہ حمد جو ام الکتاب ہے انہیں تعلیم فرمائی اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ سورہ حمد موت کے علاوہ ہر بیماری کے لئے شفا ہے۔(مجمع البیان۔نور الثقلین آغاز سورہ حمد)

''ام'' کا مطلب ہے بنیاد اور جڑ۔شاید اسی بناء پر عالم اسلام کے مشہور مفسر ابن عباس کہتے ہیں:

''ہر چیز کی کوئی اساس وبنیاد ہوتی ہے اور قرآن کی اساس سورہ حمد ہے''۔

۳۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اعزاز

قرآنی آیات میں سورہ حمد کا تعارف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ایک عظیم انعام کے طور پر کرایا گیا ہے اور اسے پورے قرآن کے مقابلے میں پیش کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

''ہم نے آپ کو سات آیتوں پر مشتمل سورہ حمد عطا کیا جو دو مرتبہ نازل کیا گیا اور قرآن عظیم بھی عنایت فرمایا گیا''(حجر۔آیۃ ۸۷)

سورہ حمد کے موضوعات

ایک لحاظ سے یہ سورہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک حصہ خدا کی حمد وثناء ہے اور دوسرا بندے کی ضروریات و حاجات۔
''عیون اخبار الرضا'' میں سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس سلسلے میں ایک حدیث بھی منقول ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''خداوند عالم کا ارشاد ہے کہ میں نے سورہ حمد کو اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان تقسیم کر دیا ہے۔ لہٰذا میرا بندہ حق رکھتا ہے کہ وہ جو چاہے مجھ سے مانگے''۔

سورہ حمد کی فضیلت

اس سورہ کی فضیلت کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

''جو مسلمان سورہ حمد پڑھے اس کا اجر وثواب اس شخص کے برابر ہے جس نے دو تہائی قرآن کی تلاوت کی ہو (ایک اور حدیث میں پورے قرآن کی تلاوت کے برابر ثواب مذکور ہے) اور اسے اتنا ثواب ملے گا گویا اس نے ہر مومن اور ہر مومنہ کو ہدیہ پیش کیا ہو''

اسی بنا پر امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

''شیطان نے چار دفعہ نالہ وفریاد کیا۔ پہلا وہ موقع تھا جب اسے راندہ درگاہ کیا گیا، دوسرا وقت وہ تھا جب اسے بہشت سے زمین کی طرف اتارا گیا، تیسرا وہ لمحہ تھا جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث برسالت کیا گیا اور آخری وہ مقام تھا جب سورہ حمد کو نازل کیا گیا''۔ (نور الثقلین ج ۱ ص ۴)

اس سورہ کا نام ''فاتحۃ الکتاب'' کیوں ہے؟

فاتحۃ الکتاب کا معنی ہے آغازِ کتاب (قرآن) کرنے والی۔ مختلف روایات جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ یہ سورت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں بھی اسی نام سے جانی جاتی تھی۔ یہیں سے دنیائے اسلام کے ایک اہم ترین مسئلے کی طرف فکر کا دریچہ کھلتا ہے اور وہ ہے جمع قرآن کے بارے میں۔ ایک گروہ میں یہ بات مشہور ہے کہ قرآن مجید رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں منتشر و پراگندہ صورت میں تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر، حضرت عمر، یا حضرت عثمان کے زمانے میں جمع ہوا لیکن ''فاتحۃ الکتاب'' سے ظاہر ہوتا ہے قرآن مجید رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اسی موجودہ صورت میں جمع ہو چکا تھا اور اسی سورہ حمد سے اس کی ابتدا ہوئی تھی۔ ورنہ یہ کوئی سب سے پہلے نازل ہونے والی سورہ تو نہیں جو یہ نام رکھا جائے اور نہ ہی

اس سورہ کے لئے فاتحۃ الکتاب نام کے انتخاب کے لئے کوئی دوسری دلیل موجود ہے۔ بہت سے دیگر مدارک بھی ہمارے پیش نظر ہیں جو اس حقیقت کے مؤید ہیں کہ قرآن مجید بصورتِ مجموعہ جس طرح ہمارے زمانے میں موجود ہے اسی طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں آپ کے حکم کے مطابق جمع ہو چکا تھا۔

علی بن ابراہیم نے حضرت امام صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے:

''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ قرآن ریشم کے ٹکڑوں، کاغذ کے پرزوں اور ایسی دوسری چیزوں میں منتشر ہے اسے جمع کر دو۔ حضرت علی علیہ السلام اس مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے اور قرآن کو زرد رنگ کے پارچے میں جمع کیا اور پھر اس پر مہر لگا دی''۔

اس کے علاوہ حدیث ثقلین جسے شیعہ وسنی دونوں نے نقل کیا ہے (کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں تم سے رخصت ہو رہا ہوں اور تم میں دو گرانقدر چیزیں بطور یادگار چھوڑے جا رہا ہوں خدا کی کتاب اور اہلِ بیت علیہم السلام) گواہی دیتی ہے کہ قرآن کتابی صورت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں جمع ہو چکا تھا۔

ایک اہم سوال: یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ اس بات کو کیسے باور کیا جائے کہ قرآن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں جمع ہوا؟ جب کہ علماء کے ایک گروہ میں مشہور ہے کہ قرآن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جمع ہوا (حضرت علی علیہ السلام کے ذریعے یا دیگر اشخاص کے ذریعے)۔

جواب: جو قرآن حضرت علی علیہ السلام نے جمع کیا تھا وہ فقط قرآن مجید نہ تھا بلکہ قرآن، تفسیر اور شان نزولِ آیات وغیرہ کا مجموعہ تھا۔

(۱) بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو (تمام مخلوقات کے لئے) رحمان اور (مومنین کے ساتھ) رحیم ہے۔

تفسیر

تمام لوگوں میں یہ رسم ہے کہ ہر اہم اور اچھے کام کا آغاز کسی بزرگ کے نام سے کرتے ہیں۔ کسی عظیم عمارت کی پہلی اینٹ اس شخص کے نام پر رکھی جاتی ہے۔ جس سے بہت زیادہ قلبی لگاؤ ہو یعنی اس کام کو اپنی پسندیدہ شخصیت کے نام منسوب کر دیتے ہیں۔ مگر کیا یہ بہتر نہیں کہ کسی پروگرام کو دوام بخشنے اور کسی مشن کو برقرار رکھنے کے لئے ایسی ہستی سے منسوب کیا جائے جو پائیدار، ہمیشہ رہنے والی ہو اور جس ذات میں فنا کا گزر نہ ہو۔

تمام موجودات میں سے فقط ذاتِ خدا ازلی و ابدی ہے۔ اس لئے چاہئے کہ تمام امور کو اس کے نام سے شروع کیا جائے۔ اس کے سائے میں تمام چیزوں کو قرار دیا جائے اور اسی سے مدد طلب کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث میں پڑھتے ہیں

''کل امر ذی بال لم یذکر فیه اسم اللّٰه فهو ابتر

جو بھی اہم کام خدا کے نام کے بغیر شروع ہوگا ناکامی سے ہمکنار ہوگا''۔

(تفسیر البیان جلد اول صفحہ ۴۶۱ بحوالہ بحار الانوار جلد ۶ باب ۵۸)

امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

''جب کوئی کام شروع کرنے لگو، بڑا ہو یا چھوٹا بسم اللہ کہو تا کہ وہ بابرکت بھی ہو اور پر از امن سلامتی بھی''

خلاصہ یہ کہ کسی عمل کی پائیداری و بقا اس کے ربطِ خدا سے وابستہ ہے۔ اسی مناسبت سے جب خداوند تعالیٰ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پہلی وحی نازل فرمائی تو انہیں حکم دیا کہ تبلیغ اسلام کی عظیم ذمہ داری کو خدا کے نام سے شروع کریں۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ (سورہ علق۔۱)

ہم دیکھتے ہیں کہ جب تعجب خیز اور نہایت سخت طوفان کے عالم میں حضرت نوح علیہ السلام کشتی پر سوار ہوئے۔ پانی کی موجیں پہاڑوں کی طرح بلند تھیں اور ہر لحظہ بے شمار خطرات کا سامنا تھا۔ ایسے میں منزلِ مقصود تک پہنچنے اور مشکلات پر قابو پانے کے لئے آپ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ کشتی کے چلتے اور رکتے بسم اللہ کہو۔ (ھود۔ آیت ۴۱)

جناب سلیمان علیہ السلام نے جب ملکہ سبا کو خط لکھا تو اس کا سرنامہ بسم اللہ کو قرار دیا۔ (سورہ نحل آیت ۳۰)

اسی بنا پر قرآن حکیم کی تمام سورتوں کی ابتدا بسم اللہ سے ہوتی ہے تا کہ نوع بشر کی ہدایت وسعادت کا اصلی مقصد کامیابی سے ہمکنار ہو اور بغیر کسی نقصان کے انجام پذیر ہو۔ صرف سورہ توبہ ایسی سورہ ہے جس کی ابتدا میں ہمیں بسم اللہ نظر نہیں آتی کیونکہ اس کا آغاز مکہ کے مجرموں اور معاہدہ شکنوں سے اعلان جنگ کے ساتھ ہو رہا ہے۔ لہٰذا ایسے موقع پر خدا کی صفات رحمان و رحیم کا ذکر مناسب نہیں۔

نکات

۱۔ کیا ''بسم اللہ'' سورہ حمد کا جزء ہے؟

شیعہ علماء و محققین میں اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں کہ بسم اللہ سورہ حمد اور قرآن کی دیگر سورتوں کا جز ہیں۔

بسم اللہ کا متن تمام سورتوں کی ابتداء میں ثبت ہونا اصولی طور پر اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ یہ جزوِ قرآن ہے کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ متن قرآن میں کوئی اضافی چیز نہیں رکھی گئی اور بسم اللہ زمانہ پیغمبرؐ سے لے کر اب تک سورتوں کی ابتدا میں موجود ہیں۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کی یہ سیرت رہی ہے کہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کے وقت بسم اللہ ہر سورت کی ابتداء میں پڑھتے رہے ہیں تو اتر سے ثابت ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس کی تلاوت فرماتے تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو چیز جزوِ قرآن نہ ہو اسے پیغمبر اور مسلمان ہمیشہ قرآن کے ضمن میں پڑھتے رہے ہوں اور سدا اس عمل کو جاری رکھا ہو۔

بہر حال مسئلہ اس قدر واضح ہے کہ کہتے ہیں:

ایک دن معاویہ نے اپنی حکومت کے زمانے میں نماز باجماعت میں بسم اللہ نہ پڑھی تو نماز کے بعد مہاجرین و

انصار کے ایک گروہ نے پکار کر کہا ''اسرقت ام نسیت''، یعنی کیا معاویہ نے بسم اللہ کو چرا لیا ہے یا بھول گیا ہے؟
(بیہقی جزءدوم ص۴۹، حاکم نے مستدرک جزء اول ص۲۳۳ میں اس روایت کو درج کر کے اسے صحیح قرار دیا ہے)

۲۔خدا کے ناموں میں ''اللہ'' جامع ترین نام ہے

کیونکہ خدا کے ناموں کو جو قرآن مجید یا دیگر مصادر اسلامی میں آئے ہیں اگر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ خدا کی کسی ایک صفت کو منعکس کرتے ہیں لیکن وہ نام جو تمام صفات و کمالاتِ الٰہی کی طرف اشارہ کرتا ہے، دوسرے لفظوں میں جو صفاتِ جلال و جمال کا جامع ہے وہ کلمہ صرف ''اللہ'' ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے دوسرے نام عموماً کلمہ ''اللہ'' کی صفت کی حیثیت سے کہے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے:

غفور و رحیم: یہ صفت خدا کی صفتِ بخشش کی طرف اشارہ ہے: فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (بقرہ۔۲۲۶)

سمیع و علیم: سمیع اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ خدا تمام سنی جانے والی چیزوں سے آگاہی رکھتا ہے اور علیم اشارہ ہے کہ وہ تمام چیزوں سے باخبر ہے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (بقرہ۔۲۲۷)

ایک آیت میں ہم دیکھتے ہیں بہت سے نام ''اللہ'' کی صفت قرار پاتے ہیں:

> اللہ وہ ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں وہ حاکم مطلق ہے، منزہ ہے، ہر ظلم و ستم سے پاک ہے امن بخشنے والا ہے، سب کا نگہبان ہے، توانا ہے کسی سے شکست کھانے والا نہیں اور تمام موجودات پر قاہر و غالب اور باعظمت ہے۔ (حشر۔۲۳)

اس نام کی جامعیت کا ایک واضح شاہد یہ ہے کہ ایمان و توحید کا اظہار صرف ''لا الٰہ الا اللّٰہ'' کے جملے سے ہو سکتا ہے۔

۳۔خدا کی رحمت عام اور خاص

مفسرین کے ایک طبقے میں مشہور ہے کہ صفت، رحمان خدا کی رحمت عام کی طرف اشارہ ہے۔ یہ وہ رحمت ہے جو دوست و دشمن، مومن و کافر، نیک و بدغرض سب کے لئے ہے۔ کیونکہ اس کی بے حساب رحمت کی بارش سب کو پہنچتی ہے، اور خوانِ نعمت ہر کہیں بچھا ہوا ہے۔

لیکن رحیم خداوند عالم کی رحمتِ خاص کی طرف اشارہ ہے۔ یہ وہ رحمت ہے جو اس کے مطیع، صالح اور فرمانبردار بندوں کے ساتھ مخصوص ہے۔

ایک چیز جو ممکن ہے اسی مطلب کی طرف اشارہ ہو، یہ ہے کہ لفظ ''رحمان'' قرآن میں ہر جگہ مطلق آیا ہے جو عمومیت کی نشانی ہے جب کہ ''رحیم'' کبھی مقید ذکر ہوا ہے جو کہ خصوصیت کی دلیل ہے۔ مثلاً ''و کان بالمومنین رحیما'' (خدا مومنین کے لئے ہر

جگہ رحیم ہے) (احزاب۔۴۳) اور کبھی مطلق ہے جیسے کہ سورہ حمد میں ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

''والله اله کل شئ الرحمٰن بجمیع خلقه الرحیم بالمومنین خاصة''

خدا ہر چیز کا معبود ہے اور تمام مخلوقات کے لئے رحمان اور مومنین پر خصوصیت کے ساتھ رحیم ہے۔(المیز ان بسند کافی ،توحید صدوق اور معانی الاخبار)

۴۔خدا کی دیگر صفات بسم اللہ میں کیوں مذکور نہیں؟اور صرف صفت رحمانیت اور رحمیت کا ذکر ہے۔

اگر ہم اس نکتے کی طرف توجہ کریں تو اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ ہر کام کی ابتداء میں ضروری ہے کہ ایسی صفت سے مدد لی جائے جس کے آثار تمام جہان پر سایہ فگن ہوں، جو تمام موجودات کا احاطہ کئے ہوئے ہو اور عالم بحران میں مصیبت زدوں کو نجات بخشنے والی ہو۔مناسب ہے کہ اس حقیقت کو قرآن کی زبان سے سنا جائے۔ارشاد الٰہی ہے:

وَ رَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ

میری رحمت تمام چیزوں پر محیط ہے۔(اعراف۔۱۵۶)

ہم دیکھتے ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام نہایت سخت اور طاقت فرسا حوادث اور خطرناک دشمنوں کے چنگل سے نجات کے لئے رحمت خدا کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔حضرت ہود علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں کے سلسلے میں ارشاد ہے:

''فَاَنۡجَیۡنٰهُ وَالَّذِیۡنَ مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا''(ہود اور ان کے ہمراہیوں کو ہم نے اپنی رحمت کے وسیلے سے نجات دی۔اعراف۔۷۲)

بسم اللہ سے واضح طور پر یہ درس بھی حاصل کیا جا سکتا ہے کہ خداوند عالم کے ہر کام کی بنیاد رحمت پر ہے اور بدلہ یا سزا تو استثنائی صورت ہے جیسا کہ ہم دعا میں پڑھتے ہیں:

''یَا مَنۡ سَبَقَتۡ رَحۡمَتُهٗ غَضَبَهٗ'' اے وہ خدا جس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت لے گئی ہے۔(دعائے جوشن کبیر)

انسان کو چاہئے کہ وہ زندگی کے پروگرام پر یوں پیرا ہو کہ ہر کام کی بنیاد رحمت و محبت کو قرار دے اور سختی و درشتی کو فقط بوقت ضرورت اختیار کرے۔

(۲) اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ	حمد وثنا اس خدا کے لئے مخصوص ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار و مالک ہے۔

تفسیر

سارا جہان اس کی رحمت میں ڈوبا ہوا ہے۔

بسم اللہ جو سورہ کی ابتداء ہے اس کے بعد بندوں کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ عالم وجود کے عظیم مبداء اور اس کی غیر متناہی نعمتوں کو یاد کریں۔وہ بے شمار نعمتیں جنہوں نے ہمارے پورے وجود کو گھیر رکھا ہے۔پروردگار عالم کی معرفت کی طرف راہنمائی کرتی

ہیں۔ بلکہ اس راستے کا سبب ہی یہی ہے کیوں کہ کسی انسان کو جب کوئی نعمت حاصل ہوتی ہے تو وہ فوراً چاہتا ہے کہ اس کے نعمت بخشنے والے کو پہچانے اور فرمانِ فطرت کے مطابق اس کی سپاس گزاری کے لئے کھڑا ہو اور اس کے شکریے کا حق ادا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ علماءِ علمِ کلام (عقائد) اس علم کی پہلی بحث میں جب گفتگو معرفت خدا کی علت وسبب کے متعلق ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ فطری و عقلی حکم کے مطابق معرفت خدا اس لئے واجب ہے چونکہ محسن کے احسان کا شکریہ واجب ہے۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ پروردگار عالم کی معرفت کی رہنمائی اس کی نعمتوں سے حاصل ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ (مبداء) خدا کو پہچاننے کا بہترین اور جامع ترین راستہ اسرار آفرینش وخلقت کا مطالعہ کرنا ہے ان میں خاص طور پر ان نعمتوں کا وجود ہے جو انسانوں کی زندگی سے مربوط ہیں۔ ان دو وجوہ کی بنا پر سورہ فاتحۃ الکتاب ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' سے شروع ہوتی ہے۔

حمد: نیک اختیاری کام یا نیک صفت کی تعریف کو عربی زبان میں حمد کہتے ہیں۔

1۔ جو انسان بھی خیر و برکت کا سرچشمہ ہے ہر وہ پیغمبر اور خدائی رہنما جو نور ہدایت سے دلوں کو منور کرتا ہے، جو سخی بھی سخاوت کرتا ہے اور جو کوئی طبیب جان لیوا زخم پر مرہم پٹی لگاتا ہے ان کی تعریف کا مبداء بھی خدا کی تعریف ہے، بلکہ اگر خورشید نور افشانی کرتا ہے، بادل بارش برساتا ہے اور زمین اپنی برکتیں ہمیں دیتی ہے تو یہ سب کچھ بھی اسی کی جانب سے ہے لہٰذا تمام تعریفوں کی بازگشت اسی کی ذاتِ بابرکات کی طرف ہے۔

2۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حمد صرف ابتدائے کار میں ضروری نہیں بلکہ اختتام کار پر بھی لازم ہے جیسا کہ قرآن ہمیں تعلیم دیتا ہے۔

اہلِ بہشت کے بارے میں ہے۔

''پہلے تو وہ کہیں گے: اے اللہ! تو ہر عیب ونقص سے منزہ ہے، ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت سلام کہیں گے اور ہر بات کے خاتمے پر کہیں گے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' (یونس۔۱۰)

3۔ کلمہ ''رب'' کے اصلی معنی ہیں کسی چیز کا مالک یا صاحب جو اس کی تربیت واصلاح کرتا ہو۔

4۔ لفظ ''عالمین'' عالم کی جمع ہے اور عالم کے معنی ہیں مختلف موجودات کا مجموعہ۔ اور جب عالمین کی شکل میں جمع کا صیغہ ہو تو پھر اس سے اس جہان کے تمام مجموعوں کی طرف اشارہ ہوگا۔

ایک روایت میں حضرت علی علیہ السلام ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' کی تفسیر کے ضمن میں فرماتے ہیں:

''ربّ العالمین سے مراد تمام مخلوقات کا مجموعہ ہے چاہے وہ بے جان ہوں یا جاندار''

(۳) الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ	وہ خدا جو مہربان اور بخشنے والا ہے۔

تفسیر

رحمان ورحیم کے معنی ومفہوم کی وسعت اور ان کا فرق ہم بسم اللہ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں جس نکتے کا یہاں اضافہ ہونا

چاہئے وہ یہ ہے کہ دونوں صفات جو اہم ترین اوصافِ خداوندی ہیں ہر روز کی نمازوں میں کم از کم ۳۰ مرتبہ ذکر ہوتی ہیں (ہر نماز کی پہلی دو رکعتوں میں ۱۲ مرتبہ) اس طرح ۶۰ مرتبہ ہم خدا کی تعریف صفتِ رحمت کے ساتھ کرتے ہیں۔

درحقیقت یہ تمام انسانوں کے لئے ایک درس ہے کہ وہ اپنے آپ کو زندگی میں ہر چیز سے زیادہ اس اخلاق خداوندی کے ساتھ متصف کریں، علاوہ ازیں اس واقعیت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اگر ہم اپنے آپ کو خدا کا بندہ سمجھتے ہیں تو ایسا نہ ہو کہ بے رحم مالک اپنے غلاموں سے جو سلوک روا رکھتے ہیں ہماری نگاہ میں جچنے لگے۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ ''رب العالمین'' کے بعد ''الرحمٰن الرحیم'' کو لانا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہم قدرت کے باوجود اپنے بندوں پر مہربانی اور لطف و کرم کرتے ہیں۔

(۴) مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ؕ	وہ خدا جو روزِ جزا کا مالک ہے۔

تفسیر

اسلام کی دوسری اہم اصل۔ قیامت پر ایمان ہے

یہاں قیامت خدا کی ملکیت سے تعبیر کی گئی ہے اور یہ بات اس دن کے لئے خدا کے انتہائی تسلط اور اشیاء و اشخاص پر اس کے نفوذ کو مشخص کرتی ہے۔ وہ دن کہ جب تمام انسان اس بڑے دربار میں حساب کے لئے حاضر ہوں گے لوگ اپنے مالک حقیقی کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ اپنی تمام کہی ہوئی باتیں، کئے ہوئے کام یہاں تک کہ سوچے ہوئے افکار کو اپنے سامنے موجود پائیں گے۔ حتیٰ کہ سوئی کی نوک کے برابر بھی کوئی بات نابود نہ ہوگی۔ اب وہ انسان حاضر ہے جسے اپنے تمام اعمال و افعال کی جواب دہی کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھانا ہوگا۔ نوبت یہ ہوگی کہ جن امور کو خود بجا نہیں لایا بلکہ کسی طریقہ یا پروگرام کا بانی تھا اس میں اسے اپنے حصے کی جواب دہی کا سامنا ہوگا۔

دوسرے لفظوں میں اس کی مالکیت، خالقیت اور ربوبیت کا نتیجہ ہے وہ ذات جس نے موجودات کو تخلیق کیا اور لحظہ بہ لحظہ انہیں فیض وجود ہستی بخشا وہی موجودات کا حقیقی مالک ہے۔

سوال: کیا خدا اس جہان کا مالک نہیں؟ اور اگر ہے تو پھر کیوں ہم اسے روزِ جزا کا مالک کہتے ہیں؟

جواب: خدا کی مالکیت اگرچہ دونوں جہانوں پر محیط ہے لیکن اس مالکیت کا ظہور قیامت کے دن بہت زیادہ ہوگا۔ کیونکہ اس دن تمام مادی رشتے اور اعتباری ملکیتیں ختم ہو جائیں گی۔ اس دن کسی شخص کی کوئی چیز نہیں ہوگی۔ یہاں تک کہ شفاعت بھی فرمان خدا سے ہوگی۔

قیامت کے دن پر ایمان انسان کو غلط اور ناشائستہ اعمال سے روکنے کے لئے بہت مؤثر ہے۔ نماز کے قبیح اور برے اعمال سے روکنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ایک تو یہ انسان کو مبداء کی یاد دلاتی ہے جو اس کے تمام کاموں سے واقف ہے اور دوسرے عدل خدا کی

بڑی عدالت کو بھی یاد دلاتی ہے۔

ایک حدیث میں امام سجادؑ کے بارے میں ہے کہ آپ جب آیت "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" تک پہنچتے تو اس کی اس قدر تکرار کرتے کہ یوں لگتا جیسے آپؑ کی روح بدن سے پرواز کر جائے گی۔ (تفسیر نور الثقلین ج ا ص ۱۹)

اب رہی یہ گفتگو کہ اس دن کو "یوم الدین" کیوں کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دن جزا کا دن ہے اور دین لغت میں جزا کے معنی میں ہے اور قیامت کا واضح ترین پروگرام جزا و سزا اور عوض ثواب ہے۔

(۵) اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ	پروردگار! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔

تفسیر

انسان دربار خدا میں

یہاں سے گویا بندہ اس محکم عقیدہ اور معرفت پروردگار کی وجہ سے اپنے آپ کو اس کے حضور اور اس کی ذات پاک کے رو برو دیکھنے لگ جاتا ہے۔ اسے مخاطب کر کے پہلے اپنی عبدیت کا اظہار کرتا ہے اور پھر اس سے طلب امداد کے لئے گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں صرف تیری پرستش کرتا ہوں اور تجھی سے مدد چاہتا ہوں۔

درحقیقت گذشتہ آیات توحید ذات وصفات بیان کر رہی ہیں اور یہاں توحیدِ عبادت اور توحید افعال سے متعلق گفتگو ہے۔

توحید عبادت یہ ہے کہ کسی شخص یا چیز کو ذاتِ خدا کے علاوہ پرستش کے لائق نہ سمجھا جائے، صرف اس کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا جائے، صرف اسی کے قوانین و احکام کو قبول کیا جائے اور اس کی ذات پاک کے علاوہ کسی کی کسی قسم کی عبادت و بندگی کرنے اور کسی اور کے سامنے سر جھکانے سے پرہیز کیا جائے۔

توحید افعالی یہ ہے کہ سارے جہاں میں مؤثر حقیقی اسی کو سمجھا جائے اس کا مطلب یہ نہیں کہ عالم اسباب کا انکار کر دیا جائے اور سبب کی تلاش نہ کی جائے بلکہ ہمیں یہ اعتقاد رکھنا چاہئے کہ ہر سبب کی یہ تاثیر حکم خدا کے تابع ہے وہی ہے جس نے آگ کو جلانے، سورج کو روشنی دینے اور پانی کو حیات بخشنے کی تاثیر دی ہے۔

اس عقیدے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان صرف اللہ پر بھروسہ کرے گا اور غیر اس کی نظر میں فانی، زوال پذیر اور فاقد قدرت ہوگا۔

(٦) اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ	ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت فرما۔

تفسیر

صراط مستقیم پر چلنا

پروردگار کے سامنے اظہارِ تسلیم، اس کی ذات کی عبودیت، اس سے طلب استعانت کے مرحلے تک پہنچ جانے کے بعد

بندے کا پہلا تقاضہ یہ ہے کہ اسے سیدھی راہ، پاکیزگی و نیکی کی راہ عدل وداد کی راہ اور ایمان و اعمال صالح کی راہ کی ہدایت نصیب ہو۔

یہاں یہ مشہور سوال سامنے آتا ہے کہ ہم ہمیشہ خدا سے صراطِ مستقیم کی ہدایت کی درخواست کرتے رہتے ہیں، کیا ہم گمراہ ہیں ؟ اور اگر بالفرض یہ بات ہمارے لئے درست ہے تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہلِ بیت علیہم السلام جو انسانِ کامل کا نمونہ ہیں ان کے لئے کیونکر صحیح ہے؟ اس سوال کے جواب میں ہم کہتے ہیں: کہ انسان کے لئے راہِ ہدایت میں ہر لمحے لغزش و کجروی کا خوف ہے لہذا اچاہئے کہ اپنے آپ کو پروردگار کے اختیار میں دیدیں اور اس سے تقاضہ کریں کہ وہ اسے سیدھی راہ پر ثابت قدم رکھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہدایت کے معنی ہیں طریقِ کامل کو طے کرنا یعنی انسان تدریجاً مراحل نقص پیچھے چھوڑتا جائے اور مراحل بلند تک پہنچتا جائے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ راہِ کمال یعنی ایک کمال سے دوسرے کمال تک پہنچنے کا راستہ نامحدود ہے گویا یہ ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔

اس بنا پر کوئی تعجب نہیں کہ انبیاء وائمہ علیہم السلام بھی خدا سے صراطِ مستقیم کی ہدایت کا تقاضہ کریں کیونکہ کمالِ مطلق تو صرف ذاتِ خدا ہے اور باقی سب بلا استثناء سیرِ تکامل میں ہیں لہٰذا کیا حرج ہے کہ وہ بھی خدا سے بالاتر واعلیٰ ترین درجات کی تمنا کریں۔

حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

خداوندا ہمیں اس راستہ پر جو تیری محبت اور جنت تک ہے ثابت قدم رکھ کہ یہی راستہ ہلاک کرنے والی خواہشات اور انحرافی وتباہ کرنے والی آراء سے مانع ہے۔

صراطِ مستقیم کیا ہے؟

آیاتِ قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ صراطِ مستقیم آئین خدا پرستی، دینِ حق اور احکامِ خداوندی کی پابندی کا نام ہے۔ جیسے سورہ انعام کی آیت ۱۶۱ میں ہے:

یعنی کہہ دیجیے کہ میرے پروردگار نے مجھے صراط مستقیم کی ہدایت کی ہے جو سیدھا دین ہے وہ کہ جو اس ابراہیم کا آئین ہے جس نے کبھی خدا سے شرک نہیں کیا۔

(۷) صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ ۧ	ان لوگوں کی راہ پر جن پر تو نے انعام کیا۔ ان کی راہ نہیں جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ وہ کہ جو گمراہ ہوگئے۔

تفسیر

دو انحرافی خطوط

یہ آیت حقیقت میں صراطِ مستقیم کی واضح تفسیر ہے جسے ہم گذشتہ آیت میں پڑھ چکے ہیں۔ دعا ہے کہ مجھے ان لوگوں کے راستہ کی ہدایت فرما جنہیں قسم قسم کی نعمتوں سے نوازا ہے (نعمت ہدایت و نعمت توفیق، مردانِ حق کی رہبری کی نعمت، نعمت علم و عمل اور

نعمت جہاد وشہادت)۔ان لوگوں کی راہ نہیں جن کے برے اعمال اور ٹیڑھے عقائد کے باعث تیرا غضب انہیں دامن گیر ہوا اور نہ ہی ان لوگوں کی راہ جو شاہراہِ حق کو چھوڑ کر بے راہ روی کے عالم میں گمراہ وسرگرداں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا ہمیں دستورِ ہدایت دے رہا ہے کہ ہم انبیاء، صالحین اور دیگر وہ لوگ جو نعمت و الطاف الٰہی سے نوازے گئے ہیں ان کے راستے کی خواہش کریں۔ نیز ہمیں خبر دار کیا گیا ہے کہ تمہارے سامنے دو ٹیڑھے خطوط موجود ہیں، خطِ **مغضوب علیھم** اور خطِ **ضالین**۔

1۔ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کون ہیں؟ سورہ نساء کی آیت ۶۹ میں اس گروہ کی نشاندہی یوں کی گئی ہے:

''جو لوگ خدا اور رسول کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں خدا انہیں ان لوگوں کے ساتھ قرار دے گا جنہیں نعمات سے نوازا گیا ہے اور وہ ہیں انبیاء، صدیقین، شہدائے راہِ حق اور صالح انسان اور یہ لوگ بہترین ساتھی ہیں''۔

اس لئے ہم روزانہ صبح وشام سورہ حمد میں خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہم بھی ان چار گروہوں کے طریقِ حق کے راہی قرار پائیں جن کا راستہ انبیاء کا راستہ، شہداء اور صالحین کا راستہ ہے۔

2۔ **مغضوب علیھم** اور **ضالین** کون لوگ ہیں؟ قرآن مجید میں دونوں الفاظ کے استعمال کے مواقع سے ظاہر ہوتا ہے **ضالین** سے مراد گمراہ لوگ ہیں اور **مغضوب علیھم** سے مراد لجوج (گمراہی پر مصر) یا منافق ہیں یہی وجہ ہے کہ کئی ایک موقعوں پر ایسے لوگوں کے لئے خدا کے غضب اور لعنت کا ذکر ہوا ہے۔

سورہ فتح آیت ۶ میں ہے:

''منافق مرد اور عورتیں اور مشرک مرد اور عورتیں جو خدا کے بارے میں برے گمان کرتے ہیں خدا ان سب پر عذاب نازل کرے گا۔ان سب پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور انہیں اپنی رحمت سے دور رکھتا ہے اور انہی کے لئے اس نے جہنم تیار کر رکھی ہے''۔

بہر حال **مغضوب علیھم** وہ ہیں جو راہِ کفر میں لجاجت وعناد اور حق سے دشمنی رکھنے کے علاوہ رہبران الٰہی اور انبیاء مرسلین کو ہر ممکن اذیت وآزار پہنچانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

سورہ بقرہ

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے

اس کی ۲۸۶ آیات ہیں

سورہ بقرہ کے موضوعات

یہ سورہ جو قرآن مجید کی طویل ترین سورتوں میں سے ہے مسلماً تمام کی تمام ایک دم نازل نہیں ہوئی بلکہ مختلف وقفوں سے مدینہ میں اسلامی معاشرے کی گونا گوں ضروریات کے مطابق نازل ہوئی۔

اس کے باوجود اسلام کے اصول اعتقاد اور بہت سے عملی مسائل کی رد سے (جن میں عبادتی، اجتماعی، سیاسی، اور اقتصادی مسائل شامل ہیں) اس کی جامعیت نا قابلِ انکار ہے۔ اس کے موضوعات ایک نظر میں یہ ہیں:

(1)۔ توحید اور خدا شناسی کے متعلق بحثیں خصوصاً وہ جو اسرار افرینش کے موضوع سے متعلق ہیں۔

(2)۔ قیامت اور موت کے بعد سے متعلق بحثیں بالخصوص حسّی مثالیں، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ، پرندوں کا مرنے کے بعد زندہ ہونا اور حضرت عزیز علیہ السلام کا واقعہ۔

(3)۔ قرآن ایک معجزہ ہونے کی بحثیں اور اس آسمانی کتاب کی اہمیت۔

(4)۔ یہودیوں اور منافقین کے بارے میں مفصل اور طویل بحثیں۔ اسلام اور قرآن کے بارے میں ان کے مخصوص اعتراضات اور اس سلسلے میں ان کی کارستانیاں اور رکاوٹیں۔

(5)۔ بڑے بڑے انبیاء خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاریخ کے سلسلے کی بحثیں۔

(6)۔ اسلام کے مختلف احکام سے متعلق ابحاث، جن میں نماز، روزہ، جہاد فی سبیل اللہ، حج، تغیر قبلہ، نکاح، طلاق، احکام موضوعات میں سے ہیں۔

سورہ بقرہ کی فضیلت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا گیا:

قرآن کی کونسی سورہ افضل ہے؟

فرمایا: سورہ بقرہ۔

عرض کیا گیا سورہ بقرہ کی کونسی آیت افضل ہے؟

فرمایا: آیت الکرسی۔ (نور الثقلین۔ ج ا ص ۲۶، مجمع البیان۔ ج ص ۳۲)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو (تمام مخلوقات کے لئے) رحمان اور (مومنین کے ساتھ) رحیم ہے۔
(۱) الٓمّٓ	ال م
(۲) ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ ۛۚۖ فِیۡہِ ۛۚ ہُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ۙ	وہ باعظمت کتاب ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ پرہیزگاروں کی ہدایت کی بنیاد ہے۔

تفسیر

قرآن کے حروف مقطعات کے متعلق تحقیق

انیس سورتوں کی ابتدا میں ہمیں حروف مقطعات دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیشہ قرآن کے اسرار آمیز کلمات میں شمار ہوتے رہے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اور علماء کی جدید تحقیقات سے ان کی نئی تفسیریں سامنے آئیں گی۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ ہم نے کسی تاریخ میں نہیں دیکھا کہ عرب کے جاہلوں اور مشرکین نے قرآن کی کئی ایک سورتوں کی ابتدا میں موجود ان حروف مقطعات کی وجہ سے حضرت رسول اکرم ﷺ پر اعتراض کیا ہو یا ان کے باعث استہزاء و تمسخر کیا ہو۔ یہ امر اس بات کی خبر دیتا ہے کہ گویا وہ لوگ بھی حروف مقطعات کے وجود کے اسرار سے بالکل بے خبر نہ تھے۔

بہر حال تفاسیر مذکورہ میں سے چند ایک ایسی ہیں جو زیادہ اہم اور معتبر لگتی ہیں

اور وہ اس سلسلے کی آخری تحقیقات سے ہم آہنگ ہیں ہم چند ایک کو تدریجاً اس سورہ، آلِ عمران اور سورہ اعراف کے آغاز میں انشاءاللہ بیان کریں گے۔

اس وقت ان میں سے اہم ترین کا ذکر کیا جارہا ہے۔

یہ حروف اس چیز کی طرف اشارہ ہے کہ یہ آسمانی کتاب اس عظمت و اہمیت کے باوجود کہ اس نے عرب و عجم کے تمام سخنوروں کو حیران کر دیا ہے۔ اور علماء و محققین کو عاجز کر دیا ہے انہی حروف کا مجموعہ نمونہ ہے جن کا استعمال سب کے اختیار میں ہے۔

باوجودیکہ قرآن انہیں حروفِ الف، با اور عام کلمات سے مرکب ہے لیکن یہ ایسے موضوع کلمات اور عظیم معانی کا حامل ہے جو انسان کے دل و جان کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں انسان کی روح تحیر و تحسین کی کیفیات سے دوچار ہو جاتی ہے اور ان کے مطالعے سے افکار و عقول ان کی تعظیم و تکریم پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

بالکل اسی طرح جیسے خداوند عظیم نے اس مٹی سے انسان کو اس تعجب خیز جسم کے ساتھ تخلیق کیا، قسم قسم کے خوبصورت پرندے اور جانور پیدا کئے، طرح طرح کے سبزے اور رنگ برنگِ پھول بنائے اور ان ہی کی طرح اور موجودات کو پیدا کیا اور ہم اس مٹی سے

پیالے، کوزے اور اسی قسم کی چیزیں بناتے ہیں۔ ایسے ہی خداوند تعالیٰ حروف الف، باء اور معمولی کلمات سے بلند ترین مطالب و معانی کو خوبصورت الفاظ اور موضوع کلمات کے سانچے میں ڈھالتا ہے اور انہیں ایسا اسلوب دیتا ہے جس سے تمام انگشت بدنداں ہیں۔ بے شک یہی حروف انسانوں کے اختیار میں بھی ہیں لیکن ان میں یہ طاقت نہیں کہ قرآن جیسی تراکیب اور جملہ بندی ایجاد کر سکیں۔

ادبیات کا عہد زریں

یہ بات قابل غور ہے کہ زمانہ جاہلیت ادبیات کے لحاظ سے ایک عہد زریں تھا۔ وہی پابرہنہ وحشی بادیہ نشین بدو تمام تر اقتصادی و معاشرتی محرومیوں کے باوجود ادبی ذوق اور سخن سنجی سے سرشار تھے۔

عربوں کے زمانۂ جاہلیت میں ایک سالانہ میلہ لگتا تھا جو بازار عکاظ کے نام سے مشہور تھا۔ یہ ایک ادبی اجتماع کے ساتھ ساتھ سیاسی و عدالتی کانفرنس بھی تھی۔ اسی بازار میں بڑے بڑے اقتصادی سودے بھی ہوتے۔ شعراء اور سخنور اپنی اپنی تحقیقات اس کانفرنس میں پیش کرتے ان میں بہترین کا انتخاب ہوتا جسے شعرِ سال کا اعزاز حاصل ہوتا اس عظیم الشان ادبی مقابلے میں کامیابی شاعر اور اس کے قبیلے کے لئے بہت بڑا اعزاز تصور کی جاتی تھی۔

ایسے زمانے میں قرآن نے اپنی مثل لانے کی دعوت انہی لوگوں کو دی اور سب نے اظہار عجز کیا اور اس کے سامنے سر جھکا لئے۔

واضح گواہ

حروف مقطعہ کی تفسیر کا زندہ ثبوت وہ حدیث ہے جو امام سجاد علی بن حسین علیہ السلام سے منقول ہے آپ فرماتے ہیں۔

"کذب قریش والیهود بالقرآن و قالوا هذا سحر مبین تقوله فقال اللّٰه : الم ذٰلک الکتاب......... ای یا محمد هذا الکتاب الذی انزلته الیک الحروف المقطعة التی منها الف و لام و میم وهو بلغتکم فأتوا بمثله ان کنتم صادقین......" (تفسیر البرہان، جلد اول، صفحہ ۵۴)

قریش اور یہودیوں نے یہ کہہ کر قرآن کی طرف نسبت دی کہ قرآن جادو ہے یہ خود ساختہ ہے اور اسے خدا سے منسوب کر دیا گیا ہے خدا نے انہیں خبردار کیا اور فرمایا **الم ذٰلک الکتاب** یعنی اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو کتاب ہم نے تجھ پر نازل کی ہے وہ انہیں حروف مقطعہ "الف۔ لام، میم" وغیرہ پر مشتمل ہے جو تمہارے زیرِ استعمال ہیں۔۔۔۔۔ اور اگر تم سچے ہو تو اس کی مثل پیش کرو۔

(۲) اس سورہ بقرہ میں حروف مقطعہ کو بیان کرنے کے بعد اس آسمانی کتاب کی عظمت کو بیان کیا گیا ہے یہ جو فرمایا گیا ہے کہ اس میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ نہیں صرف ایک دعویٰ نہیں بلکہ آثار صدق و عظمت، نظم و استحکام، معانی گہرائی، الفاظ و تعبیرات کی مٹھاس اور فصاحت اس میں نمایاں ہے کہ ہر قسم کا وسوسہ اور شک دور ہو جاتا ہے۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ رفتار زمانہ نہ فقط اس شگفتگی و

تازگی کو کم نہیں کرسکی بلکہ علوم کی پیش رفت اور اسرار کائنات کے آشکارا ہونے سے اس کے حقائق روشن تر ہوتے جارہے ہیں۔

ہدایت کیا ہے؟

لفظ ہدایت قرآن میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔اس کے بنیادی دو معانی ہیں:

1۔**ہدایت تکوینی**۔۔۔جو تمام موجوداتِ عالم میں پائی جاتی ہے(اس سے مراد وہ ہدایت ہے جو تمام موجودات نظامِ خلقت کے تحت عالم ہستی کے قوانین کی پابندی کے ساتھ پروردگار عالم سے حاصل کرتی ہیں)۔

2۔**ہدایت تشریعی**۔۔۔جو انبیاء اور کتب آسمانی کے ذریعے انجام پذیر ہوتی ہے اور نوعِ انسانی ان کی تعلیم و تربیت سے ترقی کی راہیں طے کرتی ہے۔

قرآنی ہدایت پرہیزگاروں کے ساتھ کیوں مخصوص ہے؟

یہ مسلم ہے کہ قرآن تمام دنیا کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے۔لیکن مندرجہ بالا آیت میں اس کی ہدایت کو پرہیزگاروں کے ساتھ کیوں مخصوص قرار دیا گیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک تقویٰ کا کچھ حصہ انسان میں موجود نہ ہو اس کے لئے آسمانی کتابوں اور انبیاء کی دعوت سے ہدایت کا حصول محال ہے(تقویٰ کے کچھ حصے سے مراد یہ ہے کہ انسان عقل وفطرت کی روشنی میں حق کو پہچان سکے اور پھر اس کے سامنے سر تسلیم خم بھی کردے)۔

باالفاظِ دیگر جن لوگوں کے پاس ایمان نہیں انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ایک وہ جو حق کی تلاش میں ہیں اور اس قدر تقویٰ ان میں موجود ہے کہ جہاں کہیں حق کو پائیں گے قبول کرلیں گے اور دوسرا حصہ وہ جو لجوج،متعصب اور ہوا و ہوس پرست لوگوں پر مشتمل ہے جو نہ صرف یہ کہ تلاشِ حق نہیں کرتے بلکہ جہاں کہیں اسے دیکھیں گے اسے ختم کردینے کے درپے ہوں گے اب یہ مسلم ہے کہ قرآن اور دوسری آسمانی کتب صرف پہلے گروہ کے لئے مفید تھیں اور ہیں اور دوسرا گروہ ان کی ہدایت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔گویا فاعل کی فاعلیت کے علاوہ قبول کرنے والے میں قبولیت کی شرط بھی ہے۔فرق نہیں کہ ہدایت تکوینی ہو یا تشریعی۔

وجود انسانی کی سرزمین بھی جب تک ہٹ دھرمی،عناد اور تعصب سے پاک نہ ہو ہدایت کے بیج کو قبول نہیں کرے گی۔اسی بناء پر ارشاد الٰہی ہے کہ......قرآن متقی لوگوں کے لئے ہادی و رہنما ہے۔

(٣) الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۙ	پرہیزگار وہ ہیں جو غیب(جس کا حواس ادراک نہیں کرسکتے) پر ایمان رکھتے ہیں،نماز قائم کرتے ہیں اور ان تمام نعمتوں اور عطیوں میں سے جو ہم نے انہیں بطور روزی دیئے ہیں خرچ کرتے ہیں۔

(۴) وَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ؕ	یہ وہ لوگ ہیں کہ جو کچھ آپ پر نازل ہوا ہے، جو کچھ آپ سے قبل (انبیاء گذشتہ پر) نازل ہو چکا اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔
(۵) اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ	انہیں خدا نے ہدایت کی ہے اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔

تفسیر

روح جسم انسانی میں آثار تقویٰ

قرآن اس سورہ کی ابتدا میں اسلامی آئین اور پروگرام سے مربوط ہونے کے لحاظ سے لوگوں کو تین مختلف گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔

(1) **متقین** (پرہیزگار).....جو اسلام کو مکمل طور پر قبول کرتے ہیں۔

(2) **کافرین**......جو پہلے گروہ کے مدمقابل کھڑے ہیں، اپنے کفر کے معترف ہیں۔

(3) **منافقین** ......جو دورخ اور دو چہرے رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ ظاہراً مسلمان ہیں اور گروہ مخالف کے ساتھ ہوں تو مخالف اسلام۔ البتہ ان کا اصلی چہرہ وہی کفر والا ہے اس میں شک نہیں کہ یہ گروہ اسلام کے لئے دوسرے گروہ کی نسبت زیادہ خطرناک ہے۔ کہ اسی بناء پر قرآن ان پر بہت زیادہ نکتہ چینی کرتا ہے۔

البتہ یہ موضوع اسلام سے ہی مخصوص نہیں بلکہ تمام مکاتب و مذاہبِ عالم ان تین گروہوں سے واسطہ رکھتے ہیں کیونکہ کوئی شخص کسی مکتب کا مومن ہے یا واضح طور پر اس کا مخالف یا پھر منافق جسے اپنے کام سے کام ہے۔ نیز یہ مسئلہ کسی خاص زمانے سے بھی تعلق نہیں رکھتا بلکہ تمام ادوار عالم میں ایسا ہی رہا ہے۔

پہلا گروہ متقین کا ہے

زیرِ بحث آیات میں پہلے گروہ کے متعلق گفتگو ہے۔ ان کی خصوصیات کو ایمان وعمل کے لحاظ سے پانچ عنوانات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

(1) **غیب پر ایمان:** سب سے پہلے قرآن کہتا ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ غیب اور شہود ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں۔ عالم شہود عالم محسوسات ہے اور عالم غیب ماورائے حس ہے۔ کیونکہ غیب کے معنی اصل میں پوشیدہ و نہاں چیز کے ہیں۔ کیونکہ محسوسات سے ماوراء کی دنیا ہماری حس سے پوشیدہ ہے لہٰذا اسے غیب کہا جاتا

ہے۔

غیب پر ایمان رکھنا دراصل وہ پہلا نقطہ ہے جو مومنین کو دوسروں سے جدا کرتا ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جو آسمانی ادیان کے پیروکاروں کو خدا، وحی اور قیامت کے منکروں کے مقابل کھڑا کرتا ہے۔ اسی بناء پر پرہیزگاروں کی پہلی خصوصیت کے طور پر ایمان بالغیب کا ذکر کیا گیا ہے۔

غیب پر ایمان رکھنے والے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس جہان کے پیدا کرنے والے کا علم اور قدرت بے انتہا ہے اور اس کی عظمت وادراک کی کوئی حد نہیں۔ وہ ازلی وابدی ہے۔

موت کے معنی نابود ہونا اور فنا ہونا نہیں بلکہ یہ ایک وسیع تر جہان دیکھنے کے لئے ایک دریچہ ہے جب ایک مادی شخص اعتقاد رکھتا ہے کہ جہان ہستی اس میں محدود ہے جسے ہم دیکھ رہے ہیں۔ قوانین طبیعت بغیر کسی پروگرام اور منصوبے کے اس عالم کے پیدا کرنے والے ہیں۔ اور موت کے بعد ہر چیز ختم ہو جائے گی۔

کیا یہ دو انسان قابلِ مقایسہ ہیں؟

پہلا شخص (مومن) حق وعدالت، خیر خواہی اور دوسروں کی مدد سے چشم پوشی نہیں کر سکتا لیکن دوسرے (مادی) شخص کے پاس اس امور کے لئے کوئی دلیل موجود نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مومنین کے درمیان سچا بھائی چارہ، پاکیزہ افہام وتفہیم اور تعاون ہوتا ہے جب کہ جہاں پر مادی فکر کے حامل شخص کی حکمرانی ہے وہاں استعمار، استثمار، خونریزی، غارت گری اور تاراجی ہے۔

کیا ایمان بالغیب سے مراد صرف ذاتِ پروردگار پر ایمان لانا ہے یا غیب یہاں ایک وسیع معنی رکھتا ہے یعنی وحی، قیامت، فرشتے اور عالم حس سے ماوراء سب کچھ اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ مفسرین کے درمیان اس سلسلے میں اختلاف ہے لیکن ہمارے نزدیک غیب یہاں ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کیونکہ آیت کی تعبیر مطلق ہے اور اس میں کسی قسم کی کوئی قید موجود نہیں جو اسے کسی خاص معنی میں محدود کر دے۔

اب ہم اہل بیت علیہم السلام کی بعض روایات میں دیکھتے ہیں کہ اس آیت میں غیب سے مراد امام غائب حضرت مہدی علیہ السلام لئے گئے ہیں (نور الثقلین جلد اول صفحہ ۳۱) تو یہ بات ہماری گذشتہ گفتگو سے اختلاف نہیں رکھتی۔

مذکورہ روایات حقیقت میں ایمان بالغیب کی وسعت اور اس کے امام غائب تک کے شمول کو بیان کرتی ہے یہاں تک کہ کہا جا سکتا ہے کہ ایمان بالغیب ممکن ہے زمانے کے گذرنے کے ساتھ ساتھ نئے مصداق بھی پیدا کرے۔

(2) **خدا سے رابطہ:** پرہیزگاروں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں۔ نماز خدا سے رابطے کی ایک رمز ہے۔ مومنین جو جہان ماورائے طبیعت تک رسائی حاصل کر چکے ہیں نمازوں کا دائمی وہمیشگی رابطہ مبداء عظیم آفرینش سے برقرار رکھنے کا ذریعہ ہے۔ وہ صرف خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ ایسا انسان احساس کرتا ہے کہ میں تمام مخلوقات سے آگے بڑھ گیا

ہوں اور مجھے اس مقام تک رسائی حاصل ہوگئی ہے کہ خدا سے گفتگو کروں۔ یہ احساس اس کی تربیت کے لئے بہترین عامل ہے۔

(3) **انسانوں سے رابطہ:** مومنین وہ لوگ ہیں جو پروردگار کے ساتھ دائمی رابطے کے علاوہ خلق خدا سے بھی مسلسل رابطہ رکھتے ہیں۔ اسی لئے قرآن ان کی تیسری خصوصیت یہ بیان کرتا ہے کہ ہم نے جو نعمتیں انہیں روزی کے طور پر عطا کی ہیں انہیں خرچ کرتے ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ ''من اموال ینفقون'' (اپنے اموال میں سے خرچ کرتے ہیں) بلکہ کہتا ہے ''وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ'' جو ہم نے انہیں رزق دیا ہے...... اس طرح مسئلہ انفاق اور خرچ کرنے کو عمومیت دے دی گئی ہے گویا اس میں خدا کی مادی اور معنوی سب عنایتیں شامل ہیں۔ اس بناء پر پرہیزگار وہ ہیں جو نہ صرف اپنا مال بلکہ علم، عقل و دانش، جسمانی قوتیں، مقام اور منصب اجتماعی غرض اپنا ہر قسم کا سرمایہ صاحبانِ حاجت پر خرچ کرتے ہیں اور اس خواہش کے بغیر کہ ان لوگوں سے اس کا کچھ عوض ملے گا۔

(4) **تمام انبیاء اور خدائی پروگراموں پر ایمان:** پھر قرآن کہتا ہے وہ ایسے لوگ ہیں کہ جو کچھ آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ سے پہلے نازل ہوا ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

زیرِ نظر دوسری آیت میں مومنین کی پانچویں علامت کا ذکر ہے۔

(5) **قیامت پر ایمان:** یہ وہ آخری صفت ہے جو پرہیزگاروں کی صفات کے سلسلے میں بیان ہوئی ہے فرمایا گیا ہے کہ وہ آخرت پر یقیناً ایمان رکھتے ہیں۔

وہ یقین رکھتے ہیں کہ انسان مہمل، عبث اور بے مقصد پیدا نہیں ہوا۔ اس کی تخلیق اس کے آگے بڑھنے کے لئے ہے اور اس کا سفر موت کے بعد ختم نہیں ہو جاتا۔ وہ اقرار کرتا ہے کہ پروردگار کی عدالت مطلقہ سب کے انتظار میں ہے اور یہ نہیں کہ اس دنیا میں ہمارے اعمال بے حساب اور بغیر جزا و سزا کے رہ جائیں۔

یہ اعتقاد اس میں اطمینان کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے اور کام کا بوجھ اس کے لئے باعث تکلیف نہیں رہتا بلکہ وہ ان ذمہ داریوں کا استقبال کرتا ہے۔ حوادث کے مقابل میں کوہِ گراں کی مانند کھڑا ہو جاتا ہے غیر عادلانہ سلوک کے مقابلے میں سر نہیں جھکاتا۔ وہ مطمئن ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے نیک و بد کام کی جزا و سزا ہے، موت کے بعد ایک وسیع جہان کی طرف منتقل ہونا ہے اور رحمت وسیع اور الطاف پروردگار سے بہرہ ور ہونا ہے۔

قیامت کا عقیدہ رکھنا انسان کی زندگی میں گہرا اثر پیدا کرتا ہے۔ یہ عقیدہ انسان کو شہامت و شجاعت بخشتا ہے کیونکہ اس کی بنیاد پر انسان اس جہان کی زندگی میں افتخار کی بلندیوں تک پہنچتا ہے جو اسے خداوند عالم کی مقدس راہ میں ''شہادت'' سے حاصل ہوتا ہے اور یہ شہادت ایک صاحب ایمان انسان کے لئے محبوب ترین چیز ہے کیونکہ یہ دراصل ایک ابدی و جاودانی زندگی کی ابتداء ہے۔

قیامت پر ایمان انسان کو گناہ سے روکتا ہے۔ یہ ایمان جتنا قوی ہوگا گناہ اتنے کم ہوں گے۔

زیرِ نظر آخری آیت ان لوگوں کے نتیجے اور انجامِ کار کی خبر دیتی ہے جن کی صفات گذشتہ پانچ آیات میں بیان کی گئی ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں۔ اور یہی کامیاب ہیں۔

حقیقت میں ان کی ہدایت اور کامیابی کی ضمانت خدا کی طرف سے ہے۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ قرآن کہتا ہے ''عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ'' یہ ایسے ہے گویا ہدایت خداوندی ایک رہوار ہے جس پر وہ سوار ہیں اور اس سواری کی مدد سے وہ کامیابی اور سعادت کی طرف رواں دواں ہیں۔

حقیقت تقویٰ کیا ہے؟

تقویٰ کا مادہ ہے ''وقاية'' جس کے معنی ہیں نگہداری یا خودداری (راغب نے مفردات میں لکھا ہے کہ ''وقاية'' کے معنی ہیں ''چیزوں کو ان امور سے محفوظ کرنا جو انہیں نقصان یا تکلیف پہنچائیں'' اور ''تقویٰ'' کے معنی ہیں ''خطرات سے بچا کر روح کو ایک حفاظتی پردے میں رکھنا''۔ تقویٰ کے معنی کبھی خوف بھی کئے جاتے ہیں حالانکہ خوف تو تقویٰ کا سبب ہے۔ عرف شریعت میں تقویٰ کا مطلب ہے اپنے آپ کو گناہوں سے بچا کر رکھنا اور کمالِ تقویٰ یہ ہے کہ مشتبہ چیزوں سے بھی اجتناب کیا جائے)۔ دوسرے لفظوں میں نظم وضبط کی ایک ایسی اندرونی طاقت کا نام تقویٰ ہے جو سرکشی و شہوت کے مقابلے میں انسان کی حفاظت کرتی ہے۔ حقیقت میں یہ قوت ایک ایسے مضبوط ہینڈل کا کام دیتی ہے جو وجودِ انسانی کی مشینری کو الٹ جانے کی جگہوں پر محفوظ رکھتا ہے اور خطرناک تیزیوں سے روکتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''اے اللہ کے بندو! جان لو تقویٰ ایسا مضبوط قلعہ ہے جسے تسخیر نہیں کیا جا سکتا'' (نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۷)

''تقویٰ ایسے رہوار کی مانند ہے جس پر اس کا مالک سوار ہو، اس کی باگ ڈور بھی اس کے ہاتھ میں ہو اور وہ اسے بہشت کے اندر پہنچا دے''۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۱۶)

اسلام میں کسی کی شخصیت کے لئے معیار فضیلت یہی تقویٰ ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ جملہ اسلام کا زندہ اور جاودانی شعار شمار کیا جاتا ہے

''اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ'' (حجرات۔۱۳)

یعنی......یقیناً خدا کے ہاں تم میں سے زیادہ صاحبِ عزت و تکریم وہی ہے جو تقویٰ میں سب سے بڑھ کر ہے۔

ضمناً متوجہ رہئے گا کہ تقویٰ کی کئی ایک شاخیں اور شعبے ہیں مثلاً تقویٰ مالی، تقویٰ اقتصادی، تقویٰ جنسی، تقویٰ اجتماعی اور تقویٰ سیاسی وغیرہ۔

(٦) اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ	جو لوگ کافر ہو گئے ان کے لئے برابر ہے کہ آپ انہیں (عذابِ خدا سے) ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

(۷) خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ وَ عَلٰی سَمۡعِہِمۡ ؕ وَ عَلٰۤی اَبۡصَارِہِمۡ غِشَاوَۃٌ ۫ وَّ لَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ٪	خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے اور ایک بڑا عذاب ان کے انتظار میں ہے۔

تفسیر

دوسرا گروہ سرکش کفار کا ہے

یہ گروہ ان پرہیزگار انسانوں کے بالکل برعکس ہے جن کی صفات اس آیت اور بعد والی آیت میں پوری وضاحت سے بیان ہوئی ہیں۔

اس گروہ کے افراد اپنی گمراہی میں اتنے کٹر ہیں کہ حق جتنا بھی ان کے سامنے واضح ہو جائے وہ اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں وہ قرآن جو متقین کے لئے ہادی اور رہنما ہے ان کے لئے بالکل بے اثر ہے۔ کچھ کہیں نہ کہیں، ڈرائیں یا نہ ڈرائیں کوئی بشارت دیں یا نہ دیں ان پر کسی چیز کا کچھ اثر نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ حق کی پیروی اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے لئے روحانی طور پر آمادہ ہی نہیں۔

زیرِ نظر دوسری آیت میں اس تعصب و ڈھٹائی کی دلیل پیش کی گئی ہے اور وہ یہ کہ یہ کفر و عناد میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ حسِ شناخت کو کھو بیٹھے ہیں۔ عقل آنکھ اور کان ان کے پاس ہیں لیکن سمجھنے، دیکھنے اور سننے کی قوت ان میں نہیں رہی کیونکہ ان کے برے اعمال، ان کے عناد اور ہٹ دھرمی ان کی شناخت کی قوت کے سامنے پردہ بن گئے ہیں۔

یہ مسلم ہے کہ جب تک انسان اس مرحلے تک پہنچے، کتنا ہی گمراہ کیوں نہ ہو قابلِ ہدایت ہوتا ہے لیکن جب وہ اعمال بد کی وجہ سے حسِ تشخیص ہی کھو بیٹھتا ہے تو پھر اس کے لئے راہِ نجات نہیں ہے کیونکہ اس کے پاس پہچان کی قوت ہی نہیں لہٰذا یقینی طور پر عذابِ عظیم اس کے انتظار میں ہے۔

چند اہم نکات

(1) کیا تشخیص کی قدرت کا چھن جانا دلیل جبر نہیں؟

گذشتہ آیت کے مطابق اگر خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے تو پھر وہ مجبور ہیں کہ کفر پر باقی رہ جائیں تو کیا یہ جبر نہیں؟

اس سوال کا جواب خود قرآن نے یہاں اور دوسری آیات میں دیا ہے اور وہ یہ کہ حق کے مقابلے میں ان لوگوں کا اصرار اور

ہٹ دھرمی، ان کی طرف سے ظلم وستم اور کفر کا استمرار ودوام ان کی حسِ شناخت پر پردہ پڑ جانے کے باعث بنتا ہے درحقیقت یہ حالت انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ اور عکس العمل ہے۔

(2) دلوں پر مہر لگانا

زیرِ بحث اور دیگر بہت سی آیاتِ قرآن مجید میں بعض اشخاص سے حسِ تمیز اور ادراکِ واقعی کے چھن جانے کو "ختم" سے تعبیر کیا گیا ہے اور بعض اوقات "طَبْع" یا "رَیْن" قرار دیا گیا ہے۔ یہ معنی یہاں سے لئے گئے کہ لوگوں میں رسم تھی کہ وہ جب کچھ چیزیں تھیلوں یا مخصوص برتنوں میں رکھتے یا کسی اہم خط کو کسی لفافے میں رکھتے تو اس بناء پر کہ کوئی اسے کھولے نہیں اور اسے ہاتھ نہ لگائے اسے باندھ دیتے اور گرہ لگا دیتے پھر گرہ کے اوپر مہر لگا دیتے تھے۔ آج کل بھی ڈاک کے تھیلوں پر مہر کا طریقہ رائج ہے۔

عربی زبان میں اس مفہوم کی ادائیگی کے لئے لفظ "ختم" استعمال کیا جاتا ہے۔ البتہ یہ تعبیر صرف ان اشخاص کے لئے ہے جو بے ایمان اور ہٹ دھرم ہیں جو کثرتِ گناہ کے باعث عوامل ہدایت کا اثر قبول نہیں کرتے اور اہلِ حق کے مقابلے میں ان کے دلوں میں بغض وعناد اتنا راسخ ہوتا ہے کہ گویا اس تھیلے کی طرح ان پر مہر لگ چکی ہے اور اب ان میں کسی قسم کا تصرف نہیں ہو سکتا۔

"طبع" بھی لغت میں اسی معنی کے لئے آیا ہے لیکن "رین" کا معنی ہے وہ زنگ، غبار یا سخت قسم کی مٹی جو قیمتی چیزوں سے چپک جاتی ہے یہ تعبیر بھی قرآن میں ان اشخاص کے لئے آئی ہے جو کثرتِ گناہ کی وجہ سے اس عالم کو پہنچ چکے ہیں کہ ان کے دل نفوذ حق کے قابل نہیں رہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے۔

"كَلَّا بَلْ سكتة رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ" (ایسا ہر گز نہیں بلکہ جرائم پیشہ ہونے اور مسلسل برے اعمال کرتے رہنے کی وجہ سے ان کے دل زنگ آلود ہو گئے ہیں)۔ مطففین ۔۱۴

یہاں یہ بات اہم ہے کہ انسان ہمیشہ متوجہ رہے اگر خدانخواستہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو بہت جلد اسے توبہ کے پانی اور نیک عمل سے دھوڈالنا چاہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دل زنگ کی شکل اختیار کر جائے اور اس پر مہر لگا دے۔

(3) قرآن میں قلب سے کیا مراد ہے؟

قرآن مجید میں ادراک حقائق کی نسبت دل کی طرف کیوں دی گئی ہے جب کہ یہ بات واضح ہے کہ دل ادراکات کا مرکز نہیں وہ بدن میں گردش خون کا ایک آلہ ہے۔

لفظ قلب قرآن میں کئی معانی کے لئے استعمال ہوا ہے جن میں سے بعض یہ ہیں:

(1) ادراک وعقل .... جیسا کہ سورہ ق، آیت ۳۷ میں ہے: "اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ"

ان مطالب میں تذکر ویاددہانی ان لوگوں کے لئے ہے جو عقل وادراک کی قوت رکھتے ہیں۔

(2) روح وجان .... جیسا کہ سورہ احزاب، آیت ۱۰ میں ہے: جب آنکھیں دھنس گئیں اور مارے دہشت کے روح و جان لبوں تک آ پہنچی۔ "وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ"

(3) مرکز عواطف و مہربانی ....سورہ انفال، آیت ۱۲ میں ہے: ''بہت جلد کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے''۔اس کی توضیح یہ ہے کہ انسانی وجود میں دو قوی مرکز ہیں جو یہ ہیں:

(الف) مرکز ادراک ....جو مغز اور کارخانۂ اعصاب ہے۔

(ب) مرکز عواطف ....جس سے مراد وہی چلغوزہ نما دل ہے جو سینے کے بائیں حصے میں ہے اور عاطفی مسائل (مہربانی ورحم) پہلے پہل اسی مرکز پر اثر انداز ہوتے ہیں اور پہلی چنگاری دل سے شروع ہوتی ہے۔

ہم وجدانی طور پر جب کسی مصیبت سے دوچار ہوتے ہیں تو اس کا بوجھ اسی دل پر محسوس کرتے ہیں۔اسی طرح جب کسی سرور انگیز اور مسرت آراء امر کا سامنا کرتے ہیں تو اسی مرکز میں فرحت وانبساط کا احساس کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اگر قرآن میں عاطفی مسائل کو اسی دل کی طرف اور مسائل عقلی کو قلب بمعنی عقل یا مغز کی نسبت دی گئی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے جو بیان کی گئی ہے اور یہ کوئی بے قاعدہ بات نہیں ہے۔

(۸) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿وقف لازم﴾	کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا اور روزِ آخرت پر ایمان لے آئے ہیں حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں
(۹) يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَ مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ؕ	وہ چاہتے ہیں کہ خدا اور مومنین کو دھوکا دیں مگر وہ اسطرح اپنے سوا کسی کو فریب نہیں دیتے لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے

تفسیر

تیسرا گروہ منافقین کا ہے

تاریخ کے ایک خاص موڑ پر اسلام کو ایسے گروہ کا سامنا کرنا پڑا جو ایمان لانے کے لئے جذبہ وخلوص رکھتے تھے نہ صریح مخالفت کی جرأت کرتے تھے۔قرآن اس گروہ کو ''منافقین'' کے نام سے یاد کرتا ہے۔فارسی میں دورو یا دو چہرہ کہتے ہیں۔یہ لوگ حقیقی مسلمانوں کی صفوں میں داخل ہو چکے تھے۔یہ لوگ اسلام اور مسلمانوں کے لئے بہت بڑا خطرہ شمار ہوتے تھے۔چونکہ ان کا ظاہر اسلامی تھا لہٰذا ان کی شناخت مشکل تھی لیکن قرآن ان کی باریک اور زندہ علامات بیان کرتا ہے تاکہ ان کی باطنی کیفیت کو مشخص کر دے۔اس سلسلے میں قرآن ہر زمانے اور قرن کے مسلمانوں کو ایک نمونہ دے رہا ہے۔

آیت آٹھ (۸) میں نفاق کی تفسیر بیان کرنے کے بعد آیت نو (۹) میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے اس عمل کو ایک قسم کی چالاکی اور عمدہ تکنیک سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنے اس عمل سے خدا اور مومنین کو دھوکہ دیں'' حالانکہ وہ صرف اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں''۔

(۱۰) فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۙ۬ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ	ان کے دلوں میں ایک طرح کی بیماری ہے اور خدا کی طرف سے اس بیماری کو بڑھا دیا جاتا ہے اور ان کی کذب بیانیوں کی وجہ سے دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔
(۱۱) وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ ۙ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ	جب ان سے کہا جائے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔
(۱۲) اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَ لٰكِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ	آگاہ رہو یہ سب مفسدین ہیں لیکن اپنے آپ کو مفسد نہیں سمجھتے۔
(۱۳) وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَ لٰكِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ	اور جب ان سے کہا جائے کہ دوسرے لوگوں کی طرح ایمان لے آؤ تو کہتے ہیں کیا ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں جان لو کہ یہی لوگ بے وقوف ہیں لیکن جانتے نہیں۔
(۱۴) وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ	اور جب ایماندار لوگوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لا چکے ہیں لیکن جب اپنے شیطانوں سے تنہائی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو تمہارے ساتھ ہیں (ان سے تو) ہم تمسخر کرتے ہیں۔
(۱۵) اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ یَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ	خداوند عالم ان سے استہزاء کرتا ہے اور انہیں ان کی سرکشی میں رکھے ہوئے ہے تاکہ وہ سرگرداں رہیں۔
(۱۶) اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی ۪ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ	یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی مول لی ہے حالانکہ یہ تجارت ان کے لئے نفع مند نہیں ہے اور نہ ہی وہ ہدایت یافتہ ہیں۔

تفسیر

زیرنظر پہلی آیت میں قرآن اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ نفاق درحقیقت ایک قسم کی بیماری ہے نظام آفرینش میں جو شخص کسی راستے پر چلتا ہے اور اس کے لئے زادِ راہ فراہم کئے رکھتا ہے تو وہ یقیناً اس راستے پر آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اور چونکہ منافقین کا

اصل سرمایہ جھوٹ ہے لہٰذا ان کی زندگی میں تناقضات رونما ہوتے ہیں وہ ان کی توجیہہ کرتے رہتے ہیں۔ آیت کے آخر میں بتایا گیا ہے: ان کی ان دروغ گوئیوں کی وجہ سے ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

(۱۱) اس آیت میں ان کی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن میں پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اصلاح طلبی کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ حقیقی فسادی وہی ہیں۔

(۱۲) اس آیت میں قرآن کہتا ہے: جان لو کہ یہ سب مفسد ہیں بلکہ ان کا نفاق پر اصرار، ہٹ دھرمی اور اس باعث ننگ و عار کام کی عادت کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ رفتہ رفتہ وہ گمان کرنے لگے ہیں کہ یہی ان کا پروگرام، تربیت اور اصلاح کے لئے مفید ہے۔

(۱۳) ایسے لوگوں کی دوسری نشانی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو عاقل وہشیار اور مومنین کو بیوقوف، سادہ لوح اور جلد دھوکا کھانے والے سمجھتے ہیں۔ اس طرح وہ ان کے پاک دل، حق طلب اور حقیقت کے متلاشی افراد کو حماقت و بیوقوفی سے متہم کرتے ہیں جو دعوتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی تعلیمات میں آثار حقانیت کا مشاہدہ کر کے سر تسلیم خم کر چکے ہیں۔ قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے:

''جان لو کہ واقعی بیوقوف یہی لوگ ہیں لیکن وہ جانتے نہیں''

کیا یہ بیوقوفی نہیں کہ انسان اپنی زندگی کے مقصد کا تعین نہ کر سکے اور ہر گروہ میں اس گروہ کا رنگ اختیار کر کے داخل ہو اور یکسانیت و شخصی وحدت کی بجائے دوگانگی یا کئی ایک بہروپ قبول کر کے اپنی استعداد اور قوت کو شیطنت، سازش اور تخریب کاری کی راہ میں صرف کرے اور اس کے باوجود اپنے آپ کو عقلمند سمجھے۔

(۱۴) ان کی تیسری نشانی یہ ہے کہ ہر روز کسی نئے رنگ میں نکلتے ہیں اور ہر گروہ کے ساتھ ہم صدا ہوتے ہیں۔ اہل ایمان کے ساتھ ملاقات کرتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایک ہی مکتب کے پیروکار ہیں اور دل وجان سے اسلام قبول کر چکے ہیں اور تمہیں غیر نہیں سمجھتے۔

لیکن جب اپنے شیطان صفت دوستوں سے خلوت میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہمارے دوست، ہمارے محرم راز اور ہمارا سب کچھ تو آپ ہی لوگ ہیں۔

(۱۵) اس کے بعد قرآن ایک سخت اور دوٹوک لب ولہجہ کے ساتھ کہتا ہے: خدا ان کو اس تمسخر کی سزا دے گا اور وہ اپنے نفاق اور طغیان وسرکشی کی وجہ سے کاملاً سرگرداں رہیں گے۔

(۱۶) ان کی آخری سرنوشت کو جو بہت غم انگیز اور تاریک ہے بیان کرتی ہے وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اس تجارتی کارخانۂ عالم میں ہدایت کے بدلے گمراہی کو خرید لیا ہے اسی وجہ سے ان کی تجارت نفع مند نہیں بلکہ سرمایہ بھی ہاتھ سے دے بیٹھے۔

معنی نفاق کی وسعت

اگرچہ نفاق اپنے خاص مفہوم کے لحاظ سے ان بے ایمان لوگوں کے لئے ہے جو ظاہراً مسلمانوں کی صف میں داخل ہوں لیکن باطنی طور پر کفر کے دلدادہ ہوں لیکن نفاق کا ایک وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کے ظاہر و باطن اور گفتار و کردار کے تضاد پر محیط ہے چاہے یہ چیز مومن افراد میں پائی جائے۔

مثلاً حدیث میں ہے:

''تین صفات ایسی ہیں کہ جس شخص میں پائی جائیں وہ منافق ہے چاہے وہ روزے رکھے، نماز پڑھے اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھے (اور وہ صفات یہ ہیں) جب امانت رکھی جائے تو وہ خیانت کرتا ہے، بات کرتے وقت جھوٹ بولتا ہے اور وعدے کی خلاف ورزی کرتا ہے'' (سفینۃ البحار ج۲ ص ۶۰۵)

مسلم ہے کہ ایسے اشخاص اس خاص معنی کے لحاظ سے منافق نہیں تاہم نفاق کی جڑیں ان میں پائی جاتی ہیں۔ خصوصاً ریاکاروں کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے:

''ریا کاری و دکھاوا ایسا (تلخ) درخت ہے جس کا پھل شرکِ خفی کے علاوہ کچھ نہیں اور اس کی اصل جڑ نفاق ہے'' (سفینۃ البحار ج امادہ رئی)

زیرِ نظر آیت وجدان کو دھوکا دینے کی طرف واضح اشارہ ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ گمراہ اور گناہ سے آلودہ انسان، برے اور غلط اعمال کے مقابلے میں وجدان کی سزا و سرزنش سے بچنے کے لئے اسے دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے اور آہستہ آہستہ اپنے تئیں مطمئن کر لیتا ہے کہ نہ صرف اس کا عمل برا اور قبیح نہیں بلکہ باعث اصلاح ہے اور فساد کے ساتھ مقابلہ ہے۔ یہ اس لئے کہ وجدان کو دھوکا دے کر اطمینان سے غلط کام کو جاری رکھ سکے۔

(۱۷) مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَ تَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ	وہ (منافقین) اس شخص کی مثل ہیں جس نے آگ روشن کی (تا کہ تاریک بیابان میں اسے راستہ مل جائے) مگر جب آگ سے سب اطراف روشن ہو گئیں تو خداوند عالم نے (طوفان بھیج کر) اسے خاموش کر دیا اور ایسی وحشت ناک تاریکی مسلط کی جس میں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔
(۱۸) صُمٌّ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۙ	وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں لہٰذا خطا کاری کے راستے سے پلٹیں گے نہیں۔
(۱۹) اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِىْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَ اللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ	یا پھر ان کی مثال ایسی ہے کہ بارش شبِ تاریک میں گھن گرج، چمک اور بجلیوں کے ساتھ (رہگذاروں کے سروں پر) برس رہی ہو اور وہ موت کے خوف سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں تا کہ بجلی کی آواز سے بچیں اور یہ سب کافر خدا کے احاطۂ قدرت میں ہیں۔

(۲۰) يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَ اِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۧ	قریب ہے کہ بجلی کی خیرہ کرنے والی روشنی آنکھوں کو چندھیا دے۔ جب بھی بجلی چمکتی ہے اور (صفحۂ بیابان کو) ان کے لئے روشن کر دیتی ہے تو وہ (چند گام) چل پڑتے ہیں اور جب خاموش ہو جاتی ہے تو رک جاتے ہیں اور اگر خدا چاہے تو ان کے کان اور آنکھیں تلف کر دے (کیونکہ) یقیناً ہر چیز خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

تفسیر

منافقین کے حالات واضح کرنے کے لئے دو مثالیں

پہلی مثال میں ہے کہ وہ اس شخص کی مانند ہیں جس نے سخت تاریک رات میں آگ روشن کی ہو تا کہ اس کی روشنی میں سیدھے اور ٹیڑھے راستے کی پہچان کر سکے اور منزل مقصود تک پہنچ سکے۔ مگر جب آگ کے شعلوں نے گرد و پیش کو روشن کر دیا تو خدا وند عالم نے اسے بجھا دیا اور انہیں تاریکیوں میں چھوڑ دیا اس عالم میں کہ وہ کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس تھوڑی سی آگ اور اس کی روشنی سے تاریکیوں کے ساتھ برسر پیکار رہ سکیں گے مگر اچانک آندھی اٹھی یا سخت بارش برسی یا ایندھن ختم ہو گیا اور آگ سردی اور خاموشی میں بدل گئی یوں وہ دوبارہ وحشت ناک تاریکی میں سرگرداں ہو گئے۔

(۱۸) اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں اور چونکہ ادراک حقائق کا کوئی وسیلہ ان کے پاس نہیں رہا لہٰذا وہ اپنے راستے سے پلٹیں گے نہیں۔

بہر حال یہ تشبیہ درحقیقت نفاق کے سلسلے میں ایک واقعیت کو واضح کرتی ہے اور وہ یہ کہ نفاق دو رخی طویل مدت کے لئے مؤثر نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک شعلۂ ضعیف کی طرح ہے جو بیابانِ تاریک اور ظلماتی طوفانوں کی زد میں ہے۔ زیادہ دیر نہیں لگتی کہ ان کا حقیقی چہرہ آشکار ہو جاتا ہے۔

(۱۹) **دوسری مثال** میں قرآن مجید ان کی زندگی کو ایک دوسری شکل میں پیش کرتا ہے:

تاریک و سیاہ و پر خطر رات ہے جس میں شدید بارش ہو رہی ہے۔ افق کے کناروں سے پرنور بجلی چمکتی ہے۔ بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک اتنی وحشتناک اور مہیب ہے کہ کانوں کے پردے چاک کئے دیتی ہے۔ وہ انسان جس کی کوئی پناہ گاہ نہیں وسیع و تاریک اور خطرناک دشت و بیابان کے وسط میں حیران و سرگرداں کھڑا ہے۔ موسلا دھار بارش نے اس کی پشت کو تر کر دیا ہے نہ کوئی جائے امان ہے اور نہ تاریکی چھٹتی ہے کہ قدم اٹھائے۔

مختصر سی عبارت میں قرآن ایسے مسافر کی نقشہ کشی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ منافقین کی حالت یا ایسی ہے کہ جیسے تاریک رات میں سخت بارش گرج چمک اور بجلیوں کے ساتھ (رہگذاروں کے سروں پر) برس رہی ہو۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ وہ اپنے کانوں

میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں تا کہ وحشت ناک بجلیوں کی آواز نہ سنیں۔

اور آخر میں فرماتا ہے: خداوند عالم کی قدرت کافروں پر محیط ہے وہ جہاں جائیں اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

(۲۰) پھر اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ پے در پے بجلیاں صفحۂ آسمان پر کوندتی ہیں۔بجلیوں کی روشنی آنکھوں کو یوں خیرہ کئے دیتی ہے کہ قریب ہے کہ آنکھوں کو اُچک لے۔

جب بجلی چمکتی ہے اور صفحۂ بیابان روشن ہو جاتا ہے تو مسافر چند قدم چل لیتے ہیں لیکن فوراً تاریکی ان پر مسلط ہو جاتی اور وہ اپنی جگہ پر رک جاتے ہیں۔وہ ہر لحظہ خطرہ محسوس کرتے ہیں کیونکہ اس وسط بیابان میں کوئی پہاڑ دکھائی دیتا ہے نہ درخت نظر آتا ہے جو رعد اور برق وصاعقہ کے خطرے کو روک سکے۔ ہر وقت یہ خطرہ ہے کہ بجلی ان پر گرے اور وہ فوراً خاکستر ہو جائیں۔

یہ خطرہ بھی ہے کہ بادلوں کی گرج ان کے کانوں کے پردے پھاڑ دے اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی بجلی بصارت چھین لے جائے اور ہاں خدا چاہے تو ان کے کان اور آنکھ ختم کر دے کیونکہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

افسوس کہ انہوں نے قابل اطمینان پناہ گاہ،ایمان سے پناہ نہیں لی تا کہ عذاب الٰہی کی فنا کر دینے والی بجلیوں سے نجات پا سکیں۔

ہر معاشرہ میں منافقین کی پہچان

اگر چہ ان آیات کی شان نزول زمانۂ پیغمبر ﷺ کے منافقین سے متعلق ہے لیکن چونکہ منافقین ہر عہد کے سچے اور حقیقی انقلابوں کے مقابلے میں موجود رہتے ہیں اس لئے ہر عصر وقرن کے منافقین کے لئے یہ آیات وسعت رکھتی ہیں۔ہم اپنی آنکھوں سے ایک ایک کر کے یہ تمام نشانیاں سر مو فرق کے بغیر اپنے زمانے کے منافقین میں دیکھ رہے ہیں۔ان کی سرگردانی ان کا اضطراب غرضیکہ ان کی بیچارگی، بدبختی اور رسوائی بالکل اس مسافر کی طرح نظر آتی ہے جس کی قرآن نے نہایت وضاحت اور خوبصورتی سے تصویر کشی کی ہے۔

(۲۱)یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ وَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ۙ	اے لوگو! اپنے پروردگار کی پرستش وعبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔اور اللہ کے لئے شریک قرار نہ دو اور تم جانتے ہی ہو۔

تفسیر

ایسے خدا کی عبادت کرو

ان تین گروہوں ''پرہیزگار، کفار اور منافقین'' کی حالت بیان کرنے کے بعد سعادت ونجات کی راہ جو پہلے گروہ کے لئے ہے واضح طور پر مشخص کرتے ہوئے فرماتا ہے:۔اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا ہے تا کہ پرہیزگار بن جاؤ۔

یاایھالناس کا خطاب

:اس کا مطلب ہے ''اے لوگو''۔اس خطاب کا قرآن میں تقریباً بیس (۲۰) مرتبہ تکرار ہے یہ جامع اور عمومی خطاب ہے جو نشاندہی کرتا ہے کہ قرآن کسی قبیلے یا گروہ سے مخصوص نہیں بلکہ اس کی دعوت عام ہے اور یہ سب کو ایک یگانہ خدا کی عبادت کی دعوت دیتا ہے اور ہر قسم کے شرک اور راہِ توحید سے انحراف کا مقابلہ کرتا ہے۔

(۲۲) الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّکُمۡ ۚ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا وَّ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ	وہ ذات جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان (فضائے زمین) کو تمہارے سروں پر چھت کی طرح قائم کیا ،آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے میوہ جات کی پرورش کی تا کہ وہ تمہاری روزی بن جائیں جیسا کہ تم جانتے ہو۔۔

تفسیر

نعمت آسمان وزمین

اس آیت میں خدا کی بعض نعمتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ہمارے لئے شکر گزاری کا سبب بن سکتی ہیں۔

پہلے زمین کی پیدائش کے بارے میں گفتگو ہے ارشاد ہوتا ہے ''وہی خدا جس نے زمین کو تمہارے لئے آرام دہ بچھونا قرار دیا''۔ یہ رہوار جس نے تمہیں اپنی پشت پر سوار کر رکھا ہے اس فضا میں بڑی تیزی کے ساتھ اپنی مختلف حرکات جاری رکھے ہوئے ہے جبکہ اس سے تمہارے وجود میں کوئی حرکت ولرزش پیدا نہیں ہوتی۔ یہ اس کی عظیم نعمتوں میں سے ایک ہے اس زمین کی کشش ثقل کی وجہ سے تمہیں حرکت اور استراحت، گھر اور آشیانہ، باغ اور کھیتی اور قسم قسم کے وسائل زندگی میسر ہیں۔کبھی آپ نے غور کیا کہ زمین کی کشش ثقل بھی ایک نعمت ہے اگر یہ نہ ہوتو چشم زدن میں ہم سب اور ہماری زندگی کے سب وسائل زمین کی دورانی حرکت کے نتیجے میں فضا میں جا پڑیں اور سرگرداں پھرتے رہیں۔

پھر نعمت آسمان کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

آسمان کو تمہارے سروں پر چھت جیسا بنایا ہے۔

لفظ ''السماء'' کہ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے وہ وہی فضائے زمین ہے یعنی ہوائے متراکم کا چھلکا اور چمڑا جس نے ہر طرف سے کرۂ زمین کو چھپایا ہوا ہے اور علماء ودانشوروں کے نظریے کے مطابق اس کی ضخامت کئی سو کلومیٹر ہے۔

اگر یہ چھت نہ ہوتی تو زمین ہمیشہ پراگندہ آسمانی پتھروں کی بارش کی زد میں رہتی اور عملی طور پر لوگوں سے راحت واطمینان

چھن جاتا۔اس کے بعد بارش کی نعمت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:''اور آسمان سے پانی نازل کیا''۔

کیسا پانی۔۔جو حیات بخش،تمام آبادیوں کا سبب اور تمام مادی نعمتوں کا جامع ہے۔

اس کے بعد قرآن بارش کی برکت سے پیدا ہونے والے قسم قسم کے پھلوں اور ان کی روزیوں کی طرف جو انسانوں کا نصیب ہیں۔اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے''خداوند عالم نے بارش کے سبب میوہ جات کو تمہاری روزی کے عنوان سے زمین سے نکالا۔

یہ خدائی پروگرام ایک طرف خدا کی وسیع و پھیلی ہوئی رحمت کو جو اس کے بندوں پر ہے مشخص کرتا ہے اور دوسری طرف اس کی قدرت کو بیان کرتا ہے۔اس نے کس طرح بے رنگ پانی سے ہزاروں رنگوں کے میوے جو انسانی غذا کے لئے مختلف خصوصیات کے حامل ہیں اور اسی طرح دوسرے جاندار پیدا کیے جو اس کے وجود کے زندہ ترین دلائل میں سے ہیں لہٰذا بلا فاصلہ مزید یہ کہتا ہے ''جب ایسا ہی ہے تو پھر خدا کے شریک نہ بناؤ، جب کہ تمہیں معلوم ہے۔

''انداد'' جمع ہے ''ند'' وہ چیز جو گوہر ذات میں کسی دوسری چیز کی شریک اور شبیہ ہو۔

بت پرستی مختلف شکلوں میں

کلیہ و قاعدہ یہ ہے کہ زندگی میں جس چیز کو بھی خدا کے ساتھ ساتھ مؤثر سمجھا جائے.....وہ ایک قسم کا شرک ہے۔

اس موقع پر ابن عباس کی ایک عجیب تعبیر ہے وہ کہتے ہیں:

''وہی شرک ہے جو کبھی تاریک رات میں سیاہ پتھر پر چیونٹی کی حرکت سے زیادہ مخفی ہوتا ہے۔انسان کا یہ کہنا کہ خدا کی قسم اور تیری جان کی قسم، یا خدا کی قسم اور مجھے میری جان کی قسم (یعنی خدا اور دوست کی جان یا خدا اور اپنی جان کو ایک لائن میں قرار دینا) یا یوں کہنا کہ اگر یہ کتیا کل رات نہ ہوتی تو چور آ گئے تھے (لہٰذا چوروں سے نجات دلانے والی یہ کتیا ہے) یا پھر اپنے دوست سے کہے کہ جو کچھ خدا چاہے اور تم پسند کرو..........ان سب میں شرک کی بو ہے۔ (فی ظلال سید قطب، جلد اول، صفحہ ۵۳)

عام لوگ روزانہ ایسی بہت سی باتیں کرتے رہتے ہیں مثلاً ''پہلے خدا پھر تم'' باور کیجئے ایک کامل مؤحد انسان کے لئے یہ تعبیرات بھی مناسب نہیں ہیں۔

(۲۳) وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّنۡ مِّثۡلِہٖ ۪ وَادۡعُوۡا شُھَدَآءَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ	اگر تمہیں اس چیز کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے (پیغمبر) پر نازل کی ہے کوئی شک و شبہ ہے تو (کم از کم) ایک سورہ اس کی مثل لے آؤ اور خدا کو چھوڑ کر اپنے گواہوں کو بھی اس کام کی دعوت دو، اگر تم سچے ہو۔

(۲۴)فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَ لَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَ الۡحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ	اگر یہ کام تم نے نہ کیا اور کبھی نہ کرسکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسانوں کے بدن اور پتھر ہیں یہ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

تفسیر

قرآن ہمیشہ رہنے والا معجزہ ہے

چونکہ کفر و نفاق کبھی نبوت اور اعجاز پیغمبر کے عدمِ ادراک کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔لہٰذا زیر بحث آیت میں خصوصیت کے ساتھ انگشت قرآن پر رکھ دی گئی ہے جو ہمیشہ رہنے والا معجزہ ہے۔

قرآن کہتا ہے:''اگر تمہیں اس چیز کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے کوئی شک وشبہ ہے تو ایک سورت ہی اس جیسی لے آؤ''۔

(۲۴) زیرِ نظر دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:''اگر تم اس کام کو انجام نہ دے سکے اور ہرگز نہ دے سکو گے لہٰذا اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن بے ایمان آدمیوں کے بدن اور پتھر ہیں۔یعنی آگ ابھی سے کافروں کے لئے تیار ہے اور اس میں تاخیر نہ ہو گی۔

''وقود'' کے معنی ہیں وہ چیز جسے آگ پکڑ لے یعنی وہ مادہ جو جلنے کے قابل ہے جیسے لکڑیاں۔

حجارہ سے کیا مراد ہے؟

گذشتہ آیات کے پیش نظر جو بات زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ جہنم کی آگ خود انسانوں اور پتھروں کے اندر سے نکلے گی اور یہ حقیقت آج ثابت ہوچکی ہے کہ جسموں کے اندر ایک عظیم آگ چھپی ہوئی ہے (دوسرے لفظوں میں ایسی قوتیں موجود ہیں جو آگ میں تبدیل ہوسکتی ہیں) یہ مفہوم سمجھنا مشکل نہیں۔

سورہ ہمزہ آیت ۶،۷ میں ہے:''نَارُ اللّٰہِ الۡمُوۡقَدَةُ ۙ الَّتِیۡ تَطَّلِعُ عَلَی الۡاَفۡـِٕدَةِ''

خدا کی جلانے والی آگ جس کا سرچشمہ دل ہیں اور جو اندر سے باہر کی طرف سرایت کرتی ہے (اس جہان کی آگ کے بر عکس جو باہر سے اندر تک پہنچتی ہے)۔

انبیاء معجزے کے لئے کیوں نیاز مند ہیں؟

انبیاء کے لئے معجزے کی ضرورت: جیسا کہ لفظ معجزہ سے واضح ہے نبی خارق العادة اعمال (وہ کام جو عموماً نہ ہوئے ہوں) انجام دینے کی قدرت رکھتا ہو، جن کی انجام دہی سے دوسرے لوگ عاجز ہوں۔

نبی جو صاحب معجزہ ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کو مقابلہ بمثل کی دعوت دے (یعنی کہے کہ ایسا کام تم بھی کر دکھاؤ) اور وہ اپنی گفتار کی سچائی کی علامت ونشانی کو اپنا معجزہ قرار دے تا کہ اگر دوسرے بھی ویسا کام کر سکتے ہیں تو بجالائیں اس کام کو اصطلاح میں تحدّی (چیلنج) کہتے ہیں۔

جو معجزات اور خارق عادات پیغمبر اسلام ﷺ سے صادر ہوئے قرآن ان میں سے آپ ﷺ کی حقانیت کی بلند ترین اور زندہ سند ہے۔اس کی علت یہ ہے: قرآن ایک بولنے والا ابدی، عالمگیر اور روحانی معجزہ ہے۔

گذشتہ انبیاء کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے معجزات کے ساتھ ہوں اور ان کے اعجاز کو ثابت کرنے کے لئے مخالفین کو مقابلہ بمثل کی دعوت دیں۔ درحقیقت ان کے معجزات کی اپنی کوئی زبان نہ تھی بلکہ انبیاء کی گفتار ان کی تکمیل کرتی تھی۔ یہی بات قرآن کے علاوہ پیغمبر اسلام کے دیگر معجزات پر بھی صادق آتی ہے۔

لیکن قرآن ایک بولنے والا معجزہ ہے وہ تعارف کرانے والے کا محتاج نہیں، وہ خود اپنی دعوت دیتا ہے اور مخالفین کو مقابلے کے لئے پکارتا ہے، انہیں مغلوب کرتا ہے اور خود میدانِ مقابلہ سے کامیابی کے ساتھ نکلتا ہے لہٰذا وفات حضرت نبی اکرم ﷺ کو کئی صدیاں بیت گئیں مگر قرآن آپ ﷺ کے زمانہ حیات کی طرح آج بھی اپنا دعویٰ پیش کر رہا ہے۔قرآن خود دین بھی ہے اور معجزہ بھی، قانون بھی ہے اور سندِ قانون بھی۔قرآن، زمان ومکان کی سرحد سے مافوق ہے۔

قرآن جاودانی ہے اور جہانی بھی

قرآن کسی خاص زمان ومکان سے وابستہ نہیں۔ یہ جس طرح اور جس حالت میں چودہ سو سال قبل حجاز کے تاریک ماحول میں جلوہ گر تھا اسی طرح آج بھی ہم پر ضوفشاں ہے بلکہ رفتار زمانہ اور علم ودانش کی پیش رفت کی وجہ سے ہم میں اس کی استداد بڑھ گئی ہے کہ دور حاضر کے لوگوں کے لئے اس سے زیادہ استفادہ کرسکیں۔ یہ واضح ہے کہ جس پر اپنے زمان ومکان کا رنگ نہ ہو وہ بعد تک اور سارے جہان تک رسائی حاصل کر سکے گا اور یہ بھی واضح ہے کہ ایک عالمی دین کے لئے ضروری ہے کہ وہ عالمی وابدی سند حقانیت رکھتا ہو۔

قرآن کے روحانی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ گذشتہ انبیاء سے جو خارق عادت اموران کی گفتار کے سچے گواہ کے طور پر دیکھنے میں نظر آتے تھے وہ عموماً جسمانی پہلو رکھتے تھے۔ نا قابل علاج بیماروں کو شفا دینا، مردوں کو زندہ کرنا، نوزائیدہ بچے کا گہوارے میں باتیں کرنا وغیرہ سب جسمانی پہلو رکھتے تھے اور انسان کی آنکھ اور کان کو مسخر کرتے تھے لیکن قرآنی الفاظ جوانہی عام حروف وکلمات سے مرکب ہیں انسان کے دل و جان کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں، انسان کی روح انہیں عجیب وغریب سمجھتے ہوئے ان کے لئے احساساتِ تحسین سے معمور ہو جاتی ہے اور افکار وعقول ان کی تعظیم پر مجبور نظر آتی ہیں۔ یہ ایک ایسا معجزہ ہے جو صرف انسانی اذہان، افکار اور ارواح سے سروکار رکھتا ہے۔ جسمانی معجزات پر ایسے معجزے کی برتری کسی وضاحت کی محتاج نہیں۔

(۲۵) وَ بَشِّرِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِھَا الۡاَنۡھٰرُ ؕ کُلَّمَا رُزِقُوۡا مِنۡھَا مِنۡ ثَمَرَۃٍ رِّزۡقًا ۙ قَالُوۡا ھٰذَا الَّذِیۡ رُزِقۡنَا مِنۡ قَبۡلُ ۙ وَ اُتُوۡا بِہٖ مُتَشَابِھًا ؕ وَ لَھُمۡ فِیۡھَاۤ اَزۡوَاجٌ مُّطَھَّرَۃٌ ٭ۙ وَّ ھُمۡ فِیۡھَا خٰلِدُوۡنَ	ایمان لانے والوں اور نیک عمل بجا لانے والوں کو خوشخبری دیجئے کہ ان کے لئے بہشت کے باغات ہیں جہاں درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ جب انہیں ان میں سے پھل دیا جائے گا تو کہیں گے یہ وہی ہے جو پہلے بھی ہمیں دیا گیا تھا (لیکن یہ اس سے کس قدر بہتر ہے) اور جو پھل ان کو پیش کئے جائیں گے (خوبی و زیبائی میں) یکساں ہیں اور ان کے لئے اس میں پاکیزہ بیویاں ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

تفسیر

بہشت کی نعمات کی خصوصیات

چونکہ گذشتہ بحث کی آخری آیت میں کفار اور منکرین قرآن کو دردناک عذاب کی تہدید کی گئی ہے لہٰذا زیرِ نظر آیت میں مومنین کی سرنوشت کا تذکرہ ہے۔

پہلے کہتا ہے کہ ان افراد کو جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے اعمالِ صالح انجام دیئے ہیں بشارت دے دو کہ ان کے لئے بہشت کے باغ ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ وہ باغات جہاں ہمیشہ پانی نہیں ہوتا بلکہ باہر سے پانی لا کر انہیں سیراب کیا جاتا ہے ان میں زیادہ طراوت نہیں ہوتی۔ تر و تازگی تو اس باغ میں ہوتی ہے جس کے لئے پانی کا اپنا انتظام ہو اور وہ پانی کبھی اس سے منقطع نہ ہوتا ہو، ایسے باغ کو خشک سالی اور پانی کی کمی کا خطرہ نہیں ہوتا اور بہشت کے باغات اسی طرح کے ہیں۔

اس کے بعد ان باغوں کے گوناگوں پھلوں کے بارے میں کہتا ہے: جب ان باغوں کے پھل انہیں دیئے جائیں گے تو کہیں گے یہ وہی ہے جو پہلے بھی ہمیں دیا گیا ہے۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے ان کے لئے ایسے پھل پیش کئے جائیں گے جو ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہوں گے۔ یعنی وہ سب خوبی و زیبائی میں ایک جیسے ہوں گے وہ ایسے اعلیٰ درجے کے ہوں گے کہ انہیں ایک دوسرے پر ترجیح نہ دی جا سکے گی۔ لیکن جنت کے باغات کے میوے ایک سے بڑھ کر خوشبودار، اور ایک سے ایک بڑھ کر میٹھا اور ایک سے ایک بڑھ کر جاذب نظر اور زیبا ہوگا۔

اور آخر میں جنت کی جس نعمت کا ذکر کیا گیا ہے وہ پاک و پاکیزہ بیویاں ہیں۔ فرمایا: ان کے لئے جنت میں مطہر و پاک

بیویاں ہیں۔ یہ ان تمام آلائشوں سے پاک ہوں گی جو اس جہان میں ممکن ہے ان میں ہوں۔ گویا روح و دل پر نگاہ کریں تو پاک اور جسم و بدن پر نظر ڈالیں تو پاک۔

اس آیت کے آخر میں فرمایا: مومنین ہمیشہ ہمیشہ ان باغاتِ بہشت میں رہیں گے۔

دو اہم نکات
بہشت کی نعمتوں کے بارے میں

(۱) پاکیزہ بیویاں

یہ امر قابل غور ہے کہ جنت کی بیویوں کی اس آیت میں صرف ایک صفت ''مطھّرۃ'' بیان کی گئی ہے۔ صفت مطہرہ (یعنی پاک و پاکیزہ) کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بیوی کے لئے سب سے پہلی اور اہم ترین شرط پاکیزگی ہے باقی صفات سب اس کے ماتحت ہیں۔

پیغمبر اکرم ﷺ کی ایک مشہور حدیث اس حقیقت کو روشن کرتی ہے آپ ﷺ نے فرمایا:

ایاکم و خضراء الدمن ، قیل : یارسول اللّٰہ و ما خضراء الدمن، قال: المرئة الحسناء فی منبت السوء. (وسائل الشیعہ جلد۱۰ص۱۹)

ان سبزیوں سے پرہیز کرو جو کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر اگیں۔ عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسولؐ! آپ کا مقصد اس سبزی سے کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: خوبصورت عورت جس نے گندے خاندان میں پرورش پائی ہو۔

(۲) جنت کی مادی و معنوی نعمات:

اگرچہ بہت سی آیات قرآنی میں مادی نعمتوں سے متعلق گفتگو ہوئی ہے مثلاً باغات جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں، قصور و محلات، پاکیزہ بیویاں، رنگ برنگ پھل اور میوے اور ہم مزاج دوست وغیرہ مگر ان کے ساتھ ساتھ اہم ترین معنوی نعمات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے جن کی عظمت و رفعت کو ہمارے پیمانوں سے ناپنا ممکن نہیں۔ مثلاً سورہ توبہ آیت ۷۲ میں ہے:

" وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ"

خداوند عالم نے ایماندار مردوں اور عورتوں سے باغاتِ جنت کا وعدہ کیا ہے جن کے درختوں تلے نہریں جاری ہیں وہ ہمیشہ وہیں رہیں گے اور ان کے لئے ان دائمی بہشتوں میں پاکیزہ مکانات ہیں اور اسی طرح پروردگار عالم کی خوشنودی بھی جو ان سب سے بالاتر ہے اور یہ ہے عظیم کامیابی۔ یہاں پر نعمت معنوی و دین خدا کا رضوان اور خوشنودی ہے جو سب سے بالاتر نعمت ہے۔

(۲۶) اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوۡضَۃً فَمَا فَوۡقَہَا ؕ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ ۚ وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَیَقُوۡلُوۡنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰہُ بِہٰذَا مَثَلًا ۘ یُضِلُّ بِہٖ کَثِیۡرًا ۙ وَّ یَہۡدِیۡ بِہٖ کَثِیۡرًا ؕ وَ مَا یُضِلُّ بِہٖۤ اِلَّا الۡفٰسِقِیۡنَ ۙ	خداوندِ عالم مچھر یا اس سے بڑھ کر کوئی مثال دینے میں جھجکتا نہیں۔(اس لئے کہ) جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ ان کے پروردگار کی طرف سے حقیقت ہے لیکن جنھوں نے راہِ کفر اختیار کی (اس موضوع کو بہانہ بنا کر) کہتے ہیں کہ خدا کا مقصد اس مثال سے کیا تھا۔خدا اس سے بہت سے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہت سے لوگوں کو ہدایت کرتا ہے لیکن گمراہ صرف فاسقوں کو کرتا ہے۔

تفسیر

کیا خدا بھی مثال دیتا ہے؟

مندرجہ بالا میں سے پہلی آیت کہتی ہے کہ خداوندِ عالم اس سے نہیں شرماتا کہ وہ اپنی موجودات میں سے جسے چاہے وہ ظاہراً چھوٹی سی ہو جیسے مچھر یا اس سے بھی بڑھ کر کسی چیز کی مثال دے کیونکہ مثال کے لئے ضروری ہے کہ وہ مقصد کے مطابق ہو بالفاظِ دیگر مثال حقیقت کی تصویر کشی کا ذریعہ ہے۔

بعض اوقات کہنے والا مدعیان کی تحقیر اور ان کے کمزور پہلو کو بیان کر رہا ہو تو کسی کمزور چیز کو مثال کے لئے منتخب کرتا ہے مثلاً سورہ حج آیت ۷۳ میں ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ لَنۡ یَّخۡلُقُوۡا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجۡتَمَعُوۡا لَہٗ ؕ وَ اِنۡ یَّسۡلُبۡہُمُ الذُّبَابُ شَیۡئًا لَّا یَسۡتَنۡقِذُوۡہُ مِنۡہُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الۡمَطۡلُوۡبُ

(خدا کو چھوڑ کر جن کی تم عبادت کرتے ہو وہ تو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے چاہے وہ سب مل کر اس کی کوشش کریں بلکہ اگر مکھی کوئی چیز ان سے چھین کر لے جائے تو وہ اس سے واپس لینے کی قدرت نہیں رکھتے۔طلب کرنے والا اور جس سے طلب کی جارہی ہے دونوں کمزور ہیں۔)

آپ نے دیکھا کہ یہاں مکھی یا اس جیسی کسی چیز کی مثال سے بہتر کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی جو ان کی کمزوری اور ناتوانی کی تصویر کشی کرے۔

خلاصہ یہ کہ غرض تو مقصد پہنچانا ہے مثالیں ایسی قبا کی مانند ہونا چاہئیں جو قامتِ مطلب پر فٹ آسکیں۔

’’فما فوقھا‘‘ کا مقصود کیا ہے اس کی مفسرین نے دو قسم کی تفسیریں کی ہیں:

ایک گروہ کے مطابق اس سے مراد "چھوٹے ہونے میں بڑھ کر" ہے کیونکہ مثال چھوٹے ہونے کی بیان کر رہی ہے لہٰذا اس سے بڑھ کر یا اس سے اور اوپر ہونا بھی اسی نظر سے ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ہم کسی سے کہیں کہ ایک روپے کے لئے کیوں اتنی زحمت اٹھا رہے ہو تمہیں شرم نہیں آتی اور وہ جواب دے کہ میں تو اس سے اوپر کے لئے بھی تکلیف اٹھاتا ہوں یہاں تک کہ ایک آنے کے لئے بھی۔

بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد "اوپر سے بڑے ہونے کے لحاظ سے ہے" یعنی خداوند عالم چھوٹی چیزوں کی مثالیں بھی دیتا ہے اور بڑی کی بھی، مقتضائے حال کے مطابق۔

پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

اس گفتگو کے بعد فرماتا ہے رہے وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ بات ان کے پروردگار کی طرف سے حق ہے وہ ایمان اور تقویٰ کی روشنی میں تعصب، عناد اور حق سے کینہ پروری سے دور ہیں اور وہ حق کے چہرے کو پورے طور پر دیکھ سکتے ہیں اور خدا کی دی ہوئی مثالوں کی منطق کا ادراک کر سکتے ہیں۔

لیکن جو لوگ کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ خدا کا اس مثال سے کیا مقصد تھا جو تفرقہ و اختلاف کا باعث بن گئی ہے ایک گروہ کی اس کی وجہ سے ہدایت کی ہے اور دوسرے گروہ کو گمراہ کیا ہے ان کے نزدیک یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مثالیں خدا کی طرف سے نہیں ہیں کیونکہ خدا کی طرف سے ہوتیں تو سب لوگ اسے قبول کر لیتے۔

مگر خدا انہیں ایک مختصر اور دوٹوک جواب دیتا ہے کہ وہ اس کے ذریعے صرف فاسقوں اور گنہگاروں کو جو حق کے دشمن ہیں گمراہ کرتا ہے۔

(۲۷) الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ	(فاسقین وہ لوگ ہیں) جو خدا سے محکم عہد و پیمان کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں وہ تعلق جنہیں خدا نے برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں توڑتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ یہی لوگ خسارے میں ہیں۔

تفسیر

حقیقی زیاں کار

گذشتہ آیت کے آخر میں چونکہ فاسقین کے گمراہ ہونے سے متعلق گفتگو تھی لہٰذا اس آیت میں ان کی تین صفات بیان کر کے انہیں مکمل طور پر مشخص کر دیا گیا ہے۔ ذیل میں ان علامات وصفات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

فاسقین کی پہلی صفت

فاسق وہ ہیں جو خدا سے محکم عہد و پیمان توڑ دیتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ انسانوں نے خدا سے مختلف پیمان باندھ رکھے ہیں۔ توحید و خدا شناسی کا پیمان اور شیطان اور نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کرنے کا پیمان۔ فاسق ان تمام پیمانوں کو توڑ دیتا ہے وہ فرمان حق سے سرتابی کرتا ہے اور شیطان اور خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کرتا ہے۔

یہ پیمان کہاں اور کس طرح باندھا گیا تھا؟

حقیقت امر یہ ہے کہ خدا نے انسان کو ہر نعمت وافر دی ہے اور اس کے ساتھ عملی طور پر اس سے زبان آفرینش میں عہد و پیمان لیا ہے۔ اسے آنکھ دی ہے تا کہ اس سے حقائق کو دیکھ سکے، کان دیا ہے تا کہ حق کی آواز سن سکے اور اسی طرح دیگر نعمات ہیں۔

جب انسان اپنی فطرت کے مطابق عمل پیرا نہ ہو یا خداداد قوتوں کا غلط استعمال کرے تو گویا اس نے عہد و پیمان خدا کو توڑ دیا۔ فاسق تمام کے تمام یا ان میں سے بعض فطری پیمانوں کو پاؤں تلے روند ڈالتے ہیں۔

فاسقین کی دوسری صفت

اس کے بعد قرآن کی دوسری علامت کی نشاندہی یوں فرماتا ہے: جو تعلق خدا نے قائم رکھنے کو کہا ہے وہ انہیں منقطع کر دیتے ہیں۔

بہت سے مفسرین نے اگر چہ اس آیت کو قطع رحمی اور عزیز داری کے رشتے کو منقطع کرنے سے مخصوص سمجھا ہے لیکن مفہومِ آیت پر گہرا غور نشاندہی کرتا ہے کہ اس کے معنی زیادہ وسعت اور زیادہ عمومیت رکھتے ہیں جس کی بناء پر قطع رحم اس کا ایک مصداق ہے کیونکہ آیت کہتی ہے کہ فاسقین ان رشتوں اور تعلقات کو منقطع کر دیتے ہیں جنہیں خدا نے برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اب یہ پیوند اور رشتہ داری کے ناتے، دوستی کے ناتے، معاشرے کے رشتے، خدائی رہبروں سے ربط و پیوند اور خدا سے رابطہ سب پر محیط ہیں لہٰذا آیت کو قطع رحمی اور رشتہ داری کے رابطوں کو روندنے کے معنی میں منحصر نہیں کرنا چاہئے۔

فاسقین کی تیسری صفت

فاسقین کی ایک اور علامت زمین میں فساد برپا کرنا ہے جس کی آخری مرحلے میں نشاندہی کی گئی ہے۔ وہ زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔

زیرِ بحث آیت کے آخر میں ہے کہ یہی لوگ زیاں کار اور خسارہ اٹھانے والے ہیں۔ واقعاً ایسا ہی ہے اس سے بدتر کیا خسارہ ہوگا کہ وہ تمام مادی و روحانی سرمایہ جس سے انسان بڑے بڑے اعزاز اور سعادتیں حاصل کر سکتا ہے اسے اپنی فنا و نابودی، بد بختی و سیاہ کاری کی راہ میں خرچ کر دے اور جو لوگ مفہوم فسق کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے خدا کی اطاعت کے مرکز سے خارج ہو گئے ہیں ان کی قسمت میں اس کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے۔

اسلام میں صلح رحمی کی اہمیت

گذشتہ آیت اگر چہ تمام خدائی ناتوں کے احترام کے متعلق گفتگو کرتی ہے لیکن بلا شک وتر دد رشتہ داری کا ناتہ اور تعلق اس کا واضح اور روشن مصداق ہے۔

اسلام صلح رحمی، عزیزوں کی مدد وحمایت اوران سے محبت کرنے کی بہت زیادہ اہمیت کا قائل ہے اور قطع رحمی اور رشتہ داروں اور عزیزوں سے رابطہ منقطع کرنے کوسختی سے منع کرتا ہے۔ قطع رحمی کی قباحت اور گناہ اس قدر ہے کہ امام سجاد علیہ السلام نے اپنے فرزند کونصیحت کی کہ وہ پانچ گروہوں کی صحبت اور دوستی سے پرہیز کرے اوران پانچ گروہوں میں سے ایک قطع رحم کرنے والے لوگوں کا ہے:

........وایاک و مصاحبة الکاطع لرحمة فانی وجدته ملعونا فی کتاب الله (قطع رحمی کرنے والے کی معاشرت سے پرہیز کرو کیونکہ میں نے قرآن میں اسے ملعون اور خدا کی رحمت سے دور پایا ہے)۔

(۲۸) کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ کُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا فَاَحۡیَاکُمۡ ۚ ثُمَّ یُمِیۡتُکُمۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡکُمۡ ثُمَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ	تم خدا سے کیونکر کفر کرتے ہو حالانکہ تم بے روح جسم تھے اس نے تمہیں زندگی دی پھر وہ تمہیں مارے گا اور دوبارہ تمہیں زندہ کرے گا اس کے بعد اسی کی طرف لوٹ جاؤ گے۔
(۲۹) هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ لَکُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا ٭ ثُمَّ اسۡتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَ هُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ۠	وہ خدا جس نے زمین کی تمام نعمتوں کو تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور انھیں سات آسمانوں کی صورت میں مرتب کیا اور وہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔

تفسیر

زندگی ایک اسرار آمیز نعمت ہے

مندرجہ بالا دو آیات میں قرآن نے نعمتِ الٰہی کے ایک سلسلے اور تعجب انگیز خلقت کا ذکر کر کے انسان کو پروردگار اور اس کی عظمت کی طرف متوجہ کیا ہے اور خدا شناسی کے سلسلے میں جو دلائل گذشتہ آیات (۲۱ اور ۲۲) میں بیان کیے گئے ہیں ان کی تکمیل کر رہا ہے۔

قرآن یہاں وجودِ خدا کے اثبات کو ایسے نقطے سے شروع کر رہا ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا اور وہ ہے زندگی کا پر اسرار مسئلہ۔ پہلے کہتا ہے: تم خدا کا کس طرح انکار کرتے ہو حالانکہ تم بے روح جسم تھے اس نے تمہیں زندہ کیا اور تمہارے بدن پر زندگی کا لباس پہنایا۔

قرآن ہم سب کو یاد دہانی کراتا ہے کہ ......اس سے پہلے تم پتھروں، لکڑیوں اور بے جان موجودات کی طرح مردہ تھے۔ اور نسیم زندگی کا تمہارے کوچے سے گزر نہ تھا لیکن اب تم نعمتِ حیات وہستی کے مالک ہو۔ تمہیں اعضاء، حواس اور ادراک کے کارخانے عطا کئے گئے ہیں۔ یہ وجود اور حیات تمہیں کس نے عطا کیا ہے؟ کیا یہ سب کچھ تم نے خود اپنے آپ کو دیا ہے؟ واضح ہے کہ ہر منصف مزاج انسان بغیر کسی تردد کے اعتراف کرتا ہے کہ یہ نعمت خود اس کی اپنی طرف سے نہیں ہے بلکہ ایک مبداء عالم وقادر کی طرف سے اسے ملی ہے جو زندگی کے تمام رموز اور پیچیدہ قوانین سے واقف تھا، انہیں منظّم کرنے کی قدرت رکھتا تھا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ کیوں حیات وہستی بخشنے والے خدا کا انکار کرتے ہیں؟

آج کے زمانے میں تمام علماء ومحققین پر یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ ہمارے پاس اس دنیا میں حیات وہستی سے زیادہ پیچیدہ کوئی دوسرا مسئلہ نہیں ہے کیونکہ تمام تر عجیب وغریب ترقی کے باوجود جو طبیعی علوم وفنون کے سلسلے میں انسان کو نصیب ہوئی ہے ابھی تک حیات کا معمہ حل نہیں ہوسکا۔ یہ مسئلہ اس قدر اسرار آمیز ہے کہ لاکھوں علماء کے افکار اور کوششیں اب تک اس مسئلے کے ادراک سے عاجز ہوچکی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ انتھک کوششوں کے سائے میں آئندہ تدریجاً انسان رموزِ حیات سے آگاہ ہوسکے۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ کیا کوئی شخص اس معاملے کو جو بہت گہرے غور وفکر کا نتیجہ ہے، اسرار انگیز ہے اور بہت زیادہ علم وقدرت کا محتاج ہے بے شعور طبیعت کی طرف نسبت دے سکتا ہے، وہ طبیعت جو خود حیات وزندگی سے عاری ہے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں ہم کہتے ہیں کہ اس جہانِ طبیعت میں حیات وزندگی کا ظہور وجود خدا کے اثبات کی سب سے بڑی سند ہے اور اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔

قرآن اوپر والی آیت میں خصوصیت کے ساتھ اسی مسئلے کا سہارا لیتا ہے۔ ہم سر دست اس مختصر اشارے سے گزر جاتے ہیں۔ قرآن اس نعمت کی یاد دہانی کے بعد ایک اور واضح دلیل پیش کرتا ہے اور وہ ہے مسئلہ ''موت'' قرآن کہتا ہے: پھر خدا تمہیں مار دے۔

جی ہاں جو زندگی پیدا کرنے والا ہے وہی موت پیدا کرنے والا ہے۔ چنانچہ سورہ ملک کی آیت ۲ میں ہے:

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا

(خدا وہ ہے جس نے موت وحیات کو پیدا کیا تاکہ تمہیں حسنِ عمل کے میدان میں آزمائے)۔

قرآن نے وجود خدا پر ان دو واضح دلیلوں کو پیش کیا ہے۔ دوسرے مسائل کے لئے روح انسانی کو آمادہ کیا ہے اور اس بحث سے مسئلہ معاد اور موت کے بعد زندگی کو بیان کیا ہے۔ پھر کہتا ہے: اس کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ البتہ موت کے بعد یہ زندگی کسی طرح تعجب خیز نہیں کیونکہ پہلے بھی انسان اسی طرح تھا پہلی دلیل (یعنی بے جان کو زندگی عطا کرنا) کی طرف متوجہ ہونے کے بعد دوسری مرتبہ اجزائے بدن کے منتشر ہونے کے بعد زندگی ملنے کے مسئلے کو قبول کرنا مشکل نہیں بلکہ پہلی دفعہ کی نسبت آسان ہے اگرچہ جس ذات کی قدرت لامتناہی ہو اس کے لئے تسہیل ومشکل کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔

اس آیت کے آخر میں کہتا ہے: پھر اس کی طرف تمہاری بازگشت ہو۔ خدا کی طرف رجوع کرنے کے معنی وہی خدا کی نعمتوں

کی طرف رجوع کرنا ہے یعنی قیامت اور دوبارہ قبروں سے اٹھنے والے دن خدا کی نعمتوں کی طرف رجوع کرو گے۔اس کی شاہد سورہ انعام کی آیت ۳۶ ہے جہاں فرماتا ہے:

''وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ''

خدا مردوں کو قبروں سے اٹھائے گا اور اسی کی طرف ان کی بازگشت ہوگی۔

(۲۹) نعمت حیات اور مسئلہ مبدا و معاد کے ذکر کے بعد خدا زیر نظر دوسری آیت میں ایک اور وسیع نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: خدا وہ ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔اس تربیت سے انسانوں کی وجودی قدر و قیمت اور زمین کے تمام موجودات پر ان کی سرداری کو مشخص کیا گیا ہے۔اسی سے ہم سمجھتے ہیں کہ خدا نے انسان کو بہت بڑے، قیمتی اور عظیم مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔تمام چیزوں کو تو اس کے لئے پیدا کیا ہے۔اب اسے کس لئے پیدا کیا گیا ہے۔انسان اس صحن عالم میں عالی ترین موجود ہے اور صحن عالم میں سب سے زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔

صرف یہی آیت نہیں جس میں انسان کے بلند ترین مقام کو بیان کیا گیا ہے بلکہ قرآن میں بہت سی ایسی آیات ملتی ہیں جو انسان کا تعارف تمام تر موجودات کا مقصودِ اصلی کی حیثیت سے کراتی ہیں جیسا کہ سورہ جاثیہ کی آیت ۱۳ میں آیا ہے۔

دوبارہ توحید کے دلائل کی طرف لوٹتے ہوئے کہتا ہے: پھر خداوند عالم آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں سات آسمانوں کی صورت میں مرتب کیا اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

لفظ ''استویٰ'' مادہ ''استواء'' سے لیا گیا ہے۔لغت میں اس کے معنی ہیں احاطۂ کامل، تسلط اور خلقت و تدبر پر مکمل قدرت لفظ ''ثم'' جملہ ''ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ'' میں ضروری نہیں کہ تاخیر زمانی کے معنی میں ہو بلکہ ہوسکتا ہے اس کے معنی تاخیر بیان اور حقائق کو ایک دوسرے کے بعد لانا ہو۔

سات آسمان

اب اصل بات کی طرف لوٹتے ہیں کہ سات آسمانوں سے کیا مراد ہے؟

اقوال و آراء میں سے جو بات زیادہ صحیح دکھائی دیتی ہے وہ یہ کہ ''سمٰوٰت سبع'' سے مراد سات آسمان ہی ہے جو اس کے حقیقی معنی ہیں مختلف آیات میں قرآن میں اس عبارت کا تکرار ظاہر کرتا ہے کہ سات کا عدد یہاں کثرت کے معنی میں نہیں بلکہ اسی خاص عدد کی طرف اشارہ ہے البتہ آیات قرآن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمام کرات، ثوابت اور سیارات جو ہم دیکھ رہے ہیں پہلے آسمان کا جزء ہیں اور چھ عالم اس کے علاوہ موجود ہیں جو ہماری نگاہ اور آج کے علمی آلات کی دسترس سے باہر ہیں اور مجموعی طور پر سات آسمانوں سے سات عالم تشکیل پذیر ہیں۔

قرآن اس گفتگو کا شاہد ہے: زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ (فصلت۔۱۲)

(اور ہم نے نچلے آسمان کو ستاروں کے چراغوں سے سجایا)۔

لیکن جو ہم نے کہا ہے کہ چھ اور آسمان ہیں جو ہمارے لئے مجہول ہیں اور ممکن ہے کہ آئندہ علوم ان سے پردہ اٹھائیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے ناقص علوم جتنے آگے بڑھتے ہیں خلقت کے نئے عجائبات تک دسترس حاصل کرتے ہیں مثلاً علم ہیئت ابھی وہاں تک پہنچا ہے جہاں سے آگے ٹیلی سکوپ دیکھنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

(۳۰) وَ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِکُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَ نُقَدِّسُ لَکَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ	جب آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں روئے زمین پر ایک جانشین اور حاکم مقرر کرنے لگا ہوں تو فرشتوں نے کہا (پروردگارا!) کیا ایسے شخص کو مقرر کرے گا جو زمین پر فساد اور خونریزی کرے گا۔ ہم تیری تسبیح اور حمد بجا لاتے ہیں (اس پر پروردگار عالم نے) فرمایا: میں حقائق کو جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔
(۳۱) وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِکَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ	پھر علم اسماء (علم اسرار خلقت اور موجودات کے نام رکھنے کا علم) سب کا سب آدم کو سکھایا پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر سچ کہتے ہو تو بتاؤ ان کے نام کیا ہیں۔
(۳۲) قَالُوْا سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ	فرشتوں نے کہا تو پاک ومنزہ ہے جو تو نے ہمیں تعلیم دی ہے ہم اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتے تو حکیم ودانا ہے۔
(۳۳) قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۙ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ	فرمایا؛ اے آدم! انہیں ان (موجودات) کے ناموں (اور اسرار) سے آگاہ کردے۔ جب اس نے انہیں آگاہ کردیا تو خدا نے فرمایا: میں نہ کہتا تھا کہ میں آسمان اور زمین کا غیب جانتا ہوں اور تم جن چیزوں کو ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو انہیں بھی جانتا ہوں۔

تفسیر

زمین میں خدا کا نمائندہ.....انسان

گذشتہ آیات میں پڑھ چکے ہیں کہ خدا نے زمین کی تمام نعمتیں انسان کے لئے پیدا کی ہیں اور ان آیات میں رسمی طور پر انسان کی رہبری اور خلافت کی تشریح کی گئی ہے اور اس کی اس روحانی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ ان تمام احسانات

کے لائق تھا۔

ان آیات میں آدمؑ (پہلے انسان) کی خلقت کی کیفیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور آیات کے اس سلسلے میں جو آیت ۳۰ سے شروع ہو کر آیت ۳۹ تک پہنچتا ہے تین بنیادی مسائل کو بیان کیا گیا ہے:

(1) پروردگار عالم کا فرشتوں کو زمین میں انسان کی خلافت وسرپرستی کے بارے میں خبر دینا اور وہ گفتگو جو فرشتوں نے اس سلسلے میں خدا سے کی۔

(2) پہلے انسان کے لئے فرشتوں کو خضوع تعظیم کا حکم جس کا ذکر مختلف مناسبات سے قرآن کی مختلف آیات میں کیا گیا ہے۔

(3) بہشت میں آدم کی کیفیت اور رہنے کی تشریح، وہ حوادث جو جنت سے ان کے نکلنے کا سبب بنے، آدمؑ کا توبہ کرنا اور پھر آدمؑ اور اولاد آدمؑ کا زمین میں آ کر آباد ہونا۔

زیرِ بحث آیت ان میں سے پہلی منزل کی بات کرتی ہے۔ خدا کی خواہش یہ تھی کہ روئے زمین پر ایک ایسا موجود خلق فرمائے جو اس کا نمائندہ ہو، اس کی صفات صفاتِ خداوندی کا پرتو ہوں اور اس کا رتبہ ومقام فرشتوں سے بالاتر ہو۔ یہی وجہ کہ آیت کہتی ہے یاد کریں اس وقت کو جب آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں روئے زمین پر جانشین مقرر کرنے والا ہوں۔

''خلیفہ'' کے معنی ہیں جانشین۔ لیکن یہاں کس کا جانشین مراد ہے اور کس چیز میں جانشین ہے؟

یہاں پر انصاف یہ ہے جسے بہت سے محققین نے بھی قبول کیا ہے کہ اس سے مراد خلافت الٰہی اور زمین پر خدا کی نمائندگی ہے کیونکہ اس کے بعد فرشتوں کا سوال اور ان کا کہنا کہ ممکن ہے نسل آدم مبداء فساد خونریزی ہو جب کہ ہم تیری تسبیح وتقدیس کرتے ہیں اسی معنی سے مناسبت رکھتا ہے کیونکہ زمین میں خدا کی نمائندگی ان کاموں کے ساتھ سازگار نہیں۔

بہرحال خدا چاہتا تھا کہ ایسے وجود کو پیدا کرے جو عالم وجود کا گلدستہ ہو اور خلافت الٰہی کے مقام کی اہلیت رکھتا ہو اور زمین میں اللہ کا نمائندہ ہو۔

اس کے بعد زیرِ بحث آیت مزید بیان کرتی ہے کہ فرشتوں نے حقیقت کا ادراک کرنے کے لئے نہ کہ اعتراض کی غرض سے عرض کیا: کیا زمین میں اسے (جانشین) قرار دے گا جو فساد کرے گا اور خون بہائے گا۔ جب کہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں، تیری تسبیح وحمد کرتے ہیں اور جس چیز کی تیری ذات لائق نہیں اس سے تجھے پاک سمجھتے ہیں۔

مگر یہاں خدا نے انہیں سربستہ ومجمل جواب دیا جس کی وضاحت بعد کے مراحل میں آشکار ہوئی۔ فرمایا: میں ایسی چیزوں کو جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے۔

فرشتے سمجھتے تھے کہ اگر مقصد عبودیت اور بندگی ہے تو ہم اس کے مصداقِ کامل ہیں ہمیشہ عبادت میں ڈوبے رہتے ہیں لہٰذا سب سے زیادہ خلافت کے لائق ہیں لیکن وہ اس سے بے خبر تھے کہ ان کے وجود میں شہوت وغضب اور قسم قسم کی خواہشات موجود نہیں جب کہ انسان کو میلانات وشہوات نے گھیر رکھا ہے اور شیطان ہر طرف سے اسے وسوسے ڈالتا رہتا ہے لہٰذا ان کی عبادت انسان کی

عبادت سے بہت زیادہ تفاوت رکھتی ہے۔ کہاں اطاعت اور فرمانبرداری ایک طوفان زدہ کی اور کہاں عبادت اس ساحل نشینوں کی جو مطمئن خالی ہاتھ اور سبک بار ہیں۔

انہیں کب معلوم تھا کہ اس آدم کی نسل سے محمد ﷺ، ابراہیم علیہ السلام، نوح علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام جیسے انبیاء علیہم السلام اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام جیسے امام اور ایسے صالح بندے اور جانباز شہید مرد اور عورتیں عرصۂ وجود میں قدم رکھیں گے جو پروانہ وار اپنے آپ کو راہِ خدا میں پیش کریں گے۔ ایسے لوگ بھی عرصۂ وجود میں تشریف لائیں گے جن کے غور وفکر کی ایک گھڑی فرشتوں کی سالہا سال کی عبادت کے برابر ہے۔

فرشتے امتحان کے سانچے میں

پروردگار کے لطف وکرم سے آدم حقائق عالم کے ادراک کی کافی استعداد رکھتے تھے خدا نے ان کی استعداد کو فعلیت کے درجے تک پہنچایا اور قرآن کے ارشاد کے مطابق آدم کو اسماء (عالم وجود کے حقائق واسرار) کی تعلیم دی۔

البتہ جہان خلقت اور عالم ہستی کے مختلف موجودات کے اسماء وخواص سے مربوط علوم سے باخبر وآگاہ کیا جانا حضرت آدم علیہ السلام کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت امام صادق علیہ السلام سے اس آیت کے متعلق سوال ہوا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا:

الارضين والجبال والشعاب والاوديه ثم نظر اليه بساط تحته فقال و هذا ابساط مما علمه.

اسماء سے مراد زمینیں، پہاڑ، درے، وادیاں (غرض یہ کہ تمام موجودات) تھے اس کے بعد امام علیہ السلام نے اس فرش کی طرف نگاہ کی جو آپ کے نیچے بچھا ہوا تھا اور فرمایا یہاں تک کہ یہ فرش بھی ان امور میں سے ہے کہ خدا نے جن کی آدم علیہ السلام کو تعلیم دی۔ (مجمع البیان زیرِ نظر آیت کے ضمن میں)

پھر خداوند عالم نے فرشتوں سے فرمایا: اگر سچ کہتے ہو تو ان اشیاء اور موجودات کے نام بتاؤ جنہیں دیکھ رہے ہو اور ان کے اسرار وکیفیات کو بیان کرو۔

لیکن فرشتے جو اتنا علم نہ رکھتے تھے اس امتحان میں رہ گئے لہٰذا جواب میں کہنے لگے خداوندا! تو منزہ ہے، تو نے ہمیں جو تعلیم دی ہے ہم اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتے۔ تو خود ہی علیم وحکیم ہے۔ اگر ہم نے اس سلسلے میں سوال کیا ہے تو یہ ہماری ناآگاہی کی بناء پر تھا ہم نے یہ مطلب نہیں پڑھا تھا اور آدم کی اس عجیب استعداد اور قدرت سے بے خبر تھے جو ہمارے مقابلے میں اس کا بہت بڑا امتیاز ہے۔ بے شک وہ تیری خلافت وجانشینی کی اہلیت رکھتا ہے جہان ہستی کی سرزمین اس کے وجود کے بغیر ناقص تھی۔

اب آدم علیہ السلام کی باری آئی کہ وہ ملائکہ کے سامنے موجودات کا نام لیں اور ان کے اسرار بیان کریں۔ خداوند عالم نے فرمایا اے آدم! ان فرشتوں کو ان موجودات کے ناموں اور کاموں سے آگاہ کرو۔ جب آدم علیہ السلام نے انہیں ان اسماء سے آگاہ کیا تو خداوند

عالم نے فرمایا: کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ میں آسمان وزمین کے غیب سے واقف ہوں اور تم جو کچھ ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو سب سے باخبر ہوں۔

اس مقام پر ملائکہ نے اس انسان کی وسیع معلومات اور فراواں حکمت ودانائی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور ان پر واضح ہوگیا کہ صرف یہی زمین پر خلافت کی اہلیت رکھتا ہے۔

(۳۴) وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ ٭ۗ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ	اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کے لئے سجدہ وخضوع کرو تو شیطان کے علاوہ سب نے سجدہ کیا۔ اس نے انکار کر دیا اور تکبر کر کے کافروں میں سے ہوگیا۔
(۳۵) وَ قُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ	اور ہم نے کہا اے آدم! تم اپنی بیوی کے ساتھ جنت میں سکونت اختیار کرلو اور جو چاہو کھاؤ (لیکن) اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ ستمگاروں میں سے ہوجاؤ گے۔
(۳۶) فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۖ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ	پس شیطان ان کی لغزش کا سبب بنا اور جس (بہشت) میں وہ رہتے تھے انہیں وہاں سے نکال دیا اور (اس وقت) ہم نے ان سے کہا سب کے سب (زمین کی طرف) چلے جاؤ اس حالت میں کہ تم میں سے بعض دوسروں کے دشمن ہوگے۔ زمین تمہاری ایک مدت معین کے لئے قرارگاہ ہے اور فائدہ اٹھانے کا وسیلہ ہے۔

تفسیر

آدم علیہ السلام جنت میں

گذشتہ بحث میں انسان کے مقام وعظمت کے بارے میں تھیں ان کے ساتھ قرآن نے ایک اور فصل بیان کی ہے۔ پہلے کہتا ہے: یاد کرو وہ وقت جب ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کے لئے سجدہ وخضوع کرو۔ ان سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے جس نے انکار کیا اور تکبر اختیار کیا۔ اس نے تکبر کیا اور اسی تکبر و نافرمانی کی وجہ سے کافروں میں داخل ہوگیا۔

واقعاً وہ شخص جو مقام خلافت الٰہی اور زمین پر خدا کی نمائندگی کا منصب حاصل کرے، تمام تر تکامل وکمال پر فائز ہو اور بلند مرتبہ فرزندوں کی پرورش کا ذمہ دار ہو جن میں انبیاء اور خصوصاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے جانشین شامل ہوں، ایسا انسان ہر قسم کے

احترام کے لائق ہے۔

ہم اس انسان کا کتنا احترام کرتے ہیں اور اس کے سامنے جھکتے ہیں جو علم کے چند فارمولے جانتا ہو۔تو پھر وہ پہلا انسان جو جہانِ ہستی کی بھر پور معلومات رکھتا تھا اس کے ساتھ کیا کچھ ہونا چاہئے تھا۔

دو اہم نکات

(۱) ابلیس نے مخالفت کیوں کی؟

ہم جانتے ہیں کہ لفظ ''شیطان'' اسمِ جنس ہے جس میں پہلا شیطان اور دیگر تمام شیطان شامل ہیں لیکن ابلیس مخصوص نام ہے اور یہ اسی شیطان کی طرف اشارہ ہے جس نے حضرت آدمؑ کو ورغلایا تھا وہ صریح آیات قرآن کے مطابق ملائکہ کی نوع سے نہیں تھا صرف ان کی صفوں میں رہتا تھا وہ گروہ جن میں سے تھا جو ایک مادی مخلوق ہے۔

اس مخالفت کا سبب کبر وغرور اور خاص تعصب تھا جو اس کی فکر پر مسلط تھا۔وہ یہ سوچتا تھا کہ میں آدمؑ سے بہتر ہوں لہٰذا اسے آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم نہیں دیا جانا چاہئے بلکہ آدم کو سجدہ کرنا چاہئے اور اسے مسجود ہونا چاہئے۔اس کی تفصیل سورہ اعراف کی آیت ۱۲ کے ذیل میں آئے گی۔

شیطان کے کفر کی علت بھی یہی تھی کہ اس نے خداوندِ عالم کے حکیمانہ حکم کو ناروا سمجھا۔نہ صرف یہ کہ عملی طور پر اس نے نافرمانی کی بلکہ اعتقاد کی نظر سے بھی معترض ہوا اور خود بینی اور خودخواہی نے یوں ایک عمر کے ایمان وعبادت کے ماحصل کو برباد کر دیا اور اس کے خرمنِ ہستی میں آگ لگا دی۔کبر وغرور کے آثارِ بد اس سے بھی زیادہ ہیں۔

(۲) سجدہ خدا کے لئے تھا یا آدمؑ کے لئے؟

اس میں کوئی شک نہیں کی ''سجدہ'' جس کا معنی عبادت و پرستش ہے صرف خدا کے لئے ہے کیونکہ عالم میں صرف خدا کے اور کوئی معبود نہیں ہے اور توحیدِ عبادت کے معنی یہی ہیں کہ خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں لہٰذا اس میں شک وشبہ نہیں کہ ملائکہ نے آدمؑ کے لئے سجدۂ عبادت نہیں کیا بلکہ یہ سجدہ خدا کے لئے تھا لیکن اس عجیب وغریب مخلوق کی وجہ سے یا یہ کہ سجدہ آدمؑ کے لئے تھا لیکن وہ خضوع وتعظیم کا سجدہ تھا نہ کہ عبادت و پرستش کا۔

کتابِ عیون الاخبار میں امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے اسی طرح روایت ہے:

''کان سجود هم اللّٰه تعالیٰ عبودیة و لآدم اکرام و طاعة لکوننا فی صلبه''

فرشتوں کا سجدہ ایک طرف سے خدا کی عبادت تھا اور دوسری طرف آدمؑ کا اکرام واحترام۔کیونکہ ہم صلبِ آدم میں موجود تھے۔

(۳۵) بہرحال اس واقعہ اور فرشتوں کے امتحان کے بعد آدم اور اس کی بیوی کو حکم دیا گیا کہ وہ بہشت میں سکونت اختیار

کریں۔ چناچہ قرآن کہتا ہے: ہم نے آدم سے کہا تم اور تمہاری بیوی بہشت میں رہو اور اس کی فراواں نعمتوں میں سے جو چاہو کھاؤ۔ لیکن اس مخصوص درخت کے نزدیک نہ جانا۔ ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

آیاتِ قرآنی سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدم زندگی گزارنے کے لئے اسی عام زمین پر پیدا ہوئے تھے لیکن ابتدا میں خداوندِ عالم نے انھیں بہشت میں سکونت دی جو اسی جہان کا ایک سرسبز و شاداب اور نعمتوں سے مالا مال باغ تھا۔ وہ ایسی جگہ تھی جہاں آدم علیہ السلام نے کسی قسم کی تکلیف نہیں دیکھی۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ آدم زمین پر زندگی گزارنے سے آشنائی نہ رکھتے تھے اور بغیر کسی تمہید کے زحمات و تکالیف اٹھانا ان کے لئے مشکل تھا اور زمین پر زندگی گزارنے کے لئے یہاں کے کردار و رفتار کی کیفیت سے آگاہی ضروری تھی۔

لہٰذا مختصر مدت کے لئے بہشت کے اندر ضروری تعلیمات حاصل کر لیں کیونکہ زمین کی زندگی پروگراموں، تکلیفوں اور ذمہ داریوں سے معمور ہے جس کا انجام صحیح سعادت، تکامل اور بقائے نعمت کا سبب ہے اور ان سے روگردانی کرنا رنج و مصیبت کا باعث ہے اور یہ بھی جان لیں کہ اگر چہ انھیں آزاد پیدا کیا گیا ہے لیکن یہ مطلق و لامحدود آزادی نہیں ہے کہ جو کچھ چاہیں انجام دیں بلکہ انھیں چاہئے کہ زمین کی کچھ چیزوں سے چشم پوشی کریں۔

نیز یہ جان لینا بھی ضروری تھا اگر خطا و لغزش دامن گیر ہو تو ایسا نہیں کہ سعادت و خوش بختی کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گے بلکہ انھیں پلٹ کر دوبارہ عہد و پیمان کرنا چاہئے کہ وہ حکمِ خدا کے خلاف کوئی کام انجام نہیں دیں گے تاکہ دوبارہ نعماتِ الٰہی سے مستفید ہو سکیں۔ یہ بھی تھا کہ وہ اس ماحول میں رہ کر کچھ پختہ ہو جائیں اور اپنے دوست اور دشمن کو پہچان لیں اور زمین میں زندگی گزارنے کی کیفیت سے آشنا ہو جائیں۔ یقیناً یہ سلسلۂ تعلیمات ضروری تھا تاکہ وہ اسے یاد رکھیں اور اس تیاری کے ساتھ روئے زمین پر قدم رکھیں۔

یہ ایسے مطالب تھے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد آئندہ زندگی میں ان کی محتاج تھی لہٰذا باوجود کہ آدم کو زمین کی خلافت کے لئے پیدا کیا گیا تھا ایک مدت تک بہشت میں قیام کرتے ہیں اور انھیں کئی ایک حکم دیئے جاتے ہیں شاید یہ سب تمرین و تعلیم کے پہلو سے تھا۔

(۳۶) اس مقام پر آدم علیہ السلام نے اس فرمان الٰہی کو دیکھا جس میں آپ کو ایک درخت کے بارے میں منع کیا گیا تھا۔ ادھر شیطان نے بھی قسم کھا رکھی تھی کہ آدم علیہ السلام اور اولاد آدم کو گمراہ کرنے سے باز نہ آئے گا۔ وہ وسوسے پیدا کرنے میں مشغول ہو گیا۔ جیسا کہ باقی آیاتِ قرآنی سے ظاہر ہوتا ہے اس نے آدم علیہ السلام کو اطمینان دلایا کہ اگر اس درخت سے کچھ کھا لیں تو وہ اور ان کی بیوی فرشتے بن جائیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنت میں رہیں گے یہاں تک کہ اس نے قسم کھائی کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔

بالآخر شیطان نے ان دونوں کو پھسلا دیا اور جس بہشت میں وہ رہتے تھے اس سے باہر نکال دیا قرآن کے الفاظ ہیں:

"فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ"

اس بہشت سے جو اطمینان و آسائش کا مرکز تھی اور رنج و غم سے دور تھی شیطان کے دھوکے میں آ کر نکالے گئے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: "وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ"

ہم نے انہیں حکم دیا کہ زمین پر اتر آؤ جہاں تم میں ایک دوسرے کے دشمن ہو جاؤ گے (آدم وحوا علیہما السلام ایک طرف اور شیطان دوسری طرف)۔

مزید فرمایا گیا کہ تمہارے لئے ایک مدت معین تک زمین میں قرارگاہ ہے جہاں سے تم نفع اندوز ہو سکتے ہو۔ یہ وہ مقام تھا کہ آدم متوجہ ہوئے کہ انہوں نے اپنے او پر ظلم کیا ہے اور بہشت کے آرام دہ اور نعمتوں سے مالا مال ماحول سے شیطانی وسوسے کے سامنے سر جھکانے کے نتیجے میں باہر نکالے جا رہے ہیں اور اب زحمت ومشقت کے ماحول میں جا کر رہیں گے یہ صحیح ہے کہ آدم نبی تھے اور گناہ سے معصوم تھے لیکن جیسا کہ ہم آئندہ چل کر بتائیں گے کہ کسی پیغمبر سے جب ترک اولیٰ سرزد ہو جاتا ہے تو خداوند عالم اس سے اس طرح سخت گیری کرتا ہے جیسے کسی عام انسان سے گناہ سرزد ہو۔ اور یہ خروج آدم جنت سے، وہ سنگین جرمانہ تھا جو کہ آدم نے اس نافرمانی کے مقابل میں ادا کیا۔

(۱) آدم علیہ السلام کس جنت میں تھے؟

اس سوال کے جواب میں اس نکتے کی طرف متوجہ رہنا چاہئے کہ اگر چہ بعض نے کہا ہے کہ یہ وہی جنت تھی جو نیک اور پاک لوگوں کی وعدہ گاہ ہے لیکن ظاہر یہ ہے یہ وہ بہشت نہ تھی بلکہ زمین کے سرسبز علاقوں میں نعمات سے مالا مال ایک روح پرور مقام تھا۔

اول: تو وہ بہشت جس کا وعدہ قیامت کے ساتھ ہے ہمیشگی اور جاودانی نعمت ہے جس کے دوام کی نشاندہی بہت سی آیات میں کی گئی ہے اور اس سے باہر نکلنا ممکن نہیں۔

دوم: یہ کہ غلیظ اور بے ایمان ابلیس کے لئے اس بہشت میں جانے کی کوئی راہ نہ تھی۔ وہاں نہ وسوسہ شیطانی ہے اور نہ خدا کی نافرمانی۔

سوم: یہ کہ اہلِ بیت علیہم السلام سے منقول روایات میں یہ موضوع صراحت سے نقل ہوا ہے۔

ایک راوی کہتا ہے: میں نے امام صادق علیہ السلام سے آدم کی بہشت کے متعلق سوال کیا۔ امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

"جنة من جنات الدنيا يطلع فيها الشمس والقمر ولو كان من جنان الآخرة ما خرج منها ابداً"

دنیا کے باغوں میں سے ایک باغ تھا جس پر آفتاب و ماہتاب کی روشنی پڑتی تھی اگر آخرت کی جنتوں میں سے ہوتی تو کبھی بھی اس سے باہر نہ نکالے جاتے۔

یہاں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آدم کے ہبوط ونزول سے مراد نزول مقام ہے نہ کہ نزولِ مکان یعنی اپنے اس بلند مقام اور سرسبز جنت سے نیچے آئے۔

(۲) خدا نے شیطان کو کیوں پیدا کیا ہے؟

بہت سے لوگ پوچھتے ہیں شیطان جس کا کام ہی گمراہ کرنا ہے آخر اسے کیوں پیدا کیا گیا اور اس کے وجود کا فلسفہ کیا ہے۔اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں:

اول: تو خدا نے شیطان کو شیطان پیدا نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ سالہا سال تک وہ ملائکہ کا ہم نشین رہا اور پاک فطرت پر رہا لیکن پھر اس نے اپنی آزادی سے غلط فائدہ اٹھایا اور بغاوت و سرکشی کی بنیاد رکھی لہٰذا وہ ابتداء میں پاک و پاکیزہ پیدا کیا گیا اس کی کجروی اس کی اپنی خواہش پر ہوئی۔

دوم: یہ کہ نظامِ خلقت کو دیکھتے ہوئے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صاحبانِ ایمان اور وہ لوگ جو راہِ حق پر گامزن رہنا چاہتے ہیں ان کے لئے نہ صرف یہ کہ شیطان کا وجود مضر اور نقصان دہ نہیں بلکہ ان کی پیش رفت اور تکامل کا ذریعہ ہے۔کیونکہ ترقی اور کمال ہمیشہ متضاد چیزوں کے درمیان ہی صورت پذیر ہوتے ہیں۔

(۳۷)فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیۡہِ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ	پھر آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات حاصل کئے اور (ان کے ذریعے) توبہ کی اور خداوندعالم نے اس کی توبہ قبول کر لی، خداوندعالم تواب (بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا) اور رحیم ہے۔
(۳۸) قُلۡنَا اہۡبِطُوۡا مِنۡہَا جَمِیۡعًا ۚ فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ ہُدًی فَمَنۡ تَبِعَ ہُدَایَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ	ہم نے کہا سب کے سب (زمین کی طرف) اتر جاؤ۔جس وقت میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے گی اس وقت جو لوگ اس کی پیروی کریں گے ان کے لئے نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔
(۳۹)وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۳۹﴾	اور جو لوگ کافر ہو جائیں اور ہماری آیات کی تکذیب کریں وہ اہلِ دوزخ ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

تفسیر

خدا کی طرف آدم کی بازگشت

وسوسۂ ابلیس و آدم علیہ السلام کے جنت سے نکلنے کے حکم جیسے واقعات کے بعد آدم علیہ السلام متوجہ ہوئے کہ واقعاً انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اس اطمینان بخش اور نعمتوں سے مالا مال جنت سے شیطانی فریب کی وجہ سے نکلنا پڑا اور اب زحمت و مشقت سے بھری ہوئی زمین میں رہیں گے۔اس وقت آدم علیہ السلام اپنی غلطی کی تلافی کی فکر میں پڑے اور مکمل جان و دل سے پروردگار کی طرف متوجہ ہوئے ایسی توجہ جو ندامت و حسرت کا ایک پہاڑ ساتھ لئے ہوئے تھی۔اس وقت خدا کا لطف و کرم بھی ان کی مدد کے لئے آگے بڑھا اور جیسا

کہ قرآن مندرجہ بالا آیات میں کہتا ہے: آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات حاصل کئے جو بہت مؤثر اور انقلاب خیز تھے ان کے ساتھ توبہ کی اور خدا نے توبہ قبول کر لی۔ کیونکہ وہ توّاب اور رحیم ہے۔

توبہ کا معنی

''توبہ'' کے اصلی معنی ہیں ''بازگشت'' اور قرآن کی زبان میں گناہ سے واپسی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ اس صورت میں ہے جب توبہ کا لفظ کسی شخص گنہگار کے لئے استعمال کیا جائے لیکن کبھی کبھی یہ لفظ اللہ کی طرف بھی منسوب ہوتا ہے وہاں اس کا مفہوم ہے رحمت کی طرف بازگشت۔ یعنی وہ رحمت جو ارتکاب گناہ کی وجہ سے بندے سے سلب کر لی گئی تھی۔ اب اطاعت و بندگی کے راستے کی طرف اس کی واپسی کی وجہ سے اسے لوٹا دی جاتی ہے اسی لئے خدا کے لئے توّاب (بہت زیادہ رحمت کی طرف لوٹنے والا) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

(۳۸) باوجودیکہ آدم کی توبہ قبول ہوگئی لیکن اس کا اثر وضعی یعنی زمین کی طرف اترنا یہ معتبر نہ ہوا۔ جیسا کہ مندرجہ بالا آیت کہتی ہے: ہم نے ان سے کہا تم سب (آدم وحوا) زمین کی طرف اتر جاؤ۔ تمہیں ہماری طرف سے ہدایت پہنچے اس وقت جو لوگ اس کی پیروی کریں گے ان کے لئے نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

(۳۹) لیکن جو لوگ کافر ہوگئے اور انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم کی آگ میں رہیں گے۔

(۴۰) يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَ اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ	اے اولاد اسرائیل! جو نعمتیں میں نے تمہیں عطا کی ہیں انہیں یاد رکھو اور میرے ساتھ جو عہد و پیمان تم نے باندھا ہے۔ اسے پورا کرو تا کہ میں بھی تمہارے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان کو پورا کروں۔ صرف مجھ سے ڈرا کرو۔

تفسیر

خدا کی نعمتوں کو یاد کرنا

بنی اسرائیل نے فرعونیوں کے چنگل سے نجات پائی، زمین میں خلیفہ ہوئے پھر پیمان الٰہی کو بھول گئے اور دوبارہ رنج و بدبختی میں پھنس گئے چونکہ یہ واقعہ حضرت آدم کے واقعے سے بہت زیادہ مشابہت رکھتا ہے بلکہ اسی اصل کی ایک فرع شمار ہوتا ہے لہٰذا خداوند عالم زیر بحث اور اس کے بعد دسویں آیت میں بنی اسرائیل کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز اور ان کی سرنوشت بیان کرتا ہے تا کہ وہ تربیتی درس جو سرنوشت آدم سے شروع ہوا تھا ان مباحث میں مکمل ہو جائے۔

بنی اسرائیل کی طرف اس طرح روئے سخن ہے: اے بنی اسرائیل! ہماری ان نعمتوں کو یاد کرو جو ہم نے تمہیں بخشی ہیں اور مجھ سے کیا ہوا عہد پورا کرو تاکہ میں بھی تم سے کئے ہوئے عہد سے وفا کروں اور صرف مجھ سے ڈرو۔

درحقیقت یہ تین دستور اور احکام (خدا کی عظیم نعمتوں کو یاد کرنا، عہد پروردگار کو پورا کرنا اور اس کی نافرمانی سے ڈرنا) خدا کے تمام پروگراموں کی تشکیل کرتے ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو بنی اسرائیل کیوں کہتے ہیں؟

حضرت یعقوب علیہ السلام جو حضرت یوسف علیہ السلام کے والد تھے ان کا ایک نام 'اسرائیل' بھی ہے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنا یہ نام کیوں رکھا تھا۔ اس سلسلے میں غیر مسلم مؤرخین نے ایسی باتیں لکھی ہیں جو خرافات کا پلندہ ہیں جیسے قاموس ''کتاب مقدس'' میں لکھا ہے:

''اسرائیل کا معنی وہ شخص ہے جو خدا پر غالب اور کامیاب ہو گیا ہو۔''

اور مزید لکھتا ہے:

''یہ لفظ یعقوب بن اسحاق کا لقب ہے جنہیں خدا کے فرشتوں سے کشتی لڑتے وقت یہ لقب ملا تھا''

لیکن ہمارے علماء اسلام کا نظریہ اور ہے جس طرح اس سلسلے میں مشہور مفسر طبرسی مجمع البیان میں لکھتے ہیں:

''اسرائیل وہی فرزند اسحاق علیہ السلام بن ابراہیم علیہ السلام ہیں''

وہ لکھتے ہیں:

''اس'' کے معنی ''عبد'' اور ''ئیل'' کے معنی ''اللہ'' ہیں لہٰذا ''اسرائیل'' کے معنی ''عبداللہ'' یعنی اللہ کا بندہ ہیں''

واضح ہے کہ اسرائیل کی فرشتوں سے کشتی لڑنے کی داستان جیسے کہ تحریف شدہ تورات میں اب بھی موجود ہے ایک خود ساختہ اور بچگانہ کہانی ہے جو ایک آسمانی کتاب کی شان سے بعید ہے یہی داستان موجودہ تورات کے تحریف شدہ ہونے کی دلیل و مدرک ہے۔

(۴۱) وَ اٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمۡ وَ لَا تَكُوۡنُوۡۤا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۖ وَ لَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰيٰتِىۡ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ۡ وَّ اِيَّاىَ فَاتَّقُوۡنِ	اور ایمان لے آؤ اس (قرآن) پر جو میں نے نازل کیا ہے کہ وہ اس (کتاب) کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود ہے اور اب تم اس کے پہلے منکر نہ بنو اور میری آیات کو کم قیمت پر فروخت نہ کرو۔ اور (لوگوں سے ڈرنے کی بجائے) صرف مجھ سے ڈرو۔

(۴۲) وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ	اورحق کو باطل سے نہ ملاؤاور حقیقت کو جاننے کے باوجود نہ چھپاؤ۔
(۴۳) وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ	اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو(یعنی نماز جماعت کے ساتھ پڑھو)۔

شانِ نزول

زیرِنظر آیات میں سے شروع کی آیتوں کے بارے میں بعض بزرگ مفسرین نے امام محمد باقر علیہ السلام سے یوں نقل کیا ہے:

حی بن اخطب، کعب بن اشرف اور یہودیوں کی ایک جماعت کے لئے یہودیوں کی طرف سے ہر سال ایک زرق برق دعوت کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ خوفزدہ تھے کہ کہیں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قیام کی وجہ سے یہ چھوٹا سا فائدہ جاتا نہ رہے اس وجہ سے (اور کچھ دیگر وجوہ کی بناء پر) انہوں نے تورات کی ان آیات میں تحریف کر دی جو اوصافِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں تھیں یہ وہی "ثمن قلیل" اور کم قیمت ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے'' (مجمع البیان زیرِنظر آیات کے سلسلے میں)

تفسیر

یہودیوں کی دولت پرستی

خدا نے یہودیوں سے جو پیمان لئے تھے ان میں انبیاء الٰہی پر ایمان لانا اور ان کے فرامین کی اطاعت کرنا بھی شامل تھا۔ زیرِ نظر تین آیات میں ان احکام وقوانین کے نو حصوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو یہودیوں کو دیئے گئے تھے۔

پہلا: ان آیات پر ایمان لانا جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی ہیں جب یہ آیات ان اوصاف سے ہم آہنگ ہیں جو تمہاری توریت میں موجود ہیں۔

قرآن اس کتاب کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس موجود ہے یعنی وہی بشارتیں جو تورات اور گذشتہ انبیاء نے اپنے پیروکاروں کو دی ہیں اور بتایا ہے کہ ان اوصاف کا نبی ظہور کرے گا اور اس کی آسمانی کتاب ان خصوصیات کی حامل ہوگی۔ اب تم دیکھ رہے ہو کہ اس پیغمبر کی صفات اور قرآن پاک کی خصوصیات ان بشارتوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں جو تمہاری کتب میں موجود ہیں۔ ہر قسم کی مطابقت کے بعد اب تم کیوں اس پر ایمان نہیں لاتے؟

دوسرا: پھر کہا گیا ہے کہ تم آسمانی کتاب کا انکار کرنے والوں میں پہل نہ کرو۔

اگر مشرک اور عرب کے بت پرست کافر ہو جائیں تو زیادہ تعجب کی بات نہیں تعجب تو تمہارے کفر و انکار پر ہے اور مخالفت میں پہل کے لحاظ سے تم پیش پیش بھی ہو جب کہ تم ان کی زیادہ اطلاعات رکھتے ہو اور اہلِ کتاب بھی ہو۔ اس قسم کے پیغمبر کے بارے

میں تمہاری آسمانی کتب میں سب بشارتیں دی جا چکی ہیں۔اسی بناء پر تو تم ان کے ظہور سے پہلے ان کے بارے میں منادی کیا کرتے تھے۔اب کیا ہو گیا ہے بجائے اس کے کہ ان کے ظہور کے بعد تم ان پر ایمان لانے والوں میں پہل کرتے ،تم نے کفر میں پہل کی ہے۔ بہت سے یہودی اصولی طور پر لیچڑ قسم کے تھے اور اگر ان میں یہ ضدی پن نہ ہوتا تو بظاہر انہیں دوسروں کی نسبت پہلے ایمان لانا چاہئے تھا۔

تیسرا: حکم یہ کہ تم میری آیات کو کم قیمت پر فروخت نہ کرو اور ایک سالانہ دعوت سے اس کا تقابل نہ کرو۔

چوتھا: حکم یہ ہے کہ صرف مجھ سے ڈرو۔

اس بت سے نہ ڈرو کہ تمہاری روزی منقطع ہو جائے گی اور اس سے بھی نہ ڈرو کہ یہودیوں کی متعصب جماعت تم سرداروں کے خلاف قیام کرے گی بلکہ صرف مجھ سے یعنی میرے حکم کی مخالفت سے ڈرو۔

(۴۲) **پانچواں:** حکم یہ ہے کہ حق کو باطل سے مخلوط نہ کرو تاکہ لوگ کہیں اشتباہ میں نہ جا پڑیں۔

چھٹا: اس فرمان میں حق کو چھپانے سے منع کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ حق کو نہ چھپاؤ جب کہ تم اسے جانتے اس سے آگاہ ہو۔

(۴۳) **ساتواں حکم، آٹھواں حکم اور نواں حکم:** زیرِ نظر آخری آیت میں تین احکام کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور خصوصاً اجتماعی عبادات کو فراموش نہ کرتے ہوئے رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ نہیں کہا گیا کہ نماز پڑھو بلکہ فرمایا گیا: ''وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ '' (نماز قائم کرو) یعنی فقط یہ نہ ہو کہ تم نماز پڑھتے رہو بلکہ ایسا کرو کہ آئین نماز معاشرے میں قائم ہو جائے اور عشق و وارفتگی کے ساتھ اس کی طرف جائیں۔

دراصل ان آخری تین احکام کی ترتیب کچھ یوں ہے کہ پہلا فرد کا خالق سے رشتہ بیان کرتا ہے (یعنی نماز) دوسرا مخلوق کا مخلوق سے ناتا قائم کرتا ہے (یعنی زکوٰۃ) اور تیسرا سب لوگوں کا خدا سے تعلق ظاہر کرتا ہے خدا کے سامنے جھکنے والوں کے ساتھ جھکنا۔

(۴۴) اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ	کیا تم لوگوں کو نیکی کی دعوت دیتے ہو لیکن اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ (آسمانی) کتاب پڑھتے ہو۔کیا تم عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔
(۴۵) وَ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۙ	(مشکل وقت میں) صبر اور نماز سے استعانت حاصل کرو اور خشوع کرنے والوں کے علاوہ دوسروں پر یہ کام گراں ہے۔

(۴۶)اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوا رَبِّھِمْ وَ اَنَّھُمْ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ؏	وہ(خاشعین وہ ہیں) جو ایمان رکھتے ہیں کہ خدا سے ملاقات کریں گےاوراسی کی جانب لوٹ جائیں گے۔

تفسیر

مشہور مفسر طبرسی (صاحب مجمع البیان) کے بقول یہود کے علماء وفضلاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ ﷺ پر ایمان لانے کی دعوت اور آپ ﷺ کے ظہور کی بشارت دیا کرتے تھےلیکن خود انہی نے آنحضرت ﷺ کے ظہور کے وقت ایمان لانے سے انکار کردیا۔

یہی عظیم مفسر نقل کرتے ہیں کہ علماء یہود اپنے ان وابستگان کو جو اسلام لا چکے تھے نصیحت کیا کرتے تھے کہ اپنے ایمان پر باقی اور ثابت قدم رہنا لیکن خود ایمان نہ لاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ زیر بحث آیت میں ان کے اس طرز عمل کی مذمت کی گئی ہے کہا گیا ہے: کیاتم لوگوں کو نیکی کی دعوت دیتے ہو اوراپنے نفسوں کو بھول جاتے ہو۔

باوجودیکہ آسمانی کتاب (تورات) کا مطالعہ کرتے ہو لیکن کیا کچھ بھی عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔

یہودی علماء اس بات سے ڈرتے تھے کہ اگر پیغمبر اسلام ﷺ کی رسالت کا اعتراف کرلیں گے تو ان کی مادی امداد منقطع ہو جائے گی اور یہودی عوام ان کی کوئی پرواہ نہیں کریں گے لہٰذا تورات میں پیغمبر اسلام ﷺ کی جو صفات آئی تھیں انہوں نے ان میں ردوبدل کردیا۔

علماء ومبلغین اور راہِ حق کی طرف دعوت دینے والوں کے لئے خاص طور پر یہ بنیادی بات ہے کہ وہ باقی لوگوں کی نسبت زیادہ تر اپنے عمل سے تبلیغ کریں جیسے کہ حضرت امام صادق علیہ السلام سے ایک مشہور روایت ہے:

"**کونوا دعاۃ الناس باعمالکم و لاتکونو دعاۃ بالسنتکم**" (لوگوں کو عمل سے دعوت دو نہ کہ زبان سے)۔

(۴۵) زیر نظر دوسری آیت میں ہے کہ اس مقصد کے لئے کہ وہ اپنے دلی میلان کی طرف قدم بڑھائیں اور سربراہی و سرداری کو دماغ سے نکال دیں۔قرآن کہتا ہے: صبر اور نماز سے استعانت حاصل کرو یعنی استقامت اور اپنی نفسانی خواہشات پر کنٹرول کے ذریعے کامیابی حاصل کرو۔

اس کے بعد کہتا ہے: کہ یہ کام خاشعین کے علاوہ دوسروں پر گراں ہے۔

(۴۶) زیر بحث آخری آیت میں خاشعین کا یوں تعارف کراتا ہے۔

"**اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوا رَبِّھِمْ وَ اَنَّھُمْ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ**"

"یَظُنُّوْنَ"، جس کا مادہ "ظن" ہے کبھی "گمان" اور کبھی "یقین" کے معنی میں آتا ہے۔اس مقام پر یقیناً ایمان اور قطعی یقین کے معنی میں ہے۔

(۱) لقاء اللہ سے کیا مراد ہے؟

لقاء اللہ کی تعبیر قرآن میں متعدد بار آئی ہے اور ہر بار اس سے مراد صحن قیامت کی حاضری ہے یہ تو واضح ہے کہ خدا سے ملاقات اس طرح سے حسی تو نہیں جیسے افرادِ بشر ایک دوسرے سے ملتے ہیں کیونکہ خدا کا نہ جسم ہے اور نہ رنگ ومکان رکھتا ہے کہ ظاہری آنکھ سے اسے دیکھا جا سکے بلکہ مقصود میدان قیامت میں آثار قدرت، جزا وسزا، نعمات اور عذاب الٰہی کا مشاہدہ ہے جیسا کہ مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے یا اس کا معنی ایک قسم کا شہودِ باطنی وقلبی ہے کیونکہ انسان بعض اوقات ایسے مقام ومرتبہ پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ خدا کو دل کی آنکھ سے اپنے سامنے دیکھتا ہے اس طرح کہ کوئی شک اور تردد باقی نہیں رہتا۔

(۲) مشکلات میں کامیابی کا راستہ

ترقی کرنے اور مشکلات پر قابو پانے کے لئے دو بنیادی ارکان کی ضرورت ہے ایک طاقتور اور مضبوط اندرونی قلعہ اور دوسرا بیرونی محکم سہارا۔ مندرجہ بالا آیات میں ان دونوں اساسی ارکان کو صبر اور صلوٰۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

صبر، استقامت اور بردباری کے ساتھ مشکلات کے محاذ پر ڈٹ جانے کا نام ہے اور نماز خدا سے رابطے اور تعلق کا وسیلہ ہے جو ایک محکم اور مضبوط سہارا ہے۔

امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جب دنیا کے غموں میں سے کسی کا سامنا کرو تو وضو کرو اور مسجد میں جا کر نماز پڑھو اور پھر دعا کرو نماز کی طرف توجہ اور پروردگار سے راز ونیاز انسان میں نئی قوت پیدا کر دیتا ہے۔

(۴۷) يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ	اے بنی اسرائیل! جن نعمتوں سے میں نے تمہیں نوازا ہے انہیں یاد کرو اور یہ بھی یاد کرو کہ میں نے تمہیں عالمین پر فضیلت بخشی ہے۔
(۴۸) وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ	اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص دوسرے کی جگہ جواب دہ نہ ہوگا، نہ سفارش قبول کی جائے گی، اور نہ ہی تاوان وبدلہ قبول ہوگا اور نہ ہی ان کی مدد کی جا سکے گی۔

تفسیر

یہودیوں کے باطل خیالات

اس آیت میں خدا نے دوبارہ روئے سخن بنی اسرائیل کی طرف کیا ہے۔ انہیں اپنی نعمتیں یاد دلاتے ہوئے کہتا ہے: اے بنی

اسرائیل! جونعمتیں میں نے تمہیں عطا کی ہیں ان کے بارے میں سوچو۔ان نعمتوں کا دامن بڑا وسیع ہے۔ ہدایت وایمان سے لے کر فرعونیوں کے چنگل سے رہائی اور عظمت واستقلال کے دوبارہ حصول تک سب نعمتیں اس میں شامل ہیں۔

پھر یہ نعمت بھی کہ انہوں نے اپنے زمانے کے لوگوں پر فضیلت حاصل کی جو دراصل مختلف نعمتوں کا مرکب ہے۔اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: میں نے تمہیں جہانوں پر فضیلت عطا کی۔

(۴۸) زیر نظر دوسری آیت میں قرآن نے یہودیوں کے باطل خیالات پر خطِ بطلان کھینچا ہے۔ان کا اعتقاد تھا کہ ہمارے آباء واجداد چونکہ پیغمبر تھے لہٰذا وہ ہماری شفاعت کریں گے یا یہ گمان کرتے تھے کہ گناہوں کا معاوضہ ادا کریں گے جیسے اس دنیا کا طریق کار ہے۔قرآن کہتا ہے اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص دوسرے کی جگہ جزا نہیں پائے گا۔اور نہ ہی اذن پروردگار کے بغیر کوئی سفارش وشفاعت قبول ہوگی۔نہ ہی تاوان وبدل قبول ہوگا۔اور نہ ہی کوئی شخص ان کی مدد کے لئے کھڑا ہوگا۔خلاصہ یہ کہ اس عدالت کا قاضی وحاکم وہ ہوگا جو پاک عمل کے سوا کچھ قبول نہیں کرے گا۔جیسا کہ سورہ شعراء کی آیت ۸۸اور ۸۹ میں ہے۔

درحقیقت زیر بحث آیت اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس دنیا میں اس طرح معمول ہے کہ مجرم سزا سے نجات پانے کے لئے مختلف طریقے استعمال کرتے ہیں۔کبھی ایک شخص دوسرے کا جرمانہ اپنے ذمہ لے لیتا ہے اور اسے ادا کر دیتا ہے کبھی سفارش کو وسیلہ بنایا جاتا ہے اور ایسے اشخاص کو تیار کیا جاتا ہے جو اس کے گناہ کے سلسلے میں سفارش کریں اور اگر ایسا بھی نہ ہو سکے تو مجرم کوشش کرتا ہے کہ تاوان ادا کر کے اپنے آپ کو سزا سے بچالے کچھ بھی نہ ہو سکے تو دوستوں کی مدد سے دفاع کے لئے تیار ہو جاتا ہے تا کہ سزا کے چنگل سے چھٹکارا حاصل کر سکے۔

دنیا میں سزا سے بچنے کے لئے یہ مختلف طریقے ہیں لیکن قرآن کہتا ہے کہ عالم قیامت میں سزاؤں کے اصول دنیا سے بالکل مختلف ہیں اور ان میں سے کوئی بھی چیز وہاں کارآمد نہیں ہوگی۔

بت پرستوں اور اہل کتاب میں سے کجرو لوگوں کے عقائد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے خرافاتی عقائد ان کے درمیان کم نہیں تھے۔

چنانچہ یہودیوں کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کے کفارہ کے لئے قربانی کرتے تھے اور اگر قربانی میسر نہ ہوتی تو کبوتروں کے ایک جوڑے کی قربانی کر دیتے تھے۔(المیزان، ج......۱،ص ۱۵۶)

قرآن اور مسئلہ شفاعت

اس میں کوئی شک نہیں کہ خدائی سزائیں اس جہان میں ہوں یا قیامت میں، ان میں انتقام کا پہلو نہیں ہے۔ وہ سب در حقیقت قوانین کے اجراء اور اطاعت کی ضمانت ہیں اور نتیجے کے طور پر تمام پہلوؤں میں ترقی اور تکامل ہے۔لہٰذا جو چیز اس ضامن اجراء کو کمزور کرے اس سے احتراز واجتناب ضروری ہے تا کہ لوگوں میں گناہ کی جرأت پیدا نہ ہو۔لیکن دوسری طرف واپس لوٹنے اور اصلاح کرنے کے راستے، گناہگاروں کے لئے کلی طور پر بند نہیں ہونے چاہئیں۔شفاعت صحیح معنی کے لحاظ سے تعمیر اور اصلاح کے

لئے ہے اور گناہگاروں اور ناپاکیوں سے آلودہ افراد کی واپسی کا وسیلہ ہے لیکن غلط مفہوم کے اعتبار سے گناہ کا شوق پیدا کرنے اور جرأت دلانے کا باعث بنتی ہے۔

جولوگ شفاعت کے مختلف پہلوؤں اوراس کے صحیح مفاہیم کوایک دوسرے سے جدانہیں سمجھ سکے وہ بعض اوقات مسئلہ شفاعت کے سرے سے منکر ہو گئے ہیں اور شفاعت کوسلاطین اور ظالم احکام کے سامنے ایک دوسرے کی سفارش اور پارٹی بازی کے برابر سمجھتے ہیں اور بعض اوقات وہابیوں کی طرح مندرجہ بالا آیت کے الفاظ ''لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ'' سے مراد یہ لیتے ہیں کہ قیامت میں کسی کی سفارش قابلِ قبول نہ ہوگی۔دوسری آیات کی طرف توجہ کئے بغیر اسے دستاویز قرار دے کر شفاعت کامکمل انکار کر دیتے ہیں۔

شرائط شفاعت

خلاصہ یہ ہے کہ آیات شفاعت وضاحت سے نشاندہی کرتی ہیں کہ اسلام کی نظر میں مسئلہ شفاعت کوئی بے ضابطہ اور بلاشرط موضوع نہیں ہے بلکہ اس کی قیود وشرائط ہیں ایک طرف یہ اس جرم کے لحاظ سے ہیں جس کے بارے میں شفاعت ہونی ہے اور دوسری طرف اس شخص کے بارے میں ہیں جس کی شفاعت کی جانی ہے۔تیسری طرف اس شخص کے بارے میں شرائط ہیں جس نے شفاعت کرنی ہے۔ یہ سب چیزیں مل کر شفاعت کے اصلی رخ اوراس کے فلسفے کوواضح کرتی ہیں۔مثلاً ظلم وستم جیسے گناہ،شفاعت کے دائرہ سے بالکل خارج کر دیئے گئے ہیں اور قرآن کہتا ہے کہ ظالموں کے لئے کوئی شفیع مطاع نہیں ہے۔

ایک طرف سورہ انبیاء آیت ۲۸ کے مطابق صرف وہ لوگ شفاعت کے ذریعے بخشے جائیں گے جو مقام ارتضٰی تک پہنچے ہوں گے اور دوسری طرف سورہ مریم آیت ۸۷ کے مطابق جو عہد الٰہی کے حامل ہوں گے۔

یہ دو عناوین جیسا کہ ان کے لغوی مفہوم سے اجمالاً اوراس سلسلے کی روایت سے تفصیلاً ظاہر اہوتا ہے یہ معنی رکھتے ہیں، کہ انسان کا خدا،حساب ومیزان اور سزا وعذاب پر ایمان ہو، نیک اعمال کواچھا اور برے اعمال کو برا سمجھتا ہواور تمام کے درست یعنی منزل من اللہ ہونے کی گواہی دیتا ہوا گر ایسا ایمان انسان کی فکر ونظر اور زندگی سے ظاہر ہوتا ہو جس کی نشانی یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کوان ظالمین اور سرکش لوگوں سے ممتاز کرے جو اسلام کی کسی مقدس اصل پر ایمان نہیں رکھتے اور اپنے پروگراموں پر تجدید نظر کرے تو پھر وہ شفات کا اہل ہوتا ہے۔شفاعت کرنے والوں کے لئے بھی اس شرط کو ذکر کیا گیا ہے کہ وہ حق کے گواہ ہونے چاہئیں:اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ (زخرف۔۸۶)

اس لحاظ سے ضروری ہے کہ جن کی شفاعت ہوتی ہے وہ شفاعت کرنے والے سے ربط اور تعلق برقرار رکھیں اور وہ ربط ہے قول وفعل سے حق کی طرف متوجہ ہونا جو خود اصلاً اور راہِ حق میں تمام صلاحیتیں صرف کرنے کے لئے ایک عامل ہے۔

(۴۹)وَ اِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ	نیز (یاد کرو اس وقت کو) جب تمہیں ہم نے فرعونیوں کے چنگل سے رہائی بخشی جو مسلسل تمہیں سخت ترین طریقے سے تکلیف و آزار پہنچاتے تھے۔تمہارے بیٹوں کے سر کاٹ لیتے اور تمہاری عورتوں کو (کنیزی کے لئے) زندہ رہنے دیتے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری سخت آزمائش تھی۔

تفسیر

نعمت آزادی

قرآن اس آیت میں ایک اور عظیم نعمت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے اللہ نے قومِ بنی اسرائیل کو نوازا تھا وہ ہے ستمگاروں کے چنگل سے آزادی جو خدا کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ہے۔

انہیں یاد دلاتا ہے: وہ زمانہ یاد کرو جب تمہیں ہم نے فرعونیوں سے نجات دلائی تھی۔ جو ہمیشہ شدید ترین طریقے سے تمہیں آزار دیتے تھے۔

تمہارے بیٹوں کا گلا کاٹ دیتے تھے اور تمہاری عورتوں کو کنیزی اور خدمت کے لئے زندہ رہنے دیتے تھے۔

اور یہ صورت حال تمہارے پروردگار کی طرف سے سخت آزمائش تھی۔

یہ بات اہم ہے کہ قرآن نے اس کاروائی کو بنی اسرائیل کے لئے ایک عظیم اور سخت آزمائش قرار دیا ہے (بلاء کا ایک معنی آزمائش و امتحان ہے) اور یہ حقیقت ہے کہ ان نامناسب اور خلافِ فطرت امور کو برداشت کرنا ایک سخت آزمائش تھی۔

قرآن نے بیٹیوں کو زندہ رکھنے اور بیٹوں کے سر کاٹنے کو عذاب قرار دیا ہے اور اس ظلم سے آزادی کو اپنی نعمت شمار کیا ہے۔گویا وہ انسانوں کو ابھار رہا ہے کہ وہ کوشش کریں کہ ہر قیمت پر اپنی صحیح آزادی حاصل کریں اور اس کی حفاظت کریں جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام اس مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

الموت فی حیا تکم مقھو رین والحیاۃ موتکم قاھرین

زندہ رہنا اور زیر دست مغلوب رہنا اور آزادی حاصل کرنے کے لئے موت انسان کی زندگی ہے۔

آج کی زندگی کا گذشتہ زمانے سے فرق یہ ہے کہ اس زمانے میں فرعون ایک خاص استبداد کے ساتھ مخالف گروہ کے بیٹوں اور مردوں کو قتل کر دیتا تھا اور ان کی بیٹیوں کو چھوڑ دیتا تھا۔

لیکن آج کی دنیا میں دوسرے طریقوں سے افرادِ انسانی کی روحِ مردانگی کو قتل کر دیا جاتا ہے اور لڑکیوں کو گناہوں میں غرق لوگوں کی شہوات کی قید میں دھکیل دیا جاتا ہے۔

(۵۰)وَ اِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰکُمْ وَ اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ	اور (اس وقت کو یاد کرو) جب ہم نے تمہارے لئے دریا شگافتہ کیا اور تمہیں تو نجات دے دی مگر فرعونیوں کو غرق کر دیا جب کہ تم دیکھ رہے تھے۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں فرعونیوں کے چنگل سے بنی اسرائیل کے نجات پانے کا ایک اجمالی اشارہ موجود تھا اور محلِ بحث آیت در اصل اس کی وضاحت کرتی ہے کہ یہ نجات انہیں کس طرح ملی تھی جو خود ایک نشانی ہے اور پروردگار کی بنی اسرائیل پر عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔

فرمایا گیا: یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے تمہارے لئے دریا کو شق کیا۔ تمہیں نجات دی اور فرعونیوں کو غرق کیا جب کہ تم دیکھ رہے تھے۔

فرعونیوں کی دریا میں غرقابی اور بنی اسرائیل کی ان کے چنگل سے نجات کا ماجرا قرآن کی متعدد سورتوں میں ہے منجملہ ان کے اعراف آیت ۱۳۶، انفال آیت ۱۰۳، شعراء آیت ۶۶، زخرف آیت ۵۵ اور دخان آیت ۱۷ سے بعد تک۔

ان سورتوں میں اس واقعے کی تقریباً تمام جزئیات کی تشریح کی گئی ہے لیکن مورد بحث آیت میں بنی اسرائیل پر خدا کی نظر رحمت و لطف کے لئے اور انہیں اسلام کی طرف دعوت دینے کے لئے جو نیا نجات بخش آئین ہے صرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اس آیت میں انسانوں کے لئے درس ہے کہ اگر وہ زندگی میں خدا پر بھروسہ کریں اور قوتِ لازوال پر اعتماد رکھیں اور صراط مستقیم میں کسی سعی و جستجو سے پیچھے نہ رہیں تو سخت ترین مواقع اور مشکلات میں خداوند عالم ان کا یار و مددگار ہوگا اور انہیں نجات دے گا۔

(۵۱) وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ	اور (یاد کرو اس وقت کو) جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا تو تم نے ان کے (وعدہ گاہ پر جانے کے بعد) بچھڑے کو (اپنا معبود) منتخب کر لیا۔ حالانکہ اس کام سے تم (اپنے ہی اوپر) ظلم کر رہے تھے۔
(۵۲)ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ	پھر ہم نے اس کام کے بعد تمہیں بخش دیا کہ شاید تم اس نعمت کا شکر ادا کرو۔
(۵۳)وَ اِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ	نیز (یاد کرو اس وقت کو) جب ہم نے موسیٰ کو کتاب دی جو حق و باطل کی تشخیص کا ذریعہ تھی کہ شاید تم ہدایت حاصل کرو۔

(۵۴)وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِهٖ یٰقَوۡمِ اِنَّکُمۡ ظَلَمۡتُمۡ اَنۡفُسَکُمۡ بِاتِّخَاذِکُمُ الۡعِجۡلَ فَتُوۡبُوۡۤا اِلٰی بَارِئِکُمۡ فَاقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ ؕ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ عِنۡدَ بَارِئِکُمۡ ؕ فَتَابَ عَلَیۡکُمۡ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ	اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے قوم تم نے بچھڑے کا انتخاب کر کے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔توبہ کرو اور اپنے پیدا کرنے والے کی طرف لوٹ آؤ اور اپنے نفسوں کو قتل کرو۔ تمہارے پروردگار کی بارگاہ میں یہ کام تمہارے لئے بہتر ہے پھر خدا نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔ کیونکہ وہ توّاب ورحیم ہے۔

تفسیر

یہ آیات حضرت موسیٰؑ کے کوہِ طور کی طرف جانے کے واقعے کی جانب اشارہ کرتی ہیں جو چالیس شب وروز میں انجام پذیر ہوا اور یہ آیات بتاتی ہیں کہ ان کی عدم موجودگی میں بنی اسرائیل کیسے گاؤ پرستی میں پڑ گئے۔ نیز حضرت موسیٰؑ کی کتاب ہدایت کے ساتھ واپسی، بنی اسرئیل کی نئے رنگ کی توبہ کا مسئلہ اور خدا کی طرف سے اس کی قبولیت کو بیان کرتی ہیں۔

پہلے کہتا ہے یاد کرو اس زمانے کو جب ہم نے موسیٰؑ کے ساتھ چالیس راتوں کا وعدہ کیا۔

جب وہ تم سے جدا ہوئے اور تیس راتوں کی میعاد چالیس ہو گئی تو ان کے جانے کے بعد تم نے بچھڑے کو اپنے معبود کی حیثیت سے منتخب کر لیا حالانکہ اس عمل سے تم اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔

(۵۲) زیر نظر دوسری آیت میں خدا کہتا ہے کہ اس بڑے گناہ کے باوجود ہم نے تمہیں معاف کر دیا کہ شاید ہماری نعمتوں کا شکر ادا کرو۔

(۵۳) اس بحث کو جاری رکھتے ہوئے زیر نظر تیسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے: نیز یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق وباطل کی پہچان کا وسیلہ عطا کیا تاکہ تمہاری ہدایت ہو جائے۔

(۵۴) اس کے بعد زیر نظر آخری آیت میں اس گناہ سے توبہ کے سلسلے میں ہے: اور یاد کرو اس وقت کو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے قوم تم نے بچھڑے کو منتخب کر کے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔

اب جو ایسا ہو گیا ہے تو توبہ کرو اور اپنے پیدا کرنے والے کی طرف پلٹ آؤ۔ ''بارئ'' کا معنی ہیں خالق۔ دراصل اس کے معنی ہیں ایک چیز کو دوسری چیز سے جدا کرنا۔ خالق چونکہ مخلوقات کو مواد اصلی اور ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے لہٰذا اس کی طرف اشارہ ہے کہ اس سخت توبہ کا حکم وہی ذات دے رہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ تمہاری توبہ اس طرح ہونی چاہئے کہ تم ایک دوسرے کو قتل کرو یہ کام تمہارے لئے تمہارے خالق کی بارگاہ میں بہتر ہے۔ اس ماجرے کے بعد خدا نے تمہاری توبہ قبول کر لی جو تواب ورحیم ہے۔

عظیم گناہ اور بے مانند توبہ

اس میں شک نہیں کہ سامری کے بچھڑے کی پرستش وعبادت کوئی معمولی بات نہ تھی وہ قوم جو خدا کی یہ تمام آیات دیکھ چکی تھی اور اپنے عظیم پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا مشاہدہ کر چکی تھی ان سب کو بھول کر پیغمبر کی ایک مختصر سی غیبت میں اصل توحید اور آئین خداوندی کو پورے طور پر پاؤں تلے روند دے اور بت پرست ہو جائے۔اب اگر یہ بات ان کے دماغ سے ہمیشہ کے لئے جڑ سے نہ نکالی جاتی تو خطرناک حالات پیدا ہونے کا اندیشہ تھا اور موقعے کے بعد اور خصوصاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے بعد ممکن تھا ان کی دعوت کی تمام آیات ختم ہو جاتیں اور اس عظیم قوم کی تقدیر مکمل طور پر خطرے سے دوچار ہو جاتی۔

لہٰذا یہاں شدت عمل سے کام لیا گیا اور صرف پشیمانی اور زبان سے اظہار توبہ پر ہرگز قناعت نہیں کی گئی یہی وجہ ہے کہ خدا کی طرف سے ایسا سخت حکم صادر ہوا جس کی مثال تمام انبیاء کی طویل تاریخ میں کہیں نہیں ملتی اور وہ یہ کہ توبہ اور توحید کی طرف بازگشت کے سلسلے میں گناہگاروں کے کثیر گروہ کے لئے اکٹھا قتل کرنے کا حکم دیا گیا۔یہ فرمان بھی ایک خاص طریقے سے جاری ہونا چاہیئے تھا اور وہ یہ ہوا کہ لوگ خود تلواریں ہاتھ میں لے کر ایک دوسرے کو قتل کریں کہ ایک اس کا اپنا مارا جانا عذاب ہے اور دوسرا دوستوں اور شناساؤں کا قتل کرنا۔

بعض روایات کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا کہ ایک تاریک رات میں وہ تمام لوگ جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی غسل کریں۔کفن پہن لیں اور صفیں باندھ کر ایک دوسرے پر تلوار چلائیں۔

ممکن ہے یہ تصور کیا جائے کہ یہ توبہ کیوں اس سختی سے انجام پذیر ہوئی۔کیا یہ ممکن نہ تھا کہ خدا ان کی توبہ کو بغیر خونریزی کے قبول کر لیتا۔

اس سوال کا جواب گذشتہ گفتگو سے واضح ہو جاتا ہے کیونکہ اصل توحید سے انحراف اور بت پرستی کی طرف جھکاؤ کا مسئلہ اتنا سادہ اور آسان نہ تھا کہ اتنی آسانی سے درگزر کر دیا جاتا اور وہ بھی ان واضح معجزات اور خدا کی بڑی بڑی نعمتوں کے مشاہدے کے بعد۔

درحقیقت ادیان آسمانی کے تمام اصولوں کو توحید اور یگانہ پرستی میں جمع کیا جا سکتا ہے۔اس اصل کا متزلزل ہونا دین کی تمام بنیادوں کے خاتمے کے برابر ہے اگر گاؤ پرستی کے مسئلے کو آسان سمجھ لیا جاتا تو شاید آنے والے لوگوں کے لئے سنت بن جاتا۔خصوصاً بنی اسرائیل کے لئے جن کے بارے میں تاریخ شاہد ہے کہ ضدی اور بہانہ ساز لوگ تھے۔لہٰذا چاہیئے تھا کہ ان کی ایسی گوشمالی کی جائے کہ اس کی چبھن تمام صدیوں اور زمانوں تک باقی رہ جائے اور اس کے بعد کوئی شخص بت پرستی کی فکر میں نہ پڑے اور شاید یہ جملہ ''ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ''یعنی یہ قتل وکشتار تمہارے خالق کے ہاں تمہاری بہتری کے لئے ہے۔اسی طرف اشارہ ہو۔

(۵۵)وَ اِذْ قُلْتُمْ یَامُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً فَاَخَذَتْکُمُ الصّٰعِقَۃُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ	اور (یاد کرو وہ وقت) جب تم نے کہا اے موسٰی! ہم خدا کو آشکار (اپنی آنکھوں سے) دیکھے بغیر تم پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔اسی حالت میں تمہیں بجلی نے آن لیا جب کہ تم دیکھ رہے تھے۔
(۵۶) ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ	پھر ہم نے تمہیں موت کے بعد زندگی بخشی کہ شاید خدا کی نعمت کا شکر بجالاؤ۔

تفسیر

یہ دو آیات خدا کی ایک اور بہت بڑی نعمت کی یاد دلاتی ہیں۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ لوگ کس قدر ہٹ دھرم اور بہانا ساز تھے اور کیسے خدا کے سخت عذاب نے انھیں اپنی گرفت میں لے لیا لیکن پھر خدا کا لطف وکرم ان کے شاملِ حال ہوا۔

پہلے فرماتا ہے: نیز یاد کرو اس وقت کو جب تم نے کہا: اے موسٰی! ہم اس وقت تک ہرگز تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔ جب تک خدا کو ظاہر بظاہر اپنی آنکھ سے دیکھ نہ لیں۔

ممکن ہے یہ خواہش ان کی جہالت کی وجہ سے ہو کیونکہ نادان لوگ اپنے محسوسات سے زیادہ کسی چیز کا شعور نہیں رکھتے یہاں تک کہ وہ چاہتے ہیں کہ خدا کو اپنی آنکھ سے دیکھیں یا پھر وہ ہٹ دھرمی اور بہانہ جوئی کی خاطر ایسا کرتے تھے جو اس قوم کی خصوصیت تھی اور اب بھی ہے۔

یہاں اس کے علاوہ چارہ کار نہ تھا کہ خدا کی ایک ایسی مخلوق انہیں دکھائی جاتی جسے دیکھنے کی تاب ان میں نہ ہو اور وہ جان لیں کہ ظاہری آنکھ تو اس سے بھی ناتواں ہے کہ وہ خدا کی تمام مخلوقات کو دیکھ سکے۔ چہ جائیکہ ذاتِ پاک پروردگار کو دیکھے۔ چنانچہ چندھیا دینے والی چمک، رعب دار آواز زلزلے کے ساتھ بجلی آئی اور پہاڑ پر گری۔ اس نے سب کو اس طرح وحشت زدہ کر دیا کہ وہ بے جان ہو کر زمین پر گر پڑے جیسا کہ قرآن مندرجہ بالا جملے کے بعد کہتا ہے: پھر اس حالت میں صاعقہ نے تمہیں آلیا کہ تم دیکھ رہے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس واقعے سے بہت پریشان ہوئے کیونکہ بنی اسرائیل کے بہانہ جو لوگوں کے لئے تو ستر افراد کا ختم ہو جانا ایک بڑا بہانہ تھا جس کی بنیاد پر وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کو تیرہ و تار کر سکتے تھے۔ لہٰذا آپ نے خدا سے ان لوگوں کے لئے دوبارہ زندگی کی درخواست کی جسے اس نے قبول کر لیا جیسا کہ قرآن کی بعد والی آیت میں کہتا ہے: پھر تمہاری موت کے بعد ہم نے تمہیں نئی زندگی بخشی کہ شاید تم خدا کی نعمت کا شکر ادا کرو۔

(۵۷)وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ	اور ہم نے بادل کے ذریعے تم پر سایہ ڈالا اور منّ (درختوں کا مخصوص اور لذیذ شیرہ) وسلویٰ (کبوتر کی طرح کے مخصوص مرغ) کے ساتھ تمہاری تواضع کی۔ان پاکیزہ نعمتوں سے جو ہم نے دی ہیں کھاؤ۔انہوں نے ہم پر تو کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ اپنے نفسوں پر ہی ظلم کیا ہے۔

تفسیر

جیسے سورہ مائدہ کی آیت ۲۰ تا ۲۲ آیات سے ظاہر ہوتا ہے بنی اسرائیل جب فرعونیوں کے چنگل سے نجات پا چکے تو خداوندعالم نے انہیں حکم دیا کہ وہ فلسطین کی مقدس سرزمین کی طرف جائیں اور اس میں داخل ہو جائیں لیکن بنی اسرائیل اس فرمان کے مطابق نہ گئے اور کہنے لگے جب تک ستمگار (عمالقہ) وہاں سے نہ چلے جائیں ہم اس زمین میں داخل نہیں ہوں گے۔انہوں نے اس پر اکتفا نہ کی بلکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ تو اور تیرا خدا ان سے جنگ کرنے جاؤ جب تم کامیاب ہو جاؤ گے تو ہم اس میں داخل ہو جائیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کی اس بات سے بہت رنجیدہ خاطر ہوئے اور انہوں نے درگاہ الٰہی میں شکایت کی۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ چالیس سال تک بیاباں (صحرائے سینا) میں اسی طرح سرگرداں رہے۔

ان میں سے ایک گروہ اپنے کئے پر سخت پشیمان ہوا۔انہوں نے بارگاہ خدا کا رخ کیا۔خدا نے دوسری مرتبہ بنی اسرائیل کو اپنی نعمتوں سے نوازا۔جن میں سے بعض کی طرف زیر بحث آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

ہم نے تمہارے سر پر بادل سے سایہ کیا واضح ہے کہ وہ مسافر جو روزانہ صبح سے غروب تک سورج کی گرمی میں بیابان میں چلتا ہے وہ ایک لطیف سائے سے کیسی راحت پائے گا (وہ سایہ جو بادل کا ہو جس سے انسان کے لئے نہ تو فضا محدود ہوتی ہو اور نہ جو ہوا چلنے سے مانع ہو)۔یہ صحیح ہے کہ بادل کے سایہ فگن ٹکڑوں کا احتمال ہمیشہ بیابان میں ہوتا ہے لیکن آیت واضح طور پر کہہ رہی ہے کہ بنی اسرئیل کے ساتھ ایسے عام حالات کی طرح نہ تھا بلکہ وہ لطف خدا سے اکثر اس عظیم نعمت سے بہرہ ور ہوتے تھے۔

دوسری طرف اس خشک اور جلا دینے والے بیابان میں چالیس سال کی طویل مدت سرگرداں رہنے والوں کے لئے غذا کی کافی ووافی ضرورت تھی۔اس مشکل کو بھی خداوندعالم نے ان کے لئے حل کر دیا جیسا کہ اس آیت کے آخر میں کہتا ہے؛ ہم نے من و سلویٰ جو لذیذ اور طاقت بخش غذا ہے تم پر نازل کیا۔ان پاکیزہ غذاؤں سے جو تمہیں روزی کے طور پر دی گئی ہیں کھاؤ اور حکم خدا کی

نافرمانی نہ کرو اور اس کی نعمت کا شکر ادا کرو۔ لیکن وہ پھر بھی شکر گزاری کے دروازے میں داخل نہیں ہوئے (تاہم) انہوں نے ہم پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ اپنے اوپر ہی ظلم کیا ہے۔

من وسلویٰ کیا ہے؟

بعض مفسرین حضرات کے نزدیک ''من'' ایک قسم کا طبیعی شہد ہے اور بنی اسرئیل اس بیابان میں طویل مدت تک چلتے پھرتے رہنے سے شہد کے مخزنوں تک پہنچ جاتے تھے کیونکہ بیابان تیہ کے کناروں پر پہاڑ اور سنگلاخ علاقہ تھا جس میں کافی طبیعی شہد نظر آ جاتا تھا۔

عہدین (توریت وانجیل) پر لکھی گئی تفسیر سے اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے جس میں ہے کہ مقدس سرزمین قسم قسم کے پھولوں اور شگوفوں کی وجہ سے مشہور ہے اسی لئے شہد کی مکھیوں کے جتھے ہمیشہ پتھروں کے سوراخوں، درختوں کی شاخوں اور لوگوں کے گھروں کی چھتوں پر جا بیٹھتے ہیں اس طرح بہت سے فقیر اور مسکین لوگ بھی شہد کھا سکتے ہیں۔

اب ہم سلویٰ کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں

اگرچہ بعض مفسرین نے اسے شہد کے ہم معنی لیا ہے لیکن دوسرے تقریباً سب مفسرین نے اسے پرندے کی ایک قسم قرار دیا ہے یہ پرندہ اطراف اور مختلف علاقوں سے کثرت سے اس علاقے میں آتا تھا اور بنی اسرائیل اس کے گوشت سے استفادہ کرتے تھے عہدین پر لکھی گئی تفسیر میں بھی اس نظریے کی تائید دکھائی دیتی ہے۔ اس میں لکھا ہے:

> ''معلوم ہونا چاہئے کہ بہت بڑی تعداد میں سلویٰ افریقہ سے چل کر شمال کو جاتے ہیں۔ جزیرۂ کاپری میں ایک فصل میں ۱۶ ہزار کی تعداد میں انکا شکار کیا گیا۔ یہ پرندہ بحیرہ قلزم کے راستے سے آتا ہے۔ خلیج عقبہ اور سویز کو عبور کرتا ہے۔ ہفتے کو جزیرہ سینا میں داخل ہوتا ہے اور راستے میں اس قدر تکان و تکلیف جھیلنے کی وجہ سے آسانی سے ہاتھ سے پکڑا جا سکتا ہے۔ اور جب پرواز کرتا ہے تو زیادہ تر زمین کے قریب ہوتا ہے۔ اس حصے کے متعلق (تورات کے) سفر خروج اور سفر اعداد میں گفتگو ہوئی ہے''۔

اس تحریر سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ سلویٰ سے مراد وہی پُر گوشت پرندہ ہے جو کبوتر کے مشابہ اور اس کے ہم وزن ہوتا ہے اور یہ پرندہ اس سرزمین میں مشہور ہے۔ البتہ بنی اسرائیل کی سرگردانی کے دنوں میں ان پر خدا کا خاص لطف وکرم تھا کہ یہ پرندہ وہاں کثرت سے ہوتا تھا تا کہ وہ اس سے استفادہ کر سکیں۔

(۵۸)وَ اِذۡ قُلۡنَا ادۡخُلُوۡا هٰذِهِ الۡقَرۡيَةَ فَكُلُوۡا مِنۡهَا حَيۡثُ شِئۡتُمۡ رَغَدًا وَّ ادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوۡلُوۡا حِطَّةٌ نَّغۡفِرۡ لَكُمۡ خَطٰيٰكُمۡ ؕ وَ سَنَزِيۡدُ الۡمُحۡسِنِيۡنَ	اور (یاد کرو اس وقت کو) جب ہم نے کہا: اس بستی (بیت المقدس) میں داخل ہو جاؤ اور اس کی فراواں نعمتوں میں سے جتنا چاہو کھاؤ اور (معبد بیت المقدس کے) دروازے سے خضوع و خشوع کے ساتھ داخل ہو جاؤ اور کہو: خدایا؛ ہمارے گناہوں کو بخش دے۔ تا کہ ہم تمہیں بخش دیں اور ہم نیک لوگوں کو زیادہ بدلہ دیں گے۔
(۵۹)فَبَدَّلَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا قَوۡلًا غَيۡرَ الَّذِىۡ قِيۡلَ لَهُمۡ فَاَنۡزَلۡنَا عَلَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ۧ	ظالم لوگوں نے اس قول کو بدل دیا اور اس کی جگہ ایک اور (استہزاء آمیز) جملہ کہنے لگے لہٰذا ہم نے ستمگروں پر اس نافرمانی کے باعث آسمان سے عذاب بھیجا۔

تفسیر

اس مقام پر ہمارا سابقہ بنی اسرائیل کی زندگی کے ایک اور مرحلے سے پڑتا ہے جو سرزمین مقدس میں ان کے داخلے سے مربوط ہے۔

پہلی آیت کہتی ہے: اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے کہا کہ اس بستی (سرزمین قدس) میں داخل ہو جاؤ۔

لفظ قریہ اگر چہ روز مرہ میں بستی کے معنی میں ہے لیکن قرآن اور لغت عرب میں ہر اس محل و مقام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جہاں لوگ جمع ہوں چاہے وہ بڑے شہر ہوں یا بستیاں۔ یہاں مراد بیت المقدس اور قدس کی سرزمین ہے۔

قرآن مزید کہتا ہے: اور اس کی فراواں نعمتوں میں سے جتنا چاہو کھاؤ اور (معبد بیت المقدس کے) دروازے سے خضوع و خشوع کے ساتھ گزر جاؤ اور کہو: خدایا؛ ہمارے گناہوں کو بخش دے۔ تا کہ ہم تمہاری خطاؤں کو بخش دیں اور ہم نیک لوگوں کو زیادہ بدلہ دیں گے۔

متوجہ رہنا چاہئے کہ لفظ ''**حطه**'' لغوی لحاظ سے جھاڑنے اور نیچے گرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں اس کا معنی یہ ہوگا خدایا! ہم تجھ سے اپنے گناہوں کے گرنے کی خواہش کرتے ہیں۔

(۵۹) لیکن جیسا کہ ہم بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمی اور سرکشی کو جانتے ہیں، ان میں سے ایک گروہ نے یہ لفظ ادا کرنے کے حکم کی خلاف ورزی کی اور اس کی بجائے استہزا کے طور پر ایک نامناسب لفظ کہنے لگے لہٰذا قرآن کہتا ہے: رہے وہ لوگ جو ظالم و ستمگار تھے انہوں نے اس لفظ کو کسی اور لفظ سے بدل دیا ہم نے بھی ان ستمگروں پر ان کے فسق و گناہ کی وجہ آسمان سے عذاب اتارا۔

(۶۰) وَ اِذِ اسۡتَسۡقٰی مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖ فَقُلۡنَا اضۡرِبۡ بِّعَصَاکَ الۡحَجَرَ ؕ فَانۡفَجَرَتۡ مِنۡہُ اثۡنَتَا عَشۡرَۃَ عَیۡنًا ؕ قَدۡ عَلِمَ کُلُّ اُنَاسٍ مَّشۡرَبَہُمۡ ؕ کُلُوۡا وَ اشۡرَبُوۡا مِنۡ رِّزۡقِ اللّٰہِ وَ لَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ	اور (وہ زمانہ کہ) جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا تو ہم نے حکم دیا کہ اپنے عصا کو مخصوص پتھر پر مارو اچانک اس سے بارہ چشمے ابلنے لگے (اس طرح کہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کے) سب لوگ اپنے اپنے مخصوص چشمے کو پہچانتے تھے (اور ہم نے کہا) خدا کی روزی میں سے کھاؤ پیو اور زمین میں فساد نہ کرو اور نہ ہی فساد پھیلاؤ۔

تفسیر

اس آیت میں بنی اسرائیل پر کی گئی ایک اور نعمت کی نشاندہی کرتے ہوئے اللہ فرماتا ہے: یاد کرو اس وقت کو جب موسیٰ نے (اس خشک اور جلا دینے والے بیابان میں جس وقت بنی اسرائیل پانی کی وجہ سے سخت تنگی میں مبتلا تھے) پانی کی درخواست کی تو خدا نے اس درخواست کو قبول کیا جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ہم نے اسے حکم دیا کہ اپنا عصا مخصوص پتھر پر مارو اس پر اچانک پانی ابلنے لگا اور پانی کے بارہ چشمے زور شور سے جاری ہو گئے۔

یہ پتھر کس قسم کا تھا؟

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ پتھر ایک کوہستانی علاقے کے ایک حصے میں واقع تھا جو اس بیابان کی طرف جھکا ہوا تھا۔ سورہ اعراف آیت ۱۶۰ کی تعبیر ''اَنۡبَجَسَتۡ'' اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ابتداء میں اس پتھر سے تھوڑا تھوڑا پانی نکلا بعد میں زیادہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل کا ہر قبیلہ، ان کے جانور جو ان کے ساتھ تھے اور وہ کھیتی جو انہوں نے احتمالاً اس بیابان کے ایک حصے میں تیار کی تھی۔ سب اس سے سیراب ہو گئے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کوہستانی علاقے میں پتھر کے ایک حصے سے پانی جاری ہوا البتہ یہ مسلّم ہے کہ یہ سب معجزے سے رونما ہوا۔

بہر حال ایک طرف خداوند عالم نے ان پر من وسلویٰ نازل کیا اور دوسری طرف انہیں فراواں پانی عطا کیا اور ان سے فرمایا: خدا کی دی ہوئی روزی کھاؤ پیو لیکن زمین میں خرابی اور فساد نہ کرو۔

گویا یہ آیت انہیں متوجہ کرتی ہے کہ کم از کم ان عظیم نعمتوں کی شکرگزاری کے طور پر ضدی پن، ستمگری، انبیاء کو ایذا رسانی اور بہانہ سازی ترک کر دو۔

(۶۱)وَ اِذۡ قُلۡتُمۡ یٰمُوۡسٰی لَنۡ نَّصۡبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادۡعُ لَنَا رَبَّکَ یُخۡرِجۡ لَنَا مِمَّا تُنۡبِتُ الۡاَرۡضُ یُخۡرِجۡ لَنَا مِمَّا تُنۡبِتُ الۡاَرۡضُ مِنۡۢ بَقۡلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوۡمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسۡتَبۡدِلُوۡنَ الَّذِیۡ هُوَ اَدۡنٰی بِالَّذِیۡ هُوَ خَیۡرٌ ؕ اِهۡبِطُوۡا مِصۡرًا فَاِنَّ لَکُمۡ مَّا سَاَلۡتُمۡ ؕ وَ ضُرِبَتۡ عَلَیۡهِمُ الذِّلَّةُ وَ الۡمَسۡکَنَةُ ٭ وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمۡ کَانُوۡا یَکۡفُرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ یَقۡتُلُوۡنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ ؕ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوۡا وَّ کَانُوۡا یَعۡتَدُوۡنَ ۫

اور(یاد کرواس وقت کو) جب تم نے کہا: اے موسیٰ ہم اس کے لئے ہرگز تیار نہیں کہ ایک ہی قسم کی غذا پر اکتفا کریں اپنے خدا سے دعا کرو کہ ہمارے لئے زمین سے اگنے والی سبزیوں میں سے اور ککڑی، لہسن ، مسور اور پیاز اُگائے۔موسیٰ نے کہا: کیا بہتر غذا کے بدلے پست غذا کا انتخاب کرتے ہو کسی شہر میں داخل ہو جاؤ کیونکہ جو کچھ تم چاہتے ہو وہ تو وہیں ہے۔خداوند عالم نے ذلت ومحتاجی (کی مہر) ان کی پیشانی پر لگا دی اور نئے سرے سے وہ غضبِ پروردگار میں مبتلا ہو گئے کیونکہ وہ آیات الٰہی سے کفر کرتے اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ وہ گنہگار، سرکش اور تجاوز کرنے والے تھے۔

تفسیر

ان نعماتِ فراواں کی تفصیل کے بعد جن سے خدا نے بنی اسرائیل کو نوازا تھا۔زیر نظر آیت میں ان عظیم نعمتوں پر ان کے کفران اور ناشکر گزاری کی حالت کو منعکس کیا گیا ہے۔اس میں اس بات کی نشاندہی ہے کہ وہ کس قسم کے ہٹ دھرم لوگ تھے۔شاید تاریخ دنیا میں ایسی کوئی مثال نہ ملے گی کہ کچھ لوگوں پر اس طرح سے الطاف الٰہی ہو لیکن انہوں نے اس طرح سے اس کے مقابلے میں ناشکر گزاری اور نافرمانی کی ہو۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اور یاد کرو اس وقت کو جب تم نے کہا: اے موسیٰ ہم سے ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی قسم کی غذا پر قناعت کر لیں۔من و سلویٰ کتنی ہی اچھی اور لذیذ غذا ہو ہم مختلف قسم کی غذا چاہتے ہیں۔لہٰذا خدا سے خواہش کرو کہ وہ زمین سے جو کچھ اگایا کرتا ہے ہمارے لئے بھی اگائے سبزیوں میں سے، ککڑی، لہسن، مسور اور پیاز۔لیکن موسیٰ نے کہا: کیا بہتر غذا کے بدلے پست غذا پسند کرتے ہو جب معاملہ ایسا ہی ہے پھر تو اس بیابان سے نکلو اور کسی شہر میں داخل ہونے کی کوشش کرو۔کیونکہ جو کچھ تم چاہتے ہو وہ تو وہاں ہے۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: خداوند عالم نے ان کی پیشانی پر ذلت وفقر کی مہر لگا دی اور وہ دوبارہ غضبِ الٰہی میں گرفتار ہو گئے۔یہ اس لئے ہوا کہ وہ آیاتِ الٰہی کا انکار کرتے تھے اور ناحق انبیاء کو قتل کرتے تھے یہ سب اس لئے تھا کہ وہ گناہ، سرکشی اور تجاوز

کے مرتکب ہوتے تھے۔

کیا نت نئی چیز کی خواہش انسانی مزاج کا خاصہ نہیں؟

اس میں شک نہیں کہ نت نئی چیز کی خواہش انسان کی زندگی کے لوازمات اور خصوصیات میں سے ہے یہ بات انسانی زندگی کا حصہ ہے کہ وہ ایک قسم کی غذا سے اکتا جاتا ہے لہٰذا یہ کوئی غلط نہیں پھر آخر بنی اسرائیل کیوں تنوع کی درخواست پر لائق سرزنش قرار پائے؟

اس سوال کا جواب ایک نکتے سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ انسانی زندگی میں کھانا، سونا، شہوت اور طرح طرح لذتیں بنیادی چیز نہیں ہیں ایسے اوقات بھی آتے ہیں کہ ان امور کی طرف توجہ انسان انسان کو اصلی غرض اور اولین مقصد سے دور کر دیتی ہے جو دراصل ایمان، پاکیزگی، تقویٰ اور اصلاحِ ذات ہے یہ وہ مقام ہے جہاں پر انسان ان تمام چیزوں کو ٹھوکر مار دیتا ہے نت نئی چیز کی خواہش درحقیقت کل کے اور آج کے استعمارگروں کا ایک بہت بڑا جال ہے اور خصوصاً آج کے زمانے میں اس تنوع طلبی سے استفادہ کیا جاتا ہے اور انسان کو قسم قسم کی غذاؤں، لباس، سواری اور مکان کی خواہش کا اسیر بنا دیا جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو بالکل بھول جاتا ہے اور ان چیزوں کی قید کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیتا ہے۔

(۶۲) اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِئِیۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ	جو ایمان لائے ہیں (مسلمان) اور یہودی، نصاریٰ اور صائبین (حضرت یحییٰ، حضرت نوح یا حضرت ابراہیم کے پیروکار) جو بھی خدا اور روزِ آخرت کے دن پر ایمان لائے اور اعمال صالح بجالائے ان کی جزا اور اجر ان کے پروردگار کے ہاں مسلم ہے اور ان کے لئے (آئندہ یا گذشتہ) کسی قسم کا خوف اور غم نہیں ہے

تفسیر

نجات کا کلی قانون

بنی اسرائیل سے مربوط ابحاث میں دراصل قرآن ایک کلی اصول اور عمومی قانون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ قدر و قیمت حقیقت و واقعیت کی ہے نہ کہ ظاہریت کی۔ خداوند عالم کی بارگاہ میں ایمانِ خالص اور عمل صالح قابل قبول ہے۔ جو لوگ ایمان لے آئیں (مسلمان) اسی طرح یہودی، عیسائی اور صائبین (حضرت یحییٰ علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیروکار) جو بھی خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لے آئیں اور نیک عمل انجام دیں ان کا اجر و عوض پروردگار کے پاس مسلم ہے۔

ایک اہم سوال

بعض بہانہ ساز مذکورہ بالا آیت کو غلط افکار کے لئے دستاویز کے طور پر پیش کرتے ہیں وہ اسے صلح کل کے عنوان سے پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہر مذہب کے پیروکار کو اپنے ہی مذہب پر عمل کرنا چاہئے لہٰذا ان کے نزدیک ضروری نہیں کہ یہودی، عیسائی یا دوسرے مذاہب کے پیروکار آج مسلمان ہو جائیں بلکہ اگر وہ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہوں اور عمل صالح انجام دیں تو کافی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے: ہم واضح طور پر جانتے ہیں کہ قرآنی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں۔ قرآن سورہ آلِ عمران آیت ۸۵ میں کہتا ہے: وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ

اگر کوئی شخص اسلام کے علاوہ کوئی دین اپنے لئے انتخاب کرے گا تو وہ ہرگز قبول نہ ہوگا۔

علاوہ ازیں قرآن یہود و نصاریٰ اور باقی ادیان کے ماننے والوں کو دعوتِ اسلام دینے والی آیات سے بھرا پڑا ہے، اگر مندرجہ بالا تفسیر صحیح ہو تو یہ قرآن کی بہت سی آیات سے صریح تضاد ہوگا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس آیت کے واقعی اور حقیقی معنی تلاش کئے جائیں۔

اس مقام پر دو تفسیریں سب سے زیادہ واضح اور مناسب نظر آتی ہیں۔

(1) اگر یہود و نصاریٰ اور ان جیسے گروہ اپنی کتب کے مضامین پر عمل کریں تو مسلماً رسول اسلام ﷺ پر ایمان لے آئیں، کیونکہ ان کتبِ آسمانی میں مختلف صفات و علامات کے ساتھ آپ ﷺ کے ظہور کی بشارت موجود ہے جس کی تفصیل سورہ بقرہ کی آیت ۱۴۶ کے ذیل میں آئے گی۔

(2) اس آیت کی نظر ایک سوال کی طرف ہے جو ابتدائے اسلام میں بہت سے مسلمانوں کو مدینہ میں درپیش تھا۔ وہ اس فکر میں رہتے تھے کہ اگر راہِ حق و نجات فقط اسلام ہے تو ہمارے آبا و اجداد کا کیا بنے گا۔ کیا پیغمبرِ اسلام ﷺ کو نہ پہچاننے اور ان پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے انہیں سزا و عذاب کا سامنا ہوگا۔

اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس نے یہ خبر دی کہ جو شخص اپنے زمانے میں اس وقت کے برحق نبی اور کتاب آسمانی پر ایمان لے آیا ہو اور اس نے عمل صالح انجام دیا ہو وہ نجات یافتہ لوگوں میں ہے اور اس کے لئے فکر و تردد کی کوئی بات نہیں۔

لہٰذا ظہور مسیح علیہ السلام سے پہلے مومنین اور عمل صالح انجام دینے والے یہودی نجات یافتہ ہیں اور یہی صورت ظہور رسولِ اسلام ﷺ سے پہلے کے عیسائی مومنین کی ہے۔

یہی مفہوم مذکورہ آیت کی شانِ نزول سے ظاہر ہوتا ہے جس کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔ (اس شانِ نزول کی شرح کو تفسیر نمونہ جلد اول میں اسی آیت کے ذیل میں مطالعہ کریں۔

(۶۳)وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ	اور (وہ وقت کہ) جب ہم نے تم سے عہد لیا اور کوہِ طور کو تمہارے سروں کے اوپر مسلط کر دیا اور (تمہیں کہا کہ) جو کچھ (آیات واحکام کی صورت میں) ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے تھامو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو (اور اس پر عمل کرو) شاید اس طرح تم پرہیزگار ہو جاؤ۔
(۶۴)ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ	اس کے بعد پھر تم نے روگردانی کی اور اگر تم پر خدا کا فضل و رحمت نہ ہوتا تو تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوتے۔

تفسیر

ان آیات میں بنی اسرائیل سے تورات میں شامل احکامات پر عمل کرنے کے عہد و پیمان اور پھر ان کی طرف سے اس پیمان کی خلاف ورزی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

کہا گیا ہے: یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے تم سے عہد و پیمان لیا۔ اور کوہِ طور کو تمہارے سروں کے اوپر مسلط کر دیا۔ اور تمہیں کہا کہ جو آیات الٰہی تمہیں دی گئی ہیں انہیں قدرت وقوت سے تھامو۔ اور جو کچھ اس میں ہے اسے غور وفکر سے دل میں یاد رکھو (اور اس پر عمل کرو) تا کہ پرہیزگار ہو جاؤ۔

لیکن تم نے عہد و پیمان کو طاقِ نسیاں کر دیا اور اس واقعے کے بعد روگرداں ہو گئے۔ اور اگر خدا کا فضل ورحمت نہ ہوتا تو تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوتے۔

کوہِ طور ان کے سروں پر مسلط کرنے سے کیا مقصود تھا؟

عظیم اسلامی مفسر مرحوم طبرسی، ابن زید کا قول اس طرح نقل کرتے ہیں۔

''جس وقت حضرت موسیٰؑ کوہِ طور سے واپس آئے اور اپنے ساتھ تورات لائے تو اپنی قوم کو بتایا کہ میں آسمانی کتاب لے کر آیا ہوں جو دینی احکام حلال وحرام پر مشتمل ہے۔ یہ وہ احکام ہیں جنہیں خدا نے تمہارے لئے عملی پروگرام قرار دیا ہے۔ اسے لے کر اس کے احکام پر عمل کرو۔ اس بہانے سے کہ یہ ان کے لئے مشکل احکام ہیں۔ یہودی نافرمانی اور سرکشی پر تل گئے۔ خدا نے بھی فرشتوں کو مامور کیا کہ وہ کوہِ طور کا ایک بہت بڑا ٹکڑا ان کے سروں پر لا کھڑا کر دیں۔ اسی اثناء میں حضرت موسیٰؑ نے انہیں خبر دی کہ عہد و پیمان باندھ لو، احکامِ خدا پر عمل کرو، سرکشی اور بغاوت سے

توبہ کرو تو تم سے یہ عذاب ٹل جائے گا ورنہ سب ہلاک ہو جاؤ گے۔ اس پر انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ تورات کو قبول کیا اور خدا کے حضور سجدہ کیا۔ جب کہ ہر لحظہ وہ کوہ طور کو اپنے سروں پر گرنے کے منتظر تھے لیکن بالآخر ان کی توبہ کی وجہ سے عذاب الٰہی ٹل گیا۔

یہ نکتہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ کوہ طور کے بنی اسرائیل کے سروں مسلط ہونے کی کیفیت کے سلسلے میں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ پہاڑ کا ایک بہت بڑا ٹکڑا زلزلے اور شدید بجلی کے زیر اثر اپنی جگہ سے اکھڑ کر ان کے سروں کے اوپر سے بحکم خدا اس طرح گزرا ہو کہ چند لحظے انہوں نے اسے اپنے سروں پر دیکھا ہو اور یہ خیال کیا ہو کہ وہ ان پر گرا چاہتا ہے لیکن یہ عذاب ان سے ٹل گیا اور وہ ٹکڑا کہیں دور جا گرا۔

کیا اس عہد و پیمان میں جبر کا پہلو ہے؟

اس سوال کے جواب میں بعض کہتے ہیں کہ ان کے سروں پر پہاڑ کا مسلط ہونا ڈرانے دھمکانے کے طور پر تھا نہ کہ جبر و اضطرار کے طور پر ورنہ جبری عہد و پیمان کی تو کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

لیکن زیادہ صحیح یہی ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ سرکش اور باغی افراد کو تہدید و سزا کے ذریعے حق کے سامنے جھکایا جائے۔ یہ تہدید اور سختی جو وقتی طور پر ہے ان کے غرور کو توڑ دے گی۔ انہیں صحیح غور و فکر پر ابھارے گی اور اس راستے پر چلتے چلتے وہ اپنے ارادہ و اختیار سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے لگیں گے۔

بہر حال یہ پیمان زیادہ تر عملی پہلوؤں سے مربوط تھا ورنہ عقائد کو تو جبر و اکراہ سے نہیں بدلا جا سکتا۔

(٦٥)وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ۚ	جنہوں نے ہفتہ کے دن کے بارے میں حکم کی نافرمانی اور گناہ کیا۔ تمہیں ان کی حالت کے بارے میں علم ہے کہ انہیں ہم نے دھتکارے ہوئے بندروں کی شکل میں کر دیا۔
(٦٦) فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَ مَا خَلْفَهَا وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ	ہم نے عذاب کے اس واقعہ کو اس زمانے کے لوگوں کے لئے اور بعد میں آنے والوں کے لئے درس عبرت قرار دیا ہے اور پرہیزگاروں کے لئے اسے نصیحت بنایا ہے۔

تفسیر

یہ دو آیات بھی گذشتہ آیات کی طرح یہودیوں کی عصیان و نافرمانی کی روح اور مادی امور کی طرف ان کی شدید رغبت اور

وابستگی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

پہلے کہا گیا ہے: تم ان کی حالت کو تو جانتے ہو جنہوں نے ہفتہ کے دن کے بارے میں حکم کی نافرمانی اور گناہ کیا تھا۔

نیز تمہیں یہ بھی علم ہے کہ ہم نے ان کو کہا کہ دھتکارے ہوئے بندروں کی طرح ہو جاؤ۔

(٦٦) پھر دوسری آیت میں کہا گیا کہ ہم نے اس واقعے کو اس زمانے کے لوگوں کے لئے اور بعد کے زمانوں کے لئے درس عبرت قرار دیا ہے۔

اور اسی طرح پرہیزگاروں کے لئے بھی پند و نصیحت قرار دیا ہے۔

اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا نے یہودیوں کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ وہ ہفتہ کے دن تعطیل کیا کریں۔ ان میں سے کچھ لوگ دریا کے کنارے رہتے تھے اور آزمائش و امتحان کے طور پر انہیں حکم ملا کہ اس دن مچھلیاں نہ پکڑا کریں لیکن دوسرے دنوں کے برعکس ہفتہ کے دن مچھلیاں بڑی کثرت سے پانی کی اوپر والی سطح پر ظاہر ہو جاتی تھیں۔ لہٰذا وہ کوئی حیلہ سوچنے لگے اور ایک قسم کے شرعی بہانے سے انہوں نے ہفتہ کے دن مچھلیاں پکڑ لیں۔ خدا تعالیٰ نے اس جرم کی سزا دی اور ان کے انسانی چہرے حیوانی شکل میں بدل گئے۔

ان کے چہروں کا مسخ اور تبدیل ہونا جسمانی طور پر تھا یا نفسیاتی و اخلاقی طور پر، نیز یہ کہ یہ لوگ کہاں رہتے تھے اور کون سے بہانے کے ذریعے انہوں نے مچھلیاں پکڑی تھیں۔ ان تمام سوالات کے جوابات اور اس سلسلے کے دوسرے مسائل اسی تفسیر کی چھٹی جلد میں سورہ اعراف کی آیات ١٦٣ سے ١٦٦ تک کے ذیل میں آئیں گے۔

(٦٧) وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ	اور (اس وقت کو یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو۔ وہ کہنے لگے تم ہم سے مذاق کرتے ہو۔ (موسیٰ نے) کہا میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں (اور کسی سے مذاق واستہزاء کروں)۔
(٦٨) قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّ لَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ	وہ کہنے لگے (تو پھر) اپنے خدا سے یہ کہو کہ ہمیں واضح کرے کہ یہ کس قسم کی گائے ہونا چاہئے۔ اس نے کہا: خدا فرماتا ہے کہ گائے نہ بوڑھی ہو کہ جو کام سے رہ گئی ہو اور نہ بالکل جوان ہو بلکہ ان کے درمیان ہو جو کچھ تمہیں حکم دیا گیا ہے (جتنی جلدی ہو سکے) اسے انجام دو۔

(٦٩) قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ	وہ کہنے لگے: (اے موسیٰ) اپنے خدا سے کہو ہمارے لئے واضح کرے کہ اسکا رنگ کیسا ہو۔ وہ کہنے لگا: خدا فرماتا ہے کہ وہ زرد رنگ کی ہو، ایسے رنگ کی جو دیکھنے والوں کو اچھا لگے۔
(٧٠) قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَ اِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ	وہ کہنے لگے: (اے موسیٰ) اپنے خدا سے کہو! ہمارے لئے واضح کرے کہ وہ گائے کس قسم کی ہو کیونکہ یہ گائے تو ہمارے لئے مبہم ہوگئی ہے اور اگر خدا نے چاہا تو ہم ہدایت پالیں گے۔
(٧١) قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَ لَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَ مَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ؑ	اس نے کہا: کہ خدا فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ تو اتنی سدھائی ہوئی ہو کہ زمین جوتے اور نہ ہی کھیتی سینچے، بھلی چنگی اور ایک رنگ کی ہو جس میں کوئی دھبہ تک نہ ہو۔ وہ کہنے لگے اب (جاکے) ٹھیک ٹھیک بیان کیا اور پھر انہوں نے (ایسی گائے تلاش کی) اور اسے ذبح کیا حالانکہ وہ مائل نہ تھے کہ اس کام کو انجام دیں۔
(٧٢) وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۚ	اور جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا، پھر (اس کے قاتل کے بارے میں) تم میں پھوٹ پڑ گئی اور خدا نے اسے آشکار کر دیا جسے تم چھپا رہے تھے۔
(٧٣) فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ	پھر ہم نے کہا کہ اس گائے (کے گوشت) کا ٹکڑا مقتول کے ساتھ لگا دو (تاکہ وہ زندہ ہو کر قاتل کی نشاندہی کر دے)، اس طرح خدا مردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنی آیات دکھاتا ہے کہ شاید تم سمجھ سکو۔

(۷۴)ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ۭ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ	پھراس واقعے کے بعد تمہارے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے بلکہ اس سے بھی زیادہ کیونکہ کچھ پتھر تو وہ ہیں جن سے نہریں جاری ہوتی ہیں اور بعض وہ ہیں جن میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں اور ان میں سے پانی کے قطرے ٹپکتے ہیں اور ان میں سے بعض خوفِ خدا سے (پہاڑ کی بلندی سے) نیچے گر جاتے ہیں۔ اور خدا تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

تفسیر

بنی اسرائیل کی گائے کا واقعہ

پہلے بھی بنی اسرائیل کے بارے میں ہم مختصر طور پر جو دیگر واقعات پڑھ چکے ہیں ان کے برعکس ان آیات میں یہ واقعہ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔

پہلے ہم اس واقعے کی تشریح اور آیات کی تفسیر بیان کرتے ہیں بعد ازاں اس کے نکات کی طرف جائیں گے

جیسا کہ آیاتِ قرآن اور اقوال مفسرین سے ظاہر ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص نامعلوم طور پر قتل ہو جاتا ہے اس کے قاتل کا کسی طرح پتہ نہیں چلتا، بنی اسرائیل کے قبائل کے درمیان جھگڑا اور نزاع شروع ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے قبیلے اور دیگر لوگوں کو اس کا ذمہ دار گردانتا ہے اور اپنے تئیں بری الذمہ قرار دیتا ہے، جھگڑا ختم کرنے کے لئے مقدمہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے اور لوگ آپ سے اس موقع پر مشکل کشائی کی درخواست کرتے ہیں اور اس کا حل چاہتے ہیں۔ چونکہ عام اور معروف طریقوں سے اس قضیے کا فیصلہ ممکن نہ تھا اور دوسری طرف اس کشمکش کے جاری رہنے سے ممکن تھا بنی اسرائیل میں ایک عظیم فتنہ کھڑا ہو جاتا لہٰذا جیسا کہ آپ ان آیات کی تفسیر میں پڑھیں گے حضرت موسیٰ علیہ السلام پروردگار سے مدد لے کر اعجاز کے راستے سے اس مشکل کو حل کرتے ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: اور (اس وقت کو یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: قاتل کو تلاش کرنے کے لئے پہلی گائے (جو تمہیں مل جائے اس) کو ذبح کرو۔

انہوں نے بطور تعجب کہا: کیا تم ہم سے تمسخر کرتے ہو۔

موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں کہا: میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں (قَالَ أَعُوذُ بِاللهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ) یعنی استہزاء اور تمسخر کرنا نادان اور جاہل افراد کا کام ہے اور خدا کا رسول یقیناً ایسا نہیں ہے۔

(۶۸)اس کے بعد انہیں اطمینان ہو گیا کہ استہزاء و مذاق نہیں بلکہ سنجیدہ گفتگو ہے تو کہنے لگے: اب اگر ایسا ہی ہے تو اپنے پرودگار سے یہ کہئے کہ ہمارے لئے مشخص و معین کرے کہ وہ گائے کس قسم کی ہو۔ ''اپنے خدا سے کہو'' ان کے سوالات میں اس جملہ کی تکرار ہوئی ہے۔ اس میں ایک طرح کا سوئے ادب یا سربستہ استہزا مذاق پایا جاتا ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ ''ہمارے خدا سے دعا کیجئے'' کیا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خدا کو اپنے خدا سے جدا سمجھتے تھے۔

بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے جواب میں فرمایا: خدا فرماتا ہے ایسی گائے ہو جو نہ بوڑھی ہو کہ جو بے کار چکی ہو اور نہ ہی جوان بلکہ ان کے درمیان ہو۔

اس مقصد کے لئے کہ وہ اس سے زیادہ اس مسئلے کو طول نہ دیں اور بہانہ تراشی سے حکم خدا میں تاخیر نہ کریں اپنے کلام کے آخر میں مزید کہا: جو تمہیں حکم دیا گیا ہے (جتنی جلدی ہو سکے) اسے انجام دو۔

(۶۹) لیکن انہوں نے پھر بھی زیادہ باتیں بنانے اور ڈھٹائی دکھانے سے ہاتھ نہیں اٹھایا اور کہنے لگے: اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ وہ ہمارے لئے واضح کرے کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔

موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں کہا: وہ گائے ساری کی ساری زرد رنگ کی ہو جس کا رنگ دیکھنے والوں کو بھلا لگے۔

خلاصہ یہ کہ وہ گائے مکمل طور پر خوش رنگ اور چمکیلی ہو، ایسی دیدہ زیب کہ دیکھنے والوں کو تعجب میں ڈال دے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اس پر بھی اکتفاء نہیں کیا اور اسی طرح ہر مرتبہ بہانہ جوئی سے کام لے کر اپنے آپ کو اور مشکل میں ڈالتے گئے۔

(۷۰) پھر کہنے لگے: اپنے خدا سے کہئے کہ ہمیں واضح کرے کہ یہ گائے (کام کے لحاظ سے) کیسی ہونی چاہئے۔ کیونکہ یہ گائے ہمارے لئے مبہم ہو گئی ہے۔ اور اگر خدا نے چاہا تو ہم ہدایت پالیں گے۔

(۷۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: کہ خدا فرماتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہو جو اتنی سدھائی ہوئی نہ ہو کہ زمین جوتے اور کھیتی سینچے ہر عیب سے پاک ہو حتیٰ کہ اس میں کسی قسم کا دوسرا رنگ بھی نہ ہو۔

اب کہ بہانہ سازی کے لئے ان کے پاس کوئی سوال باقی نہ تھا جتنے سوالات وہ کر سکتے تھے سب ختم ہو گئے تو کہنے لگے: اب تو نے حق بات کہی۔

پھر جس طرح ہو سکا انہوں نے وہ گائے مہیا کی اور اسے ذبح کیا لیکن دراصل وہ یہ کام کرنا نہ چاہتے تھے۔

اس واقعے کی جزئیات بیان کرنے کے بعد زیرِ نظر چھٹی آیت میں قرآن دوبارہ یہ تمام واقعہ بعد والی دو آیات میں مختصراً اس طرح بیان کرتا ہے: یاد کرو اس وقت کو جب تم نے ایک آدمی کو قتل کر دیا، پھر اس کے قاتل کے بارے میں جھگڑنے لگے اور خدا نے (اس حکم کے ذریعے جو مندرجہ بالا آیت میں آیا ہے) جس چیز کو تم چھپائے ہوئے تھے اسے آشکار کر دیا۔

(۷۲) پھر ہم نے کہا کہ اس گائے (کے گوشت) کا ٹکڑا مقتول پر مارو (تا کہ وہ زندہ ہو کر قاتل کا تعارف کرائے)۔ بے شک خدا اسی طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنی اس قسم کی آیات دکھاتا ہے تا کہ تم حقیقت کو پاسکو۔

(۷۴)زیر بحث آخری آیت میں بنی اسرائیل کی قساوت اور سنگدلی کو بیان کیا گیا ہے: ان تمام واقعات کے بعد اور اس قسم کی آیات ومعجزات دیکھنے کے باوجود تمہارے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ کیونکہ کچھ پتھر تو ایسے ہیں جن میں دراڑ پڑ جاتی ہے اور ان سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں یا پھر بعض وہ ہیں جن میں شگاف پڑ جاتا ہے اور ان میں سے پانی کے قطرے ٹپکنے لگتے ہیں اور کبھی ان میں سے کچھ پتھر پہاڑ کی بلندی سے خوفِ خدا کے باعث گر پڑتے ہیں لیکن تمہارے دل تو ان پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ ان سے علم وعواطف کا چشمہ جوش مارتا ہے نہ محبت کے قطرات ٹپکتے ہیں اور نہ ہی یہ کبھی خوفِ خدا سے دھڑکتے ہیں۔

آخری جملے میں ہے: جو کچھ تم انجام دے رہے ہو خدا اس سے غافل نہیں ہے۔

یہ دراصل اس گروہ بنی اسرائیل اور ان کے خطوط پر چلنے والے تمام لوگوں کے لئے تہدید ہے۔

یہ عجیب داستان خدا کی ہر چیز پر لامتناہی قدرت کی دلیل کے علاوہ مسئلہ معاد پر بھی دلالت کرتی ہے۔

علاوہ ازیں یہ داستان ہمیں درس دیتی ہے کہ ہمیں سخت گیر نہیں ہونا چاہئے تاکہ خدا بھی ہم پر سختی نہ کرے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ شاید گائے کو ذبح کرنے کیلئے اس لئے منتخب کیا گیا ہو کہ بچی کھچی گاؤ پرستی کی فکر ان کے دماغ سے نکل جائے۔

(۷۵)اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ وَ قَدۡ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡهُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوۡنَهٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡهُ وَ هُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ	کیا تم یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تم پر (یعنی تمہارے آئین کے احکامات پر) ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کلام خدا کو سنتا تھا اور سمجھنے کے بعد اس میں تحریف کر دیتا تھا جب کہ وہ لوگ علم واطلاع بھی رکھتے تھے۔
(۷۶) وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَا بَعۡضُهُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ قَالُوۡۤا اَتُحَدِّثُوۡنَهُمۡ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیۡکُمۡ لِیُحَآجُّوۡکُمۡ بِهٖ عِنۡدَ رَبِّکُمۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ	جب مومنین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب ایک دوسرے سے خلوت کرتے ہیں تو ان میں سے بعض دوسروں پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم ان مطالب کو مسلمانوں کے سامنے کیوں دہراتے ہو جو خدا نے (رسول اسلام کی صفات کے بارے میں) تم سے بیان کئے ہیں کہ کہیں (قیامت کے دن) بارگاہِ الٰہی میں تمہارے خلاف وہ ان سے استدلال کریں، کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔

(۷۷)اَوَ لَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ	کیا تم نہیں جانتے کہ خدا ان کے اندرونی اور بیرونی اسرار سے واقف ہے۔

شانِ نزول

بعض مفسرین مندرجہ بالا دو آیات کے شانِ نزول کے سلسلے میں امام باقر علیہ السلام سے اس طرح نقل کرتے ہیں:

یہودیوں کے ایک گروہ کے لوگ جو حقیقت کے دشمن نہ تھے۔ جب مسلمانوں سے ملاقات کرتے تو جو تورات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات کے متعلق آیا تھا انہیں سنا دیتے تھے۔ یہودیوں کے بڑے لوگ اس سے آگاہ ہوئے اور انہیں منع کیا اور کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وہ صفات جو تورات میں آئی ہیں تم انہیں ان کے سامنے بیان نہ کرو کہ کہیں خدا کے سامنے ان کے پاس تمہارے خلاف کوئی دلیل نہ بن جائیں۔ یہ آیات نازل ہوئیں اور انہیں جواب دیا گیا۔ (مجمع البیان زیرِ بحث آیات کے ضمن میں)

تفسیر

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں ان آیات میں خدا بنی اسرائیل کا واقعہ چھوڑ کر مسلمانوں سے خطاب کر رہا ہے اور ایک سبق آموز نتیجہ پیش کرتا ہے۔

کہتا ہے: کیا تم یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تم پر (یعنی تمہارے آئین کے احکامات پر) ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان میں سے ایک گروہ خدا کی باتیں سننے، سمجھنے اور ادراک کرنے کے بعد ان میں تحریف کر دیتا ہے جب کہ ان لوگوں کو علم و اطلاع بھی ہے۔

(۷۶) بعد کی آیت اس حیلہ گر اور منافق گروہ کے متعلق ایک اور حقیقت کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ قرآن کہتا ہے: ان میں سے پاک دل لوگ جب مومنین سے ملاقات کرتے ہیں تو اظہارِ ایمان کرتے ہیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ صفات جو ان کی کتابوں میں موجود ہیں ان کی خبر دیتے ہیں لیکن علیحدگی اور خلوت میں ان میں سے ایک گروہ کہتا ہے: تم ان مطالب کو جو خدا نے تورات میں تمہارے لئے بیان کئے ہیں مسلمانوں کو کیوں بتاتے ہو کہ کہیں قیامت کے دن بارگاہِ الٰہی میں تمہارے خلاف ان سے استدلال کریں، کیا تم سمجھتے نہیں۔

(۷۷) آخری آیت سے ضمنی طور پر یہ بھی بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ اس منافق گروہ کا اللہ کے بارے میں ایمان اس قدر کمزور تھا کہ وہ اسے ایک مادی انسان کی طرح سمجھتے تھے اور تصور کرتے تھے کہ اگر کوئی حقیقت مسلمانوں سے چھپا لیں تو وہ خدا سے بھی چھپی رہے گی۔ لہٰذا بعد کی آیت صراحت سے کہتی ہے: کیا یہ نہیں جانتے کہ خدا ان کے اندرونی اور بیرونی اسرار سے آگاہ ہے۔

(۷۸)وَ مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ	اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتابِ خدا کو چند خیالات اور آرزوؤں کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتے اور انہوں نے فقط اپنے گمانوں سے وابستگی اختیار کر لی ہے۔
(۷۹)فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ	افسوس اور ہلاکت ہے ان لوگوں کے لئے جو کچھ مطالب اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے تا کہ اسے تھوڑی سی قیمت پر فروخت کر سکیں۔ پس افسوس ہے ان کے لئے بوجہ اس کے جو کچھ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور افسوس ہے ان کے لئے بوجہ اس کے جو کچھ وہ اس سے کماتے ہیں۔

تفسیر

عوام کو لوٹنے کی یہودی سازش

گذشتہ آیات کے بعد محلِ بحث آیات یہودیوں کو دو واضح گروہوں میں تقسیم کرتی ہیں۔عوام اور حیلہ ساز علماء۔

قرآن کہتا ہے: ان میں سے ایک گروہ میں ایسے افراد ہیں جو علم نہیں رکھتے اور کتابِ خدا میں سے چند ایک خیالات اور آرزوئیں اخذ کرنے کے علاوہ کچھ نہیں جانتے اور انہوں نے صرف اپنے ظن و گمان سے وابستگی اختیار کر لی ہے۔

علمائے یہود کا ایک اور گروہ تھا جو اپنے فائدے کے لئے حقائق کو تحریف کر دیتا تھا جیسا کہ قرآن مندرجہ بالا دوسری آیت میں کہتا ہے: افسوس ہے ان لوگوں پر جو کچھ مطالب اپنے ہاتھ سے لکھ دیتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں اور ان کی غرض یہ ہے کہ اس کام سے تھوڑی سی قیمت وصول کریں۔ افسوس ہے ان پر اس سے جو اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں۔ اور افسوس ہے ان پر اس سے جسے وہ ان خیانتوں کے ذریعے کماتے ہیں۔

اس آیت کے آخری الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے وسیلہ بھی ناپاک اختیار کیا اور اس سے نتیجہ بھی غلط حاصل کرتے تھے۔

(۸۰)وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ	اورانہوں نے کہا: چند دن کے سوا آتش جہنم ہم تک نہیں پہنچے گی۔ کہئے کیا تم نے خدا سے کوئی عہد و پیمان لیا ہوا ہے کہ خدا اپنے پیمان کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کرے گا یا تم خدا کی طرف ایسی بات منسوب کرتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں۔
(۸۱)بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ	ہاں جو لوگ گناہ کمائیں اور گناہ کے اثرات ان کے سارے جسم پر محیط ہوں وہ اہل جہنم ہیں اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔
(۸۲)وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۧ	وہ لوگ جو ایمان لا چکے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں وہ اہلِ جنت ہیں اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

تفسیر

بلند پروازی اور کھوکھلے دعوے

اس مقام پر قرآن یہودیوں کے بے بنیاد دعووں میں سے ایک کی طرف اشارہ کرتا ہے جس نے انہیں مغرور کر رکھا تھا اور جوان کی کجرویوں کا سرچشمہ تھا۔ قرآن نے یہاں اس کا جواب دیا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: وہ کہتے ہیں جہنم کی آگ چند روز کے سوا ہمیں ہرگز نہیں چھوئے گی۔

کہئے کیا خدا نے تم سے کوئی عہد و پیمان کر رکھا ہے کہ خدا جس کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کرے گا یا پھر بغیر جانے کسی چیز کی خدا کی طرف نسبت دیتے ہو۔

ملت یہود کو اپنے بارے میں نسلی برتری کا زعم تھا اور یہ قوم سمجھتی تھی کہ جو وہ ہے وہی ہے۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ ان میں سے جو گنہگار ہیں انہیں فقط چند دن عذاب ہوگا اس کے بعد انہیں ہمیشہ کے لئے جنت ملے گی۔ یہ انکی خودخواہی وخود پرستی کی واضح دلیل ہے۔

یہ امتیاز طلبی کسی بھی منطق کی رو سے روا نہیں اور بارگاہِ الٰہی میں اعمال پر جو جزاء وسزا کے سلسلے میں تمام انسانوں میں کوئی فرق نہیں۔

بہرحال مندرجہ بالا آیت ایک منطقی بیان کے ذریعے اس غلط خیال کو باطل کر دیتی ہے فرمایا گیا ہے تمہاری یہ گفتگو دو صورتوں میں سے ایک کی مظہر ہے یا تو اس سلسلے میں خدا کی طرف سے کوئی خاص عہد و پیمان ہوا ہے جب کہ ایسا پیمان تم سے ہوا نہیں یا پھر تم جھوٹ بولتے ہو اور خدا پر تہمت لگاتے ہو۔

(۸۱) بعد کی آیت ایک کلی وعمومی قانون بیان کرتی ہے جو ہر لحاظ سے عقلی ومنطقی بھی ہے فرمایا گیا ہاں وہ لوگ جو کسبِ گناہ کریں اور آثارِ گناہ ان کے سارے وجود کو ڈھانپ لیں وہ اہلِ دوزخ ہیں اور وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ یہ ایک کلی قانون ہے۔ کسی قوم وملت اور کسی گروہ وجمعیت کے گنہگاروں میں اور دیگر انسانوں میں موجود گنہگاروں میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں۔

(۸۲) رہے پرہیزگار ومومنین تو ان کے بارے میں بھی ایک کلی قانون ہے جو سب کے لئے یکساں ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں اور انہوں نے عمل صالح انجام دیا ہے وہ اہلِ بہشت ہیں اور ہمیشہ وہیں رہیں گے۔

بہر حال احاطۂ گناہ کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اس قدر گناہوں میں ڈوب جائے کہ اپنے لئے ایک ایسا قید خانہ بنالے جس کے سب سوراخ بند ہوں۔

نسل پرستی کی ممانعت

مندرجہ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ نسل پرستی کی روح جو آج کی دنیا میں بھی بہت سی بدبختیوں کا سرچشمہ ہے اس زمانے میں یہودیوں میں موجود تھی اور وہ اپنے لئے بہت سے خیالی امتیازات کے قائل تھے۔ کتنے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کئی ہزار سال گذرنے کے باوجود ابھی تک یہ نفسیاتی بیماری ان میں موجود ہے اور درحقیقت غاصب اسرائیلی حکومت کی پیدائش کا سبب بھی یہی نسل پرستی ہے۔

(۸۳) وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ ۟ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰکِیْنِ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ	اور (یاد کرو اس وقت کو) جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد و پیمان لیا کہ تم خدائے یگانہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرو گے اور ماں باپ، ذوی القربیٰ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیکی کرو گے اور لوگوں سے اچھے پیرائے میں بات کرو گے۔ نیز نماز قائم کرو گے اور زکوٰۃ ادا کرو گے۔ لیکن عہد و پیمان کے باوجود چند افراد کے سوا تم سب نے روگردانی کی اور (ایفائے عہد سے) پھر گئے۔
(۸۴) وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ لَا تَسْفِکُوْنَ دِمَآءَکُمْ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ	اور (وہ وقت کہ) جب ہم نے تم سے پیمان لیا کہ ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے اور ایک دوسرے کو اپنی سر زمین سے نہیں نکالو گے، تم نے اقرار کیا اور تم خود (اس پیمان پر) گواہ تھے۔

(۸۵)ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ وَ تُخۡرِجُوۡنَ فَرِيۡقًا مِّنۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِهِمۡ تَظٰهَرُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ ؕ وَ اِنۡ يَّاۡتُوۡكُمۡ اُسٰرٰى تُفٰدُوۡهُمۡ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيۡكُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡ ؕ اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَ تَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ	پھر تم ہو کہ ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو اور اپنے میں سے ایک گروہ کو اپنی سرزمین سے باہر نکال دیتے ہو اور گناہ وظلم کا ارتکاب کرتے ہوئے ان پر تسلط حاصل کرتے ہو (اور یہ سب اس عہد کی خلاف ورزی ہے جو تم نے خدا سے باندھا ہے) لیکن اگر ان میں سے بعض قیدیوں کی شکل میں تمہارے پاس آئیں اور فدیہ دے دیں تو انہیں آزاد کر دیتے ہو حالانکہ انہیں باہر نکالنا ہی تم پر حرام ہے۔ کیا تم آسمانی کتاب کے کچھ حصے پر ایمان لے آتے ہو اور کچھ سے کفر اختیار کرتے ہو۔ جو شخص (احکام وقوانین خدا میں تبعیض کا) یہ عمل انجام دیتا ہے اس کے لئے اس جہان کی رسوائی اور قیامت میں سخت ترین عذاب کی طرف بازگشت کے سوا کچھ نہیں اور خدا تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔
(۸۶) اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ اشۡتَرَوُا الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا بِالۡاٰخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ وَ لَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ	یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کے لئے آخرت کو بیچ دیا ہے لہٰذا ان کی سزا میں تخفیف نہیں ہوسکتی اور کوئی ان کی مدد نہیں کرے گا۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں بنی اسرائیل کے عہد و پیمان کا ذکر تو کہیں کہیں آیا ہے لیکن اس بارے میں تفصیل بیان نہیں ہوئی لیکن محل بحث آیت میں اس عہد و پیمان کی شقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان آیات میں قرآن یہودیوں کو شدید سرزنش کر رہا ہے کہ تم نے اس پیمان کو کیوں توڑ دیا۔ قرآن انہیں یہ پیمان توڑنے کی پاداش میں اس جہان کی رسوائی اور اس جہان کے شدید عذاب سے ڈراتا ہے۔

یہ پیمان جس کے بنی اسرائیل خود شاہد تھے اور اس کا اقرار کرتے تھے ان امور پر مشتمل ہے توحید اور خداوندِ یگانہ کی پرستش۔ جیسے کہ آیت کے پہلے جملہ میں فرماتا ہے:

(1)۔ اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ خدائے یکتا کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرو گے اور کسی بت کے سامنے سر تعظیم نہیں جھکاؤ گے۔

(2)ماں باپ کے ساتھ نیکی کروگے۔

(3)اپنے رشتہ داروں، یتیموں اور مدد طلب کرنے والے محتاجوں کے ساتھ نیکی کروگے۔

(4)اجتماعی طور پر لوگوں کے ساتھ تمہارا سلوک اچھا ہوگا اور لوگوں کے ساتھ اچھے پیرائے میں بات کرو گے۔

(5)نماز قائم کروگے اور ہر حالت میں خدا کی طرف متوجہ رہوگے۔

(6)زکوٰۃ ادا کرنے اور محروم لوگوں کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کروگے۔

لیکن تم میں سے مختصر سے گروہ کے علاوہ سب نے اپنے عہد منہ موڑ لیا اور اپنے پیمان کو ایفا کرنے سے روگردانی کی۔

(۸۴)(7)اور یاد کرو اس وقت کو جب تم سے ہم نے عہد لیا کہ ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے۔

(8)ایک دوسرے کو اپنی بستیوں سے باہر نہیں نکالو گے۔

(9)اگر کوئی شخص تم میں سے جنگ کے دوران قید ہو جائے تو سب اس کی آزادی کے لئے مدد کروگے، فدیہ دوگے اور اسے آزاد کراؤ گے (پیمان کا یہ مفہوم " أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ'' سے حاصل کیا گیا ہے جو بعد میں آئے گا) .

پھر تم نے ان سب شرائط کا اقرار کیا اور پیمان پر خود گواہ ہوئے۔

(۸۵)لیکن تم نے ان میں سے بہت سی شرائط کو پاؤں تلے روند ڈالا۔تم وہی تھے جو ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے اور اپنے میں سے کچھ لوگوں کو ان کی زمین میں سے نکال دیتے تھے جب کہ اس گناہ اور تجاوز میں تم ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے تھے اور یہ سب کچھ اس عہد و پیمان کے خلاف تھا جو تم خدا سے باندھ چکے تھے۔

اس دوران میں جب ان میں سے بعض قیدیوں کی صورت میں تمہارے پاس آتے تو تم فدیہ دیتے اور انہیں آزاد کراتے تھے حالانکہ انہیں پہلے ہی گھر سے نکالنا تم پر حرام تھا اور تعجب کی بات یہ کہ فدیہ دینے اور قیدیوں کو آزاد کرانے میں تم تورات کے حکم اور پیمانِ الٰہی سے سند حاصل کرتے تھے۔کیا کتاب الٰہی کے بعض احکامات پر ایمان لاتے ہو اور بعض سے کفر اختیار کرتے ہو یہ جو تم احکام الٰہی میں تبعیض و تفریق کو روا سمجھتے ہو اس کی جزا اس جہان کی رسوائی کے علاوہ کچھ نہیں اور قیامت کے دن ایسے لوگ سخت ترین عذاب کی طرف پلٹیں گے اور خدا تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔بلکہ اس نے تمہارے اعمال کی کلیات و جزئیات کو بڑی باریکی سے شمار کیا ہے اور اسکے مطابق تمہیں بدلا دے گا۔

(۸۶)محل بحث آخری آیت میں ان کے ان اعمال کا اصلی سبب بیان کیا ہے جو خلاف حقیقت ہیں۔فرمایا ہے: یہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی ہے اسی بناء پر ان کے عذاب میں تخفیف نہیں ہوگی اور کوئی ان کی مدد کے لئے کھڑا نہیں ہوگا۔

(۸۷)وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ وَ قَفَّیۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ بِالرُّسُلِ ۫ وَ اٰتَیۡنَا عِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ الۡبَیِّنٰتِ وَ اَیَّدۡنٰہُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ ؕ اَفَکُلَّمَا جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌۢ بِمَا لَا تَہۡوٰۤی اَنۡفُسُکُمُ اسۡتَکۡبَرۡتُمۡ ۚ فَفَرِیۡقًا کَذَّبۡتُمۡ ۫ وَ فَرِیۡقًا تَقۡتُلُوۡنَ	ہم نے موسیٰ کو کتاب (تورات) دی اور پھر یکے بعد دیگرے انبیاء بھیجے اور عیسیٰ بن مریم کو واضح دلیلیں بخشیں اور روح القدس کے ذریعے ہم نے اس کی تائید کی۔ جس وقت بھی کوئی پیغمبر تمہاری خواہش کے خلاف آیا۔تم اس کے مقابلے میں تکبر کرتے رہے (اور اس پر ایمان لانے سے احتراز کرتے رہے اور اسی پر بس نہیں کی) ان میں سے ایک گروہ کی تم نے تکذیب کی اور ایک گروہ کو قتل کر دیتے رہے۔
(۸۸) وَ قَالُوۡا قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ بَلۡ لَّعَنَہُمُ اللّٰہُ بِکُفۡرِہِمۡ فَقَلِیۡلًا مَّا یُؤۡمِنُوۡنَ	(بطور استہزاء و تمسخر) کہتے ہیں ہمارے دل غلاف کے اندر ہیں (ہاں ایسا ہی ہے) خدا نے ان کے کفر کی بناء پر انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے، پس ان میں سے بہت تھوڑے لوگ ایمان لاتے ہیں۔

تفسیر

ان آیات کے مخاطب تو بنی اسرائیل ہیں لیکن یہ اپنے مفاہیم اور معیار کے اعتبار سے عمومیت کی حامل ہیں اور دوسرے تمام لوگ بھی اس خطاب کا مصداق ہیں۔قرآن کہتا ہے کہ ہم نے موسیٰ کو آسمانی کتاب تورات دی۔اور پھر مسلسل یکے بعد دیگرے انبیاء بھیجے۔ان پیغمبروں میں داؤد علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام، یوشع علیہ السلام، زکریا علیہ السلام اور یحییٰ علیہ السلام شامل ہیں۔

اور عیسیٰ بن مریم کو روشن دلائل دیئے اور روح القدس کے ذریعے اس کی تائید کی۔

لیکن ان عظیم مرسلین نے ان اصلاحی پروگراموں کے باوجود جب بھی کوئی بات تمہاری خواہش نفس کے خلاف کہی تو تم نے ان کے مقابلے میں تکبر اختیار کیا اور تم نے ان کی فرمانبرداری نہیں کی۔

یہ ہوا و ہوس کی حاکمیت تم پر اس قدر غالب تھی کہ ان مرسلین میں سے کچھ کی تم نے تکذیب کی اور کچھ کو تو قتل ہی کر دیا۔

اگر تمہاری طرف سے یہ تکذیب اور جھٹلانا موثر ثابت ہوتا اور تمہارا مقصد اسی سے پورا ہو جاتا تو تم اسی پر اکتفا کر لیتے اور خدا کے پیغمبروں کے خون سے اپنے ہاتھ نہ رنگتے۔

روح القدس کیا ہے؟

بزرگ مفسرین روح القدس کے بارے میں مختلف تفاسیر بیان کرتے ہیں ہم یہاں چند ایک درج کرتے ہیں۔

۱۔ بعض کہتے ہیں کہ روح القدس سے مراد جبرائیل ہے اس تفسیر کی بناء پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا نے جبرائیل کے ذریعے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدد کی۔

۲۔ کچھ دوسرے مفسرین کا عقیدہ ہے کہ روح القدس وہی ایک غیبی طاقت ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تائید کرتی تھی اور اس مخفی خدائی طاقت سے وہ مردوں کو حکم خدا سے زندہ کرتے تھے

(۸۸) زیرِ نظر دوسری آیت بھی اس بحث کو جاری رکھے ہوئے ہے

بے خبر اور غلاف میں لپٹے دل

مدینہ کے یہودی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغات کا پوری کوشش سے مقابلہ کرتے اور آپ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کرتے اور جب بھی آپ کے بار دعوت سے بچنے کا کوئی بہانہ ملتا اس سے پورا فائدہ اٹھاتے اس آیت میں ان کی ایک گفتگو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ کہتے تھے ہمارے دل پردے اور غلاف میں لپٹے ہیں آپ جو کچھ پڑھتے ہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ بات وہ تمسخر اور استہزا کے طور پر کہتے لیکن قرآن کہتا ہے بات یہی ہے کہ جو وہ کہہ رہے ہیں کیونکہ کفر نفاق کے باعث ان کے دل بے خبری ظلمت گناہ اور کفر کے پردوں میں لپٹے جا چکے ہیں اور خدا نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بہت کم ایمان لائے ہیں۔

(۸۹) وَ لَمَّا جَآءَهُمۡ كِتٰبٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمۡ ۙ وَ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ يَسۡتَفۡتِحُوۡنَ عَلَى الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمۡ مَّا عَرَفُوۡا كَفَرُوۡا بِهٖ ۡ فَلَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ	اور جب خدا کی طرف سے ان کے پاس ایک ایسی کتاب آئی ہے جو ان نشانیوں کے مطابق ہے جو ان (یہودیوں کے) پاس ہیں حالانکہ اس ماجرے سے پہلے (وہ خود اس پیغمبر اور اس کی کتاب کے ظہور کی بشارت دیتے تھے اور) یہ امید رکھتے تھے کہ اس پیغمبر کی مدد سے فتحیاب ہوں گے (ان سب امور کے باوجود) جب کتاب اور وہ پیغمبر جسے پہلے پہچان چکے تھے، ان کے پاس آئے تو اس سے کافر ہو گئے۔ پس خدا کی لعنت ہو ان کافروں پر۔

(۹۰) بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ	انہوں نے اپنے نفسوں کو بری قیمت پر بیچا ہے کیونکہ غلط کاری کے مرتکب ہوتے ہوئے وہ ان آیات سے کافر ہو گئے ہیں جو خدا کی بھیجی ہوئی ہیں (چونکہ پیغمبر اسلام بنی اسرائیل میں سے نہیں ہیں) اور خدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے فضل سے اپنی آیات نازل کرتا ہے لہٰذا ان پر یکے بعد دیگر خدا کا غضب نازل ہوا اور کافروں کے لئے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب ہے۔

شان نزول

زیر نظر آیت کے بارے میں امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے۔

یہودیوں نے اپنی کتاب میں دیکھ رکھا تھا کہ پیغمبر اسلام کا مقام ہجرت عیر اور احد کی پہاڑیوں کے درمیان ہوگا (یہ دونوں پہاڑ مدینہ کے اردگرد ہیں) یہودی اپنے علاقے چھوڑ کر رسول کی ہجرت کی سرزمین کی تلاش میں نکلے اس دوران وہ ''حداد'' نامی پہاڑ تک پہنچے اور کہنے لگے ''حداد'' یہی احد ہے وہیں سے وہ منتشر ہو گئے ہر گروہ نے ایک جگہ کو اپنا مسکن بنالیا کچھ سرزمین تیما میں جا بسے بعض ''فدک'' میں قیام پذیر ہوئے اور کچھ ''خیبر'' میں رہنے لگے (کچھ مدت بعد) تیما کے رہنے والوں نے اپنے دوسرے بھائیوں سے ملنا چاہا۔ اس اثنا میں ایک عرب وہاں سے گذرا اس سے انہوں نے سواریاں کرائے پر لیں عرب کہنے لگا میں تمہیں عیر اور احد کی پہاڑیوں میں سے لے جاؤں گا۔ اس سے کہنے لگے جب ان دو پہاڑوں کے درمیان پہنچو تو ہمیں آگاہ کرنا وہ عرب جب سرزمین مدینہ میں پہنچا تو اس نے انہیں بتایا کہ یہ جگہ ہی کوہ عیر اور کوہ احد کے درمیان ہے پھر اس نے اشارے سے بتایا کہ یہ عیر ہے اور یہ احد ہے یہودی اس کی سواریوں سے اتر پڑے اور کہنے لگے ہم اپنے مقصد تک آپہنچے ہیں اب ہمیں تیری سواریوں کی ضرورت نہیں اب تو جہاں جانا چاہے جا سکتا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے بھائیوں کو خط لکھا کہ ہم نے وہ زمین تلاش کر لی ہے تم بھی ہماری طرف کوچ کرو۔ انہوں نے جواب میں لکھا کہ ہم چونکہ یہاں سکونت اختیار کر چکے ہیں گھر بار اور مال و منال کا اہتمام کر چکے ہیں اور یہاں سے اس سرزمین کا کوئی زیادہ فاصلہ بھی نہیں جس وقت پیغمبر موعود ہجرت کر کے آئیں گے ہم بھی تمہارے پاس آ جائیں گے۔

وہ سرزمین مدینہ ہی میں رہے اور بہت مال و دولت جمع کر لی یہ خبر تبع نامی ایک بادشاہ کو پہنچی اس نے آ کر ان سے جنگ کی یہودی اپنے قلعوں میں قلعہ بند ہو گئے اس نے ان سب کا محاصرہ کر لیا پھر انہیں امان دے دی وہ بادشاہ کے پاس

آئے تبع نے کہا مجھے یہ سرزمین پسند آئی ہے اور میں یہاں رہنا چاہتا ہوں انہوں نے جواب میں کہا ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ سرزمین ایک پیغمبر کا مقام ہجرت ہے اس کے علاوہ کوئی شخص بادشاہ کی حیثیت سے نہیں رہ سکتا تبع کہنے لگا کہ میں اپنے خاندان میں سے کچھ لوگ یہاں چھوڑ دیتا ہوں تاکہ جب وہ پیغمبر آئے تو اس کی مدد کریں لہٰذا اس نے دو مشہور قبائل اوس اور خزرج کو یہاں ٹھہرا دیا جب ان قبیلوں نے خوب مال و دولت جمع کر لیا تو یہودیوں کے مال پر تجاوز کرنے لگے یہودی ان سے کہا کرتے تھے: جب محمد ﷺ مبعوث ہوں گے تو تمہیں ہمارے علاقے سے نکال دیں گے اور جب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ مبعوث ہوئے تو اوس اور خزرج آپ پر ایمان لے آئے جو انصار مشہور ہوئے۔

مگر یہودیوں نے آپ کا انکار کیا آیت ''وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا'' کا یہی مفہوم ہے۔

وہی لوگ جو خاص عشق و محبت کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کے لئے آئے تھے جو اوس و خزرج کے مقابلے میں فخر کرتے تھے کہ ایک رسول مبعوث ہوگا اور ہم اس کے یار و مددگار ہوں گے جب رسول اللہ ﷺ کی ہجرت ہوئی اور آپ ﷺ نے ان کے سامنے قرآن کی تلاوت کی' وہی قرآن جو تورات کی تصدیق کرتا تھا تو وہ اس سے کفر کرنے لگے۔

تفسیر

ان آیات میں بھی یہودیوں اور ان کی زندگی کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے جیسا کہ شان نزول میں ہے یہ لوگ رسول خدا پر ایمان لانے کے شوق اور دل بستگی کے ساتھ مدینہ میں آخر سکونت پذیر ہوئے تھے تورات میں پیغمبر ﷺ کی نشانیوں کو دیکھتے تھے اور بے چینی سے آپ ﷺ کے ظہور کا انتظار کرتے تھے لیکن جب خدا کی طرف سے ان کے پاس کتاب (قرآن) آئی جو ان علامتوں کے مطابق تھی جو یہودوں کے پاس تھیں حالانکہ اس سے پہلے وہ اپنے آپ کو اس پیغمبر کے ظہور کی خوشخبری دیتے تھے اور پیغمبر کے ظہور کے ذریعے دشمنوں پر فتح پانے کی امید لگائے بیٹھے تھے اور جب کہ وہ کتاب اور پیغمبر کو پہلے سے پہچانتے تھے پھر بھی اس سے کفر اختیار کر بیٹھے۔

کافروں پر خدا کی لعنت ہو۔

بعض اوقات انسان کسی حقیقت کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتا ہے لیکن اس کے قریب پہنچ کر جب اسے اپنے ذاتی فائدے کے خلاف پاتا ہے تو ہوا و ہوس کے نتیجے میں اسے ٹھوکر کر مار دیتا ہے اور اسے چھوڑ دیتا ہے بلکہ کبھی تو اس کی مخالفت میں کھڑا ہو جاتا ہے۔
لیکن یہودیوں نے تو انتہائی خسارے کا سودا کیا جو لوگ پیغمبر موعود کی پیروی کے لئے اپنے علاقے کو چھوڑ کر بہت سی مشکلات جھیل کر سر زمین مدینہ میں سکونت پذیر ہوئے تھے تاکہ اپنے مقصود تک پہنچ جائیں جب موقع آیا تو منکرین اور کافرین کی صفت میں کھڑے ہو گئے لہٰذا اس مقام پر قرآن کہتا ہے کیسی بری قیمت پر انہوں نے اپنے آپ کو فروخت کیا'

وہ حسد کی بناء پر اس چیز سے کافر ہو گئے جو خدا نے نازل کی تھی انہیں اعتراض تھا کہ کیوں خدا اپنے فضل سے جس شخص پر

چاہتا ہے اپنی آیات نازل کر دیتا ہے۔

گویا اس انتظار میں تھے کہ پیغمبر موعود بنی اسرائیل میں سے اور خود انہی میں سے ہوگا لیکن جب کسی اور پر قرآن نازل ہوا تو انہیں تکلیف پہنچی اور وہ سیخ پا ہو گئے۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہے لہٰذا خدا کے غضب نے یکے بعد دیگرے انہیں گھیر لیا اور کافروں کے لئے ذلیل وخوار کرنے والا عذاب ہے۔

(۹۱)وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا نُؤۡمِنُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا وَ يَكۡفُرُوۡنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَ هُوَ الۡحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمۡ ؕ قُلۡ فَلِمَ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنۡ قَبۡلُ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ	اور جب ان سے کہا جائے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لے آ ؤ تو وہ کہتے ہیں ہم تو اس چیز پر ایمان لائیں گے جو ہم پر نازل ہوئی اور اس کے علاوہ سے کفر اختیار کر لیتے ہیں جب کہ وہ حق ہے اور ان آیات کی تصدیق کرتا ہے جو ان پر نازل ہو چکی ہیں کہہ دیجئے کہ اگر (سچ کہتے ہو اور) تم مومن ہو تو پھر اس سے پہلے انبیاء کو قتل کیوں کیا کرتے تھے۔
(۹۲)وَ لَقَدۡ جَآءَكُمۡ مُّوۡسٰى بِالۡبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذۡتُمُ الۡعِجۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ وَ اَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ	نیز موسیٰ تمہارے لئے سب معجزات لے کر آ ئے (تو پھر کیوں تم نے) بعدازاں بچھڑے کو منتخب کر لیا اور اس عمل سے تم نے اپنے اوپر ظلم کیا۔
(۹۳)وَ اِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَكُمۡ وَ رَفَعۡنَا فَوۡقَكُمُ الطُّوۡرَ ؕ خُذُوۡا مَاۤ اٰتَيۡنٰكُمۡ بِقُوَّةٍ وَّ اسۡمَعُوۡا ؕ قَالُوۡا سَمِعۡنَا وَ عَصَيۡنَا ۚ وَ اُشۡرِبُوۡا فِىۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡعِجۡلَ بِكُفۡرِهِمۡ ؕ	اور تم سے ہم نے وہ پیمان لیا (تمہاری نافرمانی کی وجہ سے) تم پر کوہ طور بلند کیا (اور تم سے کہا) یہ قوانین و احکام جو ہم نے تمہیں دیئے ہیں انہیں مضبوطی سے تھامے رکھو اور (صحیح طرح سے) سنو۔ تم نے کہا: ہم نے سن لیا ہے اور پھر نافرمانی کی ہے اور کفر کے نتیجے میں بچھڑے کی محبت سے تمہارے دلوں کی آبیاری ہوئی۔

قُلۡ بِئۡسَمَا يَاۡمُرُكُمۡ بِهٖۤ اِيۡمَانُكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ	(اے رسول ان سے) کہہ دو اگر تم ایمان رکھتے ہو تو کہہ دو کہ تمہارا ایمان تمہیں کیسا برا حکم دیتا ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات کی تفسیر میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ یہودیوں نے ان زحمتوں اور مشکلوں کے باوجود جوانہوں نے تورات کے پیغمبر موعود تک پہنچنے کے لئے جھیلیں۔ اب حسد کی وجہ سے یا اس بناء پر کہ یہ پیغمبر بنی اسرائیل میں سے نہیں ہے یا اس لئے کہ ان کے ذاتی فائدے خطرے میں پڑ جائیں گے یا پھر اور وجوہات کے باعث اس کی اطاعت اور اس پر ایمان لانے سے منہ پھیر لیا۔

زیر بحث آیات میں سے پہلی میں یہودیوں کے اس تعصب نسلی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو پوری دنیا میں مشہور ہے فرمایا جس وقت ان سے کہا جائے کہ جو کچھ خدا نے نازل فرمایا ہے اس پر ایمان لے آؤ تو کہتے ہیں ہم تو اس پر ایمان لائیں گے جو ہم پر نازل ہوا ہے نہ کہ دوسری قوموں پر اور اس کے علاوہ سے کفر اختیار کریں گے۔

نہ وہ انجیل پر ایمان لائے ہیں اور نہ قرآن پر بلکہ وہ فقط نسلی امتیاز اور اپنے ذاتی فائدے نظر میں رکھے ہوئے ہیں جب کہ قرآن جو محمد ﷺ پر نازل ہوا ہے وہ حق ہے اور ان نشانیوں اور علامتوں کے مطابق ہے جو پیغمبر موعود کے بارے میں وہ اپنی کتاب میں پڑھ چکے ہیں۔

اس کے بعد قرآن ان کے جھوٹ سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہتا ہے اگر تمہارے ایمان نہ لانے کا بہانہ یہ ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تم میں سے نہیں ہے تو پھر گذشتہ زمانے میں اپنے انبیاء پر ایمان کیوں نہیں لائے ہو اور کیوں انہیں قتل کرتے رہے ہو اگر سچ کہتے ہو اور ایمان دار ہو۔

(۹۲) ان کے کذب کو ظاہر کرنے کے لئے قرآن صرف اسی بات پر اکتفاء نہیں کرتا بلکہ بعد کی آیت میں ان کے خلاف ایک اور سند پیش کرتا ہے قرآن کہتا ہے موسیٰ علیہ السلام نے تمام معجزات و دلائل تمہارے سامنے پیش کئے لیکن تم نے اس کے بعد بچھڑے کو منتخب کیا اور اس کام کی وجہ سے تم ظالم وستم گار ٹھہرے۔

اگر تم سچ کہتے ہو کہ تم اپنے پیغمبر پر ایمان رکھتے ہو تو پھر یہ بچھڑے کی پرستش اور وہ بھی توحید پر واضح دلائل کے بعد کیا تھا یہ کیسا ایمان تھا جو صرف موسیٰ علیہ السلام کے اوجھل ہونے اور کوہ طور پر جانے سے تمہارے دلوں سے زائل ہو گیا اور کفر نے ایمان کی جگہ اور بچھڑے نے توحید کا مقام حاصل کر لیا۔ بیشک اس کام سے تم نے اپنے اوپر، اور معاشرے پر اور آئندہ نسلوں پر ظلم کیا تھا۔

(۹۳) زیر بحث تیسری آیت میں ان کے دعویٰ کے بطلان پر ایک اور سند پیش کی گئی ہے اس ضمن میں کوہ طور کے عہد و پیمان کا ذکر کیا گیا ہے فرمایا ہم نے تم سے پیمان لیا اور کوہ طور کو تمہارے سروں پر بلند کیا اور تم سے کہا کہ جو حکم ہم تمہیں دیں اسے مضبوطی سے تھامے رہو اور صحیح طور سے سنو لیکن تم نے کہا ہم نے سن کر اس کی مخالفت کی۔

بے شک ان کے دلوں کی بچھڑے کی محبت سے آبیاری ہوئی اور کفر نے ان پر غلبہ حاصل کر لیا۔

شرک اور دنیا پرستی نے جس کی مثال سامری کے بنائے ہوئے سونے کے بچھڑے سے ان کی محبت ہے، ان کے تار و پود میں اثر ونفوذ پیدا کر لیا تھا اور ان کے سارے وجود میں اس کی جڑیں پہنچ چکی تھیں۔ اسی بناء پر وہ خدا کو بھول گئے تھے۔

عجیب مسخرہ پن ہے یہ کیسا ایمان ہے جو خدا کے پیغمبروں کو قتل کرنے کی اجازت دیتا ہے جو بت پرستی اور بچھڑے کی پرستش کو بھی روا جانتا ہے اور خدا سے باندھے ہوئے محکم میثاقوں کو طاق نسیاں کر دیتا ہے اگر تم مومن ہو تو تمہارا ایمان تمہیں کیسے برے احکام دیتا ہے۔

(۹۴) قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ	کہہ دو اگر (جیسا کہ تم دعوی کرتے ہو) خدا کے ہاں آخرت کا گھر دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر تمہارے لئے مخصوص ہے تو پھر مرنے کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو۔
(۹۵) وَ لَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ	لیکن وہ برے اعمال کی صورت میں جو آگے بھیج چکے ہیں ان کے باعث کبھی مرنے کی تمنا نہیں کریں گے اور خدا ظالموں سے پوری طرح آگاہ ہے۔
(۹۶) وَ لَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚۛ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚۛ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَ مَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۧ	اور (اے رسول) تم انہیں سب سے زیادہ اس دنیوی زندگی پر حریص پاؤ گے (یہاں تک کہ) ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ ہزار سال عمر پائے حالانکہ یہ طولانی عمر (بھی) اسے خدا کے عذاب سے نہیں بچا سکے گی اور خدا ان کے اعمال کو دیکھتا ہے۔

تفسیر

خود پسند گروہ

قرآن مجید کی مختلف آیات کے علاوہ بھی یہودیوں کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اپنے آپ کو بلند نسل سمجھتے تھے اور یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ وہی انسانی معاشرے کے منتخب پھول ہیں اور بہشت انہی کے لئے بنائی گئی ہے اور جہنم کی آگ ان سے زیادہ سروکار نہیں رکھے گی وہ خدا کے بیٹے اور خاص دوست ہیں خلاصہ یہ کہ ''آنچہ خوباں ہمہ دارند انہا تنہا دارند'' یعنی تمام عالم کی اچھائیاں انہی میں جمع ہیں۔

اس آیت میں اور آنے والی آیات میں قرآن مجید انہیں دندان شکن جواب دیتا ہے اور کہتا ہے اگر (ایسا ہی ہے جیسا کہ) تم سمجھتے ہو کہ آخرت کا گھر خدا کے ہاں باقی لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے لئے مخصوص ہے تو پھر موت کی تمنا کرو اگر سچ کہتے ہو۔

یہودی چاہتے تھے کہ وہ یہ بات کر کے مسلمانوں کو آزردہ خاطر کریں کہ بہشت تو یہودیوں کے لئے مخصوص ہے یا یہ کہ ہم تو دوزخ میں بس چند دن جلیں گے اور یا کہتے کہ جنت میں صرف وہی جائے گا جو یہودی ہوگا۔قرآن نے ان کے اس جھوٹ سے پردہ اٹھایا ہے کیونکہ جب وہ دنیا کی زندگی کو کسی طرح ترک کرنے کو تیار نہیں تو یہی ان کے جھوٹے ہونے کی محکم دلیل ہے۔

(۹۵) بعد والی آیت میں قرآن مزید کہتا ہے اپنے آگے بھیجے ہوئے برے اعمال کی وجہ سے وہ کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے۔

جی ہاں ....وہ جانتے تھے کہ ان کے اعمال ناموں میں کیسی سیاہیاں موجود ہیں وہ اپنے قبیح اور سنگین گناہوں سے مطلع تھے۔خدا بھی ان ظالموں کے اعمال سے آگاہ ہے۔اسی لئے ان کے لئے آخرت کا گھر عذاب، سختی اور رسوائی کا گھر ہے اور اسی بناء پر وہ اس کی خواہش نہیں رکھتے۔

(۹۶) محل بحث آخری آیت مادی چیزوں کے متعلق ان کی شدید حرص کا تذکرہ یوں کرتی ہے: انہیں تم اس زندگی پر سب سے زیادہ حریص پاؤ گے۔ یہاں تک کہ مشرکین سے بھی بڑھ کر مال و دولت کی ذخیرہ اندوزی میں حریص، دنیا پر قبضہ کرنے میں حریص اور سب کچھ اپنے لئے سمجھنے میں حریص۔ یہاں تک کہ یہ مشرکین سے بھی بڑھ کر حریص ہیں حالانکہ مشرکین کو فطری طور پر مال جمع کرنے میں سب سے زیادہ حریص ہونا چاہئے۔

ان میں سے ہر کوئی چاہتا ہے کہ ہزار سال زندہ رہے۔زیادہ ثروت جمع کرنے کے لئے یا سزا کے خوف سے۔

ہاں ......وہ موت سے ڈرتے ہیں اور ہزار سالہ عمر کی تمنا کرتے ہیں لیکن یہ طولانی عمر بھی انہیں عذاب خدا سے نہیں بچا سکے گی۔

اگر وہ گمان کرتے ہیں کہ خدا ان کے اعمال سے آگاہ نہیں ہے تو وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔خدا ان کے اعمال کے بارے میں بصیر و بینا ہے۔

(۹۷) قُلۡ مَنۡ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبۡرِيۡلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلۡبِکَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ وَ هُدًى وَّ بُشۡرٰى لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ	(اے رسول! ان یہودیوں کے جواب میں) کہیے جو جبرائیل کا دشمن ہے (درحقیقت خدا کا دشمن ہے) کیونکہ اس نے حکم خدا سے قرآن آپ کے دل پر اتارا ہے جو گذشتہ آسمانی کتب کی تصدیق کرتا ہے اور مومنین کے لئے ہدایت و بشارت ہے۔

(۹۸) مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ	جو شخص خدا فرشتوں خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں جبرئیل اور میکائیل کا دشمن ہے خدا اس کا دشمن ہے کیونکہ خدا کافروں کا دشمن ہے۔

شان نزول

کہتے ہیں جب پیغمبر اکرم ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو ایک دن ابن صوریا (یک یہودی عالم) فدک کے یہودیوں کی ایک جماعت کی ساتھ آپ کے پاس آئے اور آنحضرت سے مختلف سوالات کئے اور وہ نشانیاں جو آپ ﷺ کی نبوت ورسالت کے بارے میں تھیں تلاش کرنے لگا منجملہ ان کے انہوں نے کہا:

اے محمد (ﷺ)! تمہیں نیند کس طرح آتی ہے کیونکہ ہمیں پیغمبر موعود کی نیند کے متعلق اطلاع مل چکی ہے آپ نے فرمایا: ''**تنام عینای و قلبی یقظان**'' یعنی...... میری آنکھ تو سو جاتی ہے لیکن میرا دل بیدار رہتا ہے

وہ کہنے لگے: آپ نے سچ کہا ہے اے محمد (ﷺ)!

پھر بہت سے سوال کیے بعد از اں ابن صوریا نے کہا: ایک بات رہ گئی ہے اگر اس کا صحیح جواب دے دیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے اور آپ کی پیروی کریں گے ذرا بتایئے کہ جو فرشتہ آپ پر وحی لے کر آتا ہے اس کا نام کیا ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا: جبریل (علیہ السلام)۔

ابن صوریا نے کہا: وہ تو ہمارا دشمن ہے وہ تو جہاد اور جنگ کے بارے میں سخت احکام لے کر آتا ہے لیکن میکائیل ہمیشہ سادہ اور راحت بخش احکام لاتا ہے اگر آپ کی وحی کا فرشتہ میکائیل ہوتا تو ہم آپ پر ایمان لے آتے۔

تفسیر

بہانہ ساز قوم

آیت کی شان نزول دیکھنے سے دوبارہ اس بہانہ ساز قوم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے لے کر آج تک یہی روش اختیار کئے رکھی ہے اور ہر زمانے میں حق کے زیر بار آنے کی بجائے بہانے تلاش کئے ہیں۔ یہاں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں بہانہ صرف یہ ہے کہ چونکہ جبریل آپ پر وحی لانے والا فرشتہ ہے جو خدا کے سخت احکام لاتا ہے لہٰذا ہم ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ ہم اس کے دشمن ہیں اگر میکائیل ہوتا تو کوئی حرج نہ تھا اور آسان تھا کہ ہم ایمان لے آئیں۔

ان سے پوچھا جائے کہ کیا خدا کے فرشتے اپنی ڈیوٹی ادا کرنے میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں کیا اصولاً وہ خواہش کے مطابق عمل کرتے ہیں اور اپنی طرف سے کچھ کہتے ہیں؟ وہ تو قرآن کے مطابق ایسے ہیں

ان بہانہ سازیوں کا جواب زیر نظر آیات میں اس طرح دیتا ہے ان سے کہہ دو جو شخص جبرائیل کا دشمن ہے وہ درحقیقت خدا

کا دشمن ہے کیونکہ اس نے تو خدا کے حکم سے آپ کے دل پر قرآن نازل کیا ہے۔

وہ قرآن جو گذشتہ آسمانی کتب کی تصدیق کرتا ہے اور ان کی نشانیوں سے ہم آہنگ ہے۔

وہی جو مومنین کے لئے ہدایت و بشارت کا سبب ہے۔

(۹۸) اس آیت میں یہی مضمون مزید تاکید و تہدید کے ساتھ بیان ہوا ہے فرماتا ہے جو شخص خدا فرشتوں خدا کے پیغمبروں جبرائیل اور میکائیل کا دشمن ہے خدا اس کا دشمن ہے کہ خدا کافروں کا دشمن ہے۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ سب ایک ہی ہیں اور ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور ان میں تشکیک و تفاوت نہیں ہے جو اللہ فرشتے خدا کے رسول جبرائیل و میکائیل بلکہ کسی فرشتے کا دشمن ہے اور جو ان میں تشکیک و تفاوت کا قائل ہے پروردگار اس کا دشمن ہے۔

(۹۹) وَ لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ ۚ وَ مَا یَکۡفُرُ بِهَاۤ اِلَّا الۡفٰسِقُوۡنَ	تیرے لئے ہم نے روشن نشانیاں بھیجیں اور سوائے فاسقین کے کوئی ان کا انکار نہیں کرسکتا۔
(۱۰۰) اَوَ کُلَّمَا عٰهَدُوۡا عَهۡدًا نَّبَذَهٗ فَرِیۡقٌ مِّنۡهُمۡ ؕ بَلۡ اَکۡثَرُهُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ	اور کیا جب بھی (یہودی) کوئی پیمان (خدا و رسول سے) باندھتے ان میں سے ایک گروہ اسے پس پشت نہیں ڈال دیتا تھا۔ اور ان میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے۔
(۱۰۱) وَ لَمَّا جَآءَهُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمۡ نَبَذَ فَرِیۡقٌ مِّنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ ٭ۙ کِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوۡرِهِمۡ کَاَنَّهُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ۫	اور جب بھی خدا کی طرف سے کوئی رسول ان کی طرف آیا جب کہ وہ ان نشانیوں کے مطابق بھی تھا جو ان کے پاس تھیں اور ان میں سے ایک جماعت نے جو حامل کتاب (اور عالم) لوگوں پر مشتمل تھی خدا کی کتاب کو ایسے پس پشت ڈال دیا گویا وہ اس سے بالکل بے خبر تھے۔

شان نزول

مندرجہ بالا پہلی آیت کے سلسلے میں ابن عباس سے شان نزول منقول ہے کہ ابن صوریا نے ڈھٹائی اور عناد کی بناء پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا۔

''تمہاری لائی ہوئی کوئی چیز ہماری سمجھ میں نہیں آتی اور خدا نے تم پر کوئی واضح نشانی نازل نہیں کی کہ ہم تمہاری اتباع کریں''

اس پر زیرنظر آیات نازل ہوئی اور اسے صراحت سے جواب دیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ شان نزول آیات کے مفاہیم کو کبھی محدود نہیں کرسکتا اوران کی کلیت وعمومیت میں کمی نہیں ہوتی اگر چہ ان کے آغاز کا سبب وہی ہوتا تھا۔

تفسیر

پیمان شکن یہودی

زیر بحث پہلی آیت میں قرآن اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کافی دلیلیں روشن نشانیاں اور واضح آیات پیغمبر صلى الله عليه وآله وسلم اکرم کے پاس تھیں جولوگ انکار کرتے وہ دراصل آپ صلى الله عليه وآله وسلم کی دعوت کی حقانیت کو جان چکے تھے لیکن مخصوص اغراض کی خاطر مخالفت میں کھڑے ہوجاتے قرآن کہتا ہے ہم نے تم پر آیات بینات نازل کیں اور فاسقین کے سوا کوئی ان سے کفر نہیں کرتا۔

آیات قرآن پرغور وفکر کرنے سے ہر پاک دل اورحق جوانسان کے لئے راستے واضح اور روشن ہوجاتے ہیں اور ہر کوئی ان آیات کے مطالعہ سے پیغمبر اسلام صلى الله عليه وآله وسلم کی صداقت اور قرآن کی عظمت کو پالیتا ہے لیکن اس حقیقت کوصرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کا دل گناہ کے اثر سے سیاہ نہ ہو چکا ہواور تعجب نہیں کہ فاسق لوگ جوفرمان خدا کی اطاعت سے روگردانی کرتے ہیں اور اپنی صحیح فطرت کوتسلسل گناہ کے باعث گنوا بیٹھتے ہیں وہ کبھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔

(۱۰۰) اس کے بعد یہودیوں کے ایک گروہ کی ایک بہت قبیح صفت یعنی ایفائے عہد کی عدم پاسداری اور پیمان شکنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کیا جب کبھی انہوں نے خدا اور پیغمبر سے عہدو پیان باندھا تو ان میں سے ایک گروہ نے اسے پس پشت نہیں ڈال دیا اوراس کی مخالفت نہیں کی۔

بے شک وہ ایسے ہی ہیں اوران میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے۔

خدانے کوہ طور پر ان سے یہ عہد لیا تھا کہ تورات کے احکام پر عمل کریں گے لیکن انہوں نے یہ عہد توڑ دیا اوراس پر عمل نہیں کیا ان سے یہ عہد بھی لیا گیا تھا کہ پیغمبر موعود (پیغمبر اسلام جن کے آنے کی بشارت تورات میں موجود تھی) پر ایمان لے آئیں انہوں نے اس عہد پر بھی عمل نہیں کیا۔

(۱۰۱) زیر بحث آیات میں سے آخری اس موضوع کوصراحت سے اور گویا تاکید سے بیان کرتی ہے فرمایا! خدا کا بھیجا ہوا ان کے پاس آیا جوان نشانیوں کے مطابق تھا جو ان کے ہاں موجود تھیں ان میں سے ایک جماعت جوصاحب کتاب لوگوں (علماء) پر مشتمل تھی اس نے کتاب خدا کوایسے پس پشت ڈال دیا گویا انہیں علم ہی نہ تھا۔

(۱۰۲)وَ اتَّبَعُوۡا مَا تَتۡلُوا الشَّیٰطِیۡنُ عَلٰی مُلۡکِ سُلَیۡمٰنَ ۚ وَ مَا کَفَرَ سُلَیۡمٰنُ وَلٰکِنَّ الشَّیٰطِیۡنَ کَفَرُوۡا یُعَلِّمُوۡنَ النَّاسَ السِّحۡرَ ٭ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ عَلَی الۡمَلَکَیۡنِ بِبَابِلَ ہَارُوۡتَ وَ مَارُوۡتَ ؕ وَ مَا یُعَلِّمٰنِ مِنۡ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوۡلَاۤ اِنَّمَا نَحۡنُ فِتۡنَۃٌ فَلَا تَکۡفُرۡ ؕ فَیَتَعَلَّمُوۡنَ مِنۡہُمَا مَا یُفَرِّقُوۡنَ بِہٖ بَیۡنَ الۡمَرۡءِ وَ زَوۡجِہٖ ؕ وَ مَا ہُمۡ بِضَآرِّیۡنَ بِہٖ مِنۡ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَ یَتَعَلَّمُوۡنَ مَا یَضُرُّہُمۡ وَ لَا یَنۡفَعُہُمۡ ؕ وَ لَقَدۡ عَلِمُوۡا لَمَنِ اشۡتَرٰىہُ مَا لَہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنۡ خَلَاقٍ ۟ؕ وَ لَبِئۡسَ مَا شَرَوۡا بِہٖۤ اَنۡفُسَہُمۡ ؕ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ

(یہودی) اس کی پیروی کرتے ہیں جو سلیمان کے زمانے میں شیاطین لوگوں کے سامنے پڑھتے تھے سلیمان (نے) کبھی بھی (جادو سے اپنے ہاتھ نہیں رنگے اور وہ) کافر نہیں ہوئے لیکن شیاطین نے کفر کیا ہے اور لوگوں کو اس جادو کی تعلیم دی جو بابل کے دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر نازل ہوا (وہ دونوں فرشتے جادو کرنے کا طریقہ لوگوں کو اسے باطل کرنے کے طریقے سے آگاہ کرنے کے لئے سکھاتے تھے) وہ کسی کو کوئی بھی چیز سکھانے سے پہلے اسے کہتے تھے کہ ہم تیری آزمائش کا ذریعہ ہیں کہیں کافر نہ ہو جانا (اور ان تعلیمات سے غلط فائدہ نہ اٹھانا) لیکن وہ ان دو فرشتوں سے وہ مطالب سیکھتے تھے جن کے ذریعے مرد اور اس کی بیوی میں جدائی ڈال سکیں (نہ یہ کہ اس تعلیم سے جادو کے اثر کو باطل کرنے کے لئے استفادہ کریں) مگر وہ حکم خدا کے بغیر کبھی کسی کو ضرر نہیں پہنچا سکتے وہ صرف انہیں حصوں کو سیکھتے جو ان کے لئے نقصان دہ تھے اور انہیں ان کا کوئی فائدہ نہ تھا اور یقیناً وہ یہ جانتے تھے کہ جو شخص ایسے مال و متاع کا خریدار رہا اسے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ملے گا اور کاش وہ یہ جانتے کہ کس قدر قبیح اور ناپسندیدہ تھی وہ چیز جس کے بدلے وہ اپنے آپ کو بیچتے تھے۔

(۱۰۳)وَ لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۠	اگر وہ توجہ کرتے اور ایمان لے آتے اور پرہیزگاری کو اپنا شیوہ بناتے تو خدا کے پاس جو اس کا بدلا تھا وہ ان کے لئے بہتر تھا کاش یہ لوگ اتنا تو سمجھتے۔

تفسیر

سلیمان علیہ السلام اور بابل کے جادوگر

احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں کچھ لوگ آپ کے ملک میں سحر و جادو کا عمل کرنے لگے حضرت سلیمان علیہ السلام نے حکم دیا کہ تمام تحریریں اور اوراق جمع کر کے ایک مخصوص جگہ پر رکھ دو انہیں محفوظ رکھنا شاید اس بناء پر تھا کہ ان میں سحر و جادو کو باطل کرنے کے لئے مفید مطالب بھی تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی رحلت کے بعد کچھ لوگوں نے انہی تحریروں کو باہر نکالا اور جادو کی ترویج شروع کر دی بعض نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور کہنے لگے کہ سلیمان علیہ السلام بالکل پیغمبر نہ تھے بلکہ وہ اسی سحر اور جادو کی مدد سے ان کے ملک پر قابض تھے وراسی سے وہ خارق عادت امور انجام دیتے تھے۔ بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے بھی ان کی پیروی کی اور جادوگری کے بہت زیادہ دلدادہ ہو گئے یہاں تک کہ تورات سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظہور فرمایا اور آیات قرآنی کے ذریعے خبر دی کہ سلیمان خدا کے پیغمبروں میں سے تھے تو یہودیوں کے بعض احبار و علماء کہنے لگے:

''کیا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر حیرت نہیں جو کہتا ہے سلیمان پیغمبران خدا میں سے تھا جب کہ وہ تو جادوگر تھا''۔

یہودیوں کی یہ گفتگو خدا کے ایک بزرگ پیغمبر پر تہمت وافترا تھی یہاں تک کہ اس کا لازمی نتیجہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی تکفیر تھا کیونکہ ان کے کہنے کے مطابق تو سلیمان علیہ السلام ایک جادوگر تھے اور غلط طور پر اپنے آپ کو پیغمبر کہتے تھے۔

قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام ہرگز کافر نہ تھے بلکہ شیاطین اور لوگوں کو جادو سکھانے والے کافر ہو گئے تھے۔

پہلی زیر بحث آیت یہودیوں کی برائیوں کے ایک اور پہلو کا پتہ دیتی ہے وہ یہ کہ انہوں نے خدا کے بزرگ پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام کو جادوگری کا الزام دیا تھا فرمایا یہ یہودی اس کی پیروی کرتے ہیں جو شیاطین سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں لوگوں کے سامنے پڑھتے تھے۔

بہر حال اس گفتگو کے بعد قرآن مزید کہتا ہے سلیمان کبھی کافر نہیں ہوئے۔ انہوں نے کبھی جادو کو ذریعہ بنایا اور نہ بلاوجہ اپنی رسالت کا دعویٰ کیا۔

لیکن شیاطین کافر ہوئے ہیں اور انہی نے جادو کی تعلیم دی ہے۔

پھر وہ مزید کہتا ہے کہ انہوں نے اس کی پیروی کی جو بابل کے دوفرشتوں ہاروت وماروت پر نازل ہوا۔

ان دوخدائی فرشتوں کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ وہ لوگوں کو جادو کا اثر زائل کرنے کا طریقہ سکھائیں لہٰذا وہ کسی بھی شخص کو کچھ سکھانے سے پہلے کہہ دیتے تھے کہ ہم تمہاری آزمائش کا ذریعہ ہیں کافر نہ ہوجانا اوران تعلیمات سے غلط فائدہ نہ اٹھانا۔

یہ دوفرشتے اس زمانے میں لوگوں کے پاس آئے جب جادو کا بازار گرم تھا اور لوگ جادوگروں کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے اوران فرشتوں نے جادوگروں کے جادو کو باطل کرنے کا طریقہ لوگوں کو سکھایا۔

چونکہ کسی چیز (مثلاً بم) کو بے کار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان پہلے سے اس چیز مثلاً بم کی ساخت سے آگاہ ہو پھر ہی اسے بیکار کرنے کا طریقہ سیکھے لیکن یہودیوں میں سے غلط فائدہ اٹھانے والوں نے اسے زیادہ سے زیادہ جادو پھیلانے کا ذریعہ بنالیا اور اتنا آگے بڑھے کہ ایک عظیم پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام کو بھی متہم کیا کہ اگر مادی عوامل ان کے زیر فرمان ہیں اور جن وانس ان کی فرمانبرداری کرتے ہیں تو یہ سب جادو کی وجہ سے ہے۔

بدکار لوگوں کا یہی طریقہ ہے کہ وہ اپنے برے مسلک اور پروگرام کی توجیہ کے لئے بزرگوں کو اسی مسلک کا پیرو ہونے کا اتہام دیتے ہیں بہرحال وہ اس خدائی آزمائش میں کامیاب نہ ہوسکے وہ ان دوفرشتوں سے ایسے مطالب سیکھتے تھے جن کے ذریعے مرد اوراس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال سکیں۔

مگر خدا کی قدرت ان تمام قدرتوں پر حاوی ہے لہٰذا وہ حکم خدا کے بغیر ہرگز کسی کونقصان نہیں پہنچا سکتے۔

وہ ایسی چیزیں سیکھتے جو ان کے لئے مضر ہوتیں اور نفع بخش نہ ہوتیں۔

انہوں نے اس اصلاحی خدائی پروگرام کی تحریف کردی اور بجائے اس کے کہ وہ اسے اصلاح اور جادو کے مقابلے کا ذریعہ بناتے فساد کا ذریعہ بناڈالا حالانکہ وہ جانتے تھے کہ جو شخص ایسے مال ومتاع کا خریدار ہو اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔

بے شک کتنی بری اور قبیح تھی وہ چیز جس کے بدلے وہ اپنے آپ کو بیچ رہے تھے اے کاش ان میں علم ودانش ہوتی۔

(۱۰۳) انہوں نے جان بوجھ کر اپنی اوراپنے معاشرے کی سعادت ونیک بختی کو ٹھکرادیا اور کفر وگناہ کے گرداب میں غوطہ زن ہوگئے حالانکہ اگر وہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو خدا کے ہاں سے جو بدلہ اور ثواب انہیں ملتا وہ ان کے لئے ان تمام امور سے بہتر ہوتا اے کاش وہ متوجہ ہوتے۔

کوئی شخص اذن خدا کے بغیر کسی چیز پر قادر نہیں

مندرجہ بالا آیت میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ جادوگر اذن پروردگار کے بغیر کسی کونقصان نہیں پہنچا سکتے تھے اس میں جبر واجبار کا مفہوم نہیں یہ توحید کے ایک اساسی اصول کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ اس جہان میں تمام قدرتوں کا سرچشمہ قدرت خدا ہے یہاں تک کہ آگ کا جلانا اور تلوار کا کاٹنا بھی اس کے اذن وفرمان کے بغیر نہیں یہ نہیں ہوسکتا کہ جادوگر عالم آفرینش میں خدا کے ارادے کے برعکس دخیل ہوں اور یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ خدا کی سلطنت میں کوئی اسے محدود کردے بلکہ یہ تو خواص وآثار ہیں جو مختلف موجودات میں

پیدا کئے گئے ہیں بعض ان سے صحیح فائدہ اٹھاتے ہیں اور بعض غلط اور یہ آزادی و اختیار بھی انسانوں کی آزمائش اور ان کے تکامل کے لئے ایک زینہ ہے۔

(۱۰۴)یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ؕ وَ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ	اے یمان والو! ''راعنا'' نہ کہا کرو بلکہ ''انظرنا'' کہا کرو۔اور جو کچھ تمہیں حکم دیا جاتا ہے اسے سنو اور کافروں (نیز استہزا کرنے والوں) کے لئے دردناک عذاب ہے۔
(۱۰۵)مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِیْنَ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْكُمْ مِّنْ خَیْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ	اہل کتاب کفار اور اسی طرح مشرکین پسند نہیں کرتے کہ خدا کی طرف سے تمہیں کوئی خیر و برکت نصیب ہو حالانکہ خدا جسے چاہتا ہے اپنی خاص رحمت سے نوازتا ہے اور خدا بخشنے والا اور بڑے فضل والا ہے۔

شان نزول

مشہور مفسر ابن عباس سے منقول ہے کہ صدر اسلام کے مسلمان جب آنحضرت ﷺ سے گفتگو میں مشغول ہوتے اور آپ ﷺ آیات و احکام الٰہی بیان کر رہے ہوتے تو کبھی کبھی درخواست کرتے کہ ذرا آہستہ گفتگو فرمائیں تا کہ وہ مطلب اچھی طرح سمجھ سکیں اور اپنے سوالات و معروضات بھی پیش کر سکیں اس درخواست کے لئے وہ لفظ ''راعنا'' استعمال کرتے اس لفظ کا مادہ ''الرعی'' ہے جس کا معنی ہے مہلت دینا لیکن یہودی اس کا معنی ایک اور مادہ ''الرعونہ'' کے حوالے سے کرتے جس کا معنی ہے بیوقوف اور احمق ہونا (پہلی صورت میں اس کا مفہوم تھا ہمیں مہلت دیجئے لیکن دوسری صورت میں اس کا معنی ہوتا ہے ہمیں بیوقوف بنایئے) یہاں یہودیوں کے ہاتھ بات آ گئی وہ اسی جملہ سے فائدہ اٹھاتے جو مسلمان کہتے اور پیغمبر اور مسلمانوں سے استہزا اور مذاق کرتے۔

پہلے اوپر والی آیت نازل ہوئی اور غلط فائدہ اٹھانے کا یہ سلسلہ روکنے کے لئے مومنین کو حکم دیا کہ ''راعنا'' کی بجائے ''انظرنا'' استعمال کرو جو وہی مفہوم ادا کرتا ہے لیکن ہٹ دھرم دشمن (یہودی) کے لئے سند نہیں ہے۔

تفسیر

دشمن کے ہاتھ بہانہ مت دو

شان نزول میں جو بات بیان کی گئی ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے اے ایمان والو! جب پیغمبر سے آیات قرآن سمجھنے کے لئے مہلت مانگو تو ''راعنا'' نہ کہو بلکہ ''انظرنا'' کہو کیونکہ اس کا بھی مفہوم وہی ہے لیکن دشمن کے لئے سند نہیں بنتا۔اور جو حکم تمہیں دیا جا

رہا ہے اسے سنو کافروں اوراستہزاءکرنے والوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان اپنے پروگراموں میں دشمن کے ہاتھ کوئی بہانہ نہ آنے دیں یہاں تک کہ ایک چھوٹا سا جملہ جو غلط مقاصد میں دشمن کے لئے مقام بحث بن سکے اس سے بھی اجتناب کرنا چاہئے قرآن مخالفین کی طرف سے مومنین سے غلط فائدے اٹھانے کی روک تھام کی نصیحت کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ایک لفظ تک ایسا نہ کہیں جس کے ایسے مشترک معنی ہوں کہ دشمن جس کے دوسرے معنی کو غلط استعمال کر سکے اور مومنین کی نفسیاتی کمزوری کا باعث بنے جب دامن کلام اور تعبیر سخن وسیع ہے تو کیا ضرورت پڑی ہے کہ انسان ایسے جملے استعمال کرے جو قابل تحریف ہوں اور غلط مفاد کا باعث ہوں۔

جب اسلام اتنی اجازت نہیں دیتا کہ دشمن کے ہاتھ کوئی ایسا بہانہ دیا جائے تو بڑے بڑے مسائل میں مسلمانوں کی ذمہ داری واضح ہو جاتی ہے اب بھی ہم سے کبھی ایسے کام سرزد ہو جاتے ہیں جو داخلی دشمن کے لئے یا بین الاقوامی مجالس میں بری تفسیر کا سبب ہوتے ہیں اور لاؤڈ سپیکر پر دشمن کے پراپیگنڈہ کے لئے سودمند ہوتے ہیں ایسے میں ہماری ذمہ داری ہے کہ ایسے کاموں سے پرہیز کریں اور بلاوجہ داخلی اور خارجی دشمنوں کے ہاتھ بہانہ نہ دیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ لفظ ''راعنا'' مندرجہ بالا پس منظر کے علاوہ ایک غیر مؤدبانہ انداز کا بھی حامل ہے کیونکہ ''راعنا'' مراعات کے مادہ باب مفاعلہ سے ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم ہماری اعانت کرو ہم تم سے مراعات کریں گے چونکہ یہ غیر مؤدبانہ تعبیر تھی علاوہ ازیں یہودی بھی اس سے غلط فائدہ اٹھاتے تھے) قرآن نے مسلمانوں کو اس سے منع کر دیا تاکہ ایک تو زیادہ مؤدبانہ لفظ استعمال کریں اور دوسرا دشمن کے ہاتھ بہانہ نہ دیں۔

(۱۰۵) زیرنظر دوسری آیت مشرکین اور اہل کتاب کی مومنین سے کینہ پروری اور عداوت سے پردہ اٹھاتی ہے فرمایا اہل کتاب کفار اور اسی طرح مشرکین پسند نہیں کرتے کہ خدا کی طرف سے کوئی خیر و برکت تم پر نازل ہو۔

لیکن یہ تمنا آرزو سے زیادہ کچھ نہیں کیونکہ خداوند عالم اپنی رحمت اور خیر و برکت جس شخص سے چاہتا ہے مخصوص کر دیتا ہے۔

اور خدا بخشش اور فضل عظیم کا مالک ہے۔

بے شک دشمن اپنے شدید کینہ اور حسد کے باعث پسند نہ کرتے تھے کہ مسلمانوں پر یہ اعزاز اور عطیہ الٰہی دیکھیں کہ خدا کی طرف سے ایک عظیم پیغمبر ایک بہت عظیم آسمانی کتاب کے ساتھ ان کے نصیب ہو لیکن کیا کوئی فضل رحمت خدا کو کسی پر نازل ہونے سے روک سکتا ہے۔

(۱۰۶)مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا ؕ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ	ہم کسی آیت کو منسوخ نہیں کرتے یا اس کے نسخ کو تاخیر میں نہیں ڈالتے مگر یہ کہ اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسی کوئی آیت لے آتے ہیں کیا تم نہیں جانتے کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

(۱۰۷)اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیۡرٍ	کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمینوں کی ملکیت خدا کے لئے ہے(اور وہ حق رکھتا ہے کہ مصالح کے مطابق احکام میں تغیر وتبدل کر سکے)اور خدا کے علاوہ تمہارا کوئی سر پرست اور یار و مددگار نہیں۔

تفسیر

ان آیات میں بھی مسلمانوں کے خلاف یہودیوں کی سازشوں اور وسوسوں سے متعلق گفتگو کی گئی ہے کبھی تو مسلمانوں سے وہ کہتے تھے دین تو یہودیوں کا دین ہے اور کبھی کہتے قبلہ تو یہودیوں ہی کا قبلہ ہے اسی لئے تو تمہارا پیغمبر ہمارے قبلہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتا ہے لیکن جب قبلہ کا حکم بدل دیا گیا اور اس سورہ کی آیت ۱۴۴ کے مطابق مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ اب وہ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں اب یہودیوں کے ہاتھ پہلے والی بات تو نہ رہی لیکن وہ نیا راگ الاپنے لگے اور کہنے لگے اگر قبلہ اول صحیح تھا تو یہ دوسرا حکم کیا ہے اور اگر دوسرا حکم صحیح ہے تو پھر تمہارے پہلے اعمال باطل ہیں قرآن ان آیات میں ان کے اعتراضات کا جواب دیتا ہے اور مومنین کے دلوں کو روشن کرتا ہے قرآن کہتا ہے ہم کسی حکم کو منسوخ نہیں کرتے یا اس کی تنسیخ کو تاخیر میں نہیں ڈالتے مگر اس سے بہتر یا اس جیسے کسی دوسرے حکم کو اس کی جگہ نافذ کر دیتے ہیں۔اور خدا کے لئے یہ آسان ہے کیا تم جانتے نہیں ہو کہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

(۱۰۷) زیر نظر دوسری آیت میں اس کی تاکید کی گئی ہے کیا جانتے نہیں ہو کہ آسمانوں اور زمینوں کی حکومت خدا کے لئے ہے(اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ)۔

وہ حق رکھتا ہے کہ مصالح کے مطابق اپنے احکام میں ہر قسم کا تغیر وتبدل کرے اور وہ اپنے بندوں کے مصالح سے زیادہ آگاہ اور زیادہ بصیر ہے اور کیا تم جانتے نہیں ہو کہ خدا کے علاوہ تمہارا کوئی سر پرست اور یار و مددگار نہیں ہے۔

(۱۰۸)اَمۡ تُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَسۡـَٔلُوۡا رَسُوۡلَکُمۡ کَمَا سُئِلَ مُوۡسٰی مِنۡ قَبۡلُ ؕ وَ مَنۡ یَّتَبَدَّلِ الۡکُفۡرَ بِالۡاِیۡمَانِ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ	کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے پیغمبر سے اس طرح کے (نامعقول) تقاضے کرو جو اس سے پہلے موسیٰ سے کئے گئے تھے (اور اس بہانے سے ایمان لانے سے روگردانی کرو) جو شخص ایمان سے کفر کا تبادلہ کرے (ایمان کی بجائے اسے قبول کر لے) وہ (عقل و فطرت کی) راہ مستقیم سے گمراہ ہو چکا ہے۔

شان نزول

کتب تفاسیر میں اس آیت کی شان نزول کے سلسلے میں مختلف مطالب نظر آتے ہیں اور نتیجہ کے اعتبار سے ایک

جیسے ہیں۔

ابن عباس سے منقول ہے کہ وہب بن زید اور رافع بن حرملہ رسول خدا ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے خدا کی طرف سے کوئی خط ہمارے نام پیش کیجئے تا کہ ہم اسے پڑھ کر ایمان لے آئیں یا ہمارے لئے نہریں جاری کیجئے تا کہ ہم آپ کی پیروی کریں

اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

بے بنیاد بہانے

اس آیت کے مخاطب اگر چہ یہودی نہیں ہیں بلکہ کمزور ایمان والے مسلمان یا مشرکین ہیں لیکن جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ یہ یہودیوں کی سرگذشت سے غیر متعلق بھی نہیں۔ غالبا قبلہ کی تبدیلی کے بعد کی بات ہے کہ کچھ مسلمانوں اور مشرکین نے یہودیوں کے پراپیگنڈا کے زیر اثر پیغمبر اسلام ﷺ سے چند بے محل اور نامعقول تقاضے کئے جن کے نمونے شان نزول میں بیان ہو چکے ہیں خداوند تعالی انہیں ایسے سوالوں سے منع کرتے ہوئے فرماتا ہے کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے پیغمبر سے وہی نامعقول تقاضے کرو جو اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام سے کئے گئے ہیں تا کہ ان بہانہ سازیوں سے ایمان سے رخ پھیر سکو۔

یہ اشتباہ نہیں ہونا چاہئے کہ اسلام علمی اور منطقی سوالات سے منع کرتا ہے یا دعوت نبی کی حقانیت سمجھنے کے لئے معجزہ طلبی سے روکتا ہے کیونکہ فہم وادراک اور ایمان کے یہی ذرائع ہیں۔

درحقیقت قرآن لوگوں کو یہ تنبیہ کرنا چاہتا ہے کہ اگر تم اسی طرح کے نامعقول تقاضے کرتے رہے تو تمہارے سر پر بھی وہی عذاب آئے گا جو قوم موسی کے سر پر آیا تھا۔

(۱۰۹) وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَ اصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ	بہت سے اہل کتاب اس حسد کی بناء پر جو ان کے وجود میں جڑ پکڑ چکا ہے یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں اسلام وایمان کے بعد پہلی حالت کی طرف پھیر لے جائیں حالانکہ ان پر حق مکمل طور پر واضح ہو چکا ہے تم انہیں معاف کر دو اور ان سے درگذر کر و یہاں تک کہ خدا اپنا فرمان (جہاد) بھیجے یقیناً خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

(۱۱۰)وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ وَ مَا تُقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِکُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ تَجِدُوۡہُ عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ	نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو (اور ان دو ذرائع سے اپنے معاشرے کی روح اور جسم کو طاقت ور بنالو اور جان لو کہ) ہر کار خیر جو اپنے لئے (دار آخرت کی طرف) آگے بھیجتے ہو اسے خدا کے ہاں موجود پاؤ گے۔ بیشک خدا تمہارے اعمال سے آگاہ ہے۔

تفسیر

ہٹ دھرم حاسد

بہت سے اہل کتاب ایسے تھے کہ صرف اس پر بس نہ کرتے تھے کہ خود دین اسلام قبول نہ کریں بلکہ انہیں اصرار تھا کہ مومنین بھی اپنے ایمان سے پلٹ آئیں اور اس کا سبب حسد کے سوا کچھ نہ تھا۔

قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیات میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے فرمایا بہت سے اہل کتاب حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہیں اسلام پر ایمان لانے کے بعد کفر کی طرف پلٹا دیں حالانکہ ان پر حق مکمل طور پر واضح ہو چکا ہے۔

اس مقام پر قرآن مجید مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ ایسے کجرو اور تباہ کن تقاضوں کے مقابلے میں تم انہیں معاف کر دو اور ان سے درگذر کرو یہاں تک کہ خدا خود اپنا فرمان بھیجے کیونکہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

(۱۱۰) بعد کی آیت جس میں مومنین کو دو اہم اصلاحی احکام دیئے گئے ہیں ایک نماز جو انسان اور خدا کے درمیان مضبوط ربط پیدا کرتی ہے اور دوسرا زکوۃ جو معاشرے کے افراد کے لئے ایک دوسرے سے وابستگی کی رمز ہے اور یہ دونوں امور دشمن پر کامیابی کے لئے ضروری ہیں فرمایا: نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور ان دو ذرائع سے اپنی روح اور جسم کو طاقت بخشو۔

مزید فرمایا: یہ خیال نہ کرو کہ جو نیکی کے کام تم کرتے ہو اور جو مال راہ خدا میں خرچ کرتے ہو وہ ختم ہو جاتے ہیں نہیں ایسا نہیں بلکہ جو نیکیاں تم آگے بھیجتے ہو انہیں خدا کے ہاں (دار آخرت میں) موجود پاؤ گے۔ خدا تمہارے تمام اعمال کو دیکھتا ہے۔ وہ پورے طور پر جانتا ہے کہ کونسا عمل تم نے خدا کے لئے انجام دیا ہے اور کون سا اس کے غیر کے لئے۔

(۱۱۱)وَ قَالُوۡا لَنۡ یَّدۡخُلَ الۡجَنَّۃَ اِلَّا مَنۡ کَانَ ہُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی ؕ تِلۡکَ اَمَانِیُّہُمۡ ؕ قُلۡ ہَاتُوۡا بُرۡہَانَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ	وہ کہتے ہیں یہودیوں اور عیسائیوں کے علاوہ ہرگز کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا یہ تو صرف ان کی تمنّا ہے (اے رسول) کہئے کہ اگر سچے ہو تو (اس دعویٰ پر) اپنی دلیل پیش کرو۔

(۱۱۲)بَلٰی ۚ مَنۡ اَسۡلَمَ وَجۡهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحۡسِنٌ فَلَهٗۤ اَجۡرُهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ ۪ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ۪	جی ہاں! جو بھی خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرلے اور نیکو کار رہو تو اس کا اجر اس کے پروردگار کے پاس مسلّم ہے ان کے لئے کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

تفسیر

بہشت کی انحصار طلبی

مندرجہ بالا آیات میں قرآن یہودیوں اور عیسائیوں کے ایک اور فضول اور نامعقول دعویٰ کی طرف اشارہ کرکے انہیں دندان شکن جواب دیتا ہے کہتا ہے وہ یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہودی و نصاریٰ کے علاوہ ہرگز کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

قرآن دونوں گروہوں کے دعوی کا ایک ہی جگہ جواب دیتا ہے پہلے فرماتا ہے یہ تو ان کی فقط آرزو ہے (جو کبھی پوری نہ ہو گی۔ پھر پیغمبر کو مخاطب کرکے فرماتا ہے۔ اگر تم سچے ہو تو اپنے دعوی پر کوئی دلیل پیش کرو۔

(۱۱۲) یہ حقیقت ثابت ہونے کے بعد کہ ان کے پاس ان کے دعوی کی کوئی دلیل نہیں اور ان کے لئے اختصاص جنت کا دعوی صرف خواب و خیال ہے جو ان کے سروں پر سوار ہے جنت میں داخل ہونے کا اصلی و حقیقی قانون کلی بیان کرتا ہے فرماتا ہے ہاں تو جو خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرلے اور نیکو کار رہو اس کا اجر و ثواب اس کے پروردگار کے ہاں مسلّم ہے۔ اس لئے ایسے اشخاص کے لئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

راہ توحید کے راہیوں کے لئے خوف و غم نہیں

اس کی دلیل واضح ہے کیونکہ وہ صرف خدا سے ڈرتے ہیں اور کسی سے گھبراتے نہیں لیکن بیہودہ مشرک ہر چیز سے ڈرتے رہتے ہیں اور اس کی گفتگو بدحالی فضول رسم و رواج اور ایسی ہی بہت سی چیزیں ہیں جن سے وہ خوفزدہ رہتے ہیں۔

(۱۱۳)وَ قَالَتِ الۡيَهُوۡدُ لَيۡسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَىۡءٍ ۪ وَّ قَالَتِ النَّصٰرٰى لَيۡسَتِ الۡيَهُوۡدُ عَلٰى شَىۡءٍ ۙ وَّ هُمۡ يَتۡلُوۡنَ الۡكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ مِثۡلَ قَوۡلِهِمۡ ۚ	یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کی (خدا کے ہاں) کوئی حیثیت و وقعت نہیں اور عیسائی (بھی) کہتے ہیں کہ یہودیوں کی کوئی حیثیت نہیں (اور وہ باطل پر ہیں) حالانکہ دونوں گروہ خدا کی کتاب پڑھتے ہیں (اور انہیں ایسے تعصّبات اور کینوں سے علیحدہ رہنا چاہیئے) نادان (اور مشرک) لوگ بھی ان کی سی باتیں کرتے ہیں

فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ	(حالانکہ یہ اہل کتاب ہیں اور وہ بت پرست) خداوند عالم قیامت کے دن ان کے اختلاف کا فیصلہ کرے گا۔

شان نزول

بعض مفسرین نے ابن عباس سے یوں نقل کیا ہے۔

جب نجران کے عیسائیوں کا ایک گروہ رسول خدا کی خدمت میں حاضر ہوا تو علماء یہود کا ایک گروہ بھی وہاں موجود تھا عیسائیوں اور ان کے درمیان آنحضرت ﷺ کے سامنے ہی جھگڑا شروع ہو گیا رافع بن حرملہ جو ایک یہودی تھا اس نے عیسائیوں کی طرف منہ کر کے کہا تمہارے دین کی کوئی اساس نہیں ہے نیز اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور انجیل کا انکار کیا نجران کے عیسائیوں میں سے ایک شخص نے بعینہ یہی جملہ اس کے جواب میں کہا کہنے لگا یہودیوں کے مذہب کی کوئی بنیاد نہیں اور اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور ان کی کتاب تورات کا انکار کیا اسی اثناء میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور دونوں گروہوں کو ان کی غلط اور نادرست گفتگو پر ملامت کی۔

تفسیر

وہ اختلاف جو انحصار طلبی سے پیدا ہو جاتے ہیں

گذشتہ آیات میں ہم نے یہود و نصاریٰ کی ایک جماعت کے کچھ بے دلیل دعوؤں کو ملاحظہ کیا زیر بحث آیت نشاندہی کرتی ہے کہ بے دلیل دعویٰ نتیجہ تضاد ہوتا ہے اور ہر گروہ اپنی اجارہ داری کا خواہشمند ہوتا ہے ارشاد ہے یہودی کہتے ہیں عیسائیوں کو خدا کے ہاں کوئی اہمیت وحیثیت نہیں اور عیسائی کہتے ہیں یہودیوں کی کوئی وقعت نہیں اور وہ باطل پر ہیں۔

مزید فرمایا: یہ ایسی باتیں کرتے ہیں حالانکہ آسمانی کتاب پڑھتے ہیں۔ کتاب خدا جن سے وہ حقائق سمجھ سکتے ہیں کے حامل ہونے کے باوجود صرف تعصب، عناد اور ڈھٹائی کی باتیں کرنا تعجب انگیز ہے۔

قرآن مزید کہتا ہے: نادان مشرکین بھی ان کی سی باتیں کہتے تھے حالانکہ یہ اہل کتاب ہیں اور وہ بت پرست ہیں۔

آیت کے آخر میں ہے اس اختلاف کا فیصلہ اللہ آخرت میں خود کرے گا۔

آخرت وہ مقام ہے جہاں حقائق زیادہ روشن اور واضح ہو جائیں گے ہر چیز کے اسناد و مدارک آشکار ہو جائیں گے اور وہاں کوئی شخص حق کا انکار نہیں کر سکے گا اس وقت تمام اختلافات ختم ہو جائیں گے گویا قیامت کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اختلافات باقی نہ رہیں گے۔

(۱۱۴)وَ مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰہِ اَنۡ یُّذۡکَرَ فِیۡہَا اسۡمُہٗ وَ سَعٰی فِیۡ خَرَابِہَا ؕ اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَہُمۡ اَنۡ یَّدۡخُلُوۡہَاۤ اِلَّا خَآئِفِیۡنَ ۬ؕ لَہُمۡ فِی الدُّنۡیَا خِزۡیٌ وَّ لَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ	اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو مساجد میں خدا کا نام لینے سے روکتا ہے اور ان کی ویرانی و بربادی میں کوشاں ہے مناسب نہیں ہے کہ خوف وحشت کے بغیر یہ لوگ ان مقامات میں داخل ہوں بلکہ مسلمان انہیں ان مقامات مقدسہ سے روک دیں اور انہیں وہاں نہ آنے دیں ان کے لئے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب عظیم ہے۔

شان نزول

اس آیت کے بارے میں کئی شان نزول ذکر کئے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ امام صادق علیہ السلام سے بھی ایک روایت منقول ہے جس میں ہے:۔

یہ آیت قریش کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب وہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہر مکہ اور مسجد الحرام میں داخل ہونے سے منع کر رہے تھے۔

تفسیر

مندرجہ بالا تفسیر شان ہائے نزول کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ آیت کا روئے سخن تین گروہوں یہود، نصاری اور مشرکین کی طرف ہے اگر چہ گذشتہ آیات میں زیادہ تر یہودیوں کے بارے میں بحثیں آئی ہیں اور کہیں کہیں نصارٰی کی طرف بھی اشارہ ہے۔

ان تینوں گروہوں اور ایسے تمام اشخاص (جو اس راہ پر قدم اٹھاتے ہیں) کو مخاطب کر کے قرآن کہتا ہے اس شخص سے بڑھ کے کون ظالم ہوسکتا ہے جو اللہ کی مسجدوں میں خدا کا نام لینے سے روکتے ہیں اور انہیں ویران و برباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آیت مزید کہتی ہے مناسب نہیں کہ یہ لوگ خوف وحشت کے بغیر ان مکانات میں داخل ہوں۔

یعنی دنیا کے مسلمانوں اور توحید پرستوں کو چاہیئے کہ وہ اس مضبوطی سے قیام کریں کہ ان ستمگروں کے ہاتھ ان مقدس مقامات سے دور ہوجائیں اور ان میں سے کوئی بھی علی الاعلان بلاخوف ان مقامات مقدسہ میں داخل نہ ہوسکے۔

آخر میں ایسے عظیم ستمگروں کے لئے دنیا و آخرت میں ہلا دینے والی سزا کا ذکر ہے فرمایا: ان کے لئے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب عظیم ہے۔ وہ لوگ جو خدا اور خدا کے بندوں میں جدائی ڈالنا چاہتے ہیں ان کا یہی انجام ہے۔

(۱۱۵)وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ	مشرق ومغرب اللہ ہی کے لئے ہیں جدھر بھی رخ کروخدا موجود ہےاور خدا بے نیاز ودانا ہے

شان نزول

اس آیت کی شان نزول کے سلسلے میں مختلف روایات منقول ہیں

ابن عباس کہتے ہیں:

اس آیت کا تعلق قبلہ کی تبدیلی سے ہے مسلمانوں کا قبلہ جب بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ مقرر ہوا تو یہودیوں نے برا منایا اور مسلمانوں پر اعتراض کیا کہ کیا قبلہ بھی بدلا جا سکتا ہے اس آیت میں انہیں جواب دیا گیا کہ دنیا کے مشرق ومغرب کا مالک خدا ہے۔

تفسیر

جس طرف رخ کرو خدا موجود ہے

گذشتہ آیت میں ان ظالمین سے متعلق گفتگو تھی جو مساجد الہی کی آبادی سے روکتے تھے اور انہیں ویران کرنے میں کوشاں رہتے تھے زیر نظر آیت اس بحث کا تتمہ ہے ارشاد ہوتا ہے مشرق ومغرب خدا کے ہیں اور جس طرف رخ کرو خدا موجود ہے۔

ایسا نہیں کہ اگر تمہیں مساجد اور مراکز توحید میں جانے سے روک دیا جائے تو خدا کی بندگی کی راہ بند ہو جائے گی اس جہان کے مشرق ومغرب اس کی ذات پاک سے تعلق رکھتے ہیں اور جس طرف رخ کرو وہ موجود ہے اسی طرح قبلہ کی تبدیلی جو بعض خاص وجوہ کے پیش نظر انجام پائی ہے اس سلسلے میں کچھ اثر نہیں رکھتی کیا کوئی جگہ ہے جو خدا سے خالی ہو اصولاً تو خدا بے عدیل وبے نیاز اور عالم ودانا ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ اس آیت میں مشرق ومغرب سے مراد دو مخصوص سمتیں نہیں بلکہ یہ تمام اطراف کے لئے کنایہ ہے

(۱۱۶)وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ	(یہودی،نصاریٰ اور مشرکین) کہتے ہیں خدا کا بیٹا ہے وہ تو پاک ومنزہ ہے بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے اور سب اس کے سامنے سرنگوں ہے (سب اس کے بندے ہیں اور کوئی بھی اس کا فرزند نہیں)۔

(۱۱۷)بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ	آسمانوں اور زمین کو وجود بخشنے والا وہی ہے اور جب کسی چیز کو وجود عطا کرنے کا فرمان جاری کرتا ہے تو اس کے لئے کہتا ہے ہوجا اور وہ فوراً ہوجاتی ہے۔

تفسیر

یہودیوں عیسائیوں اور مشرکین کی خرافات

یہودی عیسائی اور مشرک سب یہ بیہودہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کا کوئی بیٹا ہے۔

زیر نظر پہلی آیت اسی بے ہودگی کے خلاف کہتی ہے وہ کہتے ہیں خدا کا بیٹا ہے وہ تو ان ناروانسبتوں سے پاک ومنزہ ہے۔خدا کو کیا ضرورت پڑ گئی ہے کہ وہ اپنے لئے بیٹے کا انتخاب کرے کیا وہ محتاج ہے محدود ہے اسے مدد کی ضرورت ہے یا اسے بقائے نسل کی احتیاج ہے جب کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کے لئے ہیں۔اور سب کے سب اس کے سامنے سرنگوں ہیں۔

(۱۱۷)وہ نہ صرف عالم ہستی کی موجودات کا مالک ہے بلکہ تمام انسانوں اور زمین کا موجد و خالق بھی وہی ہے۔حتی کہ پہلے کسی منصوبے کے بغیر اور کسی مادہ کی احتیاج کے بغیر ہی اس نے ان سب کو تخلیق کیا ہے۔

اسے بیٹے کی کیا ضرورت ہے حالانکہ جب کسی چیز کے وجود کا حکم صادر فرماتا ہے تو کہتا ہے ہوجا اور وہ فورا ہوجاتی ہے۔

عدم فرزند کے دلائل

خدا کا بیٹا ہونا بے شک ان لوگوں کے کمزور افکار کی پیداوار ہے جو تمام امور میں خدا کو اپنے محدود وجود پر قیاس کرتے ہیں۔

مختلف دلائل کی بناء پر انسان بیٹے کا محتاج ہے ایک طرف تو اس کی عمر محدود ہے اور بقائے نسل کے لئے بیٹا ضروری ہے دوسری طرف اس کی قدرت محدود ہے خصوصا بڑھاپے اور ناتوانی کے عالم میں اسے معاون و مددگار کی ضرورت ہے جو بیٹے کے ذریعے پوری ہوسکتی ہے تیسرا یہ کہ انسانی نفسیات میں محبت وانس کی خواہش کے پیش نظر ضروری ہے کہ کوئی اس کا مونس و مددگار ہو یہ مقصد بھی اولاد کے ذریعے پورا ہوجاتا ہے واضح ہے کہ خدا کے ہاں ان میں سے کوئی بھی بات کچھ مفہوم نہیں رکھتی کیونکہ وہ تو عالم ہستی کو پیدا کرنے والا تمام چیزوں پر قدرت رکھنے والا اور ازلی وابدی ہے علاوہ ازیں جسم صاحب اولاد ہونے کا لازمہ ہے اور خدا اس سے بھی منزہ ہے۔

(۱۱۸)وَ قَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ لَوۡ لَا یُکَلِّمُنَا اللّٰہُ اَوۡ تَاۡتِیۡنَاۤ اٰیَۃٌ ؕ کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّثۡلَ قَوۡلِہِمۡ ؕ تَشَابَہَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ ؕ قَدۡ بَیَّنَّا الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ	بے علم افراد کہتے ہیں خدا ہم سے بات کیوں نہیں کرتا اور کوئی آیت ونشانی خود ہم پر کیوں نہیں نازل کرتا ان سے پہلے بھی لوگ ایسی باتیں کرتے تھے ان کے دل اور افکار ایک دوسرے کے مشابہ ہیں لیکن ہم (کافی تعداد میں) آیات اور نشانیاں (حقیقت کے متلاشی) اہل یقین کے لئے روشن اور واضح کر چکے ہیں۔
(۱۱۹)اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ بِالۡحَقِّ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا ۙ وَّ لَا تُسۡـَٔلُ عَنۡ اَصۡحٰبِ الۡجَحِیۡمِ	ہم نے تجھے حق کے ساتھ (اہل دنیا کو اچھائیوں اور برائیوں کے مقابلے میں) بشارت اور تہدید کے لئے بھیجا اور تو اہل جہنم کی گمراہی پر جواب دہ نہیں ہے۔

تفسیر

مندرجہ بالا آیات کی ابتداء میں یہودیوں کی بہانہ سازیوں کی مناسبت سے ایک اور گروہ کی بہانہ سازیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ظاہراً یہ مشرکین عرب ہی کے بارے میں ہے۔

فرمایا: بے علم لوگ کہتے ہیں خدا ہمارے ساتھ باتیں کیوں نہیں کرتا اور کیوں آیت اور نشانی خود ہم پر نازل نہیں ہوتی۔

غرور، ہٹ دھرمی اور خود پسندی پر مبنی ان باتوں کے جواب میں قرآن کہتا ہے: ان سے پہلے بھی لوگ اس قسم کی باتیں کرتے تھے ان کے دل اور افکار ایک دوسرے کے مشابہ ہیں لیکن جو حقیقت کے متلاشی اور اہل یقین ہیں ان کے لئے ہم نے کافی مقدار میں آیات اور نشانیاں واضح کی ہیں۔

اگر واقعاً ان کا مقصد حقیقت و واقعیت کو سمجھنا ہے تو یہی آیات جو پیغمبر اکرم ﷺ پر ہم نے نازل کی ہیں روشن نشانی ہیں آپ کے صدق کلام کے لئے اس کی کیا ضرورت ہے کہ ایک ایک شخص پر براہ راست اور مستقلاً آیات نازل ہوں اور اس کا کیا مطلب ہے کہ خدا بلا واسطہ مجھ سے باتیں کرے۔

بعد کی آیت کا روئے سخن پیغمبر ﷺ کی طرف ہے جو بتاتی ہے کہ خواہ مخواہ کی معجزہ طلبیوں اور دیگر بہانہ سازیوں کے سلسلے میں آپ ﷺ کی ذمہ داری کیا ہے فرمایا ہم نے تجھے حق کے ساتھ دنیا کے لوگوں کو بشارت دینے اور ڈرانے کے لئے بھیجا ہے۔ تمہاری ذمہ داری ہے ہمارے احکام تمام لوگوں کے سامنے بیان کرنا ان کے سامنے معجزات پیش کرنا اور عقل ومنطق سے حقائق واضح کرنا اس دعوت کے ذریعے نیک لوگوں کو شوق ورغبت دلاؤ اور بدکاروں کو ڈراؤ تمہارے ذمے فقط یہی ہے۔

یہ پیغام پہنچائے جانے کے بعد اگر اب ان میں سے کوئی گروہ ایمان نہ لائے تو تم اہل جہنم کی گمراہی کے ذمے دار نہیں ہو۔

(۱۲۰)وَ لَنۡ تَرۡضٰی عَنۡکَ الۡیَھُوۡدُ وَ لَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَھُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَ الۡھُدٰی ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَھۡوَآءَھُمۡ بَعۡدَ الَّذِیۡ جَآءَکَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ مَا لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیۡرٍ	یہود ونصاری آپ سے کبھی راضی نہیں ہوں گے جب تک آپ (ان کی غلط خواہشات کے سامنے سر تسلیم خم نہ کریں اور) ان کے (تحریف شدہ) مذہب کی پیروی نہ کریں کہئے ! ہدایت کامل صرف خدا کی ہدایت ہے اگر آگاہی کے بعد بھی ان کی ہوا و ہوس کی پیروی کی تو خدا کی طرف سے تمہارے لئے کوئی سرپرست و مددگار نہ ہوگا۔
(۱۲۱)اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰھُمُ الۡکِتٰبَ یَتۡلُوۡنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ ؕ اُولٰٓئِکَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ ؕ وَ مَنۡ یَّکۡفُرۡ بِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ؑ	وہ لوگ (یہود ونصاریٰ) جنہیں ہم نے آسمانی کتاب دی ہے اور وہ اسے غور سے پڑھتے ہیں پیغمبر اسلام پر ایمان لئے آئیں گے اور جو ان سے کفر اختیار کریں گے وہ خسارے میں ہیں۔

شان نزول

پہلی آیت کی شان نزول کے بارے میں ابن عباس سے اس طرح منقول ہے

مدینہ کے یہودیوں اور نجران کے عیسائیوں کا خیال تھا کہ قبلہ کے بارے میں پیغمبر اسلام ﷺ ہمیشہ ان سے موافقت رکھیں گے جب خدا نے بیت المقدس کی بجائے کعبہ کو مسلمانوں کا قبلہ قرار دیا تو وہ پیغمبر اکرم ﷺ سے مایوس ہو گئے اس دوران شاید مسلمانوں میں سے بعض لوگ بھی معترض تھے کہ ایسا کوئی کام نہ کیا جائے جو یہود ونصاری کی رنجش کا باعث ہو اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں مسلمانوں کو بتایا گیا کہ قبلہ کی ہم آہنگی کا معاملہ ہو یا کوئی اور مسئلہ یہودیوں اور عیسائیوں کا یہ گروہ تم سے کبھی راضی نہیں ہوگا جب تک تم ان کے مذہب کو پورے طور پر تسلیم نہ کرلو۔

تفسیر

وہ ہرگز راضی نہ ہوں گے

گذشتہ آیت میں پیغمبر اسلام ﷺ کی رسالت کا ذکر ہے جس میں بشارت اور تنبیہ شامل ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہٹ دھرم گمراہوں کے بارے میں آپ ﷺ سے کوئی جواب طلبی نہ ہوگی مندرجہ بالا آیات میں یہی بحث جاری ہے پیغمبر اسلام ﷺ سے

فرمایا گیا ہے کہ آپ یہودیوں اورعیسائیوں کی رضا مندی حاصل کرنے پر زیادہ اصرار نہ کریں کیونکہ وہ ہرگز آپ سے راضی نہ ہوں گے مگر یہ کہ ان کی خواہشات کو مکمل طور پر تسلیم کرلیا جائے اوران کے مذہب کی پیروی کی جائے۔ آپ کی ذمہ داری یہ ہے کہ ان سے کہہ دیجیئے ! کہ ہدایت صرف ہدایت الٰہی ہے۔ وہ ہدایت جس میں خرافات اور پست و نادان افراد کے افکار کی آمیزش نہ ہو یقیناً ایسی ہی خالص ہدایت کی پیروی کرنا چاہئے۔

مزید فرمایا: اگر آپ ان کے تعصّبات ہواو ہوس اور تنگ نظریوں کو مان لیں جب کہ وحی الٰہی کے سائے میں آپ پر حقائق روشن ہو چکے ہیں تو خدا کی طرف سے آپ کا کوئی سر پرست اور یار و مددگار نہ ہوگا۔

(۱۲۱) ادھر جب یہود و نصاریٰ میں سے کچھ لوگوں نے جو حق کے متلاشی تھے پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت پر لبیک کہی اور اس آئین و دین کو قبول کرلیا تو سابق گروہ کی مذمت کے بعد قرآن انہیں اچھائی اور نیکی کے حوالے سے یاد کرتا ہے اور کہتا ہے: وہ لوگ جنہیں ہم نے آسمانی کتاب دی ہے اور انہوں نے اسے غور سے پڑھا ہے اور اس کی تلاوت کا حق ادا کیا ہے۔ (یعنی فکر و نظر کے بعد اس پر عمل کیا ہے) وہ پیغمبر اسلام ﷺ پر ایمان لے آئیں گے۔ اور جو ان کے کافر و منکر ہو گئے ہیں انہوں نے اپنے او پر ظلم کیا ہے وہ خسارہ اٹھانے والے ہیں۔

دشمن کی رضا کا حصول

انسان کو چاہئے کہ وہ پر کشش اخلاق سے دشمنوں کو بھی حق کی دعوت دے لیکن یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جن میں کچھ لچک اور حق کو قبول کرنے کی صلاحیت ہو ایسے لوگ بھی ہیں جو کبھی حرف حق قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے ایسے لوگوں کی رضا حاصل کرنے کی فکر نہیں کرنا چاہئے یہ وہ مقام ہے جہاں کہا جائے کہ اگر وہ ایمان نہ لائیں تو جہنم میں جائیں اور ان پر فضول وقت ضائع نہ کیا جائے۔

حق تلاوت کیا ہے؟

یہ بہت ہی پر معنی تعبیر ہے۔ امام صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں ایک عمدہ حدیث منقول ہے آپ نے فرمایا۔

مقصود یہ ہے کہ وہ اس کی آیات غور سے پڑھیں اس کے حقائق کو سمجھیں اس کے احکام پر عمل کریں اس کے وعدوں کی امید رکھیں اس کی تنبیہوں سے ڈرتے رہیں اس کی داستانوں سے عبرت حاصل کریں اس کے اوامر کی اطاعت کریں اس کے نواہی سے بچے رہیں خدا کی قسم مقصد آیات حفظ کرنا حروف پڑھنا سورتوں کی تلاوت کرنا اور اس کے دسویں اور پانچویں حصوں کو یاد کرنا نہیں ان لوگوں نے حروف قرآن تو یاد رکھے مگر اس کی حدود کو پامال کر دیا ہے مقصود صرف یہ ہے کہ قرآن کی آیات میں غور و فکر کریں اور اس کے احکام پر عمل کریں جیسا کہ قرآن فرماتا ہے یہ بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے آپ پر نازل کیا ہے تا کہ لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں۔

(۱۲۲) یَا بَنِیٓ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَ اَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ	اے بنی اسرائیل میں نے تمہیں جونعمت دی ہے اسے یاد کرو اور یہ بھی یاد کرو کہ میں نے تمہیں تمام جہانوں پر فضیلت دی (لیکن تم نے اس مقام سے استفادہ نہیں کیا اور گمراہ ہو گئے)۔
(۱۲۳)وَ اتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡئًا وَّ لَا یُقۡبَلُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّ لَا تَنۡفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا هُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ	اس دن سے ڈرو جب کسی شخص کو دوسرے کی جگہ پر بدلہ نہیں دیا جائے گا اس سے کوئی عوض قبول نہ کیا جائے گا کوئی شفاعت و سفارش اس کے لئے فائدہ مند نہ ہو گی اور نہ ہی (کسی طرف سے)ایسے لوگوں کی مدد کی جائیگی۔

تفسیر

قرآن کا روئے سخن پھر بنی اسرائیل کی طرف ہے۔ان پر جونعمتیں نازل ہوئیں قرآن ان کا ذکر کرتا ہے خصوصاوہ فضیلت جوخدا نے ان کے زمانے کے لوگوں پر انہیں عطا کی تھی وہ یاد دلائی گئی ہے۔فرماتا ہے:اے بنی اسرائیل ان نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تمہیں عطا کیں اور یہ بھی یاد کرو کہ میں نے تمہیں تمام جہان والوں پر اس زمانے میں موجود سب لوگوں پر فضیلت بخشی۔

(۱۲۳) لیکن کوئی نعمت جواب دہی اور ذمہ داری کے بغیر نہیں ہوتی بلکہ ہرنعمت عطا کرنے کے بعد خدا کسی ذمہ داری اور کسی عہدو پیمان کا بوجھ انسان کے کندھے پر رکھتا ہے لہذا اس آیت میں تنبیہ کرتا ہے اور کہتا ہے اس دن سے ڈرو جب کسی شخص کو دوسرے کی بجائے جزا کا سامنا نہ ہو گا۔اور کوئی چیز تاوان وفدیہ کے طور پر قبول نہ کی جائے گی۔اوراذن خدا کے بغیر کوئی سفارش سودمند نہ ہو گی۔ اگر سمجھو کہ خدا کے علاوہ وہاں کوئی انسان کی مدد کر سکتا ہے تو یہ غلط فہمی ہے کیونکہ وہاں کسی شخص کی مدد نہ کی جا سکے گی۔

(۱۲۴)وَ اِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ	(وہ وقت یاد کرو) جب خدا نے ابراہیم کومختلف طریقوں سے آزمایا اور وہ ان سے عمدگی سے عہدہ برآ ہوئے تو خدا نے ان سے کہا: میں نے تمہیں لوگوں کا امام ورہبر قرار دیا ابراہیم نے کہا میری نسل اور خاندان میں سے (بھی آئمہ قرار دے) خدا نے ان سے فرمایا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔

تفسیر

اس آیت سے لے کر آگے تک بیت المقدس سے کعبہ کی طرف قبلہ کی تبدیلی کا موضوع شروع ہونے تک اٹھارہ آیات

ہیں جن میں خدا کے پیغمبر عظیم اور علمبردار توحید حضرت ابراہیم خانہ کعبہ کی تعمیر اور توحید وعبادت کے اس مرکز کا تذکرہ ہے۔ دراصل ان آیات کے تین مقاصد ہیں۔

1۔ یہ آیات قبلہ کی تبدیلی کے موضوع کے لئے مقدمہ کا کام دیں مسلمان جان لیں کہ یہ کعبہ حضرت ابراہیمؑ پیغمبر بت شکن کی یادگار ہے اگر مشرکوں اور بت پرستوں نے اسے آج بت خانے میں تبدیل کر رکھا ہے تو یہ ایک سطحی آلودگی ہے اس سے کعبہ کے مقام ومنزلت میں کمی واقعی نہیں ہوتی۔

2۔ یہودی اور عیسائی یہ دعوے کرتے تھے کہ ہم حضرت ابراہیمؑ اور ان کے دین کے وارث ہیں یہ آیات دیگر بہت سی آیات سے مل کر جو یہودیوں کے بارے میں گذر چکی ہیں واضح کر دیتی ہیں کہ وہ لوگ ابراہیمی آئین سے بیگانہ ہیں۔

3۔ مشرکین عرب بھی اپنے اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیان اٹوٹ رشتہ بتاتے تھے انہیں بھی یہ سمجھانا مقصود تھا کہ تمہارے اور اس بت شکن پیغمبر کے پروگرام میں کوئی ربط نہیں۔ زیر بحث آیت میں پہلے فرماتا ہے وہ وقت یاد کرو جب خدا نے ابراہیمؑ کو مختلف طریقوں سے آزمایا اور وہ ان آزمائشوں میں اچھی طرح کامیاب ہوئے۔

خدا نے انہیں انعام دینا چاہا تو فرمایا: میں نے تمہیں لوگوں کا امام، رہبر اور پیشوا قرار دیا۔

ابراہیمؑ نے درخواست کی میری اولاد اور خاندان سے بھی آئمہ قرار دے تاکہ یہ رشتہ نبوت وامامت منقطع نہ ہو اور صرف ایک شخص کے ساتھ قائم نہ رہے (قَالَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ) خدا نے اس کے جواب میں فرمایا: میرا عہد یعنی مقام امامت ظالموں تک ہرگز نہیں پہنچے گا۔ یعنی ہم نے تمہاری درخواست قبول کر لی ہے لیکن تمہاری ذریت میں سے صرف وہ لوگ اس مقام کے لائق ہیں جو پاک اور معصوم ہیں۔

اس آیت میں چند ایسے اہم موضوعات ہیں جن کے بارے میں گہری نظر سے تحقیق کی ضرورت ہے۔

ا۔ کلمات سے کیا مراد ہے؟

آیات قرآن سے اور ابراہیمؑ کے وہ نظر نواز اعمال جن کی خدا نے تعریف کی ہے کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کلمات وہ جملے جو خدا نے ابراہیمؑ کو سکھائے دراصل ذمہ داریوں کا ایک گراں اور مشکل سلسلہ تھا جو خدا نے ابراہیمؑ کے ذمے کیا اور اس مخلص پیغمبر نے انہیں بہترین طریقے سے انجام دیا۔

حضرت ابراہیمؑ کے امتحانات میں یہ امور شامل تھے۔

1۔ اپنی بیوی اور بیٹے کو مکہ کی خشک اور بے آب وگیاہ سرزمین میں لے جانا جہاں کوئی انسان نہ بستا تھا۔

2۔ بیٹے کو قربان گاہ میں لے جانے اور فرمان خدا سے اسے قربان کرنے کے لئے پرعزم آمادگی کا مظاہرہ کرنا۔

3۔ بابل کے بت پرستوں کے مقابلے میں قیام کرنا بتوں کو توڑنا اور اس تاریخی مقدمے میں پیش ہونا اور نتیجتاً آگ میں پھینکا جانا اور ان تمام مراحل میں اطمینان وایمان کا ثبوت دینا۔

4۔ بت پرستوں کی سرزمین سے ہجرت کرنا اور اپنی زندگی کے سرمائے کو ٹھوکر مارنا اور دیگر علاقوں میں جا کر پیغام حق سنانا۔

۲۔ امام کسے کہتے ہیں؟

زیر بحث آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جو مقام امامت بخشا گیا وہ مقام نبوت و رسالت سے بالاتر تھا۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں۔

" ان اللّٰہ اتخذ ابراھیم عبدا قبل ان یتخذہ بنیا و ان اللّٰہ اتخذہ نبیا قبل ان یتخذہ رسولا و ان اللّٰہ اتخذہ رسولا قبل ان یتخذہ خلیلا و ن ان اللّٰہ اتخذہ خلیلا قبل ان یتخذہ اماما فلما جمع الاشیاء قال انی جاعلک للناس اما ما فمن عظمها فی عین ابراھیم قال ومن ذریتی قال لا ینال عھدی الظلمین قال لا یکون السفیه امام التقی"

خداوند عالم نے بنی بنانے سے قبل ابراہیمؑ کو عبد قرار دیا اور اللہ نے انہیں رسول بنانے سے پہلے نبی قرار دیا اور انہیں خلیل بنانے سے قبل اپنی رسالت کے لئے منتخب کیا اور اس سے پہلے کہ امام بنا تا انہیں اپنا خلیل بنایا جب یہ تمام مقامات و مناصب انہیں حاصل ہو چکے تو اللہ نے فرمایا میں تمہیں انسانوں کے لئے امام بنا تا ہوں حضرت ابراہیمؑ کو یہ مقام عظیم دیا تو نہوں نے عرض کیا خدایا میری اولاد سے بھی امام قرار دے۔ ارشاد ہوا میرا عہد ظالموں تک نہ پہنچے گا بے وقوف شخص متقی لوگوں کا امام نہیں ہو سکتا۔

۳۔ نبوت رسالت اور امامت میں فرق

آیات میں موجود اشارات اور احادیث میں وارد ہونے والی مختلف تعبیرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے مامور لوگ مختلف منصبوں پر فائز تھے۔

1۔ **مقام نبوت**۔ یعنی خدا کی طرف سے وحی حاصل کرنا لہٰذا نبی وہ ہے جس پر وحی نازل ہو اور جو کچھ وحی کے ذریعے معلوم ہو لوگ چاہیں تو انہیں بتا دے۔

2۔ **مقام رسالت**۔ یعنی مقام ابلاغ وحی تبلیغ و نشر احکام الٰہی اور تعلیم و آ گہی سے نفوس کی تربیت لہٰذا رسول وہ ہے جس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی ماموریت کے خطے میں جستجو اور کوشش کے لئے اٹھ کھڑا ہو اور ہر ممکن ذریعے سے لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دے اور لوگوں تک اس کا فرمان پہنچائے۔

3۔ **مقام امامت**۔ یعنی رہبری و پیشوائی اور امور مخلوق کی باگ ڈور سنبھالنا در حقیقت امام وہ ہے جو حکومت الٰہی کی تکمیل کے لئے ضروری توانائیاں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ احکام خدا کو عملا جاری اور نافذ کر سکے اگر فی الوقت باقاعدہ حکومت کی تشکیل ممکن نہ ہو تو جس قدر ہو سکے اجرائے احکام کی کوشش کرے۔ بہ الفاظ دیگر امام کا کام اور ذمہ داری احکام و قوانین الٰہی کا اجراء ہے جب کہ رسول کی ذمہ داری احکام الٰہی کا ابلاغ ہے

۴۔امامت یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آخری سیر تکامل

اس سے ظاہر ہوا کہ مقام امامت ان چیزوں سے کہیں بلند ہے یہاں تک کہ نبوت و رسالت سے بھی بالاتر ہے اور یہ وہ مقام و منصب ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی اہلیت کا امتحان دینے کے بعد بارگاہ الٰہی سے حاصل کیا۔

(۱۲۵)وَ اِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَیۡتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَ اَمۡنًا ؕ وَ اتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰہٖمَ مُصَلًّی ؕ وَ عَہِدۡنَاۤ اِلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ اَنۡ طَہِّرَا بَیۡتِیَ لِلطَّآئِفِیۡنَ وَ الۡعٰکِفِیۡنَ وَ الرُّکَّعِ السُّجُوۡدِ	(وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے خانہ کعبہ کو انسانوں کے لوٹ آنے کا مقام، مرکز اور جائے امن قرار دیا اور (اسی مقصد کی تجدید کے لئے) مقام ابراہیم کو اپنے لئے مقام نماز کی حیثیت سے انتخاب کرو نیز ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو حکم دیا کہ میرے گھر کا طواف کرنے والوں، اس گھر کے خادموں اور اس میں سجدہ کرنے والوں (نماز گزاروں) کے لئے اسے پاک و پاکیزہ رکھو۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقام بلند کا ذکر تھا اب خانہ کعبہ کی عظمت کا تذکرہ ہے جو انہی کے ہاتھوں تعمیر اور تیار ہوا۔فرمایا: یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے خانہ کعبہ کو "مثابہ" (لوگوں کے پلٹ آنے کا مقام اور توجہ کا مرکز) اور مقام امن وامان قرار دیا۔

چونکہ خانہ کعبہ موحدین کا مرکز تھا وہ ہر سال اس کی طرف آتے تھے جہاں وہ فقط جسمانی طور پر ہی نہیں بلکہ روحانی طور پر بھی توحید اور فطرت اول کی طرف پلٹتے تھے اس لئے کعبہ کو "مثابہ" قرار دیا گیا ہے۔لفظ "مثابہ" میں ایک قسم کا قلبی آرام و آسائش کا مفہوم بھی داخل ہے لفظ "امنا" جو اس کے بعد آیا ہے اس مفہوم کی تاکید کرتا ہے خصوصا لفظ "للناس" نشاندہی کرتا ہے کہ یہ مرکز امن و امان تمام جہانوں کے لئے ایک عمومی پناہ گاہ ہے یہ درحقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک درخواست کی قبولیت کا مظہر ہے جو انہوں نے بارگاہ الٰہی میں کی تھی جیسا کہ اگلی آیت میں آئے گا۔"رب اجعل هذا بلدا امنا" (پروردگار اس جگہ کو محل امن وامان قرار دے)۔

اس کے بعد فرمایا: مقام ابراہیم کو اپنی نماز کی جگہ کے طور پر انتخاب کرو۔یہ اس مشہور مقام ابراہیم کی طرف اشارہ ہے جو خانہ کعبہ کے نزدیک ایک جگہ ہے جس کے پاس طواف کے بعد جا کر حجاج نماز طواف بجالاتے ہیں۔اس بناء پر مصلیٰ سے مراد بھی یہی مقام نماز ہے۔

اس کے بعد اس عہد و پیمان کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند حضرت اسمعیل علیہ السلام سے

خانہ کعبہ کی طہارت کے بارے میں لیا گیا تھا فرمایا ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو حکم دیا اور انہیں وصیت کی کہ میرے گھر کو اس کا طواف کرنے والوں اس کے پڑوس میں رہنے والوں اور رکوع وسجدہ کرنے والوں (نمازگزاروں کے لئے پاک رکھو۔

طہارت و پاکیزگی سے مراد کیا ہے؟

بعض کہتے ہیں کہ بتوں کی پلیدگی سے پاک کرنا مقصود ہے۔ بعض کہتے ہیں ظاہری نجاستوں سے پاک رکھنا مراد ہے، خصوصاً خون اور قربانی کے جانوروں کی اندرونی غلاظتوں سے کیونکہ بعض جاہل لوگ ایسا کرتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ طہارت کا معنی خانۂ توحید کی تعمیر کے وقت خلوص نیت ہے۔ لیکن چونکہ کوئی دلیل موجود نہیں جس کی بناء پر یہاں طہارت کا معنی کسی ایک چیز میں محدود کریں لہٰذا یہاں خانۂ توحید کو ہر قسم کی ظاہری و باطنی آلودگیوں سے پاک رکھنا مراد لیا جانا چاہئے۔

خانہ خدا کا نام

مندرجہ بالا آیت میں خانہ کعبہ کو "بیتی" میرا گھر کہا گیا ہے حالانکہ یہ امر واضح ہے کہ خداوند عالم نہ جسم رکھتا ہے اور نہ اسے گھر کی ضرورت ہے اس ضافت اور نسبت سے مراد نسبت اعزازی ہے کسی چیز کے بزرگی اور عظمت کو بیان کرنے کے لئے اسے خدا سے منسوب کیا جاتا ہے اسی معنی میں ماہ رمضان کو شہر اللہ اور خانہ کعبہ کو بیت اللہ کہا جاتا ہے۔

(۱۲۶)وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ	(اور یاد کرو اس وقت کو) جب ابراہیم نے عرض کی پروردگار! اس سرزمین کو شہر امن قرار دے اور اس کے رہنے والوں کو جو خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں انہیں (قسم قسم کے) میووں سے روزی دے۔ (خدا نے) کہا: وہ جو کافر ہو گئے تھے انہیں تھوڑا سا فائدہ دیں گے پھر انہیں آگ کے عذاب کی طرف کھینچ کے لے جائیں گے اور ان کا انجام کتنا برا ہے۔

تفسیر

بارگاہ خدا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی درخواستیں

اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس مقدس سرزمین کے رہنے والوں کے لئے پروردگار سے دو اہم درخواستیں کی ہیں ایک کی طرف گذشتہ آیت کے ذیل میں بھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔ قرآن کہتا ہے اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا پروردگار! اس سرزمین کو شہر امن قرار دے۔

جیسا کہ گذشتہ آیت میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی یہ دونوں دعائیں قبول ہوئیں اور خدا نے اس مقدس سرزمین کو امن وامان کا

ایک مرکز بنایا اور اسے ظاہری و باطنی طور پر سلامتی بخشی۔ان کی دوسری درخواست یہ تھی کہ اس سرزمین کے رہنے والوں کو جو خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں طرح طرح کے ثمرات سے نوازا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام پہلے امنیت کا تقاضا کرتے ہیں اور اس کے بعد اقتصادی عنایات کی درخواست کرتے ہیں یہ بات اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی ہے کہ جب تک کسی شہر یا ملک میں امن وسلامتی کا دور دورہ نہ ہو کسی ستھرے اور صحیح اقتصادی ماحول کا امکان نہیں ہوسکتا۔

لیکن تعجب کی بات ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے اس تقاضے کے جواب میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہم انہیں ان ثمرات میں سے تھوڑا سا حصہ دیں گے مگر انہیں بالکل محروم نہیں کیا جائے گا۔آخرت میں انہیں عذاب جہنم کی طرف کھینچ کر لے جایا جائیگا اور یہ کیسا برا انجام ہے۔

(۱۲۷)وَ اِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ	اور (یاد کرو اس وقت کو) جب ابراہیم اور اسماعیل خانہ کعبہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے (اور کہتے تھے) اے ہمارے پروردگار! تو ہم سے قبول فرما کہ تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔
(۱۲۸)رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَ ۠ وَ اَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا ۚ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ	پروردگار! ہمیں اپنے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا قرار دے اور ہماری اولاد میں سے ایسی امت بنا جو تیرے حضور سر تسلیم خم کرنے والی ہو ہمیں اپنی عبادت کا راستہ دکھا اور ہماری توبہ قبول فرما کہ تو توّاب اور رحیم ہے۔
(۱۲۹)رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ وَ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَةَ وَ یُزَکِّیْھِمْ ؕ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۧ	پروردگار! ان کے درمیان انہی میں سے ایک نبی مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات سنائے انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور انہیں پاک کرے کیونکہ تو توانا اور حکیم ہے (اور تو اس کام پر قدرت رکھتا ہے)۔

تفسیر

حضرت ابرہیم علیہ السلام کے ہاتھوں خانہ کعبہ کی تعمیر نو

قرآن کی مختلف آیات، احادیث اور تواریخ اسلامی سے واضح ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے بلکہ حضرت

آدم علیہ السلام کے زمانے میں موجود تھا۔

اتفاقاً زیر بحث آیت کی تعبیر بھی اسی معنی کو تقویت دیتی ہے فرمایا: یاد کرو اس وقت کو جب ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام (جب اسماعیل کچھ بڑے ہو گئے تو) خانہ کعبہ کی بنیادوں کو اونچا کر رہے تھے اور کہتے تھے پروردگار! ہم سے قبول فرما تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔

مختصر یہ کہ آیات قرآن اور روایات تاریخ کی اس مشہور بات کی تائید کرتی ہیں کہ خانہ کعبہ پہلے پہل حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں بنا پھر طوفان نوح علیہ السلام میں گر گیا اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ہاتھوں اس کی تعمیر نو ہوئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کچھ مزید دعائیں

زیر نظر دیگر دو آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام خدا سے پانچ اہم درخواستیں کرتے ہیں یہ التجائیں جو خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت کی گئیں اس قدر فکر انگیز اور معنوی و مادی زندگی کی ضروریات کی جامع ہیں کہ انسان کو خدا کے ان دو عظیم پیغمبروں کی روحانی عظمت سے آشنا کر دیتی ہیں۔ پہلے عرض کرتے ہیں پروردگار! ہمیں ہماری ساری زندگی میں اپنے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا قرار دے۔

پھر تقاضا کرتے ہیں: ہماری اولاد میں سے بھی ایک مسلمان امت قرار دے جو تیرے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والی ہو۔ پھر درخواست کرتے ہیں اپنی پرستش و عبادت کی راہ ہمیں دکھا اور ہمیں اس سے آگاہ فرما (وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا) پھر خدا کے حضور توبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ہماری توبہ قبول کر لے اور اپنی رحمت کا رخ ہماری طرف فرما کہ تو تواب اور رحیم ہے۔

اس کے بعد دعا کرتے ہیں پروردگارا! انہیں میں سے ایک رسول ان میں مبعوث فرما۔ تاکہ وہ تیری آیات ان کے سامنے پڑھے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور انہیں پاک کرے۔ یقیناً تو توانا اور حکیم ہے اور ان تمام کاموں کی قدرت رکھتا ہے۔

پیغمبر انہی میں سے ہو

مندرجہ بالا آیت میں لفظ ''منھم'' اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ انواع انسانی کے رہبر اور مربی کے لئے ضروری ہے کہ اسی کی نوع و جنس سے ہو۔ انہی صفات اور بشری طبائع کا حامل ہوتا کہ وہ عملی پہلوؤں سے ان کے لئے بہترین نمونہ بن سکے کیونکہ واضح ہے کہ اگر ان کی نوع و جنس سے نہ ہوتو نہ وہ ان کی ضروریات، تکالیف، مشکلات اور انسانوں کے مختلف مسائل کو سمجھ پائے گا اور نہ ہی انسان اسے اپنے لئے نمونہ بنا سکیں گے۔

(۱۳۰)وَ مَنۡ یَّرۡغَبُ عَنۡ مِّلَّۃِ اِبۡرٰہٖمَ اِلَّا مَنۡ سَفِہَ نَفۡسَہٗ ؕ وَ لَقَدِ اصۡطَفَیۡنٰہُ فِی الدُّنۡیَا ۚ وَ اِنَّہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیۡنَ	نادان و بیوقوف لوگوں کے سوا کون شخص (اس پاکیزگی اور روشنی کے باوجود) دین ابراہیم سے روگردانی کرے گا اس دنیا میں ہم نے انہیں منتخب کیا ہے اور دوسرے جہان میں بھی وہ صالحین میں سے ہیں۔
(۱۳۱)اِذۡ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗۤ اَسۡلِمۡ ۙ قَالَ اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ	(یاد کرو وہ وقت) جب ان کے پروردگار نے ان سے کہا اسلام لے آو۔ کہا میں عالمین کے پروردگار کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔
(۱۳۲)وَ وَصّٰی بِہَاۤ اِبۡرٰہٖمُ بَنِیۡہِ وَ یَعۡقُوۡبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰی لَکُمُ الدِّیۡنَ فَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ؕ	ابراہیم اور یعقوب نے (اپنی عمر کے آخری اوقات میں) اپنے بیٹوں کو اس دین کی وصیت کی (اور ہر ایک نے اپنے فرزندوں سے کہا) اے میرے فرزندو! خدا نے اس آئین پاک کو تمہارے لئے منتخب کیا ہے اور تم دین اسلام کے علاوہ کسی پر نہ مرنا۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کا کچھ تعارف کرایا گیا ہے ان میں حضرت ابراہیمؑ کی بعض خدمات اور کچھ درخواستیں جو مادی و معنوی پہلوؤں کی جامع تھیں کا ذکر کیا گیا ہے ان تمام ابحاث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم اس قابل ہیں کہ عالمین کے تمام طالبان حق انہیں اپنے لئے اُسوہ اور نمونہ قرار دیں چاہئے کہ ان کے مکتب کو ایک انسان ساز مکتب تسلیم کر کے اس سے استفادہ کیا جائے اسی بنیاد پر زیرنظر آیات میں گفتگو اس طرح سے آگے بڑھتی ہے احمق نادان افراد کے سوا کون شخص ابراہیمؑ کے آئین پاک سے روگردانی کرے گا۔

کیا یہ حماقت اور بیوقوفی نہیں کہ انسان اس پاک و روشن دین کو چھوڑ دے اور کفر اور شرک اور فساد کی کجراہیوں میں جا پڑے وہ آئین جو انسان کی روح و فطرت سے آشنا و سازگار ہو اور عقل و خرد سے ہم آہنگ ہو اور وہ آئین جس میں آخرت بھی ہو اور دنیا بھی اسے چھوڑ کر ایسے منصوبوں کے پیچھے لگنا جو دشمن عقل مخالف فطرت اور دین و دنیا کی تباہی کا باعث ہوں حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا: ہم نے دنیا میں ابراہیمؑ کو (ان عظیم خصوصیات و امتیازات کی بناء پر) منتخب کیا اور آخرت میں ان کا شمار صالحین میں ہوگا۔

(۱۳۱) ابراہیمؑ خدا کے چنے ہوئے اور صالحین کے سردار ہیں اسی بناء پر انہیں اُسوہ و نمونہ قرار دیا جانا چاہئے بعد کی آیت میں اسی مفہوم پر تاکید کرتے ہوئے ابراہیمؑ کی برگزیدہ صفات میں سے ایک خصوصیت جو حقیقت میں ان تمام صفات کی بنیاد ہے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یاد کرو اس وقت کو جب ان کے پروردگار نے ان سے کہا کہ ہمارے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کرو انہوں نے کہا:

میں عالمین کے پروردگار کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوں۔

(۱۳۲) جو وصیت اور نصیحت آپ نے اپنی آخری عمر میں اپنے فرزندان گرامی سے کی وہ بھی نمونہ ہے جس کا ذکر زیر نظر آیات میں سے آخر میں آیا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام نے عمر کے آخری لمحات میں اپنی اولاد کو توحید کے مکتب مقدس کی وصیت کی۔

ہر ایک نے اپنی اولاد سے کہا: اے میرے فرزندو! خدا نے اس آئین توحید کو تمہارے لئے منتخب کیا ہے۔ اس لئے اس آئین کے علاوہ کسی آئین کی پیروی نہ کریں اور اس طرح قلب سے کہ جو ایمان اور سلیم سے مالا مال ہو کے سوا دنیا کو وداع نہ کریں۔

(۱۳۳) اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ	کیا تم موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا: میرے بعد کس کی پرستش کرو گے؟ انہوں نے کہا: آپ کے خدا کی اور اس اکیلے خدا کی جو آپ کے آباء ابراہیم و اسماعیل اور اسحاق کا خدا ہے اور ہم اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔
(۱۳۴) تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ	(بہر حال) وہ ایک امت تھے کہ گذشتہ زمانے میں ان کے اعمال ان سے مربوط تھے اور تمہارے اعمال بھی خود تم سے مربوط ہیں اور ان کے اعمال کی باز پرس کبھی تم سے نہ ہوگی۔

شان نزول

یہودیوں کی ایک جماعت کا عقیدہ تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی وفات کے وقت اپنی اولاد کو اسی دین کی وصیت کی جس کے یہودی معتقد ہیں اس کی تمام تحریفوں کے ساتھ خدا تعالی نے ان کے اس عقیدے کی تردید میں یہ آیات نازل کیں۔

تفسیر

سب اپنے اپنے اعمال کے جواب دہ ہیں

جیسا کہ شان نزول میں ہے آیت کے ظاہر سے بھی یہ سمجھ آتا ہے کہ کسی گفتگو کے دوران منکرین اسلام کا ایک گروہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے کوئی غلط بات منسوب کرتا تھا قرآن ان کے اس بے دلیل دعوی کے متعلق کہتا ہے کیا تم یعقوب کی موت کے وقت موجود تھے کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو ایسی وصیت کی تھی۔

جو بات تم ان سے منسوب کرتے ہو وہ تو نہیں بلکہ جو کچھ انہوں نے اس وقت اپنے بیٹوں سے گفتگو کی یہ تھی کہ انہوں نے پوچھا میرے بعد کس چیز کی پرستش وعبادت کرو گے۔ انہوں نے جواب میں کہ آپ کے خدا کی اور اس اکیلے خدا کی جو آپ کے آباء ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام، اور اسحاق علیہ السلام کا خدا ہے۔ اور ہم اس کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

ایک اہم نکتہ

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کے باپ یا دادا نہیں تھے بلکہ ان کے چچا تھے۔ یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ لغت عرب میں کبھی کبھی لفظ "اب" (جس کا معنی باپ ہے) چچا کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ قرآن میں اگر یہ لفظ آذر کے لئے استعمال ہوا ہے تو یہ اس مفہوم کے خلاف نہیں کہ آذر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا والد نہ تھا بلکہ چچا تھا۔

(۱۳۴) زیر نظر یہ دوسری آیت گویا یہودیوں کے ایک اشتباہ کی نفی کرتی ہے کیونکہ وہ اپنے آباء واجداد ان کے اعزازات اور خدا کے ہاں ان کی عظمت پر بہت بھروسہ کرتے تھے اور اپنے بارے میں سمجھتے کہ اگر وہ گناہگار ہوں تو بھی ان بزرگوں کی وجہ سے نجات یافتہ ہیں قران کہتا ہے بہر حال وہ ایک امت تھے جو گزر گئے ہیں اور ان کے اعمال ان سے وابستہ ہیں اور تمہارے اعمال خود تمہارے ساتھ مربوط ہیں۔ تم کبھی ان کے اعمال کے جواب دہ نہیں جیسا کہ وہ تمہارے اعمال کے جواب دہ نہیں ہیں۔ لہذا بجائے اس کے کہ تم اپنی توانائی اپنے بزرگوں کے متعلق ایسے فخر ومباہات کی تحقیق میں صرف کرو اپنے عقیدہ اور عمل کی اصلاح کرو۔

اگر چہ ظاہراً اس آیت کے مخاطب اہل کتاب نصاریٰ اور یہودی ہیں لیکن واضح ہے کہ یہ حکم انہی سے مخصوص نہیں بلکہ ہم مسلمان بھی اس کے حقیقی مفہوم کے مخاطب ہیں۔

(۱۳۵) وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ	(اہل کتاب) کہتے ہیں یہودی بن جاؤ یا عیسائی تا کہ ہدایت پالو کہہ دیجئے: (تحریف شدہ مذاہب ہرگز ہدایت بشر کا سبب نہیں بن سکتے) بلکہ ابراہیم کے خالص دین کی پیروی کرو وہ ہرگز مشرکین میں سے نہ تھے۔
(۱۳۶) قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ	کہیے: ہم خدا پر ایمان لائے ہیں اور اس پر جو ہم پر نازل ہوا ہے اور اس پر بھی جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور بنی اسرائیل کے دیگر انبیاء اسباط پر نازل ہوا ہے اور اسی طرح جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کو پروردگار کی طرف سے دیا گیا ہم ان میں کوئی فرق نہیں سمجھتے اور خدا کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

(۱۳۷)فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ ۚ فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ	اگر وہ بھی اس پر ایمان لے آئیں جس پر تم ایمان لائے ہو تو ہدایت یافتہ ہو جائیں گے اور اگر روگردانی کریں گے تو وہ حق سے جدا ہوں گے اور خدا تم سے ان کے شر کو دور کرے گا کہ وہ سننے والا اور دانا ہے۔

شان نزول

ان آیات کی شان نزول کے بارے میں ابن عباس سے اس طرح منقول ہے کہ چند یہودی علماء اور نجران کے کچھ عیسائی علماء مسلمانوں سے بحث مباحثہ کرتے تھے ان میں سے ہر گروہ اپنے تئیں دین حق پر قرار دیتا اور دوسرے کی نفی کرتا تھا یہودی کہتے کہ ہمارے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام دیگر انبیاء سے برتر ہیں اور ہماری کتاب بہترین کتاب ہے اسی طرح عیسائی دعویٰ کرتے تھے کہ مسیح بہترین رہنما ہیں اور انجیل بہترین کتاب ہے ان دو مذاہب کے پیروکاروں میں سے ہر ایک مسلمانوں کو اپنے مذہب کی طرف دعوت دیتا تھا یہ آیات اسی موقع پر ان کے جواب میں نازل ہوئیں۔

تفسیر

صرف ہم حق پر ہیں

خود پرستی اور خود محوری کا اکثر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان حق کو فقط اپنی ذات میں منحصر سمجھتا ہے اور باقی سب کو باطل پرست قرار دیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ دوسروں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لے جیسا کہ محل بحث پہلی آیت میں قرآن کہتا ہے اہل کتاب کہتے ہیں یہودی ہو جاؤ یا عیسائی بن جاؤ تو ہدایت یافتہ ہو جاؤ گے۔

(۱۳۶) اسی لئے بعد کی آیت مسلمانوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ اپنے مخالفین سے کہیں کہ ہم خدا پر ایمان لائے ہیں اور اس پر ایمان لائے ہیں جو اس کی طرف سے ہم پر نازل ہوا ہے اور اس پر جو ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے اسباط پیغمبروں پر نازل ہوا ہے اور اسی طرح جو موسیٰ علیہ السلام و عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے خدا کی طرف سے دیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہم ان کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھتے اور فرمان حق کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

خود محوری، نسلی تعصب اور ایسی دیگر چیزیں ہمارے لئے اس بات کا موجب نہیں بنتیں کہ ہم کچھ کو مان لیں اور کچھ کا انکار کر دیں۔ وہ سب خدائی معلم ہیں جنھوں نے مختلف تربیتی طریقوں سے انسانوں کی رہنمائی کے لئے قیام کیا لیکن سب کا مقصد ایک ہی تھا اور وہ تھا توحید خالص اور حق وعدالت کے سائے میں نوع بشر کی ہدایت اگرچہ ان میں سے ہر ایک اپنے خاص زمانے میں بعض مخصوص ذمہ داریوں اور خصوصیات کا حامل تھا۔

(۱۳۷) زیر نظر آخری آیت میں قرآن کہتا ہے کہ اگر یہ لوگ ان امور پر ایمان لے آئیں جن پر تم ایمان لائے ہو تو ہدایت

پالیں گے۔ اگر روگردانی کریں گے تو حق سے جدا ہیں۔

بہر حال آیت کے آخر میں مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے کہ وہ دشمن کی سازشوں سے ہراساں نہ ہوں فرمایا: خدا ان کے شر کو ان سے دور کرے گا کہ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے ان کی باتیں سنتا ہے اور ان کی سازشوں سے آگاہ ہے۔

(۱۳۸) صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّ نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ	خدائی رنگ (ایمان توحید اور اسلام کا رنگ قبول کریں) اور خدائی رنگ سے کون سا رنگ بہتر ہے اور ہم صرف اس کی عبادت کرتے ہیں۔
(۱۳۹) قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَ هُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَ نَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ۙ	کہیے: کیا تم ہم سے خدا کے بارے میں گفتگو کرتے ہو حالانکہ وہی تمہارا اور ہمارا پروردگار ہے ہمارے اعمال ہمارے لئے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں اور ہم تو خلوص سے اس کی عبادت کرتے ہیں۔
(۱۴۰) اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ	کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اسباط، یہودی یا عیسائی تھے کہیے: تم بہتر جانتے ہو یا خدا (اور باوجودیکہ تم جانتے ہو کہ وہ یہودی یا عیسائی نہ تھے) کیوں حقیقت چھپاتے ہو اور اس شخص سے زیادہ کون ظالم و ستمگر ہے جو اپنے پاس موجود خدائی شہادت کو چھپائے اور خدا تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔
(۱۴۱) تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۧ	(بہر حال) وہ ایک امت تھے جو گزر گئے جو انہوں نے کیا ہے وہ ان کے لئے ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ تمہارے لئے ہے تم ان کے اعمال کے جواب دہ نہیں ہو۔

تفسیر

غیر خدائی رنگ دھو ڈالو

گذشتہ آیات میں مختلف مذاہب کے پیروکاروں کو تمام انبیاء کے پروگراموں کے سلسلے میں جو دعوت دی گئی تھی اس ضمن

میں فرماتا ہے: صرف خدائی رنگ قبول کرو (جو ایمان اور توحید کا خالص رنگ ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے: کونسا رنگ خدائی رنگ سے بہتر ہے اور ہم تو فقط اس کی پرستش و عبادت کرتے ہیں اور اسی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

اس طرح قرآن حکم دیتا ہے کہ نسلی قبائلی اور ایسے دیگر رنگ جو تفرقہ بازی کا سبب ہیں ختم کر دیں اور سب کے سب صرف خدائی رنگ میں رنگ جائیں۔

یہودی وغیرہ بعض اوقات مسلمانوں سے حجت بازی کرتے اور کہتے کہ پیغمبر ہماری قوم میں مبعوث ہوتے تھے ہمارا دین قدیم ترین ہے اور ہماری کتاب آسمانی کتابوں میں سے زیادہ پرانی ہے اگر محمد ﷺ بھی پیغمبر ہوتے تو ہم میں سے مبعوث ہوتے۔

قرآن نے مندرجہ بالا آیات میں ان سب خیالات پر خط بطلان کھینچ دیا ہے قرآن پہلے پیغمبر اکرم ﷺ سے یوں خطاب کرتا ہے ''ان سے کہئے کہ خدا کے بارے میں تم ہم سے گفتگو کرتے ہو حالانکہ وہ (اللہ) تمہارا اور ہمارا پروردگار ہے۔

یہ بھی جان لو کہ ہم اپنے اعمال کے جواب دہ ہیں اور تم اپنے اعمال کے جواب دہ ہو اور اعمال کے علاوہ کسی شخص کے لئے کوئی وجہ امتیاز نہیں۔ فرق یہ ہے کہ ہم خلوص سے اس کی پرستش کرتے ہیں اور خالص موحد ہیں لیکن تم میں سے بہت سوں نے توحید کو شرک آلود کر رکھا ہے۔

(۱۴۰) اس کے بعد کی آیت میں ان بے بنیاد دعووں میں سے کچھ کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے: کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام اسحاق علیہ السلام یعقوب علیہ السلام اور اسباط علیہ السلام سب یہودی یا عیسائی تھے۔ کہیے تم بہتر جانتے ہو یا خدا۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ یہودی تھے نہ نصرانی تم بھی کم و بیش جانتے ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے بہت سے پیغمبر دنیا میں آئے اور اگر نہیں جانتے تو پھر بغیر اطلاع کے ان کی طرف ایسی نسبت دینا تہمت، گناہ اور حقیقت سے پردہ پوشی ہے اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو اپنے پاس موجود خدائی شہادت چھپائے۔ مگر یہ جان لو کہ خدا تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

(۱۴۱) زیر بحث آخری آیت میں ایسے لوگوں کے نظریات کا ایک اور جواب دیا گیا ہے فرمایا فرض کرو یہ سب دعوے سچے ہیں تو بھی وہ ایسے لوگ تھے جو گزر گئے ہیں ان کا دفتر اعمال بند ہو چکا ہے ان کا زمانہ بیت چکا ہے اور ان کے اعمال انہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور تم اپنے اعمال کے جواب دہ ہو اور ان کے اعمال کی باز پرس تم سے نہ ہوگی۔

(۱۴۲) سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِىْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ	عنقریب کم عقل لوگ کہیں گے (مسلمانوں کو) ان کے پہلے قبلہ سے کس چیز نے روگردان کیا کہہ دو مشرق و مغرب اللہ کے لئے ہے وہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ کی ہدایت کرتا ہے۔

تفسیر

قبلہ کی تبدیلی کا واقعہ

اس آیت اور اس کے بعد کی چند آیات میں تاریخ اسلام کی ایک اہم تبدیلی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس سے لوگوں میں

ایک عظیم طوفان برپا ہو گیا تھا اس کی کچھ تفصیل یہ ہے کہ بعثت کے بعد تیرہ سال تک مکہ میں اور چند ماہ تک مدینہ میں پیغمبر اسلام ﷺ حکم خدا سے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ لیکن اس کے بعد قبلہ بدل گیا اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ مکہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں۔ مدینہ میں کتنے ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاتی رہی۔

اس واقعے سے یہودی بہت پریشان ہوئے اور اپنے پرانے طریقے کے مطابق ڈھٹائی بہانہ سازی اور طعنہ بازی کا مظاہرہ کرنے لگے پہلے تو کہتے تھے کہ ہم مسلمانوں سے بہتر ہیں کیونکہ ان کا کوئی اپنا قبلہ نہیں یہ ہمارے پیروکار ہیں لیکن جب خدا کی طرف سے قبلہ کی تبدیلی کا حکم نازل ہوا تو انہوں نے پھر زبان اعتراض دراز کی چنانچہ محل بحث آیت میں قرآن کہتا ہے بہت جلد کم عقل لوگ کہیں گے ان (مسلمانوں) کو کس چیز نے اس قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ پہلے تھے۔ مسلمانوں نے اس سے کیوں اعراض کیا ہے جو گذشتہ زمانے میں انبیاء ما سلف کا قبلہ رہا ہے اگر پہلا قبلہ صحیح تھا تو اس تبدیلی کا کیا مقصد اور اگر دوسرا صحیح ہے تو پھر تیرہ سال اور چند ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز کیوں پڑھتے رہے ہیں؟

خدا اپنے پیغمبر ﷺ کو حکم دیتا ہے: ان سے کہہ دو! عالم کے مشرق و مغرب اللہ کے لئے ہیں وہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی ہدایت کرتا ہے۔

ان حیلہ بازوں کے جواب میں یہ ایک قطعی اور واضح دلیل تھی کہ بیت المقدس اور کعبہ سب اللہ کی ملکیت ہیں خدا کا ذاتی طور پر تو کوئی گھر نہیں ہے اہم بات تو یہ ہے کہ فرمان خدا کا پاس کیا جائے جس طرف خدا حکم دے ادھر نماز پڑھی جائے وہ مقام مقدس ومحترم ہے اور کوئی جگہ حکم خدا کے بغیر ذاتی اہمیت نہیں رکھتی حقیقت میں قبلہ کی تبدیلی آزمائش اور تکاملی کے مراحل میں سے ہے ان میں سے ہر ایک ہدایت الٰہی کا مصداق ہے اور وہی ہے جو انسانوں کو صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

(۱۴۳) وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّ سَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ	(جیسے تمہارا قبلہ درمیانی ہے) اسی طرح خود تمہیں بھی ہم نے ایک درمیانی امت بنایا ہے (جو ہر لحاظ سے افراط وتفریط کے درمیان حد اعتدال میں ہے) تا کہ لوگوں کے لئے تم ایک نمونے کی امت بن سکو اور پیغمبر تمہارے سامنے نمونہ ہو اور ہم نے وہ قبلہ (بیت المقدس) کہ جس پر تم پہلے تھے فقط اس لئے قرار دیا تھا کہ وہ لوگ جو پیغمبر کی پیروی کرتے ہیں جاہلیت کی طرف پلٹ جانے والوں سے ممتاز ہو جائیں اگرچہ یہ کام ان لوگوں کے سوا جنہیں خدا نے ہدایت دی ہے دشوار تھا (یہ بھی جان لو کہ تمہاری وہ نمازیں جو پہلے قبلہ کی طرف رخ کر کے ادا کی تھیں صحیح ہیں)

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ	اور خدا ہرگز تمہارے ایمان (نماز) کو ضائع نہیں کرتا کیونکہ خدا لوگوں پر رحیم اور مہربان ہے۔

تفسیر

زیرنظر آیت میں قبلہ کی تبدیلی کے فلسفے اور اسرار کی طرف کچھ اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا: جس طرح تمہارا قبلہ درمیانی ہے اسی طرح تمہیں ہم نے درمیانی امت قرار دیا ہے۔ ایسی امت جو کندرو ہو نہ تندرو، افراط میں ہو نہ تفریط میں، بلکہ ایک نمونہ ہو۔

رہا یہ سوال کہ مسلمانوں کا قبلہ کیسے درمیانی قبلہ ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائی تقریبا مشرق کی طرف کھڑے ہوتے ہیں کیونکہ زیادہ تر عیسائی قومیں مغربی مما لک میں رہتی ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے ولادت بیت المقدس میں ہے اس لئے وہ مشرق کی طرف رخ کرنے پر مجبور ہیں اس لحاظ سے مشرقی سمت کلی طور پر ان کا قبلہ شمار ہوتی ہے اور یہودی جو زیادہ تر شامات بابل اور دیگر ایسے علاقوں میں رہتے تھے کہ انہیں تقریبا مغرب کی طرف رخ کرنا پڑتا تھا اس لحاظ سے مغربی سمت ان کا قبلہ تھا لیکن اس وقت کے مسلمان جو مدینہ میں رہتے تھے ان کے لئے کعبہ جنوب کی سمت میں اور مشرق و مغرب کے درمیان بنتا تھا جو ایک درمیانی خط شمار ہو گیا۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے غرض یہ ہے کہ تم ایک ایسی امت جو گواہ (اور ایک نمونہ کی حامل) ہو قرار پاؤ پیغمبر بھی ایک گواہ (اور ایک نمونہ) بن کر تمہارے سامنے موجود ہو۔

یعنی ان عقائد معارف اور تعلیمات کی وجہ سے جس کے تم حامل ہو ان کے ذریعے ایک ایسی امت بنو جو نمونہ ہو جیسے پیغمبر تمہارے درمیان ایک نمونہ ماڈل اور اسوہ ہیں۔

اس کے بعد قرآن تبدیلی قبلہ کی ایک اور رمز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے ہم نے اس قبلہ بیت المقدس جس پر تم قبل ازیں تھے صرف اس لئے مقرر کیا تھا کہ پیغمبر کی پیروی کرنے والے جاہلیت کی طرف پلٹ جانے والوں سے ممتاز ہو جائیں۔

مزید فرماتا ہے: اگرچہ یہ کام ان لوگوں کے سوا جنہیں خدا نے ہدایت کی تھی دشوار تھا۔

واقعاً جب تک خدائی ہدایت نہ ہو اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی روح پیدا ہی نہیں ہوتی۔ یہ بات اہم ہے کہ تسلیم حقیقت اس کا نام ہے کہ ایسے احکام جاری ہوں تو کسی سنگینی و سختی کا احساس تک نہ ہو بلکہ چونکہ حکم اس کی طرف سے ہے لہذا شہد سے شیریں تر معلوم ہو۔

وسوسہ ڈالنے والے دشمن یا نادان دوست خیال کرتے تھے کہ ہوسکتا ہے قبلہ بدل جانے سے پہلے اعمال باطل ہو جائیں اور اجر و ثواب برباد ہو جائے اس کے لئے آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے خدا ہرگز تمہارا ایمان (نماز) ضائع نہیں کرے گا کیونکہ خداوند تعالی انسانوں کے لئے رحیم و مہربان ہے۔

اس کے احکام طبیب کے نسخوں کی طرح ہیں ایک روز ایک نسخہ نجات بخش ہے اور دوسرے دن دوسرا۔ ہر ایک اپنی جگہ

درست اور سعادت وتکامل کا ضامن ہے۔لہٰذا قبلہ کی تبدیلی تمہاری گذشتہ یا آیندہ کی نمازوں کے لئے کسی قسم کی پریشانی کا باعث نہ بنے کیونکہ وہ سب کی سب صحیح تھی اور صحیح ہیں۔

زیرنظر آیت میں قرآن صراحت سے کہتا ہے کہ یہ مومنین اور مشرکین میں امتیاز پیدا کرنے والی ایک عظیم آزمائش تھی خانہ کعبہ اس وقت مشرکین کے بتوں کا مرکز بنا ہوا تھا لہٰذا حکم دیا گیا کہ مسلمان وقتی طور پر بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لیا کریں تا کہ اس طرح مشرکین سے اپنی صفیں الگ کرسکیں لیکن جب مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد اسلامی حکومت وملت کی تشکیل ہوگئی اور مسلمانوں کی صفیں دوسروں سے مکمل طور پر ممتاز ہوگئیں تو اب یہ کیفیت برقرار رکھنا ضروری نہ رہا لہٰذا اس وقت کعبہ کی طرف رخ کر لیا گیا جو قدیم ترین مرکز توحید اور انبیاء کا بہت پرانا مرکز تھا۔

ایسے میں ظاہر ہے کہ جو کعبہ کو اپنا خاندانی معنوی اور روحانی سرمایہ سمجھتے تھے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا ان کے لئے مشکل تھا اور اسی طرح بیت المقدس کے بعد کعبہ کی طرف پلٹنا۔لہٰذا اس میں مسلمانوں کی سخت آزمائش تھی تا کہ شرک کے جتنے آثار ان میں باقی رہ گئے تھے اس کٹھالی میں پڑ کر جل جائیں اور ان کے گذشتہ شرک آلود رشتے ناتے ٹوٹ جائیں جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اصولی طور پر تو خدا کے لئے مکان نہیں ہے قبلہ تو صرف وحدت اور صفوں میں اتحاد کی ایک رمز ہے اور اس کی تبدیلی کسی چیز کو دگرگوں نہیں کرسکتی اہم ترین امر تو خدا کے حکم کے سامنے سرتسلیم خم کرنا ہے اور تعصب اور ضد پرستی کے بتوں کو توڑنا ہے۔

(۱۴۴)قَدۡ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجۡهِکَ فِی السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبۡلَةً تَرۡضٰهَا ۪ فَوَلِّ وَجۡهَکَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَ حَیۡثُ مَا کُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَکُمۡ شَطۡرَهٗ ؕ وَ اِنَّ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ لَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّهُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعۡمَلُوۡنَ	ہم تمہارے چہرے کو دیکھتے ہیں جسے تم آسمان کی طرف پھیرتے ہو (اور قبلہ کی تبدیلی کے لئے فرمان خدا کے انتظار میں رہتے ہو) اب تمہیں اس قبلہ کی طرف جس سے تم خوش ہو پھیر دیتے ہیں اپنا چہرہ مسجد الحرام کی طرف کرلو اور تم (مسلمان) جہاں کہیں ہو اپنے چہرے اس کی طرف پھیر دو جنہیں آسمانی کتاب دی گئی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ حکم جو ان کے پروردگار کی طرف سے صادر ہوا ہے درست ہے اور (وہ جو ایسی آیات مخفی رکھتے ہیں) خداوند عالم ان کے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

تفسیر

جہاں کہیں ہو کعبہ کی طرف رخ کرلو

محل بحث آیت میں اس مسئلے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔قبلہ کی تبدیلی کا حکم صادر کرتے ہوئے فرماتا ہے: ہم دیکھتے ہیں کہ تم منتظر نگاہوں سے مرکز نزول وحی آسمان کی طرف دیکھتے ہو۔اب ہم تمہیں اس قبلہ کی طرف پھیر دیتے ہیں جس سے تم خوش ہو۔ابھی

سے اپنا چہرہ مسجد الحرام اور خانہ کعبہ کی طرف پھیر د۔ نہ فقط مدینہ میں بلکہ جہاں کہیں بھی تم (مسلمان) ہو اپنے چہروں کو مسجد حرام کی طرف پھیر دو۔

یہ امر قابل غور ہے کہ گذشتہ کتب میں پیغمبر اسلامﷺ کی نشانیوں میں سے ایک قبلہ کی تبدیلی بھی تھی اہل کتاب نے چونکہ پڑھ رکھا تھا کہ وہ دو قبلوں کی طرف نماز پڑھیں گے۔ اسی لئے مندرجہ بالا آیت میں اس حکم کے بعد مزید فرمایا: وہ کہ جنہیں آسمانی کتاب دی گئی جانتے ہیں کہ یہ حکم حق ہے اور پروردگار کی طرف سے ہے۔

آیت کے آخر میں قرآن کہتا ہے خدا ان کے اعمال سے غافل نہیں ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ بجائے اس کے کہ قبلہ کی تبدیلی کو آپﷺ کی صداقت کی نشانی کے طور پر تسلیم کر لیتے جس کا ذکر گذشتہ کتب میں آ چکا تھا اسے چھپانے لگے اور الٹا پیغمبر اسلامﷺ کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر دیا خدا ان کے اعمال اور نیتوں سے خوب آگاہ ہے۔

(۱۴۵) وَ لَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَ مَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَ مَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۘ وقف لازم	قسم ہے کہ اگر تم ہر قسم کی آیت (دلیل اور نشانی) ان اہل کتاب کے لئے لے آؤ تو یہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور تم بھی اب کبھی ان کے قبلہ کی پیروی نہیں کرو گے اور ان میں سے بھی کوئی دوسرے کے قبلہ کی پیروی نہیں کرتا اور اگر علم و آگاہی کے بعد تم ان کی خواہشات کی پیروی کرو گے تو مسلماً ستمگروں اور ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

تفسیر

عیسائی و یہودی قیمت پر سر تسلیم خم نہیں کریں گے

آپ گذشتہ آیت کی تفسیر میں پڑھ چکے ہیں کہ اہل کتاب جانتے تھے کہ بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی تبدیلی سے نہ صرف یہ کہ پیغمبر اسلامﷺ پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ آپﷺ کی حقانیت کی دلیل ہے کیونکہ وہ اپنی کتب میں پڑھ چکے تھے کہ پیغمبر موعود دو قبلوں کی طرف نماز پڑھے گا لیکن بے جا تعصب اور سرکشی کے بھوت نے انہیں حق قبول کرنے نہ دیا۔

اسی لئے قرآن محل بحث آیت میں قطعی طور پر کہہ رہا ہے! قسم ہے کہ اگر تم کوئی آیت دلیل اور نشانی ان اہل کتاب کے لئے لے آؤ یہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے۔

اس کے بعد مزید فرمایا: تم بھی ہرگز ان کے قبلہ کی پیروی نہیں کرو گے۔ یعنی اگر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے شور و غوغا، قیل و قال اور طعن و تشنیع سے دوبارہ مسلمانوں کا قبلہ بدل جائے گا تو یہ ان کی جہالت ہے بلکہ یہ قبلہ اب ہمیشہ کے لئے ہے۔

مزید فرمایا: وہ بھی اپنے معاملے میں ایسے متعصب ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک بھی دوسرے کے قبلہ کا پیرو اور تابع نہیں۔یعنی یہودی عیسائیوں کے قبلہ کی پیروی کرتے ہیں نہ عیسائی یہودیوں کے قبلہ کی۔

پھر بطور تاکید اور زیادہ قطعیت سے پیغمبر سے کہتا ہے: اگر علم و آگہی کے بعد جو خدا کی طرف سے تمہیں پہنچ چکی ہے تم ان کی خواہشات کے سامنے سرنگوں ہو گئے اور ان کی پیروی کرنے لگے تو مسلماً ستمگروں اور ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

(۱۴۶) اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ يَعۡرِفُوۡنَهٗ كَمَا يَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ ؕ وَ اِنَّ فَرِيۡقًا مِّنۡهُمۡ لَيَكۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَ هُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ	وہ لوگ جنہیں ہم نے آسمانی کتب دی ہیں وہ اس (پیغمبر) کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو اگر چہ ان میں سے ایک گروہ حق کو پہچاننے کے باوجود اسے چھپاتا ہے۔
(۱۴۷) اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ ۧ	(قبلہ کی تبدیلی کا یہ فرمان) تمہارے پروردگار کا حکم حق ہے لہٰذا ہرگز تردّد وشک کرنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

تفسیر

وہ پیغمبر اکرم ﷺ کو پورے طور پر پہچانتے ہیں

گذشتہ ابحاث کے بعد اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی ہٹ دھرمی اور تعصب کے بارے میں زیر نظر آیات میں گفتگو فرمائی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے! اہل کتب کے علماء پیغمبر کو اپنی اولاد کی مانند اچھی طرح پہچانتے ہیں۔اس پیغمبر کا نام،نشانیاں اور خصوصیات یہ اپنی مذہبی کتب میں پڑھ چکے ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں سے بعض کوشش کرتے ہیں کہ جان بوجھ کر حق کو چھپائے رکھیں۔

اس کے بعد گذشتہ ابحاث کی تاکید کے طور پر قبلہ کی تبدیلی کے متعلق فرمایا: یہ فرمان تمہارے پروردگا کی طرف سے حق ہے پس تم کبھی بھی تردد وشک کرنے والوں میں سے نہ ہونا۔اس طرح اس جملے میں پیغمبر کی دلجوئی کی گئی ہے اور انہیں تاکید کی گئی ہے کہ وہ دشمن کے زہریلے پراپیگنڈا کے سامنے ذرہ برابر بھی تردد وشک کو راہ نہ دیں چاہے قبلہ کی تبدیلی کا مسئلہ ہو یا کوئی اور چاہے دشمن اس کے خلاف اپنی تمام قوتیں جمع کرلیں۔

(۱۴۸) وَ لِكُلٍّ وِّجۡهَةٌ هُوَ مُوَلِّيۡهَا فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ ؕ اَيۡنَ مَا تَكُوۡنُوۡا يَاۡتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيۡعًا ؕ	ہر گروہ کا ایک قبلہ ہے جسے خدا نے اس کے لئے معین کیا ہے۔نیکیوں اور اعمال خیر میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرو تم جہاں کہیں بھی ہو گے خدا تمہیں (قیامت کے دن) حاضر کرے گا

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ	کیونکہ وہ (اللہ) ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر

ہرامت کے لئے ایک قبلہ ہوگا

یہ آیت درحقیقت یہودیوں کے جواب میں ہے جو قبلہ کی تبدیلی کے متعلق زیادہ شوروغوغا بپا کئے ہوئے تھے۔ فرمایا: ہر گروہ کا ایک قبلہ ہے جسے خدا نے اس کے لئے معین کیا ہے (اور وہ اس کی طرف رخ کرتا ہے۔

انبیاء کی طویل تاریخ میں کئی ایک قبلہ تھے اور اان کی تبدیلی کوئی عجیب وغریب چیز نہیں قبلہ کوئی اصول دین نہیں کہ جس میں تبدیلی وتغیر نہیں ہوسکتا اور نہ یہ کہ امور تکوینی کی طرح ہے کہ آگے پیچھے نہ ہوسکے لہٰذا قبلہ کے بارے میں زیادہ گفتگو نہ کرو اور اس کی بجائے اعمال خیر اور نیکیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاؤ۔

یہ مضمون بعینہ اس سورہ کی آیت ۱۷۷ کی طرح ہے

اس کے بعد اعتراض کرنے والوں کو تنبیہ کرنے اور نیک لوگوں کو شوق دلانے کے لئے فرمایا تم جہاں کہیں ہوگے خدا تم سب کو حاضر کرے گا (أَیۡنَ مَا تَکُونُوا یَأۡتِ بِکُمُ اللّٰہُ جَمِیعًا)۔ تاکہ نیک لوگوں کو عمل خیر کی جزا اور برے لوگوں کو عمل بد کی سزا دی جاسکے۔

چونکہ ممکن ہے بعض لوگوں کے لئے یہ جملہ عجیب ہو کہ خدا خاک کے منتشر ذرات کو، وہ جہاں کہیں ہوں جمع کرے گا اور دوبارہ وہی انسان عرصہ وجود میں قدم رکھے لہٰذا بلا فاصلہ فرمایا اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ درحقیقت آیت کے آخر میں یہ جملہ اس سے پہلے والے جملے '' أَیۡنَ مَا تَکُونُوا یَأۡتِ بِکُمُ اللّٰہُ جَمِیعًا '' کی دلیل ہے۔

(۱۴۹) وَ مِنۡ حَیۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡھَکَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَ اِنَّہٗ لَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ ؕ وَ مَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ	تم جس بھی جگہ، شہر اور مقام سے نکلو (جب وقت نماز ہو تو) اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کرلو یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے حکم حق ہے اور خدا تمہارے کردار سے غافل نہیں ہے۔
(۱۵۰) وَ مِنۡ حَیۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡھَکَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَ حَیۡثُ مَا کُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡھَکُمۡ شَطۡرَہٗ ۙ لِئَلَّا یَکُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَیۡکُمۡ حُجَّۃٌ ٭ۙ اِلَّا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡھُمۡ ٭	اور تم جہاں سے بھی نکلو اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کرلو اور تم (مسلمان) جہاں کہیں ہو اپنا رخ اس کی طرف کرو تاکہ لوگوں کے پاس تمہارے خلاف کوئی دلیل وحجت نہ ہو ان لوگوں کے سوا جو ظالم ہیں (جو زہر اگلنے سے باز نہیں آتے لیکن)

فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ وَاخۡشَوۡنِیۡ ۚ وَ لِاُتِمَّ نِعۡمَتِیۡ عَلَیۡکُمۡ وَ لَعَلَّکُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ۟ۙ	ان سے نہ ڈرواور (صرف) مجھ سے ڈرو (یہ قبلہ کی تبدیلی اس لئے تھی کہ میں تمہاری تربیت کروں تمہیں تعصب کی قید سے نکالوں اور تمہیں استقلال عطا کروں) اور اپنی نعمت تم پر مکمل کر دوں تا کہ تم ہدایت حاصل کرلو۔

تفسیر

یہ آیات تبدیلی قبلہ کے مسئلے اور اس کے بعد پیش آنے والے امور کے بارے میں ہیں۔

پہلی آیت میں ایک تا کیدی حکم کے طور پر فرماتا ہے: جس جگہ (شہر اور علاقے) سے نکلو نماز کے وقت اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کرولو۔

پھر تا کید مزید کے طور پر فرماتا ہے یہ حکم حق ہے اور تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے۔

آیت کے آخر میں تنبیہ اور دھمکی کے طور پر سازش کرنے والوں سے کہتا ہے اور ساتھ ہی مومنین کو خبر دار کرتا ہے اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے غافل نہیں ہے۔

(۱۵۰) اس آیت میں مسجد الحرام کی طرف رخ کرنے کے بارے میں ہر مقام سے متعلق ایک عمومی حکم ہے فرماتا ہے: جہاں سے نکلو اور جس طرف جاؤ، نماز کے وقت اپنا منہ مسجد الحرام کی طرف کرلو۔

یہ صحیح ہے کہ اس جملے میں روئے سخن پیغمبر اکرم صلى الله عليه وآله وسلم کی طرف ہے لیکن مسلماً اس کے مخاطب سب نماز پڑھنے والے ہیں تاہم بعد کے جملے میں اس کی توضیح وتا کید کے لئے فرماتا ہے: اورتم مسلمان جہاں کہیں بھی ہو اپنا رخ اس کی طرف کرلو۔

پھر اسی آیت کے ذیل میں تین اہم نکتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ا۔ مخالفین کو خاموش کرنا

فرماتا ہے: یہ قبلہ کی تبدیلی اس لئے عمل میں آئی ہے تا کہ لوگ تمہارے خلاف حجت نہ لا سکیں۔ کیونکہ گذشتہ آسمانی کتب میں پیغمبر کی نشانیوں میں سے ایک یہ تھی کہ وہ دو قبلوں کی طرف نماز پڑھے گا اگر قبلہ کی یہ تبدیلی صورت پذیر نہ ہوتی تو ایک طرف یہودیوں کی زبان مسلمانوں کے خلاف کھل جاتی اور وہ کہتے کہ تورات میں ہم نے پڑھا ہے کہ پیغمبر موعود کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہ دو قبلوں کی طرف نماز پڑھے گا لیکن محمد صلى الله عليه وآله وسلم میں یہ نشانی تو موجود نہیں اور دوسری طرف مشرکین اعتراض کرتے کہ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ دین ابراہیم علیہ السلام کو زندہ کرنے آیا ہے تو پھر خانہ کعبہ کو کیوں فراموش کر دیا جب کہ اس کی بنیاد ابراہیم علیہ السلام نے رکھی ہے لیکن قبلہ کی اس تبدیلی نے ان کے یہ اعتراضات ختم کر دیئے مگر ہمیشہ حیلہ باز اور ستم پیشہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو کسی منطق کو نہیں مانتے لہٰذا قرآن نے ان کے استثناء کو ملحوظ رکھا اور فرمایا: مگر ان میں سے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا ہے۔ یہ کسی صراط مستقیم پر قائم نہیں ہیں اور یہ بہانہ ساز اور

حیلہ گر حق کے نام پر ظلم وستم کرتے ہیں یہ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں اور دوسروں پر بھی ظلم روا رکھتے ہیں کیونکہ ان کی ہدایت میں سد راہ بنتے ہیں۔

۲۔ ان سے نہ ڈرو مجھ سے ڈرو

قرآن اس لیچڑ اور خشونت پسند گروہ کو ظالم قرار دینے کے بعد فرماتا ہے: ان کی زہریلی اور حوصلہ شکن باتوں سے ہرگز نہ ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو۔ یہ اس لئے فرمایا کہ ممکن تھا بعض لوگ ان سے وحشت زدہ ہوں۔

یہ تربیت توحید اسلامی کا ایک کلی اور بنیادی اصول ہے کہ خدا کے علاوہ (یا پھر نافرمانی حق کے سوا) کسی چیز یا شخص سے نہ ڈرنا ہر صاحب ایمان مسلمان کا شعار ہے۔

۳۔ تکمیل نعمت خدا

قبلہ کی تبدیلی کے ضمن میں آخری دلیل یوں بیان ہوئی ہے: یہ اس لئے ہوا کہ میں تمہاری تربیت کروں تمہیں تعصب کی قید سے چھڑاؤں اور اپنی نعمت تم پر تمام کروں تاکہ تمہاری ہدایت ہو سکے۔

(۱۵۱) كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ؕ	جس طرح قبلہ کی تبدیلی کے ذریعے ہم نے تم پر اپنی نعمت کامل کی اسی طرح ہم نے تمہارے درمیان تمہاری نوع اور جنس میں سے رسول بھیجا تاکہ وہ تمہیں ہماری آیات پیش کرے تمہاری پرورش و تربیت کرے تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور جو کچھ تم نہیں جانتے تمہیں بتائے۔
(۱۵۲) فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَ لَا تَكْفُرُوْنِ ۧ	تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کرو اور نعمتوں کے جواب میں کفران نعمت کا ارتکاب نہ کرو۔

تفسیر

گذشتہ آیت کے آخری حصے میں خداوند عالم نے قبلہ کی تبدیلی کی ایک دلیل تکمیل نعمت اور ہدایت مخلوق بیان کی ہے زیر بحث آیت میں لفظ "کما" اسی طرف اشارہ ہے کہ صرف قبلہ کی تبدیلی تمہارے لئے نعمت خدا نہیں بلکہ خدا نے تمہیں اور بھی بہت سی نعمتیں دی ہیں جیسا کہ میں نے تمہاری نوع میں سے تمہارے لئے رسول بھیجا ہے لفظ "منکم" یعنی تمہاری جنس سے ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ وہ نوع بشر میں سے ہے اور صرف بشر ہی بشر کے لئے مربی رہبر اور نمونہ ہو سکتا ہے اور وہی اپنی نوع کی تکالیف ضروریات اور مسائل سے آگاہ ہوتا ہے اور یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے۔

اس نعمت کے تذکرے کے بعد چار دوسری نعمتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو انہیں پیغمبر ﷺ کی برکت سے حاصل ہوئی تھیں۔

1۔ وہ ہماری آیات تمہارے سامنے تلاوت کرتا ہے

2۔ وہ تمہاری تربیت و پرورش کرتا ہے

یعنی پیغمبر آیات خدا کے ذریعے تمہارے معنوی و مادی و انفرادی و اجتماعی کمالات کو بڑھاتا ہے۔

3۔ تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے

اگرچہ تعلیم تربیت پر مقدم ہے لیکن جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ اس مقصد کو ثابت کرنے کے لئے کہ اصل مقصد تربیت ہے اسے تعلیم سے پہلے بیان فرمایا ہے: چونکہ تعلیم تو مقصد کے لئے وسیلہ ہے۔

4۔ تم جو نہیں جانتے وہ تمہیں اس کی تعلیم دیتا ہے

(۱۵۲) خدا کی نعمتوں کے ذکر کے بعد اس آیت میں لوگوں کو بتایا جا رہا ہے کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان نعمتوں کا شکر ادا کیا جائے اور ہر نعمت سے صحیح طور پر استفادہ کیا جائے جو سپاس گزاری کا طریقہ ہے اور کفران نعمت نہ کیا جائے فرماتا ہے: مجھے یاد رکھو تا کہ میں تمہیں یاد رکھوں اور میرا شکر بجالاؤ اور کفران نعمت نہ کرو۔

واضح ہے کہ ''مجھے یاد کرو تا کہ میں تمہیں یاد کروں'' یہ جملہ خدا اور بندوں کے درمیان کسی ایسے رابطے کی طرف اشارہ نہیں جیسے انسانوں کے درمیان ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں تم ہمیں یاد کیا کرو ہم تمہیں یاد کیا کریں گے بلکہ یہ ایک تربیتی وتکوینی بنیاد کی طرف اشارہ ہے یعنی مجھے یاد رکھو.......... ایسی پاک ذات کی یاد جو تمام خوبیوں اور نیکیوں کا سرچشمہ ہے اور اس طرح اپنی روح اور جان کو پاکیزہ اور روشن رکھو اور رحمت پروردگار کی قبولیت کے لئے آمادہ رہو اس ذات کی طرف متوجہ رہنا اور اسے یاد رکھنا ہر قسم کی فعالیتوں میں زیادہ مخلص زیادہ مصمم زیادہ قوی اور زیادہ متحدہ کردے گا۔

اسی طرح شکر گزاری اور کفران نعمت نہ کرنا کوئی تکلفاً نہیں اور یہ فقط کلمات کی زبان سے ادائیگی نہ تھی بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہر نعمت کو ٹھیک اس کی جگہ پر صرف کرنا اور اسی مقصد کی راہ میں خرچ کرنا جس کے لئے وہ پیدا کی گئی ہے تا کہ یہ امر خدا تعالیٰ کی نعمت و رحمت میں اضافے کا باعث ہو۔

ذکر خدا کیا ہے؟

یہ مسلم ہے کہ ذکر خدا سے مراد صرف زبان سے یاد کرنا نہیں بلکہ زبان تو دل کی ترجمان ہے یعنی دل و جان سے اس کی ذات پاک کی طرف توجہ رکھا کرو وہ توجہ جو انسان کو گناہ سے باز رکھے اور اس کے حکم کی اطاعت کے لئے آمادہ کرے اسی بناء پر متعدد احادیث میں پیشوایان اسلام سے منقول ہے کہ ذکر خدا سے مراد عملی یاد آوری ہے جیسا کہ پیغمبر اکرم ﷺ سے مروی ایک حدیث میں

ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کو وصیت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''تین کام ایسے ہیں جو یہ امت (مکمل طور پر) انجام دینے کی توانائی نہیں رکھتی اپنے مال میں دینی بھائی کے ساتھ مساوات و برابری اور اپنے اور دوسروں کے حقوق کے بارے میں عادلانہ فیصلہ اور خدا کو ہر حالت میں یاد رکھنا اور اس سے مراد ''سبحان اللّٰہ والحمد اللّٰہ والا الٰہ الااللّٰہ واللّٰہ اکبر'' کہنا نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی فعل حرام اس کے سامنے آئے تو خدا سے ڈرے اور اسے ترک کر دے''۔

(۱۵۳) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ	اے ایمان والو! (زندگی کے سخت ترین حوادث کے موقع پر) صبر و استقامت اور نماز سے مدد حاصل کرو کیونکہ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔
(۱۵۴) وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ	جو راہ خدا میں قتل ہو جاتے ہیں انہیں مردہ نہ کہو وہ تو زندہ ہیں لیکن تم نہیں سمجھتے۔

شان نزول

زیرنظر دوسری آیت کی شان نزول کے بارے میں بعض مفسرین نے ابن عباس سے اس طرح نقل کیا ہے:

یہ آیت جنگ بدر میں قتل ہونے والوں کے سلسلے میں نازل ہوئی ان کی تعداد چودہ تھی چھ مہاجرین میں سے اور آٹھ انصار میں سے تھے جنگ ختم ہونے کے بعد بعض لوگ اس طرح گفتگو کرتے کہ فلاں مر گیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس نے بتایا کہ شہداء کے لئے مردہ (میت) کہنا صحیح نہیں۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں تعلیم و تربیت اور ذکر و شکر کے متعلق گفتگو تھی ان کے وسیع تر مفہوم جس میں اکثر دینی احکام شامل ہیں کو سامنے رکھتے ہوئے محل بحث پہلی آیت میں صبر و استقامت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے جس کے بغیر گذشتہ مفاہیم کبھی عملی شکل اختیار نہیں کر سکتے۔

پہلے فرمایا: اے ایمان والو! صبر و استقامت اور نماز سے مدد حاصل کر۔ اور ان دو قوتوں (استقامت اور خدا کی طرف توجہ) کے ساتھ مشکلات و سخت حوادث سے جنگ کیلئے آگے بڑھو تو کامیابی تمہارے قدم چومے گی کیونکہ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ صبر کا معنی ہے بدبختیوں کو گوارا کرنا اپنے آپ کو ناگوار حوادث کے سپرد کرنا اور عوامل شکست کے سامنے ہتھیار ڈال دینا لیکن صبر کا مفہوم اس کے برعکس ہے صبر و شکیبائی کا معنی ہے ہر مشکل اور حادثے کے سامنے استقامت۔

دوسری چیز جو مندرجہ بالا آیت میں صبر کے ساتھ خصوصی اہمیت سے متعارف کرائی گئی ہے نماز ہے اسی لئے اسلامی احادیث میں ہے:

حضرت علی علیہ السلام کو جب کوئی مشکل در پیش ہوتی تو نماز کے کے لئے کھڑے ہو جاتے اور نماز کے بعد اس مشکل کو حل کرنے کے لئے نکلتے اور اس آیت کی تلاوت کرتے و استعینوا بالصبر و الصلوۃ۔

اسی لئے مندرجہ بالا آیت میں دراصل دو اصول سکھائے گئے ہیں ایک خدا پر بھروسہ کرنا جس کی طرف نماز اشارہ کرتی ہے اور دوسرا اپنی مدد آپ اور اپنے پر اعتماد جسے صبر کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے

(۱۵۴) پامردی صبر اور استقامت کے مسئلے کے بعد دوسری آیت میں شہداء کی ابدی اور ہمیشہ کی زندگی کے متعلق گفتگو کی گئی ہے جس کا صبر و استقامت سے قریبی ربط ہے۔

پہلے ان لوگوں (شہداء) کو مردہ کہنے سے منع کیا گیا ہے فرمایا جو راہ خدا میں قتل ہوں اور شربت شہادت نوش کریں انہیں کبھی مردہ نہ کہو۔ اس کے بعد مزید تاکید سے فرمایا بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور وادراک نہیں رکھتے۔

عموماً ہر تحریک میں ایک گروہ بزدل اور راحت طلب لوگوں کا ہوتا ہے جو اپنے آپ کو ایک طرف لے جاتا ہے اور کنارہ کش رہتا ہے یہ لوگ اتنا ہی نہیں کرتے کہ خود کام نہ کریں بلکہ دوسروں کو بھی بددل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

برزخ کی زندگی اور روح کی بقاء

اس آیت سے انسان کی حیات برزخ (موت کے بعد اور قیامت سے پہلے کی زندگی) کا بھی واضح ثبوت ملتا ہے اور یہ ان لوگوں کے لئے جواب ہے جو کہتے ہیں کہ قرآن نے روح کی بقاء اور برزخ کی زندگی کے متعلق کوئی گفتگو نہیں کی۔

اس موضوع کی مزید تشریح شہدا کی حیات جاودان، خدا کے ہاں اس کا بدلہ اور راہ خدا میں قتل ہونے والوں کا عظیم مرتبہ تفسیر نمونہ جلد سوم (سورہ آل عمران آیہ۱۶۹ کے ذیل) میں پڑھیے گا۔

(۱۵۵)وَ لَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَ الۡجُوۡعِ وَ نَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَنۡفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ ۙ	یقیناً ہم تم سب کی خوف بھوک، مالی و جانی نقصان اور پھلوں کی کمی جیسے امور سے آزمائش کریں گے اور صبر و استقامت دکھانے والوں کو بشارت دیجئے۔
(۱۵۶)الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِیۡبَةٌ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ ؕ	وہ جنہیں جب کوئی مصیبت آ پہنچے تو کہتے ہیں ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف پلٹ جائیں گے۔

(۱۵۷)اُولٰٓئِکَ عَلَیۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَ رَحۡمَةٌ ۟ وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ	یہ وہی لوگ ہیں کہ الطاف و رحمت الٰہی جن کے شامل حال ہےاور یہی ہدایت یافتہ ہیں۔

تفسیر

خدالوگوں کی آزمائش کیوں کرتا ہے؟

راہ خدا میں شہادت، شہداء کی ابدی زندگی اورصبر وشکر جن میں سے ہرایک خدائی آزمائش کے مختلف رخ ہیں کے ذکر کے بعداس آیت میں بطور کلی آزمائش اوراس کی مختلف صورتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہےاوراس کے یقینی اور غیر مبدل ہونے کا تذکرہ فرمایا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے یہ امر مسلم ہے کہ ہم تمہیں چند ایک امور مثلاً خوف بھوک مالی و جانی نقصان اور پھلوں کی کمی کے ذریعے آزمائیں گے۔

چونکہ ان امتحانات میں کامیابی صبر و پائیداری کے بغیر ممکن نہیں لہٰذا آیت کے آخر میں فرمایا اور بشارت دیجئے صبر و استقامت دکھانے والوں کو۔

اور یہ ایسے افراد ہیں جو ان سخت آزمائشوں سے خوبصورتی سے عہدہ برآ ہوتے ہیں انہیں بشارت دینا چاہئے باقی رہے سست مزاج اور بےاستقامت لوگ تو وہ آزمائشوں کے مقامات سے روسیاہ ہوکر واپس آتے ہیں۔

(۱۵۶)بعد کی آیت صابرین کے بارے میں زیادہ تشریح کرتی ہے ارشاد ہوتا ہے وہ ایسے اشخاص ہیں کہ جب کسی مصیبت کا سامنا کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم خدا کے لئے ہیں اوراسی کی طرف پلٹ کر جائیں گے۔

اس حقیقت کی طرف دیکھتے ہوئے کہ ہم اس کے لئے ہیں ہمیں یہ درس ملتا ہے کہ نعمات زائل ہونے سے ہمیں کوئی دکھ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ یہ تمام نعمتیں بلکہ خود ہمارا وجود اس سے تعلق رکھتا ہے آج وہ ہمیں کوئی چیز بخشتا ہےاور کل واپس لے لیتا ہے ان دونوں میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہے۔

اس واقعیت کی طرف توجہ رکھتے ہوئے کہ ہم سب اسی کی بارگاہ میں لوٹ کر جائیں گے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہمیشہ رہنے کا گھر نہیں ہے ان نعمتوں کا زوال اوران عطیات کی کمی بیشی سب کچھ بہت جلد گذر جانے والی چیزیں ہیں اور یہ تکامل کا ذریعہ ہیں لہٰذا ان دو بنیادی اصولوں کی طرف توجہ کرنا صبر واستقامت کے جذبے کو بہت تقویت بخشتا ہے۔

واضح ہے''قَالُوۡٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیۡهِ رَاجِعُوۡن'' سے مراد صرف زبانی ذکر نہیں بلکہ اس کی حقیقت اور روح کی طرف متوجہ ہونا ہےاس کے مفہوم میں توحید وایمان کی ایک دنیا آباد ہے۔

(۱۵۷)زیر بحث آخری آیت میں عظیم امتحانات میں صبر کرنے والوں اور پامردی دکھانے والوں کے لئے خدا تعالی کے عظیم لطف وکرم کو بیان کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے! یہ وہ لوگ ہیں جن پر خدا کا لطف وکرم اور درود وصلوٰۃ ہے۔

یہ الطاف اور رحمتیں انہیں قوت بخشتی ہیں کہ وہ اس پرخوف وخطر راستے میں سے اشتباہ اور انحراف میں گرفتار نہ ہوں لہٰذا آیت کے آخر میں فرمایا اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔

چند اہم نکات

خدا لوگوں کی آزمائشوں کیوں کرتا ہے؟

آزمائش اور امتحان کے مسئلے پر بہت گفتگو کی گئی ہے پہلے پہل جو سوال ذہن میں ابھرتا ہے یہ ہے کہ کیا آزمائش اور امتحان کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ جو چیزیں غیر واضح ہیں وہ واضح ہو جائیں اور ہماری جہالت و نادانی کے پلڑے میں کمی ہو سکے اگر ایسا ہی ہے تو پھر خداوند عالم جس کا علم تمام چیزوں پر محیط ہے اور جو ہر شخص اور ہر شے کے اندرونی اور بیرونی اسرار سے آگاہ ہے اور زمین وآسمان کے غیوب کو اپنے بے پایاں علم سے جانتا ہے کیوں امتحان لیتا ہے کیا کوئی چیز اس سے مخفی ہے جو امتحان کے ذریعے آشکار ہو جائے گی۔

اس اہم سوال کا جواب تلاش کرنا چاہئے۔

آزمائش اور امتحان کا مفہوم خدا کے بارے میں اس مفہوم سے بہت مختلف ہے جو ہمارے درمیان مروّج ہے ہماری آزمائشوں کا مقصود وہی ہے جو اوپر بیان کیا جا چکا ہے یعنی مزید معلومات حاصل کرنا اور ابہام وجہل کو دور کرنا لیکن خدا کی آزمائش در حقیقت پرورش وتربیت ہی کا دوسرا نام ہے جس کی وضاحت یوں ہے کہ قرآن میں بیس سے زیادہ مقامات پر امتحان کی نسبت خدا تعالی کی طرف دی گئی ہے یہ ایک قانون کلی ہے اور پروردگار کی دائمی سنت ہے کہ کہ وہ پوشیدہ صلاحتیوں کو ظاہر کرتا ہے جسے قوت سے فعل تک پہنچنے کا عمل کہتے ہیں وہ بندوں کو تربیت دینے کے لئے آزماتا ہے جیسے فولاد کو زیادہ مضبوط بنانے کے لئے بھٹی میں ڈالا جاتا ہے اصطلاح میں اسے آب دینا کہتے ہیں اسی طرح خدا تعالی آدمی کو شدید حوادث کی بھٹی میں پرورش وتربیت کے لئے ڈالتا ہے اور اسے مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرتا ہے۔

فوجی جوانوں کو جنگی مشقیں کرائی جاتی ہیں اور انہیں طرح طرح کی مشکلات بھوک پیاس گرمی سردی دشوار حوادث اور سخت مسائل سے گزارا جاتا ہے تاکہ وہ قوی اور پختہ کار ہو جائیں خدا کی آزمائشوں کی رمز بھی یہی ہے۔

۲۔خدا کی آزمائش ہمہ گیر ہے

جہاں ہستی کا نظام چونکہ تکامل پرورش اور تربیت کا نام ہے اور تمام موجودات تکامل کے سفر میں ہیں۔

اس عمومی قانون کے مطابق انبیاء سے لے کر عامۃ الناس تک تمام لوگوں کی آزمائش ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنی استعداد ظاہر کریں خدا کے امتحانات کی مختلف صورتیں ہیں بعض مشکل ہیں اور بعض آسان ہیں لہٰذا ان کے نتائج بھی مختلف ہوتے ہیں بہرحال آزمائش اور امتحان سب کے لئے ہے۔

۳۔آزمائشوں میں کامیابی کا راز

یہاں ایک اور سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ جب تمام انسان ایک وسیع خدائی امتحان میں شریک ہیں تو ان میں کامیابی کا راستہ کونسا ہے۔اس سوال کے جواب میں یہ کہنا چاہیئے:

1۔امتحانات میں کامیابی کے لئے پہلا قدم وہی ہے جو اس چھوٹے سے پر معنی جملے میں بیان کیا گیا ہے''و بشر الصبرین'' یہ جملہ صراحت کرتا ہے کہ اس راہ میں صبر و استقامت کامیابی کی رمز ہے اسی لئے صابرین اور با استقامت لوگوں کو کامیابی کی بشارت دی جا رہی ہے۔

2۔اس جہان کے حوادث، سختیاں اور مشکلیں گزر جانے والی ہیں اور دنیا گزر گاہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اس امر کی طرف توجہ کامیابی کا دوسرا عامل ہے جسے اس جملے میں بیان کیا گیا ہے۔

''قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْن''(ہم خدا کے لئے ہیں اور ہماری بازگشت اسی کی طرف ہے)۔

(۱۵۸)اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَاجُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَ مَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ	صفا و مروہ خدا کے شعائر اور نشانیوں میں سے ہیں لہٰذا جو لوگ خانہ خدا کا حج کریں یا عمرہ بجالائیں ان کے لئے کوئی حرج نہیں کہ وہ ان دونوں پہاڑیوں کا طواف کریں (اور سعی کریں)اور جو لوگ حکم خدا کی بجا آوری کے لئے اعمال خیر بجالائیں خدا ان کا قدردان ہے اور ان کے کردار سے آگاہ ہے۔

شان نزول

شیعہ اور اہل تسنن دونوں کی بہت سی روایات میں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں مشرکین نے کوہ صفا پر ایک بہت بڑا بت نصب کر رکھا تھا جس کا نام اساف تھا کوہ مروہ پر ایک اور بت گاڑا گیا تھا جس کا نام نائلہ تھا سعی کرتے وقت وہ ان دونوں پہاڑیوں پر چڑھتے اور ان بتوں کو متبرک سمجھتے ہوئے مَس کرتے مسلمان اس وجہ سے صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کو ناپسند کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ موجودہ حالات میں صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا کوئی ٹھیک بات نہیں۔اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس نے بتایا کہ صفا و مروہ اللہ کے شعائر اور نشانیوں میں سے ہیں اگر کچھ نادان اور بیوقوف لوگوں نے انہیں بتوں کی نجاست سے آلودہ کر رکھا ہے تو اس کا یہ معنی نہیں کہ مسلمان سعی جیسے فریضہ کو ترک کر دیں۔

تفسیر

جاہلوں کے اعمال تمہارے مثبت اعمال میں حائل نہ ہوں

مخصوص نفسیاتی حالات میں یہ آیت نازل ہوئی جن کا ذکر کیا جا چکا ہے پہلے تو مسلمانوں کو خبر دی گئی کہ صفا و مروہ خدا کے

شعائر اور نشانیوں میں سے ہیں۔

اس مقدمہ اور تمہید کے بعد نتیجہ یوں بیان فرمایا گیا ہے جو لوگ خانہ خدا کا حج یا عمرہ بجالائیں ان کے لئے کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان دو پہاڑیوں کے درمیان طواف اور سعی کریں۔مشرکین نے غلط طور پر ان خدائی شعائر کو جو بتوں سے آلودہ کر رکھا ہے ان سے ان دو مقدس مقامات کی اہمیت میں کمی واقع نہیں ہوتی آیت کے آخری میں فرمایا گیا ہے جو لوگ اطاعت خدا کے لئے نیک کام انجام دیں تو خدا بھی شاکر و علیم ہے۔

اللہ تعالی اطاعت اور نیک کاموں کی انجام دہی کے بدلے اچھے عوض کے ذریعے بندوں کے اعمال کی قدر دانی کرتا ہے اور شکریہ ادا کرتا ہے اور ان کی نیتوں سے اچھی طرح واقف ہے وہ جانتا ہے کہ کون لوگ بتوں سے وابستگی رکھتے ہیں اور کون ان سے بیزار ہیں۔

صفا و مروہ

صفا و مروہ مکہ کی دو چھوٹی سی پہاریوں کے نام ہیں مسجد الحرام کی توسیع کے باعث آج کل یہ مسجد کے مشرقی حصے میں حجر الاسود اور مقام ابراہیم کی سمت میں واقع ہیں۔ یہ دونوں پہاڑیاں ایک دوسرے سے تقریبا ۴۲۰ میٹر کے فاصلے پر ہیں اس وقت یہ فاصلے ایک چھتے ہوئے بڑے ہال کی شکل میں ہے اور حجاج کرام اس چھت کے نیچے سعی کرتے ہیں صفا پہاڑی کی بلندی پندرہ میٹر اور مروہ کی آٹھ میٹر ہے صفا اور مروہ اس وقت وہ پہاڑیوں کے نام ہیں (اصطلاح میں علم کو کہتے ہیں) لیکن لغت میں صفا کا معنی مضبوط اور صاف پتھر جس میں مٹی، ریت اور سنگریزے نہ ہوں اور مروہ کا معنی ہے مضبوط اور درشت پتھر۔

"شعائر" جمع ہے "شعیرہ" کی جس کا معنی علامت اور نشانی ہے شعائر اللہ وہ علامات ہیں جو انسان کو خدا کی یاد دلائیں اور کسی مقدس چیز کو نظروں میں نئے سرے سے اجاگر کر دیں۔

ابراہیم علیہ السلام بڑھاپے کی منزل کو جا پہنچے تھے مگر ان کی کوئی اولاد نہ تھی انہوں نے خدا سے اولاد کی درخواست کی عالم پیری ہی میں ان کی کنیز ہاجرہ کے بطن سے انہیں فرزند عطا ہوا جس کا نام انہوں نے اسماعیل علیہ السلام رکھا۔

آپ کی پہلی بیوی سارہ کو یہ پسند نہ تھا کہ ان کے علاوہ کسی خاتون کے بطن سے ابراہیم علیہ السلام کو فرزند ملے اللہ تعالی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ ماں بیٹے کو مکہ میں جا کر ٹھہرائیں جو اس وقت ایک بے آب و گیاہ بیابان تھا۔

ابراہیم علیہ السلام نے حکم خدا کی اطاعت کی اور انہیں سرزمین مکہ میں لے گئے جو ایسی خشک اور بے آب و گیاہ تھی کہ وہاں کسی پرندے کا بھی نام و نشان نہ تھا جب ابراہیم انہیں چھوڑ کر تنہا واپس ہو لئے تو ان کی اہلیہ رونے لگیں کہ ایک عورت اور ایک شیر خوار بچہ اس بے آب و گیاہ بیابان میں کیا کریں گے۔

اس خاتون کے گرم آنسو اور ادھر بچے کا نالہ و زاری اس منظر نے ابراہیم علیہ السلام کا دل ہلا کے رکھ دیا انہوں نے بارگاہ الٰہی میں ہاتھ اٹھائے اور عرض کیا۔

خداوندا! میں تیرے حکم پر اپنی بیوی اور بچے کو اس جلا دینے والے بے آب و گیاہ بیابان میں تنہا چھوڑ رہا ہوں تا کہ تیرا نام بلند اور تیرا گھر آباد ہو۔ یہ کہہ کر غم واندوہ اور شدید محبت کے عالم میں الوداع ہوئے۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ماں کے پاس آب وغذا کا جو توشہ تھا ختم ہوگیا اور اس کی چھاتی کا دودھ بھی خشک ہوگیا شیر خوار بچے کی بے تابی اور تضرع وزاری نے ماں کو ایسا مضطرب کر دیا کہ وہ اپنی پیاس بھول گئی وہ پانی کی تلاش میں اٹھ کھڑی ہوئی پہلے کوہ صفا کے قریب گئی تو پانی کا کوئی نام ونشان نظر نہ آیا سراب کی چمک نے اسے کوہ مردہ کی طرف کھینچا تو وہ اس کی طرف دوڑی لیکن وہاں بھی پانی نہ ملا وہاں ویسی چمک صفا پر دکھائی دی تو پلٹ کر آئی زندگی کی بقاء اور موت سے مقابلے کے لئے اس نے ایسے سات چکر لگائے آخر شیر خوار بچہ زندگی کی آخری سانسیں لینے لگا کہ اچانک اس کے پاؤں کے پاس انتہائی تعجب خیز طریقے سے زمزم کا چشمہ ابلنے لگا ماں اور بچے نے پانی پیا اور موت جو یقینی ہوگئی تھی اس سے بچ نکلے۔

زمزم کا پانی گویا آب حیات تھا ہر طرف سے پرندے اس چشمے کی طرف آنے لگے قافلوں نے پرندوں کی پرواز دیکھی تو اپنے رخ اس طرف موڑ دیئے اور ظاہرا ایک چھوٹے سے خاندان کی فداکاری کے صلے میں ایک عظیم مرکز وجود میں آ گیا۔

آج خانہ خدا کے پاس اس خاتون اور اس کے فرزند اسماعیل علیہ السلام کا مسکن ہے ہر سال تقریباً ڈیڑھ کروڑ افراد اطراف عالم سے آتے ہیں ان کی ذمہ داری ہے کہ اس مسکن کو جسے مقام اسماعیل علیہ السلام کہتے ہیں اپنے طواف میں شامل کریں گویا اس خاتون اور اس کے بیٹے کے مدفن کو کعبہ کا جزء سمجھیں۔

صفا ومروہ کی سعی ہمیں یہ درس دیتی ہے کہ حق کا نام زندہ کرنے اور عظمت استقلال اور آبادی کے لئے شیر خوار بچے تک کو جان کی بازی لگا دینا چاہئے صفا ومروہ کی سعی میں سبق بھی پنہاں ہے کہ ناامیدیوں کے بعد بھی کئی امیدیں ہیں اسماعیل کی والدہ جناب ہاجرہ نے وہاں پانی کی تلاش جاری رکھی جہاں وہ دکھائی نہ دیتا تھا تو خدا نے بھی ایسے راستے سے انہیں سیراب کیا جس کا تصور نہیں ہو سکتا۔

صفا ومروہ کی سعی ہمیں درس دیتی ہے کہ توحید کے اس مرکز اور آئین کی قدر ومنزلت پہچانو کہ کتنوں نے اپنے کو موت سے ہم کنار کر کے آج اس مرکز توحید کو تمہارے لئے محفوظ رکھا۔

اسی لئے خداوند عالم نے سب زائرین خانہ کعبہ پر واجب قرار دیا کہ مخصوص لباس اور مخصوص وضع قطع کے ساتھ جو ہر قسم کے امتیاز اور تشخص سے پاک ہو سات مرتبہ ان امور کی تجدید کے لئے ان دو پہاڑیوں کے درمیان چلیں جو لوگ کبر وغرور کی وجہ سے عام لوگوں کے گزرنے کی جگہ پر ایک قدم اٹھانے کو تیار نہیں اور جو سڑکوں پر تیز رفتاری سے چلنا پسند نہیں کرتے وہی فرمان خدا کی طاعت کے لئے کبھی آہستہ اور کبھی تیزی سے دوڑتے ہیں روایات کے مطابق یہ وہ جگہ ہے جہاں کے بارے میں دیئے گئے احکامات متکبرین کو بیدار کرنے کے لئے ہیں۔

(۱۵۹) اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ وَ الۡهُدٰی مِنۡۢ بَعۡدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الۡکِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَلۡعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ یَلۡعَنُهُمُ اللّٰعِنُوۡنَ ۙ	جولوگ ان واضح دلائل اور ذرائع ہدایت کو چھپاتے ہیں جنہیں ہم نے نازل کیا، جب کہ ان لوگوں کے لئے ہم نے کتاب میں بیان کر دیا ہے، ان پر خدا لعنت کرتا ہے اور سب لعنت کرنے والے ان پر لعنت بھیجتے ہیں اور نفرین کرتے ہیں۔
(۱۶۰) اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَ اَصۡلَحُوۡا وَ بَیَّنُوۡا فَاُولٰٓئِکَ اَتُوۡبُ عَلَیۡهِمۡ ۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ	مگروہ جوتوبہ کرتے ہیں اور لوٹ آتے ہیں اپنے برے اعمال کی اصلاح کر کے نیک اعمال انجام دیتے ہیں اور جو کچھ چھپاتے تھے اسے آشکار کرتے ہیں تو میں ان کی توبہ قبول کرتا ہوں کہ میں توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہو۔

شان نزول

جلال الدین سیوطی نے اسباب نزول میں ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ افراد جن میں معاذ بن جبل، سعد بن معاذ اور خارجہ بن زید شامل تھے نے علماء یہود سے تورات کے چند مطالب کے متعلق سوالات کئے جو پیغمبر کے ظہور سے مربوط تھے انہوں نے اصل واقعہ کو چھپایا اور وضاحت کرنے سے احتراز کیا۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

ویسے تو روئے سخن علمائے یہود کی طرف ہے لیکن اس سے آیت کا کلی اور عمومی مفہوم محدود نہیں ہوتا اور یہ سب حقائق چھپانے والوں کے لئے عام ہے یہ آیت شریفہ حقائق چھپانے والوں کی شدید مذمت اور سرزنش کرتی ہے ارشاد ہوتا ہے جولوگ واضح دلائل اور ذرائع ہدایت کو چھپاتے ہیں جنہیں ہم نے کتاب الٰہی کے ذریعے نازل کیا ہے اور جو ان لوگوں کے سامنے ہیں ان پر خدا لعنت بھیجتا ہے اور خدا ہی نہیں بلکہ تمام لعنت کرنے والے انہیں لعنت کرتے ہیں۔

یہ آیت بڑی عمدگی سے واضح کرتی ہے کہ خدا کے تمام بندے اور فرشتے اس کام سے بیزار ہیں دوسرے لفظوں میں حق کو چھپانا ایسا عمل ہے جو حق کے تمام طرف داروں کے غم وغصے کو ابھارتا ہے کیونکہ اس سے بڑھ کر کیا خیانت ہوگی کہ علماء آیات خدا کو اپنے شخصی منافع کے لئے چھپائیں اور لوگوں کو گمراہ کریں جب کہ یہ ان کے پاس خدا کی امانت ہیں۔

قرآن کتاب ہدایت ہے لہٰذا یہ کبھی لوگوں کے لئے امید اور بازگشت کا دریچہ بند نہیں کرتی اس لئے بعد کی آیت میں راہ نجات اور گناہوں کی تلافی کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور اسے شدید سزا کے مقابلے میں یوں بیان کیا گیا ہے مگروہ جوتوبہ کریں اور خدا کی

طرف پلٹ آئیں اپنی برائیوں کی تلافی اور اعمال کی اصلاح کریں اور جو حقائق انہوں نے چھپار کھے تھے لوگوں کے سامنے آشکار کر دیں بے شک میں ایسے لوگوں کو بخش دوں گا اور ان کے لئے اپنی اس رحمت کی تجدید کردوں گا جو ان سے منقطع کی جا چکی ہے کیونکہ میں بازگشت کنندہ اور مہربان ہوں۔

اگر دیکھا جائے ''فَاُولٰٓئِکَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ'' کے بعد ''وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ'' کا آنا توبہ کرنے والوں کے لئے پروردگار عالم کی انتہائی محبت اور کمال مہربانی پر دلالت کرتا ہے یعنی فرماتا ہے اگر وہ پلٹ آئیں تو میں بھی رحمت کی طرف پلٹ آؤں گا اور اپنی عنایات و نعمات جو ان سے منقطع کر چکا ہوں پھر سے انہیں عطا کروں گا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ یوں نہیں کہتا کہ تم توبہ کرو تو میں تمہاری توبہ قبول کرلوں گا بلکہ کہتا ہے تم توبہ کرو اور پلٹ آؤ تو میں بھی پلٹ آؤں گا ان دونوں جملوں میں جو فرق ہے واضح ہے۔

احادیث اسلامی میں حق کو چھپانا

احادیث اسلامی میں بھی ان علماء پر شدید ترین حملے کئے گئے ہیں جو حقائق کو چھپاتے ہیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

''**من سئل عن علم یعلمه فکتم لجم یوم القیامه بلجام من النار**''

اگر کسی شخص سے ایسی چیز کے بارے میں پوچھا جائے جسے وہ جانتا ہے اور وہ اسے چھپائے تو قیامت کے دن آتش جہنم کی ایک لگام اس کے منہ میں دی جائے گی۔

ایک اور حدیث جو امیر المومنین علی علیہ السلام سے مروی ہے بیان کی جاتی ہے۔

لوگوں نے آپ علیہ السلام سے پوچھا: ''من شر خلق اللّٰه بعد ابلیس و فروعون'' (ابلیس اور فرعون کے بعد بدترین خلائق کون ہے)؟

امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: ''وہ بگڑے ہوئے علماء ہیں جو باطل کا اظہار اور حق کا اخفا کرتے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق خدا فرماتا ہے: ان پر خدا کی لعنت اور تمام لعنت کرنے والوں کی نفرین ہوگی''۔

(۱۶۱) اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِکَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ	جو لوگ کافر ہو جائیں اور حالت کفر ہی میں مر جائیں ان پر خدا فرشتے اور تمام انسان لعنت کرتے ہیں۔
(۱۶۲) خٰلِدِیْنَ فِیْهَا لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ	وہ ہمیشہ کے لئے زیر لعنت اور رحمت خدا سے دور رہیں گے ان کے عذاب میں تخفیف کی جائے گی نہ انہیں کوئی مہلت دی جائے گی۔

(۱۶۳)وَ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحۡمٰنُ الرَّحِيۡمُ ؑ	تمہارا خدا اور معبود وہ اکیلا خدا ہے جس کے علاوہ کوئی معبود اور لائق پرستش نہیں کیونکہ وہی بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں ہم حق کو چھپانے کا نتیجہ دیکھ چکے ہیں زیر نظر آیات میں بھی انہی کفار کی طرف اشارہ ہے جو ہٹ دھرمی حق پوشی کفر اور تکذیب حق کا سلسلہ موت آنے تک جاری رکھتے ہیں۔

فرمایا وہ لوگ جو کافر ہو گئے ہیں اور حالت کفر میں دنیا سے چل بسے ہیں ان پر خدا، فرشتوں اور سب انسانوں کی لعنت ہو گی۔

یہ گروہ بھی حق کو چھپانے والوں کی طرح خدا فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت میں گرفتار ہو جائے گا فرق یہ ہے کہ ان لوگوں کے لئے واپسی کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا کیونکہ یہ آخر عمر تک کفر پر مصر رہے۔

(۱۶۲) مزید فرمایا: یہ ہمیشہ خدا اور بندگان خدا کی لعنت کے زیر سایہ رہیں گے ان پر عذاب الٰہی کی تخفیف نہ ہو گی نہ انہیں کوئی مہلت دی جائے گی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان بدبختیوں کی وجہ سے چونکہ اصل توحید ختم ہو جاتی ہے۔

(۱۶۳) زیر نظر آخری آیت میں فرمایا تمہارا معبود اکیلا خدا ہے۔ مزید تاکید کے لئے ارشاد ہوتا ہے اس کے علاوہ کوئی معبود اور لائق پرستش نہیں۔

آیت کے آخر میں دلیل وعلت کے طور پر فرماتا ہے وہ خدا بخشنے والا مہربان ہے۔ بے شک وہ جس کی عام وخاص رحمت سب پر محیط ہے جس نے مومنین کے لئے خصوصی امتیازات قرار دیئے ہیں یقیناً وہی لائق عبادت ہے نہ کوئی اور جو سرتا پا احتیاج ہے۔

(۱۶۴)اِنَّ فِىۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّيۡلِ وَ النَّهَارِ وَ الۡفُلۡكِ الَّتِىۡ تَجۡرِىۡ فِى الۡبَحۡرِ بِمَا يَنۡفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡيَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَ بَثَّ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ۖ وَّ تَصۡرِيۡفِ الرِّيٰحِ وَ السَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَيۡنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ	آسمانوں اور زمین کی خلقت میں، رات دن کے آنے جانے میں، انسانوں کے فائدے کے لئے دریا میں چلنے والی کشتیوں میں، خدا کی طرف سے آسمان سے نازل ہونے والے اس پانی میں، جس کے ذریعہ خدا نے زمین کو موت کے بعد زندگی دی ہے اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے، ہواؤں کے چلنے میں اور بادلوں میں جو زمین و آسمان کے درمیان معلق ہیں (خدا کی ذات یکتائی کی)

لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ	ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل وفکر رکھتے ہیں۔

تفسیر

آسمان وزمین میں اس کی ذات پاک کے جلوے ہیں

گذشتہ آیت سے توحید پروردگار کی بحث شروع ہوتی ہے زیر نظر آیت درحقیقت خدا کی توحید کے مسئلے اور اس کی ذات پاک کی یکتائی پر ایک دلیل ہے۔

مقدمہ اور تمہید کے طور پر اس بات کی طرف توجہ رہے کہ نظم وضبط علم دانش اور عقل کے وجود کی دلیل ہے خدا شناسی کی کتب میں ہم اس بنیاد کی تشریح کر چکے ہیں کہ عالم ہستی میں جب نظم وضبط کے مظاہر نظر پڑتے ہیں اور نظام قدرت کی ہم آہنگی اور وحدت عمل پر نگاہ جاتی ہے تو فوراً توجہ ایک اکیلے مبداء علم وقدرت کی طرف مائل ہو جاتی ہے کہ یہ سب کچھ اسی کی طرف سے ہے۔

اس تمہید کو نظر میں رکھتے ہوئے اب ہم آیت کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں اس آیت میں جہاں ہستی کے نظم وضبط کے چھ قسم کے آثار کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں سے ہر ایک اس عظیم مبداء کے وجود کی نشانی ہے۔

۱۔ آسمانوں اور زمین کی خلقت میں

اس وقت کے علماء کہتے ہیں کہ عالم بالا میں ہزاروں کہکشائیں موجود ہیں ہمارا نظام شمسی ایک کہکشاں کا حصہ ہے صرف ہماری کہکشاں میں کروڑوں آفتاب اور چمکتے ستارے موجود ہیں علماء عصر کے اندازے کے مطابق ان میں لاکھوں مسکونی سیارے ہیں جن میں اربوں موجودات ہیں کیا ہی عظمت وقدرت ہے

۲۔ رات دن کے آنے جانے میں

جی ہاں یہ رات دن کا اختلاف اور ایک مخصوص تدریجی نظام کے ساتھ یہ روشنی اور تاریکی کی آمد وشد اس سے پھر چار موسم وجود پاتے ہیں نباتات اور دیگر زندہ موجودات اسی نظام کی وجہ سے تدریجی طور پر مراحل تکامل طے کرتے ہیں اس ذات پاک اور اس کی بلند صفات کے لئے یہ ایک اور نشانی ہے۔

۳۔ انسانوں کے نفع کی چیزیں لے کر کشتیاں دریا میں چلتی ہیں

چھوٹی بڑی کشتیوں کے ذریعے انسان وسیع سمندروں میں چلتا ہے اور اپنے مقاصد کے لئے ان کے ذریعے زمین کے مختلف حصوں میں جاتا ہے یہ سفر خصوصا بادبانی کشتیوں کا سفر چند نظاموں کی وجہ سے ہے۔

۴۔ پانی جسے خدا آسمان سے نازل کرتا ہے

اس کے ذریعے مردہ زمینوں کو زندہ کرتا ہے اور اسی نے ان میں طرح طرح کے جانور پھیلا رکھے ہیں بارش کے حیات بخش تازہ اور بابرکت موتی اور اس طبعی صاف وشفاف پانی کے قطرے ہر جگہ گرتے ہیں اور گویا زندگی کا چھڑکاؤ کرتے ہیں اور اپنے

ساتھ حرکت و برکت آبادی اور نعمتوں کی فراوانی لاتے ہیں یہ پانی جو ایک خاص نظام کے تحت گرتا ہے تمام موجودات اور جاندار اس بے جان سے جان پاتے ہیں۔

یہ سب اس کی عظمت وقدرت کے پیغامبر ہیں۔

۵۔ ہواؤں کا ایک منظّم طریقے سے چلنا

ہوائیں نہ صرف سمندروں پر چلتی اور کشتیوں کو چلاتی ہیں بلکہ خشک زمینوں پہاڑوں دروں اور جنگلوں کو بھی اپنی جولان گاہ بناتی ہیں کبھی یہ ہوائیں نرگھاس کے چھوٹے چھوٹے دانوں کو مادہ سبزہ زاروں پر چھڑکتی ہیں اور پیوند کاری و بار آوری میں ان کی مدد کرتی ہیں ہمارے لئے پھلوں کا تحفہ لاتی ہیں اور طرح طرح کے بیجوں کو وجود دیتی ہیں۔

کبھی ہوائیں گرم علاقوں کی تپش سرد علاقوں میں کھینچ لاتی ہیں اور کبھی سرد علاقوں کی خنکی گرم علاقوں میں منتقل کر دیتی ہیں اور یوں زمین کی حرارت کو معتدل کرنے میں موثر مدد کرتی ہیں کبھی یہ ہوائیں شہروں کی باد سموم کو جس میں آکسیجن نہیں ہوتی بیابانوں اور جنگلوں میں منتشر کر دیتی ہیں اور یوں نوع بشر کی زندگی کا سامان کرتی ہیں۔

گویا ہواؤں کا چلنا جس میں یہ تمام فوائد و برکات ہیں اس کے بے انتہا لطف وحکمت کی ایک اور نشانی ہے۔

۶۔ وہ بادل جو زمین وآسمان کے درمیان معلق ومسخر ہیں

ایک دوسرے سے ٹکرانے والے یہ بادل جو ہمارے سروں کے اوپر گردش میں ہیں اربوں ٹن پانی اٹھائے کشش ثقل کے قانون کے برعکس آسمان وزمین کے درمیان معلق ہیں اور اس پانی کو بغیر کوئی خطرہ پیدا کئے ادھر ادھر لے جاتے ہیں یہ اس کی عظمت کی ایک اور نشانی ہے۔

جی ہاں! یہ سب اس کی ذات پاک کی نشانیاں اور علامتیں ہیں لیکن ایسے لوگوں کے لئے جو عقل وہوش رکھتے ہیں اور غور وفکر کرتے ہیں ان کے لئے نہیں جو بے خبر اور کم ذہن ہیں نہ ان کے لئے جو آنکھیں رکھتے ہوئے بے بصیرت ہیں اور کان رکھتے ہوئے بہرے ہیں۔

(۱۶۵) وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَنۡدَادًا يُّحِبُّوۡنَهُمۡ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَ لَوۡ يَرَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡۤا اِذۡ يَرَوۡنَ الۡعَذَابَ ۙ اَنَّ الۡقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيۡعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعَذَابِ	بعض لوگ خدا کو چھوڑ کر اپنے لئے کسی اور معبود کا انتخاب کرتے ہیں اور انہیں اس طرح دوست رکھتے ہیں جیسے خدا کو رکھنا چاہئے لیکن وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں انہیں خدا سے شدید عشق ومحبت ہے اور جنہوں نے ظلم کیا ہے (اور خدا کے علاوہ کسی اور کو معبود قرار دے لیا ہے) جب وہ عذاب خدا کو دیکھیں گے تو جان لیں گے کہ تمام قدرت خدا کے ہاتھ ہے (نہ کہ ان خیالی معبودوں کے ہاتھ جن سے وہ ڈرتے ہیں) اور خدا کا عذاب اور سزا شدید ہے۔

(۱۶۶)اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَ رَاَوُا الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ	اس وقت (انسانی و شیطانی معبود اور) رہبر اپنے پیروکاروں سے بیزار ہوں گے وہ عذاب خدا کا مشاہدہ کریں گے اور ان کے باہمی تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔
(۱۶۷)وَ قَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ۧ	تب پیروکار کہیں گے کاش ہم دوبارہ دنیا کی طرف پلٹ جائیں تاکہ ہم بھی ان سے اسی طرح بے بیزاری اختیار کریں جس طرح آج یہ ہم سے بیزار ہیں۔ یونہی خدا انہیں ان کے اعمال حسرت دکھائے گا (اور انہیں اپنے اعمال سراپا یاس دکھائی دیں گے) اور وہ ہرگز (جہنم کی) آگ سے خارج نہیں ہوں گے۔

تفسیر

پہلے کی دو آیات میں وجود خدا اور اس کی توحید و یگانگت کو نظام خلقت اور اس کی ہم آہنگی کے دلائل سے ثابت کیا گیا ہے اسی وجہ سے محل بحث آیت میں روئے سخن ان لوگوں کی طرف سے جنہوں نے ان واضح اور قطعی براہین سے چشم پوشی کی شرک و بت پرستی اختیار کی اور متعدد خدا قرار دے لئے یہ گفتگو ان لوگوں کے بارے میں ہے جنہوں نے خشک لکڑی کے زوال پذیر معبودوں کے سامنے سر تعظیم خم کیا ہے ان سے ایسا عشق کرتے ہیں جیسا عشق صرف خدا تعالی کے لائق ہے جو تمام کمالات کا منبع و مرکز ہے اور تمام نعمات بخشنے والا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: بعض لوگ اپنے لئے خدا کے علاوہ معبود انتخاب کرتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف بتوں کو اپنا معبود قرار دے لیا تھا بلکہ ان کے اس طرح عاشق ہو گئے تھے جیسے خدا سے محبت کی جاتی ہے۔ لیکن جو لوگ خدا پر ایمان لا چکے ہیں وہ اللہ سے زیادہ محبت رکھتے ہیں۔

مومنین کے عشق کا سرچشمہ عقل علم اور معرفت ہے اور کفار کے عشق کی بنیاد جہالت خرافات اور خواب و خیال ہے اسی لئے پہلی قسم کی محبت کبھی متزلزل نہیں ہو سکتی لیکن مشرکین کے عشق میں ثبات دوام نہیں لہذا آیت کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا گیا ہے یہ ظالم جب عذاب خدا کو دیکھیں گے اور جان لیں گے کہ تمام قدرتیں خدا کے ہاتھ میں ہیں اور وہی عذاب شدید کا مالک ہے اس وقت اپنے اعمال کی پستی و حقارت اور اپنے کرتوتوں کے برے انجام کی طرف متوجہ ہوں گے اور اعتراف و اقرار کریں گے کہ ہم کجرو اور منحرف لوگ تھے۔

(۱۶۶) بہرحال اس وقت جہالت غرور اور غفلت کا پردہ ان کی آنکھوں سے اٹھ جائے گا اور وہ اپنے اشتباہ اور غلطی کو جان لیں گے لیکن چونکہ ان کے لئے کوئی پناہ گاہ اور سہارا نہ ہو گا لہذا سخت بے چارگی میں وہ بے اختیار اپنے معبودوں اور رہبروں کے دامن تھامنے کو لپکیں گے مگر اس وقت ان کے گمراہ رہبران کو پیچھے دھکیل دیں گے اور وہ اپنے پیروکاروں سے اظہار بیزاری کریں گے۔

اسی حالت میں وہ اپنی آنکھوں سے عذاب الٰہی دیکھیں گے اور ان کے باہمی تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔

واضح ہے کہ یہاں معبودوں سے مراد پتھر اور لکڑی کے بت نہیں بلکہ وہ جابر و قاہر انسان اور شیاطین ہیں کہ مشرکین اپنے تئیں دست بستہ جن کے اختیار میں دے چکے ہیں لیکن وہ بھی اپنے پیروکاروں کو دھتکار دیں گے۔

(۱۶۷) ایسے میں جب یہ گمراہ پیروکار اپنے معبودوں کی یہ کھلی بے وفائی دیکھیں گے تو اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے کہیں گے کاش ہم دنیا میں پلٹ جائیں تو ان سے بیزاری اختیار کریں گے جیسے وہ آج ہم سے بیزار ہیں۔

لیکن اب کیا فائدہ معاملہ تو ختم ہو چکا ہے اب دنیا کی طرف پلٹنا ممکن نہیں رہا۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے: ہاں اسی طرح ان کے اعمال ان سب کے لئے سبب حسرت و یاس بنا کر پیش کرے گا۔ اور وہ کبھی جہنم کی آگ سے نہیں نکلیں گے۔ لیکن یہ حسرت بیہودہ ہے چونکہ اس وقت نہ عمل کا موقع ہے نہ جبران کرنے کی جگہ ہے۔

(۱۶۸) يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ	اے لوگو! زمین میں جو کچھ حلال اور پاکیزہ ہے اسے کھاؤ اور شیطان کے نشان پا کی پیروی نہ کرو بلکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔
(۱۶۹) اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ	وہ تمہیں فقط برائیوں اور انحرافات کا حکم دیتا ہے نیز (کہتا ہے کہ) جن امور کو تم نہیں جانتے انہیں خدا کی طرف منسوب کر دو۔

شان نزول

ابن عباس سے منقول ہے کہ عرب کے بعض قبیلوں مثلاً ثقیف خزاعہ وغیرہ نے بعض زرعی اجناس اور جانوروں کو بغیر کسی دلیل کے اپنے اوپر حرام قرار دے رکھا تھا یہاں تک کہ ان کی تحریم کی نسبت خدا کی طرف دیتے تھے اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں جن میں انہیں اس ناروا عمل سے روکا گیا ہے۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں شرک و بت پرستی کی سخت مذمت کی گئی تھی شرک کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان خدا کے علاوہ کسی کو قانون ساز سمجھ لے اور نظام تشریع اور حلال و حرام اس کے اختیار میں قرار دے دے محل بحث آیات میں ایسے عمل کو شیطانی فعل قرار دیا گیا ہے پہلے ارشاد ہوتا ہے: اے لوگو! جو کچھ زمین میں حلال اور پاکیزہ ہے اسے کھاؤ۔

اور شیطان کے نقوش قدم پر نہ چلو کیونکہ وہ تمہارا واضح دشمن ہے۔

(۶۷) شیطان جس کا مقصد انسان کی بدبختی اور شقاوت کے سوا کچھ نہیں۔ یہ آیت اس کی انسان سے شدید ترین دشمنی کو بیان کرتی ہے فرمایا: وہ صرف تمہیں طرح طرح کی برائیوں اور قباحتوں کا حکم دیتا ہے۔ نیز تمہیں آمادہ کرتا ہے کہ خدا پر افترا باندھو اور جو

چیز تم نہیں جانتے ہو اس کی خدا کی طرف نسبت دو۔

ان آیات سے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیطان کے پروگراموں کا خلاصہ یہی تین امور ہیں۔ برائیاں قباحتیں اور ذاتِ پروردگار سے بے بنیاد باتیں منسوب کرنا۔

''فحشاء'' کا مادہ ہے فحش جس کا مطب ہر وہ چیز ہے جو حد اعتدال سے خارج ہوکر فاحش کی شکل اختیار کرلے اس لحاظ سے تمام منکرات اور واضح قباحتیں اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔

تدریجی انحرافات

''خطوات الشیطان'' (شیطان کے نقوش پا) یہ الفاظ ایک دقیق تربیتی مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور وہ یہ کہ کجرویاں اور تباہ کاریاں آہستہ آہستہ انسان میں نفوذ کرتی ہیں نہ کہ دفعتاً۔

یہ کام فقط وہ ایک مشہور شیطان نہیں کرتا بلکہ شیطانی قوتیں اپنے غلط منصوبوں کو اسی طرح عملی جامہ پہناتی ہیں اسی لئے قرآن کہتا ہے کہ پہلے قدم پر ہی ہوش میں آکر شیطان کی ہمراہی سے کنارہ کش ہو جانا چاہئے۔

(۱۷۰)وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَآ اَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ شَيۡـًٔا وَّ لَا يَهۡتَدُوۡنَ	جب انہیں کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباواجداد کو پایا ہے کیا ایسا نہیں کہ ان کے آباواجداد نہ کسی چیز کو سمجھتے ہیں اور نہ ہدایت یافتہ ہیں۔
(۱۷۱) وَ مَثَلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا كَمَثَلِ الَّذِىۡ يَنۡعِقُ بِمَا لَا يَسۡمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡىٌ فَهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ	کافروں کو دعوت دینے میں تمہاری مثال اس شخص کی سی ہے جو (بھیڑوں اور دیگر جانوروں کو خطرات سے بچانے کے لئے) آواز دیتا ہے لیکن وہ صدا اور پکار کے سوا کچھ نہیں سنتے (اور اس کی بات کی حقیقت اور مفہوم کو نہیں سمجھ پاتے) وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، اس لئے کچھ نہیں سمجھ سکتے۔

تفسیر

آباءواجداد کی اندھی تقلید

یہاں مشرکین کی کمزور منطق حلال غذاؤں کی بلا جواز تحریم یا بطور کلی بت پرستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں ہم نے جس طریقے پر اپنے آباوَاجداد کو پایا ہے اسی کی

پیروی کریں گے۔

قرآن اس بیہودہ اور خرافاتی منطق کی فوراً خبر لیتا ہے جو آباؤاجداد کی اندھی تقلید ہے ارشاد ہوتا ہے کیا ایسا نہیں کہ ان کے آباؤاجداد کچھ نہیں سمجھتے تھے اور وہ ہدایت یافتہ نہیں تھے۔ یا اگر وہ پڑھے لکھے اور ہدایت یافتہ لوگ ہوتے تو گنجائش تھی کہ ان کی پیروی کی جاتی لیکن یہ جاننے کے باوجود کہ وہ ان پڑھ نادان اور توہم پرست تھے کیا تک ہے کہ ان کی پیروی کی جائے کیا یہ جاہل کی تقلید کا مصداق نہیں؟ ای دو صد لعنت براین تقلید باد۔

(۱۷۱) یہ آیت کہتی ہے کہ یہ گروہ ان واضح دلائل کے ہوتے ہوئے کیوں حق کی طرف نہیں پلٹا اور کیوں گمراہی و کفر پر اصرار کرتا ہے فرمایا اس کافر قوم کو ایمان لانے اور اندھی تقلید چھوڑنے کی دعوت دیتے ہوئے تمہاری مثال اس شخص کی طرح ہے جو بھیڑوں اور دیگر جانوروں کو (خطرے سے نجات دلانے کے لئے) آواز دیتا ہے لیکن وہ ایک پکار اور صدا کے سوا کچھ نہیں پاتے۔

آیت کے آخر میں تاکید اور مزید وضاحت کے لئے فرماتا ہے وہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں کسی چیز کا ادراک نہیں کر سکتے۔

جبھی تو وہ اپنے آباءواجداد کی غلط رسموں اور خرافاتی طریقوں سے چمٹے ہوئے ہیں اور ہر اصلاحی دعوت سے انہوں نے منہ موڑ رکھا ہے۔

(۱۷۲) یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ	اے ایمان والو! جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے پاک و پاکیزہ چیزیں (شوق سے) کھاؤ اور اگر خدا ہی کی عبادت کرتے ہو تو اس کا شکر بجالاؤ۔
(۱۷۳) اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَ مَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ	اس نے تم پر مردہ جانور خون سور کا گوشت اور وہ جانور جس پر (ذبح کرتے وقت) غیر خدا کا نام لیا گیا ہو حرام کیا ہے پس جو شخص مجبور ہو کر اگر وہ سرکشی و زیادتی کرنے والا نہ ہو ان میں سے کچھ کھالے تو اس پر کوئی گناہ نہیں بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر

وہ کجرویاں جو جڑ پکڑ چکی ہیں ان کی اصلاح کے لئے قرآن کا اسلوب ہے کہ وہ مختلف طرزوں اور طریقوں کی تاکید و تکرار سے استفادہ کرتا ہے ان آیات میں زمانہ جاہلیت میں مشرکین کی حرام کردہ حلال غذاؤں کے بارے میں دوبارہ گفتگو کرتا ہے فرق یہ ہے کہ اب روئے سخن مومنین کی طرف ہے جب کہ گذشتہ آیات میں تمام لوگ (یا ایها لناس) مخاطب تھے فرماتا ہے: اے ایمان والو!

ان پاکیزہ نعمتوں میں سے میں نے تمہیں جو روزی دی ہے اسے کھاؤ۔ اگر خدا ہی کی عبادت کرتے ہو تو پھر اس کا شکرادا کرو۔ یہ پاک و حلال نعمتیں جو ممنوع نہیں ہیں انسان کی فطرت سلیم کے موافق ہیں اور تمہارے لئے پیدا کی گئی ہیں تم ان سے کیوں استفادہ نہیں کرتے۔

(۱۷۳) اس آیت میں حرام اور ممنوع غذاؤں کو واضح کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں ہر طرح کے بہانوں کو ختم کر دیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: خدا نے مردار کا گوشت، خون، سور کا گوشت اور اس جانور کا گوشت جسے ذبح کرتے ہوئے غیر خدا کا نام لیا جائے حرام کیا ہے۔

بعض اوقات ایسی ضروریات پیش آتی ہیں کہ انسان بعض حرام چیزوں کے استعمال پر بھی مجبور ہو جاتا ہے لہٰذا قرآن اس استثنائی پہلو کے بارے میں کہتا ہے لیکن جو شخص اپنی جان کے تحفظ کے لئے مجبور ہو کر انہیں کھالے تو اس پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ وہ ظالم ومتجاوز نہ ہو۔ اس بنا پر کہ کہیں اضطرار کو بہانہ ہی نہ بنا لیا جائے ان حرام غذاؤں کے کھانے میں زیادتی اور تجاوز روکنے کے لئے ''غَیۡرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ'' فرمایا گیا ہے۔ یعنی یہ اجازت صرف ان افراد کے لئے ہے جو ان محرمات کو لذت کے لئے نہ کھانا چاہیں اور اتنا ہی کھائیں جتنا حفظ جان کے لئے ضروری ہو اس سے تجاوز نہ کریں۔

آیت کے آخر میں فرمایا: خدا غفور و رحیم ہے۔ وہی خدا جس نے یہ گوشت حرام قرار دیئے ہیں اس نے اپنی رحمت خاص سے شدید ضرورت کے وقت ان سے استفادہ کرنے کی اجازت بھی دے دی ہے۔

(۱۷۴) اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ یَشۡتَرُوۡنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ۙ اُولٰٓئِکَ مَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ اِلَّا النَّارَ وَ لَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَ لَا یُزَکِّیۡہِمۡ ۚۖ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ	وہ لوگ جو اسے چھپاتے ہیں جسے خدا نے کتاب میں نازل کیا ہے اور وہ اسے تھوڑی سی قیمت پر بیچ دیتے ہیں سوائے آگ کے کچھ نہیں کماتے (یہ قیمت درحقیقت ایک جلانے والی آگ ہے) اور قیامت کے دن خدا ان سے بات نہیں کرے گا نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔
(۱۷۵) اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالۡہُدٰی وَ الۡعَذَابَ بِالۡمَغۡفِرَۃِ ۚ فَمَاۤ اَصۡبَرَہُمۡ عَلَی النَّارِ	یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت اور عذاب کو بخشش کی بجائے خرید لیا ہے۔ عذابِ الٰہی کے مقابلے میں واقعاً یہ کتنے بے پرواہی اور سردمہری کا شکار ہیں۔

(۱۷۶)ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ ؕ وَ اِنَّ الَّذِیۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِی الۡکِتٰبِ لَفِیۡ شِقَاقٍۭ بَعِیۡدٍ ۟	یہ (سب کچھ) اس لئے ہے کہ خدا نے (آسمانی) کتاب کو حق (کی نشانیوں اور واضح دلائل) کے ساتھ نازل کیا ہے اور جو اس میں (حق کو چھپا کر اور تحریف کر کے) اختلاف پیدا کرتے ہیں گہرے شگاف (اور پراگندگی) میں پڑے ہیں۔

شان نزول

تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ آیات اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہیں بیشتر مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ آیات خاص طور پر ان علماء یہود کے بارے میں ہیں جو پیغمبر ﷺ اسلام کے ظہور سے پیشتر لوگوں کو اپنی کتابوں میں سے آپ کی صفات اور نشانیاں بیان کرتے تھے لیکن ظہور پیغمبر ﷺ کے بعد جب انہوں نے لوگوں کو آپ ﷺ کی طرف مائل وراغب ہوتے ہوئے دیکھا تو خوفزدہ ہو گئے کہ اگر انہوں نے اپنی روش کو برقرار رکھا تو ان کے منافع خطرے میں پڑ جائیں گے اور وہ تحفے اور دعوتیں جو انہیں مہیا ہیں ختم ہو جائیں گی تو وہ پیغمبر ﷺ کے وہ اوصاف جو تورات میں نازل ہو چکے تھے چھپانے لگے اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور ان کی سخت مذمت کی گئی۔

تفسیر

دوبارہ حق پوشی کی مذمت

حق کو چھپانے کے بارے میں جو موضوع اسی سورہ کی آیہ ۱۵۹۔ میں گزر چکا ہے زیرنظر آیات اس کی تاکید میں ہیں۔

زیرنظر پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے وہ لوگ جو خدا کی نازل کردہ کتاب کو چھپاتے ہیں اور اسے معمولی قیمت پر بیچ دیتے ہیں آگ کے علاوہ کچھ نہیں کماتے۔

واقعاً اس طرح سے جو ہدیے وہ حاصل کرتے ہیں اور مال ومنال کماتے ہیں وہ جلانے والی آگ ہے جو ان کے اندر داخل ہوتی ہے۔

اس کے بعد ان کی ایک معنوی سزا کو بیان کیا گیا ہے جو مادی سزا سے کہیں زیادہ دردناک ہے ارشاد ہوتا ہے خدا قیامت کے دن ان سے بات نہیں کرے گا نہ انہیں پاک کرے گا اور دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔

محل بحث آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بڑی روحانی لذت اور عطائے الٰہی ہے کہ آخرت میں خدا اہل ایمان سے اپنے لطف وکرم سے بات کرے گا۔

واضح ہے کہ خدا کی گفتگو کا یہ مفہوم نہیں کہ خدا زبان رکھتا ہے اور اس کا جسم ہے بلکہ وہ اپنی بے پایاں قدرت کے ذریعے فضا میں آواز کی لہریں پیدا کر دے گا جو سمجھنے اور سننے کے قابل ہوں گی (جیسے وادی طور میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو ہوئی تھی) یہ بھی ممکن

ہے کہ الہام کے ذریعے دل کی زبان سے وہ اپنے مخصوص بندوں سے بات کرے گا۔

(۱۷۵)اس آیت میں اس گروہ کی کیفیت کو زیادہ واضح طور پر بیان کرتی ہے اوراس کے نقصان دہ انجام اورنتیجہ کار کی خبر دیتی ہے ارشاد ہوتا ہے یہ ایسے لوگ ہیں جو گمراہی کو ہدایت کے بدلے اور عذاب کو بخشش کے عوض خرید لیتے ہیں۔

اس طرح وہ دوطرفہ نقصان اور خسارے میں گرفتار ہوئے ہیں ایک طرف ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی انتخاب کرنا اور دوسری طرف رحمت وبخشش الٰہی کو ہاتھ سے دے کراس کی جگہ دردناک عذاب خدا کو حاصل کرنا ایک ایسا سودا ہے کہ کوئی عقلمند آدمی اس کے پیچھے نہیں جاتا۔

آیت کے آخر میں مزید فرماتا ہے واقعاً تعجب کی بات ہے کہ وہ عذاب خدا کے سامنے کتنی بیباکی اور سردمہری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

(۱۷۶)زیربحث آخری آیت میں فرمایا گیا ہے یہ دھمکیاں اورعذاب کی وعیدیں جوحق کو چھپانے والوں کے لئے بیان کی گئی ہیں اس لئے ہیں کہ خدانے آسمانی کتاب قرآن کوحقیقت اور واضح دلائل کے ساتھ نازل کیا ہے تاکہ ان خیانت کاروں کے لئے کسی شک اورابہام کی گنجائش باقی نہ رہے۔

اس کے باوجودلوگ نہیں چاہتے کہ اپنے مادی فوائد کی خاطر اس برے عمل سے دست بردار ہوں وہ توجیہ وتحریف میں مشغول رہتے ہیں اوراپنی آسمانی کتب میں اختلاف پیدا کرتے ہیں تاکہ بزعم خود پانی کو گدلا کرکے اس میں سے مچھلیاں پکڑسکیں اور ایسے لوگ جو کتاب آسمانی میں اختلاف پیدا کرتے ہیں حقیقت سے کافی دور ہیں۔

(۱۷۷)لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَ الۡمَغۡرِبِ وَ لٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ الۡمَلٰٓئِكَةِ وَ الۡكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الۡمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الۡقُرۡبٰى وَ الۡيَتٰمٰى وَ الۡمَسٰكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِ ۙ وَ السَّآئِلِيۡنَ وَ فِى الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَ الۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ اِذَا عٰهَدُوۡا ۚ	نیکی یہی نہیں کہ (نماز کے وقت) اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرلو (اور تمام گفتگو قبلہ اوراس کی تبدیلی کے بارے میں کرتے رہو اوراپنا سارا وقت اسی میں صرف کردو) بلکہ نیک (اور نیکوکار) وہ لوگ ہیں جو خدا، روز قیامت، ملائکہ، آسمانی کتاب اورانبیاء پر ایمان لے آئیں اور (اپنا) مال اس سے پوری محبت کے باوجود رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، ضرورتمند مسافروں، سوال کرنے والوں اور غلاموں پر خرچ کریں، نماز قائم کریں، زکوۃ ادا کریں، جب عہدو پیمان باندھیں تو اسے پورا کریں

وَ الصّٰبِرِیۡنَ فِی الۡبَاۡسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِیۡنَ الۡبَاۡسِ ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا ؕ وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ	اور بے کسی، محرومی، بیماری اور میدان جنگ غرض ہر عالم میں استقامت وصبر کا مظاہرہ کریں یہ وہ لوگ ہیں جو سچ بولتے ہیں (اور ان کی گفتار، کردار اور اعتقاد میں ہم آہنگی) اور یہی پرہیزگار ہیں۔

شان نزول

قبلہ کی تبدیلی سے عام لوگوں میں بالعموم اور یہود ونصاری میں بالخصوص شور وغوغا بپا ہوگیا تھا اور یہودیوں کے نزدیک یہ بڑی سند افتخار تھی کہ مسلمان ان کے قبلہ کی پیروی کرتے ہیں اور اب یہ ہاتھ سے جاتی رہی تھی لہٰذا انہوں نے زبان اعتراض دراز کی۔قرآن نے اس سورہ کی آیت ۱۴۲ "سیقول السفهاء" میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔مندرجہ بالا آیت اس کی تائید میں نازل ہوئی جس میں کہا گیا ہے کہ قبلہ کے مسئلے پر اتنی باتیں بنانا صحیح نہیں ہے بلکہ اس سے اہم تر مسائل ہیں جن کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے اس آیت میں ان مسائل کی تشریح بھی کی گئی ہے۔

تفسیر

تمام نیکیوں کی اساس

جیسا کہ قبلہ کی تبدیلی سے متعلق آیات کے ذیل میں گذر چکا ہے کہ مخالفین اسلام ایک طرف سے شور بلند کرتے تھے اور نووارد مسلمان دوسری طرف متحیر تھے مندرجہ بالا آیت کا روئے سخن ان دونوں کی طرف ہے فرمایا نیکی صرف یہ نہیں کہ نماز کے وقت منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرلو اور اپنا سارا وقت اسی مسئلے پر بحث کرتے گزار دو۔

اس کے بعد ایمان، اخلاق اور عمل کے لحاظ سے نیکیوں کے اہم ترین اصول چھ عنوانات کے ضمن میں بیان کئے گئے ہیں فرمایا لیکن نیکی اور نیک افراد وہ لوگ ہیں جو خدا، روز قیامت، ملائکہ، آسمانی کتب اور انبیاء پر ایمان لے آئے ہیں۔

ایمان کے بعد انفاق ایثار اور مالی بخششوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا چاہت ومحبت کے باوجود اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور غلاموں کو دے دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مال ودولت کی پرواہ نہ کرنا سب کے لئے آسان کام نہیں خصوصا جب مقام ایثار ہو کیونکہ اس کی محبت سب دلوں میں ہے۔اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اس دلی خواہش کے باوجود استقامت دکھاتے ہیں اور خدا کے لئے اس خواہش سے صرف نظر کر لیتے ہیں۔

نیکیوں کی تیسری بنیاد قیام نماز شمار کی گئی ہے۔

چوتھا پروگرام زکوٰۃ اور دیگر واجب مالی حقوق کی ادائیگی ہے۔ایسے بہت سے لوگ ہیں جو کئی مقامات پر ضرورت مندوں کی

مدد کے لئے تیار ہوجاتے ہیں لیکن واجب حقوق کی ادائیگی میں سہل انگاری سے کام لیتے ہیں۔ان کے برعکس کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو واجب حقوق کے علاوہ اور کسی قسم کی مدد کو تیار نہیں ہوتے اور وہ ایک پیسہ بھی کسی ضرورت مند کو دینے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے۔زیر بحث آیت میں ایک طرف مستحب امور پر خرچ کرنے والوں اور دوسری طرف واجب حقوق ادا کرنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے دونوں کو نیک لوگوں کی صفت سے نکال دیتی ہے اور حقیقی نیک اسے قرار دیتی ہے جو اپنی ذمہ داری دونوں میدانوں میں ادا کرے۔

پانچویں خصوصیت ایفائے عہد و پیمان شمار کی گئی ہے۔فرمایا: وہ لوگ جو وعدہ کرلیں تو اپنے عہد و پیمان کو نبھاتے ہیں۔کیونکہ باہمی اعتماد اجتماعی زندگی کا سرمایہ ہے وہ گناہ جو اطمینان اور اعتماد کے رشتے کو توڑ پھوڑ دیتے ہیں اور اجتماعی روابط کی بنیاد کو نیچے سے کمزور کردیتے ہیں ان میں وعدے کی عدم پاسداری ہے اسی لئے اسلامی روایات میں مسلمانوں کی ذمہ داری بتائی گئی ہے کہ وہ تین امور سب لوگوں کے بارے میں انجام دیں چاہے ان کے سامنے مسلمان ہو یا کافر اور نیک ہو یا بد، وہ تین چیزیں یہ ہیں۔

1۔ایفائے عہد

2۔ادائے امانت اور

3۔ماں باپ کا احترام

ان نیک لوگوں کی چھٹی بات یہ بتائی گئی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو محرومیت، فقر و فاقہ، بیماری اور رنج و مصیبت کے وقت اور اسی طرح جنگ میں دشمن کے مقابلے میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ان سخت حوادث کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکتے۔آیت کے آخر میں بات کو مجتمع کرتے ہوئے اور ان چھ بلند صفات پر تاکید کے طور پر فرماتا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جو سچ بات کرتے ہیں اور یہی پرہیزگار ہیں۔

ان کی راست گوئی تو یہاں سے واضح ہوتی ہے کہ ان کے اعمال اور ان کا کردار ہر طرح سے ان کے اعتقاد اور ان کے ایمان سے ہم آہنگ ہے۔ان کا تقویٰ و پرہیزگاری اس بات سے عیاں ہے کہ وہ ضرورت مندوں، محروموں، انسانی معاشرہ اور اپنی ذات کے بارے میں اپنی الٰہی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مندرہ بالا چھ برجستہ صفات اصول اعتقاد و اخلاق اور عملی پروگراموں پر مشتمل ہیں اصول اعتقاد کے سلسلے میں تمام بنیادی امور کا تذکرہ ہے اور عملی پروگراموں میں سے انفاق، نماز اور زکوۃ کا ذکر ہے جو مخلوق کے خالق سے اور مخلوق کے مخلوق سے رابطے کا نمونہ ہے اخلاقی امور میں سے ایفائے عہد اور استقامت و پائیداری کا تذکرہ ہے جو تمام تر اعلیٰ اخلاق کی بنیاد ہے۔

(۱۷۸)یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی ؕ فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ	اے ایمان والو! مقتولین کے بارے میں حکم قصاص تمہارے لئے لکھ دیا گیا ہے آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت، پس اگر کوئی اپنے (دینی) بھائی کی طرف سے معاف کر دیا جائے (اور حکم قصاص خونبہا سے بدل جائے) تو اسے چاہئے کہ پسندیدہ طریقے کی پیروی کرے (اور دیت کی وصولی میں دیت دینے والے کی حالت کو پیش نظر رکھے) اور قاتل بھی ولی مقتول کو اچھے طریقے سے دیت ادا کرے (اور اس کی ادائیگی میں حیل و حجت سے کام نہ لے) تمہارے پروردگار کی طرف سے یہ تخفیف اور رحمت ہے اور اس کے بعد بھی جو تجاوز کرے اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔
(۱۷۹)وَ لَكُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ یّٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ	اور قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے اے صاحبان عقل وخرد! تمہیں تقویٰ و پرہیزگاری کی راہ اختیار کرنا چاہئے۔

شان نزول

زمانہ جاہلیت کے عربوں کی عادت تھی کہ ان کے قبیلے کا ایک آدمی قتل ہو جاتا تو وہ پختہ ارادہ کر لیتے کہ حتی المقدور اس کا انتقام لیں گے اور یہ فکر یہاں تک آگے بڑھ چکی تھی کہ وہ تیار رہتے کہ ایک شخص کے بدلے قاتل کا سارا قبیلہ قتل کر ڈالیں۔ مندرجہ بالا آیت کے ذریعے قصاص کا عادلانہ حکم بیان کیا گیا۔

اس زمانے کے دو مختلف دستوروں میں اسلام کا یہ حکم حد وسط تھا اس دور میں بعض لوگ قصاص کو ضروری سمجھتے تھے اور اس کے علاوہ کسی چیز کو جائز اور درست نہ جانتے تھے جب کہ بعض لوگ صرف دیت اور خونبہا کو ضروری خیال کرتے تھے اسلام نے مقتول کے اولیاء کے راضی نہ ہونے کی صورت میں قصاص کا حکم دیا اور طرفین کی رضا اور قصاص کی معافی پر دیت کو ضروری قرار دیا۔

تفسیر

قصاص تمہاری حیات کا سبب ہے

ان آیات سے لے کر آگے کی کچھ آیات تک احکام اسلام کے ایک سلسلے کو واضح کیا گیا ہے گذشتہ آیات نیکی کے بارے

میں تھیں اوران میں کچھ اسلامی پروگراموں کی وضاحت بھی کی گئی تھی زیرنظرآیات اس سلسلہ بیان کی تکمیل کرتی ہیں۔

سب سے پہلے احترام خون کی حفاظت کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے جوربط معاشرے کے ضمن میں بہت اہمیت رکھتا ہے اسلام کا یہ حکم جاہلیت کے رسم ورواج پرخط بطلان کھینچتا ہے مومنین کومخاطب کرکے فرمایا گیا ہے اے ایمان والو! مقتولین کے بارے میں قصاص کا حکم تمہارے لئے لکھ دیا گیا ہے۔

لفظ قصاص اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اولیاء مقتول حق رکھتے ہیں کہ وہ قاتل سے وہی سلوک کریں جس کا وہ ارتکاب کر چکا ہے لیکن آیت یہیں پرختم نہیں ہوجاتی بلکہ آیت کا آخری حصہ مساوات کے مسئلہ کوزیادہ واضح کرتا ہے ارشاد ہوتا ہے آزاد کے بدلے آزادغلام کے بدلے غلام اورعورت کے بدلے عورت۔

بعد میں ہم واضح کریں گے کہ یہ مسئلہ مرد کے خون کی عورت کے خون پر برتری کی دلیل نہیں ہے بلکہ قاتل مرد سے بھی (خاص شرائط کے ساتھ) مقتول عورت کے بدلے قصاص لیا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد یہ واضح کرنے کے لئے کہ قصاص اولیاء مقتول کا ایک حق ہے مگر یہ کوئی الزامی حکم نہیں ہے بلکہ اگر اولیاء مائل ہوں تو قاتل کوبخش سکتے ہیں اورخون بہالے سکتے ہیں یا چاہیں تو خون بہا بھی نہ لیں مزید فرمایا کہ اگرکوئی اپنے دینی بھائی کی طرف سے معاف کردیا جائے (اورقصاص کا حکم طرفین کی رضا سے خون بہا میں بدل جائے) تو اسے چاہئے کہ پسندیدہ طریقے کی پیروی کرے (اوراس خون بہا کے لینے میں دوسرے پرسختی وتنگی روا نہ رکھے) اورادا کرنے والا بھی دیت کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرے۔

آیت کے آخر میں بطور تاکید اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس کسی کی طرف سے حد سے تجاوز کیا جائے گا وہ شدید سزا کا مستحق ہوگا فرمایا: تمہارے پروردگار کی طرف سے یہ تخفیف اوررحمت ہے اوراس کے بعد بھی جوشخص حد سے تجاوز کرے تو دردناک عذاب اس کے انتظار میں ہے۔

انسانی اورمنطقی نقطہ نظر سے قصاص اورعفو کا یہ ایک عادلانہ دستور ہے ایک طرف اس حکم سے زمانہ جاہلیت کی فاسد روش کو غلط قرار دیا گیا ہے اس دور میں لوگ قصاص کے لحاظ سے کسی قسم کی برابری کے قائل نہ تھے اور ہمارے زمانے کے جلادوں کی طرح ایک شخص کے بدلے سینکڑوں افراد کو خاک وخون میں لوٹا دیتے تھے دوسری طرف لوگوں کے لئے عفو وبخشش کا راستہ کھول دیا ہے اس حکم میں احترام خون میں کمی نہیں آنے دی گئی اورقاتلوں میں جسارت دبے باکی پیدا نہیں ہونے دی گئی اوراس آیت کا چوتھا پہلو یہ ہے کہ معاف کرنے اورخون بہا لینے کے بعد طرفین میں سے کوئی بھی تجاوز کا حق نہیں رکھتا جب کہ زمانہ جاہلیت میں اولیاء مقتول معاف کر دینے اورخون بہا لینے کے باوجود بعض اوقات قاتل کوقتل کردیتے تھے۔ مگروہ جنایت کارافراد جواپنی جنایات (جرائم) پرفخر کرتے ہیں اوران کی انجام دہی سے پشیمان نہیں ہیں ایسے لوگ نہ برادری کا استحاق رکھتے ہیں اورنہ عفو ودرگزر کا استحقاق رکھتے ہیں۔

(۱۷۹) زیرنظر آخری آیت مختصر اور پرمعنی عبارت سے مسئلہ قصاص سے متعلق بہت سے سوالوں کا جواب دیتی ہے ارشاد ہوتا ہے اے صاحبان عقل وخرد! قصاص تمہارے لئے حیات بخش ہے ہوسکتا ہے تم تقوی وپرہیزگاری اختیار کرلو۔

دس الفاظ پر مشتمل یہ آیت انتہائی فصیح وبلیغ ہے یہ ایک شعار اسلامی کی صورت میں ذہنوں پرنقش ہوجاتی ہے یہ بڑی عمدگی

سے نشاندہی کرتی ہے کہ اسلامی قصاص میں کسی قسم کا انتقامی پہلو نہیں بلکہ یہ حیات وزندگی کی طرف کھلنے والا ایک دریچہ ہے ایک طرف تو یہ معاشرے کی حیات ہے کیونکہ اگر قصاص کا حکم کسی طور پر بھی موجود نہ ہوتا اور سنگدل لوگ بے پرواہ ہوتے تو بے گناہ لوگوں کی جان خطرے میں رہتی جن ملکوں میں قصاص کا حکم ختم کر دیا گیا ہے وہاں قتل کی وارداتوں میں تیزی سے اضافہ ہو گیا ہے دوسری طرف یہ حکم قاتل کی زندگی کا سبب ہے کیونکہ قصاص کا تصور اسے قتل انسانی کے ارادے سے کافی حد تک باز رکھے گا اور اسے کنٹرول کرے گا۔

کیا مرد کا خون، عورت کے خون سے زیادہ قیمتی ہے

ممکن ہے کہ بعض لوگ اعتراض کریں کہ آیات قصاص میں حکم دیا گیا ہے کہ عورت کے قتل کے بدلے مرد سے قصاص نہیں لینا چاہئے تو کیا مرد کا خون گراں تر اور زیادہ قیمتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت کا مفہوم یہ نہیں کہ مرد سے عورت کے قتل کے بدلے قصاص نہ لیا جائے بلکہ جیسا کہ فقہ اسلامی میں تفصیل وتشریح سے موجود ہے عورت کے اولیاء (ورثا) عورت کے قتل کی صورت میں قصاص لے سکتے ہیں بشرطیکہ دیت کی آدھی مقدار ادا کر دیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ زیادہ تر مرد ہی خاندان کا اقتصادی عضو مؤثر ہوتا ہے اور مرد ہی خاندان کے اخراجات اٹھاتا ہے اور مرد ہی اپنی اقتصادی کارکردگی سے خاندان کی زندگی کا کارخانہ چلاتا ہے۔ اس بنا پر مرد اور عورت کے ختم ہونے میں اقتصادی پہلو کا جو فرق ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اگر اس فرق کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو مقتول مرد کے بے گناہ پسماندگان اور آل اولاد آخر کس جرم میں خسارہ اٹھائیں گے۔ اسلام نے مرد سے عورت کے قتل کا قصاص لینے کی صورت میں آدھی دیت دینے کا قانون معین کر کے سب لوگوں کے حقوق کا لحاظ رکھا ہے اور اس طرح ایک خاندان کو جو ناقابل تلافی نقصان ہو رہا تھا اس کا ازالہ کیا گیا ہے۔ اسلام اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ لفظ مساوات کے بہانے دوسرے کے حقوق پائمال ہوں جیسے اس شخص کی اولاد کے حقوق جس سے قصاص لیا جا رہا ہے۔

(۱۸۰) كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ ۚ اِلْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ؕ	جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آئے تو چاہئے کہ وہ ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے شائستہ طور پر وصیت کرے یہ حق ہے پرہیزگاروں پر۔
(۱۸۱) فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ؕ	پھر جس نے وصیت سن کر اسے بدل ڈالا اس کا گناہ (وصیت) بدلنے والے پر ہے خدا تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔

(۱۸۲)فَمَنۡ خَافَ مِنۡ مُّوۡصٍ جَنَفًا اَوۡ اِثۡمًا فَاَصۡلَحَ بَیۡنَهُمۡ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۠	جس شخص کو خوف ہو کہ وصیت کرنے والے نے انحراف (بعض ورثہ کی طرف یک طرفہ میلان) یا گناہ (غلط چیز کیلئے وصیت) سے کام لیا ہےاور وہ ورثہ کے درمیان صلح کرا دے تو اس پر کچھ گناہ نہیں خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر

شائستہ اور مناسب وصیتیں

گذشتہ آیات میں مجرمین کے بارے میں بعض مسائل بیان کرنے کے بعد ان آیات میں ایک لازمی حکم کے طور پر مالی معاملات میں وصیت کے کچھ احکام بیان کئے گئے ہیں فرمایا: تم پر لکھ دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت قریب آ جائے تو اپنے مال و منال کے سلسلے میں والدین اور رشتہ داروں کے بارے میں مناسب اور شائستہ وصیت کرے۔ آیت کے آخر میں مزید فرمایا یہ پرہیزگاروں کے ذمے ایک حق ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہاں مال کی جگہ لفظ خیر استعمال کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ اگر کوئی اچھی چیز اپنے ترکے میں چھوڑے تو وصیت کرے یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ اسلام کی نظر میں وہ دولت و ثروت جو شرعی طریقے سے حاصل کی جائے اور معاشرے کے فائدے کے لئے اچھی راہ پر صرف کی جائے خیر و برکت ہے یہ بات ان لوگوں کے غلط افکار پر خط بطلان کھینچتی ہے جو مال و دولت ہی کو بری چیز سمجھتے ہیں اسلام ان کجرو زاہدوں سے بیزار ہے جو روح اسلام کو نہیں سمجھ سکے اور وہ زہد کو فقر و فاقہ کا دوسرا نام سمجھے ہوئے ہیں اور ان کے افکار اسلامی معاشرے میں جمود اور ذخیرہ اندوزوں کے سر اٹھانے کا سبب بنتے ہیں۔

ضمنی طور پر یہ تعبیر اس ثروت و دولت کے مشروع اور جائز ہونے کی طرف لطیف اشارہ ہے جس کے بارے میں وصیت کا حکم دیا گیا ہے ورنہ انسان کا چھوڑا ہوا غیر مشروع ناجائز مال تو خیر نہیں بلکہ شر ہی شر ہے۔

(۱۸۱) جب وصیت تمام مذکورہ صفات کی جامع ہو تو وہ ہر لحاظ سے محترم اور مقدس ہوگی اور اس میں کسی طرح کا تغیر و تبدل حرام ہے اسی لئے بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے جو کوئی وصیت سننے کے بعد اس میں تبدیلی کرے اس کا گناہ تبدیلی کرنے والے کے سر ہے۔ اور اگر ان کا گمان ہے کہ خدا ان کی سازشوں اور مخفی کاروائیوں سے بے خبر ہے تو وہ سخت اشتباہ میں ہیں کیونکہ خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

ممکن ہے یہ آیت اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو کہ وصی (وہ شخص جو وصیت کرنے والے کی موت کے بعد وصیتوں پر عملدرآمد کے لئے ذمے دار ہے) کی خلاف ورزی کبھی وصیت کرنے والے کے اجر و ثواب کو ختم نہیں کر سکتی وہ اپنا اجر پا چکا ہے گناہ کا طوق فقط وصی کی گردن کے لئے ہے جس نے وصیت کی مقدار کیفیت یا اصلی وصیت میں تبدیلی کی ہے۔

(۱۸۲)اب یہ حکم اسلامی واضح ہوگیا کہ وصیتوں میں ہر طرح کا تغیر وتبدل جس صورت میں ہو اور جس قدر ہو گناہ ہے لیکن ہر قانون میں کچھ استثنائی پہلو ہوتے ہیں لہٰذا زیر نظر آخری آیت میں فرمایا گیا ہے جب وصی کو وصیت کرنے والے میں انحراف اور کجروی کا اندیشہ ہو یہ انحراف چاہے بےخبری سے ہو یا جان بوجھ کر آگاہی کے باوصف ہو اور وہ اس کی اصلاح کرے تو وہ گناہ گار نہ ہو گا اور وصیت کی تبدیلی کا قانون اس پر لاگو نہ ہوگا۔ خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

ا۔ وصیت کا فلسفہ

قانون میراث سے صرف کچھ معین رشتے دار بہرہ مند ہوتے ہیں جب کہ ممکن ہے خاندان کے اور افراد یا بعض اوقات قریبی دوست احباب مالی امداد کی سخت احتیاج رکھتے ہوں اسی طرح ورثہ میں سے بھی کبھی وراثت کا حصہ کسی کی ضروریات کی کفالت نہیں کر سکتا لہٰذا قانون اسلام کی جامعیت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ یہ خلا پر نہ ہو اسی لئے اس نے قانون میراث کے ساتھ ساتھ قانون وصیت بھی رکھا ہے اور مسلمانوں کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنے مال کے تیسرے حصے کے متعلق اپنے بعد کے لئے کوئی مستحکم پروگرام بنائیں اور اسے اپنے مقصد میں صرف کریں۔

علاوہ ازیں بعض اوقات انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کوئی اچھا کام انجام دے لیکن وہ اپنی زندگی میں اپنی مالی ضروریات کے پیش نظر ایسا نہیں کر پاتا تو عقل منطق واجب قرار دیتی ہے کہ وہ اپنے ان اموال سے جن کے حصول کے لئے اس نے زحمت اٹھائی ہے کار خیر کے انجام دینے سے بالکل محروم نہ ہو۔ ان سب امور کی وجہ سے اسلام میں قانون وصیت رکھا گیا ہے۔

روایات اسلامی میں وصیت کے بارے میں بہت تاکید کی گئی ہے ان میں سے ایک روایت میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''من مات بغير وصية مات ميتته جاهلية''

(جو شخص بغیر وصیت کے مر جائے وہ جاہلیت کی موت مرا)۔

۲۔ وصیت میں عدالت

مندرجہ بالا آیت میں وصیت میں تعدی وتجاوز نہ کرے کا حکم آپ نے ملاحظہ کیا اس سلسلے میں اسلامی روایات میں بھی ظلم و جور اور ضرر نہ پہنچانے کے بارے میں بہت تاکید کی گئی ہے ان روایات کے اجتماعی مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے وصیت کرنے کی بہت اہمیت ہے اسی طرح وصیت میں ظلم روا رکھنا بہت برا عمل ہے

اور گناہان کبیرہ میں سے ہے ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

''من عدل فی وصية كان كمن تصدق بها فی حياته ومن جار فی وصية لقی الله عزو جل يوم القيامة وهو عنه معرض''

(جوشخص اپنی وصیت میں عدل کرے وہ ایسے ہے جیسے اس نے اپنی زندگی میں یہ مال راہ خدا میں صدقہ کردیا ہواور جو اپنی وصیت میں ظلم وتعدی کرے قیامت کے دن پروردگار کی طرف سے نگاہ لطف وکرم اس سے اٹھالی جائے گی)۔

(۱۸۳)یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ	اے ایمان والو! روزہ تمہارے لئے لکھ دیا گیا ہے جیسے تم سے پہلے لوگوں کے لئے لکھا گیا تھا تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔
(۱۸۴)اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ وَ عَلَى الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْكِیْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَهُوَ خَیْرٌ لَّهٗ ؕ وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ	چند گنے چُنے دن (روزہ رکھو)اورتم میں سے جولوگ بیمار ہوں یا مسافر ہوں وہ ان کی بجائے دوسرے دنوں میں (روزوں کی) گنتی پوری کرلیں اور جولوگ یہ کام انجام دینے کی قدرت نہیں رکھتے (مثلاً دائمی مریض اور بوڑھے مردوعورتیں) ضروری ہے کہ وہ کفارہ ادا کریں اور مسکین کوکھانا کھلائیں اور جولوگ کارخیر بجالائیں تو وہ ان کے لئے بہتر ہے اور روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے اگرتم جانو۔
(۱۸۵)شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ؕ وَ مَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۫ وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ	(وہ چند گنے چُنے دن) ماہ رمضان کے ہیں اس میں قرآن نازل ہوا جس میں لوگوں کے لئے راہنمائی اور ہدایت کی نشانیاں ہیں اور جوحق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے پس جوشخص ماہ رمضان میں حضر میں ہووہ روزہ رکھے اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو وہ دوسرے دنوں میں بجالائے خدا تمہارے لئے راحت وآرام چاہتا ہے زحمت وتکلیف نہیں تم یہ دن پورے کرو اور خدا کی اس لئے بزرگی بیان کرو کہ اس نے تمہیں ہدایت کی ہے ہوسکتا ہے تم شکرگزار ہو جاؤ۔

تفسیر

روزہ تقویٰ کا سرچشمہ ہے

چند اہم اسلامی احکام کے بیان کے بعد زیرنظر آیات میں ایک اور حکم بیان کیا گیا ہے جو چند اہم ترین اسلامی عبادات میں

شمار ہوتا ہےاور وہ روزہ ہےاسی تاکید سے ارشادہ ہوتا ہےاے ایمان والو! روزہ تمہارے لئے اس طرح سےلکھ دیا گیا ہےجس طرح تم سے پہلے کی امتوں کے لئے لکھا گیا تھا۔

ساتھ ہی اس انسان ساز اور تربیت آفرین عبادت کا فلسفہ چھوٹے سے پرمعنی جملے میں یوں بیان کرتا ہے ہوسکتا ہے تم پرہیز گار بن جاؤ۔

(۱۸۴)روزے کی سنگینی اور مشکل میں کمی کے لئے بعد کی (زیرِنظر دوسری) آیت میں چند احکام اور بیان کئے گئے ہیں۔ ارشاد فرمایا چند گنے چُنے دن روزہ رکھو۔ایسا نہیں کہ تم پورا سال روزہ رکھنے پر مجبور ہو یا یہ سال کا کوئی بڑا حصہ ہے بلکہ یہ تو سال کے ایک مختصر سے حصے میں تمہیں مشغول رکھتا ہے۔

دوسری بات جو اس آیت میں ہے یہ ہے کہ تم میں سے جو افراد بیمار ہیں یا مسافر ہیں کہ جن کے لئے روزہ باعث مشقت و زحمت ہے انہیں اس حکم میں رعایت دی گئی ہے کہ وہ ان دنوں کے علاوہ دوسرے دنوں میں روزہ رکھیں (سفر ختم ہو جانے اور بیماری سے صحت یابی کے بعد)۔

تیسری بات یہ کہ جنہیں روزہ رکھنے میں انتہائی زحمت و تکلیف ہوتی ہے (مثلاً بوڑھے مرد، بوڑھی عورتیں اور دائمی مریض جن کے تندرست ہونے کی امید نہیں) ان کے لئے ضروری نہیں کہ وہ روزہ رکھیں بلکہ اس کی بجائے کفارہ ادا کرنے کے لئے مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

جو شخص اس سے زیادہ راہ خدا میں کھانا کھلانا چاہے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے۔

آیت کے آخر میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ روزے کا تمہیں ہی فائدہ پہنچے گا اور روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔

(۱۸۵)زیرِنظر آخری آیت روزے کے زمانے ،اس کے کچھ احکام اور فلسفے کو بیان کرتی ہے فرمایا وہ چند گنے چنے دن جن میں روزہ رکھنا ہے ماہ رمضان کے ہیں۔وہی مہینہ جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔وہی قرآن جو لوگوں کی ہدایت کا سبب ہے جو ہدایت کی نشانیاں اور واضح دلیلیں لئے ہوئے ہےاور جو حق و باطل کے امتیاز اور ان کے ایک دوسرے سے الگ ہونے کا معیار رکھتا ہے۔

اس کے بعد مسافروں اور بیماروں کے بارے میں روزے کے حکم کو دوبارہ تاکیداً بیان کیا گیا ہے: جو لوگ ماہ رمضان میں حاضر ہوں انہیں تو روزہ رکھنا ہوگا مگر جو مسافر یا بیمار ہوں وہ اس کے بدلے بعد کے دنوں میں روزہ رکھیں۔

آیت کے آخر میں دوبارہ روزے کی تشریع اور فلسفے کا بیان ہے فرمایا: خدا تمہارے لئے راحت و آرام اور آسانی چاہتا ہے وہ تمہارے لئے زحمت و تکلیف اور تنگی نہیں چاہتا۔

مزید ارشاد ہوتا ہے: غرض اور مقصد یہ ہے کہ تم ان روزوں کی تعداد کو مکمل کرو۔

آخری جملے میں ارشاد ہوتا ہے: تاکہ اس بناء پر کہ خدا نے تمہاری ہدایت کی ہے تم اس کی بزرگی بیان کرو اور شاید اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔

1۔روزے کے تربیتی واجتماعی اثرات

روح انسانی کولطیف تر بنانا ارادہ انسانی کوقوی کرنا اور مزاج انسانی میں اعتدال پیدا کرنا روزے کے اہم فوائد میں سے ہے۔

روزے دار کے لئے ضروری ہے کہ حالت روزہ میں آب وغذا کی دستیابی کے باوجود اس کے قریب نہ جائے اور اسی طرح جنسی لذات سے چشم پوشی کرے اور عملی طور پر ثابت کرے کہ وہ جانوروں کی طرح کسی چراگاہ اور گھاس پھوس کی قید میں نہیں ہے سرکش نفس کی لگام اس کے قبضے میں ہے اور ہواوہوس اور شہوات وخواہشات اس کے کنٹرول میں ہیں۔

حقیت میں روزے کا سب سے بڑا فلسفہ یہی روحانی اور معنوی اثر ہے۔

خلاصہ یہ کہ روزہ انسان کو عالم حیوانیت سے بلند کر کے فرشتوں کی صف میں لے جا کھڑا کرتا ہے"لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونِ" (ہو سکتا ہے تم پرہیز گار بن جاؤ) ان تمام مطالب کی طرف اشارہ ہے۔

مشہور حدیث ہے۔

الصوم جنة من النار

روزہ جہنم کی آگ سے بچانے کے لئے ڈھال ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک اور حدیث مروی ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

"بہشت کا ایک دروازہ ہے جس کا نام ہے ریان (یعنی سیراب کرنے والا) اس میں سے صرف روزہ دار ہی داخل جنت ہوں گے"۔

2۔روزے کے معاشرتی اثرات

روزہ انسانی معاشرے کے لئے ایک درس مساوات ہے۔امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ ہشام بن حکم نے روزے کی علت اور سبب کے بارے میں پوچھا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا۔

"روزہ اس لئے واجب ہوا ہے کہ فقیر اور غنی کے درمیان مساوات قائم ہو جائے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ غنی بھی بھوک کا مزہ چکھ لے اور فقیر کا حق ادا کرے کیونکہ مالدار عموماً جو کچھ چاہتے ہیں ان کے لئے فراہم ہوتا ہے خدا چاہتا ہے۔کہ اس کے بندوں کے درمیان مساوات ہو اور مال داروں کو بھی بھوک اور درد ورنج کا ذائقہ چکھائے تا کہ وہ کمزور اور بھوکے افراد پر رحم کریں"۔

3۔روزے کے طبی اثرات

طب کی جدید اور قدیم تحقیقات کی روشنی میں امساک (کھانے پینے سے پرہیز) بہت سی بیماریوں کے علاج کے لئے

معجزانہ اثر رکھتا ہے جو قابل انکار نہیں شاید ہی کوئی حکیم ہو جس نے اپنی مشروح تالیفات اور تصنیفات میں اس حقیقت کی طرف اشارہ نہ کیا ہو کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بہت سی بیماریاں زیادہ کھانے سے پیدا ہوتی ہیں چونکہ مواد اضافی بدن میں جذب نہیں ہوتا جس سے مزاحم اور مجتمع چربیاں پیدا ہوتی ہیں مایہ چربی اور خون میں اضافی شوگر کا باعث بنتی ہے عضلات کا یہ اضافی مواد درحقیقت بدن میں ایک متعفن بیماری کے جراثیم کی پرورش کے لئے گندگی کا ڈھیر بن جاتا ہے۔

ایسے میں ان بیماریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بہترین حل یہ ہے کہ گندگی کے ان ڈھیروں کو امساک اور روزے کے ذریعے ختم کیا جائے روزہ ان اضافی غلاظتوں اور بدن میں جذب نہ ہونے والے مواد کو جلا دیتا ہے درحقیقت روزہ بدن کو صفائی شدہ مکان بنا دیتا ہے۔

ایک مشہور حدیث پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

" صوموا تصحوا" (روزہ رکھو تا کہ صحت مند رہو)۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک اور حدیث مروی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

" المعدة بیت کل داء والحمیة راس کل دواء "(معدہ ہر بیماری کا گھر ہے اور امساک و فاقہ اعلی ترین دوا ہے)۔

۴۔روزہ گذشتہ امتوں میں

موجود تورات اور انجیل سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ روزہ یہود و نصاری میں بھی تھا جیسا کہ قاموس کتاب مقدس میں ہے۔

روزہ کلیتۃً تمام اوقات اور تمام زمانوں میں ہر گروہ، امّت اور مذہب میں اندوہ و غم اور اچانک مصیبت کے موقع پر معمول تھا۔

تورات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چالیس دن تک روزہ رکھا۔ یہودی جب تو بہ کرتے اور رضائے الٰہی طلب کرتے تو روزہ رکھتے تھے جیسا کہ انجیل سے بھی ظاہر ہوتا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی چالیس دن روزے رکھے۔

۵۔رمضان مبارک کی خصوصیت اور امتیاز

کیا سبب ہے کہ ماہ رمضان روزے رکھنے کے لئے منتخب کیا گیا ہے بلکہ اسی بناء پر اسے دوسرے مہینوں پر برتری حاصل ہے زیر نظر آیت میں اس کی برتری کی وجہ بیان کی گئی ہے وہ یہ کہ قرآن اسی مہینے میں نازل ہوا ہے۔

اسلامی روایات میں ہے کہ تمام عظیم آسمانی کتب تورات، انجیل، زبور، صحیفے اور قرآن اسی مہینے میں نازل ہوئیں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

''تورات چھ رمضان، انجیل بارہ رمضان، زبور اٹھارہ رمضان اور قرآن شب قدر میں نازل ہوا ہے۔''

اس طرح ماہ رمضان عظیم آسمانی کتب کے نزول اور تعلیم وتدریس کا مہینہ ہے کیونکہ صحیح تربیت تعلیم اور کچھ سیکھے بغیر ممکن نہیں ہے۔

روزے کا تربیتی پروگرام زیادہ سے زیادہ اور گہری آگاہی کے ساتھ آسمانی تعلیمات سے ہم آہنگی ہونا چاہئے تاکہ اس سے انسانی روح وبدن کی آلودگی گناہ ڈھل جائے۔

(۱۸۶)وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ	اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق سوال کریں تو (ان سے کہو کہ) میں قریب ہوں۔ پکارنے والے کی پکار پر میں اسے جواب دیتا ہوں پس وہ میری دعوت اور پکار کو قبول کریں اور مجھ پر ایمان لے آئیں تاکہ انہیں راستہ مل سکے۔

شان نزول

کسی نے نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا کہ کیا ہمارا خدا نزدیک ہے کہ ہم اس سے آہستہ سے مناجات کرسکیں یا دور ہے کہ بلند آواز سے پکاریں، اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور جواب دیا گیا کہ خدا اپنے بندوں کے نزدیک ہے۔

تفسیر

دعا اور تضرع وزاری

خدا کے ساتھ بندوں کے ارتباط کا ایک وسیلہ دعا اور تضرع وزاری ہے۔ لہٰذا اس آیت کا روئے سخن پیغمبر ﷺ کی طرف ہے۔ فرمایا: جس وقت میرے بندے تم سے میرے بارے میں سوال کریں تو کہہ دو کہ میں نزدیک ہوں۔

اس سے زیادہ قریب کہ جس کا تم تصور کرسکتے ہو، تم سے تمہاری نسبت بھی زیادہ نزدیک اور تمہاری رگ حیات سے بھی زیادہ قریب جیسے کہ دوسری جگہ اس طرح ہے۔

وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ

اور ہم انسان سے اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں (ق............۱۶)

اس کے بعد مزید فرمایا: جب دعا کرنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کا جواب دیتا ہوں۔ اس لئے میرے بندوں کو چاہئے کہ وہ میری عوت قبول کریں۔ اور مجھ پر ایمان لے آئیں (وَلْیُؤْمِنُوا بِیْ) ہوسکتا ہے وہ اپنی راہ پالیں اور مقصد تک جا پہنچیں۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ خدا نے اس مختصر سی آیت میں سات مرتبہ اپنی ذات پاک کی طرف اور سات ہی مرتبہ بندوں کی طرف اشارہ کیا ہے اس طرح اللہ نے بندوں سے اپنی انتہائی وابستگی، قربت، ارتباط اور ان سے اپنی محبت کی عکاسی کی ہے۔

دعااورزاری کا فلسفہ

دعاایک طرح کی عبادت،خضوع اور بندگی ہے۔انسان دعاکے ذریعے ذات الٰہی کے ساتھ ایک نئی وابستگی پیدا کر لیتا ہے اور جیسے تمام عبادات تربیتی اثر رکھتی ہیں دعا بھی ایسے اثر کی حامل ہوتی ہے۔چاہے قبولیت تک پہنچے یانہ پہنچے۔

جولوگ یہ کہتے ہیں کہ دعاامورالٰہی میں مداخلت ہےاور جو کچھ مصلحت کے مطابق ہوخدا دیتا ہے وہ اس طرف متوجہ نہیں کہ عطیات خداوندی استعداداور لیاقت کے مطابق تقسیم ہوتے ہیں،جتنی استعدادولیاقت زیادہ ہوگی انسان کوعطیات بھی اسی قدر نصیب ہوں گے۔امام صادقؑ فرماتے ہیں

"ان عند اللّٰہ عزو جل منزلۃ لا تنال الا بمسألۃ "

(خداکے ہاں ایسے مقامات ومنازل ہیں جو مانگے بغیر نہیں مل سکتے۔

ایک صاحب علم کا قول ہے:

"جب ہم دعا کرتے ہیں تو ہم اپنے آپ کوایک ایسی لا متناہی قوت سے متصل ومربوط کر لیتے ہیں جس نے ساری کائنات کی اشیاءکوایک دوسرے سے پیوستہ کر رکھاہے"۔

(۱۸۷)اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ	تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے۔وہ تمہارا لباس ہیں اورتم ان کا لباس ہو(دونوں ایک دوسرے کی زینت اور ایک دوسرے کی حفاظت کا باعث ہو)خداکے علم میں تھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کرتے تھے(اوراس ممنوع کام کوتم میں سے کچھ لوگ انجام دیتے تھے)پس خدا نے تمہاری توبہ قبول کر لی اور تمہیں بخش دیا۔اب ان سے ہمبستری کرواورتمہارے لئے جو کچھ مقرر کیا گیاہے اسے طلب کرواور کھاؤ پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے صبح کی سفید دھاری رات کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے اس کے بعد روزے کو رات تک مکمل کرو

وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ	اور جب تم مساجد میں اعتکاف کیلئے بیٹھو تو ان سے مباشرت نہ کرو یہ حدود الٰہی ہیں ان کے نزدیک نہ جانا خدا اس طرح اپنی آیات کو لوگوں کیلئے واضح کرتا ہے ہوسکتا ہے کہ وہ پرہیز گار ہو جائیں۔

شان نزول

روایات اسلامی سے پتہ چلتا ہے کہ جب شروع میں روزے کا حکم نازل ہوا تو مسلمان صرف یہ حق رکھتے تھے کہ رات کو سونے سے پہلے کھانا کھالیں چنانچہ اگر کوئی شخص کھانا کھائے بغیر سو جاتا اور پھر بیدار ہوتا اس کے لئے کھانا پینا حرام تھا۔

ان دونوں ماہ رمضان کی راتوں میں بھی ان کے لئے اپنی بیویوں سے ہم بستری کرنا مطلقاً حرام تھا اصحاب پیغمبر ﷺ میں سے ایک شخص جس کا نام مطعم بن جبیر تھا ایک کمزور انسان تھا ایک مرتبہ افطار کے وقت گھر گیا۔ اس کی بیوی اس کے افطار کے لئے کھانا لینے لگی تو تھکان کی وجہ سے وہ سو گیا۔ جب بیدار ہوا تو کہنے لگا اب افطار کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ وہ اسی حالت میں رات کو سو گیا۔ صبح کو روزے کی حالت میں اطراف مدینہ میں خندق کھودنے کے لئے (جنگ احزاب کے میدان میں) حاضر ہو گیا۔ کام کے دوران میں کمزوری اور بھوک کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا۔ پیغمبر اکرم ﷺ اس کے سرہانے تشریف لائے اور اس کی حالت دیکھ کر متاثر ہوئے۔

نیز بعض جوان مسلمان جو اپنے آپ پر ضبط نہیں کر سکتے تھے ماہ رمضان کی راتوں کو اپنی بیویوں سے ہم بستری کر لیتے تھے۔

ان حالات میں یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو اجازت دے دی گئی کہ رات بھر کھانا بھی کھا سکتے ہیں اور اپنی بیویوں سے ہم بستری بھی کر سکتے ہیں۔

تفسیر

حکم روزہ میں وسعت

جیسا کہ آپ شان نزول میں پڑھ چکے ہیں ابتدائے اسلام میں ماہ رمضان کے دن اور رات دونوں میں مسلمانوں کے لئے اپنی بیویوں سے اختلاط کرنا مطلقاً ممنوع تھا اور اسی طرح رات کو ایک مرتبہ سو جانے کے بعد کھانا پینا بھی ناجائز تھا اور شاید یہ اس لئے تھا کہ مسلمانوں کو آزمایا جائے اور انہیں احکام روزہ قبول کرنے کے لئے مائل کیا جائے۔

زیر نظر آیت روزے اور اعتکاف کے سلسلے میں چار اسلامی احکام پر مشتمل ہے پہلے مسلمانوں کے لئے وسعت پیدا کرتے

ہوئے فرمایا گیا ہے: ماہ رمضان کی راتوں میں تمہارے لئے اپنی بیویوں سے جنسی میل جول حلال کر دیا گیا ہے۔

اس کے بعد اس موضوع کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔

لباس ایک طرف تو انسانی بدن کی سردی گرمی اور خطرناک چیزوں کے اثرات سے حفاظت کرتا ہے۔ دوسری طرف انسان کے عیوب چھپاتا ہے اور پھر یہ انسانی بدن کی زینت ہے مندرجہ بالا آیت میں استعمال ہونے والی تشبیہ ان سب نکات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اس کے بعد اس قانون الٰہی کی تبدیلی کی علت اور سبب کو بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: خدا جانتا تھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کرتے ہو اور تم میں سے بعض ممنوع کام انجام دیتے تھے۔ خدا نے تمہاری توبہ قبول کی اور تمہیں بخش دیا۔ ہاں اس بناء پر کہ تم کہیں زیادہ گناہ سے آلودہ نہ ہو جاؤ خدا نے اپنے لطف و رحمت سے تمہارے لئے اس پروگرام کو آسان بنا دیا ہے۔ اس کی مدت و حدود میں کمی کر دی ہے۔ اب جب کہ ایسا ہے تو تم ان سے مباشرت کر سکتے ہو اور جو کچھ خدا نے تمہارے لئے مقرر کیا ہے وہ طلب کر سکتے ہو۔

اس کے بعد دوسرا حکم بیان کیا گیا ہے فرماتا ہے: کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری رات کی سیاہ دھاری سے تمہارے لئے نمایاں ہو جائے۔

تیسرے حکم کے لئے ارشا ہوتا ہے: اس کے بعد روزے کو رات تک مکمل کرو۔ ''ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ'' یہ جملہ روزہ داروں کے لئے دن بھر کھانے پینے اور جنسی اختلاط سے باز رہنے کی تاکید کے طور پر ہے نیز یہ جملہ روزے کے آغاز اور انجام کی خبر بھی دیتا ہے اور وہ یہ کہ روزہ طلوع فجر سے شروع ہوتا ہے اور رات کے آنے پر ختم ہوتا ہے۔

آخر میں چوتھا اور آخری حکم بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: مساجد میں اعتکاف کے دوران میں اپنی بیویوں کے ساتھ مباشرت نہ کرو۔ اس حکم کا بیان گذشتہ حکم میں استثناء سے مشابہ ہے کیونکہ اعتکاف میں جس کی مدت کم از کم تین دن ہے روز رکھا جاتا ہے اس عرصے میں عورتوں سے نہ دن کو مباشرت کی اجازت ہے نہ رات کو۔

آخر میں تمام احکام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ یہ خدائی حدود ہیں ان کے نزدیک نہ جانا۔ کیونکہ سرحد کے قریب جانا وسوسے پیدا کرتا ہے اور بعض اوقات سبب بنتا ہے کہ انسان حدود سے تجاوز کر کے مبتلائے گناہ ہو جائے۔

ہاں۔ خدا تو اسی طرح لوگوں کے لئے اپنی آیات کو واضح کرتا ہے کہ شاید وہ پرہیزگار ہو جائیں۔

ابتدا و انتہا تقویٰ ہی تقویٰ ہے

یہ بات قابل توجہ ہے کہ احکام روزے سے مربوط پہلی آیت میں بھی ہم نے اس کا آخری مقصد تقوی پڑھا ہے اور بعینہ یہی بات آخری آیت کے آخر میں بھی آئی ہے۔

یہ بات نشاندہی کرتی ہے کہ سارا پروگرام روح تقویٰ کی پرورش، اپنے آپ کو گناہ سے بچانے اور ملکہ پرہیزگاری پیدا کرنے کے لئے ہے اس پروگرام کا مقصد یہ ہے کہ نوع انسانی میں شرعی ذمہ داریوں کی ادائیگی کا احساس اجاگر کیا جائے۔

(۱۸۸)وَ لَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَکُمۡ بَیۡنَکُمۡ بِالۡبَاطِلِ وَ تُدۡلُوۡا بِہَاۤ اِلَی الۡحُکَّامِ لِتَاۡکُلُوۡا فَرِیۡقًا مِّنۡ اَمۡوَالِ النَّاسِ بِالۡاِثۡمِ وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۠	ایک دوسرے کے اموال آپس میں باطل (وناحق) طریقے سے نہ کھاؤ اور گناہ کے ذریعے لوگوں کے مال کا ایک حصہ کھانے کے لئے اس میں سے (کچھ مال) قاضیوں کو نہ دو جب کہ تم جانتے ہو۔

تفسیر

ارشاد رب العزت ہوتا ہے: ایک دوسرے کے مال ودولت میں ناحق تصرف نہ کرو اور غیر صحیح طریقے سے مال پر قبضہ نہ کرو۔

رشوت خوری ایک مصیبت

ایک عظیم مصیبت جو زمانۂ قدیم سے نوع انسانی کو دامن گیر ہے اور جو آج کل تو بڑی شدت سے رائج اور جاری وساری ہے وہ رشوت ہے عدالت اجتماعی کی راہ میں یہ ایک بہت بڑی رکاوٹ رہی ہے اور آج بھی ہے۔ اسی کے سبب وہ قوانین جو کمزوروں کے تحفے کے ضامن تھے۔ طاقتوروں کے ان مظالم کے حق میں استعمال ہوتے ہیں، قانون جنہیں محدود کرنا چاہتا تھا کیونکہ طاقتور اور قوی لوگ تو ہمیشہ اپنی قوت کے بل بوتے پر اپنے منافع کی حفاظت کر سکتے ہیں یہ تو ضعیف اور کمزور لوگ ہی ہیں جن کے منافع اور حقوق کی حفاظت قانون کو کرنا ہے واضح ہے کہ اگر رشوت کا دروازہ کھلا رہے تو قوانین کا نتیجہ بالکل برعکس نکلے گا کیونکہ قوی لوگ تو رشوت دینے کی قدرت رکھتے ہیں اس کے نتیجے میں ان کے ہاتھوں قوانین کمزور لوگوں کے حقوق پر ظلم وستم اور تجاوز جاری رکھنے کے لئے ایک کھیل بن کر رہ جائیں گے۔

اسی لئے اسلام نے رشوت خوری کو پوری شدت کے ساتھ قباحت قرار دیا ہے اس کی مذمت کی ہے اور اسے گناہان کبیرہ میں سے قرار دیا ہے۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ رشوت جیسی برائی اور قباحت دوسرے پرفریب ناموں سے انجام پاتی ہے رشوت خوار اور رشوت دینے والا اس کے لئے ہدیہ حق وحساب، حق زحمت اور انعام جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن واضح ہے کہ ناموں کی یہ تبدیلی کسی طرح بھی اس کی ماہیت اور حقیقت کو نہیں بدل سکتی ہر صورت میں جو بھی پیسہ اس طریقے سے وصول ہوگا حرام اور ناجائز ہے۔

نہج البلاغہ میں اشعث بن قیس کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ ایک مرتبہ وہ حضرت علی علیہ السلام کے محکمہ عدل میں اپنے مدمقابل پر کامیابی کے لئے رشوت لے کر آیا ہوا یوں کہ رات کے وقت ایک لذیذ حلوے سے بھرا ہوا برتن لے کر حضرت علی علیہ السلام کے دروازے پر آیا وہ اسے ہدیہ قرار دے رہا تھا حضرت علی علیہ السلام نے غصے سے فرمایا:

> "سوگوار تجھ پر روئیں۔ کیا تو اس لیے آیا ہے کہ مجھے فریب دے اور مجھے دین حق سے باز رکھے۔ خدا کی قسم! اگر سات اقلیم ان سب چیزوں کے سمیت جو ان کے آسمانوں کے نیچے ہیں مجھے دے دی جائیں صرف اس کے بدلے کہ میں چیونٹی کے منہ سے جَو کا ایک چھلکا ظلم سے چھین لوں۔ تو میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا تمہاری یہ دنیا میرے نزدیک ٹڈی

کے منہ میں چبائے ہوئے پتے سے بھی زیادہ بے وقعت ہے۔علی علیہ السلام کو فنا ہونے والی نعمتوں اور جلد گزر جانے والی لذتوں سے کیا کام"

اسلام رشوت کی ہر شکل وصورت کو مذموم سمجھتا ہے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ حیات کا ایک واقعہ ہے کہ آپ کو ایک مرتبہ خبر ملی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے معین ایک حاکم نے ہدیہ کے نام پر رشوت قبول کر لی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غضبناک ہوئے اور اس سے فرمایا:

"تو وہ چیز کیوں لیتا ہے جو تیرا حق نہیں ہے"

اس نے جواب میں معذرت کرتے ہوئے کہا: "اے رسول خدا! میں نے جو کچھ لیا وہ تو ہدیہ تھا"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اگر تم گھروں میں بیٹھے رہو اور میری طرف سے کسی جگہ پر عامل وحاکم نہ بنو۔تو کیا پھر بھی لوگ تمہیں ہدیہ دیتے ہیں؟"

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا اور اس سے وہ ہدیہ لے کر بیت المال میں داخل کر دیا گیا اور اسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معزول کر دیا۔

(۱۸۹)يَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ ؕ وَ لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَ اْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ	لوگ آپ سے مہینے میں چاند کی مختلف صورتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں کہیے کہ یہ تقسیم اوقات (اور طبعی تقویم) کا مظہر ہیں نیز یہ لوگوں (کے نظام زندگی) کے لئے اور حج کے وقت (کے تعین) کے لئے ہیں یہ نیک کام نہیں کہ عقب مکان سے اندر آؤ بلکہ نیکی یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرو اور گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو اور خدا کی نافرمانی سے پرہیز کرو تا کہ کامیاب ہو جاؤ۔

شان نزول

منقول ہے کہ یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ یہ چاند کس لیے ہے اور اس کا کیا فائدہ ہے۔

ان سوالات کے جواب میں محل نظر آیت نازل ہوئی جس میں بتایا گیا کہ چاند کی مختلف صورتیں انسانی نظام زندگی کے لئے بہت سے فوائد کی حامل ہیں۔

تفسیر

جیسا کہ اس آیت کی شان نزول میں آیا ہے کہ کچھ لوگ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چاند کے متعلق سوالات کرتے تھے۔

حقیقت میں چاند ایک طبیعی تقویم ہے جو تمام افراد بشر کے لئے عام ہے اس سے تمام لوگ چاہے وہ پڑھے لکھے ہوں یا ان

پڑھ اور دنیا کے کسی بھی حصے میں آباد ہوں اس سے استفادہ کر سکتے ہیں قوانین اسلام کی ایک خصوصیت اور امتیاز یہ ہے کہ انہیں عموماً طبعی اور فطری میزان کے مطابق قرار دیا گیا ہے کیونکہ طبعی مقیاس ایک ایسا ذریعہ ہے جو سب لوگوں کے ہاتھ میں دیا گیا ہے اور رفتار زمانہ اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

''وَ لَیۡسَ الۡبِرُّ بِاَنۡ تَاۡتُوا الۡبُیُوۡتَ مِنۡ ظُهُوۡرِهَا'' یعنی گھر کی پشت سے گھر میں داخل ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہے یہاں حج کے متعلق گفتگو جاری ہے اور بتایا گیا ہے کہ حج کے اوقات کو چاند کے ذریعے معین کی جا سکتا ہے اب خداوند عالم نے حج کے موقع پر زمانہ جاہلیت کی ایک رسم کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اس سے منع فرمایا ہے وہ لوگ جب احرام بندھ لیتے تو عام راستے اور گھر کی ڈیوڑھی سے گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ احرام باندھے ہوئے شخص کو گھر کے دروازے سے داخل نہیں ہونا چاہئے اس بنا پر وہ گھر کی پچھلی طرف نقب لگاتے اور احرام کی حالت میں صرف وہیں سے داخل ہوتے وہ اس عمل کو کار نیک سمجھ کر انجام دیتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک یہ عمل ایک طرح سے ایک عادت ترک کرنے کا اظہار تھا احرام چونکہ عادات ترک کرنے کا نام ہے لہٰذا وہ خیال کرتے تھے کہ اس کی تکمیل اس عادت کے ترک کرنے سے ہونا چاہئے۔

لیکن قرآن صراحت سے کہتا ہے کہ نیکی تقویٰ میں ہے نہ کہ ایسی بے ہودہ عادات و رسوم میں اور پھر بلا فاصلہ حکم دیتا ہے کہ گھروں میں عمومی راستے ہی سے داخل ہوا کرو۔

البتہ آیت کا ایک وسیع تر اور زیادہ عام معنی بھی ہے اور جب یہ کہ جب کسی بھی کام کے لئے ابتداء کی جائے چاہے وہ مذہبی اعمال میں سے ہو یا ان کے علاوہ چاہئے کہ اس کے صحیح راستے سے اس میں داخل ہوا جائے نہ کہ انحرافی الٹے اور غیر عادی طریقوں سے۔

لیس البر بان...... یہ جملہ ہوسکتا ہے ایک اور لطیف نکتے کی طرف بھی اشارہ ہو وہ یہ کہ معارف دینی کے متعلق سوال کرنے کی بجائے مہینے کے چاند کے بارے میں تمہارا سوال کرنا ایسے ہے گویا کوئی شخص گھر کی اصلی دروازے کو چھوڑ کر اس کی پشت پر نقب زنی کر کے اس میں داخل ہو جو کتنا برا کام ہے۔

(۱۹۰) وَ قَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَكُمۡ وَ لَا تَعۡتَدُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡنَ	اور راہ خدا میں تم ان لوگوں سے قتال کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو کیونکہ خدا تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

شان نزول

ابن عباس سے منقول ہے کہ یہ آیت صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی واقعہ یوں ہے کہ رسول خدا اپنے ۱۴۰۰ اصحاب کے ساتھ عمرہ کے لیے تیار ہوئے جب سرزمین حدیبیہ پر (جو مکہ کے قریب ایک جگہ ہے) پہنچے تو مشرکین نے انہیں مکہ میں داخل ہونے اور مناسک عمرہ بجالانے سے روکا۔ طویل گفتگو کے بعد انہوں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے صلح کر لی ور طے یہ پایا کہ حضرت رسول اکرم ﷺ اگلے برس عمرہ ادا کرنے آئیں اور وہ ان کیلئے تین دن تک مکہ خالی کر دیں گے

تاکہ آپ ﷺ خانہ کعبہ کا طواف کرسکیں۔

اگلے سال جب آپ ﷺ مکہ کی طرف جانے کیلئے آمادہ ہوئے تو ڈرتھا کہ شاید مشرکین وعدہ وفا نہ کریں اور رکاوٹ پیدا کریں یوں جنگ شروع ہوجانے کا امکان تھا اور آپ ماہ حرام میں جنگ کرنے پر خوش نہ تھے۔اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی اور حکم دیا گیا کہ اگر دشمن جنگ شروع کردے تو تم بھی اس کے مقابلے میں کھڑے ہوجاؤ۔

تفسیر

اس آیت میں قرآن نے ان لوگوں سے قتال کا حکم صادر فرمایا ہے جو آغاز جنگ کریں اور مسلمانوں کے سامنے تلوار نکال لیں قرآن نے اجازت دی ہے کہ دشمن کو خاموش کرنے کے لئے ہتھیار پر ہاتھ رکھا جائے اور ہر قسم کے دفاعی ذرائع سے استفادہ کیا جائے۔

جنگ کیوں اور کس سے؟

اس آیت میں تین بنیادی نکات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو جنگ کے موقع کی اسلامی منطق کو مکمل طور پر واضح کرتے ہیں۔

(1)۔ جملہ ''وَقَاتِلُوْا فِی سَبِیْلِ اللهِ'' (خدا کی راہ میں جنگ کرو) اسلامی جنگوں کے اصلی مقصد اور ہدف کو واضح کرتا ہے انتقام، جاہ طلبی، حصول اقتدار، کشور کشائی، مال غنیمت اور دوسروں کی زمینوں پر قبضہ ان سب مقاصد کے لئے جنگ کرنا اسلام کی نگاہ میں مذموم ہے صرف راہ خدا میں اور قوانین الٰہی کے پھیلنے کے لئے جہاد کرنا صحیح ہے یعنی حق، عدالت اور توحید کے لئے اور ظلم فساد انحراف اور کجروی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے جہاد درست ہے

(2)۔ جملہ ''الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ'' (ان سے لڑو جو تم سے جنگ کریں) صراحت کرتا ہے کہ کن لوگوں سے جنگ کی جائے جب تک مدمقابل ہتھیار نہ اٹھائے اور جنگ کے لئے کھڑا نہ ہوجائے مسلمانوں کو پیش قدمی نہیں کرنا چاہئے (سوائے چند استثنائی مواقع پر جن کے بارے میں دیگر آیات جہاد میں اشارہ کیا جائے۔

اس آیت سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فوجیوں کے علاوہ دیگر اشخاص (خصوصا عورتوں اور بچوں) پر حملہ نہ کیا جائے کیونکہ وہ جنگ کے لئے نہیں اٹھے لہٰذا انہیں محفوظ و مامون رہنا چاہئے۔

(3)۔ جملہ ''ولا تعتدوا'' (حد سے تجاوز نہ کرو) سے اس بات کا تعین ہوتا ہے کہ کب تک جنگ کی جائے اسلام میں جنگ خدا کے لئے اور اس کی راہ میں ہوتی ہے اور راہ خدا میں کسی قسم کی تعدی اور تجاوز نہیں ہونا چاہئے اسی لیے دور حاضر کی جنگوں کے برعکس اسلام جنگی امور کے بارے میں اخلاقی اصولوں کی پاسداری کی بہت تلقین کرتا ہے مثلاً جو لوگ ہتھیار زمین پر رکھ دیں یا جو جنگ کرنے کی قوت کھو بیٹھیں یا جو اصولی طور پر جنگ کرنے کی قدرت نہیں رکھتے جیسے بوڑھے، عورتیں اور بچے ان پر حملہ آور نہیں ہونا چاہئے باغوں اور درختوں کو تباہ و برباد نہیں کرنا چاہئے اور دشمن کے پینے کے پانیوں کو زہر آلود کرنے کے لئے زہریلا مواد استعمال نہیں کرنا چاہئے (یعنی کیمیاوی ہتھیاروں اور جراثیمی ہتھکنڈوں کے استعمال کی اجازت نہیں ہے)۔

(۱۹۱)وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَ لَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ	اور انہیں (بت پرستوں کو جو کسی جرم وتجاوز سے منہ نہیں موڑتے) جہاں پاؤ قتل کردواور جہاں (مکہ) سے انہوں نے تمہیں نکال دیا ہے انہیں نکال باہر کرواور فتنہ (وبت پرستی) قتل سے بھی بدتر ہے اور ان سے مسجد حرام کے پاس جنگ نہ کرو جب تک وہ وہاں پر تمہارے ساتھ جنگ نہ کریں پس اگر وہ تم سے جنگ کریں تو انہیں قتل کرو یہی ہے کافروں کی جزا۔
(۱۹۲)فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ	اور اگر وہ رک جائیں تو خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر

آیت ۱۹۰ تا ۱۹۵ میں خدا تعالیٰ نے ان کفار مکہ کے بارے میں مسلمانوں کی ذمہ داری کو واضح کیا ہے جنہوں نے مسلمانوں کو گھر سے بے گھر ہی نہیں کیا، بلکہ انہیں ہر قسم کی اذیت وآزار پہنچائی اور انہیں اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے ہزاروں جتن کئے۔

زیر نظر پہلی آیت میں اس حکم کے دائرے کو وسعت دیتے ہوئے مسلمانوں کو اجازت دی گئی ہے کہ ان دشمنوں کو جہاں بھی آمادہ پیکار دیکھو قتل کر ڈالو اور جیسے انہوں نے اپنی پوری قوت سے مسلمانوں کو مکہ سے باہر نکالنے اور آوارہ منزل کرنے کے لئے اقدام کئے ہیں ان سے وہی سلوک کرنا اور انہیں مکہ سے باہر نکال دو۔

''وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ''

اور فتنہ قتل سے بدتر ہے

لغت کے لحاظ سے ''فتنہ'' کا وسیع معنی ہے۔ اس کے مفہوم میں ہر قسم کا مکروفریب، فساد، شرک، گناہ اور رسوائی شامل ہے۔ اس آیت میں اس سے مراد وہی شرک اور بت پرستی ہے جو بہت سے اجتماعی مفاسد، اختلاف، پراگندگی، گناہ وفساد اور خونریزی کا سرچشمہ ہے۔

اس بنا پر ''وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ'' والے جملے کا معنی یہ ہوگا کہ بت پرستی کا مذہب اور اس سے پیدا ہونے والے مکہ میں مروج بہت سے انفرادی واجتماعی فسادات قتل کرنے اور مار دینے سے بھی سخت تر ہے کیونکہ ان امور نے خدا کے امن والے حرم کو آلودہ کر رکھا ہے اس لیے خونریزی کے خوف سے شرک وبت پرستی سے جنگ کرنے سے دستبردار نہیں ہونا چاہئے اور جیسے بھی ہوسکے پہلے صلح جوئی سے اور پھر شدت عمل اور سختی سے بت پرستی اور اس سے پیدا ہونے والے فتنہ وفساد کی ریشہ کنی ہونا چاہئے۔

اس کے بعد مزید فرمایا کہ مسلمانوں کو مسجد الحرام کا احترام کرنا چاہئے اس جگہ کا احترام جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی درخواست کے مطابق جائے امن قرار دیا ہے جب تک وہاں خود دشمن ہتھیار نہ اٹھائے اس وقت تک ان سے جنگ کرنے اور قتل کرنے

کی اجازت نہیں لیکن اگر وہ مسجد الحرام کا احترام نہ کریں تو پھر مسلمانوں کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے دفاع کے لئے مسجد الحرام کے اندر بھی جنگ کر سکیں البتہ پیش دستی نہیں کر سکتے اور نہ وہ یہ حق رکھتے ہیں کہ خدا نے جسے جائے امن قرار دیا ہے اس کا احترام پامال کریں۔

آیت کے آخر میں تصریح کی گئی ہے کہ یہ کفار کی سزا ہے کہ اگر وہ کسی مقدس جگہ پر تجاوز روا رکھیں تو انہیں سخت اور منہ توڑ جواب دیا جائے تا کہ وہ حرم کے تقدس اور احترام سے غلط فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

"فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ"

(اگر وہ رک جائیں تو خدا پردہ پوشی کرنے والا مہربان ہے)۔

اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ کفر سے دستبردار ہونے اور بت پرستی اور شرک کے مذہب کو پس پشت ڈال دینے سے خدا ان کی توبہ قبول کرے گا اور وہ مسلمانوں کے بھائی ہو جائیں گے یہاں تک کہ وہ ان سزاؤں اور تاوان سے بھی صرف نظر کر لے گا جو مجرموں کے لئے ہوتا ہے۔

(۱۹۳) وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ	اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ (اور بت پرستی اور لوگوں سے سلب آزادی کی حالت) باقی نہ رہے اور دین خدا کے لئے مخصوص ہو جائے پس اگر (وہ اپنی غلط روش سے) دستبردار ہو جائیں تو (ان سے مزاحمت نہ کرو کیونکہ) تعدی اور تجاوز ظالموں کے علاوہ کسی کا شیوہ نہیں ہے۔

تفسیر

اس آیت میں اسلامی جہاد کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔ اس بناء پر جیسا کہ مشاہدہ بتاتا ہے کہ اسلامی جنگ اس لیے ہوتی ہے کہ انسانی معاشرے میں فتنہ باقی نہ رہے اور توحید پرستی کا دین تمام انسانی معاشروں میں رواج پا جائے۔

آیت کا ذیل میں مزید ارشاد ہوتا ہے کہ لوٹ آنے اور کفر، فساد اور بت پرستی سے دست بردار ہو جانے کی صورت میں مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ان سے متعرض نہ ہوں اور گذشتہ واقعات کا انتقام لینے کے درپے نہ ہوں اور ماضی کو بھول جائیں کیونکہ تعرض اور تجاوز فقط ستمگر اور ظالم لوگ ہی کیا کرتے ہیں۔

۱۔ ابتدائی جہاد آزادی

خداوند عالم کے احکام اور پروگرام نوع انسان کی سعادت، آزادی، تکامل، خوش بختی اور آسائش و آرام کے لئے ہیں اور اس نے اپنے انبیاء و مرسلین کا یہ فریضہ قرار دیا ہے کہ وہ ان احکام کو لوگوں تک پہنچائیں اب اگر کوئی شخص یا گروہ ان احکام کی تبلیغ کو اپنے پست منافع سے مزاحم سمجھتے ہوئے اس کی راہ میں روڑے اٹکائے تو انہیں حق پہنچتا ہے کہ وہ پہلے صلح و آشتی سے اور اگر اس سے ممکن نہ ہو تو قوت و طاقت سے اپنی دعوت کی راہ سے یہ رکاوٹیں ہٹا دیں اور اپنے لیے تبلیغ کی آزادی حاصل کریں۔

۲۔دفاعی جہاد

بعض اوقات کسی فرد یا گروہ پر جنگ ٹھونسی جاتی ہے اوراس پر تجاوز کیا جاتا ہے یا دشمن کی اس غفلت سے فائدہ اٹھا کر اچانک حملہ کر دیتا ہے ایسی صورت میں حملے کا نشانہ بننے والے فرد یا گروہ کو تمام آسمانی اورانسانی قوانین دفاع کا حق دیتے ہیں اسے حق پہنچتا ہے کہ ایسے میں جو کچھ اس سے اپنے وجود کی بقاء کے لئے بن پڑے، کرے اوراپنی حفاظت کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے، جہاد کی قسم کو دفاعی جہاد کہتے ہیں ۔احد،احزاب،موتہ،تبوک حنین اوربعض دیگر اسلامی جنگیں جہاد کے اسی حصے کا جزو ہیں اور یہ سب جنگیں دفاعی پہلو کی حامل ہیں ۔

۳۔شرک وبت پرستی کے خلاف جہاد

اسلام لوگوں کو یہ آخری اور بلندترین دین انتخاب کرنے کی دعوت دیتا ہے اس کے باوجود وہ عقیدے کی آزادی کو بھی محترم شمار کرتا ہے اسی لیے آسمانی کتب کی حامل قوموں کو اسلام نے کافی مہلت اور رعایت دی ہے کہ وہ مطالعہ اورغوروفکر سے دین اسلام کو قبول کریں اوراگر وہ اسے قبول نہ کریں تب بھی ان سے اسلام ایک ہم پیمان اقلیت والا معاملہ کرتا ہے اورمخصوص شرائط کے ساتھ جو پیچیدہ ہیں نہ مشکل ان سے صلح آشتی سے باہمی زندگی گذارتا ہے

لیکن شرک اور بت پرستی کوئی دین اورآئین نہیں اور نہ ہی وہ قابل احترام ہے بلکہ وہ تو ایک قسم کی بے ہودگی، کجروی اور حماقت ہی دراصل وہ ایک فکری اوراخلاقی بیماری ہے جس کی ہر قیمت پر ریشہ کنی ضروری ہے دوسرے کی فکر ونظر کی آزادی اوراحترام کے الفاظ ان کے لئے استعمال ہوتے ہیں جن کے فکر وعقیدہ کی کم ازکم کوئی صحیح بنیاد تو ہولیکن کجروی بے ہودگی گمراہی اور بیماری تو کوئی ایسی چیز نہیں جسے محترم سمجھا جائے اسی لیے اسلام حکم دیتا ہے کہ جیسے بھی ہو انسانی معاشرے سے بت پرستی کی ریشہ کنی کی جائے چاہے اس کے لئے جنگ مول لینا پڑے بت خانے اور بت پرستی کے آثار صلح صفائی سے نہ مٹ سکیں تو قوت وطاقت کے بل بوتے پر انہیں ویران ومنہدم کیا جانا چاہئے۔

(۱۹۴)اَلشَّهۡرُ الۡحَرَامُ بِالشَّهۡرِ الۡحَرَامِ وَ الۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَيۡهِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِيۡنَ	حرام مہینہ حرام مہینے کے مقابلے میں (اگر دشمن اس کا احترام نہ کریں اورتم سے لڑیں تو تم بھی مقابلہ بالمثل کا حق رکھتے ہو) اورتمام حرام امور (قابل) قصاص ہیں اور(بطورکلی) جوشخص بھی تم پر تجاوز کرے تو اس کی طرح تم بھی اس پر تعدّی کر سکتے ہو اور خدا سے ڈرتے رہنا (اورزیادتی نہ کرنا) اورجان لوکہ خدا پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔

تفسیر

مشرکین جانتے تھے اور پیغمبر اکرم ﷺ سے سن بھی چکے تھے کہ حرمت والے مہینوں (ذی القعدہ ذی الحجہ،محرّم اور

رجب) میں اسلام کے نقطہ نظر سے جنگ کرنا ناجائز اور خصوصیت سے مسجد الحرام اور مکہ میں تو اور بھی زیادہ غیر درست ہے نیز پیغمبر اسلام ﷺ اس حکم کا احترام کرتے ہیں اس لیے ان کی خواہش تھی کہ مسلمانوں پر انہی مہینوں میں غفلت کی حالت میں حملہ کر دیں اور وہ خود ان محترم مہینوں کے احترام سے بے پرواہ تھے ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ مقابلہ کریں اور یوں ہی رہا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔

زیر بحث آیت نے ان کی سازش سے پردہ اٹھا دیا اور کہا کہ حرام مہینوں میں جنگ کا جواب انہی مہینوں میں دیا جائیگا حرام مہینوں میں مسلمانوں کی طرف سے مقابلہ درحقیقت ان مہینوں کا احترام لوٹانے کے لئے ہی ہے۔

والحرمات قصاص.. واقع میں ان لوگوں کا دندان شکن جواب ہے جو حرام مہینوں میں جنگ کی اجازت دینے پر پیغمبر اکرم ﷺ اعتراض کرتے تھے یعنی نگاہ اسلام میں ماہ حرام کا احترام ان لوگوں کے مقابلے میں ہے جو اسے محترم سمجھیں لیکن جو اس کے احترام کو پامال کریں ان سے رعایت ضروری نہیں اور ان سے اس ماہ میں بھی جنگ کرنا جائز ہے اسی لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جنگ کی صورت واضح ہو جائے تو مقابلے کے لئے کھڑے ہو جاؤ تاکہ مشرکین دوبارہ حرام مہینوں کا احترام زائل کرنے کی جرات نہ کر سکیں۔

اس کے بعد ایک کلی اور عمومی حکم صادر فرمایا گیا ہے وہ یہ کہ مقابلہ بمثل ہر مسلمان شخص کا فریضہ ہے تمام لوگوں کو اجازت دی گئی ہے کہ ظالم کے مقابلے میں کھڑے ہو جائیں اور جس قدر ظلم و تجاوز ان پر کیا گیا ہے اتنا ہی اسکا جواب دیں۔

مسیحیت کہتی ہے اگر کوئی تمہارے دائیں رخسار پر تھپڑ مارے تو بایاں بھی اس کے سامنے کر دو اور اسے دوسرے تھپڑ کے لیے تیار کرو۔

اس کے برعکس اسلام کہتا ہے جس قدر تم پر ظلم و تعدی ہو اس کا جواب اس طرح دو اور تسلیم کا معنی موت اور مقابلے کا معنی زندگی یہ ہے اسلام کی منطق۔

(۱۹۵) وَ اَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ لَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ ۚۖۛ وَ اَحۡسِنُوۡا ۚۛ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ	اور راہ خدا میں خرچ کرو (اور خرچ نہ کر کے) اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور نیکی کرو کہ اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے

تفسیر

جس طرح جہاد میں مخلص طاقتور اور تجربہ کار مردوں کی ضرورت ہے اسی طرح مال و دولت کی بھی احتیاج ہے کیونکہ جہاد میں روحانی و جسمانی آمادگی کی ضرورت ہے اور فوج کے لئے مناسب اسلحہ اور سامان جنگ کی بھی احتیاج ہے۔

یہ صحیح ہے کہ پہلے درجے کا عامل سرنوشت اور انجام جنگ کا تعین مجاہدوں اور جانبازوں ہی سے ہوتا ہے لیکن مجاہد کو وسائل کی بھی ضرورت ہے یہی وجہ ہے کہ آیت تاکید کر رہی ہے کہ اس راہ میں کوچ نہ کرنا گویا اپنے تئیں ہلاکت و تباہی میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

خرچ کرنا معاشرے کو ہلاکت سے بچاتا ہے

یہ آیت اگرچہ آیات جہاد کے ذیل میں آئی ہے لیکن اس سے ایک کلی و اجتماعی حقیقت معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ خرچ کرنا افراد معاشرہ کو ہلاکت سے بچانے کا باعث بنتا ہے اس کے برعکس اگر انفاق اور خرچ کرنے کے عمل کو فراموش کر دیا جائے اور دولت ایک ہی طبقے کے پاس جمع ہو جائے تو ایک محروم اور بے نوا اکثریت وجود میں آ جائے گی زیادہ دیر یہ حالت قائم نہیں رہے گی اور جلد ایک دھما کہ ہوگا جس کے نتیجہ میں انسان اور سرمایہ داروں کا مال جل کر خاکستر ہو جائے گا اس سے خرچ کرنے اور ہلاکت سے بچنے کا باہمی ربط بھی واضح ہو جاتا ہے۔

اس بناء پر انفاق اور خرچ کرنا محروموں اور محتاجوں سے پہلے سرمایہ داروں کے لئے مفید ہے یعنی دولت وثروت کا اعتدال دولت وثروت کا محافظ ہے چنانچہ حضرت علی علیہ السلام اس حقیقت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

"حصّنوا اموالکم بالزکوۃ" زکوۃ دے کر اپنے مال کی حفاظت کرو

"وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ" آیت کے آخر میں احسان اور نیکی کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس طرح جہاد و انفاق کے مرحلے سے احسان و نیکی کے مرحلے کی طرف راہنمائی کی گئی ہے کیونکہ اسلام کی نظر میں احسان انسانیت کے تکامل وارتقاء کے بلند ترین مرحلے کا نام ہے۔

(۱۹۶) وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَ لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۫ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ	حج وعمرہ کو خدا کے لئے مکمل کرو اور اگر محصور ہو جاؤ (اور ایسی رکاوٹیں پیدا ہو جائیں جن کے باعث مکہ میں داخل نہ ہو سکو مثلاً دشمن کا خوف ہو یا کوئی بیماری لاحق ہو جائے) تو جو قربانی فراہم ہو اسے ذبح کرو اور (احرام سے خارج ہو جاؤ) اور اپنے سروں کو نہ منڈواؤ جب تک قربانی اپنے مقام تک نہ پہنچ جائے (اور قربان گاہ میں ذبح نہ ہو جائے) اور اگر کوئی بیمار ہو جائے یا اس کے سر میں کوئی تکلیف و اذیت ہو (اور مجبور ہو کر وہ اپنا سر نہ منڈوائے) تو اسے چاہیئے کہ روزہ، صدقہ یا گوسفند کی صورت میں فدیہ اور کفارہ دے جب (بیماری یا دشمن سے) مامون ہو جائیں تو جو لوگ عمرہ ختم کرنے کے ساتھ ہی حج کا آغاز کر دیں تو جو قربانی انہیں میسّر ہو (اسے ذبح کریں)

فَمَنۡ لَّمۡ یَجِدۡ فَصِیَامُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ فِی الۡحَجِّ وَسَبۡعَةٍ اِذَا رَجَعۡتُمۡ ؕ تِلۡکَ عَشَرَةٌ کَامِلَةٌ ؕ ذٰلِکَ لِمَنۡ لَّمۡ یَکُنۡ اَهۡلُهٗ حَاضِرِی الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ؑ	اور جن کے پاس نہیں ہے تو وہ تین دن حج کے دنوں میں اور سات دن واپس آ کر روزے رکھیں یہ پورے دس دن ہیں (البتہ) یہ ایسے شخص کے لئے ہے جس کے گھر والے مسجد الحرام کے پاس نہ ہوں (جو اہل مکہ اور اطراف مکہ میں سے نہ ہو) اور خدا سے ڈرو اور جان لو کہ وہ سخت عتاب کرنے والا ہے۔

تفسیر

حدود و شرائط اور وہ اعمال جو مراسم حج میں انجام دینا چاہئیں زیر بحث آیت میں بھی ان کی طرف اشارہ ہے۔

اب اس امر کی طرف توجہ دی جانی چاہئے کہ آیت کہتی ہے کہ یہ تمام اعمال خدا کے لیے اور اس کے فرمان کے مطابق ہونا چاہئے اور انہیں ظاہریت، ریاکاری اور بتوں کے لئے نہیں ہونا چاہئے۔

اس بناء پر آیت کا پہلا جملہ "وَ اَتِمُّوا الۡحَجَّ وَ الۡعُمۡرَةَ لِلّٰهِ" یہ بتاتا ہے کہ حج وعمرہ کے اعمال میں تقریب الٰہی کے سوا کوئی وجہ اور سبب نہیں ہونا چاہئے۔

مزید کہتا ہے کہ اگر احرام باندھے ہوئے ہو اور پھر کوئی رکاوٹ مثلاً بیماری یا دشمن کا خوف لاحق ہو جائے اور عمرہ و حج کے اعمال نہ بجالائے جاسکیں تو ضروری ہے کہ اپنی استطاعت کے مطابق قربانی ذبح کرو۔

حج میں جن کاموں کو انجام دینا ہے ان میں سے ایک سر کے بالوں کا منڈوانا ہے لیکن توجہ رہے کہ قربان گاہ میں قربانی ذبح ہونے سے پہلے تم یہ عمل بجالانے کا حق نہیں رکھتے۔

مگر جس شخص کو کوئی بیماری یا کچھ اور رکاوٹیں درپیش ہیں جن کی وجہ سے اسے وقت سے پہلے سر منڈوانا پڑے اور اس کام کے پیش آنے کی صورت میں ضروری ہے کہ فدیہ دے اور یہ فدیہ تین دن کے روزے یا چھ مساکین کو کھانا کھلانا یا ایک بھیڑ ذبح کرنا ہو سکتا ہے۔

جب بیماری یا دشمن سے آسودہ خاطر ہو جاؤ اور حج تمتع انجام دینا چاہو تو اپنی استطاعت کے مطابق اونٹ گائے یا بھیڑ کی قربانی دو قربانی کا جانور نہ مل سکے یا مالی حالت اس کی اجازت نہ دے تو تین دن حج کے ایام میں (ساتویں، آٹھویں اور نویں کا دن) اور سات دن واپس جانے کے بعد کل دس دن روزے رکھو۔

تلک عشرة کاملة معلوم ہے کہ تین اور سات کُل دس دن بنتے ہیں پھر بھی قرآن کہتا ہے یہ دس دن کامل ہو جائیں گے۔

"ذٰلِکَ لِمَنْ لَّمْ یَکُنْ اَھْلُہٗ حَاضِرِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ"

یہ حج تمتع کا پروگرام ان لوگوں کے لئے ہے جو مسجد الحرام میں موجود یا اس کے قرب و جوار میں نہ ہوں (فقہاء میں مشہور یہ ہے کہ جو شخص مکہ سے ۴۸ میل دور رہتا ہے حج تمتع اسکی ذمہ داری ہے لیکن جو مکہ سے اتنا دور نہیں اس کا فریضہ حج قران یا حج افراد ہے) اس مسئلے کی تفاصیل اور مدارک فقہی کتب میں موجود ہیں۔

آیت کے آخر میں حکم دیا گیا ہے کہ تقویٰ اختیار کرو اور اس سلسلے میں جو احکام دیئے گئے ہیں ان کی تعمیل میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرو اور پروردگار کے شدید عقاب سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو۔

یہ تاکید شاید اس لیے ہے کہ حج ایک اہم اسلامی عبادت ہے اور اگر اس کے مراسم و اعمال پر پوری توجہ نہ دی جائے یا اس کی روح کو فراموش کر دیا جائے تو مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔

حج وہ عبادت ہے جسے امیر المومنین علیہ السلام نے اسلام کا پرچم اور اہم شعار قرار دیا ہے اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں آپ علیہ السلام نے وصیت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

" اللّٰہ اللّٰہ فی بیت ربکم لا تخلوہ ما بقیتم فانہ ان ترک لم تناظروا ."

(تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں جب تک زندہ ہو خانہ خدا سے دستبردار نہ ہونا کیونکہ اگر اس کی زیارت متروک ہوگئی تو تمہیں مہلت نہیں دی جائے گی اور تمہارا وجود خطرے میں پڑ جائے گا)۔

(۱۹۷) اَلْحَجُّ اَشْھُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِیْھِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوْقَ ۙ وَ لَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؔؕ وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی ۫ وَ اتَّقُوْنِ یٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ	حج معیّن مہینوں میں ہے اور جو لوگ (احرام اور مناسک حج شروع کر لینے سے) حج اپنے اوپر فرض کر لیتے ہیں (انہیں توجہ رکھنی چاہئے کہ) حج میں عورتوں سے جنسی ملاپ گناہ اور جدال نہیں ہے اور جو اچھے کام تم انجام دیتے ہو خدا انہیں جانتا ہے۔ زادِ راہ اور توشہ مہیا کرلو کیونکہ بہترین زاد و توشہ پرہیزگاری ہے اور اے صاحبان عقل مجھ سے ڈرو۔

تفسیر

اس آیت میں قرآن یاد دلاتا ہے کہ حج کا عمل معین مہینوں میں انجام پانا چاہئے اور اسے سال بھر انجام نہیں دیا جا سکتا اور جیسا کہ کتب حدیث تفسیر اور فقہ میں ہے کہ یہ عظیم عبادت صرف شوال، ذی القعدہ اور ذی الحجہ کے پہلے دس دنوں میں انجام دی جا سکتی ہے۔ اور بعض اعمال تو صرف ذی الحجہ کی نویں، دسویں، گیارھویں اور بارھویں تاریخوں ہی میں انجام دیئے جا سکتے ہیں اور باقی اعمال اس پوری مدت میں انجام پا سکتے ہیں۔

اس کے بعد قرآن بیان کرتا ہے کہ جو لوگ احرام اور اعمال حج میں مشغول ہو کر اپنے اوپر حج واجب کر چکے ہیں انہیں اعمال حج بجالاتے ہوئے جنسی ملاپ اور کوئی گناہ انجام دینے سے پرہیز کرنا چاہئے اور یونہی بے کار گفتگو بے فائدہ بحث مباحثہ اور بے مصرف کشمکش ترک کر دینی چاہئے کیونکہ یہ ماحول اور مقام عبادت خلوص اور مادی لذات کے ترک کرنے کا ہے یہ وہ ماحول ہے کہ جس سے روح کو قوت لینا چاہئے اور جہاں مادہ سے اسے کاملاً جدا ہو جانا چاہئے اور عالم مادہ سے ماوراء راستہ پانا چاہئے اور اس کے ساتھ ساتھ اتحاد و اتفاق اور برادری کے رشتے کو محکم کرنا چاہئے۔

جیسا بھی نیک عمل تم سے سرزد ہو خدا اسے جانتا ہے اور یہ پہلی جزا و ثواب ہے جو نیک شخص کو ملتا ہے کیونکہ ایک صاحب ایمان کی پہلی مسرت تو یہی ہے کہ اسے معلوم ہو کہ پروردگار اس عمل کو جانتا ہے جسے اس نے اس کی خاطر انجام دیا ہے اور یہ پہلو بہت ہی لذت بخش ہے۔

آیت کے اس حصے میں زادراہ مہیا کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہتے ہیں کہ اس زمانے میں یمن کے لوگوں میں سے ایک گروہ خانہ خدا کی زیارت کے لئے چل کھڑا ہوتا تھا اور کوئی زادراہ ساتھ نہ لیتا تھا ان لوگوں کی منطق یہ تھی کہ ہم خدا کے گھر کی زیارت کے لئے جا رہے ہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ہمیں کھانا نہ دے حالانکہ خدا نے سب کو غذا اور مادی وسائل دیئے ہیں لہٰذا آیت کے اس حصے میں حکم دیا گیا ہے کہ توشہ راہ مہیا کرو اور غذا اپنے ساتھ اٹھا کر لے جاؤ

اس کے علاوہ ایک معنوی مسئلے کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اس توشۂ سفر کے علاوہ ایک اور زادراہ کی بھی بہت ضروری ہے جسے مہیا کرنا ہے اور ہے پرہیز گاری اور تقوی۔

یہ جملہ اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ سفر حج میں معنوی زادراہ مہیا کرنے کے بہت مواقع ہیں جن سے غفلت نہیں برتنا چاہئے وہاں اسلام کی مجسم تاریخ اور ابراہیم علیہ السلام جیسے توحید کے علمبردار کی فدا کاری کے مناظر اور پروردگار کے مخصوص جلوے یوں نظر آتے ہیں کہ کہیں اور اس طرح سے دکھائی نہیں دیتے جن کی روح بیدار اور فکر زندہ ہے وہ ایک عمر کے لیے اس بے نظیر روحانی سفر سے معنوی اور روحانی توشہ فراہم کر سکتے ہیں۔

آیت کے اس حصے میں روئے سخن اہل فکر و نظر کی طرف ہے کہ وہ پرہیز گاری اختیار کریں کیونکہ یہی لوگ ان اعلی تربیتی پروگراموں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جب کہ دوسرے لوگوں کی نظر اس کے ظاہری غلاف پر ہی ہوتی ہے۔

(۱۹۸) لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَ اِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ	کوئی گناہ اور حرج نہیں کہ تم اپنے پروردگار کے فضل سے (اور ایام حج میں اقتصادی منافع سے) فائدہ اٹھاؤ (کیونکہ حج کا ایک فلسفہ اسلامی اقتصادی معاشرے کی بنیاد رکھنا بھی ہے) اور جب میدان عرفات سے کوچ کرو تو مشعر الحرام سے پاس خدا کو یاد کرو اسے اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں ہدایت کی ہے اگرچہ اس سے پہلے تم لوگ گمراہ تھے۔

(۱۹۹)ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَ اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ	پھراس جگہ سے کہ جہاں سے لوگ کوچ کرتے ہیں (سرزمین منیٰ کی طرف) کوچ کرواور خدا سے طلب مغفرت کرو جو بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر

موسم حج میں اقتصادی کارکردگی

زمانہ جاہلیت میں مراسم حج بجالانے کے موقع پر معاملہ،تجارت،مسافروں کو لے جانااور سامان لانا لے جانا حرام اور گناہ سمجھا جاتا تھا۔مسلمان فطری طور پر منتظر تھے کہ انہیں معلوم ہو کہ زمانہ جاہلیت والے احکام جوں کے توں باقی رہیں گے یا یہ کہ اسلام ان کے بے وقعت ہونے کا اعلان کرتا ہے۔

محل بحث پہلی آیت نے ان دنوں میں معاملہ یا تجارت کے گناہ ہونے کو غلط قرار دے دیا اور بتایا ہے کہ موسم حج میں کسی قسم کا معاملہ یا تجارت کرنے میں کوئی مانع اور حرج نہیں اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ لوگ فضل خدا سے بہرہ ور ہوں اور کوئی نفع حاصل کریں اور اپنے ہاتھوں کی کمائی سے فائدہ اٹھائیں۔

اسلامی کتب اور منابع میں حج کے فلسفہ میں جہاں اس کے اخلاقی،سیاسی اور ثقافتی پہلوں کی طرف اشارہ ہوا ہے وہاں اس کے اقتصادی فلسفہ کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے اور کہا گیا ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں سے خانہ خدا کی طرف مسلمانوں کا سفر اور وہاں عظیم اسلامی کانفرنس کی تشکیل اسلامی معاشروں کی عام اقتصادی ترقی کی اساس بھی بن سکتی ہے۔

اس حصے میں قرآن متوجہ کرتا ہے کہ پروردگار کی ہدایت کے شکرانے کے طور پر مشعر الحرام میں اس کی یاد میں رہو ایسی یاد جو اس ہدایت کے مطابق ہے جو خدا کی طرف سے ہے۔

عرفات کو عرفات کیوں کہتے ہیں؟

ہم کہہ چکے ہیں کہ عرفات مکہ سے چار فرسخ کے فاصلے پر ایک وسیع وعریض بیابان ہے۔وہاں حاجی حضرات نویں ذی الحجہ کو زوال آفتاب سے لے کر غروب تک ٹھہرتے ہیں۔

اس سرزمین کا نام عرفات کیوں ہے۔اس بارے میں بہت سے پہلو مذکور ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب خدا کی وحی کا قاصد جبرئیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مناسک حج کی نشاندہی کروا رہا تھا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کہتے "عرفت" "عرفت" یعنی "میں نے پہچان لیا"۔"میں نے پہچان لیا"۔

لیکن بعید نہیں کہ یہ نام رکھنا ایک اور حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہو اور وہ یہ کہ یہ سرزمین جہاں سے مراحل حج شروع ہوتے

ہیں معرفت پروردگار اور اس کی پاک ذات کو پہچاننے کے لئے بہت آمادہ اور تیار ماحول مہیا کرتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ روحانی اور معنوی جذبہ جو انسان میں اس سرزمین میں داخل ہوتے وقت پیدا ہوتا ہے اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

سب ایک ہی صورت میں، سب ایک انداز میں، سب بیابان نشیں، شہر کے شور وغل سے دور، مادی دنیا کے ہاؤ ہو سے پرے، زرق و برق دنیا سے اوجھل ایک آزاد اور گناہ سے پاک فضا میں آسمان کے سائے تلے اس جگہ جہاں فرشتۂ وحی کے پر چھوتے رہے جہاں سے جبرئیل علیہ السلام کا زمزمہ، ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ کی مردانہ وار پکار، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صدر اول کے مجاہدین کی حیات بخش صدا کی بھنبھناہٹ آج بھی سنائی دیتی ہے۔ وہ مقام جہاں انسان نہ صرف یہ کہ عرفان پروردگار کے نشہ میں سرمست ہو جاتا ہے اور کچھ لمحوں کے لئے ساری مخلوق کی تسبیح کے سرور سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے بلکہ اپنے وجود کے اندر اپنی کھوئی ہوئی ذات کو جس کی تلاش میں تھا پا لیتا ہے اور اپنی ذات کا عارف ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر وہ جان لیتا ہے کہ وہ وہ شخص نہیں جو رات دن تلاش معاش میں حریصانہ کوہ وصحرا کی وسعتوں کو اپنے قدموں سے ماپتا رہتا تھا اور جو کچھ ملتا تھا اس سے سیراب نہ ہوتا تھا۔ یہاں وہ جان لیتا ہے کہ ایک اور گوہر اس کی روح کے اندر چھپا ہوا ہے جو دراصل اسکے وجود کی حقیقت ہے

جی ہاں اس سرزمین کو عرفات کہتے ہیں۔ کس قدر عمدہ اور مناسب نام ہے۔

مشعر الحرام...... کے نام کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ وہ جگہ شعائر حج کا مرکز ہے اور ان عظیم و پرشکوہ آسمانی مراسم کی نشانی ہے۔

لیکن یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ''مشعر'' ''شعور'' کے مادہ سے ہے۔ اس تاریخی رات (دس ذی الحجہ کی رات) جب زائرین خانۂ خدا اور عرفات میں اپنا تربیتی پروگرام مکمل کرنے کے بعد ادھر کوچ کرتے ہیں۔ رات ڈھلے سے صبح تک نرم پتھروں پر تاروں بھرے آسمان تلے، ایک ایسی سرزمین پر جو محشر کبریٰ کا نمونہ اور قیامت عظمیٰ کا ایک مظہر بنی ہوتی ہے۔ لوگ ہر طرف یوں پھیلے ہوتے ہیں جیسے ٹھاٹھیں مارنے والے سمندر کی طوفانی موجیں ہوں۔ صبح تک لوگوں کی آوازیں اس سرزمین پر سنائی دیتی رہتی ہیں۔

جی ہاں آلائشوں سے پاک اس پاکیزہ اور ہلا دینے والے ماحول میں، احرام کے معصومانہ لباس میں، نرم کنکریوں پر بیٹھا انسان اپنے اندر یوں محسوس کرتا ہے جیسے فکر و شعور کے تازہ چشمے ابل رہے ہوں اور ان کا پانی دل کی گہرائیوں میں گر رہا ہو اور وہ اپنے اندر سے ان جھرنوں کی آواز صاف طور پر سن رہا ہو۔ ہاں! اسی جگہ کو مشعر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

(۱۹۹) ربّ جلیل نے اس آیت میں ایک امتیاز اور خصوصیت پر خط بطلان کھینچا ہے جس کے قریش مکہ اپنے بارے میں قائل تھے۔ قریش اپنے تئیں حمس (حمس کا معنی ہے وہ افراد جو اپنے دین میں مستحکم ہوں) (بروزن خمس) کہتے تھے اور وہ اپنے آپ کو اولاد ابراہیم علیہ السلام اور سرپرست کعبہ قرار دیتے تھے۔

وہ کسی عرب کو اپنے برابر نہ سمجھتے تھے وہ کہتے تھے کہ حریم مکہ سے باہر رہنے والوں کا احترام حرم میں رہنے والوں کے برابر نہیں کرنا چاہئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم ایسا کریں گے تو عرب ہماری قدر و قیمت کے قائل نہیں ہوں گے۔ اسی بناء پر انہوں نے عرفات

میں ٹھہرنے کوترک کر دیا تھا کیونکہ وہ محیط حرم سے باہر تھا حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ یہ فرائض حج اور دین ابراہیم علیہ السلام کا جزو ہے (سیرت ابن ہشام ج۱،ص۲۱۱،۲۱۲)

مندرجہ بالا آیت میں قرآن حکم دیتا ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ سب ایک ہی جگہ عرفات میں وقوف کریں اور وہاں سے سب کے سب مشعر کی طرف آجائیں اور پھر وہاں سے سرزمین منیٰ کی طرف کوچ کریں۔

''وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ''

مزید فرماتا ہے کہ خدا سے طلب مغفرت کرو اور زمانۂ جاہلیت کے ان افکار و خیالات سے کنارہ کشی کرلو کیونکہ حج مساوات و برابری کا درس ہے اور یاد دلاتا ہے کہ خدا غفور و رحیم ہے۔

(۲۰۰) فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ	اور جب اپنے مناسک (حج) انجام دے لو تو ذکر خدا کرو جیسے (زمانۂ جاہلیت میں موہوم مفاخر پر فخرو مباہات کرتے ہوئے) اپنے آباء کو یاد کرتے (رہے) ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر (یہاں دو طرح کے لوگ ہیں) بعض کہتے ہیں: خدایا ہمیں دنیا میں بھلائی عطا کر، ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔
(۲۰۱) وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ	بعض کہتے ہیں خداوند ہمیں دنیا میں بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی اچھائی سے نواز اور ہمیں (جہنم کی) آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔
(۲۰۲) اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَ اللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ	وہ اپنی کوشش (اور دعا) کا صلہ اور حصہ پائیں گے اور خدا جلد حساب چکا دینے والا ہے۔

شانِ نزول

امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ زمانہ جاہلیت میں مراسم حج کی انجام دہی کے بعد ایک اجتماع منعقد ہوا کرتا تھا اور لوگ اپنے باپ دادا کی طرف سے ملنے والے موہوم افتخارات خوب بیان کیا کرتے تھے۔قرآن متوجہ کرتا ہے کہ اعمال حج بجالانے کے بعد خدا کو یاد کیا کرو اور اس عظیم اجتماع میں خدا اور اس کی وسیع و بے شمار نعمتوں پر گفتگو کیا کرو اور اپنے دلوں کو اس کی جانب مائل کرو اور اس یاد خدا میں اتنا تو شوق و شغف اور سوز و گداز ہو جتنا زمانہ جاہلیت میں اپنے اباء و اجداد کے فخر و مباہات کے ضمن میں ہوتا تھا بلکہ خدائے بزرگ و برتر کے بارے میں تو زیادہ

جوش وخروش اور گہرائی ہونا چاہئے۔

تفسیر

ضمنی طور پر اس آیت سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ بزرگی اور عظمت خدا سے مربوط رہنے میں ہے نہ کہ اپنے آباء واجداد کے موہوم مفاخر ومباہات سے وابستگی میں۔

اس کے بعد قرآن دوگروہوں کی کیفیت کو واضح کرتا ہے اور ان کے افکار وفہم کا تذکرہ کرتا ہے۔ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جو مادی منافع کے سوا کچھ نہیں دیکھتا اور ان کے علاوہ خدا سے کسی چیز کی درخواست نہیں کرتا اور وہ کہتا ہے۔

(۲۰۱)''رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً'' خدا ہمیں دنیا کی نعمتیں بخش دے۔

ایسے لوگوں کا معنویت وروحانیت میں کوئی حصہ نہیں اور آخرت میں ان کے نصیب میں کچھ نہیں۔یہ لوگ اس ابدی و باقی اور ہمیشہ رہنے والے جہاں سے بے بہرہ ہیں۔جہاں انسان کو ہر چیز کی ضرورت ہوگی۔

دوسرے گروہ میں وہ لوگ ہیں جن کے افکار ونظریات فقط مادی زندگی تک محدود نہیں بلکہ وہ حیات دنیا کو بھی معنوی تکامل و ارتقاء کے لئے مقدمہ سمجھتے ہیں اور آخرت کے گھر کی سعادت کے بھی طلب گار ہیں۔یہ آیت درحقیقت اسلامی منطق کو مادی اور معنوی مسائل میں مشخص کرتی ہے اور جو لوگ صرف مادیات میں ڈوبے ہوئے ہیں انہیں ان لوگوں کی طرح مذموم قرار دیتی ہے جو دنیاوی زندگی پر کوئی نظر نہیں رکھتے نیز یہ آیت انسانوں کی اس جہان میں دردناک عذاب سے نجات بھی چاہتی ہے۔

''وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ''

''حسنۃ'' کا معنی ہے''نیکی''۔اس کا ایک وسیع مفہوم ہے۔اس میں تمام مادی ومعنوی نعمتیں شامل ہیں لیکن بعض احادیث میں حسنہ کے مفہوم کے بارے میں پیغمبر اسلام ﷺ سے منقول ہے۔

''ومن اوتی قلباً شاکراً و لساناً ذاکراً و زوجة مؤ منة تعینة علی امر دنیا و اٰخرة فقد اوتی فی الدّ نیا حسنة و فی الاٰخر ة حسنة و وقی عذاب النار ۔'' (مجمع البیان۔آیت مذکورہ کے ذیل میں)

(جسے خدا شکر گزار دل دے،یاد حق میں مشغول زبان بخشے اور صاحب ایمان بیوی عطا کرے جو امور دنیا وآخرت میں اس کی مددگار ہو اسے دنیا وآخرت کی نیکی بخشی ہے اور آتش جہنم کے عذاب سے بچایا ہے۔)

واضح ہے کہ اس حدیث میں عام مفہوم کی بعض خاص امور کے حوالے سے تفسیر کی گئی ہے اور اس میں بعض واضح مصادیق کی نشاندہی کی گئی ہے نہ کہ منحصراً اس کا بس یہی مفہوم ہے۔

(۲۰۲) گذشتہ بحث کے بعد اس آخری آیت میں ہے کہ دونوں گروہ اپنی کاوشوں کے نتیجے سے بہرہ ور ہوتے ہیں،وہ بھی جو خدا سے صرف دنیا چاہتے ہیں اور وہ بھی جو دنیا وآخرت کے خواستگار ہیں۔ان میں سے کوئی بھی محروم نہیں ہوتا البتہ ہر ایک کا صلہ اس کی خواہش تک محدود ہے۔

(۲۰۳) وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ	اور خدا کو معین دنوں (۱۱،۱۲ اور ۱۳ ذی الحجہ) میں یاد کرو اور جو لوگ جلدی کریں اور (ذکر خدا کو) دو دنوں میں انجام دیں ان پر کوئی گناہ نہیں اور جو تاخیر کریں (اور تین دن انجام دیں) ان پر کوئی گناہ نہیں (یہ ان کیلئے ہے) جو تقویٰ اختیار کریں۔ نیز خدا سے ڈرو اور جان لو کہ تم اس کی طرف محشور ہوگے۔

تفسیر

یہ آیت مراسم حج کے بعد ذکر خدا کا پروگرام پیش کرتی ہے۔ اس کے مطابق زمانۂ جاہلیت کے موہوم مفاخر کی بجائے چند روز یاد الٰہی میں بسر کرنا چاہئیں۔ یہ مدت کم از کم دو دن اور زیادہ سے زیادہ تین دن ہے۔ سابق آیات کے قرینہ سے یہ دن عید قربان کے مراسم کے بعد ہیں اور یہ یقیناً ذی الحجہ کی ۱۱،۱۲ اور ۱۳ تاریخیں ہیں۔ روایات کی زبان میں ان دنوں کو ایاّم تشریق کہا جاتا ہے اور جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے یہ روشنی بخشنے والے دن ہیں۔ جن میں ان بلند مرتبہ مذہبی مراسم کے ذریعے انسانی روح اور جان روشن ہو جاتی ہے۔

احادیث کے مطابق ۱۵ نمازوں کے فوراً بعد (جو عید کے روز نماز ظہر سے لے کر ۱۳ ذی الحجہ کی نماز صبح تک ہیں) ان الہام بخش جملوں کا تکرار کیا جاتا ہے:

''اللّٰہ اکبر ، اللّٰہ اکبر ، اللّٰہ اکبر ، لا الٰہ الّا اللّٰہ و اللّٰہ اکبر ، وللّٰہ الحمد، اللّٰہ اکبر علیٰ ما ھدانا ، اللّٰہ اکبر علیٰ ما رزقنا من بھیمۃ الانعام''

''**فلا اثم علیہ**'' (اس پر کوئی گناہ نہیں) ہوسکتا ہے یہ جملہ دو اور تین دن کے ذکر خدا میں اختلاف کی طرف اشارہ ہو یعنی اس تعداد میں سے جسے چاہو اختیار کرو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے (اور آیت سے ابتدائی طور پر بھی یہی مفہوم ظاہر ہوتا ہے)۔

یہ بھی ممکن ہے کہ آیت کے اس حصے میں خانہ خدا کے زائرین سے مطلق گناہ کی نفی ہو یعنی ایمان، خلوص اور توجہ سے مناسک حج انجام دینے سے جو ان اذکار سے مکمل ہوتے ہیں، زائرین کعبہ کے گذشتہ گناہوں کے آثار اور تہ در تہ گناہ و معاصی ان کے قلب و جان سے دھل جائیں گے اور جب وہ اس عظیم تربیتی مکتب سے نکلیں گے تو ان کی روحیں آلائش گناہ سے پاک ہو چکی ہوں گی۔ ''لمن اتّقی'' (یعنی۔ ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کریں) کے الفاظ اسی مفہوم کی تائید کرتے ہیں۔

(۲۰۴)وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یُّعۡجِبُکَ قَوۡلُہٗ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ یُشۡہِدُ اللّٰہَ عَلٰی مَا فِیۡ قَلۡبِہٖ ۙ وَ ہُوَ اَلَدُّ الۡخِصَامِ	کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کی گفتگو دنیاوی زندگی کے لئے تمہیں بھلی معلوم ہوتی ہے اور وہ جو دل میں چھپائے ہوئے ہیں خدا اس پر گواہ ہے اور (جبکہ) وہ سخت ترین دشمن ہیں۔
(۲۰۵)وَ اِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الۡاَرۡضِ لِیُفۡسِدَ فِیۡہَا وَ یُہۡلِکَ الۡحَرۡثَ وَ النَّسۡلَ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یُحِبُّ الۡفَسَادَ	(ان کی نشانی یہ ہے کہ) جب وہ رخ پھیرتے ہیں (اور تیری بارگاہ سے نکلتے ہیں) تو زمین میں فساد برپا کرنے کے درپے ہوتے ہیں اور وہ فصلوں اور چوپایوں کو تباہ و برباد کرتے ہیں (اسکے باوجود کہ وہ جانتے ہیں کہ) خدا فساد کو پسند نہیں کرتا۔
(۲۰۶)وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُ اتَّقِ اللّٰہَ اَخَذَتۡہُ الۡعِزَّۃُ بِالۡاِثۡمِ فَحَسۡبُہٗ جَہَنَّمُ ؕ وَ لَبِئۡسَ الۡمِہَادُ	اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا سے ڈرو (تو ان کا اصرار اور ہٹ دھرمی بڑھ جاتی ہے) اور ضد اور تعصب انہیں گناہ کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ جہنم کی آگ ان لوگوں کے لئے کافی ہے اور (جہنم) کیا بری جگہ ہے۔

شان نزول

یہ آیات اخنس بن شریق کے متعلق نازل ہوئی ہیں۔ وہ خوبصورت اور خوش بیان شخص تھا۔ وہ پیغمبر اکرم ﷺ سے دوستی کا اظہار کرتا تھا اور خود کو مسلمان ظاہر کرتا تھا۔ جب پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ ﷺ کے پاس بیٹھتا تو اظہار ایمان کرتا اور منافق ہونے کے باوجود قسمیں کھاتا اور کہتا کہ میں آپ ﷺ کو دوست رکھتا ہوں اور خدا پر ایمان رکھتا ہوں۔ پیغمبر ﷺ بھی (بظاہر) اسے تپاک سے ملتے اور اس سے اظہار لطف و محبت فرماتے۔

ایک مرتبہ اس کے اور قبیلہ ثقیف کے درمیان دشمنی ہوگئی۔ اس نے ان پر شب خون مارا۔ ان کے چوپائے مار ڈالے اور فصلوں کو آگ لگا دی۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے کھیتوں سے گزرا اور انہیں آگ لگا دی اور ان کے چوپایوں کے پاؤں کاٹ دیئے۔ اس طرح اس نے اپنے اندرونی نفاق کو ظاہر کیا اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

تفسیر

جیسا کہ شان نزول میں آیا ہے آیات بعض منافقین کے نفاق کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور ان کا تقاضا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے تیئں ان سے بچائے رہیں۔فرمایا گیا ہے کہ کچھ لوگ اپنی باتوں سے اظہار ایمان کرتے ہیں اور قسم کھا کر یوں ظاہر کرتے ہیں کہ ان کی باتیں ان کے اعتقاد کی مظہر ہیں حالانکہ وہ اسلام کے سخت ترین دشمن ہیں۔اسی لئے یہ لوگ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت سے اٹھ کر باہر جاتے ہیں تو زمین میں فساد کرتے ہیں،کھیتوں کو اجاڑ دیتے ہیں اور انسانوں کے تباہ کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔

(۲۰۵) زیرنظر دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ ان کے رخ کردار سے پردہ اٹھاتا ہے اور ان کے باطن کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے آشکار کرتا ہے اور فتنہ۔اور فساد میں ان کی بڑھتی ہوئی فعالیت کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہتا ہے:اگر یہ لوگ اپنے اظہارات میں سچے ہوتے تو فساد اور تخریب کاری کی طرف ہاتھ نہ بڑھاتے کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ خدا تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

(۲۰۶) زیرنظر آخری آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ جب انہیں اس برے عمل سے روکا جاتا ہے تو ان کی ہٹ دھرمی اور تعصب میں اضافہ ہو جاتا ہے اور نہ صرف یہ کہ وہ نصیحت کرنے والوں کے نصائح پر کان نہیں دھرتے بلکہ غرور اور اپنی مخصوص نخوت کے ساتھ حق کے خلاف کاموں میں اضافہ کرتے ہیں ایسے افراد کو جہنم کی آگ کے سوا کوئی چیز رام نہیں کر سکتی ''فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ''......یعنی جہنم اس کے لئے کافی ہے اور وہ بری جگہ ہے۔

(۲۰۷)وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ	کچھ لوگ اپنی جان خدا کی خوشنودی کے بدلے بیچ دیتے ہیں اور خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے۔

شان نزول

اہل سنت کے مشہور مفسر ثعلبی کہتے ہیں:

جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام نے ہجرت کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تو اپنے قرضوں کی ادائیگی اور موجود امانتوں کی واپسی کے لئے حضرت علی علیہ السلام کو اپنی جگہ مقرر کیا اور جس رات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غار ثور کی طرف جانا چاہتے تھے اس رات مشرکین آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملہ کرنے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کے چاروں طرف سے محاصرہ کئے ہوئے تھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ آپ کے بستر پر لیٹ جائیں۔اپنی مخصوص سبز رنگ کی چادر انہیں اوڑھنے کو دی۔اس وقت خداوند عالم نے جبرئیل اور میکائیل پر وحی کی کہ میں نے تم دونوں کے درمیان بھائی چارہ اور اخوت قائم کی ہے اور تم میں سے ایک کی عمر کو زیادہ مقرر کیا ہے۔تم میں سے کون ہے جو ایثار کرتے ہوئے دوسرے کی زندگی کو اپنی حیات پر ترجیح دے ان میں سے کوئی بھی اس کے لئے تیار نہ ہوا تو ان پر وحی ہوئی کہ اس وقت علی علیہ السلام میرے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر سویا ہوا ہے اور وہ تیار ہے کہ اپنی جان ان پر قربان کر دے۔زمین پر جاؤ اور اس کے محافظ اور نگہبان بن جاؤ۔

جب جبرائیل حضرت علی علیہ السلام کے سرہانے آئے اور میکائیل پاؤں کی طرف بیٹھے تھے تو جبرئیل کہہ رہے تھے سبحان اللہ، آفرین آپ پر اے علی علیہ السلام کہ خدا آپ کے ذریعے فرشتوں پر فخر ومباہات کر رہا ہے۔

اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور اسی بناء پر وہ تاریخی رات ''لیلة المبیت'' کے نام سے مشہور ہو گئی۔

تفسیر

جیسا کہ شان نزول میں بیان ہو چکا ہے کہ یہ آیت ہجرت کی رات حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی لیکن اس کا ایک کلی وعمومی مفہوم بھی ہے۔ یہ آیت چونکہ گذشتہ آیت ''و من النّاس من یّعجبک.....'' کے مقابلے میں آئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس آیت میں انسانوں کے جس گروہ کی طرف اشارہ ہے سابق گروہ کے مقابلے میں ہے۔

محل بحث آیت حضرت علی علیہ السلام کی ایک بہت بڑی فضیلت ہے جس کا ذکر اکثر اسلامی کتب میں آیا ہے۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ اس آیت میں بیچنے والا انسان ہے اور خریدنے والا خدا ہے۔ مال ومتاع نفس وجان ہے اور اس کی قیمت خوشنودیٔ پروردگار ہے۔ یہ آیت دیگر ان آیات سے مختلف ہے جن میں لوگوں کی خدا سے تجارت بیان کی گئی ہے۔ وہاں قیمت بہشت اور دوزخ سے نجات ہے۔

(۲۰۸) یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ	اے ایمان والو! سب کے سب صلح وآشتی میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو کہ وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔
(۲۰۹) فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ	اور اگر (ان سب) نشانیوں اور واضح پروگراموں کے بعد بھی تم سے لغزش ہو جائے۔ تو جان لو کہ خدا توانا اور حکیم ہے۔

تفسیر

عالمی صلح وآشتی صرف ایمان کے سائے میں ممکن ہے

''سلم'' اور ''سلام'' لغت میں صلح وآشتی کے معنی میں ہے۔ یہ آیت تمام لوگوں کو امن وصلح کی دعوت دیتی ہے۔ آیت کا روئے سخن چونکہ مومنین کی طرف ہے اس لئے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ صلح وآسائش صرف ایمان کے سائے میں ممکن ہے۔

واضح ہے کہ مادی امور مثلاً زبان، نسل، ثروت ودولت، جغرافیائی حدود اور طبقہ بندی سب کے سب جدائی اور پراگندگی کے سرچشمے ہیں۔ ان کے ذریعے حقیقی عالمی امن قائم نہیں ہوسکتا کیونکہ حقیقی امن تو قلوب انسانی میں کسی محکم رشتے کا محتاج ہے اور یہ محکم رشتۂ اتصال صرف خدا پر ایمان کا نام ہے۔

اسی سورہ کی آیہ ۱۶۷ میں اشارہ ہو چکا ہے کہ کجرویاں اور شیطانی وسوسے تدریجی طور پر رونما ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر

ایک قرآنی تعبیر کے مطابق شیطان کے ایک قدم کی پیروی ہے۔ یہاں بھی اسی حقیقت کا تکرار کیا گیا ہے کہ انحراف حق، دشمنی، عداوت، نفاق، جنگ اور خوں ریزی، انسان کے مزاج میں آہستہ آہستہ داخل ہوتے ہیں۔ صاحب ایمان افراد کو پہلے سے بیدار رہنا چاہئے تاکہ وہ ان برائیوں کا مقابلہ کرسکیں۔

''اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ''

شیطان کی انسان سے دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ابتدائے آفرینش حضرت آدمؑ سے وہ اسلام کی دشمنی کے لئے کمر بستہ ہے اور اس نے سوگند کھا رکھی ہے کہ وہ اس دشمنی کو اپنے حتمی نتیجے تک پہنچانے کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کرے گا لیکن جیسا کہ اپنے مقام پر ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ تضاد اور عداوت باایمان لوگوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ بلکہ یہ ان کے تکامل وارتقاء کے لئے ایک رمز ہے۔

(۲۰۹) زیر نظر دوسری آیت میں ہے کہ پروگرام، راستہ اور مقصد سب واضح ہیں تو پھر لغزشوں اور شیطانی وسوسوں کی گنجائش نہیں ہونا چاہئے لیکن اگر تم ان سب چیزوں کے باوصف راستے سے ہٹ جاؤ۔ کجروی اختیار کرلو تو مسلّم ہے کہ اس میں تمہاری کوتاہی ہے اور جان لو کہ خدا بھی عزیز (صاحب قدرت وتوانا) ہے اور کوئی شخص اس کی عدالت سے فرار اختیار نہیں کرسکتا اور وہ حکیم بھی ہے، خلاف عدالت کوئی حکم اور فیصلہ صادر نہیں کرتا۔

(۲۱۰) هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۧ	کیا (شیطان کے پیروکار) یہ لوگ (ان تمام نشانیوں اور واضح پروگراموں کے بعد) پھر بھی منتظر ہیں کہ خدا اور فرشتے بادل کے سائے میں ان کے پاس آئیں اور تمام چیزیں انجام پاچکی ہیں اور تمام معاملات کی بازگشت خدا کی طرف ہے۔

تفسیر

یہ آیت اگرچہ قرآن کی پیچیدہ آیات میں سے نظر آتی ہے لیکن آیت کی تعبیرات میں دقّت نظر اور غور وخوض سے ابہام دور ہوجاتا ہے۔ اس آیت میں صدائے سخن پیغمبر ﷺ کی طرف ہے۔ گذشتہ بحث کے بعد خداوند عالم فرماتا ہے کیا یہ سب نشانیاں اور واضح دلائل انسان کو لغزش سے بچانے اور عدو مبین (شیطان) کے چنگل سے نجات دلانے کے لئے کافی نہیں ہیں؟

کیا وہ منتظر ہیں کہ خداوند عالم فرشتوں کی ہمراہی میں سایہ فگن بادلوں کی اوٹ میں ان کی طرف آئے اور انہیں زیادہ واضح دلائل پیش کرے؟ ایسا ہونا تو محال ہے کیونکہ خدا جسم نہیں ہے اور بفرض محال ایسا ہو بھی تو اس کی ضرورت کیا ہے جب کہ تمام چیزیں انجام پاچکی ہیں اور کوئی فروگذاشت واقع نہیں ہوئی (وقضی الامر) اور تمام چیزوں کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور سب امور کا سر انجام وہی ہے۔

(۲۱۱)سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کَمْ اٰتَیْنٰھُمْ مِّنْ اٰیَةٍۢ بَیِّنَةٍ ؕ وَ مَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ	بنی اسرائیل سے پوچھ لو، ہم نے انہیں کیسی واضح نشانیاں دی تھیں لیکن انہوں نے خدا کی عطا کردہ مادی ومعنوی نعمتوں کو غلط طور پر صرف کیا) اور جو شخص اللہ کی نعمت پا کر اسے تبدیل کردے (اور اسے غلط امور میں صرف کرے وہ خدا کے شدید عذاب میں گرفتار ہوگا کہ) خدا شدید العقاب ہے۔

تفسیر

یہ آیت بنی اسرائیل کی روش اور طور وطریقوں کے بارے میں ہے کہ وہ واضح آیات اور نعمات الٰہی کے حصول کے بعد کیسے انہیں بدل دیتے تھے۔ کفران نعمت کرتے تھے اور نتیجے کے طور پر وہ عذاب میں گرفتار ہوگئے۔

نعمت کی تبدیلی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے پاس موجود وسائل، توانائیاں اور مادی ومعنوی صلاحیتیں تخریبی اور انحرافی راستوں، گناہ اور ظلم وستم میں استعمال کرے۔ خداوند عالم نے بنی اسرائیل کو روحانی مربی بھی عطا فرمائے۔ ان میں سے طاقتور سربراہ بنائے اور ہر قسم کے مادی ومعنوی اسباب ان کے تصرف میں دیئے لیکن وہ نعمت کی تبدیلی میں گرفتار ہوگئے۔ اسی سے ان کی زندگی تباہ و برباد ہوگئی اور قیامت میں بھی دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔

نعمت کی تبدیلی کا مسئلہ بنی اسرائیل میں منحصر نہیں۔ اس زمانے میں بھی دنیائے صنعت اس عظیم بدبختی میں مبتلا ہے کیونکہ انسان کے اختیار میں اگرچہ آج بہت سی نعمتیں اور توانائیاں ہیں جو تاریخ کے کسی دور میں بھی انسان کو نصیب نہیں ہوئیں لیکن انبیاء و مرسلین کی آسمانی تعلیمات سے دوری کی وجہ سے وہ تبدیلی نعمت کے عمل میں گرفتار ہے اور ان ہی نعمتوں کو وحشت ناک حد تک اپنی فنا اور نابودی کی راہ میں صرف کررہا ہے۔

''سل بنی اسرآئیل''۔ یہ جملہ حقیقت میں اس لئے ہے کہ ان سے نعمات الٰہی کا اعتراف کروایا جائے اور اس کے بعد انہیں پوچھا جائے کہ ان وسائل وذرائع کے باوجود ایسا روز سیاہ تمہیں کیوں نصیب ہوا اور کیوں آج تم دنیا میں پراگندہ ومنتشر ہو۔

(۲۱۲)زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَ یَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ وَ اللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ	دنیاوی زندگی کو کافروں کے لئے مزیّن کیا گیا ہے (لہٰذا) وہ صاحب ایمان لوگوں کا تمسخر اڑاتے ہیں حالانکہ اہل ایمان قیامت میں ان سے بالاتر ہوں گے۔ اور خدا جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے روزی دیتا ہے۔

شان نزول

مشہور اسلامی مفسر ابن عباس کہتے ہیں کہ یہ آیت اشراف اور روسائے قریش کے ایک مختصر گروہ کے بارے میں

میں نازل ہوئی کہ جن کی زندگی بہت شاہ خرچ اور خوشحال تھی۔ وہ صدر اوّل کے ثابت قدم عمار اور بلال جیسے مومنین کو تمسخر اڑاتے تھے کیونکہ وہ مادی لحاظ سے فقیر اور تہی دست تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر پیغمبر ﷺ کی کوئی شخصیت ہوتی اور وہ خدا کی طرف سے مبعوث ہوتے تو اشراف اور بڑے لوگ ان کی پیروی کرتے۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں ان کی بے بنیاد باتوں کا جواب دیا گیا ہے۔

تفسیر

مذکورہ بالا شان نزول کے مطابق آیت قریش کے خودخواہ اور دنیا پرست اشراف کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن یہ امر اس سے مانع نہیں کہ یہ گذشتہ آیت کی بحث کی تکمیل کرتی ہے جو یہودیوں کے بارے میں تھی نیز یہ اس سے بھی مانع نہیں کہ یہ ایک کلّیہ قاعدہ کے طور پر ہے اور ایک عمومی حکم جو سب کے لئے ہے بیان کرتی ہے۔ اس کا عمومی مفہوم یہ ہے کہ کافروں کی نگاہ کا افق مادی دنیا کی چار دیواری سے بالاتر نہیں ہے اس لئے ان کے لئے مادی زندگی بہت دلپذیر، خوبصورت اور زیبا ہے اور یہی زندگی ان کے نزدیک تمام قدروں کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کے لئے ایک مقیاس و میزان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پسماندہ، بیمار اور علیل فکر کے مطابق دولت و ثروت سے تہی دست افراد کی کوئی حیثیت و شخصیت نہ تھی لہٰذا وہ ان کا مذاق اڑاتے اور ان سے تمسخر کرتے تھے۔ معنوی و انسانی اقدار ان کی نظر میں ہیچ تھیں حالانکہ ان دو طرح کی اقدار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان کی کوتاہ نظر ان بلندیوں اور زیبائشوں کو دیکھنے کی قدرت نہ رکھتی تھی۔ ان کے جواب میں قرآن دو نکات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

1۔ دوسرے جہان میں جہاں معنوی اور روحانی حقائق اور کمالات اپنی اصلی اور حقیقی صورت اختیار کر لیں گے وہاں مومنین ان سے بلند درجات پر فائز ہوں گے کیونکہ یہ زمین کی تہوں میں چل رہے ہوں گے اور وہ آسمان کے اوپر ہوں گے۔

2۔ علاوہ ازیں مادی فوائد سے لطف اندوز ہونا کسی کی منزلت کی نشانی اور ایمانی قدر و قیمت کی علامت نہیں ہے کیونکہ اس جہاں میں روزی کی تقسیم کفر و ایمان اور معنوی و انسانی اقدار کی بنیاد پر نہیں ہے۔

(۲۱۳) كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۠ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۠ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ	(ابتداء میں) لوگوں کا ایک ہی گروہ تھا (اور ان کے درمیان کوئی تضاد نہ تھا۔ رفتہ رفتہ گروہ اور طبقات پیدا ہوتے گئے) پھر ان میں اختلافات (اور تضادات) وجود میں آئے۔ خدا نے انبیاء کو بھیجا تا کہ وہ لوگوں کو بشارت دیں اور ڈرائیں نیز ان پر آسمانی کتاب بھی نازل کی جو انہیں حق کی طرف دعوت دیتی تھی، یہ کتاب لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کرنے کے لئے تھی (ایمان والوں نے تو اس سے اختلاف نہیں کیا)

فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ	صرف ایک گروہ نے حق سے انحراف اور ستمگری کرتے ہوئے اس سے اختلاف کیا جب کہ انہیں کتاب دی گئی تھی اور واضح نشانیاں ان تک پہنچ چکی تھیں۔ جو لوگ ایمان لا چکے تھے خدا نے اختلافی چیز میں اپنے حکم سے ان کی رہبری کی (لیکن بے ایمان لوگ اسی طرح گمراہی اور اختلاف میں باقی رہے) اور خدا جسے چاہتا ہے راہ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

تفسیر

ابتداء میں انسان کی زندگی اور معاشرہ سادہ تھا۔ رفتہ رفتہ جب انسانوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ منافع کا تضاد ابھرا اور اختلافات پیدا ہونے لگے۔ یہ مقام وہ تھا کہ راہنما اور قانون کی ضرورت پیدا ہوئی۔ سب سے پہلے ضروری تھا کہ خدا کے بھیجے ہوئے نمائندے لوگوں کو دوسرے جہان کی زندگی کی طرف متوجہ کریں جو سیر تکامل اور سفر ارتقاء کا آخری مرحلہ ہے۔ ضروری تھا کہ وہ انہیں متنبہ کریں کہ موت کے بعد ایک اور جہان ہے جس میں لوگ اپنے کردار کی جزا و سزا سے دوچار ہوں گے۔ انبیا کرام اس ذریعے سے اور ثواب کی بشارت اور بدکاروں کو عذاب سے ڈرانے کے طریقے سے لوگوں کو احکام الٰہی کی طرف راغب کرتے تھے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں انسان محسوس کرتا ہے کہ اسے ایسے صحیح قوانین کی ضرورت ہے جو اس کی سعادت کا سبب بنیں۔ اسی لئے خداوند عالم نے انبیاء کے پاس سعادت بخش قوانین بھیجے تا کہ وہ لوگوں کے اختلافات کو ختم کریں۔ درحقیقت زیر نظر آیت ان مراحل کو بیان کرتی ہے جو انبیاء کی بعثت اور آسمانی احکام کے نزول پر منتہی ہوتے ہیں۔

پہلا مرحلہ: یہ مرحلہ ابتدائی سادہ زندگی پر مشتمل ہے جب انسان اجتماعی زندگی کا عادی نہ ہوا تھا اور فطرتاً تضاد اور تصادم وقوع پذیر نہ ہوتا تھا۔ قانون فطرت کے مطابق خدا کی پرستش ہوتی تھی اور اس کے آسان و سادہ فرائض اس کی بارگاہ میں انجام دئے جاتے تھے۔

دوسرا مرحلہ: یہ وہ مرحلہ ہے جب انسانی زندگی اجتماعی شکل اختیار کر لیتی ہے اور ایسا ہی ہونا چاہئے تھا کیونکہ انسان تکامل و ارتقاء کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اس تکامل کے لئے اجتماعی و معاشرتی زندگی ناگزیر ہے۔

تیسرا مرحلہ: یہ تضاد و تصادم کا مرحلہ ہے اور معاشرتی زندگی میں اس سے بچا نہیں جا سکتا۔ اختلافات پیدا ہوتے ہیں اور نوع انسانی کے لئے انبیاء کے قوانین اور تعلیمات کی تشنگی محسوس ہوتی ہے۔

چوتھا مرحلہ: اس مرحلے میں انبیاء خدا کی طرف سے نجات بشر کے لئے مامور کئے جاتے ہیں۔ افکار اور قلوب کو آمادہ کرنے کے لئے سب سے پہلے بشارت و نذارت کا پروگرام پیش کیا جاتا ہے (یہ نیکوکاروں کو جزا کی بشارت اور بدکاروں کو سزا

سے ڈرانے کا پروگرام ہے)حب ذات اور خود پرستی کے زیر سایہ جب انسان نے بشارت اور نذارت کا پروگرام تسلیم کرلیا اور اس نے محسوس کرلیا کہ انبیاء کے پاس ایسی تعلیم ہے جو انسانی سرنوشت سے براہ راست مربوط ہے تو آسمانی کتب، احکام اور قوانین نازل ہونا شروع ہوئے تا کہ تضادات اور مختلف کشمکشیں (جو فکری، اجتماعی، اخلاقی اور نظریاتی بنیادوں پر تھیں) ختم ہو جائیں۔

''وَ مَا اخْتَلَفَ فِیْهِ اِلَّا الَّذِیْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ''

یہ جملہ دراصل تعلیمات انبیاء کے آغاز کے بعد کے مرحلے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس میں اس اعتراض کا جواب ہے کہ اگر انبیاء فکری، اجتماعی اور عقائد کے اختلافات کے حل کے لئے آتے ہیں تو ان کے آجانے کے بعد بھی کم وبیش اختلافات کیوں باقی رہتے ہیں۔

آیت کہتی ہے کہ موجودہ اختلاف اور پہلے تضاد میں فرق ہے۔ پہلے اختلافات کا سرچشمہ جہالت، نادانی اور بے خبری تھی اور یہ وجہ بعثت انبیاء سے ختم ہوگئی۔ لیکن بعدازاں اختلافات کی بنیاد دیگر چیزیں مثلاً ''بغی'' یعنی ظلم وستم، ہٹ دھرمی وغیرہ بن گئیں جن کی وجہ سے بعض لوگوں نے اختلافی راہ پر اپنے سفر کو جاری رکھا۔

یہاں آکر لوگ دو مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔

مومنین .... جو ہدایت اور حق کی راہ پر چل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنے اختلافات کو ختم کر دیا۔ انہوں نے بحکم خدا صراط مستقیم کو طے کرلیا۔ لیکن............

کفار ۔۔۔۔۔ جوں کے توں اپنے اختلافات میں باقی ہیں۔

'' وَ اللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ '' یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی مشیت نیک اعمال اور لوگوں کی پاکیزگی کے مطابق ہے یعنی جو افراد حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں خدا بھی انہیں راہ راست کی ہدایت کرتا ہے۔ ان کی روشن فکری اور راہ راست کو پالینے کی توفیق میں اضافہ کرتا ہے اور انہیں انبیاء کی وساطت سے راہ نجات اور راہ راست دکھاتا ہے۔

(۲۱۴) اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا یَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ	کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں جاؤ گے اور تمہیں وہ حوادث پیش نہیں آئیں گے جو گذشتہ لوگوں کو درپیش ہوئے۔ وہی لوگ جنہیں دشواریاں اور تکلیفیں درپیش ہوئیں اور وہ ایسے دکھ درد میں مبتلا ہوئے کہ پیغمبر اور ان کے ساتھ اہل ایمان کہنے لگے خدا کی مدد کہاں ہے؟ آگاہ رہو کہ خدا کی مدد قریب ہی ہے۔

شان نزول

بعض مفسرین کہتے ہیں جنگ احزاب میں جب مسلمانوں پر ڈر اور شدید خوف غالب آیا اور وہ محاصرے میں آ

گئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔اس میں انہیں صبر واستقامت کی دعوت دی گئی اور نصرت و مدد کا وعدہ کیا گیا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ جنگ احد میں جب مسلمان شکست کھا گئے تو عبداللہ ابن ابی نے ان سے کہا کہ کب تک اپنے آپ کو قتل کرواتے رہو گے اگر محمد ﷺ پیغمبر ہوتا تو خدا اس کے اصحاب وانصار کو قید و بند اور قتل میں گرفتار نہ کرتا۔اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

سخت حوادث خدائی سنت ہیں

مندرجہ بالا آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مومنین کا ایک گروہ یہ سمجھتا تھا کہ جنت میں داخل ہونے کا حقیقی عامل اور سبب یہ ہے کہ خدا پر ایمان کا صرف اظہار کر دیا جائے اور اس کے بعد انہیں کسی قسم کی تکلیف، زحمت اور رنج والم اٹھانے کی ضرورت نہیں، ان کی کوششوں کے بغیر ہی خدا ان کے امور کو راہ پر ڈال دے گا اور ان کے دشمنوں کو نابود کر دے گا۔

اس غلط طرز فکر کے مقابلے میں قرآن حقیقی سنت اور خدا کی دائمی روش کی طرف اشارہ کرتا ہے۔قرآن کے مطابق تمام مومنین کو راہ ایمان میں پیش رفت کے لئے مشکلات اور تکالیف کا استقبال کرنا پڑے گا۔اس راہ میں فدا کاری کرنا پڑے گی۔ یہ مشکلات تو دراصل آزمائش اور امتحان ہیں۔ان کے ذریعے حقیقی اور غیر حقیقی ایمان میں امتیاز پیدا ہوتا ہے۔قرآن اس حقیقت کی بھی تصریح کرتا ہے کہ یہ آزمائشیں اور مشکلات عمومی قوانین کے تحت ہیں اسی بناء پر گذشتہ امتیں بھی ان سے دوچار ہوئیں ان کی بھی آزمائشیں کی گئیں۔

گویا یہ ایک سنت الٰہی ہے جو تکامل، ارتقاء اور تربیت کی ایک رمز ہے۔تمام امتوں کو حوادث کی سخت بھٹیوں میں ڈالا جانا چاہئے، انہیں پگھل کر فولاد کی طرح بھٹی سے باہر آنا چاہئے اور پھر زیادہ اہم اور سخت تر حوادث سے دوچار ہونے کے لئے تیار رہنا چاہئے تاکہ زیادہ قابل افراد پہچانے جاسکیں اور نااہل لوگ الگ ہو جائیں اس طرح تصفیہ وتطہیر ہو جائے۔

دوسرا نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ دی جانا چاہئے وہ یہ ہے کہ آیت کے مطابق گذشتہ امتوں کو شدائد اور مشکلات اس طرح گھیر لیتی تھیں کہ اہل ایمان اور انبیاء ہم صدا ہو کر کہتے تھے: خدا کی مدد کہاں ہے؟ واضح ہے کہ ان کی مراد بارگاہ قدرت پر اعتراض کرنا نہ تھی بلکہ یہ تعبیر خود ایک قسم کی دعا اور تقاضا ہے۔

(۲۱۵)يَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا يُنفِقُوْنَ ۖ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۗ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ	تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ کہہ دو کہ ہر خیر و نیکی (اور فائدہ بخش مادی و معنوی سرمایہ) جو تم خرچ کرتے ہو وہ ماں باپ، قریبیوں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہونا چاہئے اور جو کار خیر بھی تم کرتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

شان نزول

عمرو بن جموح ایک بوڑھا رئیس اور دولت مند تھا۔ اس نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ کس چیز سے اور کس کس کو صدقہ دوں۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

قرآن مجید میں بہت سی آیات راہ خدا میں خرچ کرنے کے بارے میں آئی ہیں۔ پروردگار عالم مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو خرچ کرنے اور محتاج و بے نوا لوگوں کی مدد کرنے کا شوق دلاتا ہے لیکن محل بحث آیت کی وضع کچھ اور ہی ہے۔ بعض افراد چاہتے تھے کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ کس قسم کا مال خرچ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں؟

جواب میں اس سوال کی وضاحت کے علاوہ ایک اور اہم مسئلہ کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے اور وہ ہے مواقع اور اشخاص جن پر خرچ کرنا چاہئے۔ آیت کی شان نزول سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں مسئلے (کیا کچھ خرچ کریں اور کن کن پر خرچ کریں) محل سوال تھے۔

پہلے معاملے کے ذیل میں خرچ کرنے کے لئے ''خیر'' کا لفظ استعمال کر کے سوال کا ایک کامل، جامع اور وسیع جواب دیا گیا ہے۔ یعنی ہر قسم کا کام، سرمایہ اور موضوع جو خیر ہو اور لوگوں کے لئے سودمند ہو، خرچ کرنے کے قابل ہے۔ اس میں ہر طرح کا مادی و معنوی سرمایہ شامل ہے۔

سوال کے دوسرے رخ کے ضمن میں یعنی کن کن پر خرچ کیا جائے فرمایا گیا ہے کہ سب سے پہلے نزدیکی رشتے داروں پر اور ان سے بھی پہلے ماں باپ پر خرچ کیا جائے۔ اس کے بعد یتیم، مساکین اور ابنائے سبیل (وہ مسافر جو دوران سفر میں اپنا زاد راہ خرچ کر بیٹھے ہوں) پر خرچ کیا جائے۔ واضح ہے کہ نزدیکی رشتے داروں پر خرچ کرنا دیگر آثار کے علاوہ صلہ رحمی اور رشتے ناتوں کے استحکام کا بھی باعث بنتا ہے۔

''وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ''

(جو کار خیر بھی تم کرتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے)۔

یہ جملہ تو گویا اس مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ خرچ کرنے والے اس بات پر اصرار نہ کریں کہ لوگ ان کا کام جان لیں۔ کیا ہی عمدہ ہے کہ زیادہ خلوص کی بناء پر اپنی عنایات اور عطیات کو پنہاں رکھیں کیونکہ وہ ذات جو بدلہ اور ثواب دے گی ان سب چیزوں سے آگاہ ہے۔ اسی کے ہاتھ میں جزا ہے اور اسی کے پاس سب کا حساب ہے۔

(۲۱۶) كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَ هُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَ عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ عَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۠	راہ خدا میں جہاد کرنا تم پر فرض کیا جا چکا ہے جب کہ تم اس سے اکراہ کرتے ہو اور اسے ناپسند کرتے ہو جب کہ اسی میں تمہاری بھلائی ہوتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تم جسے پسند کرتے ہو اس میں تمہاری برائی ہوتی ہے اور خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

تفسیر

گذشتہ آیت انفاق اور خرچ کے بارے میں تھی اور یہ آیت خون اور اور جان کی قربانی پیش کرنے کے بارے میں ہے فداکاری کے میدان میں یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے دوش بدوش ہیں۔

آیت بیان کرتی ہے کہ دشمن سے جنگ کرنا تمہارے لئے حکماً ضروری ہے۔ اس عمل کا بجالانا تمہارے لئے لکھ دیا گیا ہے لیکن انسان کو فطری طور پر سختی کے مواقع پر تکلیف ہوتی ہے اور وہ شدائد اور مشکلات کو پسند نہیں کرتا۔ اس کی رغبت، خوشی اور راحت و آرام کی طرف زیادہ ہوتی ہے۔

''وَ عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ''

یہ جملہ اسی انسانی مزاج کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ دشمن سے جنگ اور نبرد آزمائی کا نتیجہ موت، جسمانی تکلیف اور مالی نقصان ہوتا ہے۔ جنگ بدامنی اور بے آرامی کا باعث بنتی ہے اس لئے اصولی طور پر انسان کی نظر میں یہ سخت اور ناپسندیدہ ہے۔ لیکن ہمیشہ کچھ ایسے فداکار ضرور ہوتے ہیں جو مقدس مقاصد کے لئے کسی قسم کی جان کی بازی سے دریغ نہیں کرتے لیکن اکثر لوگ مذکورہ وجوہات کی بنا پر جہاد کو پسند نہیں کرتے پروردگار عالم قطعی لب و لہجہ میں اس طرز فکر کی مذمت کرتا ہے۔

خدا تعالیٰ ان کے سامنے ایک دریچۂ نہاں کھولتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم کاموں کے مصالح سے باخبر نہیں ہو۔ تمہیں یہ کیسے پتہ چلا کہ تمہاری پسندیدہ چیز کے پیچھے شر اور تمہاری ناپسندیدہ چیز کے پیچھے خیر نہیں ہے۔ خدا ہی اسرار مخفی سے آشنا ہے۔ البتہ مسلّم ہے کہ محققی اور زیرک لوگ (نہ کہ سطحی نظر رکھنے والے) ان احکام کے بعض اسرار سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ یہ آیت خدا کے تکوینی اور تشریعی قوانین کی ایک بنیاد کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

ان قوانین کے پیش نظر یہ آیت انسان میں انضباط اور تسلیم کی روح کی پرورش کرتی ہے۔ آیت کے مطابق انہیں یہ نہیں

چاہیئے کہ انسان اپنی تشخیص و دریافت کا دارومدار قضاوت اور فیصلے پر رکھے۔ یہ مسلم ہے کہ انسان کا علم ہر لحاظ سے محدود اور ناچیز ہے۔ انسانی مجہولات کے مقابلے میں انسانی علم دریا کے سامنے قطرے کی طرح ہے۔ اس لئے وہ قوانین جن کا سرچشمہ علم الٰہی ہے اور جو ہر لحاظ سے لامتناہی ہے انسان کو اس سے کبھی روگردانی نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ انسان کو جان لینا چاہیئے کہ یہ تمام قوانین اس کے فائدے اور منفعت کے لئے ہیں چاہے وہ تشریعی قوانین و احکام ہوں جیسے جہاد اور زکوٰۃ وغیرہ یا تکوینی ہوں جو بلا اختیار زندگی میں رونما ہوتے ہیں اور ان سے بچنا ممکن نہیں جیسے موت، دوستوں اور عزیزوں کی مصیبت یا آئندہ کے اسرار کا انسان سے مخفی ہونا وغیرہ۔

(۲۱۷)يَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الشَّهۡرِ الۡحَرَامِ قِتَالٍ فِيۡهِ ؕ قُلۡ قِتَالٌ فِيۡهِ کَبِيۡرٌ ؕ وَ صَدٌّ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَكُفۡرٌۢ بِهٖ وَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ۚ وَ اِخۡرَاجُ اَهۡلِهٖ مِنۡهُ اَکۡبَرُ عِنۡدَ اللّٰهِ ۚ وَ الۡفِتۡنَةُ اَکۡبَرُ مِنَ الۡقَتۡلِ ؕ وَ لَا يَزَالُوۡنَ يُقَاتِلُوۡنَکُمۡ حَتّٰى يَرُدُّوۡکُمۡ عَنۡ دِيۡنِکُمۡ اِنِ اسۡتَطَاعُوۡا ؕ وَ مَنۡ يَّرۡتَدِدۡ مِنۡکُمۡ عَنۡ دِيۡنِهٖ فَيَمُتۡ وَ هُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فِى الدُّنۡيَا وَ الۡاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ	ماہ حرام میں جنگ کرنے کے بارے میں تم سے سوال کیا جاتا ہے۔ کہیئے کہ اس میں جنگ کرنا بڑا (گناہ) ہے۔ لیکن راہ خدا اور دین حق سے لوگوں کو روکنا، اللہ سے کفر اختیار کرنا، مسجد الحرام کی بے حرمتی کرنا اور اس میں رہنے والوں کو نکال دینا خدا کے نزدیک اس سے بھی بڑھ کے بُرا ہے اور فتنہ برپا کرنا قتل سے بد تر ہے مشرکین تم سے ہمیشہ لڑتے ہی رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کے بس میں ہو تو تمہیں دین سے برگشتہ کر دیں لیکن جو شخص دین سے پھر جائے اور حالت کفر میں مر جائے اس کے (گذشتہ) تمام نیک اعمال دنیا و آخرت میں برباد ہو جائیں گے اور یہی اہل دوزخ ہیں اور اس میں سدا رہیں گے۔
(۲۱۸)اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِيۡنَ هَاجَرُوۡا وَ جٰهَدُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِکَ يَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ	جو ایمان لے آئے ہیں، جنہوں نے ہجرت کی ہے اور راہ خدا میں جہاد کیا ہے وہی رحمت خداوندی کے امیدوار ہیں اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

شان نزول

کہتے ہیں یہ آیت عبداللہ بن جحش کے سریہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ واقعہ کچھ یوں ہے:

جنگ بدر سے پہلے پیغمبر اسلام ﷺ نے عبداللہ بن جحش کو بلایا۔ اسے ایک خط دیا اور مہاجرین میں سے آٹھ آدمی اس کے ساتھ کئے۔ اسے حکم دیا کہ دو دن راستہ چلنے کے بعد خط کھولنا اور اس کے مطابق عمل کرنا۔ اس نے دو دن کے سفر کے بعد خط کھولا تو اس میں لکھا تھا۔

جب خط کھولو تو نخلہ (مکہ اور طائف کے درمیان ایک جگہ) تک آگے جانا۔ وہاں قریش کے حالات پر نظر رکھنا اور جو کچھ صورت حال ہو ہمیں اس کی اطلاع دینا۔

عبداللہ نے اپنے ساتھیوں سے واقعہ بیان کیا اور مزید کہا کہ پیغمبر ﷺ نے راہ پر چلنے کے لئے تمہیں مجبور کرنے سے منع کیا ہے اس لئے جو شہادت کے لئے تیار ہے وہ میرے ساتھ آئے۔ دوسرے لوگ واپس چلے جائیں۔ سب اس کے ساتھ چل پڑے۔ جب وہ نخلہ پہنچے تو قریش کے ایک قافلے کا سامنا ہوا۔ اس میں عمرو بن حضرمی بھی تھا۔ ماہ رجب (جو ماہ حرام ہے) کا چونکہ آخری دن تھا اس لئے ان پر حملہ کرنے کے سلسلے میں انہوں نے آپس میں مشورہ کیا۔

بعض کہنے لگے کہ اگر آج ہم ان سے دستبردار رہے تو وہ حدود حرم میں داخل ہو جائیں گے اور پھر ہم ان سے تعرض نہیں کر سکیں گے۔ بالآخر انہوں نے ان پر بڑی بہادری سے حملہ کر دیا۔ عمرو بن حضرمی کو قتل کیا اور قافلہ دو قیدیوں کے ساتھ پیغمبر ﷺ کی خدمت میں لے آئے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا میں نے تمہیں یہ حکم تو نہیں دیا تھا کہ حرام مہینوں میں جنگ کرو۔ آپ ﷺ نے مال غنیمت اور قیدیوں میں کوئی تصرف نہ کیا۔ مجاہدین کو بڑا رنج ہوا۔ دیگر مسلمانوں نے بھی انہیں سرزنش کی۔ مشرکوں نے بھی زبان طعن کھولی اور کہنے لگے کہ محمد ﷺ نے حرام مہینوں میں جنگ، خون ریزی اور قید و بند کو حلال شمار کیا ہے۔

اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ جب یہ آیت نازل ہو چکی تو عبداللہ بن جحش اور اس کے ساتھیوں نے یہ اظہار کیا کہ انہوں نے اس راستے میں جہاد کا ثواب حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے پیغمبر ﷺ سے پوچھا کہ کیا انہیں مجاہدین کا اجر ملے گا؟ اس پر دوسری آیت نازل ہوئی۔(انّ الّذین اٰمنوا و الّذین ھاجرو........)۔

تفسیر

جیسا کہ شان نزول سے ظاہر ہے یہ آیت حرام مہینوں میں جہاد کے بارے میں سوالات کا جواب ہے۔ قرآن صراحت سے حرام مہینوں میں حرمت جنگ کی خبر دیتا ہے اور اسے بہت بڑا گناہ شمار کرتا ہے (قل قتال فیه کبیر) لیکن قرآن تاکید کرتا ہے کہ (وہ) مسلمان دستہ (جس نے اشتباہ سے حرام مہینے میں جنگ کی) پر اعتراض کا حق ان مشرکین کو نہیں پہنچتا جو ایسے بڑے بڑے گناہوں سے آلودہ ہیں جیسے خدا سے کفر کرنا، راہ راست کی ہدایت سے لوگوں کو روکنا، مکہ میں ٹھہرے ہوئے اور سکونت پذیر افراد کو وہاں سے نکال دینا اور خدا کے حرم امن کے احترام کو پاؤں تلے روندنا جب کہ وہاں حیوانات اور گھاس تک کو محفوظ رہنا چاہئے۔

علاوہ ازیں مشرکین فتنہ برپا کرتے ہیں یعنی فاسد ماحول پیدا کرنے کے درپے ہیں جس میں کفر اور بت پرستی کی آمیزش ہے وہ حقیقت کے متلاشی لوگوں پر دباؤ ڈال کر انہیں دین توحید کی طرف راغب ہونے سے روکنے کا گناہ کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل ماہ حرام میں جنگ کرنے سے بڑھ کر ہے۔

اس کے بعد قرآن کا روئے سخن مسلمانوں کی طرف ہے۔ مسلمانوں کو مشرکوں کے پراپیگنڈا سے بچانے کے لئے قرآن

انہیں متنبہ کرتا ہے کہ مشرک تو ہمیشہ اس کے درپے ہیں کہ اگر ہو سکے تو تمہیں دین اسلام سے پھیر لے جائیں۔اس سلسلے میں پیش بندی کے طور پر قرآن الارم دیتا ہے کہ جو مسلمان دین حق سے پھر گیا اور حالت کفر میں جا مرا، کفر کے سبب اس کے تمام نیک اعمال کا اجر اس جہان میں اور اس جہان میں باطل ہو جائے گا۔کفران اعمال کو ختم کر دے گا اور انکی خاصیت کو بدل دے گا۔اس بنا پر ایسا شخص ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عذاب الٰہی میں مبتلا رہے گا۔

(۲۱۸) زیر نظر آخری آیت میں اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ ممکن ہے بعض مجاہدین راہ خدا مطلع نہ ہونے کی بنا پر یا کافی احتیاط نہ کرنے کی وجہ سے اشتباہات کے مرتکب ہوں۔عبداللہ بن جحش کا واقعہ اس کی نظیر ہے لیکن خدا ان کی بڑی خدمات اور صحیح مجاہدات کی بناء پر انہیں بخش دے گا۔

(۲۱۹) يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۙ	تم سے شراب اور قمار بازی کے متعلق سوال کرتے ہیں۔کہہ دو کہ ان میں بہت بڑا گناہ ہے (مادی نگاہ سے) لوگوں کے لئے ان میں منافع (بھی) ہیں (لیکن) ان کا گناہ ان کے نفع سے زیادہ ہے اور تم سے سوال کرتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں۔کہہ دو کہ تمہاری ضرورت سے جو زیادہ ہو۔اس طرح خدا تمہارے لئے آیات کو واضح کرتا ہے شاید تم فکر کرو۔

شان نزول

اصحاب کا ایک گروہ پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔عرض کرنے لگا کہ شراب اور قمار کے بارے میں حکم بیان فرمائیے کیونکہ یہ عقل کو زائل اور مال کو تباہ کرنے والی چیزیں ہیں۔اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

خمر کا معنی ہے ''ڈھکنا''۔ ہر وہ چیز جو دوسری کو چھپا دے اور مخفی کرے اسے خمار کہتے ہیں۔اصطلاح شریعت میں ہر بہنے والی مسکر (مست کرنے والی) چیز کو خمر کہتے ہیں، چاہے وہ انگور سے لی جائے یا کشمش اور کھجور سے۔ بلکہ ہر قسم کا الکحل مشروب اس کے مفہوم میں شامل ہے۔البتہ لفظ خمر کا استعمال مائعات مسکر (یعنی بہنے والی نشہ آور چیزوں) پر اس کے لغوی معنی کی مناسبت سے ہوتا ہے کیونکہ نشہ آور مائعات عقل پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور اچھے برے کی تمیز ختم کر دیتی ہیں۔

''میسر'' کا مادہ ہے ''یسر'' اس کا معنی ہے سہل و آسان اور قمار بازی، بظاہر لگتا ہے کہ اس کا حقیقی معنی سہل اور آسان ہی ہے اور چونکہ قمار باز شخص چاہتا ہے کہ مال و ثروت آسانی سے حاصل کر لے اس بناء پر قمار کو بھی میسر کہا جاتا ہے۔

''قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ .....''

خداوند کریم نے آیت کے اس حصے میں حرمت شراب کے حکم کو نرمی اور مدارات کی آمیزش سے بیان فرمایا ہے۔ خدا اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ ان کے جواب میں کہو یہ دونوں بڑے گناہ ہیں اگر چہ ان میں لوگوں کے لئے منفعت بھی ہے لیکن ان کا فائدہ ان کے نقصان کی نسبت بہت ہی کم ہے اور کوئی عقلمند شخص تھوڑے سے نفع کے لئے اتنا بڑا نقصان اٹھانا گوارا نہیں کرسکتا۔

عفو سے کیا مراد ہے؟

عفو کے لغت میں کئی معانی بیان کئے گئے ہیں۔

------''بخشش وعنایت''

------''اثر زائل کرنا''

------''کسی چیز کو پکڑنے کا ارادہ''

------''ہر چیز کا وسط اور درمیان''

------''کسی چیز کی اضافی مقدار''

اور------''مال کا بہترین حصہ'' یہ سب عفو کے مختلف معنی ہیں۔

تین پہلے معانی ظاہراً آیت کے مفہوم سے مناسبت نہیں رکھتے بلکہ آخری تین معانی میں سے یہاں کوئی اس کا مفہوم ہے یعنی خرچ کرنے میں حد اوسط اور اعتدال کا خیال رکھنا، یا اپنی ضروریات سے اضافی مقدار خرچ کرنا (یہ دونوں معانی ایک ہی مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں، کیونکہ اعتدال کو ملحوظ رکھنے کا معنی یہی ہے کہ اپنی ضرورت سے زیادہ مال خرچ کیا جائے اور اپنی زندگی کو تباہ نہ کیا جائے)۔

اگر آخری معنی مراد لیا جائے تو آیت کا مضمون یہ ہے:

''خرچ کرتے وقت گھٹیا اور بے قدر و قیمت مال کا انتخاب نہ کرو، بلکہ راہ خدا میں خرچ کرنے کے لئے اپنے مال کے بہترین حصے کا انتخاب کرو''۔

یہ معنی بھی پہلے دو معانی پر پوری طرح سے منطبق ہوتا ہے کیونکہ خرچ کرتے وقت حدّ وسط اور اعتدال کو بھی مدّ نظر رکھا جائے اور اچھے مال کا بھی انتخاب کیا جائے تو ان تمام معانی پر عمل ہوسکتا ہے۔

آیت میں ایک اور احتمال بھی ہے کہ عفو اسی پہلے معنی میں ہو یعنی مغفرت اور دوسروں کی لغزشوں سے درگزر کرنا۔ اگر چہ جہاں تک ہم نے دیکھا ہے یہ احتمال کسی مفسر نے بیان نہیں کیا۔ اس احتمال کے مطابق آیت کا مفہوم یوں ہوگا:

''کہہ دو کہ بہترین انفاق اور خرچ کرنا یہ ہے کہ عفو و درگزر کو خرچ کرو''۔

چند امور ایسے ہیں کہ جن کے پیش نظر اس احتمال کا درست ہونا کچھ بعید بھی نہیں مثلاً جزیرۃ العرب کی وضع و کیفیت خصوصاً اہل مدینہ کی دشمنی اور کینہ پروری کی قدیم عادت اور ان پست حالات اور افراد میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک عفو و درگزر کی

اہمیت۔

اور پھر یہ مفہوم ان کے سوال کے بھی منافی نہیں ہے۔انہوں نے مالی امور کے بارے میں سوال کیا تھا۔وہ بعض اوقات ایسی چیز کے بارے میں سوال کرتے تھے جس سے زیادہ ضروری چیز کے بارے میں انہیں پوچھنا چاہئے تھا تو قرآن سوال کے حوالے سے ان کی آمادگی اور پذیرائی سے استفادہ کرتے ہوئے جواب میں اس چیز کا تذکرہ کرتا ہے جو اہم تر ہوتی ہے یعنی ان کے سوال سے قطع نظر کرتے ہوئے زیادہ اہم بات بیان کرتا ہے۔

یہ نظر نواز انداز قرآن ہی سے مخصوص نہیں کیونکہ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص ہم سے ایک مسئلے کے بارے میں سوال کرتا ہے جب کہ وہ اس سے اہم مسائل بھولے ہوئے ہوتا ہے تو ہم بجائے اس کے کہ آسان اور سادہ سوال کا جواب دیں۔اس کی ضرورت کے اہم مسائل کو تفصیل سے بیان کر دیتے ہیں۔یہ فصاحت و بلاغت میں سے ایک فن ہے جو اپنی جگہ پر ثابت ہے۔

(۲۲۰)فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ؕ وَ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡیَتٰمٰی ؕ قُلۡ اِصۡلَاحٌ لَّہُمۡ خَیۡرٌ ؕ وَ اِنۡ تُخَالِطُوۡہُمۡ فَاِخۡوَانُکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ الۡمُفۡسِدَ مِنَ الۡمُصۡلِحِ ؕ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَاَعۡنَتَکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ	(تاکہ) دنیا و آخرت میں (فکر کرو) اور تم سے یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہہ دو کہ ان کے کام کی اصلاح کرنا بہتر ہے اور اگر اپنی زندگی کو ان کی زندگی میں ملا لو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں خدا مفسدین کو مصلحین میں سے پہچانتا ہے اور اگر خدا چاہے تو تمہیں زحمت و تکلیف میں ڈال دے کیونکہ وہ توانا اور حکیم ہے۔

شان نزول

تفسیر قمی میں امام صادق علیہ السلام اور تفسیر مجمع البیان میں ابن عباس سے منقول ہے کہ جب آیت

"و لا تقربوا مال الیتیم الاّ بالّتی ھی احسن." (یتیم کے مال کے نزدیک بھی نہ جانا۔مگر یہ کہ یہ اس کے حق میں بہتر ہو۔بنی اسرائیل۔۳۴)

اور آیت

"انّ الّذین یأ کلون اموال الیتامیٰ ظلما انمّا یأ کلون فی بطونھم نار اوسیصلون سعیراً." (جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں بس انگارے بھرتے ہیں اور عنقریب واصل جہنم ہوں گے۔نساء۔۱۰)

نازل ہوئیں کہ جن میں یتیموں کے مال و دولت کے قریب جانے سے منع کیا گیا ہے سوائے اس کے کہ ان کے لئے مفید ہو اور ان کا مال کھانے سے روکا گیا ہے تو جن کے گھروں میں یتیم تھے انہوں نے ان کی کفالت سے ہاتھ اٹھا لیا

اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے تو انہیں اپنے گھر ہی سے نکال دیا اور جنہوں نے ایسا نہ کیا ان کے گھر میں بھی یتیموں کی کیفیت نکالے جانے سے مختلف نہ تھی۔ان کے مال سے پکایا گیا کھانا اپنے کھانے سے نہ ملاتے ،ان کے لئے الگ کھانا پکتا،یتیم اپنے کمرے کے کونے میں الگ سے کھانا کھاتا،اس کا بچا ہوا کھانا پڑا رہتا تا کہ پھر بھوک لگنے پر اسی کو کھائے اور کھانا خراب ہوجاتا تو پھینک دیا جاتا۔

یہ سب اہتمام اس لئے کیا جاتا کہ کہیں مال یتیم کھانے کا جرم سرزد نہ ہو۔ یہ صورت حال سرپرستوں اور یتیموں دونوں کے لئے بہت مشکلات کا باعث تھی۔ان حالات میں متاثر افراد پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں اپنے احوال پیش کئے۔اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

قرآن مجید یتیموں کے سرپرستوں کو حکم دیتا ہے کہ یتیموں کی سرپرستی سے دست کش ہوجانا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا درست نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ان کی سرپرستی قبول کرلو اور ان کے کام انجام دو اور جو کام ان کے فائدے میں ہو اور جس میں ان کی اصلاح اور بہتری سمجھو،اسے انجام دو۔

اور اگر ان کی زندگی تمہاری زندگی سے مخلوط ہو تو ان سے ایک بھائی کا سا سلوک کرو۔ جب تمہارا مقصد ان کی بھلائی ہو تو ان کے مال اور کھانا تمہارے مال اور کھانے سے مل جائے تو کوئی اشکال نہیں۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے کہ خدا تمہاری نیتوں سے واقف ہے۔ بھلائی کا اظہار صحت عمل کی دلیل نہیں بلکہ حقیقت میں اصلاح طلب بنو۔تمہاری نیت یتیموں کی خدمت کرنا ہو۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے: خداوند عالم اگر چاہے تو تم پر معاملہ سخت کرسکتا ہے اور یتیموں کی سرپرستی کو لازمی قرار دینے کے باوجود تمہیں اپنے مال اور کھانے کو ان کے مال اور کھانے سے الگ رکھنے کا حکم دے سکتا ہے لیکن وہ قادر بھی ہے اور حکیم و دانا بھی ہے،کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے بندوں پر سخت گیری کرے۔

(۲۲۱)وَ لَا تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ حَتّٰى يُؤۡمِنَّ ؕ وَ لَاَمَةٌ مُّؤۡمِنَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكَةٍ وَّ لَوۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ ۚ وَ لَا تُنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَتّٰى يُؤۡمِنُوۡا ؕ وَ لَعَبۡدٌ مُّؤۡمِنٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكٍ وَّ لَوۡ اَعۡجَبَكُمۡ ؕ	مشرک اور بت پرست عورتیں جب تک ایمان نہ لے آئیں ان سے نکاح نہ کرو۔ ایماندار کنیزیں آزاد بت پرست عورت سے بہتر ہیں اگر چہ ان کی زیبائی تمہیں بھلی معلوم ہوتی ہو اور اپنی عورتیں بت پرست مردوں سے نہ بیاہو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک صاحب ایمان غلام ایک بت پرست مرد سے بہتر ہے اگر چہ وہ تمہیں اچھے لگے۔

اُولٰٓئِکَ یَدۡعُوۡنَ اِلَی النَّارِ ۚۖ وَ اللّٰہُ یَدۡعُوۡۤا اِلَی الۡجَنَّۃِ وَ الۡمَغۡفِرَۃِ بِاِذۡنِہٖ ۚ وَ یُبَیِّنُ اٰیٰتِہٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّہُمۡ یَتَذَکَّرُوۡنَ ؑ	وہ تو آگ کی دعوت دیتے ہیں جب کہ خدا جنت اور اپنے حکم کے ذریعے بخشش کی دعوت دیتا ہے اور اپنی آیات لوگوں کے لئے واضح کرتا ہے کہ شاید وہ یاد رکھیں۔

شان نزول

''مرثد'' جو ایک بہادر انسان تھا پیغمبر اکرم ﷺ نے اسے مدینے سے مکے کی طرف بھیجا اور حکم دیا کہ وہاں پر موجود مسلمانوں کی ایک جماعت کو ساتھ لے آئے۔ وہ فرمان پیغمبر ﷺ کی انجام دہی کے لئے مکّہ پہنچا۔ وہاں اس کی ملاقات ایک خوبصورت عورت ''عناق'' سے ہوگئی۔ اسے وہ زمانہ جاہلیت سے

پہچانتا تھا۔ اس عورت نے گذشتہ زمانے کی طرح اسے گناہ کی دعوت دی لیکن مرثد چونکہ مسلمان ہو چکا تھا، اس کی خواہش کو قبول نہ کرسکا۔ اس عورت نے نکاح کا تقاضا کیا تو مرثد نے کہا کہ یہ معاملہ پیغمبر اکرم ﷺ کی اجازت پر موقوف ہے۔ وہ اپنی ڈیوٹی ادا کر کے مدینے پلٹ آیا اور وہ واقعہ آنحضرت ﷺ کے گوش گزار کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں بیان کیا گیا ہے کہ مشرک اور بت پرست عورتیں مسلمانوں مردوں کی ہمسری اور تزویج کے لائق نہیں۔

تفسیر

مشرک عورت مسلمان مرد کی کفو اور بیوی بننے کے اہل نہیں اور بالفرض وہ بیوی بن جائے تو بچے اس کے خیالات اور صفات بھی وراثت میں حاصل کریں گے اور اسی کی گود میں تربیت پائیں گے (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) تو ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ برا ہی نکلے گا۔ لہٰذا قرآن اس آیت میں مشرک اور بت پرست عورتوں سے شادی کرنے سے منع کرتا ہے۔ اس سے قطع نظر ایک پہلو یہ بھی ہے مشرکین اسلام سے بیگانہ ہوتے ہیں اگر وہ شادی کے ذریعے مسلمانوں کے گھروں میں راہ و رسم پیدا کرلیں تو اسلامی معاشرہ ہرج مرج اور داخلی دشمنوں کا شکار ہو جائے گا۔ اس طرح کفر و اسلام کی صفیں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوسکیں گی۔

''وَ لَا تَنۡکِحُوا الۡمُشۡرِکٰتِ حَتّٰی یُؤۡمِنَّ ؕ وَ لَاَمَۃٌ مُّؤۡمِنَۃٌ خَیۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِکَۃٍ وَّ لَوۡ اَعۡجَبَتۡکُمۡ''

جس طرح مومن مردوں کو مشرک اور بت پرست عورتوں سے شادی کرنے سے منع کیا گیا ہے اس جملے میں کافر اور مشرک مردوں سے مسلمان عورتیں بیاہنے سے روکا گیا ہے۔ نیز جس طرح مومن کنیزیں کافر آزاد عورتوں سے شادی کی نسبت بہتر ہیں چاہے کافر عورتیں حسن و جمال اور مال و منال میں بالاتر ہی کیوں نہ ہوں۔

اسی طرح صاحب ایمان غلام، خوبصورت اور بظاہر باحیثیت کافروں سے برتر اور بہتر ہیں لیکن مومن عورتوں کی شادی کافر مردوں سے اس وقت تک منع ہے جب تک وہ کافر ہیں اور اگر وہ ایمان قبول کرلیں تو ان سے شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ بازگشت کا ایک راستہ ہے جس کی طرف آیت کی ابتداء میں بھی اشارہ ہوا ہے۔

''اُولٰٓئِکَ یَدۡعُوۡنَ اِلَی النَّارِ وَ اللّٰہُ یَدۡعُوۡۤا اِلَی الۡجَنَّۃِ وَ الۡمَغۡفِرَۃِ بِاِذۡنِہٖ''

اس جملے میں اہل ایمان کی مشرک اور بت پرستوں سے شادی کرنے کی حرمت کی وجہ بیان کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ مشرک سے شادی کرنا اسلئے حرام ہے کہ مشرک انسان اپنے ساتھی کو بت پرستی اور ایسی ناپسندیدہ صفات کی دعوت دیتا ہے جن کا سرچشمہ بت پرستی ہے، خصوصاً بت پرست سے یہ معاشرت زنا کے حوالے سے بہت خطرناک ہے اور اسکے اثرات بہت زیادہ اور بہت گہرے ہیں۔ گویا بت پرست سے معاشرت کا انجام غضب خدا کی آگ کے سوا کچھ نہیں، خلاصہ یہ کہ بت پرستوں سے آشنائی خصوصاً شادی بیاہ کے دریچے سے خدا سے ناآشنائی کے مترادف ہے اور ان سے نزدیکی خدا سے دوری کا باعث ہے جب کہ مومنین اپنے ایمان اور سرچشمۂ ایمان سے پھوٹنے والی بلند صفات کی بدولت اپنے ساتھیوں کو ایمان اور فضیلت کی دعوت دیتے ہیں جس کا انجام جنت، مغفرت اور خدا کی بخشش ہے۔

مومنین کا رابطہ چونکہ خدا سے بہت گہرا ہے اس لئے آیت میں خدا نے مومنین کی بجائے اپنا نام لیا ہے۔ فرماتا ہے:

''وَ اللّٰہُ یَدۡعُوۡۤا اِلَی الۡجَنَّۃِ وَ الۡمَغۡفِرَۃِ بِاِذۡنِہٖ'' (خدا جنت اور اپنے حکم کے ذریعے بخشش کی دعوت دیتا ہے)

ممکن ہے خدا کی دعوت سے مراد بت پرستوں سے شادی کی حرمت کا حکم ہی ہو، جس کا نتیجہ جنت اور خدا کی مغفرت ہے اور اس میں بھی کوئی مانع نہیں کہ آیت دونوں مفاہیم کی حامل ہو۔

(۲۲۲) وَ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡمَحِیۡضِ ؕ قُلۡ ہُوَ اَذًی ۙ فَاعۡتَزِلُوا النِّسَآءَ فِی الۡمَحِیۡضِ ۙ وَ لَا تَقۡرَبُوۡہُنَّ حَتّٰی یَطۡہُرۡنَ ۚ فَاِذَا تَطَہَّرۡنَ فَاۡتُوۡہُنَّ مِنۡ حَیۡثُ اَمَرَکُمُ اللّٰہُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیۡنَ وَ یُحِبُّ الۡمُتَطَہِّرِیۡنَ	اور تم سے خون حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ نقصان دہ اور ناپاکی کی ایک حالت ہے۔ لہٰذا ماہواری کے دوران میں عورتوں سے کنارہ کشی اختیار کرو۔ جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب نہ جاؤ اور جب وہ پاکیزہ ہو جائیں تو جس راہ سے خدا نے تمہیں حکم دیا ہے ان سے ملاپ کرو۔ خدا توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور پاک رہنے والوں کو بھی خدا دوست رکھتا ہے۔
(۲۲۳) نِسَآؤُکُمۡ حَرۡثٌ لَّکُمۡ ۪ فَاۡتُوۡا حَرۡثَکُمۡ اَنّٰی شِئۡتُمۡ ۫ وَ قَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِکُمۡ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّکُمۡ مُّلٰقُوۡہُ ؕ وَ بَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ	تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں۔ جب چاہو تم ان سے ملاپ کرو (نیک اولاد کی پرورش کرو، اس طرح نیک تاثیر) اپنے لئے آگے بھیجو، خدا سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اس سے ملاقات ضرور ہونا ہے اور مومنین کو رحمت کی بشارت دو۔

شان نزول

عورتیں ہر ماہ میں کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ دس دن نماز، روزہ سے فارغ رہتی ہیں۔ ان دنوں میں فقہی کتب میں درج مخصوص اوصاف کا خون رحم عورت سے خارج ہوتا ہے۔ اس حالت میں عورت کو حائض کہتے ہیں اور اسی خون کو

خون حیض کہا جاتا ہے۔ یہود و نصاریٰ کا موجودہ دین حائض عورتوں سے مباشرت کے بارے میں ایک دوسرے سے متضاد احکام رکھتا ہے۔ یہ صورت ہر شخص کو سوال کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

یہودیوں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ ایسی عورتوں کے ساتھ مردوں کا رہنا سہنا ہی بالکل حرام ہے۔ یہاں تک کہ ایک دسترخوان پر کھانے اور ایک کمرے میں رہنے تک کی اجازت نہیں ہے۔ ان کے مطابق جس جگہ حیض والی عورت بیٹھی ہو وہاں مرد کو نہیں بیٹھنا چاہئے اور بیٹھ جائے تو اپنا لباس دھوئے ورنہ وہ نجس ہے اور اگر اس کے بستر پر سو جائے تو لباس بھی دھوئے اور غسل بھی کرے۔ خلاصہ یہ کہ ان ایام میں عورت کو ایک ناپاک شے اور لازم الاجتناب وجود سمجھا جاتا ہے۔

یہودیوں کے اس گروہ کے برعکس عیسائی کہتے ہیں کہ عورت کی حالت حیض اور غیر حیض میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں۔ حالت حیض میں بھی ان سے ہر طرح کی معاشرت، میل جول یہاں تک کہ جنسی ملاپ پر بھی کوئی قدغن نہیں۔

مشرکین عرب، خصوصاً اہل مدینہ کم و بیش یہودیوں کے اخلاق و عادات سے مانوس تھے اور حائض عورتوں سے یہودیوں کا سا سلوک روا رکھتے تھے۔ ماہواری کے دنوں میں ان سے الگ رہتے تھے۔

اسی دینی اختلاف اور ناقابل معافی افراط و تفریط کے باعث بعض مسلمانوں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے اس بارے میں سوال کیا اور جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

ماہواری میں جنسی ملاپ کے نقصانات

''وَ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْمَحِیْضِ ؕ قُلْ ھُوَ اَذًی''

یہاں ''مَحِیض'' مصدر میمی ہے اور یہاں حیض کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس لئے اس کا مفہوم یہ ہوگا ''اے پیغمبر! تم سے حیض اور اس کے احکام کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان کے جواب میں کہو ''ھو اذی''، یعنی وہ تکلیف دہ اور ناپاک چیز ہے۔ در حقیقت یہ جملہ ماہواری میں عورت سے جنسی ملاپ کے اجتناب کے حکم کا فلسفہ بیان کرتا ہے کیونکہ اس حالت میں عورتوں سے جنسی ملاپ تنفر کا باعث ہونے کے علاوہ بہت سے نقصانات کا بھی سبب بنتا ہے۔ ان نقصانات کو آج کی میڈیکل کی دنیا نے بھی ثابت کر دیا ہے۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں۔

1۔ مرد اور عورت دونوں کا بانجھ ہونا

2۔ آتشک اور سواک جیسی آمیزشی بیماریوں کے جراثیم کا پروان چڑھنا

3۔ عورت کے تناسلی اعضا کی زبردست گرمی اور مواد حیض کا مرد کے عضو تناسل میں داخل ہونا جب کہ یہ مواد بدن کے داخلی جراثیموں سے بھرا ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ بھی بہت سی بیماریاں اس طرح سے پیدا ہوتی ہیں جن کی تفصیلات میڈیکل کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں انہی وجوہ کی بنیاد پر ڈاکٹر، حائض عورتوں سے جنسی ملاپ سے منع کرتے ہیں۔

آیت کا یہ حصّہ حقیقت میں عورتوں سے جواز مباشرت کی وضاحت کے لئے ہے "اذا تطھرن" سے معلوم ہوتا ہے کہ ماہواری سے پاک ہوجانے پر ہی عورتوں سے مباشرت جائز ہے کیونکہ یہ جملہ خون حیض کو آلودگی قرار دینے کے بعد آیا ہے یعنی جب وہ اس ناپاکی اور آلودگی سے پاک ہوجائیں تو حکم متناعی ختم ہوجاتا ہے۔"تطھرن" کا مفہوم ظاہراً عورتوں کا غسل کر لینا نہیں لیا جا سکتا کیونکہ آیت کی ابتداء میں وجوب غسل کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کی گئی۔

نوعِ بشر کی حفاظت کا ذریعہ

(۲۲۳) زیرِنظر آخری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

اس آیت میں عورتوں کو کھیتی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ہوسکتا ہے بعض لوگوں کے نزدیک یہ تشبیہ عورتوں کے بارے میں بوجھل ہو اور وہ سوچیں کہ اسلام نے آدھی انسانیت کے لئے یہ لفظ کیوں استعمال کیا ہے حالانکہ اس تشبیہ میں ایک باریک سا نکتہ پنہاں ہے۔ درحقیقت قرآن چاہتا ہے کہ اس طرح سے عورت کو متعارف کروا کر انسانی معاشرے میں اس کے وجود کی ضرورت کو اجاگر کرے اور یہ واضح کرے کہ عورت فقط آتش شہوت کو سرد کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ نوع بشر کی بقا کا وسیلہ ہے۔

جیسے انسان اپنی بقاء کے لئے غذا کا محتاج ہے اور یہ احتیاج کاشتکاری اور زراعت کے بغیر پوری نہیں ہوسکتی، اس طرح بقا نوع انسانی عورت کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ بات ان لوگوں کے لئے ایک تنبیہ کی حیثیت رکھتی ہے جو عورت کو ایک کھلونا اور ہوس پرستی کا ہدف سمجھے بیٹھے ہیں۔

" وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُم"

یہ جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جنسی ملاپ کا اصل مقصد صرف حصول لذت اور تکمیل خواہش نہیں بلکہ صاحب ایمان افراد کو چاہئے کہ وہ اس عمل سے لائق اور شائستہ اولاد کے حصول کی خواہش کریں اور پھر اس کی تربیت کی ذمہ داری پوری کریں اور اس مقدس تربیتی خدمت کو ایک معنوی سرمائے کے طور پر اپنے کل کے لئے آگے بھیجیں۔ اس لئے قرآن تنبیہ کرتا ہے کہ بیوی کے انتخاب میں ایسے اصول پیش نظر رکھیں جن کا نتیجہ اچھی اولاد کی پرورش اور عظیم اجتماعی وانسانی سرمائے کا حصول ہو۔

اس کے بعد متوجہ کرتا ہے کہ تمہیں قیامت کے دن پروردگار سے ملاقات اور اپنے اعمال کے نتائج کی طرف جانا ہوگا۔

آخر میں ایمانداروں کو بشارت دیتا ہے کیونکہ صاحبان ایمان اس کے احکام کے سامنے سرتسلیم خم کئے ہوئے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ احکام ان کی مادی اور روحانی زندگی کے لئے مفید ہیں۔

(۲۲۴)وَ لَا تَجۡعَلُوا اللّٰہَ عُرۡضَۃً لِّاَیۡمَانِکُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡا وَ تَتَّقُوۡا وَ تُصۡلِحُوۡا بَیۡنَ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ	خدا کو اپنی قسموں میں نہ لاؤ۔نیکی کرنے،تقویٰ اختیار کرنے اور لوگوں میں صلح صفائی کے عمل میں قسمیں نہ کھاتے رہو اور خدا سننے والا جاننے والا ہے۔
(۲۲۵)لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغۡوِ فِیۡۤ اَیۡمَانِکُمۡ وَ لٰکِنۡ یُّؤَاخِذُکُمۡ بِمَا کَسَبَتۡ قُلُوۡبُکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ حَلِیۡمٌ	بے توجہ قسمیں کھانے پر تو خدا تمہارا مواخذہ نہیں کرے گا البتہ جو کچھ تم دل و دماغ سے کرتے ہو اس پر ضرور باز پرس ہوگی اور خدا بخشنے والا صاحب علم ہے۔

شان نزول

پیغمبر اکرم ﷺ کے ایک صحابی عبداللہ بن رواحہ کے داماد اور بیٹی میں اختلاف ہوگیا تو اس نے قسم کھائی کہ ان میں صلح کے لئے وہ دخل اندازی نہیں کرے گا اور اس بارے میں کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور ایسی قسموں کو ممنوع اور بے بنیاد قرار دے دیا۔

تفسیر

''ایمان'' ''یمین'' کی جمع ہے۔اس کا معنی ہے''قسم''''عرضة'' کا معنی ہے کسی چیز کا معرض قرار دینا۔مثلاً کوئی جنس بازار میں بیچنے کے لئے لاتے ہیں اور اسے معاملے کے معرض میں قرار دیتے ہیں یعنی اسے معاملے کے بیچ میں لاتے ہیں تو اسے عرضہ کہتے ہیں۔بعض اوقات موانع اور رکاوٹوں کو بھی عرضة کہتے ہیں۔کیونکہ وہ معرض انسان میں واقع ہوتے ہیں اور انسان کے راستے میں حائل ہوتے ہیں۔

''عرضة'' کے مذکورہ مفہوم کو نظر میں رکھتے ہوئے آیت کی تفسیر کچھ اس طرح ہوگی: خدا کو اپنی قسموں کے معرض میں نہ لاؤ اور ہر چھوٹے بڑے کام کے لئے قسم نہ کھاؤ۔خدا کے نام کو معمولی نہ بنا دو۔اہم مقاصد کے علاوہ یوں قسم کھانا غیر مناسب اور غیر مطلوب کام ہے۔یہ بات بہت سی احادیث میں بھی بیان کی گئی۔

(۲۲۵)اس آیت میں اللہ تعالیٰ دو طرح کی قسموں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پہلی قسم

لغو قسموں کی ہے،جن کا کوئی اثر نہیں اور جن کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے۔یہ وہ قسمیں ہیں جو لوگ بغیر توجہ کے کھاتے ہیں۔بعض لوگ تکیہ کلام اور عادت کے طور پر قسمیں کھاتے ہیں۔ہر کام میں''لا واللّٰہ''اور''بلیٰ واللّٰہ''یعنی نہ بخدا اور ہاں بخدا کہتے ہیں۔ایسی قسمیں لغو ہیں''لغو'' لغت میں ان تمام کاموں اور باتوں کو کہتے ہیں جن کا ہدف اور مقصد معین نہ ہو یا جو قصد و ارادہ سے

سرزد نہ ہوں۔

دوسری قسم

ان قسموں کی ہے جو قصد وارادہ کے ماتحت ہوں اور قرآن کی تعبیر کے مطابق اس میں "کسب قلبی" موثر ہے۔ ایسی قسم معتبر ہے اور اس کی پابندی کرنا چاہیئے اور اس کی مخالفت نہ فقط گناہ ہے بلکہ اس کا کفارہ بھی دینا پڑتا ہے، مگر اس کی کچھ شرائط ہیں جن کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔

(۲۲۶) لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ	جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھاتے ہیں۔ وہ چار ماہ تک انتظار کا حق رکھتے ہیں اگر رجوع کرلیں (تو کوئی حرج نہیں) خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔
(۲۲۷) وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ	اور اگر علیحدگی کا مصمّم ارادہ کرلیں۔ خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

تفسیر

زمانۂ جاہلیت کے ایک طرز عمل کا خاتمہ

"ایلاء" وہ رسم ہے جو زمانہ جاہلیت میں میاں بیوی کے درمیان جدائی کے سلسلے میں عام تھی۔ "ایلاء" کا مفہوم ہے کہ میاں بیوی والے تعلقات ترک کرنے کی قسم کھانا، حکم طلاق نازل ہونے سے پہلے تو مسلموں میں بھی یہ رسم باقی تھی۔

زمانہ جاہلیت میں جب کوئی مرد اپنی بیوی سے متنفر ہو جاتا تو بعض اوقات قسم کھالیتا کہ وہ اس سے ہمبستری نہیں کرے گا اس طرح وہ اپنی بیوی کو اپنے اس غیر انسانی سلوک سے ایک شدید عذاب میں مبتلا کردیتا۔ نہ رسمی طور پر طلاق دیتا کہ وہ آزادی سے اپنے لئے کسی دوسرے شوہر کا انتخاب کر کے اپنی خواہشات پوری کرسکے نہ اس قسم کے بعد وہ خود تیار ہوتا کہ اس سے صلح کر کے ایک شوہر کی طرح زندگی بسر کرے۔

زیر نظر آیت میں اس سلسلے میں اسلام کا معین کردہ طریق کار بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ شوہر کو چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اس مصیبت اور عذاب سے نجات دے۔ اس عرصے میں وہ اپنی قسم کو ترک کردے اور اپنی بیوی کے ساتھ زندگی بسر کرے یا اسے طلاق دے کر آزاد کردے۔

پہلی راہ کا انتخاب یعنی گھر کے ماحول کو خرابی سے بچانا بلاشبہ عقل و دانش کا تقاضا بھی ہے اور رضائے پروردگار کے حصول کا ذریعہ بھی، اسی لئے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے:

''اگر اپنے ارادے کو ترک کر دیں تو خدا بخشنے والا مہربان ہے''

''فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ''۔۔۔یہ جملہ دلالت کرتا ہے کہ اس قسم کو ترک کرنا کوئی گناہ نہیں، اگرچہ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قسم کھانا خود بھی ایک پسندیدہ عمل نہیں ہے۔

(۲۲۷) زیر نظر دوسری آیت میں ہے کہ اگر مرد علیحدگی کا ارادہ کر لے اور طلاق دے دے تو اس صورت میں بخشش و مغفرت مسلّم نہیں ہے۔ خدا جو تمام اسرار سے آگاہ ہے، جانتا ہے کہ ہوس پرستی نے شوہر کو قانون طلاق سے غلط فائدہ اٹھانے پر ابھارا ہے یا اس کے حالات کا یہی تقاضا تھا۔ ظاہری طلاق جاری کرنے کے بارے میں، اس کا سبب اور محرک سب کچھ خدا کے علم میں ہے اسی لئے آیت کے آخر میں فرماتا ہے۔

''اور گروہ طلاق ہی کا ارادہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے''

اسلام چار ماہ سے زیادہ جدائی کی اس کیفیت کو روا نہیں جانتا (جب کہ قسم نہ کھائی جائے تب بھی مباشرت میں اس مدت تک کی تاخیر مباح ہے)۔ اگر اس مدت کے اختتام پر بھی مرد ٹال مٹول سے کام لے اور اپنے پروگرام کو واضح نہ کرے تو حکومت اسلامی اسے طلب کر سکتی ہے اور مخالفت کی صورت میں اسے مجبور کر سکتی ہے کہ وہ معاملے کو طے کرے۔

(۲۲۸) وَ الْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَ لَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۧ	طلاق یافتہ عورتیں تین مرتبہ ماہواری دیکھنے (اور پاک ہونے) کا انتظار کریں اور اگر خدا اور روز جزا پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کے لئے حلال نہیں کہ جو کچھ خدا نے ان کے رحم میں پیدا کیا ہے اسے چھپائیں اور ان کے شوہر اس مدت میں ان کی طرف رجوع کرنے کے زیادہ حق دار ہیں اگر وہ صلح چاہتے ہیں اور جیسے عورتوں کے کندھوں پر فرائض عائد ہیں ایسے ہی ان کے لئے شائستہ حقوق مقرر کئے گئے ہیں اور مرد ان پر برتری رکھتے ہیں، اور خدا توانا اور حکیم ہے۔

تفسیر

اکثر گھریلو معاملات کی خرابی معاشرتی ڈھانچے کے لئے ناقابل تلافی نقصانات کا باعث بنتی ہے۔ اس لئے اسلام نے ایسے قوانین اور احکام وضع کئے ہیں کہ امکان کی آخری حد تک گھریلو رشتے ٹوٹنے سے بچ جائیں۔ ایک طرف اسلام نے طلاق کو مباح اور حلال چیزوں میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت قرار دیا ہے اور دوسری طرف گھریلو اختلافات کے لئے خاندانی عدالت کا تصور دیا ہے۔ یہ عدالت رشتہ داروں پر مشتمل ہوتی ہے تاکہ طرفین کے قریبی رشتہ داروں کے ذریعے صلح وآشتی کی کوئی صورت نکل

آئے۔ طلاق کے معاملے کو تاخیر میں ڈالنے اور اس فیصلے کو متزلزل کرنے کے لئے ''عدت'' مقرر کی گئی ہے جس کی مدت تین ''قرؤ'' ہے جس کا ذکر زیرِ نظر آیت میں کیا گیا ہے۔

''قروء'' سے کیا مراد ہے؟

''قروء'' کا واحد ''قرء'' ہے یہ لفظ ''ماہواری کی عادت'' اور اس سے پاک ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اگر چہ بہت سی روایات میں تصریح کی گئی ہے کہ ''ثلاثه قروء'' عدت کی حد ہے اور اس کا مفہوم ہے عورت کا خون حیض سے تین مرتبہ پاک ہونا۔

عدت......حفاظت نسل کا ایک ذریعہ

عدت کا ایک اور فلسفہ یہ ہے کہ اگر عورت حاملہ ہے تو یہ کیفیت واضح ہو جائے۔ یہ درست ہے کہ ایک مرتبہ ماہواری دیکھنے ہی سے عموماً عورت کے حاملہ نہ ہونے کا یقین ہو جاتا ہے لیکن بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ حاملہ ہونے کے باوجود ابتدائے حمل میں عورتوں کو خون حیض آنے لگتا ہے۔ اس لئے اس معاملے کی پوری وضاحت کے لئے حکم دیا گیا ہے کہ عورت تین مرتبہ ماہواری دیکھے اور پاک ہو جائے تاکہ حتمی طور پر پہلے شوہر سے اس کا حاملہ نہ ہونا واضح ہو جائے اور پھر وہ نئے سرے سے کہیں شادی کر سکے۔

سوال اور اس کا جواب

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ عدت کے دنوں کی ابتداء اور انتہا کس طرح معلوم کی جائے؟ اسلام نے اس معاملے میں خود عورت کی بات کو مستند قرار دیا ہے۔

جب عورت طلاق رجعی کی عدت میں ہو تو شوہر کو رجوع کرنے کا حق ہے تاکہ اگر وہ چاہے تو بلا تکلف اپنی بیوی کے ساتھ اپنی زندگی جاری رکھ سکتا ہے البتہ آیت نے ''إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا'' کی قید لگائی ہے اور اس سے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ حکم یک طرفہ نہ ہو۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ مرد آزادانہ بلا شرط حق رجوع رکھتا ہو اور چاہے زمانہ جاہلیت کی طرح اپنی طاقت سے غلط فائدہ اٹھاتا رہے اور عورت پر سختی اور تکلیف روا رکھے لہٰذا یہ حق اسے اس صورت میں ہے کہ وہ واقعاً اپنے طرز و طریقے سے پشیمان ہو اور وہ واقعاً اپنی زندگی کا نئے سرے سے آغاز چاہتا ہو تب وہ اصطلاح کے مطابق رجوع کا حق رکھتا ہے، مقصد یہ ہے کہ وہ عورت کو ضرر، دکھ اور تکلیف نہ پہنچانا چاہتا ہو۔

''وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَ لِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ''

گذشتہ مسائل کے بعد یہ جملہ عورت اور مرد کے باہمی احترام کے بارے میں ہے جسے طلاق اور عدت کے مسئلے سے بالاتر قرار دیا گیا ہے۔ اس میں شخصی اور اجتماعی حقوق کی طرف راہنمائی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ جیسے مرد کے حقوق وضع کئے گئے ہیں تاکہ عورت ان حقوق کا احترام کریں اسی طرح عورت کے مختلف حقوق بھی مرد کے ذمہ ہیں جن کی ادائیگی کا وہ ذمہ دار

ہے۔''بالمعروف'' کا لفظ اس سلسلۂ آیات میں بارہ (۱۲) مرتبہ آیا ہے یہ سب اس لئے ہے کہ کوئی اپنے حقوق سے غلط فائدہ نہ اٹھائے۔عورت اور مرد دونوں کو مصلحت اندیش ہونا چاہئے اور باہمی حقوق مناسب طریقے سے ادا کرنے چاہئیں۔

''وَ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ''

یہ جملہ گذشتہ قانون کی تکمیل کرتا ہے۔اس کی وضاحت یہ ہے کہ گذشتہ جملے میں عورت کے بارے میں قانون عدالت مرد کی طرح جاری ہے لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ مرد اور عورت تمام فرائض اور ذمہ داریوں میں اور پھر ان کے پس منظر میں تمام حقوق میں سو فیصد برابر اور ہم دوش ہوں۔

عورت اور مرد کی جسمانی و روحانی قوت و استعداد میں جو وسیع فرق ہے اسے مدّ نظر رکھتے ہوئے اس سوال کا جواب واضح ہوجاتا ہے چونکہ عورت کے ذمہ ماں کا حساس فریضہ اور معاشرے کے لئے آبرومند نسلوں کی پرورش ہے لہٰذا اس میں احساسات و جذبات زیادہ پائے جاتے ہیں۔عورت میں احساسات کی اسی برتری کے پیش نظر ضروری ہے کہ بعض اجتماعی فرائض جن میں زیادہ فکری اور نظری قوت درکار ہے ان میں مرد بلند مرتبہ کے حامل ہوں۔ کیونکہ ان امور کو جذبات سے بالاتر ہونا چاہئے۔حکومت، قضاوت گھریلو معاملات کی سرپرستی ایسے امور ہی کی مثالیں ہیں۔البتہ ان امور کی وجہ سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں کہ بعض خواتین اپنے علم وتقویٰ کے سبب کسی مرحلے میں بہت سے مردوں سے بلندتر ہوں۔

(۲۲۹) اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ وَ لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ	طلاق (جس میں رجوع ہے) دو مرتبہ ہے (اور ہر مرتبہ) مناسب طریقے سے اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھے یا نیکی کے ساتھ اسے چھوڑ دے اور تمہارے لئے حلال نہیں کہ انہیں جو چیز دی ہے وہ ان سے واپس لو۔مگر یہ کہ دونوں (میاں بیوی) اس سے ڈریں کہ وہ حدود الٰہی کی پاسداری نہیں کرسکیں گے اگر انہیں خوف ہے کہ وہ حدود الٰہی کا لحاظ نہ کرسکیں گے تو پھر ان کے لئے کوئی حرج نہیں کہ عورت فدیہ اور عوض دے دے (اور طلاق لے لے) یہ حدود (اور خدائی سرحدیں) ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور جو شخص ان سے تجاوز کرے وہ ظالم ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیت کی تفسیر میں کہا جاچکا ہے کہ عدت اور رجوع کا قانون خاندانوں کی اصلاح اور جدائی روکنے کے لئے ہے لیکن اسلام لانے والے نئے مسلمان اس سے غلط فائدہ اٹھاتے تھے اور بیوی کو تکلیف اور سختی پہنچانے کے لئے پے در پے طلاق دیتے اور

عدت ختم ہونے سے قبل رجوع کر لیتے۔اس طرح وہ عورت پر سختی کرتے اور اسے مصیبت میں مبتلا رکھتے۔

زیر بحث آیت اس غیر انسانی فعل کو روکتی ہے۔ارشاد ہے کہ دو مرتبہ تک طلاق اور رجوع صحیح ہے لیکن اگر تیسری مرتبہ طلاق انجام پذیر ہوئی تو پھر رجوع کا حق نہیں ہے۔اور آخری طلاق یہی تیسری طلاق ہے۔البتہ " **الطّلاق مرّتان** " سے مراد ہے وہ طلاق جس میں رجوع ممکن ہے اور جس کے بارے میں "**امساک بمعروف**" صادق آتا ہے جو دو سے زیادہ نہیں اور تیسری طلاق میں رجوع نہیں ہے، جیسا کہ آیت گواہی دیتی ہے۔

"**امساک**" کا معنی ہے۔روکے رکھنا اور "**تسریح**" کا معنی ہے چھوڑ دینا۔جب کشمکش، طلاق اور پھر صلح اور رجوع کی نوبت دو مرتبہ ہو گزرے تو پھر مرد کو چاہئے کہ معاملے کو ایک طرف کرے۔

دو اہم نکات

1۔جس طرح رجوع کرنے اور عورت کو روک رکھنے میں "معروف" کی شرط ہے۔یعنی رجوع اور روکے رکھنا صلح وصفائی اور خلوص ومحبت کی بنیاد پر ہو اسی طرح جدائی بھی "احسان" کے ساتھ مقید ہے۔یعنی علیحدگی اور جدائی ہر طرح کے ناپسندیدہ امر سے پاک ہو مثلاً انتقام، غیض، غضب اور کینہ سے مبرّا ہو اور کہا جا سکتا ہے کہ آیت کا یہ حصّہ احسان ہی کی وضاحت کے لئے ہے۔

2۔ "**الطّلاق مرّتان**" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو یا تین طلاقیں ایک ہی مجلس میں انجام نہیں پا سکتیں اور چاہئے کہ وہ متعدد مواقع پر واقع ہوں۔خصوصاً جب تعدد طلاق کا مقصد یہ ہے کہ رجوع کا زیادہ موقع مل سکے اور شاید پہلی کشمکش کے بعد صلح وصفائی برقرار ہو جائے اور اگر پہلی مرتبہ صلح و آشتی نہ ہو سکے تو شاید دوسری مرتبہ ہو جائے۔لیکن ایک ہی موقع پر متعدد طلاقوں سے یہ راستہ بالکل مسدود ہو جاتا ہے اور میاں بیوی ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور اس طرح تعدد طلاق عملی طور پر بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے۔

"**وَ لَا یَحِلُّ لَکُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّاۤ اٰتَیۡتُمُوۡهُنَّ شَیۡـًٔا**"

گذشتہ جملے میں کہا جا چکا ہے کہ علیحدگی احسان کی بنیاد پر ہونا چاہئے۔زیر نظر یہ جملہ گذشتہ جملے کی وضاحت بھی ہے اور ایک مستقل حکم بھی نیز یہ ان مواقع کے لئے ایک نمونہ بھی ہے جو احسان کی بنیاد پر علیحدگی کی تشریح کرتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شوہر جو چیز حق مہر کے طور پر بیوی کو دے چکا ہے وہ واپس نہیں لے سکتا۔

صرف ایک صورت میں حق مہر واپس لینے میں کوئی حرج نہیں اور وہ یہ کہ جب عورت خود ازدواجی زندگی کو جاری رکھنا نہ چاہتی ہو۔اب اگر اس کے عدم میلان اور نفرت کی وجہ سے اندیشہ ہو کہ عورت اور مرد حدود الٰہی کی حفاظت نہ کر سکیں گے تو اس صورت میں کوئی حرج نہیں کہ حق مہر (عوض کے طور پر) شوہر کو دے دیا جائے تا کہ وہ عورت کو طلاق دے۔

"**تِلۡکَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا ۚ وَ مَنۡ یَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ**"

"**تلک**" ان احکام کی طرف اشارہ ہے جو گذشتہ جملوں میں بیان کئے جا چکے ہیں۔حقیقت میں یہ احکام اجتماعی، اخلاقی

اور فقہی نکات کا مجموعہ ہیں جنہیں پروردگار نے اجتماعی روابط کے استحکام کے لئے وضع اور بیان فرمایا ہے۔

زیر نظر جملے میں کہا گیا ہے کہ اگر بعض لوگ افراط کا شکار ہوں اور ناجائز میلانات کی وجہ سے حدود الٰہی سے بے پرواہ ہو جائیں تو ان کا شمار ستمگروں اور ظالموں میں ہوگا۔

(۲۳۰) فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ ؕ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَاۤ اَنۡ يَّتَرَاجَعَاۤ اِنۡ ظَنَّاۤ اَنۡ يُّقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ وَ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ	اگر (دو مرتبہ طلاق دینے اور پھر رجوع کر لینے کے بعد پھر) اسے طلاق دے تو اس کے بعد وہ عورت اس پر حلال نہیں ہوگی مگر یہ کہ اس کے علاوہ کسی شوہر سے شادی کرے (اور وہ اس سے جنسی ملاپ کرے۔ بعد ازاں وہ دوسرا شوہر بھی) اسے طلاق دے دے تو کوئی حرج نہیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف رجوع کریں (اور عورت اپنے پہلے شوہر سے پھر سے شادی کر لے) جب کہ انہیں امید ہو کہ وہ حدود الٰہی کا احترام کریں گے اور یہ اللہ کی حدود ہیں جنہیں خدا آگاہ لوگوں سے بیان کرتا ہے۔

شان نزول

ایک عورت پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ کہنے لگی: میں اپنے چچا زاد رفاعہ کی بیوی تھی۔ اس نے مجھے تین مرتبہ طلاق دی تو میں نے ایک اور شخص عبدالرحمٰن سے شادی کر لی۔ اتفاقاً اس نے بھی مجھے طلاق دے دی لیکن اس دوران میں اس نے مجھ سے ہم بستری نہیں کی۔ کیا اب میں پہلے شوہر کی طرف لوٹ سکتی ہوں؟

آنحضرت ﷺ نے نفی میں جواب دیا اور فرمایا کہ پہلے شوہر سے تیری شادی اسی صورت میں صحیح ہے جب نئے شوہر نے تجھ سے مباشرت کی ہو۔

اس واقعے کے بعد مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں اجمالی طور پر یہ نکتہ بیان کیا جا چکا ہے کہ دوسری طلاق کے بعد عورت اور مرد الفت و صلح کی راہ اپنا لیں یا ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔

یہ آیت حقیقت میں ایک تبصرہ ہے جو گذشتہ آیت سے منسلک ہے۔ آیت کہتی ہے کہ جدائی کا حکم ہمیشہ کے لئے ہے لیکن عورت دوسری شادی کر لے، اور دوسرے شوہر سے مباشرت کے بعد طلاق لے لے تو اس صورت میں چاہے تو پہلے شوہر سے صلح کر سکتی ہے اور امید رکھے کہ اگر وہ حالات کو ساز گار رکھیں اور حدود الٰہی کا احترام کریں تو کوئی حرج نہیں۔

(۲۳۱)وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۠ وَ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَ لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۡ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۧ	جب عورتوں کو طلاق دو اور وہ عدت کے آخری دنوں تک پہنچ جائیں تو یا انہیں صحیح طریقے سے اپنے ہاں رکھ لو اور (ان سے صلح کر لو) یا انہیں پسندیدہ طریقے سے چھوڑ دو اور انہیں کسی طرح بھی نقصان پہنچانے اور ان سے زیادتی کرنے کے لئے ان سے صلح نہ کرو اور جو ایسا کرے گا اس نے گویا اپنے ہی اوپر ظلم کیا (اور ان احکام اور قوانین سے غلط فائدہ اٹھا کر) آیات خدا کا مذاق نہ اڑاؤ اور اپنے اوپر نازل ہونے والی نعمت الٰہی، کتاب آسمانی اور علم و دانش کو یاد کرو اور انہیں ان کے زریعے جو وعظ و نصیحت کی گئی ہے اسے یاد کرو اور خدا سے ڈرو اور جان لو کہ خدا ہر چیز سے آگاہ ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات کے بعد اس آیت میں اسلام طلاق کے بارے میں وضع کردہ حد بندیوں کو بیان کرتا ہے تا کہ حقوق اور عورت کے احترام سے چشم پوشی نہ کی جا سکے۔

آیت کہتی ہے کہ جب تک عدت کی مدت ختم نہ ہوا گرچہ اس کا آخری دن باقی ہو مرد کو اجازت ہے کہ وہ اپنی بیوی سے صلح کر لے اور دونوں خلوص و محبت سے زندگی بسر کرنے لگیں .اگر حالات نامساعد ہیں تو اسے چھوڑ دے۔لیکن توجہ رہے کہ رجوع یا علیحدگی ہر صورت میں احسان اور نیکی ملحوظ رہے اور جذبہ انتقام سے یہ کام انجام نہیں پانا چاہئے۔

"وَ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ"

یہ جملہ "معروف" کی تفسیر ہے، یعنی رجوع صدق وصفا اور خلوص و محبت کی بنا پر ہو۔ چونکہ زمانہ جاہلیت میں طلاق اور رجوع کو انتقام لینے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، لہٰذا آیت قطعی لہجے میں کہتی ہے کہ عورت کو آزاد و تعدی کے مقصد سے زوجیت کی قید میں نہ رکھا جائے کیونکہ ایسا کرنا اسی پر نہیں بلکہ خود تمہارے نفس پر بھی ظلم ہے۔

خدا کے قوانین کا مذاق نہ اڑاؤ

"وَ لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۡ ...."

"ھزو" اور "ھزوء" کا معنی تمسخر کرنا ہے۔

عموماً ہزاروں لوگ شرعی احکام کی خلاف ورزیاں کرتے ہوئے وجدانی دباؤ سے بچنے کے لئے اور (اپنے خیال میں)

عذاب الٰہی سے فرار کے لئے شرعی حیلے بہانے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور آیات واحکام کے ظواہر کو اپنے لئے دستاویز بنا لیتے ہیں۔اس روش کو قرآن آیات قرآن اور احکام الٰہی سے استہزاء اور تمسخر قرار دیتا ہے۔یہ بات باعث افسوس ہے کہ بہت سے احکام کے بارے میں ایسا انحراف عموماً نظر سے گذرتا رہتا ہے۔طلاق کے معاملے میں بھی اس کی مثال ملتی ہے۔جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے مرد کے لئے حق رجوع از دواج اور شادی کو زیادہ سے زیادہ پائدار بنانے کے لئے ہے لیکن بعض لوگ اس مقصد کے برعکس اقدام کرتے ہیں یعنی رجوع حق کی اجازت کو عورت سے انتقام لینے اور اسے آزار پہنچانے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اس طرح قانون پر عمل کرنے کے پردے میں اپنے حقیقی ظالمانہ چہرے کو چھپاتے ہیں اسی کو قرآن اور قانون کا تمسخر اڑانا کہتے ہیں۔محل بحث آیت کہتی ہے: آیات خدا کو کھلونا نہ بناؤ اور خدا کی عظیم نعمت دین اور آسمانی کتاب کو یاد رکھو جو تمہاری سعادت کے لئے آئے ہیں۔

دین اور اس کے تمام قوانین واحکام کا سرچشمہ جہاں ثابت کا نظام ہے جسے نوع انسانی کے حقیقی مصالح کی روشنی میں بنایا گیا ہے۔اس لئے مصالح سے چشم پوشی اختیار کرتے ہوئے بعض احکام کے ظاہری طریقوں کو اپنا کر بے روح سانچے نہ بناؤ۔کہیں یہ طرز عمل خود تمہارے فوائد کو بھی خطرے میں ڈال دے گا اور آیات خدا کے سامنے منہ ٹیڑھا کرنے کا جرم بھی شمار نہ کر لیا جائے۔

آیت کے آخر میں عورت کے حقوق کی حفاظت کے لئے احکام الٰہی سے غلط فائدہ اٹھانے والوں کی گرفت کی گئی ہے اور ایسے لوگوں سے کہا گیا ہے کہ خدا سے ڈرو اور جان لو کہ وہ تمہارے کاموں اور اس جہان کے تمام اسرار سے آگاہ وواقف ہے۔

(۲۳۲)وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ	اور جب عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت تمام ہو جائے تو اگر پسندیدہ طریقے اور باہمی رضا مندی سے وہ اپنے (پہلے) شوہروں سے شادی کرنا چاہیں تو انہیں اس سے نہ روکو۔اس حکم سے تم سے بس وہ لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں (اور اس پر عمل کرتے ہیں) جو خدا اور روز جزا پر ایمان رکھتے ہیں یہ (احکام) تمہارے (خانوادوں کے) نشوونما کے لئے زیادہ موثر اور آلودگیوں کو دھونے کے لئے زیادہ مفید ہیں اور خدا جانتا ہے (لیکن) تم نہیں جانتے۔

شان نزول

معقل بن یسار، پیغمبر اکرم ﷺ کا ایک صحابی تھا۔اس کی ایک بہن جملاء تھی۔عاصم بن عدی اس کی بہن کا پہلا شوہر تھا۔وہ عاصم سے اپنی بہن کی دوبارہ شادی کی مخالفت کرتا تھا کیونکہ عاصم نے قبل ازیں اسے طلاق دے دی تھی۔اس بناء پر آیت نازل ہوئی جس میں اس قسم کی مخالفت سے منع کیا گیا ہے۔

تفسیر

ایک اور زنجیر ٹوٹ گئی

جیسا کہ گذشتہ مباحث میں گزر چکا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں عورتیں پابندیوں اور زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ ان کے ارادے، فکر ونظر اور میلان ورغبت کی کوئی حیثیت نہ تھی اور وہ خودسر مردوں کے ارادہ ومیلان کے تابع تھیں۔ اس کیفیت کا ایک نمونہ انتخاب شوہر کا مسئلہ بھی تھا جس میں عورتوں کی خواہش ورغبت کا کوئی دخل نہ تھا۔ اس روش میں معاملہ یہاں تک جا پہنچا تھا کہ اگر عورت رسمی نکاح بھی کر لیتی اور اس کے بعد اس شوہر سے علیحدگی ہو جاتی تو نئے سرے سے اس سے وابستگی بھی ولی (یا اولیاء) کے ارادے پر موقوف تھی۔ بعض اوقات اگر میاں بیوی اپنی سابقہ ازدواجی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے تو ان کے اولیاء اپنے منافع کی خاطر یا خیالات وموہومات کی بنا پر اس تعلق میں حائل ہو جاتے۔

قرآن صراحت سے اس روش کو مذموم قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اولیاء اور دیگر افراد ہرگز ایسا کوئی حق نہیں رکھتے کیونکہ جب میاں بیوی جو شادی کے دو اصلی بنیادی رکن ہیں وہ ایک دوسرے سے موافقت رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ علیحدگی کے بعد پھر شادی کر لیں تو دوسروں کی مخالفت کوئی معنی نہیں رکھتی۔

آیت کا آخری حصہ کہتا ہے کہ احکام کا یہ سلسلہ جو تمہارے نفع کے لئے بیان ہوا ہے ایسے لوگوں کے بارے میں ہے جو کائنات کے پیدا کرنے والے اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں۔ جب تک انسان خدا پرستی اختیار کر کے خود پرستی سے نجات حاصل نہ کر لے اپنے میلانات پر ہرگز کنٹرول نہیں کر سکتا اور کج روی سے بالکل نہیں بچ سکتا۔

''ذٰلِکُمۡ اَزۡکٰی لَکُمۡ وَ اَطۡہَرُ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ''

یہ جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان احکام پر عمل کرنے کا نتیجہ سو فیصد تمہارے حق میں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ اطلاعات کی کمی کی وجہ سے تمہیں احکام کے فلسفہ سے واقفیت حاصل نہ ہو لیکن وہ خدا جو تمام اسرار سے آگاہ ہے اس نے یہ احکام تمہارے منافع کے تحفظ، خاندانوں کی طہارت اور پاکیزگی کے لئے جاری کیے ہیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ خداوند عالم نے اس جملے میں ان احکام پر عمل کرنے کا نتیجہ تزکیہ بھی اور طہارت بھی قرار دیا ہے ''ذٰلِکُمۡ اَزۡکٰی لَکُمۡ وَ اَطۡہَرُ'' اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان احکام پر عمل کرنا ایک تو ان مختلف آلودگیوں اور ناپاکیوں کو دور کرتا ہے جو غلط کاموں کے سبب خاندانوں کے دامن گیر ہو جاتی ہیں اور دوسرا اس کا حاصل یہ ہے کہ انہیں نشوونما، تکامل اور خیر وبرکت نصیب ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ تزکیہ کا اصلی لغوی معنی نمو پانا اور بڑھنا ہی ہے۔

(۲۳۳)وَ الْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَ لَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَ اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ	(وہ) مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلاتی ہیں یہ (حکم) اس کے لئے ہے جو دودھ پلانے کے دور کی تکمیل کرنا چاہے اور اس (باپ) کے لئے جس کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے ضروری ہے وہ ان (ماؤں) کو (دودھ پلانے کی مدت میں) مناسب طریقے سے خوراک اور لباس دے۔ کسی شخص کی ذمہ داری اس کی قوت و طاقت سے زیادہ نہیں ہے نہ ماں بچے کو (اس کے باپ سے اختلاف کی وجہ سے) ضرر پہنچانے کا حق رکھتی ہے اور نہ باپ اور اس کے وارث پر ایسا کرنا لازم ہے (کہ وہ دودھ پلانے کی مدت میں ماں کے اخراجات مہیا کرے) اور اگر وہ دونوں باہمی رضامندی اور مشورے سے بچہ کا دودھ (زیادہ جلدی) چھڑوا دیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہے اور اگر (طاقت نہ رکھنے یا ماں کے موافق نہ ہونے سے) اپنے بچوں کے لئے کوئی دایا لے آؤ تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ ماں کا گذشتہ حق شائستہ اور مناسب طریقے سے ادا کردو اور خدا سے ڈرو اور جان لو کہ جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اسے دیکھنے والا ہے۔

تفسیر

دودھ پلانے کے احکام

1۔ دودھ پلانے کے دو سالوں میں دودھ پلانے کا حق ماں سے مخصوص ہے اور وہی اس مدت میں بچے کو دودھ پلا سکتی ہے اور وہی دیکھ بھال بھی کرے گی۔ اگرچہ چھوٹے بچوں کی ولایت باپ کے ذمہ ہے لیکن نوزائیدہ بچے کو ماں کی دیکھ بھال اور سرپرستی میں دے دیا گیا ہے کیونکہ نومولود کے جسم و روح کی غذا کے طور پر ماں کا دودھ اور شفقت مادری درکار رہے۔ بچے اور ماں کا یہ انمٹ رشتہ ہے ایک پہلو یہ ہے کہ ماں کے جذبات کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے کیونکہ ایسے حساس لمحات میں ماں اپنی گود کو خالی نہیں دیکھ سکتی اور وہ بچے کی حالت دیکھ کے آرام سے نہیں رہ سکتی۔ اس لئے اس عرصے میں دیکھ بھال اور دودھ پلانے کا حق ماں کو دیا گیا ہے۔ یہ حکم دو پہلوؤں

کا حامل ہے۔اس میں بچے اور ماں دونوں کی حالت کوملحوظ رکھا گیا ہے۔

2۔ضروری نہیں کہ بچے کو دودھ پلانے کی مدت پورے دوسال ہی ہو۔دوسال تو اس صورت میں ہے اگر جو وہ دودھ پلانے کے اس دور کومکمل کرنا چاہئیں۔

لیکن مائیں حق رکھتی ہیں کہ نومولود کی حالت وکیفیت اور سلامتی کو مدّنظر رکھتے ہوئے اس میں کمی کردیں۔

3۔'' وَ عَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ '':

یہاں لفظ ''الاب ''،جس کے معنی باپ ہے استعمال نہیں ہوا بلکہ ''المولود له'' کی تعبیر استعمال کی گئی ہے جس کا معنی ہے ''وہ شخص جس کا بچہ پیدا ہوا ہے''۔یہ بات یہاں قابل توجہ ہے۔یہ تعبیر گویا اس لئے استعمال کی گئی ہے کہ اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے پدری جذبات کو زیادہ سے زیادہ تحریک دی جائے یعنی اگر بچے اور اس کی ماں کے اخراجات مرد کے ذمے رکھے گئے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کا بیٹا ہے اور اس کے دل کا میوہ ہے نہ کہ ایک اجنبی فرد۔

اس مقام پر ''بِالْمَعْرُوفِ '' کی شرط اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ماں کی غذا اور لباس رائج معیار کے مطابق اور شایان شان ہو۔اس سلسلے میں سختی درست ہے نہ فضول خرچی۔

اس کے بعد اس سلسلے میں ہر قسم کے ابہام کو دور کرنے کے لئے مزید وضاحت فرمائی گئی ہے کہ ہر باپ اپنی طاقت کے مطابق ذمہ دار ہے کیونکہ خداوند عالم کسی کی توانائی سے زیادہ اس پر ذمہ داری نہیں ڈالتا۔

4۔خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ ماں باپ اپنے بچے کی تقدیر اپنے اختلافات کی بھینٹ نہ چڑھا دیں اور ان اختلافات کے ذریعے نوزائیدہ بچے کی روح رواں پر ناقابل تلافی ضربیں نہ لگا دیں۔

دودھ پلانے کے دوران میں بچوں کی دیکھ بھال کا حق ماؤں کو حاصل ہے،مردوں کو چاہیئے کہ ان سے یہ حق چھین کر پامال نہ کریں اور مائیں بھی جنہیں یہ حق دیا گیا ہے اس سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں اور مختلف موہوم بہانوں سے دودھ پلانے سے پہلو تہی نہ کریں اور یونہی مرد کو بچے کی ملاقات سے محروم نہ کردیں۔

اس جملے کے مفہوم کے بارے میں اور تفسیریں بھی کی گئی ہیں لیکن جو کچھ یہاں بیان کیا گیا ہے وہ گذشتہ جملوں سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

5۔باپ کی موت کے بعد وارثوں کو چاہیئے کہ وہ اس ذمہ داری کو اپنے ذمہ لیں اور بچے کو دودھ پلانے کے دوران میں ماں کی ضرورت کو پورا کریں۔

6۔بچے کو دودھ چھڑوانے کا اختیار ماں باپ کو دیا گیا ہے۔گذشتہ آیت میں اگر چہ بچّے کو دودھ پلانے کی مدت کا تعین ہو چکا ہے لیکن ماں باپ بچے کی جسمانی کیفیت کو مدّنظر رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے صلاح ومشورہ اور باہمی رضامندی سے مناسب موقع پر بچے کا دودھ چھڑوا سکتے ہیں۔یعنی اگر ماں باپ باہمی رضامندی اور مشورے سے بچے کا دودھ چھڑوانا چاہیں کوئی حرج نہیں۔

7۔ ماں کے دودھ پلانے اور دیکھ بھال کرنے کے حق کو ہرگز نہیں روکا جاسکتا۔ لیکن اگر ماں خود انکار کردے یا اس میں کوئی رکاوٹ حائل ہوجائے تو اس صورت کے لئے ارشاد فرماتا ہے:

تمہیں حق پہنچتا ہے کہ بچے کی دیکھ بھال اور اسے دودھ پلانے کا کام کسی مناسب آیا کے سپرد کردو یا پھر کچھ مدت کے لئے دودھ پلانے کا کام اسے سونپ دو تا کہ ماں کے لئے مدد واعانت ہوسکے۔

''اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَیْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ''

اس جملے کا معنی ہے کہ ماں کی بجائے دودھ پلانے کے لئے دوسری عورت کا انتخاب طرفین کی رضامندی اور مشورے کے ساتھ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن شرط یہ ہے کہ ماں کے گذشتہ حقوق اور جتنا دودھ اس نے پلایا ہے اس کا حق پامال نہ ہوجائے بلکہ جو مروّج طریقہ ہے اس کے مطابق ہر حق ادا کیا جائے۔

'' وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ''

بعض اوقات عورت اور مرد کے مابین اختلافات انتقامی صورت اختیار کرلیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ان کی اپنی یا بیچارے بچوں کی زندگی خطرے سے دوچار ہوجاتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف کوئی سازش کررہے ہوں لہٰذا ان تمام احکام کے آخر میں فرماتا ہے: خدا سے ڈرو اور پرہیزگاری اختیار کرو اور جان لو کہ خدا تمہارے تمام اعمال کو دیکھتا ہے اور وہ بینا ہے۔

(۲۳۴) وَ الَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ یَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا فَعَلْنَ فِیْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ	اور تم سے جو لوگ وفات پا جاتے ہیں اور اپنی بیویاں پیچھے چھوڑے جاتے ہیں تو ان بیویوں کو چار مہینے اور دس دن انتظار کرنا چاہئے اور جب وہ یہ مدت پوری کرچکیں تو تم پر اس کا کوئی گناہ نہیں وہ اپنے بارے میں جو چاہیں مناسب طور پر انجام دیں (اور اپنی خواہش کے مطابق کسی سے نکاح کرلیں) اور تم جو کچھ عمل کرتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

تفسیر

شوہر کی وفات کے بعد دوسری شادی عورت کے لئے بنیادی اور مشکل مسائل میں سے ہے۔ پہلے شوہر کی وفات کے بعد فوری طور پر دوسری شادی کرنا سابق شوہر کی محبت، دوستی اور احترام کے منافی ہے۔ نیز یہ یقین پیدا کرنا بھی ضروری ہے کہ عورت کا رحم پہلے شوہر کے نطفے سے خالی ہے۔ علاوہ ازیں فوری طور پر دوسری شادی مرنے والے کے لواحقین کے جذبات کے مجروح ہونے کا سبب بھی ہے لہٰذا مندرجہ بالا آیت میں عورتوں کے لئے یہ شرط عائد کی گئی ہے کہ نئے نکاح کے لئے چار مہینے اور دس دن کی عدت گذاریں۔

شوہر کے مرنے کے بعد بھی ازدواجی زندگی کے حریم کا احترام ایک فطری امر ہے۔اس لئے مختلف قبائل میں اس مقصد کے لئے طرح طرح کے آداب ورسوم رہے ہیں اگر چہ بعض اوقات یہ بات زیادتی اور افراط کی شکل اختیار کر جاتی ہے اور عملی طور پر عورتیں قیدو بند میں ڈال دی جاتی ہیں۔بعض اوقات تو ایسی عورتوں پر بہت زیادہ ظلم روا رکھا جاتا رہا ہے۔بعض لوگ تو شوہر کے انتقال کے بعد عورت کو جلا دیتے تھے یا مرد کے ساتھ ہی زندہ دفن کر دیتے تھے۔

لوگوں میں یہ رسم بھی رہی ہے کہ عورت کو نئی شادی سے یکسر محروم کر کے گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا جاتا۔بعض قبائل میں یہ رواج تھا کہ شوہر کے انتقال کے بعد عورت ایک مدت تک سیاہ اور بوسیدہ خیمہ شوہر کی قبر پر گاڑتی اور اس میں پھٹے پرانے اور کثیف لباس میں وقت گذارتی، ہر طرح کی آرائش وزیور یہاں تک کہ نہانے دھونے سے بھی دور رہتی اور یونہی اس کے شب وروز گزر جاتے۔

زیرنظر آیت نے ان تمام خرافات پر خط بطلان کھینچ دیا ہے اور شائستہ طور پر حریم زوجیت کی بنیاد کی حفاظت کے لئے ''عدت'' مقرر کردی ہے۔

''فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيۡمَا فَعَلۡنَ فِىۡٓ اَنۡفُسِهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ''

''بلوغ اجل'' کا مفہوم ہے ''مہلت کا انجام کو پہنچنا'' آیت کے اس حصے کے مطابق اس مدت عدت کے خاتمے پر عورتیں اپنی خواہش کے مطابق شادی کر سکتی ہیں۔

بعض اوقات اولیاء خرافات اور موہوم افکار کی بناء پر عورت کے نکاح ثانی میں حائل ہوتے ہیں اس لئے آیت انہیں مخاطب کر کے کہتی ہے: اس سلسلے میں اب تمہاری کوئی ذمہ داری نہیں، تم انہیں چھوڑ دو کہ وہ اپنی پسند کے مردوں سے رشتۂ نکاح صحیح بنیاد پر قائم کرلیں۔

''وَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ''

اور اولاد کے امور کے بارے میں دخل اندازی نہ کریں کیونکہ پروردگار تمام چیزوں سے باخبر ہے اور وہ ہر شخص کو اس کے اچھے اور برے اعمال کی جزا دے گا۔

(۲۳۵)وَ لَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيۡمَا عَرَّضۡتُمۡ بِهٖ مِنۡ خِطۡبَةِ النِّسَآءِ اَوۡ اَكۡنَنۡتُمۡ فِىۡٓ اَنۡفُسِكُمۡ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمۡ سَتَذۡكُرُوۡنَهُنَّ وَلٰـكِنۡ لَّا تُوَاعِدُوۡهُنَّ سِرًّا اِلَّاۤ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا ؕ	اور اس بات کا تم پر کوئی گناہ نہیں اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ اشارے کنائے سے تم (ان عورتوں سے) خواستگاری کرو یا بلا اظہار دل میں اس کے لئے پختہ ارادہ کرلو۔خدا جانتا تھا کہ تم ان کی یاد میں گرفتار ہو جاؤ گے لیکن ان سے پوشیدہ طور پر مباشرت کا وعدہ نہ کرو ہاں مگر (کنایہ کے طور پر) پسندیدہ طریقے سے اظہار کرو

وَ لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۠	(لیکن ہر حالت میں) ان کی عدت ختم ہونے تک شادی کا اقدام نہ کرو اور جان لو کہ جو کچھ تمہارے دل میں ہے خدا اسے جانتا ہے، اس کی مخالفت سے ڈرو اور جان لو کہ خدا بخشنے والا اور بردبار ہے۔

تفسیر

قرآن یہ چاہتا ہے کہ سابق زوجیت کا احترام بھی زائل نہ ہو اور نہ ہی عورت اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے سے محروم رہے۔ اس بناء پر اس سلسلے میں مندرجہ بالا آیت میں ایک قابل توجہ حکم دیا ہے جو عادلانہ بھی ہے اور اس میں طرفین کا مکمل احترام بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ آیت کہتی ہے کہ اگر کوئی شخص دوران عدت عورت سے خواستگاری کرنا چاہے تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن وہ پوشیدہ طور پر اور اشارہ و کنایہ کی صورت میں ہو نہ کہ آشکار اور صریح۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے کہ بغیر اظہار کے (جس میں صراحت ہو نہ کنایہ) ان سے عدت وفات کے بعد نکاح کرنے کے ارادے میں بھی کوئی گناہ نہیں۔

"عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ"

آیت کے اس حصے کے مطابق یہ حکم اس بناء پر ہے کہ ان کے شوہروں کے (اس دنیا سے) چل بسنے کے بعد یہ فطری امر ہے کہ بعض افراد ان سے شادی کرنے کی فکر میں پڑ جاتے ہیں اور چونکہ اسلام فطری اور معقول خواہشات کی مخالفت نہیں کرتا لہٰذا اس فکر کو وہ گناہ شمار نہیں کرتا۔

"لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا"

آیت کے اس حصے میں سمجھایا گیا ہے کہ کھلے بندوں خواستگاری ہی سے رکنا کافی نہیں بلکہ مخفی طور پر عدت کے دوران میں عورت سے بالصراحت خواستگاری نہیں کرنا چاہئے البتہ اس سلسلے میں گفتگو واقعاً اس طرح ہو کہ معاشرتی آداب اور فوت شدہ شوہر کے احترام سے ہم آہنگ ہو۔ قرآن کی اصطلاح میں "معروف"، یعنی پسندیدہ ہو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ پردے اور کنائے سے ہو۔

"وَ لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ....."

آیت کے اس حصے میں صراحت سے فرمایا گیا ہے کہ جب تک عدت ختم نہ ہو نکاح نہ کیا جائے۔ مسلّم ہے کہ اگر دوران عدہ میں نکاح کرے تو نکاح باطل ہے بلکہ وہ عورت اس کے لئے حرم ابدی ہوگی۔

اس کے بعد مزید ارشاد فرمایا گیا ہے کہ خدا تمہارے مخفی بھیدوں سے آگاہ ہے لہٰذا اس کے فرمان کی مخالفت سے ڈرتے رہو۔ لیکن خدا یہ بھی نہیں چاہتا کہ جو بندے کبھی کبھار اس کی مخالفت کر بیٹھیں وہ بالکل اس کی رحمت سے مایوس ہو جائیں۔ لہٰذا قرآن

فرماتا ہے: جان لو کہ خدا بخشنے والا ہے اور وہ بندوں کو سزا دینے میں جلد بازی سے کام نہیں لیتا

(۲۳۶) لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚۖ وَّ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًاۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ	اگر مباشرت اور تعیین مہر سے قبل (بوجوہ) عورتوں کو طلاق دے دو تو تم پر کوئی گناہ نہیں (اس موقع پر) انہیں (مناسب ہدیہ کی صورت میں) بہرہ مند کرو۔ جو شخص طاقت رکھتا ہے وہ اس کیمطابق اور جو تنگ دست ہے وہ اپنے حسب حال شائستہ ہدیہ دے اور یہ نیکوکاروں کے لئے ضروری ہے۔

تفسیر

لغت میں "مس" کا معنی ہے "چھونا"۔ یہاں مباشرت کے عمل سے کنایہ ہے۔ زیر نظر آیت دو (۲) نکات پر مشتمل ہے۔

1۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ مباشرت اور تعیین حق مہر سے قبل طلاق دینا صحیح نہیں۔ آیت نے ان کے خیال کی تردید کی ہے اور فرمایا ہے کہ اس میں کسی قسم کا کوئی حرج نہیں ہے۔

البتہ اس کی صورت یہ ہے کہ طرفین عقد کے بعد مباشرت سے قبل کئی ایک وجوہ کی بنیاد پر یہ سمجھیں کہ وہ ایک ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اس موقع پر طرفین طلاق کے ذریعے ایک دوسرے سے جدا ہو سکتے ہیں۔

2۔ مباشرت سے قبل طلاق کی صورت میں اگر حق مہر معین شدہ نہ ہو تو ایسا ہدیہ جو کہ عورت کے شایان شان ہو اسے ادا کیا جائے۔

حق مہر معین ہو چکا ہو تو اس صورت میں کیا کرنا چاہئے؟ اس کی وضاحت اگلی آیت میں آئے گی۔ اس بیان کے مطابق لفظ "او" "واؤ" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

ہدیہ دینے کے بارے میں لوگوں کی طاقت اور استطاعت کو مدنظر رکھتے ہوئے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے:

" عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ "

"موسع" کا معنی ہے "تونگر" اور "مقتر" کا معنی ہے "تنگ دست" اس لئے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ صاحب ثروت اپنی حیثیت کے مطابق اور تنگ دست اپنی استطاعت کے مطابق ہدیہ ادا کرے۔

"مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ" یعنی یہ ہدیہ شائستہ طور پر ہو، اسراف و بخل دونوں سے پاک ہو۔ دینے والے اور لینے والے ہر دو کے حسب حال ہو۔

یہ ہدیہ اہم تاثیر کا حامل ہے۔ جذبہ انتقام کو ختم کرنے اور عورت کو کئی ایک مشکلات سے بچانے کے لئے یہ اہم کردار ادا کر سکتا ہے (یہ مشکلات اس رشتہ ازدواج کے ٹوٹنے سے پیدا ہو سکتی ہیں) لہٰذا آیت میں اس عمل کو نیکی اور احسان کے جذبے سے وابستہ

کردیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے نیک لوگوں کے لئے یہ عمل ضروری ہے۔ یعنی اسے نیکی اور صلح وصفائی کے جذبے سے سرشار ہونا چاہئے۔

یہ بات بھی کہے بناواضح ہے کہ "محسنین" کی تعبیر کا یہ مقصد نہیں کہ مذکورہ ہر حکم الزامی وضروری نہیں بلکہ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے لوگوں کے جذبات واحساسات کو تحریک دینے کے لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے ورنہ جیسا کہ اشارہ کیا جاچکا ہے یہ حکم بجالانا لازمی اور ضروری ہے۔

دوسرا اہم نکتہ اس آیت سے یہ سامنے آتا ہے یہ ہے کہ مرد کی طرف سے عورت کو دیئے جانے والے اس ہدیے کو "متاع" کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ لغت میں متاع کا معنی ہے وہ چیزیں جن سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے اور ان سے متمتع ہوتا ہے۔ یہ لفظ زیادہ تر نقدی کے علاوہ چیزوں پر بولا جاتا ہے کیونکہ نقدی سے براہ راست فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا بلکہ ضروری ہے کہ وہ متاع میں تبدیل ہو۔ اسی بناء پر قرآن ہدیئے کو متاع سے تعبیر کرتا ہے۔

(۲۳۷)وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِیْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَ اَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ	اور اگر عورتوں کو چھونے (اور ان سے ہمبستری کرنے) سے قبل طلاق دے دو جب کہ حق مہر معین ہو چکا ہو تو (ضروری ہے کہ) معین شدہ کا نصف (انہیں دے دو) مگر یہ کہ وہ (اپنا حق) بخش دیں یا (اگر وہ صغیر اور سفیہ ہیں تو ان کا حق) جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے اسے بخش دے اور اگر تم درگزر کرو (اور تمام مہر انہیں ادا کردو) تو پرہیزگاری کے زیادہ نزدیک ہے۔ نیز درگذر اور پرہیزگاری کو اپنے درمیان سے فراموش نہ کردو کیونکہ تم جو کچھ انجام دیتے ہو خداوند عالم اس سے بینا ہے۔

تفسیر

اس آیت میں بھی طلاق کے بارے میں حکم بیان کیا گیا ہے۔ گذشتہ صورت کی طرح اگر مباشرت کا عمل نہیں ہوا لیکن حق مہر معین ہو چکا ہے تو اس سلسلے میں آیت پہلے قانون اسلام کی نگاہ میں جو حکم ہے اسے بیان کرتی ہے اور وہ یہ کہ مرد کو چاہئے کہ مقرر شدہ حق مہر سے آدھا ادا کرے۔ قانونی حکم جو اجتماعی نظام کی حقیقی بنیاد ہے اسے بیان کرنے کے بعد اخلاقی پہلو بیان کئے گئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: آدھے حق مہر کی ادائیگی کا حکم تو عفو اور بخشش سے صرف نظر کرتے ہوئے ہے لیکن اگر عورت اپنے مسلمہ حق سے درگذر کرے تو پھر شوہر پر کچھ واجب نہیں ہے۔

اسی طرح اگر جس کے ہاتھ میں نکاح کا معاملہ ہے وہ حق مہر سے چشم پوشی کرلے تو شوہر پر کوئی چیز واجب نہیں ہوگی۔

'' وَ اَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی''، یہ جملہ مرد اور اس کے انسانی فرائض کے بارے میں ایک اور حکم بیان کرتا ہے اور وہ یہ کہ بہتر ہے مرد درگزر کی راہ اپنائے اور اگر تمام حق مہر ادا کر چکا ہے تو اس میں سے کچھ واپس نہ لے اور اگر ادا نہیں کیا تو سارے کا سارا ادا کر دے اور اپنے آدھے حق سے صرف نظر کر لے۔ آیت کے اس حصّے میں بتایا گیا ہے کہ اگر مرد عفو اور درگذر سے کام لے تو یہ پرہیزگاری کے نزدیک ہے۔

اسلام چاہتا ہے کہ جدائی اور علیحدگی کا مرحلہ بھی ''معروف'' اور ''احسان'' کی بنیاد پر انجام پذیر ہو۔ یعنی انتقام ہی سے خالی نہ ہو بلکہ مرد اور عورت دونوں عظمت و بزرگی کی روح کو بھی فراموش نہ کریں۔ فرماتا ہے: اپنے درمیان سے کبھی نیکی، عظمت اور احسان کو فراموش نہ کرو۔ کیونکہ خدا تمہارے اعمال کو دیکھنے والا ہے۔

(۲۳۸) حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ	تمام نمازوں کی انجام دہی اور (خصوصاً) نماز وسطیٰ (نماز ظہر) کی ادائیگی میں کوشاں رہو اور خضوع و اطاعت کے ساتھ خدا کے لئے قیام کرو۔
(۲۳۹) فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ	اور اگر (جنگ یا کسی اور خطرے کی وجہ سے) تمہیں خوف ہو تو (نماز کو) پیادہ یا سواری کی حالت میں انجام دو لیکن جب حالت امن لوٹ آئے تو خدا کو یاد کرو جیسا کہ اس نے تمہیں ان چیزوں کی تعلیم دی ہے جنہیں تم نہیں جانتے تھے۔

شان نزول

بعض منافقین نے گرمی کا بہانہ تراشا اور مسلمانوں کی صفوں میں تفرقہ ڈالنے کے لئے وہ نماز با جماعت میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ ان کے دیکھا دیکھی اور لوگوں نے بھی شرکت ترک کر دی۔ اس طرح مسلمانوں کی جماعت میں کمی آ گئی۔ اس پر پیغمبر اکرم ﷺ بہت پریشان تھے۔ آپ ﷺ نے انہیں سخت سزا کی دھمکی دی۔ زید بن ثابت سے منقول ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ سخت ترین گرمی میں بھی دوپہر ہوتے ہی نماز ظہر جماعت کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ یہ عمل آپ ﷺ کے اصحاب کے لئے بہت گراں تھا۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں نماز کی اہمیت بالعموم اور نماز ظہر کی اہمیت بالخصوص بیان ہوئی۔

تفسیر

نماز انسان کو خالق کائنات سے مربوط کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور اگر وہ اپنی صحیح شرائط کے ساتھ انجام پا جائے تو دل کو عشق خدا سے معمور کر دیتی ہے اور اس کے ذریعے انسان بہتر طور پر گناہوں، آلودگیوں اور پروردگار کی نافرمانیوں سے محفوظ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا

یہ آیت تاکید کرتی ہے کہ مسلمان اس فریضہ کو قائم کرنے میں کوشاں رہیں اور خشوع وخضوع اور پوری توجہ سے بجالائیں۔خصوصاً نماز وسطیٰ کی حفاظت کریں۔

صلوٰۃ وسطیٰ کے بارے میں مفسرین نے مختلف آراء پیش کی ہیں لیکن ہمارے پیش نظر جو قرآئن ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے مراد نماز ظہر ہی ہے۔کیونکہ علاوہ اس کے کہ نماز ظہر دن کے وسط اور درمیان میں بجالائی جاتی ہے۔آیت کی شان نزول بھی گواہی دیتی ہے کہ نماز ظہر کی تاکید اس لئے ہے کہ لوگ گرمی کی وجہ سے اس میں کوتاہی کرتے تھے۔

(۲۳۹) زیر نظر دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے "فَاِنۡ خِفۡتُمۡ فَرِجَالًا اَوۡ رُكۡبَانًا" "رجال" یہاں "راجل" کی جمع ہے جس کا معنی ہے پا پیادہ اور "رکبان" "راکب" کی جمع ہے جس کا معنی ہے سوار۔یعنی میدان جنگ یا ایسے کسی اور موقع پر خوف کے عالم میں تم پیدل چلتے ہوئے یا سواری وحرکت کی حالت میں بھی نماز ادا کرسکتے ہو۔

اس آیت میں تاکید کی گئی ہے کہ سخت ترین حالات حتیٰ کہ جنگ میں نماز کو ترک نہیں کرنا چاہئے۔البتہ فرق یہ ہے کہ خطرے کی حالت میں نماز کی بہت سی شرائط ساقط ہوجاتی ہیں مثلاً قبلہ رو ہونا۔متعارف اور معمول کے طریقے سے رکوع وسجود بجالانا اور اس قسم کی دیگر چیزیں۔ایسی حالت میں رکوع وسجود کو اشارے سے بھی بجالایا جاسکتا ہے۔

"فَاِذَآ اَمِنۡتُمۡ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمۡ مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ"

آیت کا یہ حصہ نشاندہی کرتا ہے کہ پیدل چلتے ہوئے اور سواری پر نماز کی ادائیگی حالت خوف وخطر سے مخصوص ہے اور جب امن وامان قائم ہوجائے اور راحت وآرام میسر آجائے تو پھر عام حالت کی طرح نماز ادا کرنا چاہئے۔

اس کے بعد مزید ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تم بہت سی چیزوں کو نہیں جانتے تھے اور خدا نے تمہیں ان کی تعلیم دی ہے۔امن اور خوف میں نماز پڑھنے کا طریقہ بھی اس نے تمہیں سکھایا ہے۔واضح ہے کہ اس تعلیم کا شکرانہ یہی ہے کہ اس کے مطابق عمل کیا جائے اور جیسا حکم دیا جائے ویسا عمل کیا جائے۔

(۲۴۰) وَ الَّذِيۡنَ يُتَوَفَّوۡنَ مِنۡكُمۡ وَ يَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزۡوَاجِهِمۡ مَّتَاعًا اِلَى الۡحَـوۡلِ غَيۡرَ اِخۡرَاجٍ ۚ فَاِنۡ خَرَجۡنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِىۡ مَا فَعَلۡنَ فِىۡٓ اَنۡفُسِهِنَّ مِنۡ مَّعۡرُوۡفٍ ؕ	اور تم میں سے جو لوگ آستانۂ موت تک جا پہنچے ہیں اور اپنی بیویاں پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ان کے لئے وصیّت کرنی چاہئے کہ ایک سال تک انہیں (زندگی کے اخراجات سے) بہرہ مند کریں بشرطیکہ وہ (شوہر کے گھر سے) باہر نہ نکلیں (اور نئی شادی کے لئے اقدام نہ کریں) اور اگر وہ باہر چلی جائیں (تو مصارف حیات لینے کا حق نہیں رکھتیں لیکن) ان پر اس بارے میں کوئی گناہ (بھی) نہیں کہ وہ اپنے لئے کوئی شائستہ اقدام کریں

وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ	اور خدا توانا و حکیم ہے۔

تفسیر

آیت کے پہلے حصے میں حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگ جو موت کے آستانے تک جا پہنچیں اور اپنی بیویاں پیچھے چھوڑ جائیں تو انہیں وصیت کرنا چاہئے کہ ان کے پسماندگان ایک سال تک ان کے مال سے ان کی بیویوں کے اخراجات ادا کریں۔ اس لئے لفظ ''یتوفّون'' مرنے کے معنی میں نہیں بلکہ ذکر وصیت کے قرنیہ سے موت کے آستانے پر جا پہنچنا مراد ہے البتہ اس شرط کے ساتھ کہ عورت بھی شوہر کی موت کے بعد ایک سال تک اس کے گھر میں رہے اور اس سے باہر نہ نکلے۔

''فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ''

یہ جملہ دو معانی پر منطبق ہوسکتا ہے۔

1۔ عورت کا حق ہے کہ مرد کے وارث ایک سال تک اس کے مصارف ادا کریں لیکن اگر عورت اپنی خوشی سے ایک سال کا خرچ نہ لے اور شوہر کے گھر میں بھی نہ رہے تو پھر کوئی اس کا جواب دہ نہیں ہے اور اگر عورت دوسری شادی کر لے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ اس تفسیر کے مطابق آیت میں اجازت دی گئی ہے کہ عورت پہلے سال کے دوران میں نان نفقہ سے صرف نظر کر کے سابق شوہر کے گھر سے چلی جائے۔

2۔ اگر عورت ایک سال تک صبر کرے اور یہ مدت پوری کرنے کے بعد شوہر کے گھر سے نکلے اور پھر نئی شادی کر لے تو کوئی حرج نہیں۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت اسی سورہ کی آیت ۲۳۴ کے ذریعے منسوخ ہوگئی ہے۔ اس میں عدت وفات چار ماہ اور دس دن معین کی گئی ہے۔ اگرچہ وہ آیت تنظیم اور ترتیب کے اعتبار سے پہلے آئی ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ سورتوں کی آیات کی تنظیم تاریخ نزول کے مطابق نہیں ہے۔

(۲۴۱) وَ لِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ	(شوہر کی طرف سے) تمام مطلقہ عورتوں کو ہدیہ دیا جانا مناسب ہے۔ یہ پرہیزگار مردوں پر حق ہے۔
(۲۴۲) كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۧ	اس طرح خدا اپنی آیات تمہارے سامنے بیان کرتا ہے کہ شاید تم غور و فکر کرو۔

تفسیر

جیسا کہ پہلے اشارہ ہو چکا ہے ایسے مواقع پر متاع سے مراد ہدیہ ہے جو مرد عورت کو طلاق کے بعد دیتا ہے۔ یہ آیت احکام طلاق کا خاتمہ ہے اس میں بھی جذبہ انتقام کو زیادہ سے زیادہ ختم کرنے کے لئے اور بغض و کینہ کے خاتمے کے لئے مطلقہ عورتوں کے

بارے میں پھر سفارش کی گئی ہے۔آیت کہتی ہے کہ مردوں کے فرائض میں داخل ہے کہ جب اپنی بیوی کو طلاق دیں تو انہیں ہدیہ پیش کریں اور یہ فریضہ تمام پرہیز گار مردوں پر عائد کیا گیا ہے۔البتہ اس آیت کا ظاہری مفہوم سب عورتوں کے بارے میں ہے لیکن جیسا کہ آیت ۲۳۶ میں کہا جا چکا ہے کہ ہدیہ دینا صرف اس صورت میں واجب ہے کہ حق مہر معین نہ ہوا ہو اور رخصتی بھی نہ ہوئی ہو۔اس بناء پر یہ حکم باقی صورتوں کے لئے مستحب ہوگا۔دراصل اسلام کا یہ حکم انسانی پہلو کا حامل ہے۔

(۲۴۲)اس طرح عملی پہلو رکھنے والی معلومات بھی ہیں۔ان پر بھی تعقل کا اطلاق اسی صورت میں ہوگا جب وہ عملی پہلو کی حامل ہوں گی۔

(۲۴۳)اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۫ ثُمَّ اَحْیَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ	کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو موت کے خوف سے اپنے گھروں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور وہ ہزاروں افراد تھے خدا نے ان سے کہا کہ مرجاؤ۔خدا نے پھر انہیں زندہ کیا۔خداوند عالم تو اپنے بندوں پر احسان کرتا ہے لیکن زیادہ تر لوگ شکر بجا نہیں لاتے۔

شان نزول

شام کے ایک شہر میں طاعون کی بیماری پیدا ہوگئی۔بڑی عجیب اور سرسام آور تیزی سے لوگ مرنے لگے کچھ لوگ موت سے بچنے کے لئے وہ شہر اور علاقہ چھوڑ گئے۔علاقے سے فرار اور موت سے نجات نے ان میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ وہ بہت قدرت و استقلال کے مالک ہیں۔ارادۂ الٰہی سے بے پرواہ ہو کر فقط طبیعی عوامل پر نظر رکھتے ہوئے وہ غرور اور فریب میں مبتلا ہوئے لہٰذا پروردگار نے انہیں اسی بیماری کے ذریعے اسی بیابان میں نیست و نابود کر دیا۔

اس واقعے کے ایک عرصے بعد بنی اسرائیل کے ایک نبی حضرت حزقیل (بعض روایات کے مطابق حضرت موسیٰ کے بعد حضرت حزقیل بنی اسرائیل کے تیسرے راہنما تھے) وہاں سے گذرے انہوں نے خدا سے خواہش کی کہ انہیں زندہ کر دے۔خدا نے ان کی دعا قبول کر لی اور وہ دوبارہ زندہ ہو گئے۔

تفسیر

اس آیت میں ایک گروہ کی کیفیت بیان کی گئی ہے کہ وہ موت کے ڈر سے اپنے گھروں کو چھوڑ دیا اور پھر وہ سب لوگ خدا کے حکم سے مر گئے اور انہیں بھاگ جانے کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔یہ بات واضح ہے کہ لفظ ''الوف'' جس کا معنی ہے ہزاروں، یہ یہاں کسی خاص تعداد کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ اس گروہ کی زیادتی اور کثرت کی طرف اشارہ ہے۔اسی لئے بعض روایات میں ان کی تعداد دس ہزار اور بعض میں ستر ہزار بیان کی گئی ہے۔

یہ بھی واضح ہے کہ ''موتوا''یعنی ''مرجاؤ'' سے یہ حکم لفظی نہیں بلکہ خدا کا امر تکوینی ہے جو تمام عالم ہستی اور جہان حیات پر حکم فرما ہے۔یعنی خدا نے ان کی موت کے اسباب عوامل فراہم کیے اور سب کے سب بڑی تیزی سے مرگئے یہ امر اس امر کی طرح ہے۔

اس کا حکم صرف یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کے ہونے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے ہو جا اور وہ فوراً ہو جاتی ہے (یاسین۔۸۲)

''ثمّ احیاھم'' آیت کے اس حصّے میں اس گروہ کی موت کے بعد پھر زندگی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔شان نزول میں بیان کیا جا چکا ہے کہ ایسا حضرت حزقیل (جو پیغمبر تھے) کی دعا سے ہوا۔

ان کی دوبارہ زندگی خدا کی ایک واضح دلیل اور نشانی تھی اس لئے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے:صرف یہ ایک نعمت نہ تھی جو خدا نے انہیں عطا فرمائی۔خدا تمام لوگوں کے لئے بخشنے والا اور مہربان ہے اور سب کو اپنی نعمتوں اور احسانات سے نوازتا رہتا ہے، لیکن یہ بات باعث افسوس ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ ان نعمتوں کا شکر نہیں بجالاتے۔

ایک اہم نکتہ

رجعت کی طرف اشارہ

مشہور شیعہ عالم شیخ صدوقؒ نے اسی آیت سے رجعت کے امکان کے مسئلہ پر استدلال کیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ہمارے عقائد میں سے ایک عقیدہ رجعت ہے البتہ رجعت کا تناسخ سے کوئی تعلق نہیں۔اس مسئلے کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

(۲۴۴)وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ	اور راہ خدا میں جنگ کرو اور جان لو کہ خدا سننے والا جاننے والا ہے۔
(۲۴۵)مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا کَثِیْرَةً ؕ وَ اللّٰہُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ	کون ہے جو خدا کو قرض حسنہ دے (اور اس نے جو مال دیا ہے اس میں سے خرچ کرے) تا کہ خدا اس مال کو اس کے لئے کئی گنا کردے اور خدا (بندوں کی روزی کو) محدود اور وسیع کرتا ہے۔اور اس کی طرف لوٹ جاؤ گے۔

تفسیر

بنی اسرائیل کے بعض لوگوں کی سرگذشت جو گذشتہ آیت میں بیان ہوئی ہے۔یہ واضح ہو چکا ہے کہ موت وحیات پروردگار کے ہاتھ میں ہے۔اگر یہ واقع نظر میں رہے تو انسان یہ سمجھ سکتا ہے کہ جہاد سے بھاگ جانے اور جنگ میں سستی کرنے سے وہ موت سے نہیں بچ سکتا۔

زیر نظر آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ راہ خدا میں جہاد کرو اور جان لو کہ خدائے بزرگ و برتر تمام چیزوں سے باخبر ہے اور

تمہارے باطن سے اٹھنے والے علل واسباب کو جانتا ہے اور جنگ کے بارے میں تمہاری نیتوں سے آگاہ ہے۔ وہ تمہاری ہر گفتگو سنتا ہے اور کوئی چیز اس کی درگاہ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

(۲۴۵) زیرِ نظر دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ''مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا''

جیسے معاشرہ اپنے استقلال، پیش رفت اور سر بلندی کے لئے مجاہد و مبارز افراد کا محتاج ہے اس طرح محروم انسانوں کی حمایت، عمومی منافع اور وسائل جہاد کے لئے بھی کمک کی ضرورت ہے۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن راہِ خدا میں خرچ کرنے کے معاملے پر خاص طور پر زور دیتا ہے۔

خدا بندوں سے قرض لیتا ہے

یہ امر قابل غور ہے کہ قرآن اس آیت میں اور چند دیگر آیات میں اس اجتماعی ذمہ داری کو قرض سے تعبیر کرتا ہے۔

یہ نکتہ نگاہ میں رہے کہ تمام اموال کا حقیقی مالک پروردگار عالم ہے۔ انسان تو صرف نمائندہ خدا ہونے کی حیثیت سے اس میں صرف کرتا ہے۔ البتہ اس سر پرستی اور نمائندگی کی شرط یہ ہے کہ اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے علاوہ عام لوگوں کی حاجات و ضروریات کو پورا کرنے کے لئے خرچ کرے۔

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود قرآن کہتا ہے کہ اس مادی کمک کو خدا کو قرض دینے کے حساب میں شمار کرو۔ اس خالق کائنات کو قرض دو کہ جس کی طرف سے تمام چیزیں ہیں اور جب واپس لو گے تو کئی گنا ملے گا۔

اس سے بندوں پر پروردگار کے انتہائی لطف و کرم کا اظہار ہوتا ہے اور انفاق اور خرچ کرنے کی کمال اہمیت اس سے عیاں ہوتی ہے۔ باوجودیکہ وہی مالک اور بخشنے والا ہے۔ پھر بھی اپنے بندے سے قرض کی خواہش کرتا ہے اور قرض بھی ایسا کہ جس کے ساتھ اس قدر نفع بھی شامل ہو جائے یعنی خداوند کریم کا کرم بین اور لطف و عنایت۔

''وَ اللّٰہُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ ۠ وَ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ''

آیت کے آخر میں یہ جملہ گویا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ خیال نہ کرنا کہ انفاق اور بخشش تمہارے اموال کو کم کر دیتے ہیں کیونکہ تمہارے سرمائے کی وسعت اور محدودیت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہی ہے جو آسمان اور زمین کی برکتوں سے تمہیں مالا مال کر سکتا ہے اور عطا کردہ اموال کی جگہ کئی گنا ثروت تمہیں بخش سکتا ہے۔ بلکہ معاشرتی روابط اور وابستگیوں کے انداز پر نظر کی جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہی عطا کردہ اموال آخر کار تمہاری طرف پلٹ آئیں گے۔

ان تمام چیزوں کے باوجود یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ تم نے خدا کی طرف پلٹ جانا ہے اور ایک اور جہان تمہارے آگے ہے جہاں تم اپنے ان انفاق اور مصارف کا ثمرہ پاؤ گے۔

(۲۴۶)اَلَمۡ تَرَ اِلَی الۡمَلَاِ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰیۘ اِذۡ قَالُوۡا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابۡعَثۡ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِؕ قَالَ هَلۡ عَسَیۡتُمۡ اِنۡ كُتِبَ عَلَیۡكُمُ الۡقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوۡاؕ قَالُوۡا وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَ قَدۡ اُخۡرِجۡنَا مِنۡ دِیَارِنَا وَ اَبۡنَآئِنَاؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیۡهِمُ الۡقِتَالُ تَوَلَّوۡا اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡهُمۡؕ وَ اللّٰهُ عَلِیۡمٌۢ بِالظّٰلِمِیۡنَ	کیا تم نے دیکھا نہیں کہ بنی اسرائیل کا ایک گروہ موسیٰ کے بعد اپنے نبی سے کہنے لگا کہ ہمارے لئے کسی فرمانروا کا انتخاب کردیں تاکہ (اس کی قیادت میں) ہم راہ خدا میں جنگ کریں۔ ان کے پیغمبر نے کہا کہ ہوسکتا ہے کہ تمہیں جنگ کا حکم دیا جائے تو تم (روگردانی کرو اور) راہ خدا میں جہاد نہ کرو۔ انہوں نے کہا کہ کیسے ممکن ہے کہ ہم راہ خدا میں جنگ نہ کریں جب کہ ہمارے گھر اور اولاد ہم سے چھوٹ چکے ہیں (اور ہمارے شہروں پر دشمنوں نے قبضہ کر کے ہماری اولاد کو قید کر لیا ہے) لیکن جب انہیں جنگ کا حکم دیا گیا تو چند لوگوں کے علاوہ سب پھر گئے اور خدا ستمگروں کو جانتا ہے۔
(۲۴۷)وَ قَالَ لَهُمۡ نَبِیُّهُمۡ اِنَّ اللّٰهَ قَدۡ بَعَثَ لَكُمۡ طَالُوۡتَ مَلِكًاؕ قَالُوۡۤا اَنّٰی یَكُوۡنُ لَهُ الۡمُلۡكُ عَلَیۡنَا وَ نَحۡنُ اَحَقُّ بِالۡمُلۡكِ مِنۡهُ وَ لَمۡ یُؤۡتَ سَعَةً مِّنَ الۡمَالِؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰهُ عَلَیۡكُمۡ وَزَادَهٗ بَسۡطَةً فِی الۡعِلۡمِ وَ الۡجِسۡمِؕ وَ اللّٰهُ یُؤۡتِیۡ مُلۡكَهٗ مَنۡ یَّشَآءُؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ	ان کے نبی نے ان سے کہا کہ خدا نے طالوت کو تمہاری بادشاہی کے لئے (انتخاب کر کے) بھیجا ہے۔ وہ کہنے لگے یہ ہم پر کیسے حکومت کرسکتا ہے جب کہ ہم اس سے زیادہ اہل ہیں اور اس کے پاس تو زیادہ دولت و ثروت بھی نہیں ہے۔ اس (نبی) نے کہا کہ اسے خدا نے علم اور جسمانی طاقت میں تم سے برتری کی بنیاد پر منتخب کیا ہے۔ خدا جسے چاہتا ہے اپنا ملک بخش دیتا ہے اور خدا کا احسان وسیع ہے اور وہ (لوگوں کی اہلیت سے) آگاہ ہے۔

(۲۴۸)وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۠	اوران کے نبی نے ان سے کہا کہ اس کی حکومت کی نشانی یہ ہے کہ ''صندوق عہد'' تمہاری طرف آئے گا۔ (وہی صندوق کہ) جس میں آل موسیٰ اور آل ہارون کی یادگاریں ہیں جب کہ فرشتوں نے اسے اٹھا رکھا ہوگا اور اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اس میں تمہارے لئے (واضح) نشانی ہے۔
(۲۴۹)فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْۤ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ	اور جب طالوت بنی اسرائیل کے لشکر کی فرمانروائی کے لئے مقرر ہوگئے اور وہ لشکر کو باہر لے گئے تو ان سے کہا کہ خدا تمہارا پانی کی ایک لہر کے ذریعے امتحان لے گا تو جو لوگ (پیاس کے وقت) اسے پی لیں گے وہ مجھ سے نہیں ہیں اور جو اس کو نہ چکھے گا وہ مجھ سے ہے مگر (ہاں) جو اپنے ہاتھ سے ایک ہاتھ سے ایک (آدھا) چلو بھر (کے پی) لے (تو کوئی حرج نہیں) چند افراد کے علاوہ سب نے اس سے پانی پی لیا۔ اس کے بعد وہ اور ان پر ایمان لانے والے نہر سے گذر گئے تو (بعض لوگ) کہنے لگے آج ہم جالوت اور اس کی فوج سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے لیکن وہ جو جانتے کہ خدا کی ملاقات ہوگی (اور وہ قیامت پر ایمان رکھتے تھے) کہنے لگے کہ کتنے ہی ایسے تھوڑے لوگ تھے جو حکم خدا سے بڑے بڑے گروہوں پر غالب آئے اور کامیاب ہوگئے اور خدا صابرین کے ساتھ ہے۔

(۲۵۰)وَ لَمَّا بَرَزُوۡا لِجَالُوۡتَ وَجُنُوۡدِہٖ قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَیۡنَا صَبۡرًا وَّ ثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَ انۡصُرۡنَا عَلَی الۡقَوۡمِ الۡکٰفِرِیۡنَ	اور وہ جالوت اور اس کے لشکر کے سامنے (مقابلے کے لئے) ڈٹ گئے تو کہنے لگے پروردگار! ہم پر شکیبائی اور استقامت نازل فرما اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور ہمیں کافر قوم پر کامیابی عطا فرما۔
(۲۵۱)فَهَزَمُوۡهُمۡ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۛ وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوۡتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الۡمُلۡکَ وَ الۡحِکۡمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا یَشَآءُ ؕ وَ لَوۡ لَا دَفۡعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الۡاَرۡضُ وَ لٰکِنَّ اللّٰهَ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ	اس کے بعد انہوں نے خدا کے حکم سے دشمن کی فوج کو شکست سے دوچار کر دیا اور داؤد نے جو طالوت کے لشکر میں قوی اور شجاع نوجوان تھے) جالوت کو قتل کر دیا اور خدا نے انہیں حکومت اور علم و دانش عطا فرمائی اور جو کچھ اس (اللہ) نے چاہا انہیں تعلیم دی اور اگر خدا بعض لوگوں کے ذریعے بعض کو دفع نہ کرے تو زمین فساد سے بھر جائے لیکن خدا تمام جہانوں پر لطف و احسان کرنے والا ہے۔
(۲۵۲)تِلۡکَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتۡلُوۡهَا عَلَیۡکَ بِالۡحَقِّ ؕ وَ اِنَّکَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ	یہ خدا کی آیات ہیں جو ہم حق کے ساتھ تم پر پڑھتے ہیں اور تم مرسلین (خدا کی طرف سے بھیجے گئے رسولوں) میں سے ہو۔

تفسیر

خدائے بزرگ و برتر ان آیات میں ایک عبرتناک واقعہ بیان کرتا ہے۔ اس میں بنی اسرائیل کے ایک گروہ کی سرگذشت بیان کی گئی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد وقوع پذیر ہوئی۔ جہاد اور حریم دین خدا یعنی حریم انسانیت کے دفاع کا یہ تذکرہ مسلمانوں کی عبرت کے لئے ہے۔ آیات کی تفسیر سے قبل ہم اس داستان کو بیان کرتے ہیں۔

ایک عبرت خیز واقعہ

اہل فرعون کے زیر اثر رہ کر بنی اسرائیل کمزور و ناتواں ہو چکے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دانشمندانہ رہبری کے نتیجے میں انہیں اس افسوس ناک حالت سے نجات ملی اور انہوں نے قدرت و عظمت حاصل کر لی۔

اس پیغمبر کی برکت سے خدا تعالیٰ نے انہیں بہت سی نعمات سے نوازا۔ ان نعمات میں سے ایک صندوق عہد (بہت جلد

صندوق عہد، اس کی تاریخ اور اس میں موجود چیزوں کے بارے میں بحث کریں گے) بھی تھا۔ یہودی اپنے لشکر کے آگے اسے اٹھائے رکھتے تھے۔ اس سے ان میں ایک طرح کا سکون قلب اور روحانی طاقت پیدا ہوتی تھی۔

بنی اسرائیل کو یہ قدرت وعظمت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ایک مدت تک حاصل رہی لیکن یہی کامیابیاں اور نعمتیں رفتہ رفتہ ان کے غرور وتکبر کا باعث بن گئیں اور وہ قانون شکنی کرنے لگے۔ اس کے نتیجے میں انہیں فلسطینیوں کے ہاتھوں شکست اٹھانا پڑی۔ وہ اپنی قدرت وعظمت کھو بیٹھے اور صندوق عہد بھی ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔ پھر اس قدر پراگندگی اور اختلاف کا شکار ہوئے کہ چھوٹے سے چھوٹے دشمنوں سے بھی دفاع کے قابل نہ رہے یہاں تک کہ دشمنوں نے ان کے بہت سے لوگوں کو ان کی سرزمین سے نکال دیا اور ان کی اولاد کو غلام اور قیدی بنالیا۔ کئی برس تک یہ کیفیت رہی یہاں تک کہ خداوند عالم نے ان کی نجات اور ارشاد وہدایت کے لئے حضرت اشموئیل کو پیغمبر بنا کر مبعوث فرمایا۔ بنی اسرائیل بھی دشمنوں کے ظلم وجور سے تنگ آ چکے تھے اور کسی پناہ گاہ کی تلاش میں تھے لہٰذا ان کے گرد جمع ہو گئے اور ان سے خواہش کی کہ وہ ان کے لئے کوئی رہبر اور امیر مقرر کر دیں تاکہ وہ اس کی قیادت میں ہم آواز اور ایک جان ہو کر دشمن سے جنگ کریں اور عزّت رفتہ بحال ہو سکے۔

اشموئیل علیہ السلام ان کی اندرونی کیفیات اور سست ہمتی سے پوری طرح واقف تھے۔ انہوں نے کہا۔

مجھے ڈر ہے کہ جب جہاد کا حکم آئے تو تم کہیں امیر ورہبر کے حکم سے روگردانی نہ کرو اور دشمن سے مقابلے اور جنگ سے پہلو تہی نہ کرو۔

وہ کہنے لگے:

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم امیر کے حکم سے منہ پھیر لیں اور اپنی ذمہ داری نبھانے سے دریغ کریں حالانکہ دشمن ہمیں ہمارے وطن سے نکال چکا ہے۔ ہماری زمینوں پر قبضہ کر چکا ہے اور ہماری اولاد کو قیدی بنا کے لے گیا ہے۔

حضرت اشموئیل علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ اپنی بیماری کی تشخیص کر چکے ہیں اور اب انہیں ایک طبیب کی ضرورت ہے۔ گویا وہ اپنی پسماندگی کے راز سے واقف ہو چکے ہیں۔ اس پر حضرت اشموئیل علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی کا رخ کیا اور قوم کی خواہش کو اس کے حضور پیش کیا۔ وحی ہوئی:

''میں نے طالوت کو ان کی سربراہی کے لئے منتخب کیا ہے۔''

حضرت اشموئیل علیہ السلام نے عرض کیا: خداوندا! میں ابھی تک طالوت کو دیکھا ہے نہ اسے پہچانتا ہوں

ارشاد ہوا: ہم اسے تمہاری طرف بھیجیں گے۔ جب وہ تمہارے پاس آئے تو فوج کی کمان اس کے حوالے کر دینا اور علمِ جہاد اس کے ہاتھ میں دے دینا۔

''اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْ۔۔۔۔''

لغت میں ''ملاء'' اس چیز کو کہتے ہیں جس سے آنکھ بھر جائے اور دیکھنے والے کے تعجب کو برانگیختہ کر دے۔ اس لئے زیادہ جمعیت کو جو ہم رائے اور ہم عقیدہ ہو ''ملاء'' کہتے ہیں۔ نیز ہر قوم وملّت کے اشراف اور بزرگوں کو بھی ملاء کہتے ہیں کیونکہ وہ ایک خاص

مقام ومنزلت کے حامل ہونے کی وجہ سے دیکھنے والے کی آنکھ کو بھر دیتے ہیں۔

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے یہ آیت بنی اسرائیل کی ایک بڑی جمعیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ان لوگوں نے بیک آواز اپنے پیغمبر سے امیر ورہبر کا تقاضا کیا تا کہ اس کی قیادت میں جالوت کا مقابلہ کر سکیں جس نے ان کی دینی، اجتماعی اور اقتصادی حیثیت کو معرض خطر میں ڈال رکھا تھا۔یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد رونما ہوا۔

''فِی سَبِیْلِ اللہِ''۔

بنی اسرائیل اس دشمن کے تجاوز اور زیادتی سے نجات چاہتے تھے جس نے انہیں ان کی سرزمین سے نکال دیا تھا اس کے لئے وہ آمادۂ جنگ تھے۔اس کے باوجود اس پروگرام کو''فِی سَبِیْلِ اللہِ'' قرار دیا گیا تھا۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو چیز انسانوں کی آزادی، ظلم کی سرکوبی اور تجاوز سے نجات کے لئے مددگار ثابت ہو سکے وہ''فِی سَبِیْلِ اللہِ'' میں شمار ہوتی ہے۔

ان کے پیغمبر چونکہ ان کی سستی و کاہلی سے واقف تھے اس لئے کہنے لگے: ممکن ہے جب تمہیں جہاد کا حکم دیا جائے تو تم عمل نہ کرو۔

وہ کہنے لگے: یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم دشمن کے ساتھ جنگ سے روگردانی کریں۔حالانکہ اس نے ہمیں ہمارے شہر سے باہر نکال دیا ہے اور ہمارے بچوں کو ہم سے جدا کر دیا ہے۔

اسی طرح ان سے پیمان وفاداری لیا گیا لیکن خدا کا نام اس کا فرمان، اپنے وجود اور استقلال کی حفاظت کا تقاضا اور اولاد کی آزادی کی خواہش کوئی چیز بھی انہیں عہد شکنی سے نہ روک سکی اس لئے قرآن نے ساتھ ہی یہ فرمایا ہے:

جب ان پر جہاد فرض ہوا تو تھوڑے سے افراد کے علاوہ سب لوگ روگرداں ہو گئے اور ان کے قائد نے ایک قلیل سی فوج لے کر جنگ کے عظیم میدان میں شرکت کی۔

خدا ان ظالموں کو جانتا ہے جنہوں نے اپنے آپ پر۔معاشرے پر، آنے والی نسلوں پر اور اپنی اولاد پر ظلم کیا ہے۔ان کے حسب حال سزا اب ان کا انتظار کر رہی ہے۔

(۲۴۷) اس آیت کے مطابق بنی اسرائیل کے لشکر کی بادشاہی اور سربراہی کے لئے خدا تعالیٰ نے طالوت کو منتخب کیا تھا اور شاید''بعث'' کا لفظ اسی طرف اشارہ ہو جو کچھ اس واقعہ کی تفصیل میں بیان کیا گیا ہے یعنی غیر متوقع صورت حال کی وجہ سے طالوت پیغمبر کی مجلس تک آ پہنچے۔

ضمنی طور پر آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ طالوت فقط لشکر کے کمانڈر ہی نہ تھے، ملک کے حکمران بھی تھے۔

بنی اسرائیل کی طرف سے یہ پہلی عہد شکنی ہے کہ انہوں نے اپنے پیغمبر کے سامنے طالوت کے انتخاب کے بارے میں اعتراض کیا۔حالانکہ وہ تصریح کر چکے تھے کہ یہ چناؤ خدا کی طرف سے ہے لیکن وہ خدا کے انتخاب پر اعتراض کرنے سے بھی نہ چوکے اور کہنے لگے: ہم اس سے زیادہ حق دار ہیں کیونکہ عالی نسبی اور فراواں دولت تو ہمارے پاس ہے جو حکمرانی کی دو لازمی شرطیں ہیں۔

جیسا کہ ہم اس واقعے کی تفصیل میں دیکھ چکے ہیں کہ طالوت بنی اسرائیل کے ایک گمنام قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور مالی

طور پر ایک عام زراعت پیشہ شخص سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔

اس زمانے کے پیغمبر نے معترضین کو جو دنداں شکن جواب دیا قرآن نے اسے یوں بیان کیا ہے: خدانے اسے تم پر حکمرانی کی خاطر اس لئے چنا ہے کہ وہ دانائی ومردانگی اور علم سے مالا مال ہے اور جسمانی طاقت کے لحاظ سے قوی اور صاحب قدرت ہے۔

ممکن ہے یہ جملہ رہبری کی تیسری شرط کی طرف اشارہ ہو جو یہ ہے کہ رہبر کے لئے مختلف اسباب وذرائع کی فراہمی بھی درکار ہے کیونکہ ممکن ہے رہبر علم وقدرت سے تو کاملاً مالا مال ہو لیکن اس کا سابقہ ایسے حالات واوقات سے ہو جو اس کے مقدس مقاصد کے لئے سازگار نہ ہوں۔ یہ طے شدہ بات ہے کہ ایسی رہبری واضح کامیابی حاصل نہیں کر سکتی۔قرآن کہتا ہے کہ حکومت الٰہی جسے خدا چاہتا ہے بخش دیتا ہے یعنی اس ماحول کے لئے جو وسائل وذرائع ضروری ہوں وہ اس کے لئے فراہم کر دیتا ہے۔

''وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ''

یعنی خدا ایک وسیع اور لامتناہی ہستی ہے۔اس کا فضل اور بخشش بھی اس کے وجود کی طرح لامتناہی ہے لیکن وہ علیم ہے اور جانتا ہے کہ کون سا منصب کسے بخشا جانا چاہئے۔

(۲۴۸) یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ بنی اسرائیل ابھی تک خدا کی طرف سے طالوت کی ماموریت پر مطمئن نہیں ہوئے تھے حالانکہ ان کے پیغمبر اشموئیل تصریح کر چکے تھے کہ وہ اس کام کے لئے خدا کی طرف سے مامور ہوئے ہیں۔انہوں نے اس کی نشانی اور دلیل کا تقاضا کیا۔جواب میں اشموئیل نے کہا: طالوت کے مامور من اللہ ہونے کی نشانی یہ ہے کہ تابوت (صندوق عہد) تمہاری طرف آئے گا۔

(۲۴۹) یہ بات وضاحت کی محتاج نہیں کہ ہر گروہ کی کامیابی رہبر اور کمانڈر کے حکم کے مطابق فوج کے نظم وضبط اور ایمان کی مرہون منّت ہے۔

اگر فوجی اپنے کمانڈر کی قابلیت اور حکم پر ایمان رکھتے ہوں تو اپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرتے۔طالوت جو بنی اسرائیل کو جہاد کے لئے لے جارہے تھے ان کے لئے یہ جاننا ضروری تھا کہ ان کے اہل لشکر ان کے حکم کی کتنی اطاعت کرتے ہیں۔ خصوصاً جب کہ یہ وہ لشکر تھا جس نے تردّد اور بددلی سے ان کی قیادت قبول کی تھی۔اگر چہ وہ ظاہراً ان کی رہبری کو تسلیم کر چکے تھے لیکن اس بات کا امکان تھا کہ وہ فطرتاً ابھی شک وتردّد کے عالم میں ہوں۔لہٰذا فرمان الٰہی کے ذریعے انہیں حکم دیا گیا کہ انہیں آزمائیں۔ اس پر طالوت نے خبر دی کہ بہت جلد ایک نہر آئے گی۔ساتھ ہی ان سے کہہ دیا گیا کہ وہ پیاس کا مقابلہ کریں اور تھوڑا سا پانی پیئں تا کہ واضح ہو جائے کہ دشمن کی شمشیر آتش بار کے مقابلے میں جانے والا لشکر پیاس کو برداشت کرنے کی سکت رکھتا ہے یا نہیں۔

اس واقعے کی تفصیل میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ اکثریت آزمائش کی اس کٹھالی سے صحیح سالم نہ نکل سکی۔

اس طرح طالوت کا لشکر تطہیر کے دوسرے عمل سے گذرا۔پہلی تطہیر وہ تھی جب انہوں نے عام لوگوں کو تیاری کے وقت کہا تھا کہ جو لوگ دل جمعی سے ساتھ نہ دے سکیں اور تکمیل مقصد تک قائم نہ رہ سکیں، وہ میرے ساتھ نہ آئیں۔

یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ وہ تھوڑے سے افراد جو پیاس کی آزمائش پر پورے اترے وہی طالوت کے ساتھ گئے لیکن جب اس چھوٹے سے گروہ نے غور کیا کہ جلد ہی ان کا دشمن کے عظیم اور طاقتور لشکر سے سامنا ہوگا تو اپنی تعداد کی کمی پر وہ بہت پریشان ہوئے۔ یہ وہ وقت تھا جب آزمائش کا تیسرا مرحلہ شروع ہوا۔

آیت کہتی ہے کہ اس وقت قیامت پر ایمان راسخ رکھنے والے باقی ساتھیوں کو بیدار اور تنبیہ کرنے لگے کہ کسی جمعیت کی مقدار اور تعداد پر نگاہ نہیں کرنا چاہئے بلکہ کیفیت اور جذبے کو دیکھنا چاہئے۔ کیونکہ بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ ایک کم تعداد مگر باایمان اور عزم صمیم رکھنے والی جمعیت نے حکم خدا سے اپنے سے کہیں بڑی تعداد پر غلبہ پالیا۔

(۲۵۰) یہ آیت کہتی ہے کہ جب طالوت اور ان کے لشکر ایسی جگہ پر پہنچ گئے جہاں جالوت کا طاقتور لشکر نمایاں طور پر نظر آ رہا تھا تو وہ اس عظیم قوت کے سامنے صف بستہ ہو گئے انہوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اپنے تئیں پروردگار کی لامتناہی قدرت کے سپرد کر دیا اور اس سے استقامت اور صبر کا تقاضا کیا۔

''رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا''

''افراغ'' کا مطلب ہے کسی سیال مادے کو برتن سے ایسے گرانا کہ برتن خالی ہو جائے۔ حضرت طالوت کے ہمراہی دعا کے وقت کہتے ہیں کہ خداوندا ہم پر صبر و استقامت انڈیل دے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا سے صبر، استقامت اور پامردی کا آخری درجہ طلب کر رہے ہیں جیسے کسی برتن کا سارا پانی کسی پر ڈال دیا جائے اور برتن خالی ہو جائے۔

''وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا''۔

یعنی ہمیں ثابت قدم رکھ تاکہ ہمارے قدم اکھڑ نہ جائیں اور میدان سے بھاگ کھڑے نہ ہوں حقیقت میں پہلی دعا باطنی پہلو کی حامل ہے اور یہ دعا ظاہری پہلو رکھتی ہے اور یہ مسلّم ہے کہ ثابت قدمی صبر و استقامت کی روح کا نتیجہ ہے۔

''وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ''

دراصل یہ جملہ استقامت اور ثابت قدمی کا نتیجہ ہے جو گذشتہ دو جملوں میں بیان ہو چکی ہے یعنی خداوندا استقامت اور ثبات قدمی کے زیر سایہ ہمیں کفار پر فتح عطا فرما۔

(۲۵۱) اس آیت میں طالوت کی رہبری اور کمان میں بنی اسرائیل کی جالوت جیسے ظالم اور اس کے طاقتور لشکر سے جنگ کے آخری مرحلے کو بیان کیا گیا ہے جالوت کا لشکر آخرکار شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا خود جالوت بھی حضرت طالوت کے لشکر کے ایک شخص داؤد کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ داؤد کے ہاتھوں جالوت کے قتل کی تفصیلات گذشتہ اوراق میں بیان کی جا چکی ہیں۔

زیر نظر آیت میں یہ صراحت موجود نہیں کہ یہ داؤد وہی پیغمبر ہیں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے والد گرامی ہیں یا کوئی اور شخص۔ لیکن اس آیت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مقام نبوت کے حامل ہوئے آیت کا اگلا حصّہ یہ ہے۔

''خدا نے اسے حکومت اور علم عطا کیا اور جو کچھ وہ چاہتا تھا اسے سکھایا''۔

اس طرف توجہ رکھتے ہوئے کہ یہ آیت بنی اسرائیل کے مومنین کی ایک جماعت کے ہاتھوں ظالم جالوت اور اس کی

فوج کی شکست کے بعد آئی ہے، تفسیر خود بخود واضح ہو جاتی ہے کیونکہ اگر خداوند عالم بعض اوقات صاحب ایمان و استقامت لوگوں کے ذریعے ستمگروں اور ظالموں کی سرکوبی نہ کرے تو ممکن ہے کہ وہ تمام روئے زمین پر قدرت حاصل کرلیں۔ پروردگار عالم کی سنت تو یہ ہے کہ دنیا میں ارادہ واختیار کی آزادی ہو اور لوگ خیر وشر کا راستہ اختیار کرنے میں آزاد ہوں، لیکن جب ستمگروں کی سرکشی دنیا کی عمومی تباہی کا باعث بن رہی ہو تو خدا اپنے بندوں میں سے کسی ایک گروہ کی مدد کرتا ہے جو راہ سرکشی کو روک دیتے ہیں اور یہ پروردگار عالم کا اپنے بندوں پر ایک لطف و کرم ہے۔

(۲۵۲) ہر آیت میں بنی اسرائیل کے بارے میں بیان کیے گئے متعدد واقعات کی طرف اشارہ موجود ہے ان میں سے ہر واقعہ پروردگار کی قدرت وعظمت کی نشانی ہے اور یہ واقعات خرافات اور ہر افسانوی رنگ سے پاک ہو کر پیغمبر اسلام ﷺ پر نازل ہوئے اور یہ امر بذات خود پیغمبر اکرم ﷺ کی سچائی اور نبوت کی ایک علامت ہے۔

(۲۵۳) تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَ لٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۗ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۧ	ان بعض رسولوں کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے۔ ان میں سے بعض سے خدا نے (براہ راست) گفتگو کی ہے اور بعض کو برتر درجات عطا کیے ہیں اور عیسیٰ بن مریم کو ہم نے واضح نشانیاں دی ہیں اور ان کی تائید ہم نے روح القدس کے ذریعے کی۔ اگر خدا چاہتا تو ان پیغمبروں کے بعد آنے والے لوگ واضح نشانیاں آجانے کے بعد ایک دوسرے سے جنگ و جدال نہ کرتے۔ مگر ان امتوں نے آپس میں اختلاف کیا۔ بعض ایمان لے آئے اور بعض کافر ہو گئے۔ پھر بھی اگر خدا چاہتا تو وہ آپس میں جنگ نہ کرتے لیکن خدا جو چاہتا ہے (حکمت کی بناء پر) انجام دیتا ہے۔

تفسیر

"رسل" سے یہاں مراد تمام مرسلین اور پیغمبر ہیں۔

یہ جملہ وضاحت کرتا ہے کہ اگر چہ نبوت و رسالت کے لحاظ سے تمام پیغمبر ایک دوسرے کی مثل و نظیر ہیں لیکن مقام و منزلت میں یکساں نہیں ہیں کیونکہ ان کی ذمہ داریاں مختلف تھیں۔ فداکار تو وہ سب تھے لیکن ان کی فداکاری کے درجات مختلف ہیں۔ اسی لئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ان میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے۔

"مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ"

اس جملے میں پیغمبروں کے بعض فضائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ خدا نے ان سے بعض کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ واضح ہے کہ اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں چونکہ وہی ایسی شخصیت ہیں جو "کلیم اللہ" کے نام سے مشہور ہیں۔

"وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ"

اس جملے میں بعض پیغمبروں کی درجے اور مرتبے کے اعتبار سے فضیلت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آیت کی ابتدا میں پیغمبروں کے درجات کے فرق کو بیان کیا گیا ہے۔ اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ زیر نظر جملے سے مراد ایک یا کئی مخصوص افراد ہیں جن کا کامل نمونہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکت ایسی ہے جس کا لایا ہوا دین و آئین آخری اور کامل ترین تھا اور جس کی رسالت کامل ترین دین کی تبلیغ کے لئے ہے اسے خود سب سے برتر ہونا چاہئے۔

فرمایا گیا ہے کہ ہم نے عیسیٰ کو واضح نشانیاں دیں مثلاً ناقابل علاج بیماروں کو شفا دینا، مردوں کو زندہ کرنا، اعلیٰ مذہبی معارف اور روح القدس کے ذریعے انہیں تائید و تقویت بخشی۔

اس بارے میں سورہ بقرہ کی آیت ۸۷ میں بحث ہو چکی ہے کہ روح القدس سے مراد وحی الٰہی پہنچانے والے جبرائیل علیہ السلام ہیں یا کوئی مخفی معنوی قوت جو تمام مومنین میں مختلف درجے پر موجود ہے۔

یہ آیت اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ پیغمبروں کی عظمت ان پیروکاروں کے درمیان اختلاف میں رکاوٹ کا سبب نہیں بنی کیونکہ خدا نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ تکامل و ارتقاء کے لئے ضروری ہے کہ انسان حق و فضیلت کے راستے کو اپنے ارادے سے طے کرے۔ اگر خدا چاہتا تو اس میں کوئی رکاوٹ نہ تھی کہ وہ انسان کو حیوانات کی طرح خاص عزائز و طبائع کے ساتھ پیدا کرتا اور ان کے زیر اثر وہ انبیا کی پیروی کرتا اور صلح و صفائی سے رہتا لیکن یہ مسلم ہے کہ پھر ان پیغمبروں کی پیروی کرنا یا صلح و آشتی سے رہنا اور جنگ و جدال سے بچنا فضیلت و فخر کا باعث نہ ہوتا کیونکہ اس میں جبر و اکراہ کا پہلو پایا جاتا ہے۔

اس اختلاف کا سرچشمہ خود لوگ ہی تھے ورنہ انبیاء و مرسلین میں تو کوئی اختلاف نہ تھا۔ ان سب کا تو ایک ہی ہدف اور مقصد تھا۔ ہوا یہ کہ بعض لوگ ان کی تعلیمات پر ایمان لے آئے اور بعض نے مخالفت کی اور یہ امر اختلافات کے ظہور کا باعث بنا۔

دوبارہ تاکید کی گئی ہے کہ یہ کام خدا کے لئے آسان تھا کہ جبری طور پر اختلافات کو ختم کر دیتا لیکن خدا اپنے ارادے کے مطابق امور انجام دیتا ہے اور خدا کا ارادہ حکمت اور تکامل انسانی سے ہم آہنگ ہے۔ اس نے انسان کو آزاد اور مختار قرار دیا ہے اگرچہ بعض لوگ اس آزادی سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔

(۲۵۴)يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّابَيْعٌ فِيْهِ وَ لَا خُلَّةٌ وَّ لَا شَفَاعَةٌ ؕ وَ الْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ	اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تمہیں رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرو، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوسکتی ہے اور نہ دوستی اور نہ ہی شفاعت اور کافر تو ظالم ہیں۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں پہلی امتوں کی سرنوشت، جہاد اور حکومت کا ذکر تھا۔ اب اس آیت میں مسلمانوں کی ذمہ داریوں کا بیان ہے نیز حکومت اور معاشرے کے لئے دفاعی بنیادوں کی تقویت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اے صاحبان ایمان لوگو! ہم نے جو روزی تمہیں دی ہے اس میں سے خرچ کرو۔ بعید نہیں کہ اس آیت میں انفاق سے مراد انفاق واجب یعنی زکوٰۃ ہو کیونکہ اس کے بعد اس سے منہ موڑنے والوں کو روز قیامت سزا کی دھمکی دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں انفاق واجب ہی دراصل بیت المال اور حکومت کی بنیاد کو تقویت پہنچاتا ہے۔ ضمنی طور پر ''ممّا'' سے معلوم ہوتا ہے کہ انفاق واجب ہمیشہ مال کے ایک حصے پر مشتمل ہوتا ہے نہ کہ سارے مال پر۔

آج جب کہ تم میں توانائی ہے انفاق کرلو اور خرچ کرلو چونکہ دوسرا جہان تو یہاں بوئے گئے کے کاٹنے کی جگہ ہے۔ وہاں معاملہ تمہارے ہاتھ سے نکل چکا ہوگا وہاں خرید وفروخت کا معاملہ انجام نہ دے سکو گے کہ جس کے ذریعے اپنے لئے سعادت ونجات خرید سکو اور نہ اس جہان میں سرمائے کے ذریعے مادی دوستیاں حاصل کی جاسکتی ہیں کہ جو وہاں فائدہ بخش ہوسکیں اور شفاعت بھی تمہارے لئے سودمند نہ ہوگی کیونکہ تم واجب ادائیگیوں سے بھی عہدہ برآ نہیں ہوتے اس لئے تم پر نجات کے سارے دروازے بند ہوجائیں گے۔

''وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ''

اس جملے میں قرآن یہ حقائق واضح کرنا چاہتا ہے:

1۔ کافر اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں کیونکہ انفاق اور واجب مخارج نیز دیگر دینی اور انسانی فرائض ترک کر کے خود کو عظیم ترین سعادتوں سے محروم کردیتے ہیں۔ ان کے یہی اعمال اس جہان میں ان کے دامن گیر ہوں گے اور یہ خدا کی طرف سے کوئی ظلم نہ ہوگا۔

2۔ کافر اپنے معاشرے پر بھی ظلم کرتے ہیں۔ اصولی طور پر کفر ہی قساوت، سنگدلی، مادہ پرستی اور دنیاداری کا منبع ہے۔ یہی چیزیں ظلم وستم کے اصلی سرچشمے ہیں۔

یہاں اس نکتے کی یاد آوری بھی ضروری ہے کہ کفر کا لفظ اس آیت میں حکم انفاق کے بعد آیا ہے۔ لہٰذا یہاں یہ لفظ روگردانی، گناہ اور حکم خدا کی خلاف ورزی کے معنی میں ہے اور اس معنی میں یہ لفظ قرآن وحدیث میں بہت مقامات پر آیا ہے۔

(۲۵۵)اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ۚ لَا تَاۡخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوۡمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ ؕ یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَ مَا خَلۡفَهُمۡ ۚ وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ کُرۡسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ ۚ وَ لَا یَـُٔوۡدُهٗ حِفۡظُهُمَا ۚ وَ هُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ	اس خدائے یگانہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو زندہ ہے اور اپنی ذات سے قائم ہے اور باقی موجودات اس کے ساتھ قائم ہیں۔ اسے کبھی اونگھ اور نیند نہیں آتی جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کی طرف سے ہے۔ کون ہے جو اس کے حضور اس کے فرمان کے بغیر شفاعت کرے۔ جو کچھ ان (بندوں) کے سامنے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اسے وہ جانتا ہے۔ اور سوائے اس مقدار کے جسے وہ چاہے کوئی شخص اس کے علم سے واقف نہیں ہوسکتا۔ اور اس کی (حکومت کی) کرسی آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور ان (آسمانوں اور زمین) کی نگہداری اس کے لئے گراں نہیں ہے اور بلندئ مقام اور عظمت اسی سے مخصوص ہے۔

تفسیر

وہ ذات جو یگانہ اور تنہا ہے اور تمام صفات کمال کی جامع ہے وہی عالم ہستی کو پیدا کرنے والی ہے۔ لہٰذا عالم وجود میں کوئی اس کے علاوہ پرستش کے لائق نہیں ہے۔ لا الٰه الّا اللّٰه. اس ارشاد میں قرآن خلّاق عالم کی وحدت و یگانگی کو جو اسلام کی بنیاد ہے بیان کرتا ہے لیکن جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے لفظ ''اللہ'' میں بھی یہ حقیقت پوشیدہ ہے اس بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ لا الٰه الا اللّٰه اس حقیقت کی تاکید ہے۔

''حیّ'' کا معنی ہے زندہ اور یہ لفظ ہر صفت مشبہ کی طرح دوام و ہمیشگی پر دلالت کرتا ہے۔ خدا کی حیات حقیقی ہے کیونکہ اس کی حیات عین ذات ہے نہ کہ عارضی یا کسی دوسرے سے لی ہوئی۔ سورہ فرقان آیہ ۵۸ میں ہے۔

''اس زندہ ذات پر بھروسہ کرو جسے کبھی موت نہ آئے گی''

لَا تَاۡخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوۡمٌ

''سنة'' مخصوص سستی ہے جو نیند کی ابتدا میں عارض ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اونگھ یا نیند کے جھونکے کو سنة کہتے ہیں۔

''نوم'' کا معنی ہے نیند یعنی وہ حالت جب انسان کے کچھ حواس طبیعی عوامل کے ذریعے کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔

''لَا تَاۡخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوۡمٌ''

دراصل خدا کے قیوم ہونے کی تاکید کرتا ہے کیونکہ عالم ہستی کے لئے کامل و مطلق قیام کا تقاضا ہے کہ ایک لمحہ بھر کی غفلت نہ

ہو یعنی حکومت مطلقہ اور عالم ہستی کے امور کی تدبیر کے لئے خدا تعالیٰ لمحے بھر کی غفلت نہیں کرتا۔لہٰذا ہر وہ چیز جو خدا کی اصل ''قیومیت'' کے ساتھ ساز گار اور مناسب نہیں اس کی خود بخود اللہ کی بارگاہ مقدس سے نفی ہو جاتی ہے۔

یہ جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کا فیض اور لطف دائمی ہے اور یہ ایک لمحے کے لئے بھی اس کے وجود سے منقطع نہیں ہوتا۔

خدا کی مالکیتِ مطلقہ

آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان میں ہے اسکی مالکیت کے بغیر امور عالم کی تدبیر کے لئے قیام ممکن نہیں۔اس لئے خدا کی قیومیت کا ذکر کرنے کے بعد اس حقیقت کی تصریح کی گئی ہے کہ تمام عالم اس کا ملک خاص ہے، عالم ہستی میں جو بھی تصرف ہو اسی کی طرف سے ہے۔

بنا کہے واضح ہے کہ اس مفہوم کی طرف توجہ کرنا حقیقت میں ایک اہم تربیتی عامل ہے کیونکہ اگر انسان میں یہ عقیدہ پیدا ہو جائے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ دراصل اس کا نہیں ہے بلکہ چند روز کے لئے اسے عاریتاً ملا ہے تو یقیناً یہ عقیدہ اسے دوسروں کے حقوق میں تجاوز، استثمار، ذخیرہ اندوزی، حرص، طمع اور بخل سے باز رکھے گا۔ کیونکہ ممکن ہے شدید دنیا پرستی کی وجہ سے یہ چیزیں انسان میں پیدا ہو جائیں۔ یہ عقیدہ انسان کی یہ تربیت کرتا ہے کہ وہ اپنے شرعی حقوق پر راضی رہے۔

''مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ''

اصطلاحی طور پر یہ جملہ استفہام انکاری ہے یعنی کوئی شخص بھی خدا کے حکم کے بغیر اس کی بارگاہ میں شفاعت وسفارش نہیں کر سکتا۔ یہ جملہ درحقیقت تمام موجودات عالم ہستی پر خدا کی قیومیت اور مالکیت مطلقہ کے مفہوم کی تکمیل کرتا ہے یعنی اگر کچھ لوگ بارگاہ الٰہی میں شفاعت کرتے نظر آتے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ کسی چیز کے مالک ہیں اور وہ تاثیر میں استقلال رکھتے ہیں بلکہ یہ مقام شفاعت بھی انہیں خدا نے عطا کیا ہے۔ان کی شفاعت چونکہ حکم خدا سے ہے اس لئے یہ خود خدا کی قیومیت اور مالکیت پر ایک دلیل ہے۔

پروردگار کی قدرت کاملہ اور اس کے مقابلے میں دوسروں کے قدرت سے تہی ہونے پر تاکید بھی ہے کیونکہ جو اپنے گذشتہ اور آئندہ سے بے خبر ہے اور آسمانوں اور زمین کے غیب کا علم نہیں رکھتا اس کی قدرت بہت ہی محدود ہوگی لیکن وہ ذات جو ہر دور میں ہر چیز سے آگاہ ہے اس کی قدرت ہر لحاظ سے لامتناہی ہے اس لئے ہر اقدام یہاں تک کہ شفاعت بھی اس کے فرمان کے تابع ہے۔

''وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِہٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ''

یہ جملہ بھی درحقیقت سابقہ جملے کی تاکید کے طور پر ہے اور علم خدا کے مقابلے میں شفاعت کرنے والوں کے محدود علم کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ وہ پروردگار کے علم پر احاطہ نہیں رکھتے اور خدا جس قدر چاہے وہ اتنا ہی باخبر ہوتے ہیں۔

اس جملے سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص بھی اپنی طرف سے کوئی علم نہیں رکھتا اور انسان کے تمام علوم خدا کی طرف

سے ہیں۔وہی ہے جو رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ تدریجاً جہان آفرینش کے حیرت انگیز اسرار سے پردہ اٹھاتا ہے اور نئے حقائق انسان کے ہاتھ دیتا ہے اور اس کی معلومات میں وسعت پیدا کرتا ہے۔

اس جملے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ممکن ہے خدا بعض علوم غیب ،بعض منتخب لوگوں کو دے دے اور کچھ لوگوں کو اسرار غیب سے آگاہ کردے۔اس بناء پر یہ بات ان لوگوں کا جواب ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ علم غیب تو انسان کے لئے ممکن ہی نہیں۔نیز یہ ان آیات کی بھی تفسیر ہے جو بشر کے لئے علم غیب کی نفی کرتی ہیں یعنی انسان ذاتی طور پر اسرار غیب میں سے کسی چیز کو نہیں جانتا مگر یہ کہ خدا علم دے اور جس قدر دے وہ اس قدر جان لیتا ہے۔

وسعت علم کا علاقہ

یعنی خدا کا علم تمام آسمانوں اور زمین پر محیط ہے اور کوئی چیز بھی اس کی حکومت علم سے باہر نہیں۔جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ کرسی بعض اوقات علم کے لئے کنایہ ہوتی ہے۔کئی ایک روایت میں بھی یہی مفہوم بیان کیا گیا ہے۔

آسمان اور زمین سے وسیع تر چیز

یعنی کرسی ایک ایسا وجود ہے جو آسمانوں اور زمین سے زیادہ وسعت رکھتا ہے جو ہر طرف سے ان پر محیط ہے۔اس طرح آیت کا معنی ہوگا کہ خدا کی کرسی تمام آسمانوں اور زمین کو اٹھائے ہوئے ہے اور ان پر محیط ہے۔

یہاں تک کہ کچھ روایات میں معلوم ہوتا ہے کہ کرسی آسمانوں اور زمین سے اس قدر وسیع تر ہے کہ وہ سب کے سب کرسی کے مقابلے میں اس انگوٹھی کی طرح ہیں جو وسط بیابان میں پڑی ہو۔امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔

''آسمان اور زمین کرسی کے مقابلے میں بیابان میں پڑی ہوئی انگشتری کے حلقے کی طرح ہیں اور کرسی بھی عرش کے مقابلے میں بیابان میں پڑی ہوئی انگشتری کے حلقے کی طرح ہے''۔

خلاصہ اور نتیجہ یہ کہ پروردگار کا تخت حکومت وقدرت تمام آسمانوں اور زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔اس کے علم و دانش کی کرسی تمام عالمین پر محیط ہے اور کوئی چیز اس کی حکومت اور علم سے خارج نہیں۔

''وَ لَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا''

''یؤدہ'' ''اود''(بروزن قول) سے ہے۔اس کا معنی ہے ''سنگینی'' یعنی آسمانوں اور زمین کی حفاظت اور نگرانی خدا تعالیٰ کے لئے کسی قسم کی سنگینی ،بوجھ اور مشقت کا باعث نہیں کیونکہ وہ اپنی مخلوق اور بندوں کی طرح نہیں کہ جن کی قدرت محدود ہے۔

''وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ''

یہ جملہ دراصل سابقہ جملوں کی دلیل کے طور پر ہے یعنی وہ خدا جو برتر اور بالاتر ہے۔ہر طرح کے شبیہ اور شریک سے پاک ہے اور ہر قسم کی کمی ،عیب اور نقص سے ماورا ہے۔وہ خدا جو عظیم ،بزرگ اور لامتناہی ہے اس کے لئے کوئی کام بھی مشکل نہیں ہے اور وہ

کسی وقت بھی جہان ہستی کومنظّم کرنے اوراس کی تدبیر کرنے سے خستہ، عاجز، غافل اور بے خبر نہیں ہوسکتا اوراس کا علم تمام چیزوں پر محیط ہے۔

قابل توجہ یہ کہ آیت الکرسی صرف ایک آیت ہے جو العلی العظیم تک ختم ہوتی ہے برخلاف اس کے کہ جو مشہور ہے۔

(۲۵۶) لَآ اِکۡرَاهَ فِی الدِّیۡنِ ۙ قَدۡ تَّبَیَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَیِّ ۚ فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَ یُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی ٭ لَا انۡفِصَامَ لَهَا ؕ وَ اللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ	دین قبول کرنے میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہے (کیونکہ) صحیح راستہ ٹیڑھے راستے سے جدا اور آشکار ہو چکا ہے اس بناء پر جو کوئی طاغوت (بت، شیطان اور ہر سرکش) سے منہ موڑ کر خدا پر ایمان لے آئے تو اس نے محکم کڑے کو تھاما ہے جو ٹوٹ نہیں سکتا اور خدا سننے والا جاننے والا ہے۔

شانِ نزول

مشہور مفسر طبرسی نے مجمع البیان میں اس آیت کی شان نزول یہ نقل کی ہے کہ مدینے میں ایک شخص ابوحصین نامی تھا۔اس کے دو بیٹے تھے۔مدینہ میں مال تجارت لانے والے دو تاجروں نے ان لڑکوں سے ملاقات کی تو انہیں عیسائیت کی دعوت دی اور وہ بھی اس سے بہت متاثر ہوئے اور نتیجتاً عیسائی ہوگئے۔

حصین اس واقعے سے بہت پریشان ہوا اور پیغمبر اسلام ﷺ کو اس کی اطلاع دی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں انہیں واپس اپنے مذہب میں لانا چاہتا ہوں اس نے سوال کیا کہ وہ جبری طور پر انہیں اپنے مذہب میں واپس لا سکتا ہے تو اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ کسی مذہب کو اختیار کرنے میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہے۔

تفسیر

جیسا کہ آیت کی شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض افراد پیغمبر اکرم ﷺ سے چاہتے تھے کہ آپ بھی جابر حکمرانوں کی طرح طاقت اور زور سے لوگوں کے عقائد تبدیل کرنے کے لئے عملی اقدامات کریں۔مندرجہ بالا آیت نے اس پر صراحت سے جواب دیا کہ دین و آئین ایسی چیز نہیں کہ جس کی جبری تبلیغ کی جائے۔

یہ آیت ان لوگوں کا دندان شکن جواب ہے جو اسلام کو زبردستی اور جبری پہلو کا حامل قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی ترقی فوج اور تلوار کی مرہون منت ہے۔

جب اسلام باپ کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے بیٹے کو مذہبی عقیدہ زبردستی بدلنے پر مجبور کرے تو دوسروں کی ذمہ داری اس سے واضح ہوجاتی ہے۔اگر عقیدہ بدلنے کے لئے جبر ممکن اور جائز ہوتا تو ضروری تھا کہ سب سے پہلے باپ کو بیٹے کے بارے میں اجازت دی جاتی جبکہ اسے یہ حق نہیں دیا گیا۔

آیت کے اس حصے میں قرآن کہتا ہے: جو شخص طاغوت سے کفر کرے اور اس سے منہ پھیر لے اور خدا پر ایمان لے آئے اس نے گویا مضبوط کڑے پر ہاتھ ڈالا ہے جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔

عروۃ الوثقیٰ اس آلے کو کہتے ہیں جو دروازے کی پشت پر نصب کرتے ہیں اور دروازہ بند کرتے یا کھولتے وقت اس پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔

آیت کے آخر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کفر و ایمان کا مسئلہ ایسا نہیں جو دکھاوے سے حل ہو جائے کیونکہ خدا سب کی باتوں کو سنتا ہے چاہے وہ آشکار ہوں یا بند کمروں اور مخفی اجلاسوں میں اس طرح وہ لوگوں کے دلوں میں چھپی ہوئی چیزوں اور لوگوں کے ضمیروں کی حالت سے آگاہ ہے۔

(۲۵۷) اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۗ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـؤُهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۗ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۧ	خدا ان لوگوں کا سرپرست ہے جو ایمان لے آئے ہیں۔انہیں وہ تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتا ہے (لیکن) وہ لوگ جو کافر ہو گئے ہیں ان کے اولیاء اور سرپرست طاغوت ہیں جو انہیں نور سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں وہ اہل آتش (جہنم) ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں کفر و ایمان، حق و باطل اور راہ راست اور انحرافی راستے کی وضاحت کے بعد اب یہ آیت تکمیل مطلب کے لئے کہتی ہے: مومن و کافر ہر کسی کا رہبر و راہنما اور اپنا مخصوص راستہ ہے۔مومنین کا رہبر و راہنما خدا ہے، ان کا راستہ تاریکیوں سے جدا ہو کر نور کی طرف جاتا ہے۔لیکن کافروں کا رہبر طاغوت ہے اور ان کی راہ مومنین کے برعکس نور سے ظلمت کی طرف جاتی ہے اور ان کا انجام بھی واضح ہے کیونکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آگ میں رہیں گے۔

(۲۵۸)اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَ اُمِيْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ	کیا دیکھتے نہیں ہو (اور اس سے آگاہ نہیں ہو) جس نے ابراہیم کے ساتھ اس کے پروردگار کے بارے میں حجت بازی اور کلام کیا کیونکہ خدا نے اسے حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیم نے کہا: میرا خدا وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ اس نے کہا میں زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا خدا آفتاب کو افق مشرق سے نکالتا ہے (اگر تم سچے ہو) تو خورشید کو مغرب سے نکال کر دکھاؤ (یہاں) وہ کافر مبہوت ہو گیا اور خدا ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

تفسیر

گذشتہ آیت پروردگار کی ولایت اور راہنمائی کے ذریعے مومنین کی ہدایت اور طاغوت کی پیروی کے ذریعے کفار کی گمراہی کے بارے میں تھی۔ اس کے بعد زیر نظر آیت میں خدا ایک زندہ اور واضح شاہد کا ذکر کرتا ہے جو اس کے عظیم پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق رونما ہوا۔

ہوا یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے زمانے کے ایک جابر سے بحث مباحثہ کیا اور اپنے موقف کے حق میں دلائل پیش کئے وہ اپنی حکومت کی وجہ سے بادۂ غرور سے سرمست تھا لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھنے لگا تیرا خدا کون ہے۔ حضرت ابراہیم نے کہا وہی جو زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ حقیقت میں آپ نے عظیم ترین شاہکار قدرت کو دلیل کے طور پر پیش کیا۔ مبداء جہان ہستی کے علم وقدرت کی واضح نشانی یہی قانون موت وحیات ہے لیکن اس نے مکر وتزویر کی راہ اختیار کی اور مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لوگوں کو اپنے حمایتیوں کو غافل رکھنے کے لئے کہا وہ تو میں زندہ کرتا اور مارتا ہوں اور موت وحیات کا قانون میرے ہاتھ میں ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی موت وحیات سے متعلق دلیل ہر لحاظ سے قوی تھی لیکن دشمن سادہ لوح لوگوں کو جُل دے سکتا تھا لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دوسرا استدلال پیش فرمایا کہ خدا آفتاب کو افق مشرق سے نکالتا ہے اگر جہان ہستی کی حکومت تیرے ہاتھ میں ہے تو تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا۔ یہاں دشمن خاموش، مبہوت اور عاجز ہو گیا۔ اس میں سکت نہ رہی کہ اس زندہ منطق کے بارے میں کوئی بات کر سکے۔

(۲۵۹) اَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّ هِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْىٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَ انْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ انْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ

یا اس شخص کی طرح جو ایک آبادی میں سے گذرا، حالت یہ تھی کہ اس کی دیواریں چھتوں پر گری پڑی تھیں۔ کہنے لگا: خدا انہیں موت کے بعد اب کیسے زندہ کرے گا (اسی وقت) خدا نے اسے ایک سو سال کے لئے مار دیا۔ پھر اسے زندہ کیا اور اس سے کہا: کتنی دیر ٹھہرے رہے ہو۔ کہنے لگا: ایک دن، یا دن کا کچھ حصّہ۔ فرمایا: (نہیں) بلکہ ایک سو سال تک ٹھہرے رہے ہو، اپنی غذا اور کھانے پینے کی چیز کی طرف دیکھو (جو تمہارے پاس تھی اور سالہا سال گذرنے کے باوجود) اس میں کوئی تغیر نہیں آیا۔ لیکن اپنے گدھے کی طرف دیکھو (کہ وہ کیسے ریزہ ریزہ ہو چکا ہے) تمہاری یہ دوبارہ زندگی اس لئے ہے کہ تمہیں ہم لوگوں کے لئے نشانی قرار دیں اب (اپنی سواری کی) ہڈیوں کی طرف دیکھو کہ ہم انہیں کیسے اٹھا کر ایک دوسرے سے جوڑ دیتے ہیں اور اس پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ (یہ حقائق) جب اس پر آشکار ہوئے تو اس نے کہا: میں جانتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر

یہ آیت ایک گذشتہ نبی کا دوسرا واقعہ بیان کرتی ہے یہ واقعہ معاد اور قیامت پر ایک زندہ گواہ ہے۔ درحقیقت گذشتہ آیات جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نمرود سے ہونے والی گفتگو کو بیان کیا گیا تھا۔ توحید اور خدا شناسی کے بارے میں تھیں اور یہ آیت معاد اور موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں ہے۔ پہلے ہم اجمالی طور پر اس واقعے کو دیکھیں گے اور پھر آیت کی تفسیر کریں گے۔ آیت ایک ایسے شخص کی سرگذشت بیان کر رہی ہے جو اثنائے سفر میں تھا۔ ایک سواری پر سوار تھا، کھانے پینے کا کچھ سامان اس کے ہمراہ تھا اور وہ ایک آبادی میں سے گذر رہا تھا جو وحشت ناک حالت میں گری پڑی تھی اور ویران ہو چکی تھی اور اس کے باسیوں کے جسم اور بوسیدہ ہڈیاں نظر آرہی تھیں۔ جب اس نے یہ وحشتناک منظر دیکھا تو کہنے لگا: خدا ان مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا؟

خدا تعالیٰ نے اسی وقت اس کی روح قبض کر لی اور پھر ایک سو سال کے بعد اسے زندہ کیا۔ اب اس سے سوال کیا کہ اس بیابان میں کتنی دیر ٹھہرے رہے ہو۔ وہ تو یہ خیال کرتا تھا کہ یہاں تھوڑی دیر ہی توقف کیا ہے۔ فوراً جواب میں عرض کیا: ایک دن یا اس سے بھی کم۔ اسے خطاب ہوا۔ تم ایک سو سال یہاں رہے ہو لیکن اپنے کھانے پینے کی چیزوں کی طرف دیکھو کیسے طویل مدت میں حکم خدا

کی وجہ سے ان میں تغیر نہیں آیا۔

اب اس دلیل کے لئے کہ تم جان لو کہ تمہیں سوسال موت کے عالم میں گذر گئے ذرا اپنی سواری کی طرف نگاہ کرو اور دیکھو کہ کھانے پینے کی چیزوں کے برعکس وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر چکی ہے اور طبیعت کے عام قوانین اسے اپنی لپیٹ میں لے چکے ہیں اور موت نے اس کے جسم کو منتشر کر دیا ہے۔ اب دیکھو کہ ہم اس کے پراگندہ اجزاء کو کیسے جمع کر کے اسے زندہ کرتے۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو کہنے لگا: میں جانتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ یعنی میں مطمئن ہو چکا ہوں اور مردوں کے دوبارہ اٹھنے کا معاملہ متشکل ہو کے میرے سامنے آ گیا ہے اس بارے میں کہ وہ پیغمبر کون تھے؟ مختلف احتمالات دیئے گئے ہیں۔ بعض نے ''ارمیا'' کہا ہے اور بعض ''خضر علیہ السلام'' سمجھتے ہیں لیکن مشہور یہ ہے کہ وہ ''عزیز'' تھے۔ امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں بھی حضرت عزیر علیہ السلام کے نام کی تائید ہوتی ہے۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ آیت گذشتہ آیت کی تکمیل کر رہی ہے۔ گذشتہ آیت میں توحید کے بارے میں بحث تھی۔ یہ اور اس سے اگلی آیت معاد اور قیامت کے حسی نمونے پیش کر رہی ہیں۔ ابتدا یوں ہوتی ہے: کیا تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو ایک ایسی جگہ سے گذر رہا تھا جو بالکل ویران ہو چکی تھی۔

ظاہراً اس ماجرے میں پیغمبر کے ساتھ کوئی اور شخص نہیں تھا لہٰذا انہوں نے اپنے آپ سے کہا: خدا اس بستی کو موت کے بعد کیسے زندہ کرے گا۔ ''قریہ'' سے مراد یہاں بستی والے ہیں۔ یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ وہ اس حادثے میں اہل بستی کی بکھری پڑی ہڈیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ان کی طرف اشارہ کر کے یہ بات کر رہے تھے۔

اکثر مفسرین اس جملے سے یہ سمجھے ہیں کہ خدا نے پیغمبر مذکور کو ایک سوسال کے لئے مار دیا تھا۔ پھر انہیں زندہ کیا۔ ''اماتہ'' کا لفظ بھی جو ''موت'' کے مادہ سے ہے اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اس جملے میں خدا تعالیٰ پیغمبر سے پوچھتا ہے: اس جگہ کتنی دیر ٹھہرے رہے ہو۔ وہ جواب میں تردد سے کہتے ہیں: ایک دن یا دن کا کچھ حصّہ۔

''تیسنه'' کا مادہ ہے ''سنۃ'' بمعنی ''ایک سال'' ''لم یتسنه'' کا معنی ہے ''اسے ایک سال نہیں گذرا''۔ یہ اس بات کے لئے کنایہ ہے کہ یہ متغیر اور خراب نہیں ہوا۔ اس طرح جملے کا مجموعی معنی یہ ہوگا کہ اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ سالہا سال گزر جانے کے باوجود یوں لگتا ہے گویا ان پر ایک سال کا عرصہ بھی نہیں گذرا اور ان میں کوئی تغیر نہیں آیا۔

یعنی۔ اپنے گدھے کو دیکھو۔ قرآن نے ان کی سواری کے متعلق اس سے زیادہ نہیں کہا لیکن بعد کے جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سواری وقت گزرنے کے ساتھ بالکل گل سڑ چکی تھی کیونکہ اس کے علاوہ سوسال گزرنے پر کوئی دلیل نہ تھی۔

یہ خود ایک عجیب وغریب چیز ہے کہ جانور جس کے لئے طویل عمر کا امکان ہے اس کے اجزاء اس طرح بکھر جائیں لیکن پھل اور پھلوں کا جوس جسے بہت جلد خراب ہونا چاہئے اس میں کوئی تبدیلی نہ آئے یہاں تک کہ اس کا ذائقہ اور بو تک نہ بدلے۔ یہ خدا تعالیٰ کی انتہائی قدرت نمائی ہے۔ تاکہ ہم آپ کو نشانی بنا لیں لوگوں کے لئے۔

بکھری ہوئی ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم کیسے انہیں اٹھا کر ایک دوسرے سے پیوست کرتے ہیں اور ان پر گوشت (کا لباس) پہناتے ہیں اور اسے زیادہ کرتے ہیں۔ظاہر ہے کہ بوسیدہ ہڈیوں سے مراد ان کی سواری کے جانور کی ہڈیاں ہیں نہ کہ اہل بستی کی بوسیدہ ہڈیاں کیونکہ یہ امر گذشتہ جملوں سے مناسبت نہیں رکھتا۔

یہ مسائل جب پیغمبر پر آشکار ہو گئے تو وہ کہنے لگے: میں جانتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

(۲۶۰)وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰی وَ لٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۠	اور اس وقت (کو یاد کرو) جب ابراہیم نے کہا: خدایا! مجھے دکھا کہ تو کیسے مردوں کو زندہ کرتا ہے۔فرمایا: کیا تم ایمان نہیں لائے۔کہنے لگے: کیوں نہیں میں چاہتا ہوں میرے دل کو اطمینان ہو جائے۔فرمایا: یہ بات ہے تو چار پرندے انتخاب کرلو (ذبح کرنے کے بعد) انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرلو (پھر ان کے گوشت کو آپس میں ملا دو) پھر ہر پہاڑ پر ایک حصّہ رکھ دو، پھر انہیں پکارو، وہ تیزی سے تمہارے پاس آئیں گے اور جان لو کہ خدا غالب اور حکیم ہے۔

تفسیر

ایک دن حضرت ابراہیمؑ دریا کے کنارے سے گزر رہے تھے۔آپ نے ایک مردار دریا کے کنارے پڑا ہوا دیکھا۔اس کا کچھ حصّہ دریا کے اندر اور کچھ باہر تھا۔دریا اور خشکی کے جانور دونوں طرف سے اسے کھا رہے تھے بلکہ کھاتے کھاتے ایک دوسرے سے لڑنے لگتے تھے۔اس منظر نے حضرت ابراہیمؑ کو ایک ایسے مسئلے کی فکر میں ڈال دیا جس کی کیفیت سب تفصیل سے جاننا چاہتے ہیں اور وہ ہے موت کے بعد مردوں کے زندہ ہونے کی کیفیت۔ابراہیم سوچنے لگے کہ اگر ایسا ہی انسانی جسم کے ساتھ ہو اور انسان کا بدن جانوروں کے بدن کا جزء بن جائے تو قیامت میں اٹھنے کا معاملہ کیسے عمل میں آئے گا جبکہ وہاں انسان کو اسی بدن کے ساتھ اٹھنا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے کہا: خدایا! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتے۔انہوں نے کہا: ایمان تو رکھتا ہوں لیکن چاہتا ہوں دل کو تسلی ہو جائے۔

خدا تعالیٰ نے حکم دیا: چار پرندے لے لو اور ان کا گوشت ایک دوسرے سے ملا دو۔پھر اس سارے گوشت کے کئی حصّے کر دو اور ہر حصّہ پہاڑ پر رکھ دو۔اس کے بعد ان پرندوں کو پکارو تاکہ میدان حشر کا منظر دیکھ سکو۔انہوں نے ایسا ہی کیا تو انتہائی حیرت کے ساتھ دیکھا کہ پرندوں کے اجزاء مختلف مقامات سے جمع ہو کر ان کے پاس آ گئے ہیں اور ان کی ایک نئی زندگی کا آغاز ہو گیا ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہو چکا ہے کہ حشر ونشر کے بارے میں یہ آیت گذشتہ آیت کے موضوع کی تکمیل کرتی ہے۔ ''ارنی کیف..... '' سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ مشاہدہ، رویت اور شہود کا تقاضا کر رہے تھے اور وہ بھی اصل معاد کا نہیں بلکہ اس کی کیفیت کا۔

ممکن تھا کہ مذکورہ مطالبے پر لوگ حضرت ابراہیمؑ کے ایمان کے بارے میں تزلزل کا گمان کرتے لہٰذا انہیں وحی ہوئی: تو کیا تم ایمان نہیں لائے ہو؟ یہ اس لئے تھا تا کہ وضاحت ہوجائے اور اس واقعے سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو لہٰذا انہوں نے کہا: جی ہاں، میرا ایمان تو ہے لیکن چاہتا ہوں دل مطمئن ہوجائے۔

یعنی چار پرندے انتخاب کرلو، انہیں ذبح کرو اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے ایک دوسرے سے ملا دو۔

مقصد یہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ حشر ونشر اور مردوں کے اجزاء بدن کے بکھر جانے کے بعد زندہ ہونے کے نمونے کا مشاہدہ کرلیں اور یہ بات پکارنے اور مائل کرنے کے معانی سے حاصل نہیں ہوتی خصوصاً جبکہ آیت کا بعد کا حصہ کہتا ہے: پھر ہر پہاڑ پر ان میں سے ایک حصّہ رکھ دو' آیت کا یہ حصہ واضح گواہی دے رہا ہے کہ پہلے پرندوں کو ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا ہے اور ان کے اجزاء بنے ہیں۔ جو لوگ ''صرھن'' کا ترجمہ ''مانوس اور مائل کرنا'' کرتے ہیں وہ دراصل لفظ ''جزء'' کے معنی سے غافل ہیں۔

''پھر انہیں پکارو تو وہ تیزی سے تمہاری طرف آئیں گے'' اس موقع پر ایک پرندے کے بکھرے ہوئے اجزاء جمع ہوئے اور آپس میں مل گئے اور پرندے نئے سرے سے زندہ ہوگئے۔ البتہ ایسا ہونا بالکل خارق عادت اور خلاف معمول ہے لیکن اگر ہم خدا کو طبیعی قوانین پر حاکم سمجھیں نہ کہ محکوم، تو پھر مسئلے میں کوئی پیچیدگی نہیں رہے گی۔

جب ابراہیمؑ یہ حیرت انگیز منظر دیکھ چکے تو انہیں وحی ہوئی کہ یہ واقعہ دیکھ کر جان لو کہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور اس کے تمام کام حکمت کے ماتحت ہیں اور لا متناہی علم وقدرت رکھنے کی وجہ سے اس کے لئے مردوں کے منتشر اجزاء کو جاننا اور انہیں جمع کرنا کوئی مشکل نہیں۔

(۲۶۱) مَثَلُ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِیۡ كُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَ اللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ	جو لوگ اپنا مال راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں وہ اس بیج کی مانند ہیں جس کے سات خوشے نکلیں اور ہر خوشے میں سو دانے ہوں اور خدا جس کے لئے چاہے دو گنا یا کئی گنا کر دیتا ہے اور خدا (قدرت و رحمت کے لحاظ سے) وسیع اور (تمام چیزوں سے) آگاہ و دانا ہے۔

تفسیر

طبقاتی تفاوت کا ایک حل

معاشرے کی ایک مشکل جس سے انسان ہمیشہ دوچار رہتا ہے اور باوجود اتنی صنعتی اور مادی ترقی کے انسان اس میں مبتلا ہے

وہ طبقاتی تفاوت ہے۔ایک طرف فقر، بے چارگی اور تنگدستی ہے اور دوسری طرف مال ودولت کے ڈھیر ہیں۔

کچھ وہ لوگ ہیں کہ انہیں اپنی دولت کا اندازہ نہیں اور کچھ وہ ہیں کہ فقر و فاقہ کی ایسی تکلیف دہ حالت سے دو چار ہیں کہ ضروریات زندگی مثلاً کھانا، رہائش اور سادہ لباس بھی مہیا کرنا ان کے لئے ممکن نہیں۔

اس مقصد تک پہنچنے کے لئے اسلام کے پاس ایک وسیع پروگرام ہے۔اسلام نے سودخوری مطلقاً حرام قرار دی ہے۔زکوٰۃ و خمس وغیرہ جو کہ اسلامی مالیات ہیں ان کی ادائیگی واجب قرار دی ہے۔انفاق، خرچ کرنے، وقف کرنے، قرض حسنہ دینے اور مختلف قسم کی مالی امداد دینے کا شوق پیدا کرنا بھی اسی پروگرام کا ایک حصّہ ہے اور ان سب سے زیادہ روح ایمانی پیدا کرنا اور انسانی بھائی چارے کو زندہ کرنا اسلامی پروگرام کی عظمت ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس آیت میں انفاق اور خرچ کرنے سے مراد جہاد میں خرچ کرنا ہے۔اس لئے کہ اس سے قبل آیات میں جہاد کی گفتگو آئی ہے۔لیکن واضح ہے کہ یہ مناسبت تخصیص کا سبب نہیں بنتی کیونکہ ''سبیل اللّٰہ'' مطلقاً آیا ہے جس میں ہر نیک مصرف شامل ہے۔علاوہ ازیں بعد کی آیات گواہی دیتی ہیں کہ ان تمام آیات میں جہاد کے علاوہ دوسری بحث ہو رہی ہے اور '' انفاق'' اور خرچ کرنے کی بحث کا مستقل طور پر پیچھا کیا گیا ہے۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ اس آیت میں راہِ خدا میں خرچ کرنے والے اشخاص کو پُر برکت دانے سے تشبیہ دے کر قرآن یہ بتانا چاہتا ہے کہ ہر شخص کا عمل اس کے وجود کا پرتو ہے اور عمل میں جتنی وسعت پیدا ہوتی ہے دراصل اتنی ہی وسعت انسان کے وجود میں پیدا ہوتی ہے۔

''اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِیۡ کُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ''

اس جملے میں قرآن اس پُر برکت دانے کی توصیف یوں کرتا ہے: اس سے سات سنبل اور خوشے اگتے ہیں، ان میں سے ہر خوشے میں سو دانے ہیں۔یوں وہ اپنی اصل سے سات سو گنا ہو جاتے ہیں۔

''وَ اللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ''

''یضاعف '' کا مادہ ہے ''ضعف'' (بروزن ''شعر'')۔یہ دوگنا یا چند گنا کے معنی میں ہے۔اس لئے اس جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا جس کے لئے چاہے اس برکت کو زیادہ کر دے اور دوگنا یا کئی گنا کر دے۔مندرجہ بالا تحریر کو نظر میں رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ کچھ دانے ایسے بھی ہیں جو سات سو سے کئی گنا زیادہ ثمر دیتے ہیں۔اس بناء پر یہ تشبیہ ایک حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۲۶۲)اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ	جولوگ اپنا مال راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور جو کچھ انہوں نے خرچ کیا ہو اس پر کوئی منّت اور احسان نہیں جتاتے اور اذیّت نہیں پہنچاتے ان کی جزا ان کے پروردگار کے ہاں محفوظ ہے اور انہیں کوئی خوف ہے نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔

تفسیر

''ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَآ اَذًى''

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ بارگاہ پروردگار میں خرچ کرنے کی قبولیت تبھی ہے جب اس میں احسان جتلانے کا عمل نہ ہو اور کوئی ایسی چیز نہ ہو جو ضرورت مندوں کے لئے تکلیف و آزار کا باعث ہو۔ اس بناء پر جو لوگ راہ خدا میں مال خرچ کرتے ہیں اور بعد میں احسان جتاتے ہیں یا کوئی ایسا کام کرتے ہیں جو اذیت اور تکلیف کا باعث ہو تو وہ درحقیقت اس ناپسندیدہ عمل سے اپنا اجر اور صلہ بھی کھو بیٹھتے ہیں۔

جو شخص کوئی چیز کسی کو دیتا ہے اور پھر اسے احسان جتلاتا ہے یا تکلیف پہنچا کر دل شکستہ کرتا ہے حقیقت میں اس نے اسے کوئی چیز نہیں دی کیونکہ اگر کچھ سرمایہ اسے دیا ہے تو کچھ لے بھی لیا ہے۔ اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ تحقیر و تذلیل اور روحانی شکستگی اسے دیئے جانے والے مال سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے اگر ایسے اشخاص کے لئے کوئی اجر اور ثواب نہ ہو تو یہ بالکل فطری اور عادلانہ معاملہ ہو گا بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسے افراد بہت سے مواقع پر تو مقروض ہوتے ہیں نہ کہ قرض خواہ کیونکہ انسان کی عزت و آبرو مال و ثروت سے کئی درجے بالاتر ہے۔

''لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ''

یہ جملہ خرچ کرنے والوں کو اطمینان دلاتا ہے کہ ان کی جزا پروردگار کے پاس محفوظ ہے تاکہ وہ دلی اطمینان سے اس راہ میں بڑھ چڑھ کر قدم اٹھائیں کیونکہ جو چیز خدا کے پاس ہے نہ اس کے نابود ہونے کا خطرہ ہے نہ اس کے نقصان کا اندیشہ ہے بلکہ لفظ ''رب'' کے ساتھ ''هم'' کی ضمیر (جس کا معنی ہے ان کا پروردگار) یہ گویا اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ان کی پرورش کرتا ہے اور اس میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔

''وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ''

پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ ''خوف'' آئندہ کے امور کے بارے میں ہوتا ہے اور حزن واندوہ گذشتہ امور کے بارے میں۔ خرچ کرنے والے جانتے ہیں کہ ان کا اجر اور جزا بارگاہ خدا میں محفوظ ہے اس لئے نہ وہ آئندہ اور روز قیامت کا خوف رکھتے ہیں اور نہ راہ خدا میں بخش دیئے جانے والے کے بارے میں کوئی ملال کرتے ہیں۔

(۲۶۳)قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَ اللهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ	(ضرورت مندوں کے سامنے) پسندیدہ گفتگو اورعفو (اوران سے تلخ باتیں کہنے سے بچنا) اس بخشش وعطا سے بہتر ہے جس کے بعد اذیت اور تکلیف پہنچائی جائے اور خدا بے نیاز اور بردبار ہے۔

تفسیر

یہ آیت درحقیقت گذشتہ بحث کی تکمیل کرتی ہے۔ جولوگ حاجت مندوں سے اچھی بات اورخوش کن گفتگو کرتے ہیں اور سخت لب و لہجے میں ان کے اصرار کے باوجود عفوودرگذر سے کام لیتے ہیں وہ ان سے بہتر ہیں جو کچھ دینے کے بعد لوگوں کواذیت اور تکلیف پہنچاتے ہیں۔

اس حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خرچ کے آداب کے ایک پہلو کو واضح کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''جب کوئی حاجت مندتم سے کوئی چیز مانگے تو جب تک وہ اپنا تمام مقصد بیان نہ کرے اس کی بات قطع نہ کرو۔اس کے بعد اسے وقار وادب اور نرمی سے جواب دو۔ جو چیز تمہارے بس میں ہے اسے دے دو یا پھر شائستہ اور خوبصورت طریقے سے اسے واپس کردو۔ کیونکہ ممکن ہے سوال کرنے والا کوئی فرشتہ ہو جو تمہاری آزمائش پر مامور ہو تا کہ وہ دیکھے کہ خدا نے جو نعمتیں تمہیں دی ہیں ان کے پیش نظرتم عمل کس طرح کرتے ہو''۔

(نورالثقلین جلد۱۔صفحہ۲۸۳)

یہ بھی ممکن ہے کہ مذکورہ جملہ میں اس طرف اشارہ ہو کہ خدا تمہارے انفاق اور خرچ کرنے سے بے نیاز ہے اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو تمہارے ہی فائدے میں ہے۔ اس لئے تمہارا کسی پر احسان نہیں ہے۔ علاوہ ازیں وہ تمہاری سخت روی اور درشتی کے مقابلے میں بردبار ہے اور سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا تا کہ تم بیدار ہو کر اپنی اصلاح کرلو۔

(۲۶۴)يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا يُؤْمِنُ بِاللهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ	اے ایمان والو! اپنی بخششوں کو احسان جتانے اور آزار پہنچانے سے اس شخص کی طرح باطل نہ کرو جو دکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہے، خدا اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور (اس کا کام) پتھر کے ٹکڑے کی طرح ہے جس پر مٹی (کی باریک تہ) ہو (اور اس میں بیج ڈالے جائیں) اور خوب بارش اس پر برسے (اور ساری مٹی اور بیج بہا لے جائے) اور اسے (مٹی اور بیج سے) خالی کردے۔

لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ	ایسے لوگ جو کام بجالاتے ہیں اس سے کوئی چیز حاصل نہیں کر سکتے اور خدا کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔
(۲۶۵) وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ	اور ان لوگوں کا (کام) جو اپنا مال خدا کی خوشنودی اور اپنی روح (میں ملکات انسانی) باقی رکھنے کے لئے خرچ کرتے ہیں اس باغ کی طرح ہے جو بلند جگہ پر ہو، اس پر تیز بارش برسے اور اپنا پھل دوگنا دے اور اگر اس پر سخت بارش نہ برسے اور اس پر پھوار اور شبنم پڑے (تو بھی کافی ہے) اور تم جو کچھ انجام دیتے ہو خدا اس سے بینا ہے۔

تفسیر

راہِ خدا میں خرچ کرنے کے اسباب ونتائج

ان دو آیات میں پہلے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ اہل ایمان کو نہیں چاہئے کہ وہ راہ خدا میں خرچ کئے گئے سرمائے کو احسان جتلا کر اور آزار پہنچا کر ضائع کردیں۔ اس کے لئے دو عمدہ مثالوں کے ذریعے دونوں طرح کے انفاق کی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔ ایک وہ خرچ ہے جس میں احسان جتلانا، آزار پہنچانا، ریاکاری اور خودنمائی کی آمیزش ہے اور دوسرا وہ کہ جس کا سرچشمہ خلوص اور انسانی ہمدردی کے جذبات ہیں۔

پہلی مثال

سخت پتھر کی ہے جس پر مٹی کی باریک سی تہ جمی ہو، اس میں بیج ڈال دیا جائے، اس پر کھلی ہوا چلے اور سورج چمکے، پھر اس پر موٹے موٹے قطرات کی بارش خوب برسے۔ مسلم ہے کہ ایسی بارش مٹی کی پتلی سی تہ کو دھوڈالے گی اور بیج کو بہالے جائے گی سخت پتھر جس میں پانی اور بیج نہیں ڈالا جا سکتا اس پر سبزہ کیسے اگ سکتا ہے۔

قرآن نے ریاکاری، احسان جتلانے اور آزار پہنچانے کے لئے کیے گئے خرچ کو جس کا سرچشمہ، سخت اور قساوت رکھنے والے دل ہیں، مٹی کی اس نازک تہ سے تشبیہ دی ہے جس نے سخت پتھر کے بالائی حصّے کو چھپا رکھا ہو اور جس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا جا سکتا ہو بلکہ وہ باغبان اور کسان کی محنت ضائع کردے۔

(۲۶۵) دوسری مثال

ایک سرسبز و شاداب باغ کی ہے جو بلند اور زرخیز زمین میں ہے اس پر آزاد ہوا چلے اور وافر دھوپ پڑتی رہے۔ موسلا دھار

اور نفع بخش بارش اس پر برسے اور جب کہ موسلا دھار بارش نہ برسے تب بھی شبنم اور پھوار کے ذریعے اس کی زمین ایسی زرخیز ہے کہ شبنم اور پھوار بھی اس کے درختوں کے ثمر آور ہونے کے لئے کافی ہے۔ چونکہ وہ بلندی پر ہے اس لئے کھلی ہوا اور دھوپ سے خوب بہرہ مند ہوتا ہے۔ اس کا خوبصورت منظر ہر دیکھنے والے کی آنکھ کے لئے پرکشش ہے یہ سیلاب کے خطرے سے بھی محفوظ ہے۔

جو لوگ اپنا مال خدا کی خوشنودی اور اپنے قلب و روح میں ایمان و یقین کو استوار کرنے کے لئے خرچ کرتے ہیں وہ اس باغ کی طرح ہیں جو پُر برکت، مفید اور بیش بہا پھل دینے والا ہو۔

ایک اہم نکتہ

خدا بصیر ہے

دوسری آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے

''وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ''

(یعنی جو کچھ انجام دیتے ہو خدا اسے دیکھنے والا ہے)

یہ جملہ نیک اعمال انجام دینے والوں کے لئے ہے کہ جب بھی وہ کوئی عمل خیر انجام دیں تو توجہ رکھیں کہ نیت یا عمل میں معمولی سی آلودگی بھی پیدا نہ ہو کیونکہ خدا تعالیٰ ان کے اعمال کی نگرانی کرتا ہے۔

(۲۶۶) اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَ اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۚ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۧ	کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کا کھجوروں اور انگور کا باغ ہو جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں، اس باغ میں اس کے لئے ہر طرح کا پھل موجود ہو لیکن وہ بڑھاپے کو پہنچ چکا ہو اور اس کی اولاد (چھوٹی اور) کمزور ہو (ایسے میں) آگ کا زبردست بگولہ اٹھے اور جلا ڈالے خدا اس طرح اپنی آیات آشکار کرتا ہے کہ شاید تم غور و فکر کرو (اور سوچ سمجھ کر راہ حق کو پالو)۔

تفسیر

ایک اور مثال

انسان کو روز قیامت اعمال صالح کی سخت ضرورت ہوگی نیز ریاکاری، احسان جتلانا اور کسی کو تکلیف پہنچانا انفاق اور عمل صالح کو ضائع کر دیتا ہے یہ مطالب واضح کرنے کے لئے زیر نظر آیت میں ایک اور عمدہ مثال بیان کی گئی ہے۔

یہ ایسے شخص کی مثال ہے جس کا ایک سرسبز وشاداب باغ ہو اس میں کھجوروں اور انگور جیسے طرح طرح کے پھل دار درخت ہوں، درختوں کے نیچے پانی بہتا رہتا ہو اور آبیاری کی احتیاج نہ ہو۔ وہ شخص بوڑھا ہو چکا ہو۔ اس کی اولاد ابھی کمزور و ناتواں ہو اور ان کی زندگی کا دارومدار اسی باغ پر ہو۔ اب اگر یہ باغ اجڑ جائے تو وہ اور اس کی اولاد اسے آباد نہیں کر سکتے۔ اگر اچانک آتش بار آندھی کے گولے اس باغ پر برسنے لگیں اور اسے جلا کر خاکستر کر دیں تو اس وقت وہ بوڑھا شخص جو جوانی کی توانائیاں کھو چکا ہے اور کسی اور ذریعے سے اپنے اخراجات بھی پورے نہیں کر سکتا تو اس کی حالت کیا ہوگی اور کیسی حسرت و غم کی کیفیت سے دوچار ہوگا۔ جو لوگ نیک عمل بجالاتے ہیں اور پھر ریاکاری، احسان دھرنے اور اذیت دینے سے اسے ضائع کر دیتے ہیں اسی شخص کی طرح ہیں جس نے محنت سے باغ تیار کیا ہو اور جب پھل حاصل کرنے کی ضرورت ہو تو اس کے کام کا نتیجہ بالکل برباد ہو جائے اور اس کے پاس حسرت و اندوہ کے علاوہ کوئی چیز باقی نہ رہے۔

تمام بدبختیوں کا سرچشمہ یہ ہے کہ غور وفکر سے کام نہ لیا جائے اس ضمن میں خصوصاً ایسے کام ہیں جو بے وقوف لوگ کرتے ہیں مثلاً احسان جتلانا، جن کا فائدہ بہت کم اور نقصان بڑی تیزی سے اور بہت زیادہ ہوتا ہے اس لئے آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ لوگوں کو غور وفکر کرنے کی دعوت دیتا ہے اور فرماتا ہے: اس طرح خدا تمہارے لئے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے کہ شاید تم غور وفکر کرو۔

(۲۶۷) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَ لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ	اے ایمان والو! پاکیزہ اموال (جو تجارت کے ذریعے) تمہارے ہاتھ آئے ہیں اور جو ہم نے تمہارے لئے زمین (کے خزانوں اور معادن) سے نکالے ہیں خرچ کرو حالانکہ یہ اموال (قبول کرتے وقت) تم چشم پوشی کرتے ہوئے اور ناپسندیدگی کے علاوہ قبول کرنے کو تیار نہیں ہو اور جان لو کہ خدا بڑا بے نیاز اور لائق تعریف ہے۔

شان نزول

امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ یہ ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی جس نے زمانہ جاہلیت میں سود کے طور پر دولت جمع کر رکھی تھی اور اس میں سے راہ خدا میں خرچ کرتا تھا۔ خدا تعالیٰ نے انہیں اس کام سے روکا اور انہیں حکم دیا کہ وہ پاک اور حلال مال سے خرچ کریں۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں انفاق کے ثمرات وفوائد اور خرچ کرنے والوں کی صفات بیان کی گئی ہیں نیز وہ اعمال بھی بتائے گئے

ہیں جو انسانی اور خدا پسند کاموں کو آلودہ کر سکتے ہیں اور ان کی جزاء اور ثواب ختم کر سکتے ہیں۔اب اس آیت میں یہ تشریح کی گئی ہے کہ کیسے مال کو خرچ کیا جانا چاہئے۔آیت کے پہلے حصّے میں خدا ایماندار لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ اپنے اموال میں سے "طیّبات" کو خرچ کرو۔

"ما کسبتم" (جو کچھ تم نے کسب کیا ہے) یہ لفظ تجارتی اموال کی طرف اشارہ ہے اور (مِمَّا اَخْرَجْنَا....) زراعتی، معدنی اور زیرزمین سرچشموں کی دولت کے بارے میں ہے۔اس بناء پر تمام طرح کے اموال کا ذکر آ گیا ہے کیونکہ تمام انسانی اموال کی بنیاد زمین اور اس کے گوناگوں منابع ہیں۔یہاں تک کہ صنعتیں، تجارتیں، جانوروں کا کاروبار اور ایسی دیگر چیزوں کی بنیاد یہی ہے۔

ضمناً اس جملے کے مطابق تمام منابع انسان کے اختیار میں دے دیئے گئے ہیں۔اس لئے راہ خدا میں کسی اچھے مال کو خرچ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھنا چاہئے۔

بعض لوگوں کی عادت ہے کہ ہمیشہ وہ مال جو بے قیمت ہو اور تقریباً ناقابل استعمال ہو اور خود ان کے لئے کام کا نہ ہو اسے خرچ کرتے ہیں۔ایسے مخارج نہ انسان کی اپنی تربیت کا باعث بنتے ہیں اور نہ انسانی روح کی پرورش کا ذریعہ بنتے ہیں اور ضرورت مندوں کے لئے بھی یہ کوئی خاص فائدہ مند نہیں ہوتے بلکہ ایسے ان کی ایک طرح سے تحقیر و توہین ہوتی ہے لہٰذا یہ جملہ لوگوں کو صراحت سے اس کام سے منع کر رہا ہے۔فرمایا گیا ہے: ایسے مال سے کس طرح خرچ کرتے ہو جب کہ تم خود اسے کراہت و مجبوری کے سوا قبول کرنے کو تیار نہیں ہو۔تو کیا تمہارے مسلمان بھائی بلکہ اس سے بڑھ کر وہ خدا جسکی راہ میں خرچ کر رہے ہو تمہاری نگاہ میں خود تم سے بھی کمتر ہیں۔

آیت درحقیقت ایک باریک نکتے کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور وہ یہ کہ جو اخراجات اللہ کی راہ میں ہوتے ہیں ان میں ایک طرف تو حاجت مند، فقراء اور مساکین ہیں اور دوسری طرف خدا ہے جس کے لئے اخراجات کیے جا رہے ہیں، اس حالت میں اگر پست اور بے قیمت مال کا انتخاب کیا گیا تو ایک طرف پروردگار کے مقام بلند کی توہین شمار ہوگی کہ اسے طیب و پاکیزہ اجناس کے لائق نہ سمجھا گیا اور دوسری طرف حاجت مندوں کی تحقیر ہے کیونکہ ممکن ہے تہی دست ہونے کے باوجود وہ ایمان اور انسانیت میں بلند مقام رکھتے ہوں اور ایسے انفاق سے روحانی طور پر آزردہ اور دکھی ہوں۔

ارشاد فرمایا گیا ہے: جان لو کہ خداوند عالم بے نیاز اور لائق تعریف ہے یعنی اس امر کی طرف متوجہ رہو کہ اس خدا کی راہ میں خرچ کر رہے ہو جسے تمہارے خرچ کرنے کی ضرورت نہیں اور حمد و ستائش کے لائق وہی ہے جس نے یہ تمام نعمتیں تمہارے اختیار میں دی ہیں۔

(۲۶۸)اَلشَّیۡطٰنُ یَعِدُکُمُ الۡفَقۡرَ وَ یَاۡمُرُکُمۡ بِالۡفَحۡشَآءِ ۚ وَ اللّٰہُ یَعِدُکُمۡ مَّغۡفِرَۃً مِّنۡہُ وَ فَضۡلًا ؕ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴾ۖۙ	شیطان تمہیں (خرچ کرتے وقت) فقر و فاقہ اور تنگ دستی کے وعدے دیتا ہے اور معصیت (اور برائیوں) کی دعوت دیتا ہے لیکن خدا تم سے مغفرت و بخشش اور اضافے کا وعدہ کرتا ہے اور خدا کی قدرت وسیع ہے اور وہ (ہر چیز کو) جانتا ہے۔

تفسیر

آیت کا پہلا حصّہ کہتا ہے کہ خرچ کرتے وقت اور زکوٰۃ دیتے وقت شیطان تمہیں فقر و تنگدستی سے ڈراتا ہے۔ خصوصاً جب اچھے اور قابل توجہ اموال خرچ کرنا چاہو جن کی طرف گذشتہ آیت میں اشارہ ہوا ہے۔ اکثر اوقات یہ شیطانی وسوسہ خرچ کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے بلکہ زکوٰۃ و خمس اور دیگر واجب اخراجات پر بھی اثر انداز ہوسکتا ہے۔ خدا تعالیٰ انسان کو آگاہ کررہا ہے کہ تنگ دستی کے خوف سے انفاق اور راہ خدا میں خرچ کرنے سے بچنا غلط فکر اور شیطانی وسوسہ ہے اور ممکن ہے انسان کی نظر میں ہو کہ یہ خوف اگرچہ شیطان کی طرف سے ہے پھر بھی ایک منطقی خوف تو ہے لہٰذا بلا فاصلہ فرماتا ہے شیطان تمہیں معصیت اور گناہ کا حکم دیتا ہے، اس لئے فقر و فاقہ اور تہی دستی سے ڈرنا ہر حالت میں غلط ہے کیونکہ شیطان باطل اور گمراہی کے سوا کسی چیز کی دعوت نہیں دیتا۔

قرآن اس ذریعے سے مسلمانوں کو متوجہ کرتا ہے کہ انفاق اگرچہ ظاہری طور پر تم سے کسی چیز کو کم کردیتا ہے لیکن درحقیقت تمہارے سرمائے میں معنوی اور مادی ہر دو لحاظ سے بہت سی چیزوں کا اضافہ کردیتا ہے۔

تفسیر ''مجمع البیان'' میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

> انفاق کرتے وقت دو چیزیں خدا کی طرف سے ہیں اور دو چیزیں شیطان کی طرف سے ہیں۔ خدا کی طرف سے گناہوں کی بخشش اور وسعت مال ہے اور شیطان کی طرف سے فقر و تنگدستی کا وعدہ اور فحشاء و منکر کا حکم دینا ہے۔

''وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ''

اس جملے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ چونکہ وسیع قدرت اور لامتناہی علم رکھتا ہے اس لئے وہ اپنے وعدہ پر عمل کرسکتا ہے۔ لہٰذا اس کے وعدے پر یقین کرنا چاہئے نہ کہ فریب کار اور ناتواں شیطان کے وعدے پر جو انسان کو گناہ کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔

(۲۶۹) يُؤۡتِى الۡحِكۡمَةَ مَنۡ يَّشَآءُ ۚ وَ مَنۡ يُّؤۡتَ الۡحِكۡمَةَ فَقَدۡ اُوۡتِىَ خَيۡرًا كَثِيۡرًا ؕ وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ	حکمت و دانش جسے چاہتا ہے (اور اہل دیکھتا ہے) عطا کرتا ہے اور جسے حکمت و دانش دی گئی اسے بہت بھلائی عطا کی گئی اور عقلمندوں کے سوا (ان حقائق کو) کوئی نہیں پا سکتا (اور نہ کوئی سمجھ سکتا ہے)۔

تفسیر

''وَ مَنۡ يُّؤۡتَ الۡحِكۡمَةَ فَقَدۡ اُوۡتِىَ خَيۡرًا كَثِيۡرًا''

لفظ ''حکمت'' کے بہت سے معانی بیان کیے گئے ہیں مثلاً ''جہان ہستی کی معرفت و شناخت'' ''حقائق قرآن کا علم'' ''گفتار و کردار کے لحاظ سے حق تک پہنچنا'' اور ''خدا کی معرفت و آشنائی'' وغیرہ۔ یہ سب معانی ایک وسیع مفہوم میں یکجا ہو جاتے ہیں۔

اس آیت کی گذشتہ آیات سے مناسبت یہ ہے کہ بعض افراد کو خدا تعالیٰ ان کی پاکیزگی اور کوشش کی وجہ سے ایک علم و آگاہی عطا کرتا ہے جس کی بنا پر وہ نہایت عمدہ طریقے سے معاشرے میں انفاق کے فوائد و آثار اور نقوش حیات کا ادراک کر لیتے ہیں اور خدائی الہامات اور شیطانی وسواسات میں فرق کو جان لیتے ہیں دوسرے لفظوں میں گذشتہ آیت میں چونکہ اس بات پر گفتگو تھی کہ خدا تعالیٰ انفاق کے نتیجے میں بخشش و برکت کا وعدہ کرتا ہے اور شیطان انسان کے دل میں فقر و فاقہ کا وسوسہ پیدا کرتا ہے اس لئے زیر نظر آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ حکمت ہی ایسی چیز ہے جو خدائی اور شیطانی وعدوں میں فرق کر سکتی ہے اور گمراہ کرنے والے وسوسوں سے نجات بخشتی ہے۔

حکمت بخشنے والا اگرچہ خدا ہی ہے لیکن اس جملے میں اس کا نام نہیں لیا گیا، صرف یہ فرمایا گیا ہے: جس کسی کو حکمت دی جاتی ہے اسے بہت سی خیر دی گئی ہے۔

''وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ''

''تذکّر'' کا معنی ہے ''یادآوری'' اور ''روح میں علوم اور دانائیوں کی حفاظت'' ''اَلۡاَلۡبَابِ'' ''لب'' کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے ''مغز'' چونکہ ہر چیز کے بہترین اور بنیادی حصّے کو مغز کہتے ہیں اس لئے عقل و خرد کو ''لب'' کہا جاتا ہے اس جملے میں کہا گیا ہے کہ صرف صاحبان عقل و خرد ہی ان حقائق کو یاد رکھتے ہیں، دوسروں کو یاد دلاتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگرچہ (دیوانوں کے علاوہ) سب لوگ صاحب عقل ہیں لیکن سب کو ''اُولُوا الۡاَلۡبَابِ'' نہیں کہا جاتا۔ بلکہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو عقل و خرد کو کام میں لاتے ہیں اور اس چراغ پر فروغ کے ذریعے راہ حیات پا لیتے ہیں۔

(۲۷۰)وَ مَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَةٍ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ	جو چیز خرچ کرتے ہو! (جن اموال کو راہ خدا میں خرچ کرنے کی) نذر کرتے ہو خدا انہیں جانتا ہے اور ستمگروں کا کوئی یاور و مددگار نہیں۔

تفسیر

''وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنۡ أَنصَارٍ''

یہ جملہ کہتا ہے: ستمگروں اور ظالموں کا کوئی یار و یاور نہیں۔

ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ قیامت کے دن کے لئے جو سزائیں ریا کاروں، بخیلوں، احسان دھرنے والوں اور لوگوں کو اذیت پہنچانے والوں کے انتظار میں ہیں ان سے بچانے کے لئے کوئی بھی ان کی حمایت اور شفاعت نہیں کرے گا۔ یہ ظالم وہ ہیں جنہوں نے عوام کے حقوق پامال کیے ہیں اس لئے کوئی اس عظیم عدالت میں ان کا دفاع نہیں کرے گا۔

ہر ظلم اور ستم کا یہی اثر ہے چاہے وہ جس چہرے اور جس شکل میں ہو۔ اور یہ آیت ضمنی طور پر نذر کے مشروعیت پر بھی دلالت کرتی ہے۔

(۲۷۱)اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَ اِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ مِّنۡ سَيِّاٰتِكُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ	اگر انفاق اور صدقات کھلے بندوں کرو تو اچھا ہے اور اگر مخفی طور پر کرو تو حاجتمندوں کو دو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور ایسا کرنا تمہارے کچھ گناہوں کو چھپا دیتا ہے اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

تفسیر

خرچ کیسے کرنا چاہئے

اس میں شک نہیں کہ راہ خدا میں اعلانیہ یا مخفی طور پر خرچ کرنے میں سے ہر ایک مفید اثر رکھتا ہے کیونکہ جب انسان آشکار اور اعلانیہ اپنا مال راہ خدا میں خرچ کرتا ہے تو اگر وہ واجب خرچ ہے تو قطع نظر اس کے کہ اس سے ایسے نیک کاموں کا لوگوں میں شوق پیدا ہوتا ہے انسان اس تہمت سے بھی بچتا ہے کہ اس نے واجب ذمہ داری پوری نہیں کی اور اگر یہ انفاق مستحب ہے تو حقیقت میں ایک طرح کی عملی تبلیغ ہے جو اچھے کام کرنے، محرموں کا ساتھ دینے اور اجتماعی مفاد کے لئے نیک کام کرنے کی تشویق کا باعث ہے۔

دوسری طرف اگر انفاق مخفی طور پر ہو تو یقیناً اس میں ریاکاری اور خودنمائی کمتر ہوگی اور اس میں خلوص زیادہ ہوگا خصوصاً محروم انسانوں کی مدد کے بارے میں یہ طرز عمل بہتر ہے کیونکہ اس طرح ان کی عزت و آبرو بہتر طور پر محفوظ رہ سکے گی۔

انہی پہلوؤں کے پیش نظر آیت میں ان ہر دو طریقوں کو اپنی جگہ پر اچھا اور شائستہ قرار دیا گیا ہے۔

امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

''واجب زکوٰۃ اپنے مال سے آشکار طور پر الگ کرلو اور کھلے بندوں خرچ کرو۔ لیکن مستحب انفاق مخفی ہو تو بہتر ہے''۔

''وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّئٰتِكُمْ''

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ راہ خدا میں خرچ کرنا گناہوں کی بخشش کے لئے بہت مؤثر ہے کیونکہ حکم انفاق کے بعد اس جملے میں فرمایا گیا ہے: اور تمہارے گناہوں کو چھپاتا ہے۔

البتہ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تھوڑے سے انفاق کی وجہ سے سب گناہ بخش دیئے جائیں گے بلکہ یہاں ''من'' استعمال ہوا ہے جو عام طور پر کچھ حصّے کے لئے ''تبعیض'' کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انفاق کچھ گناہوں کو چھپاتا ہے اور ظاہر ہے یہ انفاق کی مقدار اور خلوص کے معیار سے وابستہ ہے۔

''وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ''

اس جملے کا معنی ہے کہ تم جو کچھ خرچ کرتے ہو ظاہراً ہو یا پوشیدہ، خدا جانتا ہے۔ اسی طرح وہ تمہاری نیتوں سے بھی آگاہ ہے کہ اظہار و اخفاء کس مقصد کے لئے انجام دیتے ہو۔

(۲۷۲) لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ	(جبر سے) ان کی ہدایت کرنا تمہارے ذمّے نہیں ہے لیکن خدا جسے چاہتا ہے (اور وہ اہلیت رکھتا ہے تو) ہدایت کرتا ہے اور جو کچھ تم اچھی چیزوں میں سے خرچ کرتے ہو وہ تمہارے ہی لئے ہے (لیکن) اللہ کی رضا کے سوا خرچ نہ کرو اور اچھی چیزوں میں سے جو کچھ تم خرچ کرتے ہو وہ تمہیں دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں ہوگا۔

شان نزول

تفسیر مجمع البیان میں ابن عباس سے منقول ہے کہ مسلمان غیر مسلموں پر خرچ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں اجازت دی گئی کہ ضروری مواقع پر یہ کام انجام دیں۔

تفسیر

''لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ'': یعنی۔ تم ان کی ہدایت پر مجبور نہیں ہو۔

اس جملے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب ہے اور گذشتہ آیات سے اس کا ربط واضح ہے کیونکہ گذشتہ آیت میں کلی طور پر

انفاق کا ذکر ہے اور یہ آیت غیر مسلموں پر اس معنی میں خرچ کرنے کی تشریح کرتی ہے کہ غیر مسلم فقراء ومساکین پر اس مقصد کے لئے خرچ نہ کرنا کہ وہ فقر وفاقہ کی سختی سے اکتا کر اسلام قبول کرلیں اوران کی ہدایت ہوجائے ، یہ صحیح نہیں ہے۔ جیسے اس دنیا میں خدائی بخششیں اور نعمتیں (بلاتفریق دین وآئین) سب انسانوں کے لئے ہیں مسلمانوں کو بھی چاہئے کہ جب مستحب انفاق کریں اور حاجت مندوں کی حاجت روائی کریں تو ضروری مواقع پر غیر مسلموں کی حالت کا بھی خیال رکھیں۔

''وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ''

یعنی خدا جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے لیکن یہ مسلم ہے کہ پروردگار عالم کی طرف سے ہدایت حساب وکتاب اور حکمت و دانش کے بغیر نہیں یعنی ایسا نہیں کہ وہ کسی کو بلاوجہ ہدایت دے دے اور دوسرے کو محروم رکھے۔

''وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَ نْفُسِكُمْ''

آیت کے اس حصّے میں فرمایا گیا ہے کہ انفاق کے فوائد کی بازگشت خود تمہاری طرف ہے۔ اس میں انفاق کرنیوالوں کو اس انسانی عمل کی تشویق دلائی گئی ہے۔ مسلم ہے کہ جب انسان یہ جان لیتا ہے کہ اس کے کام کا نتیجہ اور فائدہ خود اسی کو حاصل ہوگا تو اس کا دل زیادہ اس کام میں لگے گا۔

ممکن ہے بادی النظر میں یہ معلوم ہو کہ انفاق کے منافع کی بازگشت سے مراد اس کی اخروی جزا اور اس کے اخروی نتائج ہیں۔ یہ مفہوم اگرچہ صحیح ہے لیکن ایسا نہیں کہ انفاق کا فائدہ فقط آخرت میں حاصل ہوتا ہے بلکہ اس دنیا میں بھی اس کے مادی اور معنوی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

''وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ''

یعنی مسلمان اپنے اموال خوشنودی خدا کی طلب کے علاوہ خرچ نہیں کرتے۔

جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ممکن ہے کہ جملہ خبر یہ یہاں نہی کے معنی میں ہو یعنی لوگوں کو انفاق نہیں کرنا چاہئے مگر یہ کہ خدا کی رضا کے لئے ہو اور انفاق صرف اس صورت میں سودمند اور مفید ہے جب خدا کی خاطر انجام پذیر ہو۔

''وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ''

آیت کے اس حصے میں سابق مفہوم کو زیادہ واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے یہ گمان نہ کرو کہ انفاق سے تمہیں صرف تھوڑا سا فائدہ پہنچے گا بلکہ جو کچھ تم خرچ کروگے سب تمہاری طرف پلٹ آئے گا اور تم پر تھوڑا سا ظلم بھی نہیں ہوگا اس لئے انفاق کرتے وقت ہاتھ اور دل کھلا رکھو۔

(۲۷۳)لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ	تمہارا انفاق ان لوگوں کے لئے جو حاجت مند ہوں اور راہ خدا میں محصور ہو چکے ہوں سفر نہ کر سکتے ہوں (کہ سفر کے ذریعے روزگار مہیّا کریں) اور ان کی خودداری کی وجہ سے بے خبر لوگ انہیں دولت مند اور تونگر سمجھتے ہیں لیکن تم انہیں ان کے چہروں سے پہچان لوگے اور وہ اصرار کر کے ہرگز لوگوں سے کوئی چیز طلب نہیں کرتے (یہ ان کی نشانیاں ہیں) اور ہر اچھی چیز جو تم راہ خدا میں خرچ کرو خدا اس سے آگاہ ہے۔

شانِ نزول

امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ یہ آیت اصحاب صفہ[1] کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ مسجد میں ان کی رہائش چونکہ مسجد کے احترامات کے منافی تھی لہٰذا انہیں حکم دیا گیا کہ مسجد سے باہر صفہ میں منتقل ہو جائیں۔ اس صورت حال پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں مسلمانوں کو اپنے بھائیوں کی ہر ممکنہ امداد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔

تفسیر

انفاق کا بہترین موقع

اس آیت میں خدا تعالیٰ نے انفاق کے لئے بہترین موقع بیان کیا ہے۔ جن پر خرچ کیا جانا چاہئے ان لوگوں کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں:

1۔ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ :

یعنی وہ لوگ جو اہم کاموں مثلاً جہاد، دشمن سے مقابلہ، فنون جنگ کی تعلیم اور ضروری علوم کی تحصیل میں مصروف ہیں اور اس وجہ سے اپنی زندگی کے اسباب مہیا نہیں کر سکتے۔ جیسے اصحاب صفہ، جو اس کے واضح مصداق تھے۔

2۔ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ:

---

[1] اصحاب صفہ: یہ تقریباً چار سو افراد تھے۔ ان کا تعلق مکہ اور اطراف مدینہ سے تھا۔ مدینہ میں ان کا کوئی گھر اور کوئی رشتے دار نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے مسجد نبوی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ انہوں نے ہر اسلامی جہاد میں شرکت کے لئے اپنی آمادگی کا اعلان کر رکھا تھا۔

وہ اسباب زندگی کی تلاش میں سفر اختیار نہیں کر سکتے۔ان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ شہروں، بستیوں اور ایسے علاقوں میں جائیں جہاں اللہ کی نعمتیں فراواں ہیں۔

3۔یَحۡسَبُهُمُ الۡجَاهِلُ اَغۡنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ:

یعنی جولوگ ان کے حالات سے آگاہ نہیں ہیں وہ ان کی خودداری، عزت نفس اور پاکدامنی کی وجہ سے گمان کرتے ہیں کہ یہ غنی اور کسی کی امداد سے بے نیاز ہیں۔

4۔تَعۡرِفُهُمۡ بِسِیۡمٰهُمۡ:

''سیما'' لغت میں ''علامت'' اور ''نشانی'' کے معنی میں ہے۔یعنی اگر چہ وہ اپنے بارے میں کوئی بات نہیں کہتے لیکن ان کے چہرے پر داخلی دکھ درد کی نشانیاں موجود ہوتی ہیں جو باشعور افراد کے لئے واضح ہوتی ہیں۔ان کے رخساروں کا رنگ ان کے اندرونی راز کی خبر دیتا ہے۔

5۔لَا یَسۡـَٔلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا:

مراد یہ ہے کہ وہ پیشہ ورفقیروں کی طرح کسی سے سوال نہیں کرتے یعنی وہ تو اصولی طور پر سوال کرتے ہی نہیں چہ جائیکہ وہ سوال میں اصرار یا تکرار کریں۔

''وَ مَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیۡمٌ''

یہ جملہ خرچ کرنے والوں کو شوق دلانے کے لئے ہے۔خصوصاً ایسے افراد پر خرچ کرنا جو صاحب عزت نفس اور عالی مزاج ہیں کیونکہ جب خرچ کرتے وقت کسی کو یہ خیال ہو کہ جو کچھ وہ راہ خدا میں خرچ کر رہا ہے چاہے مخفی طور پر ہے لیکن خدا تعالیٰ اس سے آگاہ ہے اور اسے اس کے عمل کے ثمرات سے بہرہ مند کرے گا تو وہ زیادہ لگاؤ اور انہماک سے یہ عظیم خدمت سرانجام دے گا۔

(۲۷۴)اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ بِالَّیۡلِ وَ النَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ وقف منزل	وہ لوگ جو شب و روز اپنے اموال پنہاں و آشکار خرچ کرتے ہیں، ان کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے۔ان پر کوئی خوف ہے نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔

تفسیر

ہرصورت میں خرچ کرنا

بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے کیونکہ آپ نے ایک درہم رات کو، ایک دن کو، ایک چھپا کر اور ایک ظاہر بظاہر خرچ کیا تھا۔

لیکن قرآن کا حکم حسب معمول ایک عمومی حیثیت رکھتا ہے۔اس آیت میں انفاق کے طور طریقوں اور مختلف کیفیّات کی

تشریح کی گئی ہے اور انفاق کرنے والوں کی ذمہ داری کی وضاحت کی گئی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ ظاہر یا پوشیدہ طور پر خرچ کرتے وقت اخلاقی و اجتماعی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ جس پر خرچ کیا جا رہا ہے اس کی شخصی حیثیت کو بھی مدّ نظر رکھا جانا چاہیئے۔

ایسے افراد کو اجر اور اچھے بدلے کی خوشخبری دیتے ہوئے فرماتا ہے: ان کا اجر وثواب خدا کے پاس ہے اور ان کے لئے کوئی وحشت وخوف اور غم واندوہ نہیں ہے۔

جو لوگ خدا کے وعدوں پر ایمان رکھتے ہیں اور خرچ کرنے کے اجتماعی آثار کو بھی سمجھتے ہیں وہ راہ خدا میں خرچ کرنے سے مستقبل کے لئے کسی خوف ووحشت میں مبتلا نہیں ہوتے اور اپنی کچھ دولت خرچ کر دینے پر غمزدہ نہیں ہوتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ اس کے بدلے میں پروردگار کے ہاں کئی مراتب حاصل کریں گے اور اس کے بہت فضل سے بہرہ مند ہوں گے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ انہیں اس دنیا میں اور آخرت میں اس عمل کے ذریعے انفرادی، اجتماعی اور اخلاقی برکات حاصل ہوں گی۔

(۲۷۵)اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِىْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ	جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ تو بس اس شخص کی طرح کھڑے ہوتے ہیں جسے شیطان نے چھوکر باؤلا کر دیا ہو اور وہ اپنے اعتدال کو برقرار نہ رکھ سکتا ہو یہ سب اس لئے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ بیع بھی سود کی طرح ہے جب کہ اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے اور اگر کسی تک خدا تعالیٰ کی طرف سے نصیحت پہنچ جائے اور وہ (سودخوری سے) بچ جائے تو وہ سود جو پہلے اسے مل چکا ہے وہ اس کا مال ہے اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہو جائے گا۔ لیکن جو لوگ لوٹ جائیں (اور اس گناہ کا نئے سرے سے ارتکاب کریں) وہ اہل آتش جہنم میں ہوں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔
(۲۷۶)يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِى الصَّدَقٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ	اللہ سود کو نابود کر دے گا اور صدقات کو بڑھائے گا اور خدا کسی ناشکرے گنہ گار کو دوست نہیں رکھتا۔

(۲۷۷)اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ لَھُمۡ اَجۡرُھُمۡ عِنۡدَ رَبِّھِمۡ ۚ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡھِمۡ وَ لَا ھُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ	جولوگ ایمان لے آئے ہیں اورانہوں نے اچھے اعمال انجام دیئے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی ان کی اجرت وثواب ان کے پروردگار کے پاس ہے ان کے لئے کوئی خوف ہے نہ وہ کسی حزن وملال میں مبتلا ہوں گے۔

تفسیر

سودخوری قرآن کی نظر میں

گذشتہ آیات میں حاجت مندوں کے لئے مال خرچ کرنے اور رفاہ عامہ کے کام سرانجام دینے کے بارے میں گفتگو تھی۔ ان آیات میں سودخوری کا مسئلہ زیر بحث آیا ہے۔سودخوری کا اثر اور نتیجے کی ضد ہے۔ان آیات کا مقصد دراصل گذشتہ آیات کے سلسلے کی تکمیل کرنا ہے کیونکہ سود طبقاتی تفاوت میں اضافے ، چندلوگوں کے پاس سرمائے کی ریل پیل اور معاشرے کے بیشتر لوگوں کی محرومیت کا سبب بنتا ہے۔

''اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ''

''خبط'' کا لغوی معنی ہے: ''راہ چلتے یا اٹھتے وقت بدن کواعتدال پر نہ رکھ سکنا۔'' آیت میں سودخور کو آسیب زدہ اور دیوانہ سے تشبیہ دی گئی ہے جو چلتے وقت اپنے بدن کو اعتدال میں نہ رکھ سکے اور صحیح طریقے سے قدم نہ اٹھا سکے۔اس سے مراد دنیا میں سود خوروں کا اجتماعی چال چلن ہے کیونکہ ان کا یہ عمل دیوانوں کا سا ہے۔اوراس سے مراد حشر ونشر کے وقت کھڑا ہونا اور میدان قیامت میں آنا بھی ہوسکتا ہے یعنی سودخور اس جہاں میں زندہ ہونے کے وقت دیوانوں اور آسیب زدہ افراد کی طرح محشور ہوگا۔

''ذٰلِکَ بِاَنَّھُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّمَا الۡبَیۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا''

آیت کے اس حصے میں سودخوروں کی یہ منطق بیان کی گئی ہے کہ تجارت اور سودخوری میں کوئی فرق نہیں ہے یعنی دونوں ایک ہی طرح کالین دین ہیں جنہیں طرفین اپنے ارادہ واختیار سے انجام دیتے ہیں۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: خدا نے بیع اور تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔یعنی ان دونوں کے درمیان واضح فرق ہے۔انہیں ایک دوسرے سے مشتبہ نہیں کرنا چاہیئے۔قرآن نے اس کی مزید تفصیل اس لئے بیان نہیں کی کہ یہ بالکل واضح ہے۔

''وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الۡبَیۡعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنۡ جَآءَہٗ مَوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ فَانۡتَھٰی فَلَہٗ مَا سَلَفَ''

اس جملے میں کہا گیا ہے کہ جن لوگوں کے پاس سود کی حرمت کے بارے میں خدائی نصیحت پہنچ جائے اور وہ یہ کام چھوڑ دیں، جوسود وہ اس حکم کے نزول سے قبل لے چکے ہیں وہ انہی کی ملکیّت ہے یعنی یہ قانون ہر دوسرے قانون کی طرح ماقبل پر لاگو نہیں ہوتا۔

" وَ اَمۡرُہٗۤ اِلَی اللّٰہِ "یعنی ان کا معاملہ قیامت میں خدا کے سپرد ہوگا۔

اور جو شخص خدا تعالیٰ کی طرف سے اس نصیحت اور بار بار کی تاکید کے باوجود اس عمل سے باز نہ آیا اسے چاہئے کہ پروردگار کے دردناک اور دائمی عذاب کا منتظر رہے۔دائمی عذاب اگر چہ اہل ایمان کے لئے نہیں ہے لیکن آیت میں ایسے سود خوار مراد ہیں جو خدا سے جنگ اور دشمنی کرتے ہوئے نہایت ڈھٹائی سے اس گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔مسلم ہے کہ ایسے لوگوں کا ایمان صحیح نہیں ہے۔

(۲۷۶) اس آیت میں ربا اور انفاق کے درمیان مقابلہ ہوا ہے۔ارشاد ہوتا ہے خداوند عالم ربا کو نابود کرتا ہے اور صدقات کا اضافہ کرتا ہے۔

"کفّار" مادہ "کفور" (برون "فجور") سے ہے۔کفور اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت ہی ناشکرا اور کفران نعمت کرنے والا ہو اور "اثیم" "زیادہ گناہ کرنے والے" کو کہتے ہیں۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ سودخور نہ صرف یہ کہ راہ خدا میں خرچ نہ کر کے،قرض حسنہ نہ دے کر اور عام ضرورتمندوں کے کام نہ آ کر خدا کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر یہ ادا نہیں کرتے بلکہ اس کے ذریعے ہر قسم کا ظلم وستم اور گناہ وفساد کرتے ہیں اور یہ فطری بات ہے کہ خدا ایسے لوگوں کو دوست نہیں رکھتا۔

(۲۷۷) ناشکر گذار گنہ گار سودخوروں کے مقابلے میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ایمان کے زیر سایہ خود پرستی کو ترک کئے ہوئے اپنے فطری جذبوں کو زندہ کیے ہوئے ہیں۔یہ لوگ اپنے پروردگار سے رابطہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔نماز قائم کرتے ہیں،حاجت مندوں کے کام آتے ہیں اور ان کی حمایت میں پیش پیش ہوتے ہیں۔اسی طرح وہ سرمائے کے ارتکاز،طبقاتی کشمکش اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ہزاروں جرائم کی راہ روکے ہوئے ہیں۔ان کی جزا ان کے پروردگار کے پاس ہے اور وہ دونوں جہانوں میں اپنے نیک عمل کے نتیجے سے بہرہ مند ہوں گے۔

فطری امر ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے اضطراب اور پریشانی کے عوامل پیدا نہیں ہوتے اور جو خطرات مفت خور سرمایہ داروں کو لاحق تھے اور ان پر جو لعن طعن اور نفرین ہوتی تھی ایسے لوگوں پر نہیں ہوتی۔مختصر یہ کہ وہ مکمل راحت،آرام اور اطمینان سے بہرہ یاب ہوں گے اور ان کے لئے کسی قسم کا اضطراب اور غم واندوہ نہیں ہے۔

(۲۷۸) یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ ذَرُوۡا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ	اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور جو ربا (کا تقاضا ابھی) باقی ہے اسے چھوڑ دو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔
(۲۷۹) فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ۚ وَ اِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَکُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِکُمۡ ۚ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَ لَا تُظۡلَمُوۡنَ	اگر ایسا نہیں کرتے ہو تو پھر خدا اور رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ تو بہ کر لو تو (سود کے بغیر اصل) سرمایہ تمہاری ہی ملکیت رہے گا۔نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔

(۲۸۰)وَ اِنۡ کَانَ ذُو عُسۡرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیۡسَرَۃٍ ؕ وَ اَنۡ تَصَدَّقُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ	اور اگر (مقروض قرض) ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو اسے اتنی مہلت دو کہ وہ ایسا کر سکے اور اگر بخش دو تو بہتر ہے۔ اگر (تم اس کام کے فائدے سے) آگاہ ہو۔

شان نزول

علی بن ابراہیم کی تفسیر میں ہے کہ سود کی آیت کے نزول کے بعد خالد بن ولید نامی ایک شخص پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کہنے لگا: میرے باپ کے ثقیف قبیلے سے سودی معاملات تھے اور اس نے مطالبات وصول نہیں کیے تھے اور مجھے وصیت کر گیا تھا کہ اس کا سودی مال جو ابھی تک اس نے وصول نہیں کیا حاصل کرلوں اور اپنی تحویل میں لے لوں۔ کیا یہ عمل میرے لئے جائز ہے؟ اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور لوگوں کو ایسے کام سے سختی سے روک دیا گیا۔

تفسیر

پہلی آیت میں خدا تعالیٰ نے اہل ایمان کو مخاطب فرمایا ہے، انہیں پرہیزگاری کی وصیت کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اگر وہ ایمان رکھتے ہیں تو اپنے باقی ماندہ سودی مطالبات بھول جائیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ آیت ایمان باللہ سے شروع ہوتی ہے اور ایمان ہی کے تقاضے پر ختم ہوتی ہے۔ یہ امر اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ سود روح ایمان کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

(۲۷۹) اس آیت میں قرآن نے اپنے لب و لہجہ کو بدل دیا ہے۔ پہلی آیت کی نصیحتوں کے بعد اس آیت میں سود خوروں پر شدید حملہ کیا ہے اور انہیں خطرے کا الارم دیا ہے۔ حکم ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے اپنا کام جاری رکھا اور حق و حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا اور اسی طرح محروم لوگوں کا خون چوستے رہے تو پیغمبرؐ مجبور ہیں کہ فوجی طاقت سے انہیں روکیں اور حق کے سامنے جھکا دیں۔ حقیقت میں یہ پیغمبرؐ کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔ یہ وہی جنگ ہے جو اس قانون کے تحت انجام پاتی ہے:

''فَقَاتِلُوا الَّتِی تَبۡغِیۡ حَتّٰی تَفِیۡءَ اِلٰی اَمۡرِ اللہِ'' تجاوز اور بغاوت کرنے والے گروہ سے جنگ کرو تا کہ وہ فرمان خدا کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ (حجرات۔۹)

بہر صورت اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی حکومت طاقت کے ذریعے سود خوری کو روک سکنے کی مجاز ہے۔

''وَ اِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَکُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِکُمۡ ۚ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَ لَا تُظۡلَمُوۡنَ''

ارشاد ہوتا ہے: اگر توبہ کرلو اور سود خوری کی دوکان بڑھا دو تو تمہیں حق پہنچتا ہے کہ لوگوں کے پاس جو تمہارا اصلی سرمایہ ہے (سود چھوڑ کر) وہ لے لو اور یہ قانون ہر طرح سے عادلانہ ہے کیونکہ یہ قانون ایک طرف تو تمہیں دوسروں پر ظلم کرنے سے روکتا ہے اور دوسری طرف تمہیں ظلم کے وار سے بچاتا ہے۔ اس طرح نہ ظالم بنو گے اور نہ مظلوم۔

''لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَ لَا تُظۡلَمُوۡنَ''۔ اگرچہ یہ سود خوروں کے بارے میں آ رہا ہے لیکن درحقیقت یہ وسیع مفہوم کا حامل نہایت

قیمتی اسلامی شعار ہے جو کہتا ہے کہ جس طرح مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ظلم کرنے سے پرہیز کریں اس طرح اپنے آپ کو ظلم وستم کے سپرد کرنے سے بھی اجتناب کریں۔ اصولی طور پر اگر ستم کش نہ ہوں تو ستمگر بھی کم پیدا ہوں گے۔ اگر مسلمان اپنے حقوق کے دفاع کا پورا حوصلہ اور آمادگی رکھتے ہوں تو کوئی ان پر ظلم نہیں کرسکتا۔ لہٰذا ظالم کو ظلم سے منع کرنے سے پہلے مظلوم سے کہو کہ ظلم نہ سہے۔

(۲۸۰) قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ (سود کے بغیر) اصل سرمایہ طلبگار کا حق ہے۔ اس آیت میں مقروض کا ایک حق بیان کیا گیا ہے کہ اگر وہ اپنا قرض ادا کرنے سے عاجز ہو تو نہ صرف یہ کہ زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق ان پر نیا سود نہ لگایا جائے اور انہیں ستایا نہ جائے بلکہ اصل قرض کی ادائیگی پر بھی انہیں مہلت دی جانا چاہئے تاکہ جب وہ واپس کرسکنے کے قابل ہوں اس وقت لوٹا سکیں۔ قوانین اسلامی میں جو دراصل اس آیت کے مفہوم کو واضح کرتے ہیں یہ تصریح ہو چکی ہے۔ کبھی بھی مقروض افراد کے گھر اور دیگر ضروری وسائل کو قرق کرکے اس سے قرضہ وصول نہیں کیا جاسکتا بلکہ ضروریات زندگی سے زائد مال پر طلبگار اسی سے اپنا حق لے سکتے ہیں اور یہ انسانی معاشرے کے ضعیف اور پسماندہ طبقے کی بہت واضح حمایت ہے۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر فرمایا گیا ہے: اگر مقروض اپنا قرضہ ادا کرنے سے واقعاً بالکل عاجز ہو تو بہتر ہے کہ طلب گار ایک عظیم تر انسانی قدم اٹھائے اور اپنے مال سے صرف نظر کرلے اور یہ اس کے لئے ہر لحاظ سے بہتر اور انسانی ہمدردی کا اچھا مظہر ہے اور جو شخص اس عمل خیر کے فوائد سے آگاہ ہو جائے گا وہ واقعیت کی تصدیق کرے گا۔

(۲۸۱) وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَی اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰی كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۧ	اور اس دن سے ڈرو جب خدا کی طرف پلٹ جاؤ گے اور پھر ہر شخص نے جو کچھ انجام دیا ہوگا اسے لوٹا دیا جائے گا اور ان پر ظلم و ستم نہیں ہوگا (بلکہ جو کچھ بھی دیکھیں گے وہ ان کے اپنے اعمال کے نتائج ہوں گے۔

تفسیر

اس آیت میں لوگوں کو قیامت اور بدکاروں کے اعمال کے عذاب کی طرف توجہ دلاتے ہوئے بیدار کیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ متوجہ رہیں کہ ایک ایسا دن آنے والا ہے کہ انسان کے تمام اعمال بغیر کسی کمی بیشی کے اسے لوٹا دیئے جائیں۔

ضمناً۔ یہ آیت دوسرے جہان میں انسانی اعمال مجسم ہونے پر ایک اور شاہد ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ تفسیر درمنثور میں کئی طریقوں سے منقول ہے کہ یہ پیغمبر اسلام ﷺ پر نازل ہونے والی آخری آیت ہے اس مضمون کی طرف توجہ کی جائے تو یہ بات بعید بھی نظر نہیں آتی۔ سورہ بقرہ اگرچہ پیغمبر اکرم ﷺ پر نازل ہونے والی آخری سورت نہیں ہے تاہم یہ بات پہلی بات سے کوئی اختلاف نہیں رکھتی کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ بعض اوقات بعد میں نازل ہونے والی آیات حکم رسول ﷺ سے پہلی سورتوں میں شامل کردی گئی ہیں۔

سودخوری ایک قسم کا غیر صحیح اقتصادی مبادلہ ہے جو انسانی جذبوں اور رشتوں کو کمزور کر دیتا ہے اور دلوں میں کینے اور دشمنی کا

بیج بوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سودخوری نظام اس بنیاد پر استوار ہے کہ سودخور صرف اپنا مالی مفاد پیش نظر رکھتا ہے اور مقروض کے نقصان پر اس کی قطعاً کوئی نظر نہیں ہوتی۔ یہی مقام ہے جہاں مقروض سمجھتا ہے کہ سودخور پیسے کو اسے اور دوسروں کو بے بس کرنے کا ذریعہ بنائے ہوئے ہے۔

یہ صحیح ہے کہ سود دینے والا اپنی ضرورت کے ماتحت سود دینے پر تیار ہوتا ہے لیکن وہ اس بے انصافی کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ معاملہ کبھی یہاں تک جا پہنچتا ہے کہ مقروض سود کے پنجوں کی سخت گرفت شدت سے محسوس کرتا ہے ایسے موقع پر اس بے چارے کا سارا وجود سودخور کو لعنت اور نفرین کرتا ہے اور وہ اس کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ جو کمائی وہ جان کی بازی لگا کر کرتا ہے وہ سودخور کی جیب میں جا رہی ہے۔ ان حالات میں ایسا بحران پیدا ہوتا ہے کہ بہت سے وحشت ناک جرائم سامنے آتے ہیں۔ کبھی مقروض خودکشی کر لیتا ہے کبھی شدید کرب سے دوچار ہو کر سودخور کو المناک طریقے سے قتل کر دیتا ہے اور کبھی نتیجہ اجتماعی بحران، عمومی افراتفری اور عوامی انقلاب کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ سودخوری اخلاقی نقطۂ نظر سے قرض لینے والے کے دل و دماغ پر بہت برا اثر مرتب کرتی ہے اور اس کے دل میں اس بات کا کینہ ضرور رہ جاتا ہے۔ اس سے افراد اور قوموں کے درمیان اجتماعی تعاون کا رشتہ ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ (کتاب ''ربا خوری یا استعمار اقتصادی'' کا مطالعہ فرمائیں۔)

اسلامی روایات میں ایک مختصر سے پر معنی جملے کے ذریعے سود کے برے اخلاقی اثر کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

کتاب وسائل الشیعہ میں سود کی حرمت کی وجہ کے بارے میں ہے کہ ہشام بن سالم کہتا ہے امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

''انّما حرّم الله عزّ و جلّ الرّبوٰا لکیلا یمتنع النّاس من اصطناع المعروف.'' خدا تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا ہے تا کہ لوگ نیک کام کرنے سے رک نہ جائیں۔ (وسائل ج ۱۲، ابواب رباء۔ باب ۱، ص ۴۲۲)

(۲۸۲) یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْهُ ؕ وَلْیَکْتُبْ بَّیْنَکُمْ کَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَ لَا یَاْبَ کَاتِبٌ اَنْ یَّکْتُبَ کَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْیَکْتُبْ ۚ وَلْیُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ وَلْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَ لَا یَبْخَسْ مِنْهُ شَیْـًٔا ؕ فَاِنْ کَانَ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ سَفِیْهًا اَوْ ضَعِیْفًا اَوْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ هُوَ فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ	اے ایمان والو! جب ایک معین مدت کے لئے (قرض یا کسی اور معاملے کے لئے) ایک دوسرے سے لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو اور لکھنے والے کو چاہئے کہ وہ عدل سے دستاویز لکھے اور جس شخص کو اللہ نے لکھنے پڑھنے کی قابلیت عطا کی ہے اسے چاہئے کہ وہ لکھنے سے گریز نہ کرے اور جس کے ذمے حق ہے املا وہ شخص کروائے اور خدا سے ڈرے جو اس کا پروردگار ہے اور طے شدہ معاملے میں کوئی چیز فروگزاشت نہ کرے اور اگر قرض لینے والا نادان یا ضعیف ہو (یا دیوانہ ہو) اور یا (گونگا ہونے

وَاسۡتَشۡهِدُوۡا شَهِيۡدَيۡنِ مِنۡ رِّجَالِكُمۡ‌ۚ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُوۡنَا رَجُلَيۡنِ فَرَجُلٌ وَّ امۡرَاَتٰنِ مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰهُمَا الۡاُخۡرٰىؕ وَ لَا يَاۡبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوۡاؕ وَ لَا تَسۡـَٔمُوۡۤا اَنۡ تَكۡتُبُوۡهُ صَغِيۡرًا اَوۡ كَبِيۡرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖؕ ذٰلِكُمۡ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ وَ اَقۡوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدۡنٰٓى اَلَّا تَرۡتَابُوۡٓا اِلَّآ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيۡرُوۡنَهَا بَيۡنَكُمۡ فَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَلَّا تَكۡتُبُوۡهَاؕ وَ اَشۡهِدُوۡۤا اِذَا تَبَايَعۡتُمۡ‌ۚ وَ لَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّ لَا شَهِيۡدٌ ؕ وَ اِنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاِنَّهٗ فُسُوۡقٌۢ بِكُمۡ‌ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ‌ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ‌ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ

کی وجہ سے) املا نہ کرواسکتا ہوتو اس کے ولی کو چاہئے کہ عدل کو ملحوظ رکھتے ہوئے املا کروائے اور اپنے مردوں میں سے دوافراد کو (اس حق پر) گواہ بنائے اور اگر دو مرد نہ ہوں تو اپنے حسب اطمینان ایک مرد اور دو عورتیں منتخب کرلو (یہ دونوں عورتیں مل کر ایک گواہ ہوں گی اور یہ دو اس لئے ہیں) تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے اور جب گواہوں کو شہادت کے لئے بلایا جائے تو انہیں انکار نہیں کرنا چاہئے چاہے تھوڑا ہو یا زیادہ اسے لکھنے پر دل تنگ نہیں ہونا چاہئے (جو کچھ بھی ہو لکھ لینا چاہئے) یہ خدا کے نزدیک عدل کے قریب تر ہے، شہادت کے لئے زیادہ سہولت اسی میں ہے اور شک وتردّد (اور بحث ونزاع) کو روکنے کے لئے یہی بہتر ہے۔ ہاں البتہ جو لین دین تم دست بدست آپس میں کرتے ہو اس میں نہ بھی لکھا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں اور نقد خرید وفروخت کے وقت بھی گواہ بنا لیا کرو۔ کاتب اور گواہ کو (حق گوئی کی وجہ سے) کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔ (اور نہ ان سے سختی کی جانا چاہئے) اور اگر ایسا کرو گے تو پروردگار کے فرمان سے نکل جاؤ گے۔ خدا سے ڈرتے رہو اور خدا تمہیں تعلیم دیتا ہے اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

تفسیر

تجارتی دستاویزات

جیسے قرآن نے سود خوری، ذخیرہ اندوزی اور بخل کے خلاف سخت جنگ کی ہے۔ اسی طرح تجارتی اور اقتصادی امور کے لئے تفصیلی قواعد بیان کئے ہیں۔ تاکہ جتنا زیادہ ہو سکے سرمایہ طبیعی رشد حاصل کرے اور کسی قسم کا جھگڑا، اختلاف اور نزاع پیدا نہ ہو۔

محل بحث آیت قرآن حکیم کی طویل ترین آیت ہے۔ اس میں مالی لین دین کے قواعد کے سلسلے میں انیس احکام بیان کیے

گئے ہیں۔ ذیل میں ہم ان قواعد کو ترتیب وار ذکر کرتے ہیں:

1۔ جو کوئی شخص کسی کو قرض دے یا کوئی معاملہ انجام پائے اور طرفین میں سے ایک مقروض ہو جائے تو بعد میں ممکنہ کسی اشتباہ یا نزاع سے بچنے کے لئے معاملے کی ساری شرائط ضبط تحریر میں آ جانا چاہیئں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ آیت میں لفظ ''قرض'' نہیں بلکہ ''دین'' استعمال ہوا۔ قرض صرف وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں دو ایسی چیزوں کا تبادلہ ہو جو ایک دوسرے کی مثل ہوں۔ مثلاً نقدی یا جنس قرض کے طور پر لی جائے اور اس سے فائدہ اٹھا کر اس کی مثل واپس کر دی جائے لیکن دین کا دامن وسیع تر ہے کیونکہ جیسا معاملہ انجام پائے۔ مثلاً صلح، اجارہ، خرید و فروخت وغیرہ پھر اگر ایک طرف سے کچھ دیا جانا ہو تو اسے دین کہتے ہیں۔ اس بناء پر زیر بحث آیت ان تمام معاملات پر محیط ہے جو ''سلف'' یا نسیہ کے طور پر انجام پاتے ہیں یہاں تک کہ قرض بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے۔

2۔ اطمینان کے حصول کے لئے اور طرفین میں سے کسی کی ممکنہ بے جا مداخلت سے بچنے کے لئے حکم دیا گیا ہے کہ دستاویز کوئی تیسرا شخص لکھے۔

3۔ کاتب کو چاہئے کہ دستاویز لکھتے وقت حق کو پیش نظر رکھے اور عین واقع کے مطابق لکھے۔ کسی ایک شخص کے ذاتی مفاد کو نہ دیکھے۔

4۔ جس شخص کو خدا تعالیٰ نے لکھنے پڑھنے کی قابلیت عطا فرمائی ہے اور وہ معاملے کے بارے میں احکام و شرائط سے آگاہ ہے اسے چاہئے کہ دستاویز لکھنے میں گریز نہ کرے بلکہ اس اجتماعی امر میں طرفین کی مدد کرے۔

5۔ چاہئے کہ معاملے کے دونوں فریق میں سے ایک دستاویز کی املا کروائے یعنی وہ کہتا جائے تاکہ کاتب لکھتا جائے۔ لیکن طرفین میں سے ایسا کون کرے؟ اس بارے میں آیت کہتی ہے کہ مقروض یعنی جسے حق ادا کرنا ہے وہ ایسا کرے۔

6۔ جس کے ذمہ حق واجب الادا ہے اسے چاہئے کہ املا کرواتے وقت خدا تعالیٰ کو پیش نظر رکھے اور کسی چیز کو فراموش نہ کرے اور تمام چیزیں کہے تاکہ کاتب لکھ لے۔

7۔ اگر مقروض سفیہ و نادان ہو اپنے مالی امور کی دیکھ بھال نہ کر سکتا ہو اور اپنے نفع و نقصان کو نہ سمجھ سکتا ہو ضعیف و کمزور، کوتاہ فکر، کم عقل اور گونگا ہو (بات کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو) تو ان صورتوں میں اس کی جگہ اس کا ولی املا کروائے گا۔ اور دستاویز کو ترتیب دینے والا اسے لکھے گا۔

8۔ ''ولی'' کو بھی چاہئے کہ املاء میں عدالت کو ملحوظ رکھے اور حق سے انحراف سے بچے۔

9۔ طرفین کو دستاویز پر دو گواہ بھی بنانا چاہئیں۔

11.10۔ یہ دونوں گواہ بالغ اور مسلمان ہوں۔

''(کُمْ)'' مسلمان ہونے کا معنی دیتا ہے کیونکہ ''مِنْ رِّجَالِکُمْ'' کا لفظی معنی ہے ''ایسے مرد جو تمہاری جماعت میں سے ہوں۔''

12۔ایک مرداور دوعورتیں بھی گواہ ہو سکتے ہیں۔

13۔گواہ قابل اعتماد ہونا چاہئیں

''مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ'' اس جملے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گواہ ہر لحاظ سے پسندیدہ ہوں اور اس سے مراد ان کی عدالت ہی ہے۔جیسا کہ روایات میں بھی آیا ہے۔

14۔جب گواہ دو مرد ہوں تو ان میں سے ہر ایک مستقل گواہی دے سکتا ہے لیکن جب ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تو پھر ان دو عورتوں کو چاہئے کہ ایک دوسرے سے مل کر متفق ہو کر گواہی دیں تا کہ ان میں سے ایک اشتباہ کرے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔

رہا یہ سوال کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر کیوں شمار کی گئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت نرم دل ہوتی ہے اور ممکن ہے بعض اوقات کسی کے زیر اثر آ جائے اس لئے اس کے ساتھ ایک اور عورت کو شامل کیا گیا ہے تا کہ وہ اسے کسی کے زیر اثر ہونے سے روک سکے۔

15۔جب شاہد سے درخواست کریں کہ گواہی دو۔تو اس پر واجب ہے کہ وہ قبول کرے۔

16۔قرض تھوڑا ہو یا زیادہ اسے تحریر میں آ جانا چاہئے کیونکہ اسلام چاہتا ہے کہ اقتصادی روابط میں کسی قسم کا جھگڑا اور نزاع نہ ہو۔وہ کہتا ہے قرض کی کمی کی وجہ سے دستاویز لکھنے میں کوتاہی نہیں ہونا چاہئے۔

مستی اور خستگی کو''سامہ'' کہتے ہیں''لا تسئموا''یعنی خستہ دل تنگ نہ ہو جاؤ۔

یہاں قرآن مندرجہ بالا احکام کے فلسفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ دستاویزات کی تیاری ایک طرف تو عدل و انصاف کی ضامن ہے اور دوسری طرف گواہوں کے لئے شہادت کے وقت تقویت و اطمینان کا باعث ہے اور تیسرا پہلو یہ ہے کہ افراد معاشرہ کے مابین نزاع پیدا ہونے میں رکاوٹ کا کام دیتی ہے۔

17۔جب معاملہ نقد بنقد ہو تو کسی سند یا دستاویز کی ضرورت نہیں ہے۔

''تجارۃً حاضرۃً'' کا معنی ہے''نقد معاملہ''اور''تدیرونہا''کا مطلب ہے دست بدست پھیرنا جو کہ نقد معاملے ہی کی تاکید ہے۔''فلا جناح''یعنی کوئی حرج نہیں۔یہ لفظ ظاہر کرتا ہے کہ جب نقد معاملہ انجام پا رہا ہو اس وقت بھی کوئی دستاویز تیار کر لینا بہتر ہے کیونکہ اس طرح ہر طرح کا ممکنہ اشتباہ اور اعتراض ختم ہو جاتا ہے۔

18۔نقد معاملے میں اگرچہ تحریر ضروری نہیں البتہ گواہ بنا لینا چاہئیں۔

19۔آیت کے آخر میں حکم دیا گیا ہے کہ گواہوں اور کاتب پر کسی قسم کا تشدد اور سختی نہیں کی جانا چاہئے تا کہ وہ حق اور عدالت سے اپنا کام سرانجام دیں۔جو کچھ ہم نے مندرجہ بالا جملے میں کہا ہے اس سے معلوم ہوا کہ''یضارّ''اصطلاح کے مطابق فعل مجہول ہے یعنی اسے اذیت نہ پہنچائی جائے۔

باقی رہا عدالت کے بارے میں کاتبوں اور گواہوں کے لئے حکم۔تو وہ آیت کی ابتداء میں آ چکا ہے اس لئے ضرورت نہیں کہ ''ولا یضار''کو فعل معلوم سمجھیں اور اس کا معنی یہ لیں کہ''وہ اذیت نہ پہنچائیں''مندرجہ بالا حکم کے بعد تاکید ہے کہ اگر کوئی شخص حق گوئی

کی بناء پر گواہوں اور کاتبوں کو اذیت پہنچائے تو وہ فسق و گناہ کا مرتکب قرار پائے گا اور ایسا کرنا خدا کی بندگی کے تقاضوں کے منافی ہے۔

یہ تمام احکام بیان کرنے کے بعد آخر میں لوگوں کو تقویٰ و پرہیز گاری اور اوامر الٰہی کی اطاعت کی دعوت دی گئی ہے۔اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ جو چیزیں تمہاری مادی اور معنوی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔خدا تعالیٰ تمہیں ان کی تعلیم دیتا ہے۔وہ لوگوں کے فائدے اور نقصان سے آگاہ ہے اور جن چیزوں میں بہتری اور اصلاح ہے وہی ان کے لئے مقرر کرتا ہے۔

(۲۸۳) وَ اِنۡ كُنۡتُمۡ عَلٰى سَفَرٍ وَّ لَمۡ تَجِدُوۡا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقۡبُوۡضَةٌ ؕ فَاِنۡ اَمِنَ بَعۡضُكُمۡ بَعۡضًا فَلۡيُؤَدِّ الَّذِى اؤۡتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَ لۡيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَ لَا تَكۡتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَ مَنۡ يَّكۡتُمۡهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلۡبُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ عَلِيۡمٌ ؑ	اور اگر تم سفر میں ہو اور دستاویز لکھنے کے لئے کوئی کاتب میسّر نہ آئے تو کچھ رہن رکھ لو اور اگر تم ایک دوسرے پر (کامل) اطمینان رکھتے ہو (تو اس کی بھی ضرورت نہیں) اور جسے امین سمجھا گیا ہے اسے چاہئے کہ امانت ادا کرے اور اس اللہ سے ڈرے جو اس کا پروردگار ہے اور شہادت کو نہ چھپاؤ کہ جو شخص اسے چھپائے گا اس کا دل گنہگار ہے اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو اللہ اس سے آگاہ اور اس کا عالم ہے۔

تفسیر

یہ آیت دراصل گذشتہ آیت کے مفاہیم کی تکمیل کرتی ہے۔اس میں چند ایک احکام مزید بیان فرمائے گئے ہیں۔

1۔اگر لین دین کرتے وقت دستاویز لکھنے والا میسر نہ ہو، جیسا کہ سفر میں پیش آسکتا ہے تو قرض لینے والا دوسرے کی تسلی کے لئے کوئی چیز گروی کے طور پر دے دے۔

بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ رہن کا قانون سفر سے مخصوص ہے لیکن اگلے جملے وَلَمۡ تَجِدُوا كَاتِبًا (کاتب میسر نہ آئے تو) سے ظاہر ہوتا ہے کہ سفر کا ذکر مثال کے طور پر ایسے موقع کے لئے آیا ہے جب دستاویز لکھنے والا میسر نہ ہو۔اس بناء پر وطن میں بھی طرفین صرف رہن پر اکتفا کر سکتے ہیں۔تفاسیر اہل بیت علیہم السلام میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے۔شیعہ و سنی کتب احادیث میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زرہ ایک غیر مسلم کے پاس قرض لینے کے لئے رہن کے طور پر رکھی تھی۔

2۔رہن حتمی طور پر قرض دینے والے کے پاس رہنا چاہئے تا کہ اسے اطمینان رہے فَرِهَانٌ مَقۡبُوضَةٌ...تفسیر عیاشی میں ہے کہ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

''لا رهن الّا مقبوضة.'' (رہن ہی نہیں مگر وہ کہ جو طلب گار کی تحویل میں ہو)۔

3۔دستاویز لکھنا، گواہ بنانا اور رہن رکھنا سب احکام ایسے مواقع کے لئے مخصوص ہیں جہاں طرفین ایک دوسرے کے بارے میں مکمل طور پر اطمینان نہ رکھتے ہوں ورنہ قرض دینے والے کو کسی دستاویز کی کوئی ضرورت نہیں اور مقروض کو بھی چاہئے کہ وہ اس کے اعتماد کا احترام کرے اور برمحل اس کا حق ادا کر دے اور تقویٰ کو فراموش نہ کرے۔

4۔لین دین کا موقع ہو یا کوئی اور، اصولی طور پر جو لوگ جانتے ہیں کہ کس کا کیا حق ہے ان کی ذمہ داری ہے کہ جب انہیں

گواہی کے لئے بلایا جائے تو وہ گواہی کو نہ چھپائیں کیونکہ گواہی کو چھپانا عظیم گناہوں میں شمار ہوتا ہے۔

یہ واضح ہے کہ گواہی دینا اس صورت میں ہم پر واجب ہے جب دوسرے اپنی شہادت سے حق کو ثابت نہ کریں اگر کچھ لوگ اپنی گواہی سے حق کو ثابت کر دیں تو باقی لوگوں پر سے یہ ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے۔ اصطلاح میں گواہی دینا واجب کفائی ہے۔

شہادت کا مخفی رکھنا اور موقع کے مطابق اس کا اظہار نہ کرنا، یہ عمل چونکہ دل ہی کی مرضی سے انجام پاتا ہے اس لئے مزید تاکید کے طور پر گناہ کی نسبت دل کی طرف دی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے: اس کا دل گنہ گار ہے۔

آیت کے آخر میں امانت اور دیگر حقوق کے بارے میں زیادہ سے زیادہ توجہ اور بیداری کے لئے فرمایا گیا ہے کہ پروردگار تمہارے کردار سے باخبر ہے۔

(۲۸۴) لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ	جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ کا مال ہے (لہٰذا) جو کچھ تمہارے دل میں ہے اسے ظاہر کر دو یا پوشیدہ رکھو خدا تمہارا حساب اس کے مطابق ہی کرے گا۔ پھر جسے چاہے گا (اور جو اہل ہوگا) اسے بخش دے گا اور جسے چاہے گا (اور وہ مستحق ہوگا) اسے عذاب دے گا اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر

انسان سے جو گناہ سرزد ہوتے ہیں ان میں سے بعض اعمال خارجی پہلو رکھتے ہیں اور بعض داخلی اور قلبی پہلو رکھتے ہیں۔ مثلاً شہادت کو چھپانا اور شرک کرنا وغیرہ۔ مندرجہ بالا آیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ خدا تعالیٰ صرف ظاہری گناہوں کا محاسبہ نہیں کریگا بلکہ باطنی اور قلبی پہلو رکھنے والے گناہ بھی احتساب کے عمل سے گزریں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان پر حاکم ہے اور کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے۔ اندرونی اور قلبی گناہوں کا محاسبہ نہ کر سکنے والے وہ ہیں جو آسمان و زمین اور دنیا کے ظاہر و باطن سے بے خبر ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کا عالم ہے۔

اس تفسیر سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت ان بہت سی احادیث سے کوئی اختلاف نہیں رکھتی جن میں فرمایا گیا ہے کہ گناہ کی نیت گناہ نہیں ہے کیونکہ یہ احادیث ان نافرمانیوں کے بارے میں ہیں جو خارجی عمل کا پہلو رکھتی ہیں اور نیت ان کا مقدمہ اور تمہید ہے اور یہ احادیث ان گناہوں کے بارے میں نہیں ہیں جو ذاتی طور پر اندرونی اور باطنی پہلو رکھتے ہیں اور قلبی عمل ہیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: جہاں وہ چاہتا ہے لغزشوں سے درگذر فرماتا ہے اور جہاں اس کا ارادہ ہو سزا دیتا ہے البتہ واضح ہے کہ بخشش و عذاب اور ہدایت و ضلالت کے بارے میں خدا کا ارادہ اور مشیت کسی حساب کے بغیر نہیں ہوتے بلکہ وہ اہلیت اور قابلیت کی بناء پر ہی ہیں جنہیں انسان خود حاصل کرتا ہے اور پروردگار ہر چیز پر طاقت و قدرت رکھنے والا ہے۔

(۲۸۵)اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ	رسول اس چیز پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور مومنین بھی سب کے سب خدا اور اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے بھیجے ہوئے افراد (رسولوں) پر ایمان رکھتے ہیں۔(اور وہ کہتے ہیں کہ) ہم خدا کے رسولوں میں کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں: ہم نے سنا ہے اور ہم اطاعت کرتے ہیں۔اے ہمارے پروردگار مغفرت تیری طرف سے ہے اور تیری ہی طرف بازگشت ہے

تفسیر

زیر بحث آیت میں یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ خالق کائنات اور اس کے تمام پروگرام جو پیغمبر پر نازل ہوئے ہیں پیغمبر کا ان پر مستحکم اور غیر متزلزل عقیدہ ہے بلکہ مومنین اور جو مکتب پیغمبر کے تربیت یافتہ ہیں وہ بھی ایسے ہی ہیں۔

زیر بحث آیت آگے کہتی ہے: وہ ایمان رکھتے ہیں کہ تمام انبیاء ایک ہی ہدف اور مقصد کے حامل ہیں اور ایک ہی مقصد کے لئے بھیجے گئے ہیں لہٰذا سب زبان حال سے کہتے ہیں: ہم خدا کے بھیجے ہوئے افراد میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

البتہ یہ بات اس امر سے تضاد نہیں رکھتی کہ گذشتہ تمام ادیان منسوخ ہو چکے ہیں کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ انبیاء کی تعلیمات مختلف کلاسوں کی تعلیم کی طرح ہیں۔جب اعلیٰ کلاسوں میں ترقی کی جاتی ہے تو پہلی کلاسیں چھوٹ جاتی ہیں حالانکہ ان کا احترام برقرار رہتا ہے۔

بندگی کا اعتراف

اہل ایمان ہمیشہ بندگی اور عبودیت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں: پروردگار! تیرے پیغمبر ہمیں تیری طرف بلانے کے لئے جو دعوت اور ندا دیتے ہیں ہم اسے دل و جان سے قبول کرتے ہیں اور تیری پیروی و اطاعت کی منزل میں داخل ہوتے ہیں۔

لیکن خدایا! آخر ہم انسان ہیں۔کبھی ہمارے نفوس ہمیں لغزشوں سے بھی دوچار کر دیتے ہیں لہٰذا ہم تجھ سے بخشش کی امید رکھتے ہیں کیونکہ ہم نے بہر حال تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔

(۲۸۶)لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ٚ وَاغْفِرْ لَنَا ٚ وَارْحَمْنَا ٚ اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۠	خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتا (اسی بناء پر انسان) جو بھی (نیک) کام انجام دے اس کی جزا اور جو (برا) کام کرے خود اس کی سزا پائے گا (مومنین کہتے ہیں) پروردگار! اگر ہم بھول جائیں یا خطا کر گذریں تو ہمارا مواخذہ نہ کرنا۔ اے ہمارے رب! کسی سنگین ذمہ داری کا بوجھ ہم پر نہ ڈالنا جیسا کہ (گناہ وسرکشی کی وجہ سے) ان لوگوں پر ڈالا گیا جو ہم سے پہلے تھے۔ اے ہمارے پروردگار! ایسی سزائیں نہ دے جنہیں ہم برداشت نہیں کر سکتے اور ہمارے گناہوں کے آثار ہم سے دھو ڈال، ہمیں بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر دے تو ہمارا مولا اور سرپرست ہے پس ہمیں کفار کی جماعت پر کامیابی اور کامرانی عطا فرما۔

تفسیر

طاقت کے مطابق ذمہ داری

"وسع" کا لغوی معنی قدرت اور طاقت ہے۔ اس بناء پر آیت اس عقلی حقیقت کی تائید کرتی ہے کہ خدا کی طرف سے عائد ذمہ داریاں کبھی بشری طاقت سے ماوراء نہیں ہوسکتیں لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ یہ آیت تمام احکام کی تفسیر اور حد بندی کرتی ہے۔ تمام احکام یہ خصوصیّت رکھتے ہیں کہ وہ انسانی قدرت وطاقت کے مطابق ہیں۔ ایک کلیم وعادل فقط ایسا ہی قانون بنا سکتا ہے۔

ضمنی طور پر اس بات سے اس حقیقت کی پھر تائید ہو جاتی ہے کہ احکام شرعی کبھی حکم عقل کے منافی نہیں ہو سکتے۔ حکم شرع اور حکم عقل ہمیشہ دوش بدوش رہتے ہیں۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ انہی قوانین واحکام پر عمل سے انسانی سرنوشت مربوط ہے اس جملے کے مطابق ہر شخص اپنے نیک وبد عمل کا نتیجہ حاصل کرے گا۔ اس جہان میں اور آئندہ جہاں میں اپنے کئے کا پھل پائے گا۔ اس طرح لوگوں کو ان کی ذمہ داری اور ان کے اعمال کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ اس طرح سے قرآن نے ان افسانوں پر خط بطلان کھینچ دیا ہے جن میں لوگوں کو ان کے اعمال سے بری قرار دیا گیا ہے یا بلا وجہ کسی کے اعمال کی جوابدہی کا ذمہ دار دوسروں کو قرار دیا گیا ہے۔

مومنین چونکہ ''لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ'' کے قانون کی روشنی میں سمجھتے ہیں کہ ان کے مستقبل کا انحصار ان کے اپنے اچھے یا برے کردار پر منحصر ہے لہٰذا بارگاہ الٰہی میں خاص تضرع وزاری کے ساتھ اپنے رب کو پکارتے ہیں، اس ذات کو پکارتے ہیں جو ان کی پرورش میں خاص لطف وکرم فرماتا ہے اور کہتے ہیں (اے ہمارے پروردگار! اگر ہم بھول اور خطا واشتباہ سے دوچار ہو جائیں تو اپنی وسیع رحمت سے تو ہماری لغزش سے درگزر اور ہمیں اس کے عذاب سے رہائی بخش۔

اس جملے میں مومنین خدا سے دو تقاضے اور کرتے ہیں:

پہلا: یہ کہ ان پر دشوار ذمہ داریاں عائد نہ ہوں۔

کیونکہ ایسی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں بعض اوقات اطاعت پروردگار کے خلاف کام ہو جاتا ہے۔

دوسرا: یہ کہ وہ طاقت فرسا آزمائشوں اور ناقابل برداشت سزاؤں سے محفوظ رہیں۔

''رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ'' ''لَا تُحَمِّلْ'' گذشتہ جملے میں اور ''وَ لَا تُحَمِّلْنَا'' اس جملے میں شاید اسی بناء پر ہے کیونکہ پہلی تعبیر مشکلات کے مواقع کے لئے اور دوسری طاقت فرسا مواقع کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

سُوْرَۃ

اٰلِ عِمْرَانَ

مدینہ میں نازل ہوئی

۲۰۰ آیات ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے
(۱) الٓمّٓ	ال م
(۲) اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ	خدائے یکتا کے علاوہ کوئی معبود نہیں وہ زندہ و پائیدار اور نگہبانی کرنے والا ہے۔
(۳) نَزَّلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ وَ اَنۡزَلَ التَّوۡرٰۃَ وَ الۡاِنۡجِیۡلَ	(وہی ذات ہے) جس نے تم پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی یہ کتاب گذشتہ کتب کی نشانیوں پر منطبق ہوتی ہے۔اور تورات و انجیل کو اتارا۔

شانِ نزول

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اسی (۸۰) سے کچھ زیادہ آیات نجران کے عیسائی نمائندوں کے بارے میں ہیں جنہیں اسلام کے بارے میں تحقیق کے لئے مدینہ بھیجا گیا تھا

وہ ساٹھ افراد تھے ان میں سے چودہ نجران کے اشراف اور معززین شمار ہوتے تھے ان چودہ میں سے تین سردار تھے وہاں کے عیسائی اپنے کاموں اور مشکلات میں انہی تین سے رجوع کرتے تھے ان میں سے ایک عاقب تھا جسے عبدالمسیح بھی کہتے تھے۔ وہ اپنی قوم کا امیر اور رئیس بھی شمار ہوتا تھا۔ اس کی قوم کبھی اس کے نظریے اور رائے کی مخالفت نہیں کرتی تھی دوسرے کا نام سید تھا اسے ایہم بھی کہتے تھے۔ خاطر تواضع اور سفر کے انتظامی امور کی سرپرستی بھی کرتا تھا اور عیسائیوں کے لئے بہت قابل اعتماد تھا تیسرا شخص ابوحارثہ تھا جو عالم تھا اور نہایت بااثر تھا عیسائیوں نے کئی ایک گرجے اس کے نام پر بنا رکھے تھے اسے تمام مذہبی مسیحی کتب زبانی یاد تھیں ساٹھ افراد کا یہ گروہ قبیلہ بنی کعب کے لباس میں مدینہ آیا اور مسجد نبوی میں پہنچا۔ اس وقت حضرت نبی اکرم ﷺ مسلمانوں کے ہمراہ نماز عصر ادا فرما چکے تھے ان ساٹھ افراد نے خوبصورت زرق برق اور پرکشش لباس پہن رکھے تھے۔ ایک صحابی کے بقول: ہم نے کبھی کوئی نمائندے ایسے بنے ٹھنے نہیں دیکھے تھے۔

وہ مسجد پہنچے تو یہ ان کی نماز کا وقت تھا۔ انہوں نے اپنے مراسم کے مطابق ناقوس بجایا اور مشرق کی طرف رخ کر کے نماز میں مشغول ہو گئے۔ کچھ اصحاب نے انہیں روکنا چاہا لیکن آپؐ نے فرمایا: تم ان سے سروکار نہ رکھو۔

نماز کے بعد عاقب اور سید، نبی کریم ﷺ کی خدمت آئے اور آپؐ سے گفتگو کرنے لگے۔ آپ نے انہیں دین اسلام قبول کرنے اور بارگاہِ خداوندی میں سرِ تسلیم خم کرنے کی دعوت دی۔

عاقب اور سید کہنے لگے: ہم آپ سے پہلے اسلام لا چکے ہیں اور بارگاہِ الہٰی میں سرتسلیم خم کر چکے ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم کس طرح دینِ حق پر ہو جب کہ تمہارے اعمال بتاتے ہیں کہ تم خدا کے سامنے سر جھکائے ہوئے نہیں ہو کیوں کہ تم خدا کے لئے بیٹے کے قائل ہو اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہو، صلیب کی پوجا اور پرستش کرتے ہو اور خنزیر کا گوشت کھاتے ہو۔ جب کہ یہ سب امور دینِ حق کے خلاف ہیں۔

عاقب اور سید نے کہا: اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے نہیں تو پھر ان کا باپ کون تھا؟

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تم یہ بات جانتے ہو کہ ہر بیٹا باپ سے شباہت رکھتا ہے؟

انہوں نے کہا: ہاں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا ایسا نہیں ہے کہ ہمارا خدا ہر چیز پر قادر ہے، قیوم ہے اور موجودات کو روزی دینا اس کے ذمہ ہے؟

وہ کہنے لگے: ہاں ایسا ہی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں یہ اوصاف تھے؟

انہوں نے کہا: نہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ زمین و آسمان کی کوئی چیز خدا سے مخفی نہیں ہے اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے؟

کہنے لگے: ہاں ہم جانتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو کچھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا نے بتایا کیا وہ اس کے علاوہ اپنی طرف سے کسی چیز کو جانتے تھے؟

وہ بولے: نہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ ہمارا خدا وہی ہے جس نے شکم مادر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جیسے چاہا بنایا؟

کہنے لگے: ہاں ایسا ہی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا ایسا نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی والدہ باقی بچوں کی طرح جسم میں اٹھائے رہیں اور پھر باقی ماؤں کی جنم دیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ولادت کے بعد دیگر بچوں کی طرح غذا کھاتے تھے؟

وہ کہنے لگے: ہاں ایسے ہی تھا۔

اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تو پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے کیسے ہو گئے جب کہ اس سے کوئی شباہت نہیں رکھتے؟

گفتگو یہاں تک پہنچی تو سب کے سب خاموش ہو گئے۔ اس وقت اس سورہ کی اسی (۸۰) سے کچھ اوپر آیات نازل ہوئیں۔

ان آیات میں بعض معارف اور کچھ اسلامی پروگراموں کی وضاحت کی گئی ہے۔

تفسیر

1۔اس کا ایک اہم حصہ توحید' صفات خداوندی، معاد' معارف اسلامی سے بحث کرتا ہے۔

2۔دوسرا حصہ جہاد کے مہم دستورات' شہداء اور جنگ بدر' اُحد کے عبرتناک دروس کے بارے میں بحث کرتا ہے۔

3۔ایک حصہ میں احکام اسلامی کے سلسلے میں آنے والے موضوعات کے بارے میں بحث کرتا ہے۔

لزوم وحدتِ مسلمین' خانہ کعبہ وفریضہ حج' امر بالمعروف ونہی عن المنکر' تولیٰ وتبریٰ' امانت' راہِ خدا میں انفاق' جھوٹ کا ترک کرنا' دشمن کے مقابلے میں حوصلہ مندی' مشکلات وآزمائشات الٰہی کے وقت صبر اور ہر حال میں ذکر خدا اسی طرح تاریخ انبیاء من جملہ آدم' نوح' ابراہیم' موسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام وداستانِ مریم وغیرہ مذکور ہیں

(۲) زیرنظر دوسری آیت میں ہے کہ اللہ یگانہ ویکتا ہے، جاوداں اور قائم رہنے والا معبود ہے اور تمام چیزیں اسی کے وجود سے وابستہ ہیں اس آیہ کی شرح وتفسیر سورہ بقرہ کی آیہ ۲۵۵ میں گزر چکی ہے۔

(۳) زیرِ نظر تیسری آیت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مخاطب ہیں۔ فرمایا گیا ہے: وہ خدا جو پائندہ اور قیوم ہے اس نے تم پر ایسا قرآن نازل کیا ہے جس میں حق وحقیقت کی نشانیاں ہیں اور یہ نشانیاں ان کے علاوہ بھی ہیں جن کی بشارت گذشتہ انبیاء اور آسمانی کتب (تورات اور انجیل) نے دی ہے اور گذشتہ انبیاء اور آسمانی کتب نے قرآن اور قرآن لانے کے بارے میں جو گفتگو کی ہے اس نے اس کی بھی تصدیق کی ہے وہ وہی خدا ہے جس نے تورات اور انجیل کو نوع بشر کی راہنمائی اور ہدایت کے لئے نازل کیا ہے۔

(۴) مِنۡ قَبۡلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ اَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ ؕ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمۡ عَذَابٌ شَدِيۡدٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيۡزٌ ذُو انۡتِقَامٍ	اور اس سے قبل (تورات وانجیل کو نازل کیا) لوگوں کی ہدایت کے لیے۔ اور حق و باطل میں تمیز کرنے والی کتاب (قرآن مجید) کو نازل کیا۔ جو لوگ آیات الٰہی کے منکر ہو گئے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے اور خدا سخت انتقام لینے والا ہے۔

تفسیر

اتمام حجت' خدا کی طرف سے آیات کے نزول اور انبیاء کے دعویٰ کی صداقت پر عقل وفطرت گواہی کے بعد بلاشبہ انہیں قبول کر لینا چاہئے لہٰذا جو لوگ ان تمام امور کے باوجود مخالفت کرتے ہیں تو اس سبب ہٹ دھرمی اور سرکشی کے علاوہ کچھ نہیں اور عقل و وجدان انہیں مستحق عذاب قرار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس آیت میں منکرین آیات کو شدید اور دردناک عذاب کی تہدید کرتا ہے۔ اس لئے کہ خدا کا توانا ہونا ثابت ہو جائے کہ جو دھمکیاں دیتا ہے اس کے تحقق بخشی کو تردید نہیں ہے لہٰذا فرتا ہے: خداوند توانا اور صاحب انتقام ہے۔

(۵)اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخۡفٰی عَلَیۡہِ شَیۡءٌ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ ؕ	زمین وآسمان میں کوئی چیز بھی خدا پر مخفی نہیں رہتی (اس لیے ان کی تدبیر کرنا بھی اس کے لئے مشکل نہیں ہے)۔

تفسیر

یہ آیت درحقیقت گذشتہ مفاہیم کی تکمیل کرتی ہے۔ کیونکہ ہم گذشتہ آیات میں پڑھ چکے ہیں کہ خدا جاوداں اور قیوم ہے جہانِ ہستی کی تدبیر اور انتظام اس کے ہاتھ میں ہے مسلم ہے کہ یہ کام قدرت وعلم کا محتاج ہے لہٰذا گذشتہ آیت کے آخر میں اس کی قدرتِ مطلقہ کی طرف اشارا ہوا ہے اور یہ آیت اس کے بے پایاں علم کی طرف اشارا کرتی ہے۔ اور کہتی ہے: زمین وآسمان کی کوئی چیز اللہ کے لئے مخفی اور مستور نہیں ہے۔ یہی مضمون قرآن کی دیگر بہت سی آیات میں بھی آیا ہے۔

پروردگار کے وسعتِ علم کی دلیل واضح ہے کیونکہ وہ ہر جگہ حاضر وناظر ہے اس کے لئے اس کا وجود بے پایاں وغیر محدود ہے کوئی جگہ اس سے خالی نہیں ہے لہٰذا اگر چہ وہ محل ومقام نہیں رکھتا۔ تمام چیزوں پر محیط ہے خدا کا یہ احاطہ وجودی اور ہر جگہ پر اس کے حاضر ہونے کا حتمی نتیجہ یہ ہے کہ تمام چیزوں اور جگہوں کے متعلق اس کا علم کامل ہے اور وہ بھی علم حضوری نہ کہ علم حصولی۔

(۶)ھُوَ الَّذِیۡ یُصَوِّرُکُمۡ فِی الۡاَرۡحَامِ کَیۡفَ یَشَآءُ ؕ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ	(اللہ) وہ ذات ہے جو ماؤں کے رحم میں جیسی چاہتا ہے تمہاری صورت بناتا ہے (اسلئے) اس توانا اور حکیم خدا کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔

تفسیر

اس آیت میں خدا کی قدرت، دانائی اور حکمت کا شاہکار بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ وہ شکمِ مادر میں انسان کی صورت بناتا ہے واقعاً یہ امر تعجب خیز اور حیرت انگیز ہے کہ رحم کے اندر خدا انسان کے مختلف خط وخال بناتا ہے اور طرح طرح کی استعداد پیدا کرتا ہے، کئی قسم کی صفات عطا کرتا ہے اور جبلت وسرشت کی تشکیل کرتا ہے۔

زیبندہ ستائش ، آن آفرید گاری است
کارد چنین دل آویز ، نقشی زماء وطینی

(وہ خالق لائق تعریف ہے کہ جو ایسا دل آویز نقش پانی اور مٹی سے بنالایا ہے)

اور تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ تمام نقش ونگار پانی پر ہیں جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس پر نقش ونگار نہیں ہو سکتے۔

ے کہ کردہ است در آب صورت گری؟ (یہ کون ہے کہ جس نے پانی پر صورتیں بنائی ہیں؟)

(۷)هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ؕ وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَ مَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ	وہ ذات وہ ہے کہ جس نے تم پر کتاب نازل کی جس کی بعض آیات محکم (صریح اور واضح) ہیں جو اس کتاب کی بنیاد ہیں اور کچھ آیات متشابہ ہیں لیکن جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تا کہ فتنہ انگیزی کرتے رہیں اور ان کی (غلط) تفسیر کرنا چاہتے ہیں حالانکہ ان کی تفسیر اللہ اور علم میں راسخ لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور یہ (راسخون فی العلم) وہی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور دانشمند لوگوں کے سوا کوئی ادراک حقیقت نہیں کر سکتا۔

شانِ نزول

تفسیر نورالثقلین میں معانی الاخبار کے حوالے سے ایک حدیث منقول ہے کہ:

یہودیوں کے چند افراد حیّ بن اخطب اور اسکے بھائی کے ہمراہ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حروف مقطعہ ''الم'' کی بنیاد پر کہنے لگے کہ ابجد کے حساب سے الف مساوی ہے ایک کے اور لام برابر ہے تیس (۳۰) کے اور میم مساوی ہے چالیس (۴۰) کے لہٰذا اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کی امت کی بقاء کا زمانہ اکہتر برس سے زیادہ نہیں ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے ان کی غلط فہمی کے ازالے کے لئے فرمایا:

تم صرف ''الم'' **الف ، لام ، میم**'' کا حساب کیوں کرتے ہو۔ کیا قرآن میں ''**المص ، الر**'' اور دیگر حروف مقطعہ نہیں ہیں۔ اگر یہ حرف میری اُمت کی بقاء کی طرف اشارہ ہیں تو سب کا حساب کیوں نہیں کرتے ہو۔ (جب کہ ان حروف سے تو کچھ اور مراد ہے)۔

بہر حال اس واقعہ پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

آیت کی تفسیر کے سلسلے میں نتیجہ کلام

زیر بحث آیت کی تفسیر کے ضمن میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی آیات دو قسم کی ہیں۔

(۱) ایک وہ کہ جن کا مفہوم اس طرح واضح اور روشن ہے کہ ان سے کسی قسم کے انکار، ان کی توجیہ اور ان سے غلط فائدہ

اٹھانے کی بالکل گنجائش نہیں ہے انہیں محکمات کہتے ہیں۔

(۲) دوسری قسم کی آیات وہ ہیں جن کے مطالب کی سطح بلند ہے یا ان میں ایسے عوالم کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے کہ جو ہماری دسترس سے باہر ہیں مثلاً عالم الغیب، جہان حشر ونشر اور صفات خدا وغیرہ ان آیات کا حقیقی معنی، اسرار اور ان کی کہنہ حقیقت کا ادراک مخصوص علمی سرمائے کا محتاج ہے انہیں متشابہات کہتے ہیں۔

منحرف اور کج رو افراد عموماً کوشش کرتے ہیں کہ آیات متشابہات سے غلط مقصد حاصل کریں ان کی خلافِ حق تفسیر کریں تا کہ لوگوں میں فتنہ انگیزی کریں اور انہیں راہِ حق سے گمراہ کریں۔ لیکن اللہ تعالیٰ اور راسخین فی العلم ان آیات کے اسرار کو جانتے ہیں اور لوگوں کے سامنے ان کی تشریح کرتے ہیں وہ اپنے وسیع علم کی روشنی میں آیاتِ متشابہات کا آیات محکمات کی طرح ادراک کرتے ہیں اور اس بناء پر سب کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمام آیات ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں کیونکہ سب آیات چاہے محکم ہوں یا متشابہ ان کے علم و دانش کے سامنے واضح اور روشن ہیں۔

علم میں راسخ ہونا سبب بنتا ہے کہ انسان اسرار قرآن سے زیادہ سے زیادہ آگاہ ہوتا ہے البتہ جو علم و دانش کے لحاظ سے پہلے درجے پر فائز ہیں یعنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ ہدیٰ علیہم السلام، تو وہ تمام اسرار سے آگاہ ہیں جبکہ باقی لوگ اپنے علم و فضل کی مقدار کے برابر ان میں سے کچھ چیزیں جانتے ہیں یہی وجہ ہے کہ علماء بھی خدا کے بھیجے ہوئے معلمین سے اسرارِ قرآن حاصل کرنے کے درپے رہتے ہیں۔

(۸) رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً ۚ اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ	(راسخین فی العلم کہتے ہیں) پالنے والے ہمارے دلوں کو سیدھے رہنے کی ہدایت کے بعد منحرف نہ کر دے اور اپنی طرف سے ہم پر رحمت فرما کیونکہ تو ہی بخشنے والا ہے۔
(۹) رَبَّنَآ اِنَّکَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۧ	اے ہمارے پروردگار! تو لوگوں کو اس دن جمع کرے گا جس میں کوئی شک وتردد نہیں ہے کیونکہ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

تفسیر

ممکن ہے کہ آیات متشابہ اور ان کے حقیقی اسرار ورموز لوگوں کے لئے مقام لغزش ہوں جائیں لہٰذا اہل ایمان **راسخین فی العلم** اور صاحبان فکر ونظر آیات کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے اپنے علمی سرمائے سے کام لینے کے علاوہ اپنے خدا کی پناہ اور سہارا بھی حاصل کرتے ہیں اور یہ دونوں آیات جو **راسخون فی العلم** کی زبان سے نقل ہوئی ہیں اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ علم میں راسخ، آگاہ اور فکر ونظر کے حامل ہمیشہ اپنے قلب وروح کی حفاظت کرتے رہتے ہیں تا کہ وہ ٹیڑھے راستوں کی طرف مائل نہ ہوں اور وہ اس

راہ میں خدا کی مدد طلب کرتے ہیں کیونکہ بہت سے لوگ علمی غرور وتکبر کے باعث شکست سے ہمکنار ہو گئے ہیں اور کج راستوں میں سر گرداں ہیں کیونکہ وہ خالق کی عظمت، اپنی خلقت اور اپنی کم علمی کو فراموش کر بیٹھے ہیں اور اپنے پروردگار کی ہدایت سے محروم ہو گئے ہیں لیکن اہل ایمان اور صاحبانِ فکر ونظر کہتے ہیں "رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا.................."

(۹) زیرِ نظر دوسری آیت میں ہے کہ افکار ونظریات کو کنٹرول کرنے کے لئے معاد اور قیامت کے اعتقاد سے بڑھ کر کوئی چیز مؤثر نہیں راسخین فی العلم مبداء ومعاد کے عقیدے کے ذریعے اپنے افکار کو اعتدال پر رکھتے ہیں وہ حد سے گزرتے ہوئے رجحانات اور جذبات سے اجتناب کرتے ہیں کیونکہ یہ لغزش کا سبب بنتے ہیں اس طرح وہ ایک درست اور بے مزاحم فکر ونظر کے ذریعے صحیح راستے کو دیکھتے ہیں اور اس پر چلتے ہیں۔

ہاں ایسے ہی افراد آیاتِ الٰہی سے مکمل طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔

درحقیقت پہلی آیت مبداء کے بارے میں ان کے کامل ایمان کی طرف اشارہ ہے اور دوسری آیت معاد کے بارے میں ان کے راسخ عقیدے کا اظہار ہے۔

(۱۰) إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ ۙ	جو لوگ کافر ہو گئے ہیں انہیں مال ودولت اور اولاد خدا سے بے نیاز نہیں کر سکتے (اور وہ انہیں اس کے عذاب سے نہیں چھڑا سکتے) اور وہ جہنم کی آگ کا ایندھن ہیں۔
(۱۱) كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۚ فَأَخَذَهُمُ اللهُ بِذُنُوبِهِمْ ۗ وَاللهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ	(انکار حقائق اور تحریف میں) ان کی عادت آل فرعون اور ان سے پہلے لوگوں کی طرح ہے انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور خدا نے ان کے گناہوں کے باعث ان کی گرفت کی اور خدا شدید العقاب ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں محکم اور متشابہ آیات کے ساتھ کفار، منافقین اور مومنین کے رویّے کی تشریح کی گئی ہے۔اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اگر ہٹ دھرم کافر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا مال ودولت اور آل اولاد دوسرے جہان میں انہیں بچا سکتے ہیں تو وہ سخت اشتباہ میں ہیں۔ممکن ہے یہ اس جہان میں وقتی طور پر کچھ حوادث کے مقابلے میں انسان کے کام آ جائیں لیکن پروردگار کے مقابلے میں اس دنیا میں اور دوسرے جہان میں ان کی کوئی حیثیت نہیں لہٰذا یہ چیزیں کسی غرور اور جرأت گناہ کا باعث نہیں بننا چاہئیں۔آیت کے آخر میں کہا گیا ہے وہ جلا ڈالنے والی آگ میں گرفتار ہوں گے جس کا وہ خود ایندھن بنیں گے۔

مندرجہ بالا تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کی آگ کے شعلے خود گناہگاروں کے وجود کے اندر سے اٹھیں گے اور انہی کا وجود

ان میں آگ لگادے گا نہ کہ کوئی اور چیز۔ البتہ کچھ آیات ایسی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ دوزخ کا ایندھن گناہگاروں کے علاوہ پتھر بھی ہوں گے لیکن جیسے سورہ بقرہ آیۃ ۲۴ کے ذیل میں کہا جاچکا ہے کہ ممکن ہے ان سے وہ بت مراد ہوں جو وہ پتھر سے بناتے تھے اس طرح جہنم میں آگ ان کے وجود سے، باطل اعمال سے اور جھوٹے معبودوں سے شعلے بن کر نکلے گی۔

(۱۱) مندرجہ بالا دوسری آیت میں پیغمبر اکرم ﷺ کے دور کے کفار کی حالت کو آلِ فرعون اور ان سے پہلی قوموں کی غلط اور مستقل عادت وسیرت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ وہ لوگ آیاتِ خدا کی تکذیب کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی ان گناہوں کی وجہ سے گرفت کی اور وہ اسی جہان میں سخت سزا اور عذاب میں مبتلا ہوئے۔

درحقیقت یہ پیغمبر کے زمانے کے ہٹ دھرم کافروں کو تنبیہ ہے کہ وہ آلِ فرعون اور ان سے پہلی قوموں کی حالت کو نظر میں رکھیں اور اپنے اعمال کا جائزہ لیں۔

یہ صحیح ہے کہ خدا ارحم الراحمین ہے لیکن اپنے مقام پر اور بندوں کی تربیت کے لئے وہ شدید العقاب بھی ہے لہٰذا پروردگار کی وسیع رحمت کہیں کسی کے لئے غرور وتکبر کا باعث نہ بن جائے۔

(۱۲) قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَ تُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ	جو کافر ہو گئے ہیں ان سے کہہ دیجئے جنگ اُحد کی وقتی فتح پر خوش نہ ہو جاؤ عنقریب تم مغلوب ہو جاؤ گے (اور پھر آخرت میں) جہنم کی طرف محشور ہوگے اور وہ کس قدر بری جگہ ہے۔

شان نزول

جنگ بدر اور اس میں مسلمانوں کی کامیابی کے بعد بعض یہودی کہنے لگے: جس رسولِ اُمّی کی تعریف وتوصیف ہم نے اپنی مذہبی کتاب تورات میں پڑھی ہے کہ وہ کسی جنگ میں مغلوب نہیں ہوگا وہ یہی پیغمبر ہے۔

اس پر بعض دوسرے کہنے لگے جلدی نہ کرو، دوسری جنگ اور کوئی واقعہ پیش آلینے دو، پھر فیصلہ کرنا۔

جب جنگِ اُحد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو وہ کہنے لگے: بخدا یہ وہ پیغمبر نہیں جس کی بشارت ہماری کتاب میں دی گئی ہے۔

اس دوران میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں انہیں دندان شکن جواب دیا گیا اور کہا گیا کہ نتیجہ تم کام کے انجام پر اخذ کرنا اور یہ جان لو کہ تم سب مغلوب ہو جاؤ گے۔

تفسیر

ایک صریح پیشن گوئی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو صراحت سے بشارت دی ہے کہ وہ تمام دشمنوں پر فتح یاب ہوں گے نیز کفار

سے کہا گیا ہے کہ تم اس دنیا میں بھی شکست کھاؤ گے اور مغلوب ہو گے اور دوسرے جہاں میں بھی تمہارا انجام بہت بُرا ہوگا۔

آیت کی شان نزول کو دیکھیں تو یہ آیت جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی ہے۔ جب مسلمان ظاہری طور پر اپنی طاقت اور اثر کھو چکے تھے جب کہ دشمنان اسلام اپنے باہمی اتحاد اور معاہدوں کی وجہ سے دیدنی قدرت وطاقت حاصل کر چکے تھے ایسے میں مستقبل قریب کے بارے میں ''سَتُغْلَبُونَ'' (تم عنقریب مغلوب ہو جاؤ گے کہ کر ایک صریح پیشین گوئی کی گئی ہے اس لئے اس آیت کو اعجاز قرآن والی آیات میں شمار کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں آئندہ امور کے بارے میں ایک واضح خبر دی گئی اور وہ ان حالات میں جب کہ کافروں اور یہودیوں پر مسلمانوں کی کامیابی بالکل واضح نہ تھی۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ آیت کی صداقت ثابت ہوگئی۔ مدنیہ کے یہودی بنی قریظہ اور بنی نضیر تباہ و برباد ہو گئے اور جنگ خیبر میں ان کی طاقت کا اہم ترین مرکز ختم ہو گیا۔ اور مشرکین مکہ بھی فتح مکہ کے بعد ہمیشہ کے لئے مغلوب ہو گئے۔

(۱۳) قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَ اللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ	جب دو گروہ (جنگ بدر میں) آمنے سامنے آئے تو اس میں تمہارے لیے نشانی اور درس عبرت تھا ایک گروہ راہ خدا میں جنگ کر رہا تھا اور دوسرا کافروں کا گروہ تھا ان (کافروں) کو (مومنین) اپنی تعداد سے دو گنا نظر آ رہے تھے اور خدا جسے چاہتا ہے اپنی مدد سے اس کی تائید کرتا ہے اور اس میں صاحبان نظر کے لئے عبرت ہے۔

شان نزول

یہ آیت جنگ بدر کی صورت حال کے بارے میں نازل ہوئی ہے جیسا کہ مفسرین نے بیان کیا ہے کہ جنگ بدر میں مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ (۳۱۳) تھی ان میں ستتر (۷۷) مہاجر تھے اور دو سو چھتیس (۲۳۶) انصار مہاجرین کا پرچم حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ میں تھا اور انصار کے پرچم بردار سعد بن عبادہ تھے اس عظیم معرکے کے لئے ان کے پاس صرف ستر (۷۰) اُونٹ دو گھوڑے چھ (۶) زرہیں اور آٹھ (۸) تلواریں تھیں دوسری طرف دشمن کی فوج ہزار افراد سے متجاوز تھی۔ اس کے پاس کافی ووافی اسلحہ تھا اور ایک سو گھوڑے تھے اس جنگ میں بائیس (۲۲) مسلمان شہید ہوئے۔ ان میں چودہ (۱۴) مہاجر اور آٹھ (۸) انصار تھے دشمن کے ستر (۷۰) افراد مارے گئے اور ستر (۷۰) ہی قیدی ہوئے۔ اس طرح مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور یوں مکمل کامرانی کے ساتھ وہ مدینہ کی طرف پلٹ آئے۔ زیرِ نظر آیت واقعہ بدر ہی کا ایک پہلو بیان کرتی ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں کفار کو تنبیہ کی گئی تھی کہ وہ مال وثروت اور کثرتِ تعداد پر مغرور نہ ہوں۔ اس آیت میں اس سلسلے کا ایک زندہ شاہد بیان کیا گیا ہے اور انہیں دعوت دی گئی ہے کہ جنگ بدر کے تاریخ ساز واقعے سے درسِ عبرت حاصل کریں۔

وہ اس بات سے کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے کہ جنگی ساز وسامان سے عاری ایک چھوٹا سا لشکر لیکن پختہ ایمان والوں پر مشتمل اپنے سے کئی گنا بڑے جنگی وسائل سے آراستہ لشکر پر فتح یاب ہو گیا۔ اگر مال و دولت اور کثرت تعداد بغیر ایمان کے اثر انداز ہو سکتی تو جنگِ بدر میں اپنا اثر دکھاتی جبکہ وہاں تو نتیجہ برعکس رہا۔

''يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ''

آیت کے اس حصہ میں فرمایا گیا ہے: میدانِ جنگ میں کافروں کو مومنین اپنی تعداد سے دوگنا دکھائی دیتے تھے یعنی اگر ان کی تعداد ''۳۱۳'' تھی تو چھ سو سے زیادہ دکھائی دیتے تھے۔

یہ مسلمانوں کی کامیابی کے لئے خدائی امداد تھی کیونکہ خدا اپنے مجاہد اور مومن بندوں کی کئی طرح سے مدد کرتا ہے ایسا ظاہری پہلو سے بھی فطری اور طبیعی نظر آتا ہے کیونکہ جب جنگ شروع ہوئی تو مسلمانوں نے دشمنوں پر کمر توڑ ضربیں لگائیں اس لئے کہ وہ قوت ایمان اور تربیت اسلامی سے آراستہ تھے دشمنوں نے یہ دیکھا تو وہ اتنے مرعوب اور وحشت زدہ ہوئے کہ سمجھنے لگے کہ مسلمانوں کے ساتھ اتنی ہی طاقت اور آملی ہے اور پہلی قوت سے دوگنا طاقت سے وہ میدان جنگ پر قابض ہو گئے ہیں جبکہ دشمنان اسلام جنگ شروع ہونے سے پہلے اس نتیجے کا خیال تک بھی نہ کر سکتے تھے اور مسلمان ان کو اصل تعداد سے بھی کم لگتے تھے۔

سورہ انفال کی آیت ۴۴ میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا اور وہ آیت مندرجہ بالا تفسیر کی تائید کرتی ہے

''وَ اللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ''

اس جملے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے غلبہ اور کامیابی عطا کرتا ہے البتہ جیسا کہ ہم متعدد مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ مشیّت الٰہی بغیر کسی وجہ اور بنیاد کے عمل میں نہیں آتی بلکہ ہمیشہ اس کی کوئی حکمت مصلحت ہوتی ہے اور یہ لوگوں کی اہلیت کی حدود میں محدود ہوتی ہے یعنی جو تائید کی لیاقت رکھتے ہیں انہی کی تائید کی جاتی ہے۔

''اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ''

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ چشمِ بصیرت رکھتے ہیں اور حقائق کو صحیح طور پر دیکھتے ہیں وہ اہلِ ایمان کی اس کامیابی کو اس حوالے سے دیکھتے اور پہچانتے ہیں کہ کامیابیوں اور کامرانیوں کا اصل سرمایا ایمان اور صرف ایمان ہے اور پھر وہ اس سے درسِ عبرت حاصل کرتے ہیں۔

(۱۴)زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ	مادی چیزوں میں سے عورتیں اولاد اور مال جو سونے چاندی کے ڈھیروں پر مشتمل ہو منتخب گھوڑے جانور اور زراعت لوگوں کی نظر میں پسندیدہ بنا دیئے گئے ہیں یہ چیزیں اگر انسان کے اصلی مقاصد کے لئے ذریعہ بنیں پھر بھی پست (مادی) زندگی کا سرمایہ ہیں اور انجام نیک (اور عالی زندگی) خدا کے پاس ہے۔

تفسیر

''زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ..................''

یہ جملہ فعل مجہول کی شکل میں ہے اس میں کہا گیا ہے کہ بیوی بچوں اور مال و دولت سے لگاؤ اور ان سے محبت کو لوگوں کی نگاہ میں پسندیدہ بنا دیا گیا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ پسندیدہ بنانے والا اور انہیں لوگوں کی نظروں میں زینت دینے والا کون ہے؟

آیت کی صحیح تفسیر یہی معلوم ہوتی ہے کہ زینت دینے والا خدا ہی ہے اور یہ قوت اس نے انسان کی فطرت وطینت میں ودیعت کی ہے۔ کیونکہ خدا ہی انسان میں اولاد اور مال و دولت کی محبت پیدا کرتا ہے تا کہ اسے آزمائے' اسے کمال وارتقاعطا کرے اور تربیت کے راستے میں آگے لے جائے۔

متاع کیا ہے؟

متاع ایسی چیز کو کہتے ہیں جس سے انسان لطف اندوز ہوتا ہو اور حیاتِ دنیا سے مراد پست زندگی ہے اس بناء پر ''مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'' کا معنی یہ ہوگا کہ اگر کوئی شخص ان چھ امور ﴿1﴾ سے بنیادی ہدف کے طور پر عشق کرے اور انہیں راہِ حیات میں وسیلہ نہ سمجھے تو اس نے اپنے آپ کو پست زندگی کے سپرد کر دیا۔

حیات دنیا (پست زندگی) دراصل اس زندگی کے ارتقاء اور تکامل کی طرف اشارہ ہے اس طرح اس جہاں کی زندگی تو پہلا مرحلہ بن جاتی ہے اسی لئے آیت کے آخر میں اعلیٰ ترین زندگی' جو انسان کے انتظار میں ہے' کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

''وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ''

(نیک انجام تو خدا ہی کے پاس ہے)

﴿1﴾ (۱) بیوی (۲) اولاد (۳) مال و دولت (۴) بہترین سواریاں (۵) گھریلو ضرورت کے جانور (۶) زراعت اور فصلیں

(۱۵)قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ ۚ	کہہ دیجئے کیا تمہیں ایسی چیز سے آگاہ کروں جو اس (مادی سرمائے) سے بہتر ہے جنہوں نے پرہیزگاری اختیار کی ہے ان کے پروردگار کے پاس (دوسرے جہان) میں ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور پاکیزہ بیویاں اور خوشنودی خدا انہیں نصیب ہوگی اور خدا (بندوں کے امور کو) دیکھنے والا ہے۔
(۱۶)اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۚ	وہی لوگ کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لے آئے ہیں پس ہمیں بخش دے اور آگ کے عذاب سے بچالے۔
(۱۷)اَلصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْمُنْفِقِيْنَ وَ الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ	وہی جو پامردی اور استقامت دکھاتے ہیں، سچ بولتے ہیں، خدا کے حضور خضوع کرتے ہیں، (اور اس کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور اوقات سحر میں (عبادت اور آخر شب میں) استغفار کرتے ہیں۔

تفسیر

ان میں پہلی آیت انسانی تکامل وارتقاء کے لئے بلندی کی راہوں کو واضح کرتی ہے اسی طرف گزشتہ آیت کے آخر میں اشارہ ہوا تھا اس آیت میں فرمایا گیا ہے: کیا تمہیں اس چیز کی خبر دوں جو محدود مادی اور پست زندگی سے بالاتر اور بہتر ہے وہ جہان ابدی کی زندگی ہے جو پرہیزگار اور خود دار افراد کے انتظار میں ہے جس میں تمام اس جہان کی نعمتیں موجود ہیں لیکن وہ زیادہ کامل صورت میں ہے اور عیب ونقص سے پاک ہے۔

وہاں ایسے باغات ہیں جن کے درختوں کے نیچے اس جہان کے برعکس پانی بہتا رہتا ہے اور منقطع نہیں ہوتا۔

اس جہان کی نعمتیں تو بہت جلد گزر جاتی ہیں اور ناپائیدار ہیں لیکن وہاں کی نعمتیں ابدی ہیں ''خالدین فیھا''

اس جہان کی بیویاں یہاں کی حسین عورتوں کے برعکس جسمانی وروحانی اعتبار سے بہت پاکیزہ ہوں گی اور ان میں کوئی ناپاکی و تیرگی نہیں ہوگی۔

یہ سب چیزیں پرہیزگاروں کے انتظار میں ہیں اور ان تمام سے بالاتر معنوی نعمتیں ہیں جو تصورات سے ماوراء ہیں جنہیں آیت میں ''وَرِضْوَانٌ مِنَ اللّٰهِ'' (یعنی خوشنودئ خدا) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ آیت ''اونبئکم'' سے شروع ہوتی ہے جس کا معنی ہے ''کیا تمہیں آگاہ کروں'' ایک طرف یہ جملہ استفہامیہ ہے جو انسان کی بیدار فطرت سے جواب طلب کرتا ہے تاکہ سننے والے پر اس کا اثر زیادہ گہرا ہو اور دوسری طرف سے یہ لفظ

''انباء'' کے مادہ سے ہے اور خبر دینے کے معنی میں لیا گیا ہے جو عموماً اہم ترین اور قابلِ توجہ خبروں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

درحقیقت قرآن اس آیت میں صاحبِ ایمان افراد کو خبر دیتا ہے کہ اگر وہ غیر شرعی لذتوں' سرکشی اور گناہ آلود ہوس سے صرفِ نظر کر لیں تو اس کا معنی لذت سے محرومی نہیں ہوگا کیونکہ وہ راہِ سعادت میں جائز لذات حاصل کر سکنے کے علاوہ دوسرے جہاں کی لذتوں سے بھی بہرہ مند ہوں گے جو اس جہاں کی لذتوں کی طرح ہیں لیکن بلند تر بھی ہیں اور ہر نقص وعیب سے مبرّا بھی۔

''وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ'' (یعنی خدا اپنے بندوں کی کیفیت کو دیکھتا ہے) ہوسکتا ہے یہ جملہ اسی حقیقت کی طرف اشارا ہو کہ خدا تعالیٰ دوسرے جہان میں انسانی جسم وروح کے تقاضوں سے آگاہ ہے اور وہ ان تقاضوں کو بطریقِ احسن پورا کرے گا۔

(۱۶) گذشتہ آیت میں بتایا گیا تھا کہ پرہیزگار آخرت کی نعمتوں سے مالا مال ہیں۔ اس آیت میں اور بعد والی آیت میں پرہیزگاروں کا تعارف کرواتے ہوئے ان کی چھ نمایاں صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔

1۔ وہ دل وجان سے اپنے رب کی طرف متوجہ ہیں اور ایمان نے ان کا دل روشن کر دیا ہے۔ اسی لئے وہ سختی سے اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہیں اور وہ اپنے گناہوں کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ وہ خدا سے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہیں اور دوزخ سے نجات کی خواہش کرتے ہیں۔

(۱۷) اس آیت میں بھی سابقہ آیت کی بحث جاری ہے۔

2۔ اپنے معاملات میں صبر واستقامت سے کام لیتے ہیں اور انہیں انجام تک پہنچاتے ہیں۔ گناہ کو ترک کرتے ہیں اور انفرادی واجتماعی مشکلات کا سینہ تان کر مقابلہ کرتے ہیں۔

3۔ سچ بولتے ہیں' صحیح کردار کے مسالک ہیں' جن چیزوں کا دل سے اعتقاد رکھتے ہیں انہی پر عمل کرتے ہیں اور وہ نفاق' جھوٹ' مکر وفریب اور خیانت سے دور رہتے ہیں۔

4۔ خدا کی بندگی اور عبودیت کی راہ میں ہمیشہ خضوع اور فروتنی سے کام لیتے ہیں۔

5۔ مال ہی نہیں بلکہ جو بھی مادی وروحانی نعمتیں انہیں میسر ہیں وہ انہیں راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور اس طرح سے اجتماعی ومعاشرتی مشکلات اور بیماریوں کا مداوا کرتے ہیں۔

6۔ وقت سحر اور آخر شب یعنی جب سکون اور مخصوص صفا وخلوص کا ماحول تمام جگہوں پر محیط ہو' جب بے خبر لوگ خوابِ غفلت میں ہوں اور میٹھی نیند سو رہے ہوں جب ساری دنیا کا شور وشین خاموش ہو چکا ہو اور مردانِ خدا کے افکار اور زندہ دلوں میں عالم ہستی کی اصلی قدریں نمایاں ہو رہی ہوں وہ یاد خدا کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں اس کی باعظمت بارگاہ میں استغفار اور طلب بخشش کرتے ہیں پرودگار کے نور وجلال کے پرتَو میں محو ہوتے ہیں اور ان کے وجود کے سب ذرّے باہم زمزمہ توحید گنگنا رہے ہوتے ہیں۔

امام صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص نماز وتر میں ۷۰ مرتبہ۔ ''اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ'' پڑھے اور ایک سال تک اس عمل کی پابندی کرے خدا تعالیٰ اسے وقت سحر استغفار کرنے والوں۔ میں سے قرار دے گا اور یقیناً اسے اپنی عفو وبخشش سے نوازے گا''۔

(۱۸)شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًاۢ بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ؕ

خدا گواہی دیتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور فرشتے اور اہل علم و دانش (سب) گواہی دیتے ہیں اس عالم میں کہ (خدا تعالیٰ عالم ہستی میں) عدالت قائم کیے ہوئے ہے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں جو کہ غالب و توانا بھی ہے اور حکیم و دانا بھی۔

تفسیر

خدا کی اپنی یکتائی پر شہادت سے کیا مراد ہے؟

خدا تعالیٰ کی شہادت سے مراد عملی اور فعلی شہادت ہے نہ قولی۔ یعنی خدا تعالیٰ نے جہانِ آفرینش کو پیدا کیا۔ اس میں ایک ہی نظام قائم ہے ہر جگہ اس کے قوانین ایک سے ہیں اور اس کا ایک ہی نظام ہے۔ حقیقت میں ایک اکیلا اپنے سے وابستہ یگانہ نظام بذات خود نشاندہی کرتا ہے کہ پیدا کرنے والا اور معبود اس جہان میں ایک سے زیادہ نہیں اور سب مخلوقات کا ایک ہی منبع اور سر چشمہ ہے۔ اس بناء پر ایک ہی نظام کی ایجاد ذات الٰہی کی یگانگت اور یکتائی پر ایک شہادت ہے۔

قیام بالقسط کیا چیز ہے؟

ادبی اصطلاح کے مطابق ''شَهِدَ'' فعل ہے اس کا فاعل ''اللّٰه'' ہے اور ''قَآئِمًا بِالْقِسْطِ'' اس سے حال ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ اپنی یکتائی کی گواہی اس عالم میں دیتا ہے کہ عالم ہستی میں عدالت قائم کئے ہوئے ہے اور واقعاً یہ جملہ اس کی شہادت کی دلیل ہے کیونکہ عدالت کی حقیقت یہ ہے کہ درمیانہ اور مستقیم راستہ انتخاب کیا جائے جو ہر قسم کے افراط' تفریط اور انحراف سے دور ہو اور ہم جانتے ہیں کہ درمیانہ اور مستقیم راستہ ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے اور ایک سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔

علماء کی حیثیت و وقعت

اس آیت میں حقیقی علماء کو فرشتوں کا ہم پلہ قرار دیا گیا ہے اور یہ بات دوسروں کی نسبت علماء کے امتیاز کو ظاہر کرتی ہے آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علماء کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنے علم کے ذریعے حقائق پر مطلع ہوتے ہیں اور اس طرح سے خدا کی یگانگت کا اعتراف کرتے ہیں جو سب سے بڑی حقیقت ہے۔

واضح ہے کہ آیت تمام علماء کے بارے میں ہے اور وہ روایات جو اس آیت کے ذیل میں وارد ہوئی ہیں ان میں ''اولوا العلم'' سے آئمہ اطہار مراد لیا گیا ہے تو وہ اس لحاظ سے ہے کہ وہ حضرات ''اولوا العلم'' کے واضح ترین مصداق ہیں۔

آیت میں ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ'' کے جملے کا تکرار ہے۔ یہ تکرار گویا اس طرف اشارہ ہے کہ جسے ابتدا میں خدا فرشتوں اور علماء کی شہادت آئی ہے اس طرح جو شخص بھی سنے اسے چاہیئے کہ وہ بھی ان کی شہادت کے ساتھ ہم آواز ہو جائے اور معبود کی وحدت کی گواہی

دے۔

''لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ'' خدا کے حق کی ادائیگی ہے اور اس کی توحید کا اظہار ہے لہٰذا ''الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ'' دو اسماء الٰہی پر ختم ہوا ہے کیونکہ عدالت کا قیام قدرت وحکمت کا محتاج ہے اور وہ خدا ہی ہے جو ہر چیز پر قادر ہے اور تمام چیزوں سے آگاہ ہے اس لئے وہی جہانِ ہستی میں عدالت قائم رکھ سکتا ہے۔ یہ آیات ان آیات میں سے ہے جن پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیشہ خصوصی نظر رکھی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بار بار مختلف مواقع پر اس کی تلاوت فرماتے رہے۔ زبیر بن عوام کا کہنا ہے: ''عرفہ کی رات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا میں نے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بار بار اس آیت کی تلاوت کرتے تھے۔

(۱۹) اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَ مَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ۗ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ	اللہ کے نزدیک دین اسلام (اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنا) ہے جن کے پاس آسمانی کتاب تھی انہوں نے علم وآگاہی کے بعد بھی اختلاف پیدا کیا اور وہ بھی اپنے درمیان ظلم وستم کی بناء پر اور جو آیات خدا سے کفر اختیار کرے تو پھر خدا سریع الحساب ہے۔

تفسیر

حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہی روحِ دین ہے

''دین'' کا معنی ''جزا'' ''پاداش'' حکم کی اطاعت، اور پیروی، مذہبی اصطلاح میں دین عبارت ہے ان عقائد، قوانین اور آداب سے جن کے ذریعے انسان دنیا اور آخرت کی سعادت وخوش بختی تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔ نیز انفرادی واجتماعی اور اخلاقی وتربیتی لحاظ سے صحیح راہ پر گامزن ہوسکتا ہے۔

''اسلام'' ''تسلیم'' کے معنی میں ہے اور یہاں مراد خدا کے سامنے تسلیم ہونا ہے۔

اس لئے ''اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ'' کا معنی یہ ہو کہ بارگاہ الٰہی میں حقیقی دین اس کے فرمان اور حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے اور دراصل روح دین تمام ادوار میں حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ کسی دوسری چیز کا نام نہیں البتہ چونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین وآئین اس کا اعلیٰ ترین نمونہ تھا اس لئے اس کے لئے ''اسلام'' کے نام کا انتخاب ہوا۔

اس جملے میں قرآن نے مذہبی اختلافات کے سرچشمے کا تذکرہ کیا ہے اور فرمایا ہے: وہ لوگ جو حقیقت سے آگاہ تھے اس کے باوجود انہوں نے دین خدا میں اختلاف پیدا کیا ان کے اس عمل کا سبب طغیان، سرکشی، ظلم وستم اور حسد کے علاوہ کچھ نہیں تھا کیونکہ ہر آسمانی دین ہمیشہ واضح مدارک سے منسلک ہوتا ہے جن کی وجہ سے متلاشیانِ حقیقت کے لئے کوئی ابہام باقی نہیں رہتا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے واضح معجزات، کھلی نشانیوں اور روشن دلائل کے علاوہ جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین میں موجود تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت کے گواہ تھے۔ گذشتہ کتب آسمانی میں مذکور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف اور نشانیاں بھی موجود تھیں اور ان کتب

کے کچھ حصے ان کے پاس تھے بھی۔ اور انہی کے پیش نظر ان کے علماء آپ ﷺ کے ظہور سے قبل آپ ﷺ کے ظہور کی بشارت دیا کرتے تھے لیکن آپ ﷺ کی بعثت کے بعد انہیں اپنے فوائد معرضِ خطر میں نظر آنے لگے اس لئے ظلم وستم اور طغیان وسرکشی کی راہ اختیار کرتے ہوئے انہوں نے وہ سب کچھ پس پشت ڈال دیا۔

''وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللهِ فَإِنَّ اللهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ''

آیات کے آخر میں ایسے لوگوں کا مآل کار بیان کیا گیا: وہ لوگ جو آیات الٰہی کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ اپنے اعمال کا مکمل نتیجہ حاصل کریں گے۔ خدا تعالیٰ ان کے اعمال کا بہت جلد حساب کرے گا(۱)۔

(۲۰)فَإِنْ حَآجُّوكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَ مَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۧ	اگر وہ تم سے گفتگو اور جھگڑے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں (تو ان سے مجادلہ نہ کرو) اور کہہ دو! میں اور میرے پیروکار خدا کے سامنے تسلیم ہیں اور جو اہل کتاب یہودی و نصاریٰ ہیں اور جو ان پڑھ (مشرکین) ہیں ان سے کہہ دو کیا تم بھی تسلیم ہوئے ہو؟ اگر وہ (فرمان خدا اور منطق حق کے سامنے) سر تسلیم خم کر دیں تو ہدایت پا لیں اور اگر روگردانی کریں (تو تم پریشان نہ ہو کیونکہ) تم پر تو ابلاغ رسالت (کی ذمہ داری) ہے اور خدا بندوں کے (عقائد واعمال) دیکھتا ہے۔

تفسیر

لغت میں ''محاجه'' بحث، مباحثہ، گفتگو، استدلال اور کسی عقیدے کے دفاع کو کہتے ہیں۔ یہ فطری امر ہے کہ ہر دین کے طرفدار اپنے مقصد اور عقیدے کا دفاع کرتے ہیں اور اس سلسلے میں اپنے آپ کو حقدار قرار دیتے ہیں اس لحاظ سے قرآن رسول اللہ ﷺ سے کہتا ہے: ہوسکتا ہے اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ وغیرہ) تم سے بحث کریں اور کہیں کہ ہم حق کے سامنے تسلیم ہیں اور حق کی طرف داری کے معنی میں اسلام کے پیروکار ہیں یہاں تک کہ وہ اس بارے میں اپنی استقامت و پائیداری کا مظاہرہ کریں جیسا کہ نجران کے عیسائیوں نے بھی پیغمبر اسلام ﷺ سے ایسی ہی گفتگو کی تھی۔

مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام ﷺ کو حکم نہیں دیا کہ اہل کتاب سے بحث مباحثہ اور گفتگو ہی نہ کی جائے بلکہ یہاں ایک اور حکم دیا گیا ہے جس کے مطابق جب بحث آخری مرحلے تک پہنچ جائے تو اس وقت نہ ان کی راہنمائی کی ضرورت ہے نہ

---

(۱)نوٹ:

سریع الحساب کے مفہوم کے بارے میں اسی جلد میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۰۲ کے ذیل میں بحث کی جا چکی ہے اس سے رجوع فرمائیں۔

مخاصمت مجادلہ کی۔ بہترین راستہ یہ ہے کہ انہیں کہیں کہ میں اور میرے پیروکار خدا کے سامنے تسلیم کئے ہوئے ہیں اور حق کے پیروکار ہیں اور پھر مشرکین کہیں کہ اگر وہ بھی خدا کے سامنے تسلیم ہیں اور پیروحق ہیں تو انہیں چاہئے کہ منطقی گفتگو کے سامنے سر جھکا دیں اور اس صورت میں ان سے بحث ومباحثہ اور گفتگو کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس مقام پر گفتگو بے محل اور بے اثر ہے اور تبلیغ رسالت کے علاوہ کوئی چیز تم پر لازم نہیں ہے۔

خدا تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال وافکار کو دیکھتا ہے۔

اس مقام پر چند نکات قابلِ توجہ ہیں:

1۔ آیت سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ہٹ دھرم افراد سے بحث مباحثے سے پرہیز کرنا چاہئے جو صحیح منطق کو تسلیم نہیں کرتے۔

2۔ ''امیّین'' سے مراد آیت میں ''مشرکین'' ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا ذکر بھی کتاب (یہود ونصاریٰ) کے مقابلے میں آیا ہے اور ان کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں تھی کہ جس کی وجہ سے وہ پڑھنے لکھنے پر مجبور ہوتے۔

3۔ اس آیت سے مکمل طور پر واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کا طریقِ کار فکر ونظر اور عقیدہ ٹھونسنا نہیں تھا، بلکہ آپ ﷺ کی کوشش ہوتی تھی کہ لوگوں پر حقائق آشکار ہو جائیں اور پھر انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے تا کہ وہ خود حق کی پیروی کے لئے عزمِ صمیم کریں۔

(۲۱) اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ يَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ	جولوگ آیات خدا سے کفر کرتے ہیں انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں اور عدل کا حکم دینے والوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں انہیں دردناک عذاب کی بشارت دیجئے۔
(۲۲) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۡ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ	وہ ایسے لوگ ہیں جن کے نیک اعمال (ان عظیم گناہوں کی وجہ سے) دنیا اور آخرت میں تباہ ہو گئے ہیں اور ان کا کوئی یار و مددگار نہیں ہے۔

تفسیر

ان دو آیتوں میں پہلے ان تین عظیم گناہوں کا ذکر ہے:

1۔ آیات الٰہی سے کفر اختیار کرنا،

2۔ انبیاء علیہم السلام کو ناحق قتل کرنا اور

3۔ انبیاء ومرسلین کے پروگرام کی حفاظت کرنے والوں اور لوگوں کو عدل وانصاف کا حکم دینے والوں کو بھی قتل کر دینا

اس کے بعد ان کے لئے تین سزاؤں اور بدبختیوں کا تذکرہ ہے جو یہ ہیں:

1۔ "فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ" (انہیں دردناک عذاب کی بشارت دیجئے) اس جملے میں ان کے لئے سخت سزا کا ذکر ہے۔

2۔ زیر نظر دوسری آیت میں ہے: "أُولَئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ" (یعنی ان لوگوں کے اعمال اس دنیا میں اور آخرت میں نابود اور اکارت ہوجائیں گے۔) اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو نیک اعمال وہ انجام دے چکے ہیں وہ بھی ان کے عظیم گناہوں سے متاثر ہوں گے اور اپنی تاثیر کھو بیٹھیں گے اور ضائع ہوجائیں گے۔

3۔ آخر میں مزید کہا گیا ہے کہ انہیں ملنے والی سخت سزا اور شدید عذاب کے مقابلے میں کوئی بھی شخص ان کی حمایت کرنے والا نہیں ہوگا یعنی وہ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت سے محروم رہیں گے۔ "وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ"

جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۶۱ کے ذیل میں کہہ چکے ہیں کہ یہ آیت یہودیوں کی عجیب تاریخ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ وہ آیاتِ الٰہی کے انکار کے علاوہ انبیاء کو قتل کرنے میں بھی بڑی جسارت کا مظاہرہ کرتے تھے اور ان مجاہدوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے جو انبیاء علیہم السلام کی کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تھے لیکن مسلّم ہے کہ یہ حکم اور سزا ان کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ ان تمام اقوام کے بارے میں ہے جو ان جیسے افعال واعمال بجالاتی ہیں۔

(۲۳) اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ	کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کے پاس (آسمانی) کتاب کا کچھ حصہ ہے اور ان میں فیصلے کے لئے انہیں کتاب خدا کی طرف دعوت دی گئی ہے لیکن (علم وآگاہی کے باوجود) ان میں سے ایک فریق نے روگردانی کی جب کہ وہ (قبول حق سے) اعراض کیے ہوئے تھے۔
(۲۴) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۠ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ	(ان کا) یہ (عمل) اس بناء پر تھا کہ وہ کہتے تھے کہ چند دن کے سوا (جہنم کی) آگ ہم تک نہیں پہنچے گی اور (خدا پر باندھے گئے) اس افتراء نے انہیں بہت مغرور کردیا تھا۔
(۲۵) فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّارَيْبَ فِيْهِ ۣ وَ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ	پس اس وقت ان کی کیا حالت ہوگی جب ہم ان کو ایک ایسے دن (قیامت) جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے اکٹھا کریں گے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں ہوگا۔

شانِ نزول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں خیبر کے یہودیوں میں سے ایک عورت اور ایک مرد زنائے محصنہ (شادی شدہ

افراد کے زنا کو ''زنائے محصنہ'' کہتے ہیں) کے مرتکب ہوئے۔ باوجودیکہ تورات میں ایسے اشخاص کو سنگسار کرنے کا حکم تھا' چونکہ یہ مرد و عورت اشراف میں سے تھے اس لئے ان پر یہ حکم جاری کرنے میں توقف برتا گیا۔

اور یہ تجویز ہوا کہ پیغمبر اسلام ﷺ سے رجوع کیا جائے اور اس سے فیصلہ حاصل کیا جائے۔ انہیں توقع تھی کہ آپ ﷺ کی طرف سے کم سزا معیّن ہو گی لیکن حضرت رسول اکرم ﷺ نے بھی ان کے لئے وہی سزا معیّن فرمائی۔ اس فیصلے پر بعض یہودیوں اور ان کے وڈیروں میں سے بعض نے اعتراض کیا اور اس بات کا انکار کر دیا کہ یہودی مذہب کے مطابق یہ فیصلہ درست ہے۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ موجودہ تورات ہی تمہارے اور میرے درمیان فیصلہ کر دے گی۔

انہوں نے قبول کر لیا۔ ابنِ صوریا ان کا ایک عالم تھا اسے فدک سے مدینہ بلایا گیا تھا۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے اسے پہچان لیا اور فرمایا: تم ابنِ صوریا ہو؟

اس نے عرض کیا: جی ہاں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم یہودیوں میں اعلم علماء ہو؟

اس نے کہا: لوگ یہی سمجھتے ہیں۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ اس کے سامنے تورات کا وہ حصہ رکھا جائے جس میں سنگسار کرنے کا حکم ہے۔

وہ چونکہ پہلے سے باخبر تھا اس لئے جب تورات کی اس آیت تک پہنچا تو اس پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کے بعد کے جملے پڑھ دیئے۔

عبد بن سلام جو پہلے یہودی علماء میں سے تھا اور مسلمان ہو گیا تھا' وہاں موجود تھا وہ ابنِ صوریا کی اس پردہ پوشی پر متوجہ ہو کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور اسکا ہاتھ اس جملے سے ہٹا دیا اور متنِ تورات میں سے اسے پڑھا اور کہا کہ تورات کہتی ہے: یہودیوں کے لئے ضروری ہے جب کوئی عورت و مرد زنائے محصنہ کے مرتکب ہوں اور ان کے جرم کا کافی ثبوت موجود ہو تو انہیں سنگسار کر دیا جائے۔

اس کے بعد پیغمبر اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ ان کے دین کے مطابق مذکورہ سزا ان دو مجرموں پر جاری کی جائے۔

اس پر یہودیوں کی ایک جماعت سیخ پا ہو گئی، زیرِ نظر آیت اسی کیفیت کے بارے میں نازل ہوئی۔

تفسیر

ان آیات میں صراحت سے اہلِ کتاب کی چند خیانتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ کیسے حیلہ جوئی اور بے بنیاد مطالب کے ذریعے حدودِ الٰہی کے نفاذ سے بغاوت کرتے تھے۔ حالانکہ ان کے پاس موجود آسمانی کتاب صراحت سے حکم بیان کر چکی ہوتی تھی کہ اپنی مذہبی کتاب میں موجود حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔

لیکن انہوں نے صریحاً اس کی مخالفت کی اور اس کی مخالفت ایسی جسے اعراض، سرکشی اور احکام خدا پر نکتہ چینی کہا جانا چاہئے۔

''اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ'' سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جو تورات اور انجیل یہود و نصاریٰ کے پاس موجود تھی وہ ساری حقیقی تورات اور انجیل نہ تھی بلکہ یہ اس کا صرف ایک حصہ تھا اور ان دونوں آسمانی کتابوں کا بیشتر حصہ یا غائب تھا یا پھر تحریف شدہ تھا۔

(۲۴) اس آیت میں ان کی مخالفت اور روگردانی کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ ان کی ایک باطل اور غلط فکر تھی اور وہ یہ کہ وہ ایک بلند اور ممتاز خاندان سے ہیں۔ آج بھی وہ ایسا ہی سمجھتے ہیں اور بہت سی تحریریں ان کی نسل پرستی کی شاہد ہیں۔

ان کا اعتقاد تھا کہ پروردگارِ عالم سے ان کا ایک خاص تعلق ہے یہاں تک کہ وہ اپنے تئیں خدا کے بیٹے کہتے تھے۔

اسی لئے وہ خدائی سزا کے مقابلے میں ایک قسم کی معنویت کے قائل تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے محفوظ رہیں گے۔ اور اس امر کو خدا کی طرف بھی منسوب کرتے تھے لہٰذا ان کا اعتقاد تھا کہ ان میں سے گناہگار افراد بھی قیامت میں چند دنوں کے سوا عذاب میں مبتلا نہیں ہوں گے۔ جیسا کہ محلِ بحث آیات میں بھی ہے۔

خدا کی طرف منسوب یہ جھوٹے اور جعلی امتیازات رفتہ رفتہ ان کے عقائد کا جزو بن گئے یہاں تک کہ احکام خدا کی مخالفت اور قانون شکنی میں بھی بے باک ہو گئے تھے۔

(۲۵) زیرِ نظر تیسری آیت میں قرآن ان تمام باطل خیالات پر خطِ بطلان کھینچتا ہے اور کہتا ہے: ایک روز یقیناً پروردگار کی بارگاہِ عدل میں دیگر انسانوں کی طرح پیش ہوں گے اور ہر شخص اپنے اعمال کا سامنا کرے گا چونکہ وہ اپنے ہی اعمال کا سامنا کریں گے اور اپنے ہی اعمال کا نتیجہ پائیں گے اس لئے جو بھی سزا ملے گی اس میں ان پر کسی قسم کا ظلم و ستم نہیں ہوگا کیونکہ یہ تو سب ان کئے کا ماحصل ہوگا۔

'' مَا کَسَبَتْ'' سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ قیامت کے دن کی جزا و سزا اور دوسرے جہان کی خوش بختی و بدبختی صرف انسانی اعمال سے وابستہ ہے اور اس میں کوئی اور چیز موثر نہیں ہے اس حقیقت کی طرف بہت سی آیاتِ مجیدہ میں اشارہ ہوا ہے۔

(۲۶) قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ	کہیے بار الٰہا! حکومتوں کا مالک تو ہے تو ہی جسے چاہتا ہے کہ حکومت بخشتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت لے لیتا ہے جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلّت دیتا ہے تمام خوبیاں تیرے ہاتھ میں ہیں کیونکہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔

(۲۷) تُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۡ وَ تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۡ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ	(خداوندا تو ہی) رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے مردہ سے زندہ کو اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے اور جسے چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے۔

شانِ نزول

مشہور مفسر طبرسی نے مجمع البیان میں اس سلسلے میں دو شانِ نزول بیان کئے ہیں اور ہر دو ایک ہی حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے ذیل میں دونوں شانِ نزول پیش کی جاتی ہیں۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے مکہ فتح کرلیا تو مسلمانوں کو خوش خبری دی کہ بہت جلد ایران اور روم بھی پرچمِ اسلام کے نیچے ہوں گے یہ بات سنی تو منافقین کہ جن کے دل ابھی نورِ ایمان سے روشن نہیں ہوئے تھے اسے مبالغہ آمیز سمجھنے لگے اور تعجب سے کہنے لگے: محمد (ﷺ) نے مدینہ اور مکہ کو کافی نہیں سمجھا اور ایران و روم کی لالچ بھی رکھتا ہے اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں مشرکین اور اہلِ کتاب کے بارے میں گفتگو تھی کہ وہ کیسے ملک اور عزت کو اپنے لئے مخصوص جانتے ہیں اور خود کو اسلام سے بے نیاز سمجھتے ہیں اب ان آیات میں خداوندِ عالم ان کے اس زعمِ باطل کو غلط ثابت کرتا ہے اور فرماتا ہے: خدا ہی ہر ملک و سلطنت کا مالک ہے، خیر و نیکی اس کے قبضے میں ہے، وہ قدرتِ مطلقہ ہے اور ہر حالت میں اسی کی پناہ حاصل کرنا چاہئے۔

موجودات کا حقیقی مالک وہی ہے جو ان کا خالق اور پروردگار ہے وہ وہی ہے جو جسے چاہتا ہے ملک و سلطنت بخش دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے وہی عزت دیتا ہے اور وہی جسے چاہتا ہے خاکِ ذلت میں بٹھا دیتا ہے یہ سب کچھ اس کے قبضہ قدرت میں ہے اور اس کے زیرِ فرمان ہے اور وہ اپنے افعال میں مجبور نہیں ہے۔ وہ فاعلِ مختار ہے نہ کہ فاعلِ مجبور۔

بنا کہے واضح ہے کہ مشیّت و ارادہ سے ان آیات میں یہ مراد نہیں کہ وہ بغیر کسی حساب کتاب کے یا بغیر کسی وجہ کے کسی کو کوئی چیز عطا کرتا ہے اور کسی سے کوئی چیز لے لیتا ہے بلکہ اس مشیّت حکمت سے وابستہ ہے جہانِ خلقت کا پورا نظام اور عالم انسانیت کا سارا پروگرام اس کی مصلحت و حکمت کے تحت چل رہا ہے اس لئے وہ جو کام بھی کرتا ہے اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہترین اور صحیح ترین ہوتا ہے۔

(۲۷) ''ولوج'' لغت میں دن کو رات میں داخل کرنا ہے۔ آیت کہتی ہے اللہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے

قرآن مجید میں آٹھ دیگر مقامات پر بھی اس بات کا تذکرہ موجود ہے۔

اس آیت سے مراد وہی تدریجی اور حسی تبدیلی ہے جو سال بھر میں رات دن میں ہم دیکھتے ہیں۔ یہ تبدیلی اس کرۂ ارض کے محور کے اپنے مدار سے اپنے جھکاؤ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو ۲۳ درجہ سے کچھ زیادہ ہے اور اس سے سورج کی کرنوں کے زاویے بھی بدل جاتے ہیں۔ اسی لئے بلادِ شمالی (خطِ استوا سے اوپر والے حصے) میں سردیوں کی ابتداء میں دن بڑھنے لگتے ہیں اور راتیں چھوٹی ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس گرمیوں کے آغاز میں راتیں بڑھنے لگتی ہیں اور دن چھوٹے ہوتے جاتے ہیں اور سردیوں کی ابتدا تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جب کہ بلادِ جنوبی (خطِ استوا کے نیچے والے حصے) میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔

اس لئے خدا تعالیٰ ہمیشہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا رہتا ہے یعنی ایک میں کمی کرتا ہے اور دوسرے میں اضافہ کر دیتا ہے ممکن ہے کہا جائے کہ خطِ استواء کے اور اس طرح قطب شمالی اور قطب جنوبی کے اصلی نقطے میں رات دن تمام سال برابر رہتے ہیں اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی اور تغیّر رونما نہیں ہوتا۔ خطِ استواء پر سال بھر رات دن بارہ بارہ گھنٹے کے اور قطب شمالی اور جنوبی میں سال میں ایک رات چھ ماہ کی اور دن بھی چھ ماہ کا ہوتا ہے۔ اس لئے یہ آیت عمومی پہلو نہیں رکھتی۔

اس کے جواب میں کہنا چاہئے کہ حقیقت میں خطِ استواء ایک فرضی خط کے سوا کچھ نہیں اور لوگ ہمیشہ سے خطِ استواء کے اس طرف یا اس طرف زندگی بسر کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس طرح نقطہ قطب بھی فرضی نقطے سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا اور شمالی جنوبی وقطب میں رہنے والے لوگوں کی زندگی (اگر وہاں کوئی رہتا ہو تو) یقیناً قطب کے حقیقی نقطے سے وسیع تر جگہ میں ہوگی اس بناء پر دونوں صورتوں میں رات اور دن کا اختلاف موجود ہے۔

''وَ تُخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ وَ تُخۡرِجُ الۡمَیِّتَ مِنَ الۡحَیِّ''

یہ تعبیر بھی قرآن کی کئی ایک آیات میں موجود ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے: خدا زندہ کو مردہ میں سے اور مردہ کو زندہ میں سے نکالتا ہے۔

زندہ کو مردہ میں سے مراد بے جان موجودات سے حیات کو پیدا کرنا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جب زمین زندگی کو قبول کرنے کے قابل ہوئی تو زندہ موجودات بے جان مادہ سے معرضِ وجود میں آئے۔ علاوہ ازیں ہمارے بدن میں اور تمام عالم کے زندہ موجودات میں بے جان خلیوں (Cells) کا جز بن کر زندہ موجود میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

زندہ موجودات سے مردہ وجود کی پیدائش کا عمل بھی ہماری آنکھوں کے سامنے جاری و ساری ہے۔

یہ آیت درحقیقت موت و حیات کے دائمی قانون تبادل کی طرف اشارہ ہے جو بہت عام اور بہت پیچیدہ ہے اس کے باوجود نہایت جاذبِ نظر اور عجیب ترین قانون ہے جو ہم پر حکمران ہے۔

(۲۸) لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰةً ؕ وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ	اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست اور سرپرست نہ بناؤ اور جو شخص ایسا کرے گا اس کا کسی چیز میں اللہ سے کوئی رابطہ نہیں ہے مگر یہ کہ ان سے (اور اہم تر مقاصد کیلئے) تقیہ کرو اور خدا تمہیں (اپنی نافرمانی سے) ڈراتا ہے اور (تمہاری) بازگشت خدا کی طرف ہے۔

تفسیر

''اولیاء'' ''ولی'' کی جمع ہے یہاں اس کا معنی ہے حامی، مددگار، ہم پیمان، یار اور یاور۔ حامی، مددگار یا کسی اور حوالے سے کوئی ربط نہ رکھیں اور ان کی چکنی چپڑی باتوں، دلکش تقریروں، بظاہر گہری اور مخلصانہ محبت سے دھوکہ نہ کھائیں کیونکہ تاریخ گواہ ہے کہ اہلِ ایمان اور بامقصد زندگی گزارنے والوں نے اس طرح سے بہت دکھ اُٹھائے ہیں۔

اس موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر آیت میں شدید تہدید اور دھمکی آئی ہے اور وہ یہ کہ جو شخص اپنے تئیں غیروں کے سپرد کردے گا وہ خدا سے ہر قسم کا رابطہ منقطع کرلے گا۔

''مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ'' اس طرف اشارا ہے کہ معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں ہر شخص مجبور ہے کہ اس کے کچھ دوست احباب ہوں لیکن اہل ایمان کو چاہئے کہ وہ دوستی اور سرپرستی کے لئے ایمان والوں کا ہی انتخاب کریں اور ان کی جگہ کافروں سے رشتے استوار نہ کریں۔

''فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ''

اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ جو افراد دشمنانِ خدا سے دوستی اور ہم کاری کرتے ہیں وہ کسی چیز میں خدا سے مربوط نہیں ہیں یعنی وہ فرمانِ الٰہی، خداپرستوں اور فرمانِ خدا کے پیروکاروں سے بیگانے ہیں اور ان سے ہر لحاظ سے ان کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔

''اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰةً''

اس جملے کے ذریعے مندرجہ بالا حکم میں استثناء کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ تقیہ کے موقع پر حرج نہیں کہ مسلمان اپنی جان کی حفاظت کے لئے یا ایسے اور امور میں بے ایمان افراد سے دوستی کا اظہار کریں اور آخر میں دو مزید جملوں سے مندرجہ بالا حکم کی تاکید کی گئی ہے:۔

''وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ'' یعنی۔۔ خدا تمہیں اپنی سزا اور غضب سے ڈراتا ہے۔

''وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ''

یعنی۔۔ تم سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور اگر تم نے دشمنوں سے دوستی کر لی تو اپنے اعمال کا نتیجہ بہت جلد دیکھ لو گے۔

(۲۹)قُلۡ اِنۡ تُخۡفُوۡا مَا فِیۡ صُدُوۡرِکُمۡ اَوۡ تُبۡدُوۡہُ یَعۡلَمۡہُ اللّٰہُ ؕ وَ یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ	کہیے کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اسے چھپائے رکھو یا آشکار کر دو خدا (بہر حال) اسے جانتا ہے اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے وہ اس سے آگاہ ہے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں کفار سے تعاون و دوستی کرنے اور ان پر اعتماد و بھروسہ کرنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ ہاں البتہ "تقیہ" کے مقام کے لئے اس حکم میں استثناء رکھا گیا ہے۔

ممکن ہے کچھ لوگ بعض مواقع پر تقیہ کا نام لے کر غلط طور پر کفار سے دوستی کرلیں یا انہیں اپنا سرپرست بنالیں دوسرے لفظوں میں تقیہ کے مفہوم سے غلط فائدہ اٹھائیں اور اس کا نام لے کر دشمنانِ اسلام سے تعلقات استوار کرلیں اس لئے محلِ بحث آیت میں ایسے افراد کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے لامتناہی علم کو فراموش نہ کریں کیونکہ خدا تعالیٰ تو سینوں میں چھپے ہوئے اسرار سے ظاہری امور کی طرح واقف ہے۔

درحقیقت یہ آیت لوگوں کو اس طرف متوجہ کرتے ہوئے کہ خدا تعالیٰ دلوں کے رازوں کو جانتا ہے، یہ یہ اشارا کرتی ہے کہ وہ نہ صرف اسرار سے آگاہ ہے بلکہ یہ تو اس کے علمِ بے پایاں کا ایک مختصر سا گوشہ ہے اس کا علم تو زمین و آسمانوں کی وسعتوں پر محیط ہے اور اس کے علاوہ توانا بھی ہے اور گناہ گاروں کو سزا دینے کی قدرت رکھتا ہے۔

(۳۰)یَوۡمَ تَجِدُ کُلُّ نَفۡسٍ مَّا عَمِلَتۡ مِنۡ خَیۡرٍ مُّحۡضَرًا ۚۖۛ وَ مَا عَمِلَتۡ مِنۡ سُوۡٓءٍ ۚۛ تَوَدُّ لَوۡ اَنَّ بَیۡنَہَا وَ بَیۡنَہٗۤ اَمَدًۢا بَعِیۡدًا ؕ وَ یُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفۡسَہٗ ؕ وَ اللّٰہُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ ۠	وہ دن کہ جب ہر شخص اپنے انجام دیئے ہوئے نیک کام کو موجود پائے گا اور خواہش کرے گا کہ (کاش) اس کے اور اس کے برے کاموں کے درمیان زیادہ زمانی فاصلہ ہوتا اور خدا تمہیں (اپنی نافرمانی) سے ڈراتا ہے اور اس کے باوجود اللہ تمام بندوں پر مہربان ہے۔

تفسیر

یہ آیت روزِ قیامت نیک و بد اعمال کے حاضر ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ آیت کہتی ہے: تمام لوگ بلا استثناء جو بھی نیک و بد اعمال انجام دے چکے اس دن موجود پائیں گے بس فرق یہ ہوگا کہ نیک اعمال کو دیکھ کر خوش ہوں گے اور برے اعمال دیکھ کر وحشت میں مبتلا ہو جائیں گے اور چاہیں گے کہ یہ ان سے دور رہیں۔

پہلے تو خدا تعالیٰ لوگوں کو اپنے حکم کی نافرمانی سے ڈراتا ہے اور پھر بندوں پر اپنی مہربانی کا ذکر کرتا ہے یوں لگتا ہے کہ آیت کے یہ دونوں حصے سنت قرآنی کے مطابق خوف اور امید کا ایک امتزاج ہیں لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ دوسرا حصہ ''وَ اللّٰہُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَاد'' پہلے حصے ''وَ یُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ'' کے لئے تاکید ہو۔ بالکل اس طرح جیسے کوئی شخص دوسرے سے کہے کہ میں تجھے اس کام کے خطرناک انجام سے ڈراتا ہوں اور چونکہ میں تجھ پر مہربان ہوں لہٰذا تجھے خطرے سے باخبر کر رہا ہوں۔ اگر مجھے تجھ سے محبت نہ ہوتی تو تجھے اس خطرے سے آگاہ نہ کرتا۔

(۳۱) قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰہُ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ	کہہ دیجئے! اگر خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو تا کہ خدا بھی تمہیں اپنا دوست بنا لے اور تمہارے گناہوں کو بخش دے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔
(۳۲) قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ	کہہ دیجئے! خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اگر روگردانی کریں تو خدا کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

تفسیر

پہلی آیت کہتی ہے کہ محبت ایک قلبی تعلق ہی کا نام نہیں بلکہ انسان کے عمل میں اس کے آثار دکھائی دینے چاہئیں۔ جو شخص پروردگار سے محبت کا مدعی ہے اس کے لئے پہلی نشانی یہ ہے کہ پیغمبر اور اللہ کے بھیجے ہوئے کی پیروی کرے۔

حقیقت میں محبت کا یہ فطری اثر ہے کہ وہ انسان کو محبوب اور اس کی خواہشات کی طرف کھینچ لے جاتی ہے البتہ کمزور محبتیں بھی ہو سکتی ہیں کہ جن کی شعاع دل سے باہر نہ پڑ سکے لیکن ایسی محبتیں اس قدر حقیر ہیں کہ انہیں محبت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ ایک حقیقی محبت یقیناً عملی آثار کی حامل ہوتی ہے اور ایسی محبت محبّ کا محبوب سے ضرور تعلق قائم کر دیتی ہے، محبوب کی آرزوؤں کی راہ میں ثمر بخش ہوتی ہیں اور اس کی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے محبّ کو سعی و کوشش کے لئے ایستادہ کر دیتی ہے۔

(۳۲) زیر نظر دوسری آیت میں پہلی آیت کی بحث کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: چونکہ تم پروردگار کی محبت کے دعویدار ہو اس لئے فرمانِ خدا کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی پیروی کرو اور اگر تم نے اس سے روگردانی کی تو یہ پروردگار سے محبت نہ کرنے کی نشانی ہوگی اور خدا ایسے لوگوں کو دوست نہیں رکھتا۔

ضمناً ''أَطِیعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُول'' سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا اور رسول کی اطاعت ایک دوسرے سے جدا نہیں ہے۔ رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے اور خدا کی اطاعت رسول کی اطاعت ہے۔ اسی لئے گذشتہ آیت میں صرف اطاعت رسول کی بات کی گئی ہے یہاں خدا اور رسول دونوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اگر یہ لوگ روگردانی کریں اور دوستی کے تقاضوں پر عمل نہ کریں تو یہ اظہارِ محبت میں سچے نہیں ہیں اور

خدا پر ایمان نہیں لائے۔لہٰذا فطری بات ہے کہ خدا ایسے اشخاص کو دوست نہیں رکھتا۔

(۳۳)اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّ اٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ وَ اٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَۙ	اللہ نے آدم،نوح،آل ابراہیم اور آل عمران کو سب جہانوں پر منتخب کرلیا۔
(۳۴)ذُرِّيَّةًۢ بَعۡضُهَا مِنۡۢ بَعۡضٍ‌ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ‌ۚ	(جو پاکیزگی تقویٰ اور فضیلت کے اعتبار سے) وہ ایسے فرزند (اور خاندان) تھے کہ بعض کو بعض میں انتخاب کیا گیا اور خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

تفسیر

اس آیت سے حضرت مریمؑ اور ان کے آباءواجداد کی داستان شروع ہوتی ہے۔

''اِصۡطَفٰی'' لغت کے لحاظ سے ''صفو'' (بروزن ''عفو'') سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے ''خاص چیز'' اہلِ عرب صاف و شفاف پتھر کو بھی ''صفا'' خالص اور پاکیزہ ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں۔اس بناء پر ''اصطفا'' کا معنی ہے خالص چیز کے ایک حصے کو منتخب کرنا''

قرآن حکیم مندرجہ بالا آیت میں کہتا ہے: خدا نے آدم،نوح،خاندانِ ابراہیم اور آلِ عمران کو تمام جہانوں پر منتخب کرلیا ہے۔ یہ چناؤ ممکن ہے تکوینی طور پر بھی ہو اور تشریعی طور پر بھی۔یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی خلقت کو شروع ہی سے ممتاز قرار دیا ہے اگرچہ اس امتیاز کے باوجود وہ راہِ حق کے انتخاب میں مجبور نہ تھے بلکہ اپنے ارادے اور اختیار سے یہ راستہ طے کررہے تھے لیکن ان کی اس مخصوص خلقت وآفرینش ان میں نوعِ بشر کی ہدایت کی صلاحیت پیدا کردی تھی اور پھر فرمانِ الٰہی کی اطاعت،تقویٰ وپرہیزگاری اور انسانوں کی رہنمائی کے راستے میں جدوجہد کرنے کی وجہ سے ایک طرح کا اکتسابی امتیاز بھی انہیں حاصل ہوگیا جو ان کے ذاتی امتیاز سے مل گیا اور وہ برگزیدہ انسانوں کی حیثیت سے ظاہر ہوئے۔

(۳۴)''ذریت'' کا معنی ہے ''چھوٹی اولاد'' لیکن کبھی کبھی بلاواسطہ یا بالواسطہ تمام اولاد کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

اس آیت میں قرآن اس بات کی طرف اشارا کرتا ہے کہ یہ منتخب افراد اسلام،پاکیزگی،تقویٰ اور نوعِ بشر کی راہنمائی کے لئے کوشش کے لحاظ سے ایک جیسے تھے اور ایک ہی کتاب کے مختلف نسخوں کی مانند تھے جیسے ان میں سے ایک دوسرے کا اقتباس لیا گیا ہو۔

آیت کے آخر میں اس حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے کہ خدا تعالیٰ ان کی کوشش اور فعالیت کو دیکھتا ہے،ان کی باتیں سنتا ہے اور ان کے اعمال سے آگاہ ہے ''وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ''۔اس جملے میں چنے ہوئے افراد کی خدا تعالیٰ اور مخلوقِ خدا کے بارے میں شدید ذمہ داریوں کی طرف اشارا کیا گیا ہے۔

ضمنی طور پر اس آیت میں حضرت آدمؑ کے علاوہ تمام اولوالعزم پیغمبروں کی طرف اشارا کیا گیا ہے کیونکہ حضرت نوحؑ کا

ذکر تو صراحت سے موجود ہے اور آلِ ابراہیم علیہ السلام میں خود ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی شامل ہیں۔ نیز آلِ عمران میں حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف مکرر اشارہ ہے۔ اس تکرار کی وجہ یہ ہے کہ زیرِ نظر آیت ان کے حالات کی تفصیل کے لئے مقدمے کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۳۵)اِذْ قَالَتِ امْرَاَةُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ	(وہ وقت یاد کرو) جب عمران کی بیوی نے عرض کیا خداوندا! جو کچھ میرے رحم میں ہے میں اسے تیری نذر کرتی ہوں تاکہ وہ (تیرے گھر کی خدمت کیلئے) آزاد ہو۔ اور تو یہ مجھ سے قبول فرما لے کہ تو سننے اور جاننے والا ہے۔
(۳۶)فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی ۚ وَ اِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَ اِنِّیْٓ اُعِیْذُهَا بِکَ وَ ذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ	لیکن جب اسے جنم دیا تو دیکھا (تو وہ لڑکی تھی) عرض کیا خداوندا! میں نے لڑکی کو جنم دیا لیکن خدا اس سے آگاہ تھا کہ اس نے کیا جنم دیا ہے (پھر اس نے کہا) لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود کے (وسوسوں سے) تیری پناہ میں دیتی ہوں۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں آلِ عمران کا ذکر تھا اور ان آیات میں عمران علیہ السلام کی بیٹی مریم علیہا السلام کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی ہے۔ ان آیات میں اس عظیم خاتون کی ولادت، پرورش اور زندگی کے دیگر اہم واقعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حنہ کے شوہر عمران کی طرف وحی کی تھی کہ انہیں ایک بابرکت لڑکا عطا کیا جائے گا۔ جو لا علاج مریضوں کو شفا دے، حکم خدا سے مردوں کو زندہ کرے گا اور بنی اسرائیل کے لئے پیغمبری کے فرائض بھی سرانجام دے گا۔ وہ بے خبر تھیں انہوں نے یہ واقعہ اپنی بیوی حنّہ سے بیان کیا۔ وہ حاملہ ہوئیں تو ان کا خیال تھا کہ یہی وہ لڑکا ہے جو اس وقت ان کے رحم میں ہے۔ وہ بے خبر تھیں کہ ان کے رحم میں تو اس لڑکے کی والدہ جناب مریم علیہا السلام ہیں۔ اسی لئے انہوں نے نذر کی تھی کہ بیٹے کو خانۂ خدا، بیت المقدس کا خدمت گزار بنائیں گی۔ پیدائش ہوئی تو انہوں نے دیکھا کہ وہ لڑکی تھی اب وہ پریشان ہوئیں، سوچنے لگیں کہ کیا کروں کیونکہ بیت المقدس کی خدمت تو لڑکے کیا کرتے ہیں۔ قبل ازیں کبھی کسی لڑکی کو بیت المقدس کی خدمت گزاری کے لئے منتخب نہیں کیا گیا تھا۔

اب ہم آیات کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس واقعے کے آخری حصے کو قرآن نے کیسے بیان کیا ہے۔

اس آیت میں زوجۂ عمران کی نذر کا تذکرہ ہے۔وہ حاملہ ہوئیں تو انہوں نے نذر کی کہ اپنے بچے کو بیت المقدس کا خدمت گزار بنائیں گی کیونکہ اللہ نے ان کے شوہر عمران کو جو اطلاع دی تھی اس سے وہ یہ سمجھے بیٹھی تھیں کہ ان کے ہاں لڑکا ہوگا۔اس لئے انہوں نے لفظ ''مُحَرَّرًا'' استعمال کیا اور ''مُحَرَّرَۃ'' نہیں کہا انہوں نے خدا سے درخواست کی کہ وہ ان کی نذر قبول کرے۔

(۳۶) اس آیت میں بچی کی ولادت کے بعد حضرت مریم علیہا السلام کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔انہوں نے پریشان ہو کر کہا: خداوندا! میں نے بچی کو جنم دیا ہے اور تو جانتا ہے کہ جو نذر میں نے کی ہے اس کے لئے لڑکی لڑکے کی طرح نہیں ہوسکتی اور لڑکی لڑکے کی طرح ان فرائض کو انجام نہیں دے سکتی۔

آیت میں موجود قرائن اور آیت کی تفسیر میں وارد ہونے والی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ''وَلَیۡسَ الذَّکَرُ کَالۡاُنۡثٰی'' (لڑکا لڑکی کی طرح نہیں) یہ جملہ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ کا ہے نہ کہ کلام خدا ہے۔

آیت میں ''وَ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا وَضَعَتۡ'' (خدا بہتر جانتا ہے کہ عمران کی بیوی نے کیا جنم دیا ہے) اصطلاح میں جملہ معترضہ ہے۔یعنی ضرورت نہ تھی کہ مریم کی والدہ کہتیں کہ خدایا! میں نے تو لڑکی کو جنم دیا ہے کیونکہ خدا تو جانتا ہی تھا کہ اس نے کیا جنم دیا ہے وہ شروع سے انعقادِ نطفہ اور رحمِ مادر کے تمام مرحلوں سے آگاہ ہے۔

''وَ اِنِّیۡ سَمَّیۡتُهَا مَرۡیَمَ''

اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کا یہ نام ان کی والدہ کے ذریعے سے وضعِ حمل کے وقت ہی رکھ دیا گیا تھا۔یاد رہے کہ ''مریم'' ان کی لغت میں ''عبادت گزار خاتون'' کو کہتے تھے۔یہ نام حضرت مریم علیہا السلام کی پاکباز والدہ کے اس انتہائی عشق اور لگاؤ کا مظہر ہے جو انہیں اپنے بچے کو عبادت الٰہی کے لئے وقف کرنے کے لئے تھا۔لہٰذا انہوں نے نام رکھنے کے ساتھ ہی خدا سے درخواست کی کہ وہ اس نومولود بچی اور اس کی آئندہ اولاد کو شیطانی وسوسوں سے بچائے رکھے اور انہیں اپنے لطف و کرم کی پناہ میں رکھے۔

(۳۷) فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوۡلٍ حَسَنٍ وَّ اَنۡۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ کَفَّلَهَا زَکَرِیَّا ۚ کُلَّمَا دَخَلَ عَلَیۡهَا زَکَرِیَّا الۡمِحۡرَابَ ۙ وَجَدَ عِنۡدَهَا رِزۡقًا ۚ قَالَ یٰمَرۡیَمُ اَنّٰی لَکِ هٰذَا ؕ قَالَتۡ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ بِغَیۡرِ حِسَابٍ	اس کے پروردگار نے اس (مریم) کو خوشی سے قبول فرما لیا اور اس کے وجود (کے پودے) کو خوب اچھی طرح پروان چڑھایا زکریا کو ان کا کفیل بنایا جب زکریا وہاں داخل ہوتے خاص غذا وہاں موجود پاتے اس سے پوچھتے یہ کہاں سے لائی ہو؟ وہ کہتی یہ خدا کی طرف سے ہے خدا جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات حضرت مریم علیہا السلام کی ولادت کے بارے میں تھیں اس آیت میں بتایا گیا ہے کے خدا تعالیٰ نے مریم علیہا السلام کو

حسنِ قبول سے نوازا اور اُس کی پرورش اچھے پودے کی طرح کی۔

درحقیقت جیسا کہ ہم نے اشارا کیا ہے کہ جنابِ مریم علیہا السلام کی والدہ کو یقین نہیں آتا تھا کہ کسی لڑکی کو خانہ خدا بیت المقدس کی خدمت کے لئے قبول کر لیا جائے گا لہٰذا وہ چاہتی تھیں کہ ان کے شکم میں جو بچہ ہے وہ لڑکا ہو کیونکہ قبل ازیں کبھی کسی لڑکی کو اس مقصد کے لئے منتخب نہیں کیا گیا تھا

زیرِ نظر آیت کہتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس پاکیزہ لڑکی کو پہلی مرتبہ اس روحانی اور معنوی خدمت کے لئے قبول کر لیا۔

''انبات''، یعنی ''اُگنا'' یہ تعبیر حضرت مریم علیہا السلام کی نشو ونما اور پرورش کے بارے میں ان کے معنوی، روحانی اور اخلاقی پہلوؤں کے تکامل وارتقاء کی طرف اشارہ ہے۔

ضمناً یہ جملہ ایک لطیف نقطہ کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ خدا کا کام ''انبات'' یعنی اگانا ہے جیسے پھولوں اور پودوں کے بیج میں اہلیت اور استعداد مخفی ہوتی ہے اور وہ باغبان کی نگرانی میں پرورش پاتے ہیں اور خود کو آشکار کرتے ہیں۔ اسی طرح انسانی وجود میں بھی ہر قسم کی بلند ترین انسانی صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں اگر انسان اپنے تئیں تربیت کے لئے خدائی نمائندوں اور باغِ انسانیت کے باغبانوں کے سپرد کر دے تو وہ بہت جلد تربیت حاصل کر لیتا ہے اور اس کی پنہاں استعداد ظاہر ہو جاتی ہے اور یوں ''انبات'' کا مفہوم حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے۔

''وَ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا''

اس جملہ میں قرآن کہتا ہے: خدا نے زکریا کو مریم علیہا السلام کی کفالت کے لئے منتخب کیا تھا۔ کیونکہ جیسا کہ تاریخ میں آیا ہے مریم علیہا السلام کے والدان کی پیدائش سے پہلے وفات پا چکے تھے۔ ان کی والدہ انہیں یہودی علماء کے پاس بیت المقدس میں لے آئیں اور کہا کہ یہ بچی بیت المقدس کا ہدیہ ہے، اس کی سرپرستی تم میں سے کوئی اپنے ذمہ لے لے۔ علماء بنی اسرائیل نے اس سلسلے میں آپس میں گفتگو کی۔ ہر کوئی چاہتا تھا کہ مریم کی سرپرستی کا افتخار اور منصب اسے نصیب ہو۔ اس مقصد کے لئے معاملہ مخصوص مراسم سے گزرا جن کی تفصیل اسی سورہ کی آیت ۴۴ کی تفسیر میں آئے گی اور آخر کار ان کی کفالت کے لئے حضرت زکریا علیہ السلام کا انتخاب عمل میں آیا۔

حضرت مریم علیہا السلام حضرت زکریا علیہ السلام کی سرپرستی میں پروان چڑھیں اور خدا کی عبادت و بندگی میں اس طرح مستغرق ہوئیں کہ ابنِ عباس کے بقول جب وہ نو سال کی ہوئیں دن کو روزہ رکھتیں اور رات کو عبادت کرتیں۔ پرہیزگاری اور معرفتِ الٰہی میں انہوں نے اتنی ترقی کی کہ اس دور کے احبار اور پارسا علماء سے بھی سبقت لے گئیں۔

حضرت زکریا علیہ السلام ان کے محراب کے پاس آ کر دیکھتے تو خاص غذائیں وہاں پڑی ہوتیں۔ انہیں بہت حیرانی ہوتی۔ ایک دن پوچھنے لگے:

''يَامَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا'' (یہ غذا کہاں سے لائی ہو؟)

مریم بولیں: ''هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ''

(یہ خدا کی طرف سے ہے اور وہ تو جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے)۔

یہ غذا کیسی تھی؟ اور جناب مریم علیہا السلام کے لئے کہاں سے آتی تھی؟ اس بارے میں آیت میں کچھ بیان نہیں کیا گیا لیکن بہت سی شیعہ و اہلِ سنت کتب کی روایات سے جو تفسیر عیاشی وغیرہ میں مذکورہ ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنت کے پھلوں کی ایک قسم تھی جو بے موسم حکمِ پروردگار سے جناب مریم علیہا السلام کے محراب کے پاس پہنچ جاتے اور یہ بات کوئی باعث تعجب نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے کسی پرہیز گار بندے کی یوں پزیرائی کرے۔

(۳۸)هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ	(جب مریم میں یہ لیاقت و اہلیت دیکھی) اس وقت زکریا نے اپنے پروردگار سے دعا کی اور عرض کی خداوندا اپنی طرف سے مجھے (بھی) پاکیزہ فرزند عطا فرما کہ تو دعا کو سننے والا ہے۔
(۳۹)فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًاۢ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ	جب وہ محراب میں مشغول عبادت تھا تو فرشتوں نے اسے پکار کر کہا خدا تجھے یحییٰ کی بشارت دیتا ہے وہ خدا کے کلمہ مسیح کی تصدیق کرے گا رہبر و رہنما ہوگا ہوا و ہوس سے دور ہوگا پیغمبر ہو گا، اور صالحین میں سے ہوگا۔
(۴۰)قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ	اس نے عرض کیا۔ پروردگار! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوسکتا ہے جب کہ مجھے بڑھاپے نے آ لیا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے فرمایا: اسی طرح خدا جو کام چاہتا ہے انجام دیتا ہے۔

تفسیر

ہم کہہ چکے ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی بیوی اور جناب مریم علیہا السلام کی والدہ آپس میں بہنیں تھیں اتفاق کی بات ہے کہ دونوں ابتدا میں بانجھ تھیں جناب مریم علیہا السلام کی والدہ کو ایسی لائق بیٹی نصیب ہوئی، حضرت زکریا نے حضرت مریم علیہا السلام کے خلوص اور حیران کن خصوصیات کو دیکھا تو آرزو کی ان کی بھی مریم علیہا السلام جیسی پاکیزہ اور پرہیز گار اولاد ہو جس کا چہرہ عظمت الٰہی اور توحید کی علامت ہو۔ حضرت زکریا علیہ السلام اور ان کی بیوی کی طویل زندگی اسی طرح گزر چکی تھی ظاہری طبیعی قوانین اور فطرت کے نقطہ نگاہ سے یہ بعید نظر آتا تھا کہ اب ان کی کوئی اولاد ہو لیکن عشقِ الٰہی اور مریم علیہا السلام کے محرابِ عبادت کے پاس بے موسم کے پھل دیکھنے کا اثر تھا کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے دل میں بھی امید پیدا ہوئی اور انہوں نے بڑھاپے کے موسم میں خواہش کی کہ ان کے وجود کی شاخ پر بھی فرزند کی صورت میں میوہ پیدا ہو جائے لہٰذا جب وہ عبادت اور مناجات میں مشغول تھے انہوں نے خدا تعالیٰ سے فرزند کا تقاضا کیا: ”خداوندا! پاکیزہ فرزند عطا

فرما کہ تو بندوں کی دعائیں سننے والا ہے''

(۳۹) زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ زکریا علیہ السلام کی دعا قبول ہوگئی۔ وہ محراب عبادت میں عبادت کر رہے تھے اور مشغول عبادت تھے کہ خدا کے فرشتوں نے انہیں آواز دی اور بشارت دی کہ خدا تعالیٰ انہیں بہت جلد ایک بیٹا دے گا جس کا نام یحییٰ علیہ السلام ہوگا اور جوان صفات کا حامل ہوگا۔

1۔ وہ حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لائے گا اور اپنے ایمان سے انہیں تقویت پہنچائے گا۔

یاد رہے کہ اس آیت میں اور بعض دیگر آیات میں جن کا ذکر آگے آئے گا ''کلمہ'' سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور جیسا کہ تاریخ میں آیا ہے

حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چھ ماہ بڑے ہیں اور وہ پہلے شخص ہیں جنہوں جناب مسیح کی نبوت کی تصدیق کی اور چونکہ وہ لوگوں میں پاکیزگی اور زہد و تقویٰ کے اعتبار سے بہت شہرت رکھتے تھے۔ لہٰذا جب حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف ان کی رغبت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت و نبوت کی طرف لوگوں کی توجہ کے لئے بہت مؤثر ثابت ہوئی۔

2۔ علم و عمل کے لحاظ سے معاشرے کی رہبری ان کے ذمہ ہوگی ''وَ سَیِّدًا'' علاوہ ازیں اپنے تئیں سرکش ہوا و ہوس اور دنیا پرستی سے محفوظ رکھیں گے۔

''حَصُوْرًا'' مادہ ''حصر'' سے ہے اس کا معنی ہے وہ شخص جو کسی حوالے سے اپنے آپ کو محاصرے میں رکھے۔ کبھی یہ لفظ عدم ازدواج اور شادی نہ کرنے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیت میں اس لفظ سے یہی دوسرا مفہوم مراد لیا ہے نیز بعض روایات میں بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

3۔ وہ خدا کے پیغمبر اور صالحین میں سے ہوں گے۔

(۴۰) ملائکہ نے یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت دی تو حضرت زکریا علیہ السلام تعجب میں پڑ گئے اور بارگاہِ خداوندی میں عرض کرنے لگے: خداوندا! کیسے ممکن ہے کہ مجھ سے بچہ ہو جب کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔

جواب میں وحی آئی: ''خدا اسی طرح جو کچھ چاہے انجام دے لیتا ہے۔''

اس آیت میں حضرت زکریا علیہ السلام اپنے بڑھاپے کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ''بڑھاپا مجھ تک آ پہنچا ہے''

یہاں پر خداوند کریم نے ان کو جواب دیا، فرمایا: ''اس طرح خداوند کریم جو چاہتا ہے کرتا ہے'' اور زکریا علیہ السلام بھی اس مختصر جواب سے قانع ہوگئے۔

(۴۱)قَالَ رَبِّ اجۡعَلۡ لِّیۡۤ اٰیَةً ؕ قَالَ اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمۡزًا ؕ وَاذۡکُرۡ رَّبَّکَ کَثِیۡرًا وَّ سَبِّحۡ بِالۡعَشِیِّ وَ الۡاِبۡکَارِ ۠	(حضرت زکریا نے) عرض کی پروردگار! میرے لیے کوئی نشانی مقرر فرما خدا نے کہا تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو تین دن تک لوگوں سے گفتگو نہ کر سکے گا مگر اشارے سے۔ اور (اس عظیم نعمت پر شکرانے کے طور پر) اپنے پروردگار کو بہت یاد کرو اور صبح وشام اس کی تسبیح کرو۔

تفسیر

یہاں حضرت زکریا علیہ السلام، یحیٰی علیہ السلام کی ولادت کی بشارت پر کسی نشانی کی درخواست کرتے ہیں جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس عجیب وغریب واقعے پر حضرت زکریا علیہ السلام کا اظہار تعجب اور پروردگار سے کسی نشانی کا تقاضا کسی طرح سے بھی اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر بے اعتمادی کی دلیل نہیں ہے۔

خداتعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کی یہ درخواست بھی قبول فرمالی اور ان کے لئے ایک نشانی مقرر فرمائی گئی کہ ان کی زبان کسی طبعی عامل کے بغیر تین دن کے لئے بے کار ہوگئی۔ وہ عام گفتگو نہ کر سکتے تھے لیکن خداتعالیٰ کے ذکر اور اس کی تسبیح کے وقت ان کی زبان بغیر کسی تکلیف کے کام کرتی تھی۔ یہ عجیب وغریب کیفیت تمام امور پر اللہ کی قدرت کے لئے ایک نشانی تھی وہ خدا جو بند زبان کو اپنے ذکر کے لئے کھول دینے کی طاقت رکھتا ہے وہ یہ قدرت بھی رکھتا ہے کہ کسی بانجھ رحم سے ایک ایسا باایمان بچہ پیدا کردے جو ذکرِ پروردگار کا مظہر ہو اسی سے اس نشانی کا اس چیز سے ربط ظاہر ہو جاتا ہے جو حضرت زکریا علیہ السلام چاہتے تھے۔

''وَاذۡکُرۡ رَّبَّکَ کَثِیۡرًا وَّ سَبِّحۡ بِالۡعَشِیِّ وَ الۡاِبۡکَارِ''

اس جملے میں قرآن نے بتایا ہے کہ خداتعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو پروردگار کی تسبیح اور ذکر کا حکم دیا۔ جب آپ کی زبان بند ہو چکی تھی ایسے میں یہ تسبیح اور ذکر اس بات کی بھی نشانی تھی کہ خداتعالیٰ بند امور کو کھولنے کی قدرت رکھتا ہے نیز خدا کے عظیم عطیے پر شکرگزاری کے حوالے سے یہ ایک ذمہ داری بھی تھی۔

(۴۲)وَ اِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِکَةُ یٰمَرۡیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰکِ وَ طَہَّرَکِ وَ اصۡطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الۡعٰلَمِیۡنَ	(اور وہ وقت یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا اے مریم! خدا نے تجھے چنا، پاک کیا اور تمام جہان کی عورتوں پر برتری اور فضیلت دی۔

(۴۳)يَامَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ	اے مریم !(اس نعمت کے شکرانے کے طور پر) اپنے پروردگار کے سامنے خضوع کروسجدہ بجالاؤاوررکوع کرنے والے کے ساتھ رکوع کرو۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں جناب عمران علیہ السلام اوران کی بیوی کے متعلق بحث تھی۔اب حضرت مریم علیہا السلام کا نام بھی لیا گیا ہےاوران آیات میں ان کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ پہلے اس طرف اشارا ہوا ہے کہ فرشتوں نے مریم علیہا السلام سے باتیں کیں۔ یہ آیت نشان دہی کرتی ہے کہ ممکن ہے کہ فرشتے پیغمبروں کے علاوہ دوسرے انسانوں سے بھی گفتگو کریں نیز یہ جملہ حضرت مریم علیہا السلام کے بلند مرتبے کی بھی حکایت کرتا ہے۔

فرشتے حضرت مریم علیہا السلام کو بشارت دیتے ہیں کہ خدا نے انہیں برگذیدہ کیا اور چن لیا ہے اور انہیں پاک قرار دیا ہے یعنی تقویٰ، پرہیز گاری، ایمان اور عبادت کے نتیجے میں وہ خدا کے برگزیدہ اور پاک لوگوں میں سے ہوگئی ہیں اور انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے پیغمبر کی پیدائش کے لئے چن لیا گیا ہے

(۴۳)اس آیت میں حضرت مریم علیہا السلام سے فرشتوں کی گفتگو کی بات کی گئی ہے۔انھوں نے حضرت مریم علیہا السلام کو خدا کی طرف سے برگزیدہ ہونے کی بشارت دینے کے بعد کہا:اب پروردگار کے حضور خضوع کرواور سجدہ وقیام بجالاؤ۔ یہ درحقیقت اس عظیم نعمت پر شکرانہ تھا

یہاں فرشتوں کی طرف سے حضرت مریم علیہا السلام کو تین احکام دیئے گئے ہیں:

پہلا پروردگار کے سامنے ''قنوت'' جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ لفظ خضوع اور دائمی اطاعت کے معنی میں ہے۔

دوسرا ''سجود''اور یہ خدا کے حضور خضوعِ کامل کی ایک قسم ہے۔

تیسرا ''رکوع''اور یہ بھی خضوع اور انکساری کی ایک قسم ہے۔

(۴۴)ذٰلِکَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡهِ اِلَیۡکَ ؕ وَ مَا کُنۡتَ لَدَیۡهِمۡ اِذۡ یُلۡقُوۡنَ اَقۡلَامَهُمۡ اَیُّهُمۡ یَکۡفُلُ مَرۡیَمَ ۪ وَ مَا کُنۡتَ لَدَیۡهِمۡ اِذۡ یَخۡتَصِمُوۡنَ	یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تمہیں وحی کے ذریعے بتا رہے ہیں اور جب وہ اپنی قلمیں (قرعہ اندازی کے لئے پانی میں) پھینک رہے تھے کہ مریم کی کفالت اور سرپرستی کون کرے اور اس وقت (بھی) جب اس کی سرپرستی کا افتخار اور منصب حاصل کرنے کے لئے علماء آپس میں مصروف کشمکش تھے تم موجود نہ تھے۔

تفسیر

واقعہ کفالت حضرت مریم علیہا السلام بصورت قرعہ

مندرجہ بالا آیت اس واقعے کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کر رہی ہے فرمایا گیا ہے: مریم علیہا السلام کی جو کچھ سرگذشت ہم نے تمہیں بیان کی ہے یہ غیب کی خبروں میں سے ہے کیونکہ یہ واقعہ اس طرح سے پاک گذشتہ تحریف شدہ کتب میں بھی کہیں موجود نہیں تھا اس لئے آسمانی وحی ہی اس کی سند بن سکتی تھی۔

پھر اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے، مریم کی سرپرستی کے تعیّن کے لئے جب وہ اپنی قلمیں پانی میں ڈال رہے تھے تم موجود نہ تھے۔ یونہی جب وہ کفالت مریم پر جھگڑ رہے تھے تم پاس نہ تھے اور یہ سب کچھ تم پر صرف وحی کے ذریعے نازل ہوا ہے۔

زیرِ نظر آیت اور سورہ صافات میں حضرت یونس علیہ السلام کے بارے میں موجود آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشکل کو حل کرنے کے لئے یا تنازعے میں معاملہ آخری حد تک پہنچ جانے پر جب جھگڑا ختم کرنے کا کوئی راستہ سجھائی نہ دے تو قرعہ اندازی سے مدد لی جا سکتی ہے۔ ان آیات کے ساتھ پیشوایانِ اسلام سے منقول روایات بھی اس سلسلے میں موجود ہیں۔ انہی آیات و روایات کے باعث فقہی کتابوں میں ''قاعدہ قرعہ'' فقہی قواعد و اصول میں سے ایک کے طور پر زیرِ بحث آنے لگا۔

(۴۵)اِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرۡیَمُ اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَۃٍ مِّنۡہُ ۖ اسۡمُہُ الۡمَسِیۡحُ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ وَجِیۡہًا فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ وَمِنَ الۡمُقَرَّبِیۡنَ ۙ	وہ وقت (یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا اے مریم! خدا اپنی طرف سے تجھے ایک کلمہ اور (باعظمت شخصیت) کی بشارت دیتا ہے جس کا نام عیسیٰ بن مریم ہے وہ دنیا وآخرت میں مقام وعظمت کا مالک ہوگا اور وہ مقربین میں سے ہے۔

تفسیر

اس آیت میں حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ فرشتوں کی طرف سے جناب مریم علیہا السلام کو بشارت دینے سے شروع ہوتا ہے۔ فرشتے خدا کی طرف سے جناب مریم علیہا السلام کو خوشخبری دیتے ہیں کہ خدا انہیں ایک بچہ دے گا جس کا نام مسیح ابن مریم علیہما السلام ہوگا۔ وہ دنیا وآخرت میں مقام وعظمت کا مالک ہوگا۔ اور بارگاہِ الٰہی کے مقربین میں سے ہوگا۔

(۴۶)وَیُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الۡمَہۡدِ وَکَہۡلًا وَّ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ	اور وہ لوگوں سے گہوارے میں اور ادھیڑ عمر میں گفتگو کرے گا اور وہ صالحین میں سے ہے۔

تفسیر

اب اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گہوارے میں گفتگو کا تذکرہ ہے کیونکہ جیسا کہ سورہ مریم میں آئے گا وہ اپنی والدہ سے تہمت دور کرنے کے لئے گہوارے میں بول اٹھے اور فصیح زبان میں خدا کے حضور اپنے مقام بندگی اور مقام نبوت کو آشکار کیا۔ اور چونکہ ممکن نہیں کہ پیغمبر ناپاک اور آلودۂ گناہ رحم سے پیدا ہو اس لئے اس اعجاز کے ذریعے اپنی والدہ کی پاکیزگی کو ثابت کیا۔

ضمناً اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اپنی ولادت سے لے کر ادھیڑ عمر تک حق بات کہتے رہیں گے گویا تمام عمر مخلوق کی تبلیغ و ہدایت کے لئے قدم اٹھاتے رہیں گے اور ایک لمحہ کے لئے بھی آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔

آیت کے آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مختلف صفات کے تذکرے کے بعد فرمایا گیا ہے: وہ صالحین میں سے ہوں گے "و من الصٰلحین"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صالح ہونا بہت بڑا اعزاز اور افتخار ہے اور صالح کے مفہوم میں تمام انسانی قدریں مجتمع ہیں۔

(۴۷)قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ	(مریم نے) کہا پروردگار! مجھ سے بچہ کیونکر ہوگا جب کہ کسی شخص نے مجھے چھوا نہیں (جواب میں) فرمایا خدا اسی طرح جسے چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جب وہ کسی چیز کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس کہتا ہے ہوجا تو وہ ہوجاتی ہے۔

تفسیر

ہم جانتے ہیں کہ یہ جہاں عالم اسباب ہے۔ خدا تعالیٰ نے خلقت کے عمل کو اس طرح سے جاری فرمایا ہے کہ ہر موجود عوامل کے ایک سلسلے کے بعد ہی دائرہ وجود میں قدم رکھتا ہے مثلاً ایک بچے کے پیدا ہونے کے لئے شادی بیاہ جنسی ملاپ اور ''اسپرم'' اور ''اوول'' کا باہمی پیوند ضروری ہے۔ اسلئے یہ باعث تعجب نہیں کہ کہ بہت جلد صاحبِ فرزند ہونے کی بشارت پر مریم علیہا السلام حیران و پریشان ہوگئیں۔ انہوں نے سوال کیا: میرے خدا: کیسے ہوسکتا ہے کہ مجھ سے بچہ پیدا ہو جب کہ بشر نے مجھے مس تک نہیں کیا۔

خدا نے فوراً فرشتوں کے ذریعے انہیں خبر دی: خدا جسے چاہتا ہے پیدا کرتا ہے یعنی جہانِ طبیعت کا نظام خدا کا پیدا کردہ ہے، اس کے تابع فرمان ہے، وہ جب چاہے اسے دگرگوں کرسکتا ہے اور غیر مادی علل وعوامل سے بھی موجودات کو پیدا کرسکتا ہے۔

اس کے بعد بات کی تکمیل کے لئے فرماتا ہے: جب وہ کسی چیز کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے حکم دیتا ہے کہ ہوجا اور وہ فوراً ہوجاتی ہے۔ ''كُنْ فَيَكُوْنُ'' سرعت آفرینش کی طرف اشارہ ہے۔

(۴۸)وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۚ	اور اسے کتاب و دانش اور تورات و انجیل کی تعلیم دے گا۔
(۴۹)وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًاۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ وَ اُحْىِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ	اور اسے رسول کی حیثیت سے بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گا (جو ان سے کہے گا) میں پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے نشانی لایا ہوں میں گیلی مٹی سے پرندے جیسی مورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونکتا ہوں تو وہ حکم خدا سے پرندہ بن جاتا ہے نیز مادرزاد اندھے کو اور برص میں مبتلا لوگوں کو شفا دیتا ہوں مردوں کو زندہ کرتا ہوں

وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ	اور جو کچھ تم کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو اس کی تمہیں خبر دیتا ہوں بے شک اس میں تمہارے لیے نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

تفسیر

مندرجہ بالا پہلی آیت میں حضرت مسیح علیہ السلام کی ماموریت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوندِ عالم نے پہلے فرمایا ہے: خدا نے اسے کتاب وحکمت کی تعلیم دی۔ اوراس کے بعد کتاب وحکمت کے مصداق کی نشاندہی کی گئی ہے۔ فرمایا: تورات وانجیل سکھائی۔

(۴۹) اس کے بعد زیرِ نظر دوسری آیت میں بنی اسرائیل کے منحرف لوگوں کی ہدایت کے لئے ان کی ماموریت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کیونکہ وہ ان دنوں طرح طرح کے خرافات، آلودگیوں اور اختلافات میں گرفتار تھے، فرمایا: ''وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ''

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مندرجہ بالا آیت سے ابتداء میں یہ لگتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذمہ صرف بنی اسرائیل کو دعوت دینا تھا لیکن یہ ان کے اولوالعزم ہونے کی نفی نہیں ہے کیونکہ اولوالعزم پیغمبر وہ ہے جو نیا دین وآئین لے کر آئے اگر چہ اس کی ماموریت عالمی نہ ہو۔ تفسیر نورالثقلین میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بنی اسرائیل میں منحصر ماموریت کے بارے میں ایک روایت بھی منقول ہے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماموریت عالمی تھی اور بنی اسرائیل میں منحصر نہ تھی۔ البتہ وہ کہتے ہیں کہ جن کی ہدایت ان کے ذمہ تھی ان میں بنی اسرائیل پہلی صف میں تھے۔

مرحوم علامہ مجلسی نے بحارالانوار میں اولوالعزم کے معنی میں روایات نقل کی ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی دعوت جہانی اور پوری دنیا کے لئے ہونی چاہئے۔

درحقیقت انبیاء کی دعوت حقیقی زندگی کی طرف دعوت ہے اس لئے مندرجہ بالا آیت میں حضرت مسیح کے معجزات کی تفصیل کے موقع پر سب سے پہلے حکمِ خدا سے بے جان چیزوں میں زندگی پیدا کرنے کا تذکرہ ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی فرمایا گیا ہے۔ میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لئے نشانی لایا ہوں۔ میں گیلی مٹی سے پرندے کی شکل کی کوئی چیز بناتا ہوں اور پھر اس میں پھونکتا ہوں تو وہ حکم خدا سے پرندہ بن جاتا ہے۔

اس کے بعد ان بیماریوں کے علاج کا تذکرہ ہے جن کا علاج بہت مشکل ہے یا جو معمول کے طریقوں سے قابلِ علاج نہیں ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے میں مادرزاد اندھے اور ابرص (برص) اور سفید داغ والی بیماری میں مبتلا لوگوں کا علاج کر سکتا ہوں اور مُردوں کو بھی لباسِ حیات پہنا سکتا ہوں۔

واضح رہے کہ یہ امور خصوصاً اس زمانے کے اطباء اور علماء کے لئے ناقابلِ انکار معجزات تھے۔

بعد کے مرحلے میں کچھ لوگوں کے پوشیدہ اسرار کی خبر دینے کی بات کی گئی ہے کیونکہ ہر شخص کی اپنی انفرادی اور شخصی زندگی

سے کچھ ایسے اسرار اور راز ہوتے ہیں جن سے دوسرے لوگ آگاہ نہیں ہوتے۔اب اگر کوئی شخص کسی قسم کے سابقہ روابط کے بغیر ایسے امور کی اطلاع دے دے مثلاً جو کھانے انہوں نے کھائے ہیں ان کی خبر دے یا جو کچھ انہوں نے پس انداز کر رکھا ہے اس کی تمام تفصیلات بتا دے تو یہ اس امر کی دلیل ہوگی کہ اس نے غیبی منبع ومصدر سے الہام حاصل کیا ہے جناب مسیح علیہ السلام کہتے ہیں: میں ان امور سے آگاہ ہوں اور تمہیں ان کی خبر دیتا ہوں۔

آخر میں فرمایا گیا ہے: ان تمام چیزوں میں تمہارے لئے نشانیاں ہیں اگر تم صاحبِ ایمان ہو اور حقیقت کے متلاشی ہو۔

اس آیت اور اس سے مشابہ دیگر آیات جن کے بارے میں ہم انشاءاللہ اشارہ کریں گے، معلوم ہوتا کہ خدا کے بھیجے ہوئے افراد اور اولیاء اللہ، اللہ کے فرمان اور اذن سے بوقت ضرورت عالمِ تکوین وآفرینش میں تصرف کر سکتے ہیں اور خلاف معمول اور طبعی قوانین سے ہٹ کر کچھ واقعات کو جنم دے سکتے ہیں ''ابرء'' (شفا دے سکتا ہوں)، ''احی الموت'' (مردوں کو زندہ کرتا ہوں) اور اس قسم کے دیگر الفاظ جو فعلِ متکلم کی صورت میں ذکر ہوئے ہیں، اس بات کی دلیل ہیں کہ اس قسم کے افعال خود پیغمبروں سے صادر ہوتے ہیں اور ان عبارات کو انبیاء کی دعائیں قرار دینا بلا دلیل دعویٰ ہے۔ان عبارات کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ وہ عالم تکوین میں ظاہری تصرف کرتے تھے اور ان واقعات کو عالم وجود میں لاتے تھے۔

زیادہ سے زیادہ اس چیز کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہ کوئی شخص یہ تصور نہ کرے کہ خدا کے انبیاء واولیاء ذاتی طور پر صاحب استقلال تھے اور ان کی کوئی قدرت خدا کی قدرتِ خلقت کے مقابل تھی نیز دوگانہ پرستی کے احتمال کو برطرف کرنے کے لئے چند مواقع پر ''باذن اللہ'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں (محلِ بحث آیت میں دو مرتبہ اور سورہ مائدہ کی آیت ۱۱۰ میں چار مرتبہ ''باذن اللہ'' کا تکرار ہوا ہے)۔

ولایت تکوینی سے بھی اس کے علاوہ کچھ مراد نہیں کہ انبیاء اور آئمہ علیہم السلام ضرورت کے وقت اذن پروردگار سے عالم خلقت میں تصرفات کر سکتے ہیں (لہٰذا یہی صورت آئمہ ہدیٰ علیہم السلام کے بارے میں ہے۔مترجم) اور یہ چیز ولایت تشریعی یعنی عوام پر حکومت، قوانین کی نشر واشاعت اور براہِ راست دعوت وہدایت کرنے سے بالاتر ہے۔

(۵۰) وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ	اور میں تصدیق کرتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں اس کی جو تورات میں سے مجھ سے پہلے تھا اور (میں آیا ہوں تاکہ) بعض چیزیں جو (ظلم وگناہ کی وجہ سے) تم پر حرام تھیں انہیں حلال کروں اور تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے نشانی لایا ہوں اس لیے تم خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو

تفسیر

یہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے یوں نقل ہوئی ہے: میں تورات کی تصدیق کرنے، اس کے مبانی واصول محکم کرنے

کے لئے آیا ہوں اور اس لئے بھی کہ دین موسیٰؑ میں جو بعض حد بندیاں (مثلاً اونٹ کا گوشت، کچھ حیوانات کی چربیاں، بعض پرندے اور مچھلیاں ممنوع تھیں) تمہاری خلاف ورزیوں کی وجہ سے تھیں انہیں تمہارے لئے مباح کروں۔

اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کی زبانی ایک جملہ جو گذشتہ آیت میں آیا تھا اس کا تکرار کیا گیا ہے: میں خدا کی طرف سے اپنی دعوت کی صداقت کے لئے ایک نشانی لایا ہوں اس بناء پر یہ ہونا چاہئے کہ خدا سے ڈرو اور میرے احکام کی پیروی کرو۔

(۵۱) اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیۡ وَ رَبُّکُمۡ فَاعۡبُدُوۡهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ	خدا میرا اور تمہارا پروردگار ہے پس اسی کی عبادت کرو یہی سیدھی راہ ہے۔

تفسیر

اس آیت سے اور قرآن کی دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ہر قسم کے ابہام اور اشتباہ کے خاتمے کے لئے اور اس لئے کہ آپ کی استثنائی ولادت کو آپ کی الوہیت پر سند نہ سمجھ لیں بار بار کہتے تھے: اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔ نیز کہتے: میں اس کا بندہ ہوں اور اس کا بھیجا ہوا ہوں۔ اس کے برخلاف موجودہ تحریف شدہ انجیلوں میں حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے خدا کے بارے میں ''باپ'' کا لفظ نقل کیا گیا ہے۔ قرآن میں ایسے مقامات پر ''رب'' یا اس جیسے الفاظ نقل ہوئے ہیں ''اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیۡ وَرَبُّکُمۡ'' اور یہ چیز دعوائے الوہیت کے خلاف اور اس کے مقابلے میں حضرت مسیح کی انتہائی توجہ کی نشاندہی کرتی ہے۔

آخر میں زیادہ تاکید کے لئے فرمایا: ''فَاعۡبُدُوۡهُ'' یعنی خدا کی پرستش اور عبادت کرو نہ کہ میری۔ اور یہ توحید و یگانہ پرستی ہی کی سیدھی راہ ہے۔

(۵۲) فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِیۡسٰی مِنۡهُمُ الۡکُفۡرَ قَالَ مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰهِ ؕ قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشۡهَدۡ بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ	حضرت عیسیٰ نے ان سے کفر (اور مخالفت) کو دیکھا تو کہا کون خدا کی طرف (اور اس کے دین کے لئے) میرا یاور و مددگار بنے گا؟ حواریین (جو ان کے مخصوص شاگرد تھے) کہنے لگے ہم خدا کے یاور و مددگار ہیں اس پر ایمان لاتے ہیں اور آپ (بھی) گواہ رہیں کہ ہم اسلام لے آئے ہیں۔

تفسیر

اہل یہود حضرت عیسیٰؑ کے آنے سے پہلے حضرت موسیٰؑ کی پیشین گوئی اور بشارت کے مطابق حضرت مسیح کے ظہور کے منتظر تھے لیکن جب انہوں نے ظہور فرمایا اور بنی اسرائیل کے ایک ستمگر اور منحرف گروہ کو اپنے منافع خطرے میں نظر آئے تو صرف تھوڑے سے لوگ آپ کے گرد جمع ہوئے اور جن لوگوں کا خیال تھا حضرت مسیحؑ کی دعوت قبول کرنے اور احکام خدا کی پیروی سے ان کی حیثیت اور قدر و منزلت خطرے سے دوچار ہو جائے گی، انہوں نے قوانین الٰہی کو قبول کرنے سے منہ پھیر لیا۔

دلیل و برہان سے انہیں کافی دعوت دینے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس نتیجے پر پہنچے کہ بنی اسرائیل کا ایک گروہ مخالفت اور گناہ پر مصر ہے اور وہ کسی انکار اور کجروی سے دستبردار نہیں ہوگا لہٰذا انہوں نے پکار کر کہا: کون ہے جو دین خدا کی حمایت اور میرا دفاع کرے۔

تھوڑے سے افراد نے مثبت جواب دیا۔ یہ چند پاکباز لوگ تھے جنہیں قرآن نے حواریین کا نام دیا ہے۔

انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی پکار کا جواب دیا اور ہر قسم کی مدد کی ان کے مقدس مقاصد کی پیش رفت کی راہ میں دفاع کرنے سے دریغ نہ کیا۔ حواریین نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہر طرح سے مدد کا اعلان کیا اور جیسا کہ قرآن نے مندرجہ ذیل آیت میں ان سے نقل کیا ہے کہنے لگے:

"قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللهِ
آمَنَّا بِاللهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ"

"ہم خدا کے یاور و مددگار ہیں، خدا پر ایمان لائے
ہیں اور آپ کو اپنے اسلام پر گواہ بناتے ہیں۔"

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں یہ نہیں کہا کہ ہم آپ کے مددگار ہیں بلکہ اپنی انتہائی توحید پرستی اور خلوص کے ثبوت کے لئے اور اس مقصد کے لئے کہ ان کی بات سے کسی شرک کی بو نہ آئے۔ وہ کہنے لگے: ہم خدا کے مددگار اور ساتھی ہیں اور اسکے دین کی مدد کریں گے اور آپ کو اس حقیقت پر گواہ بناتے ہیں۔ گویا وہ بھی یہ محسوس کرتے تھے منحرف اور کج رو افراد آئندہ حضرت مسیح کی الوہیت کا دعویٰ کریں گے لہٰذا وہ ان کے ہاتھوں میں کوئی دلیل نہیں دینا چاہتے تھے۔

(۵۳) رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ	پروردگار! جو کچھ تو نے نازل کیا ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے (تیرے) رسول کی پیروی کی ہے ہمیں گواہوں کے زمرے میں لکھ لے۔

تفسیر

حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت قبول کر لینے کے بعد حواریوں نے ان کا ساتھ دیا، ان کی مدد کی اور انہیں اپنے ایمان پر گواہ بنایا۔ پھر بارگاہِ الٰہی کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنا ایمان پیش کیا اور کہنے لگے: پروردگار! جو کچھ تو نے بھیجا ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں "رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنْزَلْتَ"، لیکن ایمان کا چونکہ دعویٰ ہی کافی نہیں تھا، اس لئے ساتھ ہی آسمانی احکام پر عمل کرنے اور پیغمبر خدا (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی پیروری کا ذکر کرنے لگے اور کہنے لگے: ہم نے تیرے بھیجے ہوئے مسیح علیہ السلام کی پیروی کی "وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ" اور یہ ہمارے ایمانِ راسخ کا زندہ ثبوت ہے۔ یہ اس لئے کہ جب ایمان روحِ انسانی میں اتر جاتا ہے تو اس کے عمل میں منعکس ہوتا ہے اور عمل کے بغیر ممکن ہے دعویٰ صرف خیالی ایمان ہو اور حقیقی و واقعی ایمان نہ ہو۔

اس کے بعد انہوں نے تقاضا کیا کہ خدا ان کے نام شہادت دینے والوں اور گواہوں کے زمرے میں شمار کرے۔ یہ گواہ

وہی لوگ ہیں جو اس دنیا میں امتوں کی رہبری کرتے ہیں اور قیامت میں لوگوں کے نیک و بداعمال کے گواہ ہوں گے۔

(۵۴)وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۧ	اور (مسیح کے دشمنوں نے) سازش کی اور خدا نے چارہ جوئی کی اور خدا بہترین چارہ جوئی کرنے والا ہے۔

تفسیر

خدائی مکر سے کیا مراد ہے؟

''حواریّون'' کے ایمان کا تذکرہ کرنے کے بعد اب اس میں یہودیوں کی شیطانی سازشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: انہوں نے مسیحؑ کو نابود کرنے، ان کی آواز کو خاموش کرنے اور ان کے دین کی پیش رفت روکنے کے لئے کئی مکر وفریب اور سازشیں کیں لیکن خدا کی تدابیر اور چارہ جوئی ان سب مکاریوں اور سازش سے بالاتر اور زیادہ مؤثر تھی۔

قرآن میں اس جیسی کئی ایک آیات دکھائی دیتی ہیں جن میں مکر کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے۔

لغتِ عرب میں ''مکر'' کا معنی اس سے بہت مختلف ہے جو اس کا معنی آج کی فارسی (اور اردو) میں ہے۔آج کل کی فارسی (اور اردو) میں ''مکر'' شیطانی سازشوں اور زیاں کاریوں کے لئے استعمال ہوتا ہے حالانکہ لغتِ عرب اصولِ معانی میں ''مکر'' ہر طرح کی ''چارہ جوئی'' کو کہتے ہیں جو اچھی بھی ہوتی ہے اور بری بھی۔

اس بناء پر محلِ بحث آیت سے مراد یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمن اپنی شیطانی سازشوں کے ذریعے اس خدائی دعوت کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن خدا تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی جان کی حفاظت اور اس کے دین کی پیش رفت کے لئے تدبیر کی اور ان کے نقشے نقش بر آب ثابت ہوئے۔

(۵۵)اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ	(وہ وقت یاد) کرو جب خدا نے عیسیٰ سے کہا میں تمہیں لے لوں گا اور اپنی طرف اٹھا لوں گا اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان سے پاک کروں گا اور جو لوگ تیری پیروی کرتے ہیں انہیں ان لوگوں سے یوم قیامت تک کے لئے برتر قرار دوں گا جو کافر ہو گئے ہیں پھر تمہاری بازگشت میری طرف ہے اور جس چیز میں تم اختلاف کرتے ہو اس کا تمہارے درمیان فیصلہ کر دوں گا۔

تفسیر

ہم نے کہا ہے کہ یہودیوں نے بعض جرائم پیشہ عیسائیوں کی مدد سے حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کا مصمم ارادہ کر لیا تھا لیکن خدا

تعالیٰ نے ان کی سازشوں کو نقش بر آب کر دیا اور اپنے پیغمبر کو ان کے چنگل سے رہائی بخشی۔اس آیت میں خدا تعالیٰ نے اس سے پہلے جو احسان حضرت مسیح علیہ السلام پر کیا اس کا ذکر فرمایا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:اے عیسیٰ میں تمہیں لے لوں گا اور اپنی طرف اٹھا لوں گا۔

سورہ نساء کی آیت ۱۵۷ سے استناد کرتے ہوئے مفسرین میں یہ مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قتل نہیں ہوئے اور خدا انہیں آسمان کی طرف لے گیا۔لیکن خود عیسائی موجودہ اناجیل کے مطابق کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قتل ہوئے اور بعد از اں انہیں دفن کر دیا گیا، پھر وہ مردوں کے درمیان سے اٹھے،تھوڑی مدت زمین پر رہے اور آسمان کی طرف اٹھ گئے۔

یہاں جس بات کی طرف توجہ ضروری ہے، یہ ہے کہ محلِ بحث آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت پر دلالت نہیں کرتی اگر چہ بعض تصور کرتے ہیں کہ ''متوفیک'' کا مادہ ہے ''وفات'' اور یہ موت کے معنی میں ہے

خداوندِ عالم فرماتا ہے:اے عیسیٰ میں تجھے اپنی تحویل میں لے لوں گا، تجھے اٹھا لے جاؤں گا۔اور یہ مفہوم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور زندگی پر دلالت کرتا ہے نہ کہ ان کی موت پر۔(غور کیجئے)

پروردگار نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جو خطاب فرمایا اس جملہ میں اس کا ایک حصہ آیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

جو کافر ہیں ان سے میں تمہیں پاک و پاکیزہ رکھوں گا۔

اس پاکیزگی سے مراد بے ایمان ، ناپاک اور حق وحقیقت سے ہٹے ہوئے افراد کے چنگل سے نجات دینا ہے۔وہ کوشش کرتے تھے کہ ناروا تہمتوں اور بزدلانہ سازشوں کے ذریعے انہیں آلودہ کر دیں لیکن خدا نے ان کے دین کو کامیابی بخشی اور انہیں تہمتوں سے پاک کیا جیسا کہ سورہ فتح میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے:

تیرے پیروکاروں کو قیامت تک کے لئے کافروں پر برتری دوں گا۔

یہ ایک بشارت ہے جو خدا نے حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کے پیرکاروں کو دی تا کہ جو راہ انہوں نے منتخب کی تھی اس پر چلتے رہنے کے لئے ان میں ولولہ پیدا ہو۔درحقیقت یہ آیت قرآن کی معجزنمائیوں اور غیبی پیشین گوئیوں میں سے ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت مسیح کے پیروکار ہمیشہ یہودیوں پر جو کہ مسیح کے مخالف تھے، برتر رہیں گے۔

آج کی دنیا میں ہم یہ حقیقت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں یہودی اور صیہونی عیسائیوں سے وابستگی اور ان پر بھروسہ کئے بغیر ایک دن بھی سیاسی اور سماجی طور پر زندہ نہیں رہ سکتے واضح ہے کہ ''الَّذِیْنَ کَفَرُوا'' سے یہاں مراد وہی یہودی ہیں جنہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کا انکار کیا۔

جو کچھ گذشتہ جملوں میں کہا جا چکا ہے وہ اس جہان کی کامیابیوں کے بارے میں تھا لیکن آخری فیصلہ جو دراصل اعمال کے نتائج پر مبنی ہے اس کا ذکر اس جملہ میں کیا گیا ہے۔فرمایا:تم سب میری طرف پلٹ آؤ گے اور میں تمہارے اور ان چیزوں کے درمیان جن میں تم اختلاف کرتے ہو فیصلہ کروں گا۔

(۵۶)فَاَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَاُعَذِّبُهُمۡ عَذَابًا شَدِیۡدًا فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَةِ ۫ وَ مَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ	رہے وہ لوگ جو کافر ہو گئے ہیں (اور انہوں نے حق کو پہچاننے کے باوجود اس کا انکار کر دیا ہے) انہیں دنیا و آخرت میں سخت عذاب کروں گا اور ان کے یاور و مددگار نہیں ہیں۔
(۵۷) وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیۡنَ	اور رہے وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک عمل انجام دیئے ہیں تو خدا انہیں ان کا پورا پورا اجر وثواب دے گا اور خدا ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔
(۵۸)ذٰلِکَ نَتۡلُوۡهُ عَلَیۡکَ مِنَ الۡاٰیٰتِ وَ الذِّکۡرِ الۡحَکِیۡمِ	یہ جو کچھ ہم تیرے لئے پڑھتے ہیں تیری حقانیت کی نشانی اور حکیمانہ تذکرہ ہے۔

تفسیر

یہ ذکر کرنے کے بعد کہ لوگوں کی بازگشت اللہ کی طرف ہے اور وہی ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اب اس آیت میں اس قضاوت کا نتیجہ بیان ہوا ہے کہ وہ افراد جو کافر ہیں اور حق وعدالت کے مخالف ہیں، جیسے وہ اس دنیا میں دردناک عذاب اور تکلیف میں مبتلا ہوں گے اس جہان میں بھی ان کی یہی حالت ہوگی اور کوئی بھی ان کی حمایت اور مدد نہیں کرے گا۔

(۵۷) لیکن جو لوگ ایمان لائے ہیں اور عملِ صالح بجالاتے ہیں وہ لوگ اپنا پورا پورا اجر وثواب حاصل کریں گے اور خدا کبھی ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

پہلی آیت میں عذابِ دنیا کی طرف بھی اشارہ ہوا تھا اس سے ہم ضمناً یہ استفادہ کرتے ہیں کہ کفار (جن سے یہاں یہودی مراد ہیں) اس جہان میں بھی پریشانیوں اور مصیبتوں میں گرفتار رہیں گے۔ یہودی قوم کی تاریخ اس دعویٰ پر گواہ ہے۔ ان پر دوسری حکومتوں کے تفوق کا یہ ایک اثر ہے جس کی طرف گذشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

(۵۸) حضرت مسیح علیہ السلام کی سرگزشت اور ان کی عجیب وغریب تاریخ کے ایک گوشہ کا ذکر کرنے کے بعد اب روئے سخن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے۔ فرماتا ہے: اور جو کچھ ہم نے تیرے سامنے پڑھا ہے وہ تیری دعوت و رسالت کی صداقت کی آیات اور نشانیاں ہیں اور حکمت آمیز یاد آوری ہے جو آیات قرآن کی صورت میں تجھ پر نازل ہوئی اور یہ آیات محکم ہیں جو ہر قسم کے باطل اور خرافات سے پاک ہیں اور حقائق کو واضح کرتی ہیں۔

(۵۹)اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ	عیسیٰ کی مثال خدا کے نزدیک آدم کی سی ہے جسے خدا نے مٹی سے پیدا کیا پھر اس سے کہا ہو جا تو وہ فوراً ہو گیا اس لیے باپ کے بغیر مسیح کی ولادت ہرگز ان کی الوہیت کی دلیل نہیں بن سکتی۔
(۶۰)اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ	یہ چیزیں تیرے پروردگار کی طرف سے حقائق ہیں لہٰذا تم تردد و شک کرنے والوں میں سے نہ بنو۔

شانِ نزول

جیسا کہ سورہ کی ابتدا میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے اس سورہ کی کافی آیات نجران کے عیسائیوں کے سوال کے جواب کے طور پر نازل ہوئیں۔ وہ ایک ساٹھ رکنی وفد کی صورت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس مدینہ میں آئے۔ اس میں ان کے چند نمائندہ رؤسا اور بزرگ شامل تھے۔

انہوں نے جو مسائل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کئے ان میں سے ایک مسئلہ یہ تھا کہ وہ پوچھنے لگے کہ آپ ہمیں کس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خدائے یگانہ کی طرف اور یہ کہ میں اس کی طرف ہدایتِ مخلوق کی رسالت کے منصب پر فائز ہوں نیز یہ کہ مسیح اس کے بندوں میں سے ایک تھے، حالاتِ بشری رکھتے تھے اور دوسرے لوگوں کی طرح غذا کھاتے تھے۔ انہوں نے یہ بات نہ مانی اور باپ کے بغیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے ان کی الوہیت کے لئے دلیل کے طور پر پیش کیا۔ اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور انہیں جواب دیا گیا۔ لیکن جب وہ یہ جواب قبول کرنے پر تیار نہ ہوئے تو انہیں مباہلہ کی دعوت دی گئی، جس کی تفصیل عنقریب بیان کی جائے گی۔

تفسیر

پہلی آیت میں ایک مختصر اور واضح استدلال ہے جس میں نجران کے عیسائیوں کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں دعویٰ الوہیت کا جواب ہے فرمایا گیا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام باپ کے بغیر پیدا ہوئے تو یہ امر اس کی دلیل کبھی نہیں بن سکتا کہ وہ خدا کے بیٹے یا خود خدا تھے، کیونکہ یہ بات تو حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں عجیب ترین صورت میں محقق ہو چکی ہے۔ وہ تو ماں باپ دونوں کے بغیر دنیا میں آئے تھے۔ اس لئے جیسے حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی سے پیدائش کوئی تعجب کی بات نہیں اور خدا جو کام انجام دینا چاہے اس کا فعل اور ارادہ ہم آہنگ ہیں، اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی والدہ سے بغیر باپ کے پیدا ہونا کوئی محال مسئلہ نہیں ہے بلکہ حضرت

آدمؑ کی پیدائش کئی لحاظ سے زیادہ تعجب خیز ہے۔ پس اگر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ان کی الوہیت کی دلیل ہے تو حضرت آدمؑ اس امر کے زیادہ مستحق ہیں۔

مندرجہ بالا آیت میں پہلے حضرت آدمؑ کی خلقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ'' (یعنی ۔۔۔ اسے مٹی سے پیدا کیا)۔ دوسرے جملوں کے قرینے سے، اس جملے میں اس سے مراد حضرت آدمؑ کے جسم اور مادی پہلو سے ان کی خلقت ہے۔ اس کے بعد دوسرے جملے میں ان کی حیات اور روح کی خلقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

''ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ'' (پھر اس سے کہا ہو جا تو وہ ہو گیا)۔

(۶۰) زیرِ نظر دوسری آیت میں پہلی آیت کی تاکید کے طور پر فرمایا کہ جو کچھ ہم نے مسیحؑ کے بارے میں تم پر نازل کیا ہے، یہ پروردگار کی طرف سے ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں اور اس کے بارے میں اپنے اندر کسی قسم کے تردد کو جگہ نہ دینا۔

(۶۱) فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ۣ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ	اس علم و دانش کے بعد جو عیسیٰ کے بارے میں تمہارے پاس پہنچا ہے پھر بھی کوئی تم سے جھگڑے تو اسے کہہ دو آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ ہم اپنی عورتوں کو بلاتے ہیں تم اپنی عورتوں کو بلاؤ اور ہم اپنے نفسوں کو بلاتے ہیں تم اپنے نفسوں کو بلاؤ پھر مباہلہ کریں گے اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں گے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں حضرت مسیحؑ کی الوہیت کی نفی پر استدلال تھا۔ اب اس آیت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر اس علم و دانش کے بعد بھی جو تمہارے پاس پہنچا ہے جو لوگ تم سے لڑیں جھگڑیں۔ تو انہیں مباہلہ کی دعوت دو اور ان سے کہو، ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں تم بھی اپنے بیٹوں کو بلاؤ۔، ہم اپنی عورتوں کو دعوت دیتے ہیں تم بھی اپنی عورتوں کو بلالاؤ۔ اور ہم اپنے نفسوں کو بلاتے ہیں تم بھی اپنے نفسوں کو دعوت دو۔ پھر ہم مباہلہ کریں گے اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں گے۔

(۶۲)اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَ مَا مِنْ اِلٰہٍ اِلَّا اللّٰہُ ۭ وَ اِنَّ اللّٰہَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ	یہ (حضرت عیسیٰ کی) حقیقی سرگذشت ہے (اور ان کا خدایا خدا کا بیٹا ہونا بے بنیاد ہے) اور خدائے یگانہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور خدا توانا و حکیم ہے۔

تفسیر

حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کے حالات بیان کرنے کے بعد مندرجہ بالا آیت میں کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہم نے جو تفصیل تم سے بیان کی ہے وہ ایک واقعیت اور حقیقت ہے جو پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوئی ہے اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں الوہیت، خدا کا بیٹا یا اس کی بجائے (معاذ اللہ) غیر شرعی بچہ قرار دینے کے سب دعوے بے بنیاد اور بے ہودہ ہیں۔

اس کے بعد تاکید کے طور پر مزید کہا گیا ہے: جو ذات پرستش کے لائق ہے وہ صرف خداوند توانا و حکیم ہے اور خدا کے علاوہ کسی کے لئے اس منصب کا قائل ہونا غیر مناسب اور خلافِ حقیقت ہے۔

(۶۳)فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ بِالْمُفْسِدِیْنَ ۧ	اگر (ان دلائل کے باوجود وہ قبول حق سے) روگردانی کرتے ہیں تو جان لو کہ خدا فساد کرنے والوں سے آگاہ ہے۔

تفسیر

آیت کہتی ہے کہ مسیح علیہ السلام کے بارے میں قرآن کے منطقی دلائل کے باوجود اور دعوتِ مباہلہ کے بعد بھی اگر وہ حق کو تسلیم نہیں کرتے اور اپنی ہٹ دھرمی جاری رکھتے ہیں تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ طالبِ حق نہیں بلکہ ناروا تعصّبات، سرکشی، ہوا و ہوس اور اندھی تقلید میں گرفتار ہیں اور ان کا کام بہرصورت معاشرے میں فساد پیدا کرنا ہے۔

(۶۴)قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَ لَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْھَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ	کہیے اے اہل کتاب آؤ ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے کہ سوائے خدائے یگانہ کے کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دیں اور ہم میں سے بعض خدا کو چھوڑ کر بعض دوسروں کو خدا کے طور پر قبول نہ کریں جب (وہ اس دعوت سے) روگردانی کریں تو کہیے گواہ رہو کہ ہم تو مسلمان ہیں۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں اسلام کی دعوت اس کی تمام تر خصوصیات کے ساتھ تھی لیکن اس آیت میں اسلام اور اہلِ کتاب کے

مشترک نقاط کی طرف دعوت دی گئی ہے۔حقیقت میں اس طرز استدلال سے قرآن ہمیں سکھا تا ہے کہ اگر کچھ لوگ اس بات پر تیار نہیں کہ تمہارے تمام مقدس اہداف و مقاصد میں تمہارا ساتھ دیں تو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھ جاؤ اور کوشش کرو کہ کم از کم جس قدر تمہارے ساتھ وہ اشتراکِ ہدف رکھتے ہیں اتنا ہی ان کی ہمکاری حاصل کرو اور اسے اپنے مقدس اہداف و مقاصد کی پیش رفت کے لئے بنیاد قرار دو۔

اگر وہ لوگ توحید کے مشترک نقطے کی طرف دعوت کے بعد بھی منہ پھیر لیں تو انہیں کہا جانا چاہئے کہ گواہ رہنا کہ ہم تو حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔دوسرے لفظوں میں جان لو کہ کون لوگ حق کے متلاشی ہیں اور کون متعصب اور ہٹ دھرم۔

اس وقت انہیں ''اشْهَدُوا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ''(یعنی۔۔گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں) کے جملے سے خطرے کا الارم دو کہ حق سے تمہاری روگردانی اور دوری ہم پر کچھ بھی اثر نہیں رکھتی اور ہم اس طرح اپنے (اسلام کے راستے) پر چلتے رہیں گے،صرف اس کے قوانین قبول کریں گے (اور پختگی سے پہچانیں گے) اور ہمارے درمیان کسی بشر کی پرستش کا کسی شکل وصورت میں وجود نہیں ہوگا۔

(٦٥)يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰةُ وَ الْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ	اے اہل کتاب! (حضرت) ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ تورات اور انجیل تو ان کے بعد نازل ہوئی ہیں کیا تم عقل وفکر نہیں رکھتے۔
(٦٦)هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ	تم تو وہی ہو جو اس چیز کے بارے میں گفتگو کرتے تھے جس کے بارے میں آگاہ ہوتے تھے اب ان چیزوں کے بارے میں گفتگو کیوں کرتے ہو جن سے آگاہ نہیں ہو خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔
(٦٧)مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّ لَا نَصْرَانِيًّا وَّ لٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ	ابراہیم یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ وہ مخلص موحد اور مسلمان شخص تھے اور وہ ہرگز مشرکین میں سے نہیں تھے۔

(۶۸) اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرَاهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَ اللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ	ابراہیم سے اولیت (اور زیادہ نسبت) رکھنے والے وہ لوگ ہیں جو ان کی پیروی کرتے ہیں (اور ان کے دور میں ان کے مکتب کے وفادار تھے اور اس طرح) یہ پیغمبر اور وہ لوگ جو (اس پر) ایمان لائے ہیں۔ اور خدا مومنین کا ولی اور سرپرست ہے۔

تفسیر

تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہودی ظہورِ اسلام کے وقت ہی سے اس دین سے خاص دشمنی اور عداوت رکھتے تھے۔ اسلام کے نفوذ، پھیلاؤ اور اس جدید دین کے ذریعے دینِ مسیح کے منسوخ ہو جانے سے عیسائیوں کا ایک گروہ بھی اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ لوگ کبھی کبھی بحث مباحثہ، حجت بازی اور جھگڑے کے لئے اپنے وفادار افراد کو نبی اکرم ﷺ کے پاس بھیجتے تھے اور وہ اس طرح اپنے دین کو بہتر ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ان امور میں سے ایک یہ تھا کہ وہ سب کے سب کوشش کرتے کہ خدا کے عظیم پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے میں سے ثابت کریں کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تمام مذاہب کے پیروکاروں میں معظم ومحترم سمجھے جاتے تھے۔ یہودی مدعی تھے کہ وہ ان میں سے ہیں اور ان کے دین کے پیرو ہیں۔ یہی دعویٰ عیسائی بھی کرتے تھے۔

مندرجہ بالا آیت میں قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ اصولی طور پر خدا کے مبارز ومجاہد پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں تمھارا جھگڑا اور گفتگو ہی بیکار ہے کیونکہ وہ تو سالہا سال حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہو گزرے ہیں اور تورات و انجیل ان کے کئی سال بعد نازل ہوئیں۔

کیا یہ چیز معقول ہے کہ گذشتہ پیغمبر اپنے بعد والے دین کا پیروکار ہو "اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ" کیا تم تفکر وتعقل نہیں کرتے۔

(۶۶) یہاں خدا تعالیٰ انہیں سرزنش کرتا ہے کہ اپنے مذہب سے مربوط جن کا تمہیں علم تھا ان کے بارے میں تم نے گفتگو اور بحث کی ہے (اور تم نے دیکھ لیا جن مباحث کے بارے میں تمہارے خیال میں تمہیں علم تھا۔ ان میں بھی تم کیسے کیسے بڑے اشتباہات میں مبتلا اور حقیقت سے دور تھے اور واقع میں تمہارا علم جہلِ مرکب تھا۔) اس لئے باوجود جس چیز کی تمہیں خبر نہیں اس کے بارے میں بحث کرتے ہو اور نتیجے کے طور پر تم ایسا دعویٰ کرتے ہو جو کسی تاریخ کے مطابق درست نہیں۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں گذشتہ مطالب کی تاکید کے لئے اور بعد والی آیت کی طرف متوجہ کرنے کے لئے فرمایا گیا ہے: خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

(۶۷) یہاں صراحت سے ان کے دعووں کا جواب دیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے: ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے نہ عیسائی بلکہ پاک اور

خالص موحد تھے اور خدا کے حضور سرِ تسلیم خم کئے ہوئے تھے اور کبھی تمہاری طرح شریکِ خدا کے قائل نہیں ہوئے تھے

توجہ رہے کہ لفظ ''حنیف''، مادہ ''حنف'' (بروزن ''انف'') سے ہے اور ایسے شخص یا چیز کے معنی میں بولا جاتا ہے جو کسی طرف مائل ہو اور قرآن کی زبان میں ایسے شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو اپنے زمانے کے باطل دین سے منہ موڑ کر دین حق کی طرف مائل ہو۔

مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ''حنیف'' کے لقب سے توصیف کی ہے کیونکہ انہوں نے تقلید اور تعصب کے پردے چاک کر دیئے تھے آپ ایسے ماحول اور زمانے میں ہرگز بتوں کے سامنے نہیں جھکے جو بت پرستی میں غرق تھا لیکن زمانۂ جاہلیت کے بت پرست عرب بھی اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین ''حنیف'' پر سمجھتے تھے اور یہ بات اتنی مشہور تھی کہ اہلِ کتاب انہیں ''حنفاء'' کہتے تھے یوں لفظ ''حنیف'' کا بالکل متضاد معنی پیدا ہو گیا اور ان کی نظر میں یہ لفظ بت پرستی کا مترادف اور ہم معنی ہو چکا تھا لہٰذا خداوندِ عالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ''حنیف'' کے عنوان سے توصیف کرنے کے بعد ''مسلماً'' اور '' وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ'' کہہ کر ہر قسم کے دوسرے احتمال کی نفی کر دی۔

(٦٨) خدا کے عظیم پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اہلِ کتاب کی باتوں کے خاتمے کے لئے قرآن نے یہاں ایک بنیادی بات کی ہے۔ ان میں سے ہر ایک انہیں اپنے میں سے سمجھتا تھا اور شاید وہ زیادہ تر اس عظیم پیغمبر سے قرابت کے مسئلہ کا سہارا لیتے تھے یا نسب و قومیت کو ان سے قربت کی دلیل سمجھتے تھے اس لئے قرآن نے وضاحت کی ہے کہ انبیاء سے دوستی اور ارتباط صرف ایمان اور ان کی پیروی کے ذریعے ہوتا ہے، اس بناء پر ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ نزدیک وہی لوگ ہیں جو ان کے مکتب کی پیروی کرتے ہیں اور ان کے اہداف و مقاصد کے زیادہ وفادار ہیں چاہے یہ وہ لوگ جو ان کے زمانے میں موجود تھے ''لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا'' اور چاہے وہ لوگ جو ان کے بعد ان کے مکتب اور پروگرام کے وفادار رہے۔ مثلاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروکار۔ اس کی دلیل بھی واضح ہے اور وہ یہ کہ انبیاء کا احترام ان کے مکتب و مذہب کی وجہ سے تھا نہ کہ ان کی قوم، قبیلے اور نسب کے سبب۔

لہٰذا ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ اہلِ کتاب اپنے مشرکانہ عقائد کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کی سب سے اہم بنیاد ہی سے منحرف ہو گئے ہیں جب کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمان اس بنیاد پر قائم ہیں اور اس اصل کو اسلام کے تمام اصول و فروع میں وسعت دیتے ہوئے اس کے مخلص ترین وفادار ہیں۔ اس لئے یہ اعتراف کرنا چاہئے کہ ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ قریب یہ لوگ ہیں نہ کہ وہ۔

آیت کے آخر میں خدا عظیم پیغمبروں کے مکتب کے حقیقی پیروکاروں کو بشارت دی گئی ہے کہ خدا ان کا ولی، سرپرست، محافظ، یاور اور نگہبان ہے۔

(۶۹)وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ	اہل کتاب (یہود) کا ایک گروہ چاہتا تھا کہ تمہیں گمراہ کر دے لیکن وہ اپنے آپ کو ہی گمراہ کرتے ہیں مگر سمجھتے نہیں۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ بعض یہودیوں کی کوشش تھی کہ پاک دل مسلمانوں میں سے مشہور افراد مثلاً معاذ اور عمار وغیرہ کو اپنے دین کی طرف دعوت دیں اور شیطانی وسوسوں کے ذریعے انہیں اسلام سے موڑ لیں۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

مندرجہ بالا آیت میں دشمنوں کی اس سازش سے باخبر کیا گیا ہے۔ نیز انہیں کہا گیا ہے کہ وہ اس بے جا کوشش سے دست کش ہو جائیں۔ اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مکتبِ پیغمبر ﷺ میں ان مسلمانوں کی تربیت اس حساب اور آگاہی سے ہوئی ہے کہ ان کے لوٹ جانے کا کوئی احتمال نہیں۔ انہوں نے اسلام کو دل و جان سے اپنا لیا ہے انہوں نے اس عظیم انسانی مکتب سے گہرا قلبی لگاؤ پیدا کر لیا ہے اور وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ لہٰذا دشمن انہیں گمراہ نہیں کر سکتے بلکہ وہ تو فقط اپنے تئیں گمراہ کرتے ہیں اور یہ اس لئے کہ وہ شبہات پیدا کرتے ہیں، اسلام اور پیغمبر ﷺ کی طرف غلط نسبتیں دیتے ہیں یوں وہ خود بد نیتی کی روح اپنے وجود میں پروان چڑھاتے ہیں۔

(۷۰)يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ	اے اہل کتاب! کیوں آیات خدا سے کفر کرتے ہو جب کہ (ان کی صحت وصداقت) کی گواہی (بھی) دیتے ہو۔
(۷۱)يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۧ	اے اہل کتاب حق کو باطل سے کیوں ملاتے ہو اور (انہیں مشتبہ کرتے ہو تا کہ لوگ سمجھ نہ سکیں اور گمراہ ہو جائیں) اور حقیقت چھپاتے ہو حالانکہ تمہیں معلوم ہے۔

تفسیر

یہاں بھی روئے سخن اہلِ کتاب کی طرف ہے کہ وہ اپنی دشمنی اور ہٹ دھرمی سے کیوں دست کش نہیں ہوتے اور تورات و انجیل میں پیغمبر اسلام ﷺ کی نشانیاں پڑھنے اور ان سے علم و آگاہی رکھنے کے باوجود انکار کی راہ کیوں اختیار کرتے ہیں۔

(۷۱) دوبارہ اہلِ کتاب کو ڈرایا گیا ہے کہ وہ کیوں حق و باطل کو ایک دوسرے سے ملا دیتے ہیں اور علم رکھنے کے باوجود

حقیقت کو کیوں چھپاتے ہیں اور تورات وانجیل کی وہ آیات جن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعارف کروایا گیا ہے اور وہ جو ان کی حقانیت کی نشانیاں ہیں انہیں کیوں چھپاتے ہو۔

درحقیقت پہلی آیت میں علم وآ گاہی کے باوجود راہِ حق سے خود ان کے انحراف پر مواخذہ کیا گیا ہے اور دوسری آیت میں دوسرے لوگوں کو منحرف کرنے پر۔

(۷۲)وَ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ج صلے	اہل کتاب (یہود) کی ایک جماعت نے کہا (جاؤ اور) جو کچھ مومنین پر نازل ہوا ہے (ظاہراً) دن کی ابتداء میں اس پر ایمان لے آؤ اور دن کے آخر میں کافر ہو جاؤ (اور لوٹ آؤ) شاید وہ۔ برگشتہ ہو جائیں۔
(۷۳)وَ لَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ ط قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ لا اَنْ یُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ اَوْ یُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ط قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ ج یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ط وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ج لا	اور سوائے اس شخص کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتا ہے اور کسی پر ایمان نہ رکھو کہو کہ ہدایت تو وہ ہے جو خدا کی طرف سے ہو۔ یہ نہ سمجھنا کہ کسی کو تمہاری طرح آسمانی کتاب دی جائے گی یا یہ کہ تمہارے پروردگار کے دربار میں کوئی تم سے بحث کر سکے گا۔ کہہ دو کہ فضل نبوت عقل اور منطق کی عطا کسی میں منحصر نہیں ہے بلکہ وہ خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور خدا واسع (وسیع عطیات وعنایات کا مالک) اور آ گاہ ہے۔
(۷۴) یَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ط وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ	جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے نوازتا ہے اور اللہ عظیم عنایات وفضل کا مالک ہے۔

شانِ نزول

بعض گذشتہ مفسرین نے نقل کیا ہے کہ خیبر اور دیگر مقامات کے بارہ یہودی علماء نے مل کر بعض مومنین کا ایمان متزلزل کرنے کے لئے ایک سازش بنائی۔ انہوں نے پروگرام بنایا کہ ایک صبح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ظاہراً ایمان لے آئیں اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کریں لیکن دن کے آخر میں اس دین سے پلٹ جائیں اور جب ان سے پوچھا جائے کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟ تو کہیں کہ ہم نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صفات کو قریب سے دیکھا ہے لیکن جب اپنی دینی

کتب کی طرف رجوع کیا ہے یا اپنے علماء سے مشورہ کیا ہے تو دیکھا ہے کہ ان کی صفات اور طور طریقے اس سے مطابقت نہیں رکھتے جو کچھ ہماری کتب میں ہے لہٰذا ہم اپنے دین کی طرف پلٹ آئے ہیں۔

یہودی علماء کا خیال تھا کہ اس طرح بعض مسلمان کہیں گے کہ چونکہ یہ لوگ ہماری نسبت آسمانی کتب کا زیادہ علم رکھتے ہیں اس لئے جو کچھ یہ کہتے ہیں یقیناً سچ اور حق ہے اور یوں وہ متزلزل ہو جائیں گے۔

تفسیر

مندرجہ بالا آیت یہودیوں کی ایک اور تباہ کن سازش سے پردہ اٹھاتی ہے اور نشاندہی کرتی ہے کہ وہ مسلمانوں کا ایمان متزلزل کرنے کے لئے ہر ذریعہ استعمال کرتے تھے۔ایک گروہ کے اراکین جنہیں قرآن نے ''طَآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ'' کہا ہے آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے: آؤ اور جو کچھ مسلمانوں پر نازل ہوا ہے دن کے آغاز میں اس پر ایمان لے آئیں اور دن کے آخر میں اس سے پلٹ آئیں۔بعید نہیں کہ دن کے آغاز واختتام سے مراد اتنی کم مدت ہو کہ لوگ کہہ سکیں کہ وہ اسلام کو دور سے کچھ اور سمجھتے تھے لیکن نزدیک سے کچھ اور پایا ہے۔اس لئے بہت ہی جلد پلٹ آئے ہیں ان کا خیال تھا کہ یہ ایمان وکفر کم از کم نئے مسلمانوں کے اعتقاد کی بنیادیں تو ضرور ہلا دے گا۔یہی وجہ ہے کہ انہیں اپنی ماہرانہ سازش کی کامیابی کی بہت امید تھی اور ان کی اسی امید کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

(۷۳) انہوں نے تاکید کی کہ تمہارا ایمان فقط ظاہری ہونا چاہئے اور تمہارا رشتہ اپنے دین کے پیروکاروں سے ہونا چاہئے۔بعض تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ خیبر کے یہودیوں نے مدینہ کے یہودیوں کو وصیت کی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو تم ان لوگوں کے زیر اثر آجاؤ جو پیغمبر اسلام ﷺ کے زیادہ قریب ہیں اور یوں ان پر ایمان لے آؤ کیونکہ ان کا عقیدہ اور نظریہ تھا کہ نبوت صرف نسلِ یہود میں رہے گی اور اگر کوئی پیغمبر ظہور کرے تو اسے یہودیوں میں سے ہونا چاہئے۔

''قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ''

یہ جملہ اصطلاح میں ایک جملہ معترضہ ہے جو پروردگار کی طرف سے ہے جب کہ اس سے پہلے اور بعد والے جملے میں یہودیوں کی گفتگو نقل کی گئی ہے۔

یہودیوں کی گفتگو کے درمیان زیرِ نظر جملے میں خدا تعالیٰ نے انہیں ایک مختصر اور جامع جواب دیا ہے کہ ہدایت تو خدا کی طرف سے ہے اور وہ کسی خاص نسل اور قوم میں منحصر نہیں ہے اور کوئی ضروری نہیں کہ پیغمبر صرف یہود میں سے ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ جنہیں پروردگار کی ہر قسم کی ہدایت میسر ہے وہ ان سازشوں سے متزلزل نہیں ہوں گے اور یہ تخریبی منصوبے ان پر انداز نہیں ہو سکتے۔

''قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ......''

یہ یہودیوں کی گفتگو کا آخری حصہ ہے۔اس جملے کی ابتدا میں ''و لا تصدّقوا'' (اعتراف اور اعتماد نہ کرو) مقدر ہے۔

اس بنا پر اس جملے کا معنی یہ ہوگا کہ کبھی یہ باور نہ کرو ساری دنیا کے لوگوں میں سے کوئی شخص وہ افتخار اور امتیاز اور آسمانی کتب

جو تمہیں نصیب ہیں، لے سکے گا اور یہ بھی باور نہ کرو کہ کوئی شخص روزِ قیامت درگاہِ خداوندی میں تم سے مباحثہ اور گفتگو کر کے تمہیں مغلوب کر سکے گا کیوں کہ تم دنیا کی بہترین قوم اور خاندان ہو نیز نبوت، عقل، درایت، منطق اور استدلال صرف تمہارے پاس ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہودی اس فضول منطق کے ذریعے خدا سے اپنا ارتباط ظاہر کرتے اور تمام قوموں سے اپنے تئیں برتر سمجھتے تھے اسی لئے بعد والے جملے میں خدا تعالیٰ نے انھیں صراحت سے جواب دیا ہے۔

کہئے کہ مقام نبوت ہو، عقلی و منطقی استدلال ہو یا کوئی اور امتیاز، سب فضل و عطا خدا کی طرف سے ہے وہ جسے چاہتا ہے اور اہل سمجھتا ہے اسے نوازتا ہے۔ کسی نے اس سے عہد و پیمان نہیں لے رکھا اور نہ ہی کوئی اس سے قرابت یا رشتہ داری رکھتا ہے اس کا جود و عطا واسع ہے اور استحقاق کے مواقع سے وہ علیم و آگاہ ہے۔

(۷۴) اس آیت میں بھی گذشتہ بحث کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا جسے چاہتا ہے اور اہل سمجھتا ہے اپنی مخصوص رحمتوں سے نوازتا ہے (اور مقام نبوت و منصب رہبری بھی اس کی رحمتوں میں سے ہیں) اور کوئی شخص انہیں محدود نہیں کر سکتا اور ہر حالت میں عنایات، عطیات اور فضلِ عظیم اسی کی طرف سے ہے۔

پرانی سازشیں

مندرجہ بالا آیات دراصل قرآن کی پر اعجاز آیات ہیں جو یہودیوں اور دشمنان اسلام کے اسرار سے پردہ اٹھاتی ہیں اور ان کی صدر اول میں مسلمانوں کو متزلزل کرنے کی سازشوں کو فاش کرتی ہیں ان کی وجہ سے مسلمان بیدار ہو گئے اور دشمن کے تباہ کن وسوسوں سے بچ گئے۔ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ موجودہ دور میں بھی اسلام کے خلاف ایسے ہی منصوبے بنتے رہتے ہیں۔ دشمن کے ذرائع ابلاغ جو پوری دنیا میں سب سے قوی ہیں اس سلسلے میں استعمال ہو رہے ہیں۔ دشمنوں کی کوشش ہے کہ اصل اسلام خصوصاً ان کی نوجوان نسل کے افکار کو اسلامی عقائد سے متزلزل کر دیں۔ وہ اس کے لئے عالم، دانشور، مؤرخ، سائنسدان، صحافی یہاں تک کہ فلمی اداکار کا بھیس بھی استعمال کرتے ہیں۔

وہ یہ حقیقت نہیں چھپاتے کہ ان کے پراپیگنڈا کا مقصد مسلمانوں کو یہودی یا عیسائی بنانا نہیں بلکہ ان کا ہدف نوجوانوں کو اسلامی عقائد سے برگشتہ کرنا ہے اور انہیں اپنے دین اور ثقافت کے مفاخر سے لاتعلق کرنا ہے۔ قرآن آج مسلمانوں کو ان سازشوں سے ہوشیار رہنے کی دعوت دیتا ہے۔

(۷۵)وَ مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ مَنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِقِنۡطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيۡكَ‌ۚ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِدِيۡنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيۡكَ اِلَّا مَا دُمۡتَ عَلَيۡهِ قَآئِمًا‌ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡا لَيۡسَ عَلَيۡنَا فِى الۡاُمِّيّٖنَ سَبِيۡلٌ‌ۚ وَ يَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ	اور اہل کتاب میں سے کچھ ایسے بھی ہیں کہ اگر تم انہیں بہت سی دولت بطور امانت دو تو وہ تمہیں لوٹا دیں گے اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ اگر انہیں ایک دینار بھی سپرد کرو تو وہ تمہیں ہرگز واپس نہ کریں گے مگر اس وقت تک جب تک تم ان کے سر پر کھڑے رہو (اور ان پر مسلط رہو) یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم امیین (یہودیوں کے علاوہ) کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں اور خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں حالانکہ جانتے ہیں۔
(۷۶)بَلٰى مَنۡ اَوۡفٰى بِعَهۡدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَّقِيۡنَ	جی ہاں جو شخص اپنے عہد و پیمان پورے کرے اور پرہیز گاری اختیار کرے خدا پرہیز گاروں کو پسند کرتا ہے۔

شانِ نزول

یہ آیت دو یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ان میں سے ایک امین اور صحیح آدمی تھا اور دوسرا خائن اور پست فطرت۔ پہلا شخص عبداللہ بن سلام تھا۔اس کے پاس ایک دولت مند نے ۱۲۰۰ اوقیہ (''اوقیہ'' ''اواقی'' کی جمع ہے۔رطل کے بارہویں حصہ کو کہتے ہیں جو سات مثقال کے برابر ہوتا ہے) سونا بطور امانت رکھا تھا۔عبداللہ نے وہ سب معین موقع پر واپس کر دیا۔

دوسرا شخص فخاص بن عازورا تھا۔ایک قریشی نے اس کے پاس ایک دینار بطورِ امانت رکھا۔فخاص نے اس میں خیانت کی۔اس کی خیانت کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے زیرِ آیت میں اس کی مذمت کی ہے۔

تفسیر

یہ آیت اہل کتاب کے ایک اور چہرے سے نقاب پلٹتی ہے اور وہ یہ کہ بعض یہودی عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ دوسروں کی امانتوں کے جواب دہ نہیں ہیں یہاں تک کہ وہ سمجھتے تھے کہ انہیں حق پہنچتا ہے کہ وہ امانتوں کو اپنی ملکیت بنالیں۔

وہ کہتے تھے: ہم اہل کتاب ہیں، پیغمبر ہم میں سے ہیں اور آسمانی کتاب ہمارے پاس ہے لہٰذا دوسروں کے اموال ہمارے لئے کوئی احترام نہیں رکھتے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ آیت تصریح کرتی ہے کہ تمام اہلِ کتاب اس غیر انسانی طرزِ فکر کے موافق نہیں تھے بلکہ ان میں سے

بعض لوگ دوسروں کے حقوق ادا کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ یہ اس امر کی علامت ہے کہ قرآن ہرگز نہیں چاہتا کہ ایک گروہ کی غلط کاری کی بناء پر سب کی مذمت کی جائے اسی لئے فرمایا گیا ہے:

''بعض اہل کتاب ایسے ہیں کہ اگر انہیں کثیر دولت بھی امانت کے طور پر دی جائے تو وہ واپس کر دیں گے اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ اگر ایک دینار بھی امانت کے طور پر سپرد کر دیں تو وہ لوٹاتے نہیں مگر یہ کہ کوئی ان کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہو''۔

'' اِلَّا مَا دُمۡتَ عَلَيۡهِ قَآئِمًا ''....(یعنی۔۔جب تک تم ان کے سر پر مسلط نہ رہو) آیت کے اس حصے سے یہودیوں کے بارے میں ایک کلی اصول بھی معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ان میں سے بہت سے لوگ ایسے ہیں جو دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کے بارے میں وہ طاقت وقدرت کے علاوہ کسی طریقے کو نہیں پہچانتے۔مسلمانوں کے پاس ان سے اپنے حقوق کے حصول کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ وہ طاقت حاصل کریں۔اسی طرح یہودی ان کے حقوق ادا کرنے کے لئے آمادہ ہوسکیں گے حالیہ سالوں میں ایشیا میں جو بہت سے حوادث رونما ہوئے ہیں انہوں نے یہ حقیقت پایہ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ عالمی رائے عامہ دنیا بھر کے لوگوں کے افکار ونظریات اور حق وعدالت اور ایسی کوئی چیز ہمارے دشمنوں کے لئے کوئی مفہوم نہیں رکھتی اور وہ صرف طاقت کے سامنے جھکتے ہیں۔کسی اور چیز کو خاطر میں نہیں لاتے اور یہ ان قابلِ توجہ حقائق میں سے ایک ہے جن کی قرآن میں پیش گوئی کی گئی ہے۔

''ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡا لَيۡسَ عَلَيۡنَا فِى الۡاُمِّيّٖنَ سَبِيۡلٌ''

اس جملے میں ان کی وہ منطق بیان کی گئی ہے جو وہ دوسروں کا مال کھانے کے لئے اختیار کئے ہوئے تھے اور وہ یہ کہ ''اھل کتاب'' ''امّیّن'' (مشرکین اور عرب جو عموماً لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے) پر برتری رکھتے ہیں لہٰذا کوئی حرج نہیں اگر اہلِ کتاب ان کے مال کو اپنی ملکیت بنالیں۔ان کا عقیدہ تھا کہ اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا یہاں تک کہ اس جھوٹے امتیاز کی وہ خدا کی طرف نسبت دیتے تھے۔

مسلم ہے کہ یہ منطق تو امانت میں خیانت کرنے سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ وہ خود کو اس معاملے میں حق بجانب سمجھتے تھے قرآن ان کے جواب میں صراحت سے کہتا ہے: وہ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں اور اس کی طرف ناروا نسبت دیتے ہیں۔وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کی آسمانی کتب میں دوسروں کے مال میں خیانت کرنے کی کوئی اجازت نہیں دی گئی لیکن وہ اپنے برے اعمال کی توجیہ کے لئے ایسی دروغ سازی کرتے ہیں اور اس کی نسبت خدا کی طرف دیتے ہیں۔

اس دور میں بھی جو لوگ انسانوں کی قسمت سے کھیل رہے ہیں، انسانی حقوق پامال کرتے ہیں اور تمام اصول اور معاہدے ان کے لئے بازیچہ اطفال ہیں اور انہیں فقط اپنی خوشحالی سے غرض ہے، شاید یہ بھی اسرائیلی منطق پر کاربند ہیں۔

اس کے برعکس قرآن نسلی اور شخصی پہلوؤں کو اہم نہیں سمجھتا اور خدا کے حقیقی دوست انہیں قرار دیتا ہے جو گناہ سے دور رہتے ہیں، معاشرے کے حقوق کا احترام کرتے ہیں اور اپنے مقام ومنصب سے غلط فائدہ نہیں اٹھاتے۔

آیت میں دراصل انسان کی حقیقی قیمت اور خدا کی دوستی کی میزان ایفائے عہد بالخصوص امانت میں خیانت نہ کرنے اور ہر موقع پر تقویٰ اختیار کئے رہنے کو قرار دیا ہے۔

آج بھی ایسے شواہد موجود ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ اس منصب کے پیروکاروں کی ایک جماعت دنیا کے دیگر انسانوں کے بارے میں وہی عقیدہ رکھتی ہے اور دوسروں کے مال و دولت اور تمام چیزوں کو اپنے لئے مباح سمجھتی ہے۔ یہ شواہد قرآن کی عظمت اور اس کی منطق کی اصالت کی دلیل ہیں۔

یہ شواہد ان سے متعلقہ مقالوں اور مختلف کتب میں جمع کیے گئے ہیں۔ شوق رکھنے والے ان سے رجوع کر سکتے ہیں۔

(۷۷)اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِکَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَ لَا یُکَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَ لَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَکِّیْهِمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ	جو لوگ خدا سے باندھا ہوا عہد و پیمان اور اپنی قسموں کو تھوڑی سی قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا خدا ان سے بات نہیں کرے گا قیامت کے دن ان کی طرف (رحمت کی) نظر نہیں کرے گا انہیں (گناہ سے) پاک نہیں کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

شانِ نزول

بعض علماء یہود نے جن میں ابو رافع، حی بن اخطب اور کعب بن اشرف شامل تھا جب دیکھا کہ ان کی اجتماعی حیثیت یہودیوں کے درمیان خطرے میں ہے تو کوشش کی کہ تورات میں آخری پیغمبر کے بارے میں جو نشانیاں تھیں اور تورات کے جو نسخے خود انہوں نے لکھے تھے ان میں تحریف کر دیں یہاں تک کہ وہ اس بات پر قسم کھا جاتے کہ وہ تحریف شدہ جملے خدا کی طرف سے ہیں۔ اسی بنا پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انہیں شدت سے خطرے کا الارم دیا گیا۔

تفسیر

اس آیت میں یہود اور اہلِ کتاب کی بعض غلط کاریوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ البتہ آیت چونکہ عمومی ہے اس لئے ان سب کے بارے میں ہے جن میں صفات موجود ہوں۔

آیت کہتی ہے: جو لوگ خدا سے باندھے ہوئے عہد و پیمان اور اس کے مقدس نام کی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچتے ہیں وہ متعدد سزاؤں میں گرفتار ہیں۔

پہلی یہ کہ وہ عالم آخرت کی بے شمار نعمتوں سے قابل دید فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔

دوسری یہ کہ خدا تعالیٰ روز قیامت صاحبانِ ایمان سے گفتگو کرے گا لیکن ایسے افراد سے کوئی کلام نہیں کرے گا۔

تیسری یہ کہ اس دن ان سے اپنی نگاہِ لطف و کرم اٹھا لے گا۔

چوتھی یہ کہ اس طرح انہیں گناہ کی آلودگیوں سے پاک نہیں کرے گا۔

پانچویں یہ کہ اسی بناء پر ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

''ثَمَنًا قَلِیْلًا''(کم قیمت) سے مراد یہ ہے کہ انہیں ان عظیم گناہوں کے بدلے جو بھی مادی قیمت حاصل ہو جائے کم اور ناچیز ہے اگر چہ وہ وسیع حکومت ہی کیوں نہ ہو۔

واضح ہے کہ خدا کی گفتگو سے مراد زبان سے گفتگو نہیں ہے کیونکہ خدا تعالیٰ جسم وجسمانیت سے منزہ ومبرّہ ہے بلکہ اس سے مراد دل میں الہام کے ذریعے گفتگو ہے یا فضا میں صوتی موجوں کو ایجاد کرنا ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور سے گفتگو سنی تھی۔

جس نکتے کی توجہ ضروری ہے یہ ہے عہد شکنی اور جھوٹی قسموں سے پیدا ہونے والے نتائج جن کا آیت میں ذکر ہے خدا سے قرب وبعد کے تدریجی مراحل ہیں۔

(۷۸)وَ اِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِيۡقًا يَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡكِتٰبِ لِتَحۡسَبُوۡهُ مِنَ الۡكِتٰبِ وَ مَا هُوَ مِنَ الۡكِتٰبِ ۚ وَ يَقُوۡلُوۡنَ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ وَ مَا هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ۚ وَ يَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَ هُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ	ان (یہود) میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو (خدا کی) کتاب کی تلاوت کے وقت اپنی زبان یوں پھیرتے ہیں کہ تم گمان کرنے لگو کہ (جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں) کتاب خدا میں سے ہے حالانکہ وہ کتاب خدا میں سے نہیں ہوتا یہاں تک کہ وہ صراحت سے کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے جب کہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا اور وہ خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں حالانکہ جانتے ہیں۔

تفسیر

''يَلۡوُوۡنَ''، ''لیّ'' (بروزن ''حیّ'') سے ہے، اس کا معنی ہے پیچ وخم کھانا۔ یہ آیت درحقیقت گذشتہ آیات کی تاکید کے طور پر آئی ہے۔ اس آیت کی شانِ نزول بھی گذشتہ آیات کی شانِ نزول سے مشابہ ہے۔ یہودیوں کا ایک گروہ کتاب خدا پڑھتے وقت اپنی زبان کو پیچ وخم دیتا ہے اور ٹیڑھا کرتا ہے یہ تعبیر کلام خدا میں تحریف کرنے سے خوبصورت کنایہ ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے؛ وہ یہ کام ایسے ماہرانہ طریقہ سے انجام دیتے ہیں کہ تمہیں گمان ہوگا کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں خدا کی طرف سے نازل شدہ آیات ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

وہ اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ صراحت سے کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے نازل شدہ ہے جب کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

قرآن دوبارہ کہتا ہے کہ اس سلسلے میں انہیں اشتباہ نہیں ہوا بلکہ وہ جان بوجھ کر جھوٹ باندھتے ہیں اور جانتے بوجھتے ہوئے وہ یہ بہتان باندھتے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ منحرف عالم ایک ملت کے لئے کتنا خطرناک اور ضرر رساں ہوتا ہے۔

(۷۹)مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۙ	کسی شخص کو زیب نہیں دیتا کہ خدا آسمانی کتاب، حکم اور نبوت اسے دے اور پھر وہ لوگوں سے کہتا پھرے کہ خدا کو چھوڑ کر میری عبادت کرو (بلکہ وہ کہے) خدا والے بنو جیسا کہ کتاب خدا کی تعلیم ہے اور جیسے تم نے درس پڑھا ہے۔
(۸۰)وَ لَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَ النَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۧ	اور نہ یہ کہ تمہیں حکم دے کہ فرشتوں اور انبیاء کو اپنا پروردگار بنا لو تو کیا وہ تمہیں کفر کی طرف دعوت دیتا ہے جب کہ تم مسلمان ہو چکے ہو۔

شان نزول

ایک شخص پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ہم دوسروں کی طرح آپ پر سلام کرتے ہیں حالانکہ ہماری نظر میں ایسا احترام کافی نہیں۔ ہم تقاضا کرتے ہیں کہ آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم آپ کا امتیاز ملحوظ رکھیں اور آپ کو سجدہ کر لیا کریں۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: سجدہ خدا کے علاوہ کسی کے لئے جائز نہیں۔ اپنے پیغمبر کا ایک بشر کے طور پر احترام کرو لیکن ان (انبیاء) کا حق پہچانو اور ان کی پیروی کرو۔

تفسیر

اس سے پہلے ہم توجہ دلا چکے ہیں کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کی بری عادات میں سے ایک یہ تھی کہ وہ حقائق میں تحریف کر دیا کرتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں الوہیت کا دعویٰ انہی تحریفات سے میں ایک ہے۔ وہ کہتے تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خود ہمیں اس بات کا حکم دیا ہے بعض لوگ چاہتے تھے کہ یہی موہوم خیال وہ پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں رکھیں اور اس کی وجوہات کی طرف شانِ نزول میں اشارہ ہو چکا ہے۔ آیت نے انبیاء کی پرستش کی تجویز پیش کرنے والے ایسے تمام افراد کو صریح اور قطعی جواب دیا ہے۔

آیت کہتی ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ، کسی اور نبی یا فرشتوں میں سے کسی کی عبادت نہیں ہو سکتی اور اگر اہل کتاب یہ خیال کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں اپنی عبادت کی دعوت دی ہے۔ تو وہ اشتباہ کرتے ہیں۔

کسی انسان کو حق نہیں پہنچتا کہ خدا اسے آسمانی کتاب، علم و دانش اور نبوت سے نوازے اور وہ لوگوں کو اپنی عبادت کی دعوت دے، حالانکہ تمام انبیاء نے بالاتفاق لوگوں کو ایک اکیلے خدا کی دعوت دی ہے۔ یہ آیت نفی مطلق کے معنی میں ہے

یعنی خدا کی طرف سے بھیجے گئے لوگ جنہیں علم و حکمت کا وافر حصہ بخشا گیا ہے کسی وقت بھی بندگی اور عبودیت کے مرحلے سے تجاوز نہیں کریں گے۔ خدا کے بھیجے ہوئے رہبر ہمیشہ عام لوگوں کی نسبت بارگاہِ الٰہی میں زیادہ منکسر اور خاضع رہتے ہیں۔ لہٰذا وہ

بندگی اور توحید کی شاہراہ نہیں چھوڑ سکتے اور لوگوں کو شرک کے گڑھے میں نہیں پھینک سکتے۔

''وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ''

مندرجہ بالا جملے میں قرآن کہتا ہے کہ انبیاء کو زیبا نہیں کہ وہ لوگوں کو اپنی پرستش کی دعوت دیں۔ ان کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ لوگوں کو آیاتِ الٰہی کی ''تعلیم'' دیں اور حقائق کی تدریس کے ذریعے لوگوں کو علماء ربانی بنا دیں اور وہ ایسے لوگ تیار کریں جو خدا کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کریں اور علم و دانش اور معرفت کے سوا کسی چیز کی طرف دعوت نہ دیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ مذکورہ جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کا مقصد فقط افراد کی تربیّت کرنا نہ تھا بلکہ ان کا کام معلمین، تربیت کرنے والے اور مختلف گروہوں کے لئے رہبر تیار کرنا تھا۔ یعنی ایسے افراد تیار کرنا جن میں سے ہر کوئی ایک وسیع علاقے کو اپنے علم، ایمان اور دانش سے روشنی بخشے۔

(۸۰) اس آیت کی گفتگو گذشتہ بحث کی تکمیل ہے اس میں فرمایا گیا ہے: جیسے انبیاء لوگوں کو اپنی پرستش کی دعوت نہیں دیتے اسی طرح انہیں فرشتوں اور دیگر انبیاء کی عبادت کی دعوت بھی نہیں دیتے۔

ایک طرف تو یہ جملہ مشرکین عرب کا جواب ہے، جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے اور یوں ان کی ایک طرح سے ربوبیت کے قائل تھے پھر بھی اپنے تئیں دین کا پیرو بتاتے تھے، یونہی یہ ''صائبین'' کا بھی جواب ہے جو اپنے آپ کو ''حضرت یحیٰی علیہ السلام'' کا پیروکار بتاتے تھے اور فرشتوں کا مقام پرستش کی حد تک اوپر لے جاتے تھے۔

دوسری طرف یہ یہودیوں کا بھی جواب ہے جو ''حضرت عزیر علیہ السلام'' کو خدا کا بیٹا قرار دیتے تھے اور یوں ان کے لئے ربوبیت کے ایک حصے کے قائل تھے اور اس عقیدے کو پیغمبرانِ خدا کی طرف منسوب کرتے تھے۔

آیت ان سب کا جواب دیتی ہے کہ یہ بات کسی پیغمبر کے شایانِ شان ہرگز نہیں کہ وہ لوگوں کو غیرِ خدا کی ربوبیت کی طرف دعوت دیں۔

آخر میں فرمایا: کیا یہ ممکن ہے کہ پیغمبر تمہیں کفر کی دعوت دے جب کہ تم اسلام اور توحید کا راستہ اپنا چکے ہو۔

کہے بغیر واضح ہے کہ یہاں اسلام سے مراد دیگر بہت سے مواقع کی طرح اس کا وسیع معنی ہے یعنی فرمانِ خدا، ایمان اور توحید کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا۔

یعنی کیسے ممکن ہے کہ کوئی ایسا پیغمبر ہو جو پہلے تو لوگوں کو ایمان اور توحید کی دعوت دے اور پھر انہیں شرک کی راہ دکھائے یا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک پیغمبر دیگر تمام انبیاء کی زحمتوں کو بر باد کر دے جنہوں نے اسلام کی دعوت دی اور وہ لوگوں کو کفر و شرک کی طرف کیسے راغب کر سکتا ہے۔

ضمنی طور پر آیت عصمتِ انبیاء اور فرمانِ خدا سے ان کے انحراف نہ کرنے کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔

(۸۱)وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّ حِکْمَۃٍ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْھَدُوْا وَ اَنَا مَعَکُمْ مِّنَ الشّٰھِدِیْنَ	وہ وقت (یاد کرو) جب خدا نے انبیاء سے یہ تاکیدی عہد و پیمان لیا کہ جب میں تمہیں کتاب وحکمت دے دوں اس کے بعد تمہارے پاس ایک پیغمبر آئے جو اس کی تصدیق کرے جو تمہارے پاس ہے تو اس پر ایمان لے آنا اور اس کی مدد کرنا (پھر خدانے) کہا کیا اس چیز کا اقرار کرتے ہو اور اس پر تاکیدی عہد و پیمان باندھتے ہو انہوں نے کہا (جی ہاں) ہم اقرار کرتے ہیں (خدانے) کہا پس گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

تفسیر

مقدس عہد و پیمان

یہ آیت ایک عمومی بنیاد کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ گذشتہ انبیاء اوران کی اقتدا میں ان کے پیروکاروں نے خدا سے ایک عہد و پیمان باندھا تھا اور وہ یہ کہ وہ بعد میں آنے والے انبیاء ورسل کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں گے اوران پر ایمان لانے کے علاوہ ان کے اہداف ومقاصد کی پیش رفت کے لئے ان کی کسی قسم کی مدد سے دریغ نہیں کریں گے۔

دراصل جیسے انبیاء اوران کی امتیں گذشتہ انبیاء اوران کے دین کا احترام کرتے تھے اس طرح گذشتہ انبیاء اوران کی امتوں پر آنے والے انبیاء کے بارے میں ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ آیاتِ قرآن میں بار ہا پیغمبرانِ خدا کے مقاصد کی وحدت کی طرف اشارہ ہوا ہے، زیرِ نظر آیت بھی اس امر کا زندہ نمونہ ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں کہا گیا ہے: خدا نے انبیاء علیہم السلام سے میثاق لیا تھا ''میثاق'' دراصل ''وثوق'' کے مادہ سے ہے اوراس کا معنی ہے ''ایسی چیز جو اطمینان اوراعتماد کا سبب بنے'' عام طور پر ''تاکیدی عہد و پیمان'' کو میثاق کہتے ہیں۔

انبیاء سے پیمان لینا فطری طور پر ان کے پیروکاروں سے بھی پیمان لینے کے مترادف ہے۔ مذکورہ عہد و پیمان کا مطلب یہ تھا کہ اگر کوئی ایسا پیغمبر آئے جس کی دعوت سے ہم آہنگ ہو اور یوں اس کی حقانیت ثابت ہو جائے تو انہیں چاہئے کہ اس پر ایمان لائیں اوراس کی مدد کریں۔ اس بات کی تاکید کے لئے فرمایا گیا ہے: کیا تم اس پیمان کا اقرار کرتے ہو اور میرے عہد کو قبول کرتے ہو اور کیا اپنے پیروکاروں سے اس سلسلے میں تم نے پیمان لیا ہے؟ انہوں نے اس کے جواب میں کہا: جی ہاں! ہم اعتراف کرتے ہیں۔

پھر خدا تعالیٰ نے اس اہم امر کی تاکید کے لئے انہیں دوبارہ فرمایا: تم اس امر پر گواہ رہو اور میں بھی تم پر اور تمہارے پیروکاروں پر گواہ ہوں۔

(۸۲)فَمَنۡ تَوَلّٰى بَعۡدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ	اس بناء پر جوشخص اس (مستحکم پیمان) کے بعد منہ پھیر لے وہ فاسقین میں سے ہوگا۔

تفسیر

اس آیت میں قرآن مجید کہتا ہے کہ ان سب تاکیدوں، اصرار اور مستحکم عہد و پیمان کے بعد بھی جو لوگ پیغمبر آخر الزمان ﷺ جیسے نبی پر ایمان لانے سے روگردانی کریں، جن کے ظہور کی نشانیاں گذشتہ کتب میں آ چکی ہیں تو وہ لوگ فاسق اور حکمِ خدا سے خارج ہیں۔اور ہم جانتے ہیں کہ خدا اس طرح کے ہٹ دھرم افراد کو ہدایت نہیں کرتا ہے جس طرح سورہ توبہ آیت ۸۰ میں آیا ہے کہ جو شخص مشمولِ ہدایت الٰہی نہیں ہوا ہے وہ جہنم میں عذابِ الٰہی میں مبتلا ہے۔

(۸۳)اَفَغَيۡرَ دِيۡنِ اللّٰهِ يَبۡغُوۡنَ وَلَهٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّ كَرۡهًا وَّ اِلَيۡهِ يُرۡجَعُوۡنَ	کیا وہ لوگ دین خدا کے علاوہ کوئی چیز چاہتے ہیں (اس کا دین تو اسلام ہے) اور تمام لوگ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اختیار یا مجبوری سے اس کے سامنے تسلیم ہیں اور وہ اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔
(۸۴)قُلۡ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا وَ مَاۤ اُنۡزِلَ عَلٰٓى اِبۡرٰهِيۡمَ وَ اِسۡمٰعِيۡلَ وَ اِسۡحٰقَ وَ يَعۡقُوۡبَ وَ الۡاَسۡبَاطِ وَ مَاۤ اُوۡتِىَ مُوۡسٰى وَ عِيۡسٰى وَ النَّبِيُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّهِمۡ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ وَ نَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ	کہہ دو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور اس پر (بھی) جو ہم پر، ابراہیم پر، اسماعیل پر، اسحٰق پر، یعقوب پر اور اسباط پر نازل ہوا ہے اور اس پر جو موسیٰ، عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا ہے ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے اور اس کے (فرمان) کے سامنے تسلیم ہیں۔
(۸۵)وَ مَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ ۚ وَ هُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ	اور جو کوئی اسلام کے علاوہ اپنے لیے کوئی دین انتخاب کرے تو وہ اس سے قبول نہیں ہوگا اور آخرت میں وہ زیاں کاروں میں سے ہوگا۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں اب تک گذشتہ مذاہب کے بارے میں تفصیلی بحث ہوئی ہے اب یہاں سے اسلام کے بارے میں بحث شروع ہوتی ہے اور اہلِ کتاب اور دیگر گذشتہ ادیان کے پیروکاروں کی توجہ اس کی طرف مبذول کروائی گئی ہے۔

زیرِ نظر آیات میں سے پہلی میں قرآن کہتا ہے: کیا یہ لوگ خدا کے دین کے سوا کوئی اور چیز چاہتے ہیں، خدا کا دین تو قوانین

الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے علاوہ کچھ اور نہیں اور یہ بات کامل اور جامع صورت میں پیغمبر اسلام ﷺ کے دین میں موجود ہے لہٰذا وہ اگر دینِ حقیقی کی تلاش میں ہیں تو انہیں مسلمان ہو جانا چاہئے۔

اسلام تمام موجوداتِ عالم کا دین ہے

قرآن نے ایک مرتبہ پھر اسلام کو زیادہ وسیع معنی میں پیش کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے: تمام آسمانوں اور زمین والے یا آسمان و زمین میں موجود تمام موجودات مسلمان ہیں اور وہ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ طوعاً کرھاً (اختیار سے یا جبر سے) کی تعبیر کا مطلب ہے کہ پروردگار کے سامنے سر جھکانا کبھی ''اختیاری'' اور ''تشریعی قوانین'' کے ذریعے ہوتا ہے اور کبھی ''اجباری'' اور ''تکوینی قوانین'' کے ذریعے۔

(۸۴) اس آیت میں خدا تعالیٰ نے پیغمبر اکرم ﷺ اور مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ جو کچھ پیغمبر اسلام ﷺ پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان لانے کے علاوہ ان تمام آیات اور تعلیمات پر بھی عقیدہ رکھو جو گذشتہ انبیاء پر نازل ہوئیں اور کہو کہ ہم ان میں حقانیت اور خدا سے ارتباط کے لحاظ سے کسی قسم کے فرق کے قائل نہیں ہیں۔ ہم سب کو حقیقی طور پر (خدا کا نمائندہ) سمجھتے ہیں، سب خدا کے بھیجے ہوئے رہبر ہیں، سب مخلوق کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے ہیں اور ہم حکم خدا کے سامنے تسلیم ہیں لہٰذا اس طرح سے ہم تفرقہ اندازی سے اپنا ہاتھ کھینچے ہوئے ہیں۔

(۸۵) لفظ ''یبتغ'' ''ابتغاءٌ'' کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے کوشش اور جستجو کرنا، یہ شائستہ اور ناشائستہ ہر موقع کے لئے استعمال ہوتا ہے یہاں پر لفظ بحث کو نتیجہ پر پہنچانے کے لئے استعمال ہوا ہے اور وہ یہ کہ حقیقی دین اور آئین ''اسلام'' ہی ہے یعنی خدا کے سامنے سر ''تسلیم'' خم کرنا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو نسل، زبان، قومی تعصّبات اور ایسی تمام چیزوں سے بالا تر ہے اور جو لوگ ایسی واقعیت کے علاوہ کسی چیز کو دین کے طور پر مان لیں وہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی بلکہ اس کے بدلے انہیں سزا بھی دی جائے گی۔ وہ آخرت میں زیاں کاروں میں ہوگا، کیونکہ اس نے اپنے وجود کا سرمایہ غیر مناسب خرافات وتقلید، جاہلانہ تعصّبات اور نسل پرستی کے عوض بیچ دیا۔ مسلّم ہے کہ ایسے معاملے میں وہ نقصان و زیاں ہی میں مبتلا ہوگا اور قیامت میں انسانی وجود کے سرمائے کے نقصان کا نتیجہ محرومیوں اور سزا و عذاب کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

(۸۶) كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ	خدا ان لوگوں کو کیونکر ہدایت کرے جو ایمان لانے، رسول کی حقانیت کی گواہی دینے اور ان کے لئے واضح نشانیاں آ جانے کے بعد کفر کریں اور خدا ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا۔

(۸۷)اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُھُمۡ اَنَّ عَلَیۡھِمۡ لَعۡنَۃَ اللّٰہِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ وَ النَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ	ان کا بدلہ یہ ہے کہ ان پر اللہ، ملائکہ اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔
(۸۸)خٰلِدِیۡنَ فِیۡھَا لَا یُخَفَّفُ عَنۡھُمُ الۡعَذَابُ وَ لَا ھُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ	وہ ہمیشہ اس لعنت میں (مبتلا) رہیں گے ان کے عذاب میں تخفیف نہیں ہوگی اور انہیں مہلت نہیں دی جائے گی۔
(۸۹)اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ وَ اَصۡلَحُوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ	مگر وہ لوگ کہ جو بعد ازاں توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کر لیں کیونکہ خدا بخشنے والا اور رحیم ہے۔

شان نزول

(مدینہ کے مسلمانوں میں سے) ایک انصاری حارث بن سوید تھا اس کے ہاتھوں ہذر بن زیاد نامی ایک بے گناہ قتل ہوگیا۔ وہ سزا کے خوف سے مرتد ہوگیا اور مکہ کی طرف بھاگ گیا۔ مکہ میں پہنچا تو اپنے کام سے سخت پریشان ہوا اور سوچنے لگا اب کیا کروں۔ اس نے سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ ایک آدمی کو مدینہ میں اپنے رشتہ داروں کے پاس بھیجوں تا کہ وہ پیغمبر اکرم ﷺ سے سوال کریں کہ کیا اس کے لئے لوٹنے کا کوئی راستہ ہے یا نہیں۔

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں جن میں چند خاص شرائط کے ساتھ اس کی توبہ قبول ہونے کا تذکرہ ہے۔

تفسیر

یہ آیات ان لوگوں کے بارے میں ہیں جنہوں نے اسلام قبول کرلیا اور پھر اس سے پھر گئے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اصطلاح میں ''مرتد'' کہتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے: ایسے لوگوں کی ہدایت کے لئے خدا مدد نہیں کرتا کیونکہ ان لوگوں نے واضح علامات کے ذریعے پیغمبر ﷺ کو پہچان لیا ہے اور اس کی رسالت کی گواہی دی ہے۔ یہ لوگ اسلام سے عدول کر کے اور اس سے پھر کر ظالم اور ستمگر بن گئے ہیں اور خدا ظالموں اور ستمگروں کی ہرگز ہدایت نہیں کرتا۔

(۸۷) زیرِ نظر دوسری آیت میں ایسے لوگوں کی سزا بیان کی گئی ہے جو پہچاننے کے بعد حق سے عدول کرتے ہیں اور وہ (سزا) ہے پروردگار، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت۔

''**لعن**'' اصل میں دھتکارنے اور غیض و غضب کے ساتھ دور کرنے کے معنی میں ہے۔ لہٰذا پروردگار کی لعنت کا مطلب اس کی رحمت سے دوری ہے۔ باقی رہا فرشتوں اور لوگوں کی لعنت تو وہ غصہ، تنفر اور معنوی طور پر ہے یا پروردگار کی رحمت سے دور ہونے کی بددعا ہے۔

ایسے لوگ درحقیقت فساد اور گناہ میں اس طرح سے ڈوبے ہوتے ہیں کہ تمام عقلمندوں اور سارے جہان کے بامقصد افراد

چاہے انسان ہوں یا فرشتے سب کے تنفر کا ہدف بن جاتے ہیں۔

(۸۸) زیر نظر تیسری آیت میں مزید ارشاد ہوتا ہے کہ یہ لوگ صرف عمومی لعنت کا مرکز نہیں ہیں بلکہ ہمیشہ لعنت کا شکار رہیں گے۔ دراصل شیطان کی طرح ہیں جو ہمیشہ لعنت میں گرفتار رہتا ہے۔ مسلّم ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ دردناک اور ناقابلِ تخفیف عذاب میں مبتلا ہوں گے اور انہیں کسی قسم کی مہلت نہیں دی جائے گی۔

(۸۹) زیرِ نظر آخری آیت مندرجہ بالا احکام میں استثنائی صورت بیان کرتی ہے۔ اس آیت نے ایسے افراد کے لوٹ آنے کی راہ کھول دی ہے لیکن بہت سی دیگر آیاتِ قرآن کی طرح مسئلہ توبہ کی طرف اشارہ کرنے کے بعد گذشتہ غلط کاریوں کی تلافی کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ ''و اصلحوا'' کے ذریعے یہ حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ توبہ صرف گذشتہ گناہ پر پشیمانی اور آئندہ اپنے نیک اعمال سے گذشتہ برے اعمال کی تلافی کی جائے۔

(۹۰) اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِھِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُھُمْ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الضَّآلُّوْنَ	جولوگ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے ہیں اور پھر کفر میں بڑھ گئے ہیں تو ان کی توبہ کبھی بھی قبول نہیں ہو گی اور وہ (واقعاً) گمراہ ہیں۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے اس آیت کی گذشتہ آیات کی شان نزول سے ہٹ کر ایک اور شانِ نزول نقل کی ہے۔ اس کے مطابق مذکورہ آیت اہلِ کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور سے قبل لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کی بشارت دیتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایمان اور وفاداری کا اظہار کرتے تھے لیکن بعثت کے بعد نہ صرف یہ کہ وہ کافر ہو گئے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلے پر آ کھڑے ہوئے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں ان لوگوں کے بارے میں گفتگو تھی جو واقعاً اپنے انحرافی راستے اور کج روی پر پشیمان ہو گئے تھے اور انہوں نے حقیقتاً توبہ کر لی تھی لیکن اس آیت میں ایسے اشخاص کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے جن کی توبہ قبول نہیں ہو گی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو پہلے مرحلے پر ایمان لائے، پھر کافر ہو گئے اور اپنے کفر پر ڈٹ گئے اور اس پر مصر ہیں اس لئے کسی وقت بھی احکام حق کی پیروی کے لئے تیار نہیں مگر یہ کہ معاملہ ان کے لئے مشکل ہو جائے اور اطاعت تسلیم کے علاوہ انہیں اور کوئی راستہ نظر نہ آئے۔ خدا ایسے افراد کی توبہ قبول نہیں کرے گا کیونکہ وہ اختیاری طور پر راہِ حق پر قدم نہیں رکھتے بلکہ جب وہ اہلِ حق کا غلبہ دیکھتے ہیں تو ظاہراً پشیمان ہو کر توبہ کا اظہار کرتے ہیں اس بناء پر ان کی توبہ ظاہری ہے جو قبول نہیں ہو گی۔

(۹۱)اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۠	جولوگ کافر ہو گئے ہیں اور حالت کفر میں مر گئے ہیں زمین اگر سونے سے پر ہو اور وہ اسے فدیہ کر دیں تو بھی ان سے یہ ہر گز قبول نہیں کیا جائے گا اور ان کے لئے درد ناک عذاب ہے اور ان کا کوئی یاور و مددگار نہیں۔

تفسیر

فضول کفارہ

یہ آیت ایسے افراد کے بارے میں ہے جنہوں نے حالتِ کفر میں زندگی گزاری ہے اور اسی حالت میں دنیا سے چلے گئے ہیں۔قرآن کہتا ہے: جولوگ راہِ حق واضح ہو جانے کے باوجود طغیان وسرکشی کا راستہ اختیار کئے رہے ہیں اور حقیقتاً سر تسلیم خم نہیں کرتے ان کی بخشش اور عطیات قابلِ قبول نہیں ہوں گے اور ان کے لئے راہِ نجات نہیں ہے اگر چہ وہ تمام زمین کو سونے سے پر کر کے راہِ خدا میں خرچ کر دیں۔

واضح ہے کہ اتنا ڈھیر سونا خرچ کرنے سے مراد یہ ہے ان کی بخشش کتنی بھی زیادہ کیوں نہ ہو قلب و روح کی آلودگی اور حق سے دشمنی کے ہوتے ہوئے ان کے لئے مؤثر نہیں ہے ورنہ واضح ہے کہ ساری زمین سونے سے پر ہو جائے تو سونے کی قدر و قیمت مٹی کے برابر ہو جائے گی اس بناء پر مندرجہ بالا جملہ اس معاملے کی اہمیت ثابت کرنے کے لئے ہے۔

اس بارے میں کہ اس انفاق اور خرچ کرنے سے مراد اس جہان میں انفاق کرنا ہے یا دوسرے جہان میں ....تو اکثر مفسرین نے دونوں احتمالات ذکر کئے ہیں لیکن آیت کا ظہور دوسرے جہان سے ربط رکھتا ہے یعنی حالت کفر میں مر جانے کے بعد اگر فرض کریں کہ زمین کی بہت بڑی دولت وثروت ان کے اختیار میں ہو اور وہ خیال کریں کہ اس جہان کی طرح اس سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو سزا سے بچا لیں گے تو یہ ان کا بہت بڑا اشتباہ ہو گا اور یہ مالی جرمانہ اور فدیہ ان کی سزا کی کیفیت پر کسی قسم کا کوئی اثر نہیں ڈال سکے گا۔

ان کے لئے درد ناک عذاب یقینی ہے اور اس عظیم سزا سے بچانے کے لئے انہیں کوئی حامی و مددگار نہیں مل سکے گا اور شفاعت کرنے والوں کی شفاعت بھی انہیں میسر نہ ہو گی۔

(۹۲)لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ۬ؕ وَ مَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیۡمٌ	تم ہرگز نیکی کونہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (خدا کی راہ) میں خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو اور جو کچھ تم خرچ کروگے اللہ اس سے بے خبر نہ ہوگا

تفسیر

''لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡن'' لفظ ''بَرّ'' عربی زبان میں وسعت کا ہم معنی ہے۔اسی لئے وسیع صحرا کو ''بَرّ'' (با کی فتح کے ساتھ) کہا جاتا ہے اور اسی مناسبت سے ان نیک کاموں کو ''بِرّ'' (با کی زیر کے ساتھ) کہتے ہیں جن کا ثمرہ ونتیجہ عام اور وسیع ہو اور دوسروں تک پہنچے، ''بِرّ'' اور ''خیر'' کے درمیان لغت عرب کے لحاظ سے یہ فرق ہے کہ ''بِرّ'' وہ نیک کام ہوتا ہے جو توجہ اور قصد واختیار کے ساتھ ہو لیکن ''خیر'' ہر قسم کی نیکی کے لئے استعمال ہوتا ہے خواہ وہ کسی توجہ اور التفات کے بغیر کی گئی ہو۔

مندرجہ بالا آیت میں فرمایا گیا ہے کہ تم لوگ اس وقت تک ''بر'' اور نیکی کی حقیقت کونہیں پا سکتے جب تک اس چیز میں سے راہ خدا میں خرچ نہ کرو جس سے تم محبت کرتے ہو۔

آیاتِ قرآنی کا مسلمانوں کے دلوں پر اثر

قرآن کریم کی آیات کا مسلمانوں کے دلوں پر اتنا گہرا اثر ہوتا تھا کہ آیات کے نازل ہوتے ہی ان کے اثرات ظاہر ہو جاتے تھے اسی ضمن میں مذکورہ آیت کے متعلق تواریخ اور اسلامی تفسیروں میں واقعات لکھے گئے ہیں:

(1)۔ایک صحابی رسول ﷺ ابوطلحہ انصاری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ مدینہ منورہ میں اس کا کھجوروں کا ایک بہت ہی صاف ستھرا اور خوبصورت باغ تھا پورے مدینہ میں اس کا چرچا تھا۔اس باغ میں صاف وشفاف پانی کا ایک چشمہ بھی تھا۔جس وقت پیغمبر اکرم ﷺ اس باغ میں تشریف لاتے تو وہ پانی نوش فرماتے اور اس سے چلو بھرتے۔ان تمام خصوصیات کے علاوہ ابوطلحہ اس سے بہت زیادہ آمدنی حاصل کرتا تھا۔

آیت کے نزول کے بعد وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ میرے اموال میں سے میرے نزدیک محبوب صرف یہی باغ ہے۔ میں چاہتا ہوں کی اسے راہِ خدا میں خرچ کردوں تا کہ یہ میرے لئے توشۂ آخرت بنے۔یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا:

''بخٍ بخٍ ذٰلک مال رابحٌ لک''

(آفرین، آفرین تجھ پر یہ ایسی ثروت ہے کہ جو تیرے لئے فائدہ مند ہوگی)۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا میرا مشورہ ہے کہ اسے اپنے رشتہ داروں کو دے دو۔ابوطلحہؓ نے آپ ﷺ کے حکم کی تعمیل کی اور اسے اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کردیا۔

(2)ایک دن ابوذرؓ کے ہاں ایک مہمان آیا ابوذرؓ انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔انہوں نے مہمان سے معذرت طلب کی کہ میں اپنی ابتلاء کی وجہ سے خود تیری پذیرائی نہیں کرسکتا۔میرے چند اونٹ فلاں مقام پر موجود ہیں زحمت کر کے ان میں سے ایک بہترین اونٹ لے آؤ (تاکہ اسے تمہارے لئے نحر کردوں)۔وہ ایک کمزور اونٹ لے آیا۔جناب ابوذرؓ نے اس سے کہا تو نے میرے ساتھ خیانت کی، یہ اونٹ کس لئے لے کر آئے ہو؟اس نے جواب دیا میں نے سوچا کہ دوسرے اونٹوں کی کبھی آپ کو ضرورت پڑے گی۔تو ابوذرؓ نے کہا کہ مجھے ان کی اس وقت کے لئے ضرورت ہے جب میری آنکھیں اس جہانِ فانی سے بند ہوں گی (کیا ہی اچھا ہے کہ اس دن کے لئے سامان کرلوں)۔خدا فرماتا ہے کہ:

"لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰى تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ"

(3)۔ہارون رشید کی زوجہ زبیدہ کے پاس قرآن مجید کا ایک بہترین نسخہ موجود تھا جو زر و جواہرات سے مزیّن و مرصّع تھا اور وہ اس کو بہت پسند کرتی تھی۔ایک دن وہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے جب آیہ"لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ" پر پہنچی تو آیت پڑھتے ہی وہ ورطۂ حیرت میں پڑ گئی اور اپنے دل میں خیال کرنے لگی کہ اس قرآن مجید سے میرے نزدیک کوئی چیز بہتر نہیں ہے لہٰذا اسے راہِ خدا میں خرچ کرنا چاہئے اس نے جواہر فروشوں کو بلوا کر اس کی زیب و زینت کی چیزیں اور جواہرات فروخت کردیئے اور ان کی قیمت سے حجاز کے بیابانوں میں بادیہ نشینوں کے لئے پانی مہیا کیا۔

کہا جاتا ہے کہ آج بھی ان میں سے کچھ کنوئیں موجود ہیں اور اسی کے نام سے منسوب ہیں۔

(۹۳) كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِيۡلُ عَلٰى نَفۡسِهٖ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰٮةُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِالتَّوۡرٰٮةِ فَاتۡلُوۡهَاۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ	تمام (پاک) غذائیں بنی اسرائیل کے لئے حلال تھیں سوائے ان کے جنہیں اسرائیل (یعقوب) نے تورات کے نزول سے پہلے اپنے لیے حرام قرار دیا تھا (مثال کے طور پر اونٹ کا گوشت جو ان کے لیے ضرر رساں تھا) ان سے کہو اگر تم (اپنے اعتراض میں) سچے ہو تو لاؤ تورات اور اسے پڑھو۔
(۹۴) فَمَنِ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ وقف جبرائیلؑ	اس کے بعد بھی جو لوگ اپنی گھڑی ہوئی جھوٹی باتیں خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں وہی درحقیقت ظالم ہیں۔

(۹۵)قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۗ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۗ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ	کہہ دو اللہ نے سچ فرمایا (اور یہ ابراہیم کے پاک دین میں نہیں تھا) لہٰذا تم یکسو ہو کر ابراہیم کے آئین کی پیروی کرو جو حق پسند تھے اور یقیناً ابراہیم شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔

شانِ نزول

مفسرین کے اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہودیوں نے پیغمبر اکرمؐ پر خصوصیت کے ساتھ دو اعتراض کئے تھے:

1۔ پیغمبر اسلامؐ نے اونٹ کے گوشت اور دودھ کو حرام کیوں قرار نہیں دیا جبکہ یہ نہ صرف حضرت ابراہیمؑ بلکہ حضرت نوحؑ کے دین میں بھی حرام تھے ان کی پیروی کرتے ہوئے یہودی بھی اسے حرام سمجھتے تھے۔

2۔ رسولِ اسلامؐ کیونکہ گذشتہ انبیاء خصوصاً حضرت ابراہیمؑ کے وفادار ہو سکتے ہیں حالانکہ تمام پیغمبر بیت المقدس کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کی طرف نماز پڑھتے تھے۔ لیکن ختمی مرتبتؐ نے اس کی بجائے کعبہ کو قبلہ بنالیا ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں ان کی پہلی بات کا جواب دیا گیا ہے اور آئندہ آیات ان کے دوسرے اعتراض کا جواب دیں گی۔

تفسیر

مندرجہ بالا پہلی آیت مکمل وضاحت کے ساتھ یہودیوں کے ان خیالات کو رد کرتی ہے جو وہ کھانے کی پاک اور حلال اشیاء (مثلاً اونٹ کا دودھ اور گوشت) کے متعلق رکھتے تھے۔

یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ابتدا میں یہ تمام اشیاء بنی اسرائیل کے لئے حلال اور جائز تھیں سوائے ان اشیاء کے جن کو اسرائیل (یہ حضرت یعقوبؑ کا دوسرا نام تھا) نے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ اس آیت میں اس بات کی نشاندہی نہیں کی گئی کہ حضرت یعقوبؑ نے کونسی غذا کس سبب سے حرام قرار دی تھی لیکن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت یعقوبؑ اونٹ کا گوشت کھاتے تو آپ پر عرق النساء کا شدید حملہ ہوتا۔ لہٰذا انہوں نے اس غذا سے ہمیشہ کے لئے اجتناب کرنے کا ارادہ کر لیا اور آپ کی اتباع میں آپ کے پیروکاروں نے بھی اس سے اجتناب کیا اور یہ بات ان کے اذہان میں پختہ ہوگئی لہٰذا انہوں نے اسے حرام سمجھا اور اسے ایک دینی حکم کی طرح خدا کی طرف منسوب کیا۔ قرآن کریم کی مذکورہ آیت نے ان کے خیال کو غلط قرار دیا اور یہ واضح کیا کہ یہ صرف ان کی تہمت ہے۔

اس آیت کے دوسرے حصے میں "مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نزولِ قرآن سے پہلے کوئی پاکیزہ غذا بنی اسرائیل پر حرام نہ تھی البتہ تورات کے نازل ہونے اور حضرت موسیٰؑ کی آمد کے بعد یہودیوں کے ظلم و ستم کے نتیجہ میں کچھ پاک چیزیں ان پر حرام کر دی گئیں۔

''قُلۡ فَاۡتُوۡا بِالتَّوۡرٰۃِ فَاتۡلُوۡھَاۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ''

اس جملے میں خداوندِ عالم نے اپنے نبی ﷺ کو حکم دیا ہے کہ وہ یہودیوں کو دعوت دیں کہ وہ اسی موجودہ تورات کو لے آئیں اور اسے کھول کر پڑھیں تا کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ ان اشیاء کی حرمت کے بارے میں ان کا دعویٰ غلط ہے۔ لیکن وہ اس بات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ اس لئے کہ انہیں یقین تھا کہ تورات میں اس قسم کی کوئی بات موجود نہیں ہے۔ اور یہ صرف ان کی تہمت ہے۔

(۹۴) جب وہ لوگ تورات کو لانے پر آمادہ نہ ہوئے اور خدا پر ان کا بہتان باندھنا مسلّم ہو گیا تو اس آیت میں انہیں خبر دار کیا گیا کہ جو لوگ خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ ظالم و ستمگر ہیں۔ ایک طرف وہ اپنے آپ کو خدائی سزا اور عذاب میں گرفتار کر کے اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ جھوٹ اور مکر و فریب سے اور لوگوں کو بھی سیدھی راہ سے بھٹکا کر دوسروں پر ظلم کرتے ہیں۔

(۹۵) جب تم نے دیکھ لیا کہ میں اپنی دعوت میں سچا اور راست گو ہوں تو تم میرے دین کی پیروی کرو جو کہ ابراہیم علیہ السلام کا پاک اور بے آلائش دین ہے۔ کیونکہ وہ حنیف تھا یعنی باطل ادیان کو چھوڑ کر حق کی طرف مائل تھا اور اس کے احکام میں پاک غذاؤں کے متعلق ایک حکم بھی انحرافی اور بے دلیل نہیں تھا اور وہ ہرگز مشرکین میں سے نہ تھا۔ اور یہ جو مشرکین عرب اپنے آپ کو دین ابراہیم علیہ السلام کا پیرو سمجھتے ہیں بالکل لغو اور بے معنی ہے۔ بت پرست کہاں اور بت شکن کہاں۔

(۹۶) اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ھُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ۚ	پہلا گھر جو لوگوں (اور خدا سے تضرع و خضوع) کے لئے مقرر کیا گیا ہے وہ سر زمین مکہ میں ہے جو بابرکت ہے اور دنیا کے لیے ہدایت و رہبری کا سبب ہے۔
(۹۷) فِیۡہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبۡرٰھِیۡمَ ۬ۚ وَمَنۡ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا ؕ وَ لِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الۡبَیۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَیۡہِ سَبِیۡلًا ؕ وَ مَنۡ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ	اس میں واضح و آشکار نشانیاں ہیں ان میں سے مقام ابراہیم ہے اور جو شخص اس میں داخل ہو وہ امان میں ہے اور جو لوگ اس کی طرف جانے کی قدرت رکھتے ہیں ان پر واجب ہے کہ وہ خدا کے لئے (اس کے) گھر کی زیارت کریں اور جو کوئی کفر کرے (حج ترک کرے اس نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا) تو پھر خدا تو تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

تفسیر

جیسا کہ گذشتہ آیات کے ضمن میں کہا جا چکا ہے کہ یہودیوں کو پیغمبر اسلام ﷺ پر دو اعتراض تھے جن میں سے پہلے کا جواب ان آیات میں دیا گیا ہے۔ دوسرا اعتراض ان کو یہ تھا کہ بیت المقدس کو خانہ کعبہ پر برتری حاصل ہے۔ اس کا جواب مندرجہ بالا آیات میں دیا جا رہا ہے۔

آیت بتلا رہی ہے کہ اگر کعبہ کو مسلمانوں کے قبلہ کی حیثیت سے منتخب کیا گیا ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ چونکہ روئے زمین وجود میں آنے والا یہ خدا کا پہلا گھر اور سب سے پہلی عبادت گاہ ہے اس قبل دعا اور پروردگارِ عالم کی عبادت کا کوئی مرکز نہیں تھا۔ صرف یہی ایسا گھر ہے جو انسانی معاشرہ کے لئے ایسے نقطہ پر وجود میں لایا گیا ہے جو اجتماعیت کا مرکز ہے اور پُر برکت مقام ہے۔

اسلامی تاریخ کے مصادر بھی اس بات کی طرف اشاراہ کرتے ہیں کہ خانہ کعبہ حضرت آدمؑ کے ہاتھ کا بنا ہوا ہے۔ جب طوفانِ نوحؑ اسے کچھ نقصان پہنچا تو حضرت ابراہیمؑ نے اسے از سرِ نو تعمیر کیا۔ بنا بر ایں قبلہ کی حیثیت سے اس سے پہلے خانہ توحید کا انتخاب دوسرے ہر مقام سے زیادہ مناسب ہے۔ البتہ قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں خانہ کعبہ جس کا دوسرا نام بیت اللہ ہے کا تعارف لوگوں کے گھر کے طور پر کرایا گیا ہے۔ اس تعبیر سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ جو کچھ خدا کے نام پر ہے اور اس کے لئے ہے اسے لوگوں اور اس کے بندوں کی خدمت کے لئے استعمال کرنا چاہئے اور جو کچھ بندگانِ خدا کی خدمت کے لئے ہے وہ خدا کے لئے ہے۔

اس گھر میں خدا پرستی۔ توحید اور روحانیت و معنویت کی واضح نشانیاں نظر آتی ہیں۔ ان میں سے ایک اس کا دوام اور بقا ہے ان طاقتور دشمنوں کے مقابلہ میں جو اس کو نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے تھے دوسری نشانی حضرت ابراہیمؑ جیسے عظیم المرتبت پیغمبر کے وہ آثار ہیں جو اس کے قرب و جوار میں باقی رہ گئے ہیں مثال کے طور سے زمزم، صفا و مروہ، رکن حطیم، حجر اسود اور حجر اسماعیل ان میں سے ہر ایک گذشتہ زمانوں کی ایک مجسم تاریخ ہے جو ان کی عظیم اور دائمی یادوں کو زندہ رکھتی ہے۔

ان نشانیوں میں مقام ابراہیم کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ ایسی جگہ ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ تعمیر کعبہ اور مراسم حج کی انجام دہی یا عام لوگوں کو ان عظیم مراسم کے پورا کرنے کی دعوت دینے کے لئے کھڑے ہوتے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کعبہ کے بعد شہر مکہ کے لئے جائے امن ہونے کی خداوند عالم سے درخواست کی تھی اور یہ دعا مانگی تھی۔

خدایا: اس سرزمین کو جائے امن و امان قرار دے (ابراہیم۔۳۵)

خداوند عالم نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا کو مستجاب کیا اور اسے ایک مرکز امن قرار دیا۔

"فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ"

اس جملے میں تمام لوگوں کو حج کی انجام دہی کا حکم دیا گیا ہے اور اسے لوگوں کے ذمہ خدائی قرض قرار دیا گیا ہے چنانچہ "لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے لئے لوگوں کے ذمہ ہے لفظ حج کے لغوی معنی قصد و ارادہ ہیں۔ اسی مناسبت سے راستہ کو "محجته" کہا جاتا ہے کیونکہ وہ انسان کو اپنے مقصد تک پہنچا دیتا ہے اور دلیل و برہان کو حجت اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ مقصود کو روشن کر دیتی ہے باقی یہ بات کہ ان مخصوص رسومات کو حج سے کیوں تعبیر کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مراسم میں شرکت کے لئے چلتے وقت خانہ خدا کی زیارت کا قصد کیا جاتا ہے اسی بناء پر آیت مذکورہ میں حج کی اضافت بیت کی طرف ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ حج کے مراسم پہلی دفعہ حضرت ابراہیمؑ کے دور میں رائج ہوئے اور اس کے بعد ایک سنت کی شکل اختیار کی یہاں تک کہ زمانہ جاہلیت میں بھی اس کا سلسلہ جاری و ساری رہا بعد ازاں اسلام نے اس سے جاہلیت کے خرافات کو دور کر کے اسے خالص اور مکمل حج کی شکل دی۔

البتہ نہج البلاغہ کے خطبہ قاصعہ اور دیگر روایات سے پتہ چلتا ہے کہ فریضہ حج حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے شروع ہوا تھا لیکن اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں مزید دستوری شکل اختیار کی۔

ہر وہ شخص جو استطاعت حاصل کر لیتا ہے اس پر زندگی بھر میں صرف ایک مرتبہ حج واجب ہے اور مندرجہ بالا آیت بھی اس طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ اس میں حکم مطلق ہے اور اس سے ایک دفعہ کی انجام دہی سے اطاعت ہو جاتی ہے حج کے وجوب کے لیے صرف ایک شرط لگائی گئی ہے اور وہ ہے استطاعت وقدرت جیسا کہ ارشادہ ہو رہا ہے ''مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلا'' جو خانہ کعبہ کی طرف جانے کی قدرت رکھتا ہو البتہ اسلامی روایات اور فقہی کتب میں استطاعت کی تفسیر میں یہ چیزیں شامل کی گئی ہیں زادراہ سواری جسمانی توانائی راستے میں امن اور حج سے واپسی کے بعد گزر اوقات کی طاقت لیکن دراصل یہ سب چیزیں اس آیت میں مندرج ہیں کیونکہ اصل میں استطاعت کے معنی ہیں توانائی اور قدرت اور اس میں یہ تمام امور شامل ہیں۔

اس آیت سے ضمنی طور پر یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ قانون دیگر اسلامی قوانین کی طرح صرف مسلمانوں کے لئے مختص نہیں ہے بلکہ تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ اسے انجام دیں۔

حج کی اہمیت

آیت کے آخری حصہ میں حج کی تاکید و اہمیت کو واضح کرنے کے لئے ارشاد ہو رہا ہے کہ جو لوگ کفر اختیار کر کے اس خدائی حکم کی پرواہ نہ کریں اور اس کی مخالفت کریں تو وہ خود اپنے تئیں نقصان پہنچاتے ہیں کیونکہ خدا تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

لفظ ''کفر'' کے اصلی معنی چھپانے کے ہیں اور دینی اصطلاح میں اس کا ایک وسیع معنی ہے کیونکہ حق سے ہر طرح کی مخالفت اس میں شامل ہے چاہے مرحلہ اصول میں ہو یا فروعی احکام میں اب اگرچہ اس کا استعمال اصول کی مخالفت میں ہونے لگا ہے مگر یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ اسی میں منحصر چنانچہ آیت مذکورہ میں ترک حج کے لئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

حج بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے جس کے ترک کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے مرحوم صدوقؒ نے کتاب من لایحضرہ الفقیہ میں رسالتمآب سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا

> **یا علی تارک الحج و هو مستطیع کافر یقول اللّٰه تبارک و تعالی وللّٰه علی الناس حج البیت من استطاع الیه سبیلا و من کفر فان اللّٰه غنی عن العالمین یا علی! من سوف الحج حتی یموت بعثه اللّٰه یوم القیمة یهودیا او نصرانیا.**
>
> اے علی علیہ السلام! جو شخص حج کو ترک کرے باوجودیکہ وہ استطاعت رکھتا ہو تو وہ کافر شمار ہوگا کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ استطاعت رکھنے والے لوگوں پر خدا کے گھر کی طرف حج بجا لانے کے لئے جانا لازمی اور ضروری ہے اور جو کفر اختیار کرے یعنی اسے چھوڑ دے تو اس نے اپنا نقصان کیا ہے اور خدا ان سے بے نیاز ہے اے علی علیہ السلام! جو حج میں تاخیر کرے یہاں تک کہ دنیا سے چل بسے تو خدا اسے قیامت کے دن یہودی یا نصرانی محشور کرے گا۔

(۹۸)قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ‌ۖ‌ وَاللّٰهُ شَهِيۡدٌ عَلٰى مَا تَعۡمَلُوۡنَ	(اے پیغمبر! ان سے) کہو اے اہل کتاب! تم کیوں (دیدہ و دانستہ) اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کا شاہد حال ہے۔
(۹۹)قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ مَنۡ اٰمَنَ تَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا وَّاَنۡتُمۡ شُهَدَآءُ‌ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ	کہو: اے اہل کتاب! یہ کیا ہے کہ جو کوئی اللہ پر ایمان لانا چاہتا ہے تم اسے اللہ کی راہ سے روکتے ہو اور اسے ٹیڑھی چال چلانا چاہتے ہو حالانکہ تم حقیقت حال سے بے خبر نہیں ہو یاد رکھو جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔
(۱۰۰)يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تُطِيۡعُوۡا فَرِيۡقًا مِّنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ يَرُدُّوۡكُمۡ بَعۡدَ اِيۡمَانِكُمۡ كٰفِرِيۡنَ	اے ایماندارو! اگر تم اہل کتاب! میں کسی گروہ (کہ جن کا کام نفاق اور تمہارے درمیان کینہ و عداوت کی آگ بھڑکانا ہے) کی باتوں پر کاربند ہو گئے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ تمہیں ایمان سے کفر کی طرف لوٹا دیں گے۔
(۱۰۱)وَكَيۡفَ تَكۡفُرُوۡنَ وَاَنۡتُمۡ تُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيۡكُمۡ رَسُوۡلُهٗ ‌ؕ وَمَنۡ يَّعۡتَصِمۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ هُدِىَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ	یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم (اب پھر) کفر کی راہ اختیار کرو جب کہ تمہارا حال یہ ہے کہ اللہ کی آیتیں تمہیں سنائی جا رہی ہیں اور اس کا رسول (تعلیم و رہنمائی) کے لئے تم میں موجود ہے (لہٰذا خدا سے تمسک رکھو) اور یاد رکھو کہ جو کوئی مضبوطی سے اللہ کا ہو رہا تو بلاشبہ اس پر سیدھی راہ کھل گئی۔

شانِ نزول

ان آیات کے شان نزول کے سلسلے میں جو کچھ شیعہ اور سنی تصنیفات میں نقل ہوا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ شامی بن قیس ایک یہودی تھا۔ وہ ضعیف العمر، تاریک دل اور کفر و عناد میں کم نظیر تھا۔ ایک دن وہ مسلمانوں کے ایک مجمع کے پاس سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ اوس و خزرج جو سالہا سال ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما رہے ان کے بعض افراد انتہائی صلح و آشتی اور محبت و خلوص سے ایک دوسرے کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں مجلس کی فضا انس و محبت سے معطر ہے اور شدید اختلافات کی جو آگ زمانہ جاہلیت میں ان میں شعلہ زن تھی وہ یکسر بجھ چکی ہے۔

یہ حالت دیکھ کر وہ حسد کے مارے جل اٹھا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ اگر یہ لوگ حضرت محمد ﷺ کی پیروی کر کے اتنے آگے بڑھتے رہے تو یہودیت کے لئے بڑا خطرہ ہے اسی دوران اس کے ذہن میں ایک سازش آئی اور اس نے ایک یہودی نوجوان کو حکم دیا کہ وہ ان کے ایک گروہ سے میل جول رکھے اور اوس وخزرج کے درمیان خونیں واقعات کی یاد تازہ کرے اور ان کی نظروں کے سامنے ان واقعات کی تصویر کشی کرے۔

اتفاقاً یہودی نوجوان کی یہ سازش کارگر ثابت ہوئی اور مسلمانوں کا ایک گروہ اس کے سننے سے وہی باتیں کرنے لگا یہاں تک کہ اوس وخزرج کے بعض لوگ از سر نو ایک دوسرے کو دھمکیاں دینے لگے قریب تھا کہ بجھی ہوئی دیرینہ آگ پھر سے شعلہ زن ہو پیغمبر اکرم ﷺ کو اس واقعہ کا علم ہوا آپ ﷺ فوراً چند مہاجرین لے کر ان کی تلاش میں نکلے اور دل ہلا دینے والے مواعظ ونصائح سے انہیں بیدار کیا ان لوگوں نے جب آپ ﷺ کی اطمینان بخش گفتگو سنی تو اپنے ارادوں سے باز آ گئے اور سامان حرب وضرب زمین پر ڈال کر باہم بغل گیر ہو گئے اور بہت روئے اب وہ سمجھ گئے کہ یہ دشمنان اسلام کی ایک سازش تھی اور صلح وآشتی نے دوبارہ زندہ ہونے والے کینوں کو ختم کر ڈالا۔

اس موقع پر اوپر کی چار آیتیں نازل ہوئیں جن میں سے پہلی دو آیات میں گمراہ کرنے والے یہودیوں کی مذمت کی گئی اور بعد کی دو آیات میں مسلمانوں کو بیدار کیا گیا۔

تفسیر

نفاق ڈالنے والے

اس آیت میں روئے سخن اہل کتاب کی طرف ہے جن سے مراد یہاں یہودی ہیں اس ضمن میں خدا اپنے حبیب کو حکم دیتا ہے کہ ان سے کچھ ملامت اور سرزنش کے لب ولہجہ میں پوچھئے کہ اللہ کی آیات سے ان کے کفر کا سبب کیا ہے؟ جب کہ وہ جانتے ہیں کہ خدا ان کے اعمال سے واقف ہے

آیات سے مراد یا تو وہ آیات ہیں جو تورات میں پیغمبر اسلام ﷺ کی نشانیوں کے بارے وارد ہوئی تھیں یا سب آیات معجزات ہیں جو پیغمبر اسلام ﷺ پر نازل ہوئے تھے اور جو آپ ﷺ کی حقانیت کی ترجمانی کرتے تھے

(۹۹) اس کے بعد خداوند عالم ان کی سرزنش کرتا ہے کہ اگر تم خود حق کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو تو دوسروں کو راہ حق سے منحرف کرنے پر اصرار کیوں کرتے ہو اور خدائی راہ مستقیم کو غلط طریقے سے پیش کیوں کرتے ہو حالانکہ چاہئے تو یہ تھا کہ تم سب سے پہلے خدا کی آواز پر لبیک کہتے کیونکہ اس پیغمبر ﷺ کے متعلق تمہاری کتابوں میں پہلے سے نوید دی گئی تھی لیکن تم اس سنگین ذمہ داری سے پہلو تہی کر کے دوسروں کو منحرف کرتے ہو آخر ایسا کیوں ہے؟

''وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ''

آیت کے آخر میں انہیں دھمکی دی گئی ہے کہ خدا ہرگز تمہاری کارستانیوں سے غافل نہیں ہے

(۱۰۰) اس کے بعد روئے سخن غافل مسلمانوں کی طرف کرتے ہوئے ان کو متنبہ کیا گیا کہ اگر وہ دشمن کی زہر آلود باتوں میں آ گئے، انہیں اپنے درمیان رخنہ اندازی کرنے کی اجازت دی اوران کے وسوسوں سے متاثر ہوئے تو بعید نہیں کہ ان سے ایمان کا رشتہ ختم ہو جائے اور وہ کفر کی طرف پلٹ جائیں کیونکہ دشمن اول تو یہ کوشش کرتا ہے کہ ان کے درمیان دشمنی وعداوت کی آگ بھڑکائے اور انہیں ایک دوسرے سے لڑوا دے لیکن یہ مسلم ہے کہ وہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے وسوسوں کو جاری وساری رکھتا ہے تاکہ انہیں اسلام سے مکمل طور پر بیگانہ کردے۔

(۱۰۱) اس کے بعد مومنین سے ایک تعجب خیز انداز میں سوال ہوتا ہے کہ کس طرح ممکن ہے کہ تم کفر کی راہ اختیار کرو حالانکہ پیغمبرﷺ بھی تمہارے درمیان موجود ہیں اور آیات خدا کی بھی مسلسل تلاوت ہوتی ہے اور باران وحی کے حیات بخش قطرات تمہارے دلوں پر پڑتے ہیں حقیقت میں یہ جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر دوسرے لوگ گمراہ ہوں تو زیادہ تعجب نہیں باعث تعجب تو یہ ہے کہ جو افراد پیغمبر اکرمﷺ کی صحبت میں بیٹھتے ہیں اور اس کا عذاب بہت دردناک ہوگا۔

ان آیات کے آخر میں مسلمانوں کو وصیت کی گئی ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے وسوسوں سے چھٹکارہ حاصل کریں اور صراط مستقیم کی ہدایات کے لئے پروردگار عالم کے لطف کا دامن تھام لیں اور اس کی پاک ذات اور قرآن مجید کی مقدس آیات سے تمسک رکھیں اور انہیں صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ جو شخص خدا سے تمسک رکھے اسے راہ راست کی ہدایت حاصل ہو جائے گی۔

(۱۰۲) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ	اے ایماندارو! اللہ سے ڈرو اس طرح جو ڈرنے کا حق ہے اور دیکھو! دنیا سے نہ جاؤ مگر اس حالت میں کہ اسلام پر ثابت قدم ہو۔
(۱۰۳) وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ	اور دیکھو! سب مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑلو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ۔ اللہ نے تمہیں جو نعمت عطا فرمائی ہے اس کی یاد سے غافل نہ ہو جانا۔ تمہارا حال یہ تھا کہ آپس میں تم ایک دوسرے کے دشمن تھے لیکن اس کے فضل وکرم سے ایسا ہوا کہ بھائی بھائی بن گئے اور تم بھڑکتی آگ کے کنارے تھے پس اس نے وہاں تمہیں بچا لیا۔ اللہ اسی طرح اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔

شان نزول

کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ قبیلہ اوس خزرج کے دو آدمی جن کا نام ثعلبہ بن غنم اور اسعد بن زرارہ تھا کسی مقام پر آمنے

سامنے ہوئے اوران میں ہرایک قبول اسلام کے بعد ملنے والے سرمایہ افتخار کوشمار کرنے لگا ثعلبہ نے کہا خزیمہ بن ثابت اورحنظلہ (غسیل الملائکہ) جو مسلمانوں کے لئے باعث افتخار ہین ہم میں سے ہیں اوراسی طرح عاصم بن ثابت اور سعد بن معاذ بھی ہماری نسل سے ہیں اس کے مقابلے میں اسعد بن زرارہ جو قبیلہ خزرج سے تھا کہنے لگا قرآن کریم کی نشر واشاعت اور تعلیم قرآن کا شرف ہمارے ہی قبیلے کے چار افراد کو حاصل ہے ابی بن کعب معاذ بن جبل زید بن ثابت ابوزید اور اہل مدینہ کے رئیس وخطیب سعد بن عبادہ بھی ہم میں سے ہیں۔

رفتہ رفتہ معاملہ نازک صورت اختیار کرتا گیا اور دونوں قبیلے اس واقعہ سے آگاہ ہوئے اور اسلحہ سے لیس ہوکر ایک دوسرے کے سامنے آگئے اب دوبارہ جنگ کی آگ بھڑکنے اوران کے خون سے زمین رنگین ہونے کا خطرہ پیدا ہوگیا۔

پیغمبر ﷺ کواس کی اطلاع ہوئی تو حضرت ﷺ فوراوہاں تشریف لائے اور آپ ﷺ نے اپنے بیان اور حسن تدبیر سے اس خطرناک صورت حال کوختم کیا اوران کے درمیان صلح وصفائی ہوگئی اسی موقع پر مذکورہ آیات کا نزول ہوااور ایک حکم عمومی کے طور پران کو ایک موثر اور تاکیدی بیان کے ذریعے اتحاد واتفاق کی دعوت دی۔

تفسیر

تقویٰ اور پرہیز گاری کی دعوت

اس آیت میں پہلے تقویٰ کی دعوت دی گئی ہے تاکہ وہ اتحاد کی دعوت کے لئے تمہید بنے درحقیقت تقویٰ کی دعوت کسی اخلاقی اورعقیدہ کی مدد لئے بغیر بے اثر یا کم اثر ہوتی ہے اسی بناء پر اس آیت میں کوشش کی گئی ہے کہ اختلاف اور پراگندگی کے عوامل ایمان اور تقویٰ کی ذریعے کمزور کیے جائیں۔

اوراس لیے ایماندار افراد کومخاطب کرکے کہا گیا ہے کہ سب کے سب خدا سے ڈرو اور تقویٰ اور پرہیز گاری کا حق ادا کرو۔

حق تقویٰ سے کیا مراد ہے؟

اس ضمن میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ حق تقویٰ پرہیز گاری کا آخری درجہ ہے جس میں ہرقسم کے گناہ وعصیان اور حق سے انحراف کرنے سے پرہیز کرنا شامل ہے۔

''وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ''

حقیقت میں یہ جملہ اوس وخزرج اور تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے ایک تنبیہ ہے کہ وہ ہوشمندی سے رہیں صرف اسلام قبول کرنا کافی نہیں ہے بلکہ اس سے اہم بات یہ ہے کہ ایمان واسلام کوزندگی کے آخری لمحات تک محفوظ رکھیں اورزمانہ جاہلیت کے کینہ کی بجھی ہوئی آگ اور بیہودہ غیر معقول تعصّبات کی پیروی میں اپنے ایمان اور پاک اعمال کو بربادی کی بھینٹ نہ چڑھادیں تاکہ آخرت میں انجام بدبختی سے ہمکنار نہ ہو لہٰذا اس بات کی تاکید کی گئی کہ خیال رکھنا کہ دنیا سے ایمان واسلام کے بغیر نہ جانا۔

(۱۰۳) اتحاد کی دعوت

زیرِ نظر دوسری آیت میں مسئلہ اتحاد اور ہر قسم کے اختلاف اور تفرقہ بازی سے اجتناب کا تذکرہ ہے ارشاد ہوتا ہے سبھی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور ایک دوسرے سے جدا نہ ہو جاؤ۔

حبل اللہ (اللہ کی رسی) سے مراد کیا ہے؟

مفسرین نے اس کے متعلق کئی احتمالات کا ذکر کیا ہے بعض کے نزدیک اس سے مراد قرآن ہے اور بعض اس سے مراد اسلام لیتے ہیں کچھ حضرات کے نزدیک خاندان رسالت اور آئمہ معصومین علیہم السلام مراد ہیں جو روایات پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے نقل ہوئی ہیں ان میں بھی کئی تعبیرات نظر آتی ہیں جیسا کہ تفسیر درمنثور میں حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور معانی الاخبار میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ حبل اللہ قرآن کریم ہے اور تفسیر عیاشی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ اللہ کی رسی سے مراد آل محمد علیہم السلام ہیں اور لوگوں کو ان سے تمسک کرنے پر مامور کیا گیا ہے لیکن ان احادیث اور ان تفاسیر میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ اللہ کی رسی سے مراد ہر قسم کا ذریعہ ہے جو ذات پاک کے ساتھ ربط رکھتا ہے چاہے وہ وسیلہ اسلام ہو یا قرآن یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیت علیہم السلام بالفاظ دیگر تمام وہ چیزیں جو ذکر ہو چکی ہیں ارتباط خدا کے وسیع مفہوم میں داخل ہیں۔

کل کے دشمن اور آج کے دوست

اس کے بعد قرآن کریم اتحاد و اخوت کی عظیم نعمت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور مسلمانوں کو گذشتہ افسوس ناک حالت پر غور و فکر کرنے اور اس پراگندگی کا اس اتحاد اور وحدت کے ساتھ تقابل کرنے کی دعوت دیتا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے تمہیں نہیں بھولنا چاہئے کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے لیکن خداوند عالم نے اسلام و ایمان کی برکت سے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے انس پیدا کیا اور تم آج بھائی بھائی بن گئے قابل توجہ یہ بات ہے کہ اس آیت میں لفظ نعمت کو مکرر لایا گیا ہے اور اس طرح سے اتفاق و اخوت کی نعمت کی اہمیت ان کے گوش گزار کی گئی ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ خدا نے مومنین کی تألیف قلوب کو اپنی طرف نسبت دیتے ہوئے کہا کہ خدا نے تمہارے دلوں میں الفت و محبت پیدا کر دی اس تعبیر سے اسلام کے ایک اجتماعی معجزہ کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ اگر عربوں کی سابقہ عداوت پر غور کیا جائے کہ کس طرح سالہا سال سے ان کے دلوں میں گہرا کینہ بھرا ہوا تھا اور کس طرح ایک معمولی سے مسئلے پر ان کے درمیان خونیں جنگ کی آگ بھڑک اٹھتی تھی خصوصاً اس بات کی طرف توجہ کی جائے کہ عموماً نادان، ان پڑھ اور نیم وحشی افراد ہٹ دھرم ہوتے ہیں اور آسانی سے گذشتہ چھوٹے چھوٹے مسئلے کو طاق نسیان پر رکھنے کیلئے تیار نہیں ہوتے اس صورت میں عظیم اسلام کے اجتماعی معجزہ کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عام اور روزمرہ کے طور طریقوں سے یہ ممکن نہیں تھا کہ اس قسم کی کینہ پرور نادان قوموں کی ایک ملت بنائی جائے اور انہیں ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا جائے۔

مندرجہ بالا امر (کینہ پرعرب قبائل کے درمیان وحدت اور بھائی چارہ) کی اہمیت علماء اور مؤرخین حتی کہ غیر مسلم مؤرخین

کی نظر سے مخفی نہیں رہی اور سب نے بڑے تعجب خیز انداز سے اس کا ذکر کیا ہے

مندرجہ بالا جملے میں خدا تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے تم گذشتہ زمانے میں آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے ہر آن ممکن تھا کہ تم اس میں گر جاؤ اور تمہارا سب کچھ خاکستر ہو جائے لیکن خداوند عالم نے تمہیں نجات بخشی اور ہلاکت کے اس گڑھے سے امن و امان کے نقطہ کی طرف تمہاری رہنمائی کی جو اخوت و محبت کا نقطہ تھا۔

آیت میں آگ سے مراد جہنم کی آگ ہے یا اس دنیا کی؟

اس بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے لیکن پوری آیت پر توجہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آگ جنگ و جدال اور لڑائی جھگڑوں سے کنایہ ہے جو ہر لحظہ زمانہ جاہلیت میں کسی نہ کسی بہانہ عربوں میں بھڑک اٹھتی تھی۔ قرآن مجید اس جملے میں زمانہ جاہلیت کے خطرناک حالات کی عکاسی کرتا ہے کہ ہر لحظہ جنگ اور خونریزی کا خطرہ ان کے سروں پر منڈلاتا رہتا تھا اور خداوند عالم نے نور اسلام کی برکت سے انہیں اس حالت سے نجات دی یہ مسلم ہے کہ انہوں نے اس خطرناک حالت سے خلاصی پا کر جہنم کی جلانے والی آگ سے بھی نجات پالی۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کی گئی ہے کہ خدا اسی طرح اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے تا کہ تمہاری ہدایت ہو جائے اس بناء پر آخری مقصد اور غرض تمہاری ہدایت و نجات ہے اور چونکہ یہ تمہارے منافع اور سرنوشت کا معاملہ ہے لہٰذا جو کچھ کہا گیا اسے زیادہ سے زیادہ اہمیت دو۔

(۱۰۴) وَ لۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَ يَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ يَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ	تم میں سے ایک جماعت ایسی ہو جو بھلائی کی باتوں کی طرف دعوت دینے والی ہو وہ نیکی کا حکم دے برائی سے روکے اور بلاشبہ ایسے ہی لوگ کامیابی حاصل کرنے والے ہیں
(۱۰۵) وَ لَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ تَفَرَّقُوۡا وَ اخۡتَلَفُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡبَيِّنٰتُ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ۙ	اور دیکھو! ان لوگوں کی سی چال نہ چلنا جو (دین الٰہی پر اکٹھے رہنے کی بجائے) الگ الگ ہو گئے اور باوجود یہ کہ (کتاب اللہ) کی روشن دلیلیں ان کے سامنے آ چکی ہیں باہم دگر اختلافات میں پڑ گئے پس ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔

تفسیر

حق کی دعوت اور فساد کا مقابلہ

''امت'' اصل میں مادہ ''ام'' سے ہے جس کا معنی ہے ہر وہ چیز جس کا دوسری چیزیں ضمیمہ ہوں اسی بنا پر امت ایسے گروہ کو

کہا جاتا ہے جن کے درمیان وحدت کا پہلو ہو اس میں فرق نہیں کہ وحدت زمانی ہو یا مکانی یا مقصد میں وحدت ہو لہٰذا متفرق اور پراگندہ اشخاص کو امت نہیں کہا جا سکتا

گذشتہ آیات اخوت وحدت کے بارے میں ہیں اب اس آیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو حقیقت میں ایک اجتماعی زرہ کے مانند ہے اور جو جمعیت کی حفاظت کرتی ہے کیونکہ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ ہو تو مختلف عوامل جو اجتماعی وحدت کی بقاء کے دشمن ہیں دیمک کی طرح اندر سے معاشرے کی جڑوں کو کھاتے رہتے ہیں اور لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتے ہیں اسی لیے وحدت اجتماعی کی حفاظت عوام کی نگرانی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

آیت بالا میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہمیشہ مسلمانوں کے درمیان ایک ایسا گروہ ہونا چاہئے جو ان دو اجتماعی عظیم ذمہ داریوں کو انجام دے لوگوں کو نیکی کی دعوت دے اور برائیوں سے منع کرے اور آیت کے آخری حصے میں باقاعدہ تصریح ہوئی ہے کہ فلاح و نجات صرف اسی راستے سے ممکن ہے۔

کیا امر بالمعروف ایک عقلی حکم ہے؟

بالفاظ دیگر سوسائٹی میں کوئی چیز انفرادی ضرر کی حامل نہیں ہر انفرادی ضرر میں یہ امکان ہے کہ وہ اجتماعی نقصان کی صورت اختیار کر لے اسی بناء پر عقل و منطق معاشرے کے افراد کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کے گرد و پیش کی فضا کو پاک و صاف رکھنے کے لئے ہر قسم کی جستجو اور کوشش کریں۔

اتفاق سے بعض احادیث بھی اس بات کی غمازی کرتی ہیں جیسا کہ رسول اسلام ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

''ایک گناہگار دوسرے لوگوں کے درمیان اس شخص کی مانند ہے جو ایک کشتی میں کچھ لوگوں کے ساتھ سوار ہو جب وہ کشتی سمندر کے بیچ میں پہنچے تو وہ کلہاڑے سے اس جگہ سوراخ کرنے لگے جہاں وہ بیٹھا ہوا ہے اور جب دوسرے لوگ اس کے اس فعل پر اعتراض کریں تو وہ یہ جواب دے کہ میں تو صرف اپنی جگہ پر یہ کام کر رہا ہوں اس وقت اگر دوسرے لوگ اس کو اس خطرناک کام سے نہ روکیں تو چند لمحوں میں سمندر کا پانی کشتی میں داخل ہو جائے گا اور یک دم سب کے سب غرق ہو جائیں گے''۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے اس واضح مثال کے ذریعے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے منطقی ہونے کی تصویر کشی کی ہے اور معاشرے کے لئے ہر فرد کی نگرانی کے حق کو ایک فطری حق قرار دیا ہے۔

(۱۰۴) اس آیت میں از سر نو مسئلہ اتحاد اور تفرقہ بازی سے اجتناب کرنے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے یہ آیت مسلمانوں کو گذشتہ اقوام مثلاً یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح تفرقہ اور اختلاف کی راہ اختیار کرنے اور اپنے لیے عظیم عذاب مول لینے سے ڈراتی ہے اور درحقیقت انہیں اختلاف و تفرقہ بازی کے بعد کے گذشتہ لوگوں کی تاریخ کے مطالعہ کی دعوت دیتی ہے۔

ان آیات میں اتحاد پر اصرار کرنے اور تفرقہ و نفاق سے اجتناب کرنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہارے معاشرے میں بھی ایسا ہونے والا ہے کیونکہ جہاں کہیں کسی چیز سے ڈرانے میں اصرار کیا جاتا ہے وہ اس کے وقوع کی طرف اشارہ ہوتا

ہے۔

جولوگ واضح دلیلوں کے بعد بھی دین میں اختلاف کرتے ہیں وہ دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے اس میں کلام نہیں کہ اختلاف وانتشار کا فوری نتیجہ ذلت وخواری کے سوا کچھ نہیں اور ہر قوم کی ذلت وخواری کے راز کو ان کے اختلاف ونفاق میں تلاش کرنا چاہئے۔

وہ معاشرہ جس کی قدرت وتوانائی کی بنیاد اس کے ارکان کی تفرقہ بازی کے تیشہ سے پاش پاش ہو جائے ان کی سرزمین ہمیشہ غیروں کی جولانگاہ بن جاتی ہے اور کسی سامراجی حکومت کے قلمرو میں داخل ہو جاتی ہے واقعاً یہ کتنا بڑا عذاب ہے۔

(۱۰۶)يَّوۡمَ تَبۡيَضُّ وُجُوۡهٌ وَّ تَسۡوَدُّ وُجُوۡهٌ‌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اسۡوَدَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ ۚ اَكَفَرۡتُمۡ بَعۡدَ اِيۡمَانِكُمۡ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَكۡفُرُوۡنَ	(نفاق ڈالنے والوں پر وہ عظیم عذاب) اس دن ہوگا جب کچھ چہرے سفید اور کچھ سیاہ ہو جائیں گے وہ لوگ جن کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے (ان سے کہا جائے گا) کیا تم ایمان (اور سایہ اخوت میں آنے) کے بعد کافر ہو گئے تھے تو (اب) اپنے کئے ہوئے کفر کے عذاب کا مزہ چکھو۔
(۱۰۷)وَ اَمَّا الَّذِيۡنَ ابۡيَضَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ فَفِىۡ رَحۡمَةِ اللّٰهِ‌ؕ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ	لیکن وہ جن کے چہرے سفید ہوں گے وہ خدا کی رحمت میں ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

تفسیر

نورانی اور تاریک چہرے

اس تنبیہ کے بعد کہ جو گذشتہ آیات میں تفرقہ بازی نفاق اور کفر و جاہلیت کے زمانہ کے آثار کی طرف پلٹ جانے کے بارے میں کی گئی تھی ان دو آیات میں ان کے آخری نتائج کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کس طرح کفر تفرقہ بازی نفاق و جاہلیت کی طرف پلٹ جانا روسیاہی کا سبب ہے اور کس طرح اسلام وایمان اور اتحاد وخلوص سفید روئی کا سبب ہیں۔

مندرجہ بالا آیات تصریح کر رہی ہیں کہ روز قیامت کچھ چہرے نورانی ہوں گے اور کچھ تاریک جن کے چہرے سیاہ ہوں گے ان سے کہا جائے گا کہ تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیوں اختیار کیا اور اسلام کے زیر سایہ اتحاد واخوت کی راہ اپنانے کے بعد نفاق وجاہلیت کی راہ کیوں اختیار کی ان کے مقابلے میں وہ مومنین جو متحد و متفق رہے ہوں گے دریائے رحمت الٰہی میں ڈوب جائیں گے اور ہمیشہ کے لئے وہاں راحت وآرام کی زندگی بسر کریں گے۔

کئی دفعہ یہ یاد دہانی کرائی جا چکی ہے کہ دوسرے جہان میں انسان کی زندگی کے حالات وکیفیات اور جزا وسزا اس جہاں

کے اعمال اور افکار کے مجسمے ہوں گے دوسرے لفظوں میں اس جہاں میں جو کام بھی انسان سے سرزد ہوتا ہے وہ روح کی گہرائیوں میں وسیع اثرات مرتب کرتا ہے ممکن ہے اس دنیا میں اسے نہ سمجھا جا سکے لیکن قیامت میں یہ حقیقی صورت میں جلوہ گر ہوں گے اور چونکہ وہاں روح کی حاکمیت و تجلی زیادہ ہوگی اس لیے اس کے آثار جسم پر بھی مرتب ہوں گے جیسا کہ اس جہاں کا ایمان واتحاد سفید روئی کا سبب ہے اور اس کے برعکس بے ایمان لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے اگلے جہاں میں یہ مجازی سفیدی اور سیاہی حقیقی شکل اختیار کرے گی اور لوگ روشن یا سیاہ چہروں کے ساتھ محشور ہوں گے۔

(۱۰۸)تِلۡکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتۡلُوۡہَا عَلَیۡکَ بِالۡحَقِّ ؕ وَ مَا اللّٰہُ یُرِیۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعٰلَمِیۡنَ	کتاب کی یہ برحق آیات ہیں جنہیں ہم تیرے سامنے پڑھ کر سناتے ہیں اور خدا ہرگز عالمین کے لئے ظلم وستم کا ارادہ نہیں رکھتا۔
(۱۰۹)وَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ اِلَی اللّٰہِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ۠	اور (کس طرح ممکن ہے کہ خدا ظلم چاہے جبکہ) جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے وہ اس کی ملکیت میں ہے اور تمام کاموں کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔

تفسیر

مندرجہ بالا آیت گذشتہ مطالب اتحاد واتفاق ایمان و کفر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور ان کے نتائج کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہ خدا کی برحق آیات ہیں جو ہم تیرے سامنے پڑھتے ہیں اور ان احکامات کی خلاف ورزی کی وجہ سے جو کچھ لوگوں کو بھگتنا پڑتا ہے ان کے اعمال کی پاداش ہے اور خداوند تعالیٰ کسی پر کسی قسم کا ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ وہی برے اثرات ہیں جو انہوں نے اپنے ہاتھ سے فراہم کئے ہیں۔

(۱۰۹) یہ آیت خدا کے ظالم نہ ہونے پر دو دلیلیں پیش کرتی ہے

پہلی یہ کہ وہ خدا جو ان تمام کا خالق و مالک ہے اس کے بارے میں ظلم کا تصور نہیں ہوسکتا کیونکہ ظلم وزیادتی تو وہ کرتا ہے جس کے پاس وہ چیز نہ ہو جو دوسروں کے پاس موجود ہے لہٰذا اسے حاصل کرنے کے لئے وہ ظلم کا ارتکاب کرتا ہے۔

دوسری دلیل یہ کہ ظلم وستم کا تصور اس کے بارے میں ہوسکتا ہے جس کی خوشنودی حاصل کئے بغیر کوئی کام وقوع پذیر ہوسکتا ہو لیکن اس ذات کے بارے میں ظلم وستم چہ معنی کہ جس کی اجازت کے بغیر کوئی کام انجام پذیر نہیں ہوسکتا اور تمام امور کائنات کا آغاز و انجام اسی کی ذات سے وابستہ ہے۔

(۱۱۰) كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَ لَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ	تم وہ بہترین قوم تھے جسے لوگوں کے فائدے کے لئے پیدا کیا گیا ہے تاکہ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو اور خدا پر ایمان لے آؤ اور اگر دیگر اہل کتاب (اس پروگرام اور واضح آئین پر) ایمان لے آئیں تو ان کے لئے فائدہ ہے لیکن ان میں سے تھوڑے ہی صاحب ایمان ہیں ورنہ اکثر فاسق ہیں۔

تفسیر

فتنہ وفساد کا مقابلہ کرنے اور دعوت حق کی یاددہانی

اس آیت میں امر بالمعروف نہی عن المنکر اور خدا پر ایمان رکھنے کی دعوت کا اعادہ کیا گیا ہے اور جیسا کہ آیہ ۱۰۴ کے ذیل میں کہا گیا ہے یہ آیت بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک اجتماعی فریضہ کے طور پر بیان کرتی ہے جبکہ گذشتہ آیت نے اس کے ایک خاص مرحلہ کو بیان کیا تھا جو خصوصی اور واجب کفائی ہے اور اس کی تفصیلی تشریح بیان کی جا چکی ہے۔

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں مسلمانوں کو بہترین امت کہا گیا ہے جسے انسانی معاشرے کی خدمت کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اس کی دلیل یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں اور خدا پر ایمان رکھتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی معاشرے کی اصلاح ایمان دعوت حق اور فتنہ وفساد کا مقابلہ کیے بغیر ممکن نہیں۔

ضمنی طور پر اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ دو عظیم فرائض دین اسلام میں جو وسعت رکھتے ہیں وہ گذشتہ ادیان میں نہ تھی اور اس امت کا بہترین ہونا واضح ہے کیونکہ یہ آخری آسمانی دین کی حامل ہے اور آخری دین تکامل کی اساس پر کامل ترین دین ہے۔

بعدازاں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ مذہب جو اس طرح روشن ہے اور وہ قوانین جو اس قدر باعظمت ہیں ان کے فوائد سے انکار نہیں کیا جا سکتا بنا برایں اگر اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) ان باتوں پر ایمان لے آئیں تو ان کا اپنا ہی فائدہ ہے لیکن بہت افسوس کا مقام ہے کہ ان کی اقلیت نے جاہلانہ تعصب پر ٹھوکر مار کر کھلے دل سے اسلام قبول کیا ہے جب کہ ان کی اکثریت فرمان خداوندی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں یہاں تک کہ انہوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق اپنی کتب میں موجود بشارتوں کی بھی پرواہ نہیں کی اور وہ اپنے کفر وتعصب پر اسی طرح ڈٹے رہے۔

(۱۱۱) لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ؕ وَ اِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۟ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ	اور وہ تمہیں ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتے سوائے تھوڑی سی آزار واذیت کے اور اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تمہیں پیٹھ دکھا کر (بھاگ) جائیں گے اس کے بعد کوئی بھی ان کی مدد کو نہیں آئے گا۔

(۱۱۲)ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ اَيۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الۡمَسۡكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا يَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقۡتُلُوۡنَ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوۡا وَّ كَانُوۡا يَعۡتَدُوۡنَ ۙ	وہ جہاں کہیں ہوں گے ان پر ذلت ورسوائی کی مہر لگی ہوئی ہے مگر یہ کہ وہ خدا سے رابطہ قائم کریں یا لوگوں سے وابستگی کے ذریعے (اِدھر اُدھر سے مدد حاصل کرلیں)۔اور وہ خدا کے غضب میں گھرے ہوئے ہیں اور بیچارگی کی مہر ان پر ثبت ہو چکی ہے کیونکہ وہ آیات خداوندی کا انکار کرتے تھے اور خدا کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے یہ سب کچھ ان کے گناہوں کی وجہ سے ہے اور وہ تجاوز کرتے ہیں۔

شان نزول

جب بعض روشن ضمیر سرداران یہود مثلاً عبداللہ بن سلام اپنے رفقاء کے ہمراہ دین اسلام میں داخل ہو گئے تو یہودیوں کے بعض سرداران کے پاس آئے اور انہیں سرزنش وملامت کی یہاں تک کہ انہیں دھمکی دی اور کہا کہ تم اپنے آباؤ اجداد کا دین چھوڑ کر اسلام کیوں لے آئے ہو ان پر مندرجہ بالا آیات انہیں اور باقی مسلمانوں کو مژدہ سنانے کے لئے نازل ہوئیں۔

تفسیر

بعض مسلمان اپنی سابقہ کافر قوم کے ہاتھوں مصیبت میں مبتلا تھے وہ انہیں قبول اسلام پر سرزنش وملامت کرتے تھے اور بعض اوقات انہیں دھمکیاں دیتے تھے یہ آیت انہیں بشارت دیتی ہے کہ مخالفین تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور بہت کم ضرر پہنچا سکتے ہیں اور بدکلامی سے بڑھ کر کچھ نہیں کر سکتے۔

ان دونوں آیات میں درحقیقت مسلمانوں کے لئے چند پیشین گوئیاں اور خوشخبریاں ہیں جو تمام کی تمام حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں ظاہر ہوئیں۔

1۔اہل کتاب کبھی مسلمانوں کو کوئی قابل اعتنا ضرر نہیں پہنچا سکیں گے اور ان کے معمولی نقصانات دیرپا نہیں ہوں گے۔

2۔جب وہ مسلمانوں کے ساتھ میدان کارزار میں نبرد آزما ہوں گے تو انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑے گا اور آخری فتح و کامیابی مسلمانوں کو نصیب ہوگی اور یہودیوں کی حمایت کے لئے کوئی بھی نہیں کھڑا ہوگا۔

3۔زیرِ نظر دوسری آیت میں ہے کہ یہ کبھی اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہوں گے اور ہمیشہ ذلیل وخوار رہیں گے مگر یہ کہ اپنے پروگرام کو تبدیل کریں اور خدا کی راہ پر چلیں یا دوسرے لوگوں سے مل جائیں اور وقتی طور پر ان کی طاقت سے فائدہ اٹھائیں۔

بہت جلد یہ تینوں وعدے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں پورے ہو گئے خصوصاً حجاز کے یہودی (بنی قریظہ بنی نضیر بنی قنیقاع بنی مصطلق اورخیبر کے یہودی) کئی مرتبہ مسلمانوں کے ساتھ میدان جنگ میں آمنے سامنے ہوئے اور بالا آخر سب شکست سے دوچار ہوکر روپوش ہو گئے

''ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ''

ثقفوا کا مادہ ثقف (بروزن مقف) ہے اور ثقافت کے لغوی معنی کسی چیز کو مہارت کے ساتھ پا لینے کے ہیں اور جس چیز کو انسان باریک بینی اور مہارت کے ساتھ حاصل کر لے اسے ثقافت کہا جاتا ہے قرآن مجید کے اس جملے میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ جہاں کہیں ہوں ذلت کی مہر ان کی پیشانی پر ثبت ہو چکی ہے۔

اگر چہ ان آیات میں یہودیوں کا نام لے کر ان کو نہیں پکارا گیا تاہم سورہ بقرہ کی آیت ۶۱ اور ان آیات کے قرآئن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ بھی یہودیوں کے بارے میں ہے۔

اس کے بعد اس جملے کے ذیل میں کہا گیا ہے کہ صرف دو صورتیں ہیں جن کی وجہ سے وہ اس ذلت کی مہر کو مٹا سکتے ہیں پہلی صورت خدا کی طرف بازگشت اور اس سے رشتہ جوڑنا ہے اور اس کے سچے دین پر ایمان لانا ہے۔ یا لوگوں سے وابستگی اور ان کا سہارا لینا ہے۔

اس جملے کا معنی یہ ہے کہ یہودی اول تو اپنی کارستانیوں کی وجہ سے دوسروں کی طرف سے دھتکارے گئے ہیں اور غضب خدا میں گرفتار ہوئے ہیں پھر آہستہ آہستہ یہ ان کے لئے ایک ذاتی صفت بن گیا ہے حتی کہ وہ تمام امکانات کے باوجود احساس کی حقارت میں مبتلا ہیں اس لیے اس جملے میں کوئی استثناء موجود نہیں ہے

آیت کے آخری حصے میں یہودیوں کی بدبختی کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ اگر وہ ایسی بدبختی میں گرفتار ہیں تو اس کی وجہ نسلی و خاندانی تکبر ہے نہ کہ دوسری خصوصیات۔ بلکہ یہ ان کے اعمال کا نتیجہ ہے کیونکہ اول تو یہ خدا کی آیات کا انکار کرتے تھے اور ثانیاً یہ کہ پیشوایان خلق اور نجات دہندگان بشر کو قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے اور تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ مختلف نوعیت کے گناہوں، ظلم و ستم کرنا، دوسروں کے حقوق پر قبضہ کرنا اور باقی لوگوں کے منافع پر تجاوز کرنا میں مبتلا تھے اور مسلم ہے کہ جو قوم اس قسم کے اعمال کا ارتکاب کرے گی اس کی حالت بھی ان سے مشابہ ہوگی۔

(۱۱۳) لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَ هُمْ يَسْجُدُوْنَ	وہ سب برابر نہیں ہیں اہل کتاب میں ایک گروہ ایسا ہے جو (حق وایمان کے ساتھ) قائم ہے اور وہ اوقات شب میں مسلسل حالت سجدہ میں آیات خدا کی تلاوت کرتے ہیں۔

(۱۱۴)يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ	وہ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں اور نیک کاموں کی انجام دہی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں اور وہ نیک لوگوں میں سے ہیں۔
(۱۱۵)وَ مَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ	جو نیک اعمال وہ سرانجام دیتے ہیں انہیں ہرگز نظرانداز نہیں کیا جائے گا اور خدا پرہیزگاروں کو جانتا ہے۔

شان نزول

کہا جاتا ہے کہ جب عبداللہ بن سلام جو ایک یہودی عالم تھا کچھ لوگوں کے ہمراہ مسلمان ہوا تو یہودیوں کے سرداروں کو بہت رنج پہنچا اور وہ اس بات کے درپے ہو گئے کہ انہیں شرارت کا الزام دیں تا کہ یہ لوگوں کی نگاہ میں گر جائیں تا کہ ان کا عمل دوسروں کے لئے نمونہ اور قابل تقلید نہ بنے لہٰذا علماء یہود نے یہ نعرہ بلند کیا کہ ہم سے صرف شریر لوگ مسلمان ہوئے ہیں اگر وہ صحیح لوگ ہوتے تو اپنے آباؤاجداد کا دین نہ چھوڑتے اور ملت یہودی کے ساتھ خیانت نہ کرتے خداوند عالم نے ان آیات کو نازل کر کے ان کا دفاع کیا ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں یہودیوں کے برے افراد کی شدید مذمت کے بعد قرآن کریم اس آیت میں عدالت کے پیش نظر اور ان کے اچھے افراد کے حقوق کے احترام کی وجہ سے اور یہ حقیقت بتانے کے لئے کہ ان سب کو ایک نگاہ سے نہیں دیکھا جاسکتا کہتا ہے کہ اہل کتاب تمام کے تمام ایک جیسے نہیں بلکہ تباہ کار افراد کے مقابلے میں ایسے نیک طینت افراد بھی موجود ہیں جو خدا کی اطاعت اور ایمان پر ثابت قدم ہیں وہ ہمیشہ نیم شب کو آیت خدا کی تلاوت کرتے رہتے ہیں اور عظمت پروردگار کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں۔

(۱۱۴) زیرنظر دوسری آیت میں ہے کہ وہ خدا و روز جزاء پر ایمان رکھتے ہیں (يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ) امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور نیک کاموں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ وہ صالح اور با ایمان افراد ہیں۔

(۱۱۵) یہ آیت دراصل پہلی آیت کی تکمیل کرتی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ اہل کتاب کے اس گروہ کے نیک اعمال کی بہترین جزا ہوگی یعنی گذشتہ عمر میں اگر چہ غلطیوں کے مرتکب رہے ہوں جب انہوں نے اپنی روش بدلی اور پرہیزگاروں کی صفت میں شامل ہو گئے تو یہ اپنے نیک اعمال کا ثمرہ دیکھ لیں گے اور خدا کی طرف سے ہرگز ناقدری نہیں پائیں گے۔

باوجودیکہ خدا تمام چیزوں کو جانتا ہے اس جملے میں خصوصیت سے کہتا ہے کہ خداوند عالم پرہیزگاروں سے آگاہ ہے۔ اور یا

یہ تعبیر پرہیزگار لوگوں کی اقلیت کی غمازی کرتی ہے خصوصاً پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے یہودیوں میں سے تو یہ راستہ اختیار کرنے والے بہت ہی اقلیت میں تھے اور یہ فطری بات ہے کہ اس قسم کے کم تعداد افراد نظر میں نہیں رہتے لیکن پروردگار عالم کے وسیع علم کی تیز نگاہ سے یہ لوگ ہرگز مخفی نہیں رہیں گے اور خدا ان سے آگاہ ہے ان کے نیک اعمال کم ہوں یا زیادہ ہرگز رائیگاں نہیں ہوں گے۔

(۱۱۶)اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَنۡ تُغۡنِیَ عَنۡهُمۡ اَمۡوَالُهُمۡ وَ لَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ شَیۡـًٔا ؕ وَ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ	جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہ ہرگز اپنے اموال اور اولاد کے ذریعے اللہ کے عذاب وسزا سے نہیں بچ سکتے وہ اہل جہنم ہیں اور ہمیشہ کے لئے اس میں رہیں گے۔
(۱۱۷)مَثَلُ مَا یُنۡفِقُوۡنَ فِیۡ هٰذِهِ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا کَمَثَلِ رِیۡحٍ فِیۡهَا صِرٌّ اَصَابَتۡ حَرۡثَ قَوۡمٍ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فَاَهۡلَکَتۡهُ ؕ وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰکِنۡ اَنۡفُسَهُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ	جو کچھ وہ اس دنیاوی زندگی میں خرچ کرتے ہیں وہ جلانے والی (گرم) ہوا کی مانند ہے جو اس قوم کی زراعت پر چل پڑے جس نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ پس وہ اسے نیست و نابود کردے خدا نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں جن حق جو اور با ایمان افراد کی ستائش کی گئی ہے ان کے مقابلے میں بے ایمان اور ستمگر لوگ ہیں ان کی حالت ان دو آیات میں بیان کی گئی ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے وہ ہرگز اپنے مال و دولت اور اولاد کی کثرت کے گھمنڈ میں خدا کی سزا سے چھٹکارہ نہیں پا سکتے کیونکہ روز جزا صرف نیک عمل صدق ایمان اور خلوص نیت ہی انسان کے کام آئے گا نہ کہ اس جہاں کے مادی امتیازات۔

مادی وسائل میں سے صرف دولت اور اولاد کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لیے ہوا ہے کہ اہم ترین مادی سرمایہ ایک تو افرادی قوت ہے جس کی طرف اولاد سے اشارہ کیا گیا ہے اور دوسرا اقتصادی سرمایہ ہے اور دیگر مادی وسائل کا سرچشمہ یہی دونوں چیزیں ہیں

قرآن واضح طور پر اعلان کر رہا ہے کہ صرف مال و متاع اور افرادی قوت کے بل بوتے پر خدا کے ہاں امتیاز حاصل نہیں کیا جا سکتا اور انہی پر بھروسہ کرنا خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہے مگر یہ کہ انہیں ایمان اور خلوص نیت کے ساتھ صحیح راستوں میں خرچ کیا جائے ورنہ بصورت دیگر ان کے مالکوں کا انجام کار دائمی عذاب ہے۔

(۱۱۷) اس آیت میں ان کی ریاکارانہ سخاوت اور خرچ کرنے کی کیفیت کی طرف اشارہ ہے اور ایک بہترین مثال کے ذریعے ان کے انجام کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

قرآن کریم کفار کے خرچ کرنے کو سخت قسم کی جلانے والی یا بہت سرد اور خشک کر دینے والی ہوا سے تشبیہ دیتا ہے جو کسی زراعت پر چل پڑے اور اسے خشک کر دے

بے ایمان اور گناہ آلود افراد کا چونکہ انفاق میں صحیح مقصد نہیں ہوتا اس لیے خودنمائی اور ریاکاری کی روح کو چلانے والی خشک ہوا ان کے انفاق کی زراعت پر چل پڑتی ہے اور اسے ناکارہ بنا دیتی ہے۔

آیت کے آخر میں کہا گیا ہے کہ خدا نے اس سلسلے میں ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور وہ اپنا سرمایہ خود برباد کرتے ہیں کیونکہ فاسد اور برے کام کا نتیجہ فاسد اثر کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

(۱۱۸) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖۚ وَ مَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ	اے ایمان والو! اپنوں کے علاوہ کسی کو راز دار نہ بناؤ وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کے بارے میں کوتاہی نہیں کریں گے وہ تمہاری تکلیف پر خوش ہوتے ہیں ان کے دل کی دشمنی اور عداوت ان کے منہ سے نکل پڑتی ہے اور جو کچھ ان کے دلوں میں ہے وہ اس سے بھی شدید تر ہے ہم نے آیات (اور ان سے محفوظ رہنے کی تدابیر) تمہارے لیے واضح کر دی ہیں بشرطیکہ تم عقل و خرد سے کام لو۔
(۱۱۹) هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَ لَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَ اِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۖۚ وَ اِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ	تم عجیب لوگ ہو کہ انہیں دوست رکھتے ہو لیکن وہ تمہیں دوست نہیں رکھتے۔ حالانکہ تم تمام آسمانی کتب پر ایمان رکھتے ہو اور جس وقت وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں لیکن جب وہ تنہائی میں ہوتے ہیں تو شدید غیظ و غضب سے اپنی انگلیاں کاٹنے لگ جاتے ہیں۔ کہہ دو کہ تم اپنے غصہ میں جل مرو خدا سینوں میں چھپے ہوئے (اسرار) سے آگاہ ہے۔

(۱۲۰) اِنۡ تَمۡسَسۡكُمۡ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ ۫ وَ اِنۡ تُصِبۡكُمۡ سَیِّئَةٌ یَّفۡرَحُوۡا بِهَا ؕ وَ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا لَا یَضُرُّكُمۡ كَیۡدُهُمۡ شَیۡـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ مُحِیۡطٌ ۫	اگر تمہیں کوئی راحت ملتی ہے تو انہیں برا لگتا ہے اور اگر تمہیں کوئی ناخوشگوار حادثہ پیش آ جائے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں لیکن تم اگر ان کے مقابلے میں ثابت قدمی اور پرہیزگاری اختیار کرو گے تو ان کی سازشیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتیں خدا اس چیز پر احاطہ رکھتا ہے جو وہ انجام دیتے ہیں۔

شان نزول

ابن عباس سے منقول ہے کہ یہ آیات اس وقت نازل ہوئیں جب کچھ مسلمان یہودیوں سے قرابت داری ہمسائیگی رشتہ رضاعت یا قبل اسلام کے عہد و پیمان کی وجہ سے دوستی رکھتے تھے اور ان کے ساتھ اس خلوص و محبت سے پیش آتے تھے یہاں تک کہ مسلمانوں کے بھید ان پر ظاہر کر دیتے تھے اس طریقے سے یہودی مسلمانوں کے رازوں سے آگاہ ہو جاتے تھے حالانکہ وہ اندرونی طور پر مسلمانوں کے سخت دشمن تھے اگرچہ ظاہری طور پر اپنے آپ کو ان کے دوست ظاہر کرتے تھے اس آیت میں مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی کہ چونکہ وہ لوگ تمہارے دین میں نہیں آئے اس لیے انہیں اپنا رازدار نہ بناؤ کیونکہ وہ تمہارے بارے میں کسی برائی سے دریغ نہیں کریں گے ان کی خواہش ہے کہ تم ہمیشہ مصیبت میں رہو۔

تفسیر

اغیار کو راز واں نہ بناؤ

گذشتہ آیات میں مسلمانوں اور کفار کا تقابل کیا گیا اس آیت میں ایک حساس مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے اور ایک حسین و لطیف تشبیہ کے ذریعے تنبیہ کی گئی ہے کہ اپنے ہم مسلک افراد کے علاوہ کسی کو اپنا دوست اور ہمراز نہ بناؤ اور اغیار کو اپنے اندرونی راز نہ بتاؤ یعنی کفار تمہاری دوستی کے لائق نہیں اور نہ ہی انہیں تمہارا دوست اور ہمراز ہونا چاہئے کیونکہ وہ مسلمانوں کو گزند پہنچانے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ سابقہ دوستی ہرگز ان کے لئے رکاوٹ نہیں بنتی کہ وہ مذہب و مسلک کی بنا پر تمہاری تکلیف و نقصان کا نہ سوچیں بلکہ ان کی ہمیشہ خواہش یہ ہے کہ تم غم و اندوہ میں مبتلا رہو۔

وہ عموماً اپنی رفتار و گفتار میں احتیاط برتتے ہیں اور سوچ سمجھ کر بات کرتے ہیں تاکہ تم پر ان کے راز فاش نہ ہوں اور نہ ان کی مخفی باتوں کا تمہیں علم ہو لیکن اس کے باوجود دشمنی و عداوت کے آثار ان کی باتوں سے ٹپکتے ہیں اور کبھی کبھار لاشعوری طور پر کچھ باتیں ان کی زبان پر آ جاتی ہیں جو ان کے دلوں میں آگ کی چنگاریوں کی مانند ہیں اور ان کی وجہ سے ان کے باطن کو سمجھا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس سے خداوند عالم نے دشمنوں کے باطن کو پہچاننے کے طریقہ کی نشاندہی کی ہے اوران کی اندرونی باتوں کے متعلق فرمایا ہے کہ جو کچھ عداوت اور دشمنی وہ اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے کئی درجے زیادہ ہے جس کا وہ زبان سے اظہار کرتے ہیں۔

اس کے بعد مزید کہا گیا کہ ہم نے یہ آیات اس لیے بیان کیں کہ ان میں تدبر کرنے سے تم دوست دشمن کو آسانی سمجھ سکو گے اور دشمنوں کے شر سے خلاصی حاصل کرلو گے۔

(۱۱۹) اے گروہ مسلمین! تم ان سے قرابت ہمسائیگی یا کسی اور سبب سے دوستی کا رشتہ قائم کرتے ہو مگر اس سے غافل ہو کہ وہ تمہیں ہرگز دوست نہیں رکھتے حالانکہ تم اللہ کی طرف سے نازل کردہ تمام آسمانی کتب پر ایمان رکھتے ہو (چاہے وہ تمہاری کتاب ہو یا ان کی آسمانی کتب) لیکن وہ تمہاری آسمانی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے۔

اہل کتاب کا یہ گروہ دوغلا پن کرتا ہے جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور ہم تمہارے دین کی تصدیق کرتے ہیں لیکن جب علیحدگی میں ہوتے ہیں تو کینہ وعداوت اور غصے سے اپنی انگلیوں کی پوریں کاٹتے ہیں۔ کہہ دو! اپنے غصے میں جل مرو اور یہ غیظ وغضب مرتے دم تک تم سے جدا نہیں ہوگا۔

تم ان کی کیفیت سے آگاہ نہیں ہو لیکن خدا ان کی خبر رکھتا ہے کیونکہ وہ دلوں میں چھپے ہوئے بھیدوں سے واقف ہے۔

(۱۲۰) اس آیت میں ان کے بغض وکینہ کی ایک علامت بیان کی گئی ہے کہ اگر تمہیں فتح وکامیابی نصیب ہو تو وہ ناخوش ہوتے ہیں اور تمہیں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آئے تو وہ مسرور ہوتے ہیں۔

لیکن اگر تم ان کی کینہ پروریوں کے مقابلے میں صبر سے کام لو اور خوددار و پرہیزگار ہو جاؤ تو وہ اپنی خائن سازشوں کے ذریعے تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے کیونکہ جو کچھ وہ کرتے ہیں اس پر خدا مکمل کنٹرول رکھتا ہے بنابرایں آیت کے سیاق وسباق سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے دشمنوں کی بری سازشوں سے بچنے کے لئے استقامت ہوشیاری اور تقویٰ شرط ہے اور اسی صورت میں ان سے مامون رہنے کی ضمانت دی گئی ہے۔

(۱۲۱) وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ	اور (یاد کرو) وہ وقت جب تم صبح کے وقت اپنے گھر والوں سے مومنین کے لئے لشکر جنگ انتخاب کرنے باہر نکلے خدا سننے اور جاننے والا ہے (جنگ کے بارے میں جو بعض لوگوں نے باتیں کیں خدا سب کو جانتا ہے)۔

(۱۲۲)اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَ اللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ	اور (یاد کرو) وہ وقت جب تم میں سے دو گروہوں نے سستی کا مظاہرہ کرنے کا مصمم ارادہ کیا (اور چاہا کہ وہ راستے سے پلٹ جائیں) اور خدا ان کا مددگار تھا (کہ وہ اس فکر سے باز آ جائیں) اور اہل ایمان کو صرف خدا پر توکل کرنا چاہیئے۔

تفسیر

یہاں سے ایک اہم وسیع اسلامی واقعہ یعنی جنگ اُحد کے بارے میں آیات شروع ہوئی ہیں گذشتہ آیات کے قرائن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں آیات جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی اور اس وحشت ناک جنگ کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور بہت سے مفسرین کا بھی یہی نظریہ ہے۔

سب سے پہلے یہ پیغمبر ﷺ کے مدینہ سے کوہ اُحد کے دامن میں لشکر گاہ کے انتخاب کے لئے باہر آنے کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور ارشاد ہوتا ہے اے پیغمبر ﷺ یاد کرو! اس دن کو کہ صبح کے وقت تم اپنے عزیز واقارب کو چھوڑ کر مدینہ سے باہر آئے تا کہ دشمن سے جنگ کرنے کے لئے مومنین کے لئے کوئی لشکر گاہ تیار کر سکو اس روز مسلمانوں کے درمیان چہ میگوئیاں ہوئیں اس کی طرف ہم واقعہ اُحد کی تفصیل میں اشارہ کریں گے۔

مقام جنگ کے انتخاب کے بارے میں بہت زیادہ اختلاف تھا کہ آیا مدینہ میں ہو یا باہر اور رسالت مآب ﷺ نے اکثریت کے نظریہ کو قبول کر لیا اور لشکر گاہ شہر سے باہر کوہ اُحد کے دامن میں منتقل کر دی فطری طور پر ان میں کچھ ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے کچھ باتیں دل میں چھپا رکھی تھیں اور کئی وجوہات کی بنا پر انہیں ظاہر کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔

''واللّٰہ سمیع علیم'' کا جملہ گویا ان سب کی حالت کی غمازی کرتا ہے کہ خدا تمہاری باتوں کو بھی سنتا ہے اور تمہارے مخفی بھیدوں کو بھی جانتا ہے۔

(۱۲۲)''اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا..............................''

اس جملے کا روئے سخن اس ماجرے کے ایک اور پہلو کی طرف ہے اور وہ یہ کہ اس وقت مسلمانوں کے دو گروہ تاریخ کے مطابق قبیلہ اوس میں سے بنوسلمہ اور خزرج میں سے بنوحارثہ نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ جنگ سے پہلو تہی کرتے ہوئے ایک راستے سے مدینہ کی طرف پلٹ آئیں گے۔

اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ مدینہ کے اندر جنگ کرنے کے حق میں تھے۔لیکن پیغمبر اکرم ﷺ نے اس بات کو قبول نہ کیا علاوہ ازیں جیسا کہ واقعہ کی تفصیل سے معلوم ہو جائے گا کہ عبداللہ بن سلول تین سو یہودیوں کے ہمراہ لشکر اسلام میں آیا تھا اور اس

صورتحال کی وجہ سے وہ لوگ بھی مدینہ کی طرف واپس آ گئے اس بات نے دو مسلمان گروہوں کے لوٹ جانے کے پختہ ارادہ کو متزلزل اور کمزور کر دیا۔لیکن جیسا کہ آیت کے ذیل سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دونوں گروہ اپنے ارادے سے پلٹ آئے اور دیگر مسلمانوں سے آ ملے اس لیے قرآن کہتا ہے کہ خدا ان دو گروہوں کا مددگار معاون ہے اور اہل ایمان کو خدا پر بھروسہ کرنا چاہئے۔

(۱۲۳)وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ	خدا نے بدر میں تمہاری مدد کی (جب کہ تم ان کی نسبت ناتواں تھے) پس خدا سے ڈرو تا کہ تم اس کی نعمت کا شکر ادا کرنے والوں میں شمار رہو۔
(۱۲۴)اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ؕ	جس وقت تم مومنین سے کہتے تھے کہ کیا یہ کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار تین ہزار ملائکہ (آسمان سے) اتار کر تمہاری مدد کرے۔
(۱۲۵)بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ يَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ	ہاں! (آج بھی) اگر تم صبر و استقامت اور پرہیزگاری اختیار کرو اور جب دشمن تم پر چڑھ آئے گا تو خدا پانچ ہزار مخصوص نشان رکھنے والے فرشتوں کے ذریعے تمہاری مدد کرے گا۔
(۱۲۶)وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَ لِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۙ	لیکن یہ سب کچھ تو صرف تمہیں بشارت دینے کے لئے اور تمہارے اطمینان کی خاطر ہے ورنہ کامیابی تو فقط خدائے توانا و حکیم کی طرف سے ہے۔
(۱۲۷)لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ	(یہ وعدہ جو خدا نے تمہارے ساتھ کیا ہے) اس لیے ہے تا کہ لشکر کفار کے ایک حصہ کو قطع کر دے یا انہیں ذلت کے ساتھ پلٹائے تا کہ وہ مایوس ہو کر کو پلٹ جائیں۔

تفسیر

جیسا کہ کہا جا چکا ہے یہ آیات مسلمانوں کے جذبے کو تقویت دینے کے لئے نازل ہوئیں اور ان میں پہلے مسلمانوں کی میدان بدر کی کامیابی کی طرف اشارہ کیا گیا تا کہ اس کے ذکر سے ان کے دلوں میں آئندہ کے لئے جوش و جذبہ بڑھ جائے ارشاد ہوا کہ خدا نے تمہیں بدر میں کامیابی سے سرفراز فرمایا جب کہ تم دشمن کی نسبت کمزور تھے تو تعداد اور جنگی ساز و سامان کے لحاظ سے تمہارا اور

دشمن کا کوئی تقابل ہی نہ تھا تمہاری تعداد ۳۱۳ اور بہت کم ساز وسامان تھا جب کہ مشرکین کے پاس بہت زیادہ ساز وسامان تھا اور ان کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی ان حالات میں تم خدا سے ڈرو اور اپنے پیشوا حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکم عدولی کو نہ دہراؤ تا کہ اس طرح سے اس کی گونا گوں نعمات کا شکر بجالاؤ۔

(۱۲۴) بعد از اں میدان بدر میں فرشتوں کے ذریعے مسلمانوں کی مدد کرنے کے واقعہ کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ اس دن کو فراموش نہ کرو جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تم سے کہا تھا کہ کیا تمہاری مدد کے لئے تین ہزار فرشتے کافی نہیں ہیں۔

(۱۲۵) ہاں! اگر آج بھی پائیداری اور استقامت کا مظاہرہ کرو قریش کے مقابلے میں نکلو تقویٰ و پرہیز گاری اختیار کرو اور گذشتہ کی طرح فرمان رسول کی مخالفت نہ کرو تو اس صورتحال میں اگر مشرکین تیزی کے ساتھ تمہاری طرف پلٹ آئیں تو خدا پانچ ہزار مخصوص نشانیوں والے فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔

(۱۲۶) لیکن یہ بات یاد رہے کہ تمہاری مدد کے لئے ملائکہ کی آمد تو صرف تمہاری تشویق اطمینان قلب اور تقویت جذبہ کے لئے ہے ورنہ کامیابی تو صرف خدا کی طرف سے ہے جو ہر چیز پر قادر ہے اور تمام کاموں میں اس کی حکمت کارفرما ہے وہ کامیابی کے راستے بھی جانتا ہے اور اسے جاری کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔

(۱۲۷) اگر چہ مفسرین حضرات اس آیت کی تفسیر میں اختلافات کے شکار ہیں لیکن اگر سابقہ آیات کی طرح خود آیات اور موجودہ تاریخ سے مدد لی جائے تو اس آیت کی تفسیر بھی واضح ہوتی ہے ارشاد خداوندی ہے کہ یہ جو دشمن سے نئی جنگ کرنے کی صورت میں فرشتوں کے ذریعہ تمہاری مدد کا وعدہ کیا گیا ہے یہ اس بنا پر ہے کہ لشکر مشرکین کے حصہ کو قطع کر دے اور انہیں ذلت کے ساتھ پلٹا دے آیت میں طرف کا معنی ٹکڑا ہے اور ''یکبتھم'' کبت سے ہے جس کے معنی کسی کو زبردستی اور ذلیل کر کے واپس کرنے کے ہیں۔

(۱۲۸) لَیۡسَ لَکَ مِنَ الۡاَمۡرِ شَیۡءٌ اَوۡ یَتُوۡبَ عَلَیۡهِمۡ اَوۡ یُعَذِّبَهُمۡ فَاِنَّهُمۡ ظٰلِمُوۡنَ	کسی قسم کا اختیار (کفار اور جنگ سے فرار کرنے والے مسلمانوں کے فیصلے کے بارے میں) تمہیں نہیں ہے مگر یہ کہ خدا چاہے کہ انہیں درگزر کر دے یا سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔

تفسیر

اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے لیکن یہ مسلم ہے کہ یہ آیت جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی اور اس کے واقعات سے متعلق ہے۔

اس آیت کی شان نزول روایات میں مختلف انداز سے پیش کی گئی ہے ان میں سے یہ بھی ہے کہ جب جنگ اُحد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہوئے اور جبین مبارک زخمی ہوگئی اور مسلمانوں کو بہت سخت نقصان پہنچا تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کفار کے امروز وفردا کے متعلق سوچنے لگے کہ یہ لوگ کس طرح راہ ہدایت پر آئیں گے اور فرمایا:

''کیف یفلح قوم فعلوا هذا بنبیهم وهو یدعوهن الی ربهم''

(یہ گروہ کیسے فلاح پائے گا جس نے اپنے پیغمبر سے یہ سلوک کیا جب کہ وہ انہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہے)۔
اس مقام پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور پیغمبر کو تسلی و تشفی دی گئی کہ آپ ان کی ہدایت کے جواب دہ نہیں ہیں بلکہ آپ کی ذمہ داری صرف تبلیغ ہے

(۱۲۹)وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ؑ	اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ کی ملکیت ہے وہ جسے چاہتا ہے (اور مناسب سمجھتا ہے) بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عذاب دے دیتا ہے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر

درحقیقت یہ آیت گذشتہ آیت کی تاکید ہے کہ بخشنا اور سزا دینا پیغمبر ﷺ کے ہاتھ میں نہیں بلکہ وہ حکم خداوند کے تابع ہے آسمانوں اور زمین کی حکومت جس کے قبضہ قدرت میں ہے پیدا کرنا اسی خدا کا کام ہے۔

"وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ"

باجودیکہ خداوند قدوس کا عذاب بہت سخت ہے وہ بخشنے والا اور مہربان ہے اور اس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔

(۱۳۰)یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۚ	اے ایماندارو! بڑھا چڑھا کر سود نہ کھاؤ خدا سے ڈرو تاکہ فلاح پا جاؤ۔
(۱۳۱)وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْۤ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ۚ	اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے۔
(۱۳۲)وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۚ	اور خدا اور پیغمبر کی اطاعت کرو تاکہ رحمت (الٰہی) تمہارے شامل حال ہو۔

تفسیر

زیرنظر تین اور بعد والی چھ آیات چند ایک اقتصادی اجتماعی اور تربیتی پروگراموں پر مشتمل ہیں اور ان نو آیات کے بعد پھر از سر نو جنگ اُحد کا تذکرہ ہے۔

سودخوری کی حرمت کے چند مراحل

ہم جانتے ہیں کہ قرآن کا یہ طریقہ ہے کہ وہ معاشرے کی ایسی برائیاں جن کی جڑیں گہری ہو چکی ہیں ان کی بیخ کنی کرنے کے لئے آہستہ آہستہ زمین ہموار کرتا ہے اور لوگوں کو تدریجاً ان کے مفاسد سے آگاہ کرتا ہے اور جب قرآنی احکام قبول کرنے کے

لئے آمادگی حاصل ہوجائے قانون تصریحی شکل میں بیان کردیتا ہے (خصوصا ایسے مواقع پر جہاں گناہ سے آلودگی کا امکان بہت زیادہ ہو۔

یہ بھی واضح ہے کہ دنیائے عرب زمانہ جاہلیت میں سودخوری میں شدت سے ملوث تھی خصوصا مکہ کا گردونواح سودخوروں کا مرکز تھا اوران کی بہت سی قبیح اجتماعی برائیوں کا سبب یہی برا کاروبار تھا بنابرایں قرآن مجید نے سودخوری ختم کرنے کے لئے حرمت کا حکم چار مراحل میں بیان کیا ہے۔

1۔ پہلے پہل سود کے بارے میں سورہ روم آیہ ۳۹ میں ایک اخلاقی نصیحت پر زور دیا گیا ہے۔

2۔ سورہ نساء آیہ ۱۶۱۔ میں یہودیوں کی غلط رسوم وعادات پر تنقید کرتے ہوئے ان کی سودخوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''و اخذھم الربٰوا وقد نھوا عنه''

ان کی ایک بری عادت یہ تھی کہ وہ سود کھاتے تھے حالانکہ انہیں اس سے منع کیا گیا تھا۔

3۔ زیر بحث آیت میں جیسا کہ اس کی تفسیر کے ذیل میں بتایا جائے گا سود کی حرمت کا صریح حکم ذکر ہوا ہے لیکن سود کی صرف ایک قسم کی طرف جو بہت بری قسم ہے اشارہ ہوا ہے

4۔ آخر میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۷۵ سے لے کر ۲۷۹ تک ہر قسم کی سودخوری کی شدت سے ممانعت کا اعلان کیا گیا ہے اور اسے خدا سے جنگ کرنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔

اس آیت میں سود کی قبیح ترین قسم کی حرمت کی طرف اشارہ ہوا ہے اور ''اَضْعَافًا مُضَاعَفَةً'' چند در چند کی تعبیر موجود ہے ربائے فاحش سے مراد یہ ہے اصل سرمایہ ہی اضافی سود کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہے یعنی سود پہلے مرحلے میں اصل سرمائے میں جمع ہو جائے اور آئندہ اصل سرمائے میں سود جمع ہونے پر جو سرمایہ بنا ہے اس پر سود لگے اور اسی ترتیب سے ہر مرتبہ کا سود اضافہ سرمایہ بن کر گذشتہ سرمائے میں جمع ہوتا جائے اور سرمائے کی نئی رقم تشکیل دیتا ہے اس طرح قلیل مدت میں ایک دوسرے پر سود کی زیادتی کی وجہ سے مقروض کے قرضہ کا مجموعہ اصل قرضہ سے کئی گنا زیادہ ہوجائے اور اس کی زندگی مکمل طور پر دیوالیہ ہوجائے جیسا کہ روایات وتواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں یہ معمول تھا کہ اگر مقروض قرض کی مدت ختم ہونے پر قرض نہیں ادا کرسکتا تھا تو قرض خواہ سے تقاضا کرتا کہ وہ سود اور اصل قرض کا مجموعہ نئے سرمائے کی شکل میں اسے بطور قرض دیدے اور اس کا سود لے ہمارے دور میں بھی اس قسم کی ظالمانہ سودخوری کثرت سے رائج ہے۔

آیت کے آخر میں ارشاد رب العزت ہوتا ہے اگر فلاح وکامیابی سے ہمکنار ہونا چاہتے ہو تو تقویٰ اپناؤ اور اس گناہ سے بچو۔

(۱۳۱) یہ آیت ازسرنو تقویٰ کی تاکید کرتی ہے اور اس آگ سے جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے ڈراتی ہے لفظ کافرین کے ساتھ تعبیر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصولی طور پر سودخوری ایمان کے ساتھ سازگار نہیں ہے اور سودخوروں کے لئے بھی اس آگ

کا ایک حصہ ہے جو کفار کی منتظر ہے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کی آگ بنیادی طور پر کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے باقی رہے گناہگار اور معصیت کار تو ان کے لئے اس کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا وہ کفار سے شباہت اور ہم آہنگی رکھتے ہیں۔

(۱۳۲) گذشتہ آیت کی دھمکی اس تشویق و ترغیب کے ساتھ تکمیل پاتی ہے جو اس آیت میں مطیع اور فرمانبرداروں کے لئے ہے کہ خدا اور رسول کی اطاعت کرو اور سود خوری چھوڑ دو تا کہ تم پر اللہ کی رحمت کا سایہ ہو۔

(۱۳۳) وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۙ	ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرو اپنے پروردگار کی مغفرت اور جنت کے لئے جس کی وسعت تمام آسمانوں اور زمین کے برابر ہے اور جو پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔
(۱۳۴) الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۚ	(متقین) وہ لوگ (ہیں) جو تنگی اور کشادگی میں خرچ کرتے ہیں، اپنا غصہ پی جاتے ہیں، لوگوں کی خطاؤں سے درگزر کرتے ہیں اور خدا نیکوکار لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔
(۱۳۵) وَ الَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۖ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۖ۫ وَ لَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ	اور (متقین) وہ لوگ ہیں کہ جب وہ کسی عمل بد کا ارتکاب کریں یا اپنے اوپر ظلم کریں تو خدا کو یاد کرتے ہیں اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہیں اور خدا کے سوا گناہوں کو بخشنے والا کون ہے اور وہ گناہ پر اصرار نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں۔
(۱۳۶) اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ؕ	ان کی جزا پروردگار کی بخشش اور وہ باغات بہشت ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ ہمیشہ کے لئے ان میں رہیں گے اور یہ عمل کرنے والوں کے لئے کتنا اچھا معاوضہ ہے

تفسیر

سعادت کی راہ میں ایک دوسرے پر سبقت

''سارعوا'' ''سارعت'' سے ہے جس کے معنی ہیں کسی مقصد تک پہنچنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے لئے دو یا دو سے زیادہ افراد کی کوشش نیک کاموں میں یہ قابل ستائش ہے اور برے کاموں میں مذموم۔

گذشتہ آیات کے بعد کہ جو بدکاروں کو جہنم کی تہدید اور نیک لوگوں کو رحمت الٰہی کی تشویق کرتی ہیں اس آیت میں نیک

لوگوں کی کوشش اور جستجو کو معنوی مقابلے سے تشبیہ دی گئی ہے جس کا آخری مقصد خدا کی بخشش اور بہشت کی دائمی وابدی نعمات ہیں اور قرآن کہتا ہے کہ اس مقصد تک رسائی کے لئے ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرو۔

اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس مقابلے کا پہلا مقصد مغفرت قرار دیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر معنوی مقام تک رسائی گناہوں کی آلودگی سے پاک وصاف ہوئے بغیر ممکن نہیں ہے لہٰذا سب سے پہلے اپنے آپ کو گناہ سے پاک کیا جائے اور اس کے بعد مقام تقرب الٰہی کی طرف قدم اٹھایا جائے۔

اس معنوی مقابلے کا دوسرا ہدف بہشت ہے جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے عرض کے برابر ہے یہ مخفی نہ رہے کہ اس آیت میں عرض سے مراد علم ہندسہ کی اصطلاح نہیں ہے کہ عرض طول کے مقابلے میں ہو بلکہ اس سے مراد وسعت اور پھیلاؤ ہے اس طرح قرآن صراحت سے کہتا ہے کہ جنت کی وسعت آسمانوں اور زمین کی وسعت جتنی ہے اور سورہ حدید کی آیت ۲۱ میں یہی تعبیر معمولی فرق کے ساتھ آئی ہے۔

آیت کے آخر میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ یہ بہشت اس عظمت کے ساتھ پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

(۱۳۴) پرہیزگاروں کی نشانیاں

گذشتہ آیت میں پرہیزگاروں کو دائمی جنت کی نوید سنائی گئی تھی اس آیت میں ان کا تعارف کرایا جا رہا ہے اور ان کی پانچ اعلیٰ امتیازی خصوصیات بیان کی گئیں ہیں۔

1۔ الَّذِيْنَ يُنفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ .... وہ ہر حالت میں خرچ کرتے ہیں چاہے وہ آرام وفروخ دستی میں ہوں یا پریشانی اور محرومیت میں مبتلا ہوں۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ یہاں پرہیزگاروں کی پہلی عمدہ صفت انفاق (راہ خدا میں خرچ کرنا) ذکر ہوئی ہے کیونکہ یہ آیات سود خوروں اور سامراجیوں کے مدمقابل صفات کو بیان کر رہی ہیں کہ جن کا ذکر گذشتہ آیات میں ہو چکا ہے علاوہ ازیں خوشی اور تنگدستی کی حالت میں مال ودولت کی قربانی تقویٰ کی واضح ترین علامت ہے

2۔ وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ .... وہ اپنے غصہ کو پی جاتے ہیں۔

3۔ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ .... اور وہ لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں

غصہ کو پی جانا اپنے مقام پر بڑی اچھی خوبی ہے لیکن یہ انسان کے دل کو بغض وکینہ سے پاک نہیں کرتا لہٰذا بغض وکینہ کی برائی ختم کرنے کے لئے ان دونوں غصے کو پی جانا اور درگذر کرنا کو یکجا کر دیا گیا ہے البتہ ایسے افراد سے درگذر کرنا مراد ہے کہ جو اس کے اہل ہوں۔

4۔ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ .... اور وہ نیکی کرنے (والے لوگ ہونے) کی وجہ سے اللہ کو محبوب ہیں۔

اس حصے میں عفو وبخشش سے بلند تر مرحلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور زنجیر کی کڑیوں کی طرح ترقی وتکامل کے مراتب کی تصویر کشی کی گئی ہے اور وہ اس طرح کہ انسان نہ صرف اپنا غصہ پی جائے اور عفو وبخشش سے کینہ کے داغ دل سے دھوڈالے بلکہ برائی کے مقابلے میں احسان اور نیکی کر کے جہاں مناسب ہو مد مقابل کے دل سے بھی دشمنی کی بیخ کنی کر دے اور اس کے دل میں نرمی پیدا کر دے تاکہ پھر کبھی اس قسم کا حادثہ سر نہ اٹھائے۔

(۱۳۵)5۔وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً ....وہ گناہوں پر اصرار کرتے۔

لفظ فاحشہ فحش یا فحشا سے ہے جس کا معنی ہے ہر وہ عمل جو بہت ہی برا ہو اور یہ مفہوم عفت و پاک دامنی کے منافی اعمال میں منحصر نہیں ہے کیونکہ اصل میں یہ حد سے تجاوز کے معنی میں ہے جس میں ہر طرح کا گناہ شامل ہے۔

درج بالا آیت میں پرہیز گاروں کی ایک اور صفت کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ وہ لوگ گذشتہ مثبت صفات سے متصف ہونے کے علاوہ اگر کسی گناہ کے مرتکب ہو جائیں تو فوراً یاد خدا میں پڑ جاتے ہیں اور توبہ کر کے پھر کبھی اس گناہ کا ارتکاب نہیں کرتے اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان جب تک یاد خدا میں مشغول ہے وہ گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا اور وہ گناہ کا اس وقت مرتکب ہو جاتا ہے جب کلی طور پر اس کا دل یاد خدا سے خالی ہو اور وہ محو غفلت ہو لیکن پرہیز گار افراد میں یہ غفلت زیادہ عرصہ نہیں رہتی بلکہ وہ بہت جلد یاد خدا میں مصروف ہو جاتے ہیں اور گذشتہ کمی کی تلافی کر لیتے ہیں اور اس وقت وہ محسوس کرتے ہیں کہ خدا کے علاوہ کوئی پناہ گاہ نہیں ہے اور صرف اسی سے گناہوں کی بخشش طلب کرنا چاہئے۔

''وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللهُ'' (کون ہے خدا کے علاوہ جو گناہوں کو بخشتا ہے)۔

اس بات کی طرف بھی توجہ رہے کہ آیت میں فاحشہ کے علاوہ اپنے اوپر ظلم کرنے کا ذکر بھی ہوا ہے۔

ممکن ہے کہ ان دونوں میں فرق یہ ہو کہ فاحشہ سے گناہان کبیرہ اور ظلم سے گناہان صغیرہ مراد ہوں آیت کے آخری حصہ میں تاکیداً کہا گیا ہے۔اور وہ علم وآگاہی کی صورت میں گناہ پر اصرار نہیں کرتے۔

(۱۳۶)اس آیت میں ان پرہیز گاروں کی جزا اور اجر بیان کیا گیا ہے (کہ جن کی صفات گذشتہ آیات میں بیان ہو چکی ہیں)۔وہ پروردگار کی بخشش اور بہشت بریں ہے جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور ایک لحظہ کے لئے ان سے پانی منقطع نہیں ہوتا وہ جنت کہ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے درحقیقت اس مقام پر پہلے تو معنوی وروحانی نعمات مغفرت قلب وروح کو پاکیزہ کرنے اور روحانی ترقی کی طرف اشارہ ہوا ہے اس کے بعد مادی نعمات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور آخر میں کہا گیا۔یہ کیسی ہی اچھی جزا اور اجر ہے نیک عمل کرنے والوں کے لئے جو کہ مرد میدان ہیں نہ کہ سست وبیکار افراد جو ہمیشہ اپنے وعدوں اور ذمہ داریوں میں لا پرواہی برتتے ہیں۔

(۱۳۷)قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ سُنَنٌ ۙ فَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ	تم سے پہلے کچھ سنتیں موجود تھیں (اور ہر قوم کی سرنوشت ان کے اعمال وصفات کے مطابق تھی اور تمہارا حال بھی ان کا سا ہے) زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ آیات خدا کی تکذیب کرنے والوں کا انجام کیا ہوا۔
(۱۳۸)هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّ مَوۡعِظَةٌ لِّلۡمُتَّقِيۡنَ	یہ بیان ہے لوگوں کے لئے اور پرہیز گاروں کے لئے ہدایت و نصیحت ہے۔

تفسیر

گذشتہ لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ

قرآن مجید کا ایک انفرادی اسلوب ہے کہ یہ گذشتہ ادوار کو موجودہ اور زمانہ حاضر کو گذشتہ تاریخ سے مربوط کرتا ہے اور حقائق کو سمجھنے کے لئے موجودہ نسل کا گذرے ہوئے لوگوں کے ساتھ فکری وثقافتی ربط لازمی اور ضروری قرار دیتا ہے کیونکہ ان دوزمانوں (ماضی اور حال) کے پختہ ارتباط سے آنے والوں کی ذمہ داری واضح ہو جاتی ہے جیسا کہ زیر نظر آیت میں کہتا ہے کہ "قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ سُنَنٌ ۙ فَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ"۔

خدا کی کچھ سنتیں (تعلیمات) گذشتہ اقوام میں تھیں جو ہرگز صرف ان کے لئے مخصوص نہ تھیں اور وہ قوانین زندگی کے سلسلہ کی ایک شکل میں تمام گزرے ہوئے اور آنے والوں کے لئے جاری ہوتی تھیں ان سنتوں میں مومن ومجاہد اور متحد و بیدار مغز افراد کی پیشرفت اور بلند پروازی کی نشاندہی کی گئی ہے اور اسی طرح بے ایمان اور گناہ کی نجاست سے آلودہ اقوام کی شکست وریخت کی بھی تصویر کشی کی گئی ہے جو کہ تاریخ بشریت میں ثبت ہے۔

تاریخ ہر قوم کے لئے زندگی سے کم اہمیت نہیں رکھتی یہ تاریخ کا کمال ہے کہ وہ گذشتہ لوگوں کی اخلاقی خصوصیات ان کے برے بھلے کام اور ان کے نظریات وافکار ہمارے سامنے دہراتی ہے اور مختلف معاشروں کی ترقی وتنزل اور کامیابی وناکامی کے اسباب کی نشاندہی کرتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ لوگوں کی تاریخ انسانی معاشروں کی روحانی ومعنوی زندگی کا آئینہ ہے اور آنے والوں کی بیداری کا سبب ہے۔

بنا بریں قرآن مجید مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ جاؤ زمین میں چلو پھرو اور گذشتہ قوموں سربراہوں سرکش فرعونوں اور جبار بادشاہوں کی طاغوتیت وبربریت کے آثار میں غور وفکر کرو اور دیکھو کہ جب انہوں نے خدا کا انکار کیا اور خدا کے پیغمبروں کو جھٹلایا اور زمین میں ظلم وفساد کی بنیاد رکھی تو ان کا انجام کیا ہوا گذشتہ لوگوں کے آثار آنے والوں کے لئے پند ونصیحت کا سامان ہیں اور لوگ ان

سے مستفید ہوکر زندگی کی راہ سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔

(۱۳۸)اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ جو کچھ گذشتہ آیات میں بیان ہو چکا ہے وہ تمام انسانوں کے لئے ایک واضح اعلان اورتمام پرہیز گاروں کے لئے ہدایت اور وعظ ونصیحت کا ایک بہترین ذریعہ ہے یعنی باجودیکہ یہ بیانات تمام انسانوں کے لئے ہمہ گیر پہلو رکھتے ہیں لیکن ان سے ہدایت کا ثمر صرف پرہیزگار ہی حاصل کر سکتے ہیں۔

(۱۳۹)وَ لَا تَهِنُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ	اور سست نہ ہو جاؤ اور حزن وملال نہ کرو اور تم ہی برتر ہو اگر تم ایمان والے ہو۔
(۱۴۰)اِنۡ یَّمۡسَسۡکُمۡ قَرۡحٌ فَقَدۡ مَسَّ الۡقَوۡمَ قَرۡحٌ مِّثۡلُهٗ ؕ وَتِلۡکَ الۡاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیۡنَ النَّاسِ ۚ وَ لِیَعۡلَمَ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ یَتَّخِذَ مِنۡکُمۡ شُهَدَآءَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیۡنَ ۙ	اگر تمہیں (میدان اُحد میں) زخم لگے ہیں (اور تمہیں نقصان پہنچا ہے) تو اس گروہ کو بھی (میدان بدر میں) اسی طرح زخم لگ چکے ہیں اور (ہم شکست و کامیابی کے) ان دنوں کو لوگوں میں الٹ پھیر کرتے رہتے ہیں (کیونکہ یہ اس جہان کی زندگی کی خاصیت ہے) یہ اس لیے کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ پہچانے جائیں اور خدا تم میں سے (شہداء) قربان ہونے والوں کو منتخب کر لے اور خدا ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔
(۱۴۱)وَ لِیُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ یَمۡحَقَ الۡکٰفِرِیۡنَ	اور اس لئے کہ خدا صاحب ایمان لوگوں کو خالص قرار دے (اور وہ الگ ہو جائیں) اور کافروں کو رفتہ رفتہ نابود کر دے۔
(۱۴۲)اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَ لَمَّا یَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡکُمۡ وَ یَعۡلَمَ الصّٰبِرِیۡنَ	کیا تمہارا گمان ہے کہ تم (صرف دعویٰ ایمان کی بناء پر) جنت میں داخل کر دیئے جاؤ گے جبکہ ابھی تک خدا نے تم میں سے مجاہدین اور صابرین کو جدا نہیں کیا۔

(۱۴۳)وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ	اور تم موت (اور راہ خدا میں شہادت) کی تمنا کرتے تھے جبکہ ابھی تمہارا اور اس کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا اور پھر تم نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور تمہیں وہ نظر آ رہی تھی (لیکن تم اپنے تئیں اس کے حوالے کرنے کو تیار نہ تھے۔

شان نزول

ان آیات کی شان نزول کے بارے میں کئی ایک روایات ہیں مجموعی طور پر ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ان آیات کا ضمیمہ ہیں جو جنگ اُحد کے بارے میں پہلے آ چکی ہیں یہ آیات جنگ اُحد کے اسباب و نتائج کا بہترین تجزیہ پیش کرتی ہیں اور ضمنی طور پر مسلمانوں کی روحانی تقویت اور ان کی تسلی کا سامان بھی فراہم کرتی ہیں کیونکہ جیسا بیان کیا گیا ہے کہ جنگ اُحد کچھ مسلمانوں کی نافرمانی اور جنگی اصولوں سے انحراف کی وجہ سے شکست پر منتج ہوئی اور اس میں اسلام کی چند درخشاں شخصیات نے جام شہادت نوش فرمایا۔ جن میں سے سرفہرست پیغمبر اکرم ﷺ کے چچا حضرت حمزہ کا نام گرامی آتا ہے پیغمبر اکرم ﷺ اسی رات اپنے صحابہ کے ہمراہ شہداء کی لاشوں کے قریب گئے شہداء کی ارواح مقدسہ کی عظمت کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ ﷺ ایک ایک شہید کی لاش مبارک کے پاس بیٹھتے اور گریہ کرتے اور ان کے لئے طلب مغفرت کرتے بعد میں ان سب کی لاشوں کو کوہ اُحد کے دامن میں بہت ہی رنج و ملال کے ساتھ دفن کیا گیا ان حساس لمحات میں درج بالا آیات کا نزول ہوا کیونکہ اس موقع پر مسلمان روحانی تقویت اور شکست کے نتائج سے معنوی فائدہ حاصل کرنے کے شدید محتاج تھے۔

تفسیر

جنگ اُحد کے نتائج

اس آیت میں پہلے تو مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک جنگ میں شکست کی وجہ سے تم میں سستی اور کمزوری پیدا ہو اور تم محزون ہو کر آخری کامیابی سے مایوس ہو جاؤ کیونکہ بیدار مغز افراد جس طرح کامیابیوں سے استفادہ کرتے ہیں اسی طرح شکست سے بھی درس حاصل کرتے ہیں اور اس کے سایہ میں کمزوری کے نقاط اور شکست کی وجوہات تلاش کرتے ہیں اور انہیں دور کر کے آخری کامیابی کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

"وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" (تم ہی برتر ہو اگر تم میں ایمان ہو) ایک بہت ہی پر معنی جملہ ہے یعنی تمہاری شکست درحقیقت روح ایمان اور اس کے آثار کھو بیٹھنے کی وجہ سے تھی۔ اگر تم فرمان خدا اور رسول ﷺ کو پائے نافرمانی سے نہ روندتے

تو اس قسم کی مصیبت میں گرفتار نہ ہوتے تاہم تمہیں رنج وملال نہیں ہونا چاہئے اگر راہ ایمان پر ثابت قدم رہے تو آخری فتح تمہاری ہوگی اور ایک میدان میں شکست سے دوچار ہونے کا معنی حتمی شکست نہیں ہے۔

(۱۴۰)قرح کا معنی ایسا زخم ہے جو بدن میں کسی خارجی عامل کی وجہ سے پیدا ہوا اس آیت میں ایک دوسرا درس آخری کامیابی تک پہنچنے کے لئے مسلمانوں کو دیا جارہا ہے کہ تمہیں دشمن سے کمتر تو نہیں ہونا چاہئے وہ سخت سنگین شکست سے دوچار ہوئے تھے ان کے ستر آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور بہت سے لوگ زخمی اور قید ہوئے تھے بایں ہمہ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے نہیں رہے بلکہ میدان اُحد میں تمہاری غفلت کی وجہ سے انہوں نے اپنی شکست کی تلافی کی ہے اب اگر تم اس میدان میں شکست کھا گئے ہو تو تم بھی نقصان کی تلافی کیے بغیر بیٹھ نہ جاؤ اسی لیے ارشاد ہوا کہ اگر تمہیں زخم لگے ہیں تو ان کو بھی اس طرح کے زخم لگے ہیں بنابرایں تمہاری سستی اور غم واندوہ کی وجہ کیا ہے۔

پہلے ایک سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ انسانی زندگی میں تلخ وشیریں حوادث آتے رہتے ہیں کہ جن میں سے کسی کے لئے پائیداری نہیں ہے فتوحات وناکامیاں قدرتیں اور ناتوانیاں سب کی حالت بدلتی رہتی ہے لہٰذا ایک میدان کی شکست اور اس کے آثار کو پائیدار نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ شکست کے عوامل اور اسباب کا مطالعہ کر کے ان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے استفادہ کیا جائے اور اسے کامیابی سے بدلا جائے دنیا میں نشیب وفراز آتے رہتے ہیں اور زندگی اپنے اصول کے مطابق تبدیل ہوتی رہتی ہے اور خدا ان ایام کو لوگوں کے درمیان گردش دیتا رہتا ہے تاکہ ان حوادث وواقعات میں سے سنت تکامل آشکار ہو جائے بعد ازاں ان ناگوار واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ یہ سب کچھ اس لیے ہے تاکہ صاحبان ایمان افراد ایمان کے دعویداروں سے الگ ہو جائیں۔

''وَ یَتَّخِذَ مِنۡکُمۡ شُهَدَآءَ'' میں ارشاد ہوتا ہے کہ اس شکست کے نتائج میں سے ایک یہ تھا کہ تم راہ اسلام میں شہادتیں اور قربانیاں پیش کرو اور جان لو کہ یہ پاک دین وآئین تمہیں مفت میں نہیں مل گیا مبادا آئندہ اسے تھوڑی سی قیمت پر ہاتھ سے دے بیٹھو جو قوم مقدس مقاصد اور اہداف کے لئے قربانی نہ دے وہ انہیں کم تر سمجھتی ہے لیکن جب ان کے لئے قربانیاں دے تو پھر خود اور آئندہ نسلیں بھی انہیں عظمت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ خدا ظالموں کو دوست نہیں رکھتا اس لیے ان کی حمایت بھی نہیں کرے گا۔

(۱۴۱)پرورش وتربیت کا میدان

اس آیت میں جنگ اُحد کے ایک اور فطری نتیجہ کی طرف اشارہ ہوا ہے اور وہ یہ کہ اس قسم کی شکستیں جماعتوں کی کمزوری اور عیوب کے پہلو واضح کرتی ہیں اور ان عیوب کو دور کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں قرآن کہتا ہے کہ خدا چاہتا تھا کہ اس معرکہ حق وباطل

میں باایمان افراد کو خالص قرار دے اور انہیں کمزوری کے نقاط کی نشاندہی کرے تاکہ وہ آئندہ کی اس قسم کی آزمائش کی کٹھالی سے گزر کر اپنی ہوشیاری کا اندازہ لگالیں۔

(۱۴۲) قرآن مجید واقعہ اُحد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسلمانوں کے ایک فکری اشتباہ کی تصحیح کرتا ہے کہ تم یہ خیال کرتے ہو کہ جہاد میں استقامت کا مظاہرہ کیے بغیر بہشت بریں میں قیام پذیر ہو جاؤ گے کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ اس معنوی سعادت کے اندر داخل ہونا صرف مسلمان کہلوانے یا عمل کے بغیر صرف عقیدہ سے ممکن ہے اگر ایسا ہوتا تو معاملہ نہایت سہل ہوتا لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے اور جب تک حقیقی عقائد کی میدان عمل میں عکاسی نہ ہو کوئی شخص بھی ان سعادتوں سے بہرہ ور نہیں ہوسکتا آزمائش کی منزل پر حق و باطل کی صفیں ایک دوسرے سے ممتاز ہو جاتی ہیں اور مجاہد و مہاجر بے قیمت و بے ارزش افراد سے ممتاز نظر آتے ہیں۔

(۱۴۳) کھوکھلی باتیں

جنگ بدر میں بعض مسلمانوں کی پر افتخار شہادت کے بعد بعض مسلمان جب باہم مل بیٹھتے تو ہمیشہ شہادت کی آرزو کرتے اور کہتے کاش یہ اعزاز میدان بدر میں ہمیں بھی نصیب ہوتا یقیناً ان میں کچھ لوگ سچے بھی تھے لیکن ان میں ایک جھوٹا گروہ بھی تھا جس نے اپنے آپ کو سمجھنے میں اشتباہ کیا بہرحال زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ جنگ اُحد کا وحشت ناک معرکہ درپیش ہوا تو ان سچے مجاہدین نے بہادری سے جنگ کی اور جام شہادت نوش کیا اور اپنی آرزو کو پالیا لیکن جھوٹوں کے گروہ نے جب لشکر اسلام میں شکست کے آثار دیکھے تو وہ قتل ہونے کے ڈر سے بھاگ کھڑے ہوئے تو یہ آیت انہیں سرزنش کرتے ہوئے کہتی ہے کہ تم ایسے لوگ تھے کہ جو دلوں میں آرزو اور تمنائے شہادت کے دعویدار تھے پھر جب تم نے اپنے محبوب کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا تو کیوں بھاگ کھڑے ہوئے۔

(۱۴۴) وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ	محمد صرف خدا کے رسول ہیں اور ان سے پہلے بھی بہت سے رسول ہو گزرے ہیں کیا اگر وہ وفات پا جائیں یا انہیں قتل کر دیا جائے تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے (اور ان کی وفات کے بعد اسلام کو چھوڑ کر کفر و بت پرستی کے زمانہ کی طرف پلٹ جاؤ گے) اور جو شخص پلٹ جائے گا وہ ہرگز خدا کو کوئی ضرر نہیں پہنچائے گا اور خدا تعالیٰ عنقریب شکر گزاروں کو جزا دے گا۔

(۱۴۵)وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتَابًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ	اور کوئی شخص حکم خدا کے بغیر نہیں مرتا یہ معین شدہ سرنوشت ہے (اس بناء پر پیغمبر اور دوسرے لوگوں کی وفات سنت الٰہی ہے) تو جو شخص بھی دنیا کا ثواب اور جزا چاہتا ہے تو اس میں کچھ نہ کچھ ہم اسے دیں گے اور جو آخرت کا ثواب اور جزا چاہتا ہے تو اس میں اسے عطا کریں گے اور عنقریب شکر گزاروں کو جزا دیں گے۔

شان نزول

یہ آیت بھی جنگ اُحد کے ایک حادثہ کے بارے میں ہے اور وہ یہ کہ جس وقت جنگ کی آگ مسلمانوں اور بت پرستوں کے درمیان شعلہ زن تھی اچانک ایک آواز بلند ہوئی اور کسی نے کہا: ''میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قتل کر دیا، میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قتل کر دیا''۔ یہ ٹھیک اس وقت کی بات ہے جب ایک شخص عمر و بن قمیئہ حارثی نے ایک پتھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف پھینکا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشانی اور دندان مبارک شہید ہو گئے نچلا لب پھٹ گیا اور آپ کا رخسار مبارک لہولہان ہو گیا اس موقع پر ہر ایک دشمن چاہتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کر دے اس دور میں لشکر اسلام کے ایک علمدار مصعب بن عمیر نے ان کے حملوں کو تو روک دیا لیکن خود شہید ہو گیا اس کی شکل چونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملتی جلتی تھی دشمن نے یہی گمان کیا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاک وخون میں تڑپ رہے ہیں یہ آواز فضائے عالم میں گونج اٹھی اس آواز سے جتنا بت پرستوں کے جذبات پر مثبت اثر پیدا ہوا اتنا ہی مسلمانوں میں عجیب اضطراب پیدا ہو گیا چنانچہ ایک کثیر گروہ کے ہاتھ پاؤں جواب دے گئے اور وہ بڑی تیزی سے میدان جنگ سے نکل گئے یہاں تک کہ ان میں سے بعض نے سوچا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو شہید ہو گئے ہیں لہٰذا اسلام ہی کو خیر باد کہہ دیا جائے اور بت پرستوں کے سرداروں سے امان طلب کر لی جائے لیکن ان کے مقابلے میں فداکاروں اور جانثاروں کی بھی ایک قلیل جماعت تھی جن میں حضرت علی علیہ السلام ابودجانہ اور طلحہ جیسے بہادر لوگ موجود تھے جو باقی لوگوں کو پامردی اور استقامت کی دعوت دے رہے تھے ان میں سے انس بن نضر لوگوں کے درمیان آیا اور کہنے لگا اے لوگو! اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہو گئے تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خدا تو قتل نہیں ہوا چلو اور جنگ کرو اسی نیک اور مقدس ہدف کے حصول کے لئے درجہ شہادت پر فائز ہو جاؤ یہ گفتگو تمام کرتے ہی انہوں نے دشمن پر حملہ کر دیا یہاں تک کہ شہید ہو گئے تاہم جلد ہی معلوم ہو گیا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سلامت ہیں اور اطلاع اشتباهاً دی گئی تھی مندرجہ بالا آیت اسی مقام پر نازل ہوئی اور اس نے پہلے گروہ کی مذمت کی۔

تفسیر

شخصیت پرستی کی ممانعت

جنگ اُحد کے واقعات سے استفادہ کرتے ہوئے یہ آیت مسلمانوں پر ایک اور حقیقت واضح کرتی ہے وہ یہ کہ اسلام شخصیت پرستی کا دین نہیں ہے اور فرض کرلیں کہ اگر پیغمبر اس میدان جنگ میں جام شہادت نوش فرماتے تب بھی مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ لڑائی کو جاری رکھتے کیونکہ پیغمبر کی طبعی وفات یا شہادت سے اسلام کا خاتمہ نہیں ہوتا بلکہ یہ ابد تک باقی رہنے والا دین حق ہے شخصیت پرستی ایک خطرناک مسئلہ ہے جو با مقصد لڑائی کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے کسی خاص شخص چاہے وہ پیغمبر خاتم ﷺ ہی کیوں نہ ہوں سے بے مقصد کی وابستگی کا معنی یہ ہے کہ جب وہ شخص اس دنیا سے چلا جائے تو پیشرفت کی کوشش اور اس کی تلاش ختم ہو سکتی ہے اور یہ وابستگی اجتماعی رشد وترقی کے نہ ہونے کی ایک واضح نشانی ہے۔

لہٰذا قرآن صراحت کے ساتھ اوپر کی آیت میں اعلان کرتا ہے کہ محمد ﷺ صرف خدا کے بھیجے ہوئے (رسول) ہیں ان سے پہلے بھی بھیجے ہوئے افراد تھے جو دنیا سے چل بسے کیا اگر وہ وفات پا جائیں یا قتل ہوں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور بت پرستی کا راستہ اختیار کرو گے قابل توجہ امر یہ ہے کہ آیت میں رجعت قہقہری (پیچھے کی طرف پلٹنے) کے لئے ''اِنْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِکُمْ'' کے الفاظ لائے گئے ہیں کیونکہ اعقاب جو کہ عقب (بروزن خشن) کی جمع ہے اس کا معنی ایڑی ہے اور یہ رجعت قہقہری کی واضح تصویر کشی ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ جو لوگ پیچھے کی طرف پھر جائیں اور کفر و بت پرستی کے دور کی طرف لوٹ جائیں وہ صرف اپنے آپ کو نقصان پہنچا رہے ہیں نہ کہ خدا کو کیونکہ اس عمل سے نہ صرف ان کی نیک بختی جاتی رہتی ہے بلکہ جو کچھ اب تک کما چکے ہیں وہ بھی تیزی کے ساتھ اپنے ہاتھ سے دے بیٹھیں گے

آیت کے آخر میں اس قلیل جماعت کی طرف اشارہ کیا گیا جو تمام مشکلات اور پیغمبر اکرم ﷺ کی خبر شہادت عام ہونے کے باوجود جہاد سے دست بردار نہیں ہوئی اس میں ان کی جدوجہد کو سراہا گیا ہے اور ان کا تعارف شاکرین اور نعمات الٰہی سے بہرہ ور ہونے والے اشخاص کے عنوان سے کرایا گیا ہے اور ارشاد ہوتا ہے خدا ان شکر گزاروں کو اچھی جزا دے گا۔

(۱۴۵) جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ میدان اُحد میں پیغمبر ﷺ کی شہادت کی بے بنیاد خبر نے بہت سے مسلمانوں کو وحشت و اضطراب میں ڈالا یہاں تک کہ وہ میدان چھوڑ گئے بلکہ بعض تو اسلام سے ہی علیحدہ ہونا چاہتے تھے اس لیے ازسرنو اس آیت میں اس گروہ کو تنبیہ اور بیداری کے لیے ارشاد ہوا کہ موت خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس کے ہاں ہر شخص کے لئے مقرر شدہ وقت ہے جس سے وہ بھاگ نہیں سکتا بنابریں اگر پیغمبر ﷺ اس میدان میں جام شہادت نوش فرما لیتے تو سوائے ایک سنت الٰہی انجام پانے کے اور کوئی بات نہیں تھی لیکن ان حالات میں مسلمانوں کو وحشت و اضطراب میں مبتلا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ لڑائی جاری نہ رکھیں اور دوسری طرف میدان جنگ سے فرار موت سے خلاصی نہیں دلاسکتا جیسا کہ میدان جنگ میں شریک ہونا بھی انسان کی موت کو پہلے نہیں لاسکتا۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہوا کہ انسان کی کوشش کبھی ضائع نہیں ہوتی اگر کسی کا مقصد صرف مادی فوائد تک محدود ہو اور مقصد

جنگ اُحد کے بعض سپاہیوں کی طرح صرف مال غنیمت جمع کرنا ہو تو بالآخر کچھ نہ کچھ اس سے بہرہ ور ہو گا لیکن اگر اس کا مقصد عظیم ہو اور حیات جاودانی اور انسانی فضائل کی راہ میں کوشش کی جائے تو پھر بھی اپنے مقصد تک پہنچ جائے گا بنا بریں جب دنیا یا آخرت کا حصول دونوں ہی کوشش کے محتاج ہیں تو پھر انسان کیوں اپنے وجود کے سرمائے کو بلند ترین اور پائیدار راستہ میں صرف نہ کرے اس کے بعد دوبارہ تاکیداً کہا گیا کہ ہم بہت جلد شکرگزاروں کو جزا دیں گے۔

(۱۴۶)وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوۡنَ كَثِيۡرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوۡا لِمَاۤ اَصَابَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوۡا وَ مَا اسۡتَكَانُوۡا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيۡنَ	اور کتنے پیغمبر تھے جن کی معیت میں بہت سے خدا والوں نے جنگ کی تو انہوں نے راہ خدا میں پہنچنے والی مصیبت کے مقابلے میں سستی نہیں کی اور نہ وہ کمزور و ناتواں ہوئے اور نہ ہی انہوں نے سر جھکایا اور خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔
(۱۴۷)وَ مَا كَانَ قَوۡلَهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡا رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَ اِسۡرَافَنَا فِىۡۤ اَمۡرِنَا وَثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ	ان کی گفتگو صرف یہ تھی کہ پروردگار ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمارے کاموں میں زیادتی سے صرف نظر فرما ہمیں ثابت قدم رکھ اور ہمیں کفار پر کامیابی عطا کر۔
(۱۴۸)فَاٰتٰهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنۡيَا وَحُسۡنَ ثَوَابِ الۡاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۚ	لہٰذا خدا نے دنیا اور آخرت کا حسن ثواب انہیں دیا اور خدا نیک کارلوگوں کو پسند کرتا ہے۔

تفسیر

گذشتہ زمانوں کے مجاہدین

جنگ اُحد کے واقعات کے بعد اوپر کی آیت گذشتہ زمانہ کے مجاہدین اور اصحاب انبیاء کی قوت شجاعت پختگی ایمان اور استقامت کی یاد دلا کر مسلمانوں کو شجاعت اور فداکاری کی تشویق و ترغیب دلاتی ہے اور ضمنی طور پر میدان سے فرار کرنے والوں کی سرزنش کرتی ہے اور کہتی ہے کہ بہت سے انبیاء ایسے تھے جن کے یار و انصار کی صف میں خدا پرست مجاہد موجود تھے اس کے بعد ان کا طرز عمل یوں بیان کرتی ہے وہ انبیاء کی مدد کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے بہت کٹھن مشکلات میں انہوں نے سستی اور ناتوانی نہیں دکھائی اور دشمن کے سامنے کبھی سرخم نہیں کیا اور نہ ہی اپنے آپ کو ان کے سپرد کیا ہے۔ اور واضح ہے کہ خدا ایسے ہی افراد کو پسند کرتا ہے جو لڑائی میں پیچھا نہیں دکھاتے۔

(۱۴۷) وہ لوگ جو کبھی سستی یا لغزشوں کی وجہ سے دشمن کے سامنے مشکلات میں گھر جاتے تھے تو بجائے اس کے کہ میدان ان کے حوالے کر دیں یا اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیں یا ان کے دماغ میں کفر و ارتداد کی خلش پیدا ہو وہ بارگاہ خداوند سے صبر و

استقامت اور پامردی کی درخواست کرتے تھے اور کہتے تھے:

''پروردگار! ہمارے گناہوں کو بخش دے ہماری جلد بازی سے درگزر فرما اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور ہمیں کافروں پر کامیابی عطا فرما''

(۱۴۸) وہ اس قسم کے طرزِ فکر و عمل سے خدا سے جلد اپنی جزا اور ثواب حاصل کرتے تھے اس دنیا کی جزا بھی جو فتح و کامرانی ہے اور دوسرے جہاں کی جزا ثواب بھی۔

آیت کے آخر میں انہیں نیکوکاروں میں شمار کر کے ارشاد ہوتا ہے:

''وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصَّابِرِیْنَ'' (خدا نیکوکاروں کو دوست رکھتا ہے)

اس طرح سے خدا تازہ مسلمانوں کے لئے گذشتہ امتوں کے مجاہدین کے پروگراموں اور مشکلات کے مقابلے میں ان کے طرزِ عمل کا ذکر ایک درس کے طور پر کر رہا ہے۔

(۱۴۹) یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِیْعُوا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَرُدُّوْکُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ	اے ایمان والو! اگر ان لوگوں کی اطاعت کرو گے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو وہ تمہیں پیچھے کی طرف دھکیل دیں گے اور آخرکار تم نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے۔
(۱۵۰) بَلِ اللّٰہُ مَوْلٰکُمْ ۚ وَ ھُوَ خَیْرُ النّٰصِرِیْنَ	(وہ تمہارا سہارا نہیں ہیں بلکہ) تمہارا سہارا اور سرپرست خدا ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔
(۱۵۱) سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَکُوْا بِاللّٰہِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ سُلْطَانًا ۚ وَ مَاْوٰھُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَی الظّٰلِمِیْنَ	عنقریب ہم ان کے دل میں جنہوں نے کفر اختیار کیا، رعب ڈال دیں گے کیونکہ انہوں نے ان چیزوں کو اللہ کا شریک ٹھہرایا جن کے بارے میں کوئی دلیل نازل نہیں ہوئی اور ان کا ٹھکانا آگ ہے اور ظالموں کا ٹھکانا کس قدر برا ہے۔

تفسیر

بار بار خطرے سے آگاہی

یہ آیات بھی گذشتہ آیات کی طرح جنگ اُحد کے واقعات کا تجزیہ و تحلیل کرتی ہیں اور اس حقیقت کی گواہی دیتی ہیں یوں لگتا ہے کہ جنگ اُحد کے ختم ہونے کے بعد دشمنان اسلام زہریلے پروپیگنڈا سے نصیحت کے بھیس میں مسلمانوں کے درمیان منافرت و اختلاف کا بیج بوتے تھے جیسا کہ جنگ اُحد میں بھی پیغمبر اکرم ﷺ کی شہادت کی بے بنیاد افواہ پھیلا کر مسلمانوں کی نفسیات کو کمزور

کرنے کی کوشش کی گئی۔

پہلی آیت مسلمانوں کو کفار کی پیروی کرنے سے ڈراتی ہے اور کہتی ہے کہ اگر تم کفار کی پیروی کرو گے تو وہ تمہیں پیچھے کی طرف دھکیل دیں گے اور تعلیمات اسلام کے زیر سایہ روحانی معنوی اور مادی ترقی کے بعد تمہیں پہلے نقطہ کی طرف گرادیں گے جو کفر و فساد ہے اور اس وقت تمہیں بہت زیادہ نقصان پہنچے گا کیونکہ اس سے زیادہ خسارہ اور کیا ہوگا کہ انسان اسلام کو کفر سے اور سعادت کو شقاوت سے اور حق کو باطل سے بدل ڈالے۔

(۱۵۰) اس کے بعد انہیں تسلی دیتے ہوئے تاکید کی گئی ہے کہ تمہارا بہت بڑا مددگار موجود ہے۔ خدا تمہارا حامی و مددگار ہے اور وہ بہترین مددگار ہے جو کبھی مغلوب نہیں ہوسکتا جبکہ دوسرے مددگار شکست و ریخت سے دوچار ہوسکتے ہیں

یہاں جنگ اُحد کے بعد مسلمانوں کے معجزانہ طور پر نجات پانے کی طرف اشارہ ہوا ہے اور اللہ تعالی انہیں اپنی نصرت و حمایت کا ایک موقع یاد دلاتا ہے۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ ان کے دلوں میں رعب وخوف کا سبب یوں بیان کیا گیا ہے اسی وجہ سے کہ انہوں نے بلا دلیل بہت سی چیزوں کو خدا کا شریک قرار دیا تھا درحقیقت جو بے ہودہ لوگ دلیل و برہان کی پیروی نہیں کرتے اور رائی کو پہاڑ بنا لیتے ہیں اور پتھر اور لکڑی کو اپنا معبود سمجھتے ہیں وہ حوادث زمانہ کے مقابلے سے عاجز ہوتے ہیں کیونکہ وہ بہت جلد محاسبہ کے اشتباہ میں گرفتار ہوجاتے ہیں اور زندگی میں کسی معمولی حادثہ کا بھی سامنا نہیں کرپاتے۔

یہ افراد اپنے اور معاشرے پر ظلم کرتے ہیں اس بنا پر ان کے لئے سوائے (جہنم کی) آگ کے کوئی پناہ گاہ نہیں اور وہ کیسی بری پناہ گاہ ہے۔

(۱۵۲) وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ	خدا نے تم سے اپنا وعدہ (جنگ اُحد میں دشمن پر کامیابی) کا سچ کر دکھایا جبکہ (ابتداء جنگ اُحد میں) تم دشمنوں کو اس کے حکم سے قتل کر رہے تھے اور یہ کامیابی جاری تھی یہاں تک کہ تم سست ہوگئے (اور مورچوں کو چھوڑنے لگے۔ اور) آپس میں نزاع کرنے لگے اور جو (دشمن پر غلبہ) تم چاہتے تھے وہ تمہیں دکھایا لیکن اس کے بعد تم نے نافرمانی کی تم میں سے بعض دنیا کے خواہشمند تھے اور بعض آخرت کے خواہاں تھے پھر خدا نے تمہیں ان سے پھیر دیا اور (تمہاری فتح شکست سے بدل گئی) تا کہ تمہارا امتحان لے اور اس نے تمہیں معاف کردیا اور خدا مومنین کے لیے فضل کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

(۱۵۳)اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ وَ لَا تَلۡوٗنَ عَلٰۤی اَحَدٍ وَّ الرَّسُوۡلُ یَدۡعُوۡکُمۡ فِیۡۤ اُخۡرٰىکُمۡ فَاَثَابَکُمۡ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّکَیۡلَا تَحۡزَنُوۡا عَلٰی مَا فَاتَکُمۡ وَ لَا مَاۤ اَصَابَکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ	(یاد کرو وہ وقت) جب تم پہاڑ پر چڑھ رہے تھے (اور تمہارا ایک گروہ بیابان میں بکھرا ہوا تھا) اور تم پیچھے رہ جانے والوں کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے اور پیغمبر پیچھے سے تمہیں پکار رہے تھے اس کے بعد تم پر پے در پے مصائب آئے اور یہ اس لیے تھا (تاکہ جنگی غنائم) کے ہاتھ سے چلے جانے سے تم غمگین نہ ہو اور نہ ہی ان آلام کی وجہ سے جو تم پر آ پڑے ہیں اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔
(۱۵۴)ثُمَّ اَنۡزَلَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ الۡغَمِّ اَمَنَۃً نُّعَاسًا یَّغۡشٰی طَآئِفَۃً مِّنۡکُمۡ ۙ وَ طَآئِفَۃٌ قَدۡ اَہَمَّتۡہُمۡ اَنۡفُسُہُمۡ یَظُنُّوۡنَ بِاللّٰہِ غَیۡرَ الۡحَقِّ ظَنَّ الۡجَاہِلِیَّۃِ ؕ یَقُوۡلُوۡنَ ہَلۡ لَّنَا مِنَ الۡاَمۡرِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ قُلۡ اِنَّ الۡاَمۡرَ کُلَّہٗ لِلّٰہِ ؕ یُخۡفُوۡنَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ مَّا لَا یُبۡدُوۡنَ لَکَ ؕ یَقُوۡلُوۡنَ لَوۡ کَانَ لَنَا مِنَ الۡاَمۡرِ شَیۡءٌ مَّا قُتِلۡنَا ہٰہُنَا ؕ قُلۡ لَّوۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ بُیُوۡتِکُمۡ لَبَرَزَ الَّذِیۡنَ کُتِبَ عَلَیۡہِمُ الۡقَتۡلُ اِلٰی مَضَاجِعِہِمۡ ۚ وَ لِیَبۡتَلِیَ اللّٰہُ مَا فِیۡ صُدُوۡرِکُمۡ وَ لِیُمَحِّصَ مَا فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ	پھر اس غم واندوہ کے بعد امن وآرام کا تم پر سایہ نازل کیا اور یہ ایک اونگھ کی صورت میں تھا جو (واقعہ اُحد کی بعد والی رات میں) تم میں سے ایک گروہ کو عارض ہوئی تھی لیکن ایک دوسرے گروہ کو اپنی جان کی فکر تھی اور (انہیں نیند نہیں آئی تھی) وہ لوگ خدا کے بارے میں زمانہ جاہلیت کے سے برے گمان کرتے تھے اور کہتے تھے کہ کیا کامیابی کا کچھ حصہ ہمیں نصیب ہوگا کہہ دو (تمام کامیابیاں اور) کام اللہ کے ہاتھ میں ہیں وہ اپنے دل میں کچھ باتیں چھپائے ہوئے ہیں جن کا تمہارے سامنے اظہار نہیں کرتے وہ کہتے ہیں کہ اگر کامیابی میں ہمارا کوئی حصہ ہوتا تو ہم قتل نہ ہوتے کہہ دو اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو وہ لوگ کہ قتل ہونا جن کی قسمت میں تھا وہ (دشمن) ان کے بستروں پر آ پڑتے (اور انہیں قتل کر دیتے) اور یہ اس لیے کہ خدا تمہارے سینوں میں چھپی ہوئی باتوں کی آزمائش کرے اور تمہارے دلوں میں جو (ایمان) ہے اس کے خلوص کو پرکھے

وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ	اور تمہارے سینوں کے اندر جو کچھ ہے اللہ اس سے باخبر ہے۔

تفسیر

کامیابی کے بعد شکست

جنگ اُحد کے واقعات میں گزر چکا ہے کہ مسلمان ابتداء جنگ میں اتحاد اور بڑی دلیری کے ساتھ لڑے اور جلد ہی کامیاب ہوگئے اور دشمن کا لشکر پراگندہ منتشر ہوگیا جس سے سارے لشکر اسلام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی لیکن کوہ عینین کے درے میں عبداللہ بن جبیر کی سرکردگی میں لڑنے والے تیراندازوں کی نافرمانی اور ان کے اس حساس مورچے کو چھوڑنے اور دوسرے لوگوں کی مال غنیمت جمع کرنے کی مشغولیت سے ورق ہی الٹ گیا اور لشکر اسلام ایک زبردست شکست سے دوچار ہوا۔

کافی شہید دے کر اور بہت نقصان اٹھا کر جب مسلمان مدینہ کی طرف پلٹ آئے تو ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ کیا خدا نے ہم سے فتح و کامیابی کا وعدہ نہیں کیا تھا پھر اس جنگ میں ہمیں کیوں شکست ہوئی؟ اس پر مندرجہ بالا آیات میں انہیں جواب دیا گیا اور شکست کے اسباب کی نشاندہی کی گئی اب ہم آیات کی تفصیلی تفسیر کی طرف آتے ہیں۔

''وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ''

اس جملہ میں ارشاد خداوندی ہے کہ کامیابی کے بارے میں خدا کا وعدہ بالکل درست تھا اور اس کی وجہ ہی سے تم ابتداء جنگ میں کامیاب ہوئے اور حکم خدا سے تم نے دشمن کو تتر بتر کردیا کامیابی کا یہ وعدہ اس وقت تک تھا جب تک تم استقامت و پامردی اور فرمان پیغمبر ﷺ کی پیروی سے دست بردار نہیں ہوئے اور شکست کا دروازہ اس وقت کھلا جب سستی اور نافرمانی نے تمہیں آ گھیرا یعنی اگر تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ کامیابی کا وعدہ بلاشرط تھا تو تمہاری بڑی غلط فہمی ہے بلکہ کامیابی کے تمام وعدے فرمان خدا کی پیروی کے ساتھ مشروط ہیں البتہ یہ کہ خدا نے مسلمانوں سے اس جنگ میں کامیابی کا وعدہ کب کیا تھا اس بارے میں دو احتمال ہیں پہلا یہ کہ مراد عمومی وعدے ہیں جو خدا کی طرف سے مسلمانوں کو دشمنوں پر کامیابی کے بارے میں دیئے جا چکے تھے دوسرا یہ کہ پیغمبر ﷺ خدا صریحی طور پر جنگ اُحد سے پہلے وعدہ دے چکے تھے اور ان کا وعدہ خدا کا وعدہ ہے۔

اس میں کوہ عینین کے تیراندازوں کی طرف اشارہ ہے اور ان کی کیفیت بیان کی گئی ہے کہ وہ تیرانداز جو پہاڑ کے درے پر تھے ان میں مورچہ چھوڑنے کے بارے میں اختلاف پڑ گیا اور ان میں بیشتر نے نافرمانی اور مخالفت کی اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ جیسی تمہاری آرزو تھی ویسی ہی نظروں میں سما جانے والی کامیابی دیکھ لینے کے بعد تم نے راہ عصیان اختیار کی اور حقیقت میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے تم نے جو لازمی تھی وہ کوشش کی لیکن اس کو برقرار رکھنے کے لئے تم نے استقامت و پامردی نہیں دکھائی اور ہمیشہ کامیابیوں کی حفاظت کرنا ان کے حصول سے زیادہ مشکل ہوا کرتا ہے۔

اس موقع پر تم میں سے ایک گروہ دنیا چاہتا تھا وہ مال غنیمت اکٹھا کرنے لگا جب کہ دوسرا گروہ جس میں عبداللہ بن جبیر اور

دیگر تیرانداز شامل تھے جو ثابت قدم رہے وہ آخرت اور خدائی جزا و ثواب کے خواہاں تھے۔

یہاں ورق الٹ گیا اور خدا نے تمہاری کامیابی کو شکست سے بدل ڈالا تا کہ تمہاری آزمائش کرے اور تمہیں تنبیہ کرے اور تمہاری تربیت کرے۔

اس کے بعد خدا نے تمہاری ان سب نافرمانیوں سے درگزر کیا جبکہ تم سزا کے مستحق تھے کیونکہ خداوند عالم مومنین کے لئے ہر قسم کی نعمتوں کو فروگزار نہیں کرتا۔

(۱۵۳) اس آیت میں خدا تعالی مسلمانوں کے لئے جنگ اُحد کے انجام کا نقشہ کھینچتا ہے اور فرماتا ہے یاد کرو اس وقت کو جب تم ہر طرف منتشر تھے اور بھاگ رہے تھے اور پیچھے کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے کہ تمہارے باقی بھائی کس حالت میں ہیں جبکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیچھے سے تمہیں پکار رہے تھے الی عباد اللہ الی عباد اللہ فانی رسول اللہ خدا کے بندو میری طرف پلٹ آؤ میری طرف پلٹ آؤ میں خدا کا رسول ہوں لیکن تم میں سے کوئی ان کی پکار پر کان نہیں دھرتا تھا۔

اس وقت یکے بعد دیگرے غم و اندوہ تم پر ٹوٹے کیونکہ تم ایک طرف جنگ میں شکست کئی افسروں اور بہادر سپاہیوں کی شہادت اور کئی زخمیوں کے غم میں مبتلا تھے تو دوسری طرف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خبر شہادت کے پھیل جانے کی پریشانی اور پھر ان کے زخمی ہونے کا غم تھا اور یہ سب کچھ مخالفتوں اور نافرمانیوں کا نتیجہ تھا۔

غم و اندوہ کا یہ سیلاب اس لیے تھا تا کہ اب تم مال غنیمت ہاتھ سے جانے پر غمگین نہ ہونے پاؤ اور کامیابی کی راہ میں جو مشکلات اور زخم تمہیں پہنچے ہیں ان کی فکر کرو۔

خدا تمہارے اعمال سے آگاہ تھا اور پوری طرح سے اطاعت کرنے والوں حقیقی مجاہدین اور اسی طرح بھاگنے والوں کی کیفیت کو جانتا تھا بنابریں تم میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو فریب نہ دے اور جو کچھ جنگ اُحد میں ہوا ہے اس کے برخلاف دعویٰ نہ کرے اور اگر واقعاً تم پہلے گروہ میں داخل ہو تو خدا کا شکر ادا کرو ورنہ گناہوں سے توبہ کرو۔

زمانہ جاہلیت کے وسوسے

واقعہ اُحد کے بعد والی رات بہت دردناک اور اضطراب انگیز تھی مسلمان سمجھتے تھے کہ قریش کے فاتح سپاہی دوبارہ مدینہ کی طرف پلٹ آئیں گے اور مسلمانوں کے باقی ماندہ مقابلے کی طاقت ختم کر دیں گے اور شاید کسی طور پر بت پرستوں کے واپس آنے کی خبر بھی انہیں آ پہنچی تھی اور یہ مسلم تھا کہ اگر وہ پلٹ آتے تو جنگ کا خطرناک ترین مرحلہ پیش آتا اس دوران حقیقی مجاہدین اور فرار کرنے والوں میں سے پشیمان افراد جنہوں نے توبہ کر لی تھی اب پروردگار کے لطف و کرم پر اعتماد رکھتے تھے اور آئندہ کے لیے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وعدوں پر مطمئن تھے۔

اس حالت وحشت میں وہ آرام کی نیند سو گئے تھے جبکہ جنگی لباس میں ملبوس اور ہتھیاروں سے لیس تھے لیکن منافق ضعیف

الایمان اور بزدل گروہ ساری رات فکر و پریشانی میں مبتلا رہا اور بادل نخواستہ حقیقی مومنین کی پہرہ داری کرتا رہا درج بالا آیت رات کی اس کیفیت کی تشریح کرتے ہوئے کہتی ہے کہ پھر اُحد کے دن کے ان تمام غم واندوہ کے بعد تم پر امن وامان اور راحت وآرام نازل کیا اور یہ وہی ہلکی پھلکی نیند تھی جو تم میں سے ایک گروہ کو آئی لیکن ایک ایسا گروہ بھی تھا کہ جسے صرف اپنی جان کی فکر تھی وہ لوگ سوائے اپنی جانیں بچانے کے اور کوئی چیز نہیں سوچتے تھے اس لیے وہ راحت وآرام سے محروم ہو گئے تھے۔

یہ ایمان کا ایک اہم ترین ثمرہ ہے کہ مرد مومن اس دنیا میں بھی راحت وآرام سے رہتا ہے جبکہ بے ایمان یا منافق اور کمزور ایمان والے افراد کبھی بھی اس کا ذائقہ نہیں چکھتے بعد ازاں قرآن منافقین اور کمزور ایمان والے لوگوں کی گفتگو اور طرزِ فکر کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے: وہ خدا کے بارے میں زمانہ جاہلیت کا غلط اور ناحق گمان رکھتے اور اپنی گفتگو میں کہتے کہ شاید پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وعدے غلط ہی ہوں اپنے آپ کو یا ایک دوسرے کو کہتے تھے ''هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ'' یعنی کیا یہ ممکن ہے کہ اس ولخراش کیفیت کے بعد ہمیں کامیابی نصیب ہو یعنی بہت ہی بعید یا ناممکن ہے قرآن ان کو جواباً کہتا ہے۔ کہہ دو جی ہاں کامیابی تو خدا کے ہاتھ میں ہے اگر وہ چاہے اور تمہیں اس لائق سمجھے تو تمہیں کامیابی نصیب کرے وہ اب بات کو ظاہر کرنے کے لئے تیار نہیں تھے جو وہ اپنے دلوں میں چھپائے بیٹھے تھے کیونکہ وہ اس سے ڈرتے تھے کہ کہیں کفار کی صف میں ان کا شمار نہ ہو۔

گویا ان کا خیال تھا کہ جنگ اُحد کی شکست دین اسلام کے ناحق ہونے کی علامت ہے اسی لیے وہ کہتے تھے: اگر ہم حق پر ہوتے اور کامیابی ہمارے نصیب میں ہوتی تو یہاں ہمارے اتنے لوگ نہ مارے جاتے خداوند عالم ان کے جواب میں دو چیزوں کی طرف اشارہ کرتا ہے پہلے یہ کہ یہ تصور نہ کرو کہ کوئی شخص میدان جنگ کے سخت حوادث سے بھاگ کر موت سے بچ سکتا ہے جبکہ ان کا استقبال کرنا چاہئے جن کی اجل آ گئی ہے چاہے وہ اپنے گھروں میں رہ جائیں ان کے بستر پر دشمن آ پڑیں گے اور انہیں قتل کر دیں گے۔

اصولی طور پر وہ قوم جس کی اکثریت کے خلاف شکست کا فیصلہ اس کی سستی کی وجہ سے کیا گیا ہو وہ آخر کار موت کا ذائقہ چکھے گی تو کیا ہی اچھا ہے کہ وہ میدان جہاد میں دشمن کی ضرب سے پرافتخار مقابلے میں اسے لبیک کہے نہ یہ کہ بستر پر ذلّت آمیز طریقہ سے اس کا کام تمام کر دیا جائے دوسرا یہ کہ یہ حوادث رونما ہونے چاہئیں تا کہ دلوں میں جو کچھ ہے وہ آشکار ہو جائے علاوہ ازیں لوگوں کی آہستہ آہستہ تربیت ہو اور ان کی نیتیں خالص ایمان پختہ اور دل پاک ہوں۔ آیت کے آخر میں کہا گیا ہے۔ خدا سینوں کے بھیدوں کو جانتا ہے اسی بنا پر وہ صرف لوگوں کے اعمال پر نگاہ نہیں رکھتا بلکہ وہ چاہتا ہے کہ ان کے دلوں کو بھی آزمائے اور انہیں شرک نفاق شک اور تردد کی ہر قسم کی آلودگی سے پاک کر دے۔

(۱۵۵)اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۧ	وہ لوگ جنہوں نے دو گروہوں کے آمنے سامنے ہونے کے دن (جنگ اُحد کے روز) فرار کیا انہیں شیطان نے ان کے چند گناہوں کی وجہ سے بہکا دیا اور خدا نے انہیں معاف کر دیا خدا بخشنے والا اور بردبار ہے۔

تفسیر

ایک گناہ دوسرے گناہ کا سرچشمہ ہے

یہ آیت بھی جنگ اُحد کے واقعات سے متعلق مسلمانوں سے ایک اور حقیقت بیان کرتی ہے اور وہ یہ کہ جو لغزشیں انسان سے شیطانی وسوسوں کے باعث صادر ہوتی ہیں وہ دراصل ان گذشتہ گناہوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی روحانی کمزوریوں کا نتیجہ ہوتی ہیں جو انسان کے لئے دوسرے گناہوں کی راہ ہموار کرتی ہیں ورنہ پاک و پاکیزہ دل میں شیطانی توہمات کبھی اثر انداز نہیں ہو سکتے اسی لیے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ لوگ جو میدان اُحد سے فرار کر گئے شیطان نے انہیں چند ایک گناہوں کی وجہ سے پھسلا دیا مگر خدا نے انہیں بخش دیا اور خدا بخشنے والا اور حلیم ہے۔

(۱۵۶)يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَ اللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۗ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ	اے ایماندارو! تم کفار کی مانند نہ ہو جاؤ کہ جب ان کے بھائی سفر پر یا جنگ کے لئے جاتے ہیں (اور مر جاتے ہیں یا قتل ہو جاتے ہیں) تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور قتل نہ ہوتے (تم ایسا نہ کہو) تاکہ خدا یہ حسرت ان کے دلوں میں رکھ دے اور زندہ کرنے والا اور مارنے والا خدا ہے اور وہ تمہارے اعمال سے آگاہ ہے۔
(۱۵۷)وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ	اور اگر تم راہ خدا میں قتل ہو جاؤ یا مر جاؤ (تو تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوا) کیونکہ خدا کی رحمت اور مغفرت ان تمام چیزوں سے جو انہوں نے (ساری زندگی میں) جمع کیا ہے بہتر ہے۔

(۱۵۸)وَلَئِنۡ مُّتُّمۡ اَوۡ قُتِلۡتُمۡ لَاۡاِلَی اللّٰہِ تُحۡشَرُوۡنَ	اور اگر تم مر جاؤ یا قتل ہو جاؤ تو خدا کی طرف پلٹ جاؤ گے (لہٰذا تم فنا نہیں ہو گے)

تفسیر

منافقین کی مفاد پرستی

واقعہ اُحد دو لحاظ سے مسلمانوں کے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہے پہلی یہ کہ واقعہ اس وقت کے تمام حالات و کیفیات کا آئینہ دار ہے جس میں مسلمانوں کی حقیقی صورتحال کی عکاسی ہوتی ہے اور انہیں اپنی کیفیت کی اصلاح کرنے پر ابھارا گیا اور کمزور پہلوؤں کو بہتر کرنے کی دعوت دی گئی ہے اسی بنا پر قرآن نے اس واقعہ کو نہایت اہتمام سے بیان کیا ہے بہت سی گذشتہ اور آئندہ آیات میں بھی اس واقعے سے تربیت کے لئے فائدہ اٹھایا گیا ہے دوسری طرف یہ واقعہ دشمنوں اور منافقوں کیلئے زہر پاشی کا کام دیتا تھا اس لیے بہت سی آیات میں اس کو زائل کیا گیا ہے مندرجہ بالا آیات بھی ایسی ہی ہیں۔

مذکورہ بالا آیات منافقین کی تخریبی کاروائیوں کو ناکام بنانے اور مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لئے پہلے صاحب ایمان افراد سے خطاب کرتی ہیں کہ تم کفار کی طرح نہ ہو جاؤ کہ جس وقت ان کے بھائی سفر پر یا جنگ لڑنے کے لئے جاتے ہیں اور وہ قتل ہو جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ افسوس اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے اگرچہ وہ یہ باتیں ہمدردی کے بھیس میں کرتے ہیں لیکن تم ان زہریلی باتوں سے بچو اور ایسے جملے زبان پر نہ لاؤ

اگر تم مومنین ان کی گمراہ کن باتوں سے متاثر ہوئے اور ایسی ہی باتیں کیں تو فطری طور پر تمہارے جذبے ماند پڑ جائیں گے اور میدان جنگ کی طرف جانے سے اور راہ خدا میں سفر سے رک جاؤ گے اور اس طرح لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن تم ایسا نہ کرو اور مضبوط جذبے کے ساتھ میدان جہاد میں جاؤ تاکہ ایسی حسرت منافقین کے دلوں میں ہمیشہ کے لئے رہ جائے اس کے بعد قرآن ان کی زہر آلود باتوں کے تین منطقی جواب دیتا ہے۔

1۔موت و حیات ہر حالت میں اللہ کے دست قدرت میں ہے سفر اور جنگ کرنے سے اس کی قطعی و یقینی حالت نہیں بدل سکتی اور خدا بندوں کے سب اعمال سے آگاہ ہے۔

(۱۵۷)۔2۔اب اگر تم راہ خدا میں مر جاؤ یا قتل ہو جاؤ اور منافقین کے خیال کے مطابق تم پر موت جلد آ پڑے تو تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوا کیونکہ پروردگار کی رحمت و مغفرت ان اموال سے بدرجہا بہتر ہے جو تم یا منافقین اپنی زندگی میں جمع کرتے ہو۔اصولی طور پر ان دونوں کا آپس میں تقابل نہیں کرنا چاہئے لیکن ان کی پست ذہنیت مال و دولت اور چند روزہ زندگی کو اعزاز جہاد و شہادت پر ترجیح دیتی تھی اس لیے اس کے علاوہ چارہ نہیں تھا کہ کہا جاتا کہ جن اموال کو کفار شہوت بھری زندگی اور دنیا پرستی کے جنون میں جمع کرتے ہیں اس سے وہ اعزاز حاصل کہیں بہتر ہے جو تم راہ شہادت اور راہ خدا میں مر جانے سے پاتے ہو۔

(۱۵۸)۔3۔موت کا معنی فنا اور نابودی نہیں ہے جس سے تم اتنے پریشان ہوتے ہو بلکہ موت دوسری زندگی کے لئے ایک دریچہ ہے جو بہت وسیع اور جاوداں ہے۔

(۱۵۹)فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ ۗ اِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ	رحمت الٰہی کے سبب تم ان کے سامنے نرم (اور مہربان ہو) اور اگر تم سخت خو ہوتے تو وہ تم سے دور ہو جاتے لہٰذا انہیں معاف کر دو اور ان کے لئے مغفرت طلب کرو اور کاموں میں ان سے مشورہ کیا کرو لیکن مصمم ارادہ کر لو تو (پھر ڈٹ جاؤ اور) خدا پر توکل کرو کیونکہ خدا توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔
(۱۶۰)اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَ اِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۗ وَ عَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ	اگر خدا تمہاری مدد کرے تو کوئی بھی تم پر غلبہ نہیں پا سکتا اور اگر وہ تمہاری مدد سے دستبردار ہو جائے تو اس کے علاوہ کون تمہاری مدد کرنے والا ہے اور مومنین کو صرف خدا پر توکل کرنا چاہیئے۔

تفسیر

عام معافی کا حکم

اگر چہ اس آیت میں گرد و پیش کے حوالے سے عمومی پروگراموں سے متعلق احکام پیغمبر اکرم ﷺ کو دیئے گئے لیکن شان نزول کے لحاظ سے اس کا تعلق جنگ اُحد کے ساتھ ہے کیونکہ یہ جو لوگ واقعہ اُحد کے دوران جنگ سے فرار ہو گئے تھے وہ پیغمبر اکرم ﷺ کے گرد جمع ہو گئے اور انہوں نے ندامت و پشیمانی کے عالم میں معافی کی درخواست کی تو خداوند قدوس نے اس آیت میں پیغمبر اکرم ﷺ سے انہیں عام معافی دینے کے لئے فرمایا لہٰذا یہ آیت نازل ہوتے ہی آپ ﷺ نے فراخ دلی سے توبہ کرنے والے خطا کاروں کو معاف کر دیا۔

درج بالا آیت میں پیغمبر اکرم ﷺ کی ایک بہت بڑی اخلاقی خوبی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تم پروردگار کے لطف و کرم کے سبب ان پر مہربان ہو گئے اور اگر تم ان کے لئے سنگدل سخت مزاج اور تند خو ہوتے اور عملا ان پر لطف وعنایت نہ کرتے تو وہ تمہارے پاس سے بکھر جاتے۔''فظ''..........لغت میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کی باتیں تیز اور سخت ہوں اور غلیظ القلب اسے کہتے ہیں جو سنگدل اور لطف محبت کا عملی اظہار بھی نہ کر سکے اس بنا پر ان دونوں میں سختی کا معنی پایا جاتا ہے لیکن اول الذکر گفتگو میں سختی کرنے اور موخر الذکر کام میں سختی کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے گویا خدا تعالیٰ نادانوں اور گنہگاروں کے لئے پیغمبر اکرم ﷺ کی

کامل نرم دلی اور لطف وعنایت کا ذکر کرتا ہے۔

اس کے بعد حکم دیا گیا کہ ان کی کوتاہیوں سے درگزر فرمایئے اور انہیں اپنے دامن عفو میں جگہ دیجئے اور اس جنگ میں انہوں نے جو بے وفائیاں آپ سے کی ہیں اور جو تکالیف اس جنگ میں آپ ﷺ کو پہنچائی ہیں ان کے لئے ان کی مغفرت طلب کیجئے اور میں خود ان کے لئے تم سے سفارش کرتا ہوں کہ انہوں نے میری جو مخالفتیں کی ہیں مجھ سے ان کی مغفرت طلب کرو دوسرے لفظوں میں جو تم سے مربوط ہے اسے تم معاف کردو اور جو مجھ سے ربط رکھتا ہے اسے میں بخش دیتا ہوں آنحضرت ﷺ نے فرمان خدا پر عمل کرتے ہوئے ان تمام کو عام معافی دے دی واضح ہے کہ عفو ودرگزر کرنے کے لئے ایک اہم اور بہت مناسب موقع تھا اور اگر آپ ﷺ ایسا نہ کرتے تو لوگوں کے بکھر جانے کے لئے فضا ہموار تھی وہ لوگ جو اتنی بری شکست کا سامنا کر چکے تھے اور بہت سے مقتول ومجروح پیش کر چکے تھے (اگر چہ یہ سب کچھ ان کی اپنی غلطی سے ہوا تاہم ایسے لوگوں کو محبت ودلجوئی اور تسلی کی ضرورت تھی تاکہ ان کے دل اور جسم کے زخم پر مرہم لگ سکے اور وہ ان سے جانبر ہوکر آئندہ کے معرکوں کے لئے تیار ہوسکیں۔

آخری فیصلے کا مرحلہ

مشورہ کرتے وقت نرم مزاجی اور محبت سے کام لینا چاہئے لیکن جب پختہ ارادہ کرلیا جائے تو اتنا ہی مضبوط بھی ہونا چاہئے اور اپنے آپ کو ہر قسم کے تردّد اور اختلاف آراء سے دور رکھتے ہوئے مصمم ارادہ کر لینا چاہئے اسی کو قرآن مجید نے مندرجہ بالا آیت میں عزم سے تعبیر کیا ہے اور یہی تصمیم قاطع ہے۔

توکل کا نتیجہ

یہ آیت گذشتہ آیت کی تکمیل کرتی ہے اس میں خدا پر توکل کے سلسلے میں ایک نکتہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ کہ خدا کی قدرت تمام قدرتوں سے بالاتر ہے لہٰذا وہ جس کی حمایت کرے گا دوسرا کوئی بھی اس پر کامیابی حاصل نہیں کرسکتا وہ ذات جو ایسی تمام کامیابیوں کا سرچشمہ ہے اس پر بھروسہ کرنا چاہئے اور اسی سے مدد مانگنی چاہئے۔

یہ آیت اہل ایمان کو ترغیب دلاتی ہے کہ ہر قسم کے ظاہری وسائل میسر ہونے کے باوجود خدا تعالیٰ کی ناقابل شکست قدرت پر بھروسہ کرنا چاہئے۔

دراصل گذشتہ آیت میں روئے سخن پیغمبر اکرم ﷺ کی طرف تھا اور انہیں حکم دیا گیا تھا لیکن اس آیت میں تمام مومنین مخاطب ہیں انہیں فرمایا گیا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی طرح خدا کی ذات پاک پر بھروسہ کریں اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا:

”وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ“

یعنی مومنین کو صرف ذات خدا پر توکل کرنا چاہئے۔

(۱۶۱)وَ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ	اور ممکن نہیں ہے کہ کوئی پیغمبر خیانت کرے اور جو شخص خیانت کرے گا وہ روز قیامت اسی چیز کے ہمراہ (میدان حشر میں) پیش ہوگا پھر ہر شخص کو وہ کچھ دیا جائے گا جو اس نے کمایا ہوگا (اس بناء پر) ان پر ظلم نہیں ہوگا۔

تفسیر

ہر قسم کی خیانت ممنوع ہے

اس طرف توجہ رکھتے ہوئے کہ مندرجہ بالا آیت جنگ اُحد کے سلسلے کی آیات کے بعد آئی ہے اور ان روایات پر نظر رکھتے ہوئے جو صدر اول کے مفسرین نے نقل کی ہیں یہ آیت جنگ اُحد کے سپاہیوں کی بعض بے بنیاد عذر تراشیوں کے جواب میں ہے اس کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ جنگ اُحد کے بعض تیر انداز جب اپنا حساس مورچہ مال غنیمت جمع کرنے کے لئے چھوڑنا چاہتے تھے تو ان کے سردار نے انہیں حکم دیا کہ وہ یہ مورچہ نہ چھوڑیں اور ساتھ ہی ان سے کہا کہ رسول ﷺ خدا تمہیں مال غنیمت سے محروم نہیں رکھیں گے لیکن ان دنیا پرستوں نے اپنے اصلی چہرے چھپانے کے لئے کہا کہ ہمیں یہ ڈر ہے کہ پیغمبر تقسیم غنائم میں نظر انداز کر دیں گے لہٰذا ہمیں اپنے لیے خود ہاتھ پاؤں مارنے چاہیں یہ کہہ کر انہوں نے اپنا مورچہ چھوڑا اور مال غنیمت سمیٹنے لگ گئے اور پھر وہ دردناک حوادث پیش آئے جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے کیا تم گمان کرتے ہو کہ پیغمبر ﷺ تم سے خیانت کریں گے جبکہ ممکن نہیں کہ کوئی پیغمبر خیانت کرے۔

البتہ واضح ہے کہ خیانت کی کسی شخص کو اجازت نہیں چاہے وہ پیغمبر ہو یا کوئی اور لیکن جنگ اُحد کے بہانہ سازوں کی گفتگو چونکہ پیغمبر ﷺ کے بارے میں تھی لہٰذا آیت بھی پہلے انبیاء کے متعلق بات کرتی ہے اور پھر مزید کہتی ہے۔ جو شخص بھی خیانت کرے گا وہ روز قیامت اس چیز کا بار اپنے دوش پر بطور سند اٹھائے ہوئے حاضر ہوگا جس میں اس نے خیانت کی ہوگی یا میدان محشر میں اسے اپنے ساتھ لائے گا اس طرح وہ سب کے سامنے ذلیل و رسوا ہوگا۔

پھر ہر شخص کو وہ کچھ دیا جائے گا جو اس نے انجام دیا ہے یا کسب کیا ہے یعنی لوگ اپنے اعمال کو بعینہ وہاں پائیں گے لہٰذا اس بناء پر کسی شخص پر ظلم و ستم نہیں ہوگا کیونکہ ہر شخص کو وہ کچھ مل جائے گا جو اس نے حاصل کیا تھا یا کمایا تھا چاہے اچھا ہو یا برا۔

(۱۶۲) اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ	وہ جو رضائے خدا کی پیروی کرے کیا وہ اس کی مانند ہے جو خشم وغضب خدا کی طرف لوٹے اور جس کی جائے قرار جہنم ہے جس کا انجام بہت ہی برا ہے۔
(۱۶۳) هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ	ان میں سے ہر ایک کے لئے درگاہِ خدا میں درجہ و مقام ہے اور جو کچھ وہ انجام دیتے ہیں خدا اسے دیکھتا ہے۔

تفسیر

جہاد میں شرکت نہ کرنے والے

آیات گذشتہ میں جنگ اُحد کے مختلف پہلوؤں اور اس کے نتائج پر بحث ہو چکی ہے اب باری ہے منافقین اور ان کمزور ایمان والے مسلمانوں کی جو منافقین کی اتباع کرتے ہوئے میدان جنگ میں حاضر نہ ہوئے روایات میں ہے کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ اُحد کے لئے چلنے کا حکم صادر فرمایا تو منافقین کا ایک گروہ اس بہانے سے شامل نہ ہوا کہ بقول ان کے انہیں جنگ کے وقوع پذیر ہونے کا یقین نہیں تھا بعض کمزور ایمان والے مسلمان بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئے زیر نظر آیت ان کی اسی حالت کی وضاحت کرتے ہوئے کہتی ہے وہ لوگ جو حکم خداوند کی اطاعت کرتے ہیں اور اس کی رضا کی پیروی کرتے ہیں کیا وہ ان لوگوں کی طرح ہیں جو غضب خدا کی طرف لوٹ گئے ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم اور ان کا انجام کار برا اور تکلیف دہ ہے۔

اس کے بعد فرمایا: ان میں سے ہر کوئی بارگاہ الٰہی میں درجہ اور اہمیت رکھتا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ نہ فقط یہ کہ تن پرور منافق اور مجاہدین آپس میں فرق رکھتے ہیں بلکہ ہر شخص جو ان دو صفوں میں سے کسی میں کھڑا ہے فدا کاری و جانبازی یا نفاق و حق دشمنی میں فرق کا ایک خاص درجہ رکھتا ہے جو صفر سے شروع ہو کر حد تصور سے بالاتر تک جاری و ساری رہتا ہے۔

(۱۶۴) لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۚ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ	خدا نے مومنین پر احسان کیا (انہیں ایک عظیم نعمت بخشی) جبکہ ان میں انہی کی جنس سے ایک پیغمبر مبعوث کیا جو ان کے سامنے اس کی آیات پڑھتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگر چہ اس سے پہلے وہ واضح گمراہی میں تھے۔

تفسیر

خدا کی بہت بڑی نعمت

اس آیت میں عظیم ترین نعمت یعنی بعثت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق گفتگو ہے حقیقت میں یہ ان سوالات کا جواب ہے جو نو

مسلموں کے دل میں جنگ اُحد کے بعد اٹھتے تھے وہ سوچتے تھے کہ ہم ان مشکلات و مصائب میں کیوں گرفتار ہوں قرآن انہیں کہتا ہے اگر تمہیں اس راہ میں نقصان اٹھانا پڑا ہے تو یہ نہ بھول جاؤ کہ اللہ نے تمہیں ایک بہت بڑی نعمت عطا کی ہے اس نے پیغمبر مبعوث کیا ہے جو تمہاری تربیت کرتا ہے اور تمہیں کھلی گمراہیوں سے روکتا ہے اس عظیم نعمت کی حفاظت کے لئے تم جتنی بھی کوشش کرو اور تمہیں جتنی بھی قیمت دینا پڑے حقیر ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے پیغمبر کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ خود انہی کی جنس اور نوع بشر میں سے ہے ''مِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ'' وہ فرشتوں یا دیگر مخلوق کی نوع میں سے نہیں ہے یہ اس لیے ہے تا کہ وہ ضروریات بشر کو مکمل طور پر جان سکے اور انسان کے دکھ درد مشکلات و مصائب اور مسائل زندگی کو لمس کر سکے اور یوں ان کی تربیت کے لئے اقدام کرنے کی طرف خود متوجہ ہو سکے۔

پھر فرمایا پیغمبر نے ان کے سامنے تین اہم پروگرام پیش کیے ہیں:

''يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَ الۡحِكۡمَةَ''

پہلا: تلاوت آیات ....ان کے سامنے پروردگار عالم کی آیات تلاوت کرنا اور ان کے کانوں اور افکار کو ان آیات سے آشنا کرنا۔

دوسرا: تعلیم ....یعنی ان حقائق کو ان کی روح تک پہنچانا۔

تیسرا: تزکیہ نفس ....یعنی اخلاقی و انسانی ملکات کی تربیت اور نشو و نما چونکہ اصلی ہدف تربیت ہے لٰہذا آیت میں اس کا ذکر تعلیم سے پہلے آیا ہے حالانکہ فطری تربیت کے لحاظ سے تعلیم تربیت پر مقدم ہے۔

دنیا کے لوگ اور خصوصا جزیرۃ العرب کے رہنے والے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے زمانے میں واضح ضلالت و گمراہی میں مبتلا تھے ناجائز کاروبار بدبختی جہل و نادانی اور طرح طرح کی معنوی آلودگیوں نے اس زمانے میں تمام دنیا کو گھیر رکھا تھا اور یہ غیر مناسب کیفیت کسی پر بھی ڈھکی چھپی نہ تھی۔

(۱۶۵) اَوَ لَمَّاۤ اَصَابَتۡكُمۡ مُّصِيۡبَةٌ قَدۡ اَصَبۡتُمۡ مِّثۡلَيۡهَا ۙ قُلۡتُمۡ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلۡ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ	(جنگ اُحد میں) تم پر مصیبت آئی جبکہ جنگ بدر میں اس سے دوگنا (دشمن) پر بھی تم غالب آ چکے ہو تو تم کہنے لگے کہ یہ مصیبت کہاں سے آئی ہے؟ کہہ دو کہ یہ خود تمہاری طرف سے ہے (کہ تم نے جنگ اُحد کے میدان میں حکم پیغمبر کی مخالفت کی) خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر

جنگ اُحد پر ایک اور نظر

اس آیت میں واقعہ اُحد پر ایک اور نگاہ ڈالی گئی ہے اس کی وضاحت یہ ہے کہ بعض مسلمان جنگ کے المناک نتائج پر غمگین اور پریشان تھے اور بار بار اپنی پریشانی کا اظہار کرتے تھے۔ خداوند عالم مندرجہ بالا آیت میں ان سے تین نکات کا ذکر کرتا ہے تم صرف

ایک ہی جنگ کے نتائج سے پریشان نہ ہو جاؤ بلکہ جتنی مرتبہ دشمن سے مقابلہ ہوا ہے اس کا موازنہ کرو اگر اس میدان میں تم پر مصیبت آئی ہے تو دوسرے میدان بدر میں اس سے دوگنا دشمن پر تم بھی غالب آ چکے ہو کیونکہ انہوں نے اُحد میں تمہارے ستر آدمی شہید کیے ہیں جبکہ تم میں سے کوئی قید نہیں ہوا لیکن جنگ بدر میں تم نے ان کے ستر آدمی قتل کیے اور ستر ہی گرفتار کیے تھے۔

1۔ حقیقت میں تم نے دشمن کو دوگنا نقصان پہنچایا تھا ایک جواب ہے جو سوال سے پہلے آیا ہے۔

2۔ تم کہتے ہو کہ یہ مصیبت ہمیں کہاں سے دامن گیر ہوئی لیکن اے پیغمبر! ان سے کہیے اس مصیبت کا باعث خود تم ہو اور عوامل شکست کو اپنی ہی ذات میں تلاش کرو۔ تم ہی تو تھے جنہوں نے حکم پیغمبر کی مخالفت میں کوہ عینین کا حساس مور چہ چھوڑ دیا اور تمہی نے جنگ ختم ہونے سے پہلے اور اس کے حتمی فیصلے سے قبل مال غنیمت جمع کرنا شروع کر دیا اور تم ہی دشمن کے نئے حملے کے وقت میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تمہاری یہی کوتاہیاں اور گناہ اس شکست اور اتنے لوگوں کے قتل کا سبب بنیں۔

3۔ اب آئندہ تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہئے کیونکہ خدا ہر چیز پر قادر و توانا ہے اور اگر تم اپنی کمزوریوں کی تلافی کر لو تو اس کی حمایت تمہارے شامل حال ہوگی۔

(۱۶۶)وَ مَآ اَصَابَكُمۡ يَوۡمَ الۡتَقَى الۡجَمۡعٰنِ فَبِاِذۡنِ اللّٰهِ وَلِيَعۡلَمَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۙ	اور اس روز (اُحد کے دن) جب دو گروہ (مومنین و کفار) آپس میں نبرد آزما ہوئے تو تمہیں جو مصیبت پہنچی وہ حکم خدا اور (قانون مکافات) کے مطابق تھی اور اس بناء پر تھی کہ اہل ایمان پہچانے جائیں۔
(۱۶۷)وَلِيَعۡلَمَ الَّذِيۡنَ نَافَقُوۡا ۖۚ وَ قِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا قَاتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَوِ ادۡفَعُوۡا ؕ قَالُوۡا لَوۡ نَعۡلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعۡنٰكُمۡ ؕ هُمۡ لِلۡكُفۡرِ يَوۡمَئِذٍ اَقۡرَبُ مِنۡهُمۡ لِلۡاِيۡمَانِ ۚ يَقُوۡلُوۡنَ بِاَفۡوَاهِهِمۡ مَّا لَيۡسَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ وَ اللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا يَكۡتُمُوۡنَ ۚ	اور (یہ بھی وجہ تھی) کہ جن لوگوں نے منافقت کی ہے وہ پہچانے جائیں وہ جنہیں کہہ دیا گیا تھا کہ آؤ اور راہ خدا میں جنگ کرو یا (کم از کم) اپنے حریم کا دفاع کرو انہوں نے کہا اگر ہمیں یقین ہوتا کہ واقعاً جنگ ہوگی تو ہم تمہاری پیروی کرتے (لیکن ہمیں تو پتہ ہے کہ جنگ نہیں ہوگی) وہ لوگ اس دن ایمان کی نسبت کفر سے زیادہ نزدیک تھے وہ اپنے منہ سے وہ کچھ کہتے تھے جو ان کے دل میں نہیں ہوتا تھا اور خدا اس چیز کو جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں

تفسیر

مختلف گروہوں کو الگ الگ پہچانا جانا چاہئے

مندرجہ بالا آیت یہ بات یاد دلاتی ہے کہ اُحد کی طرح جو مصیبت بھی پیش آتی ہے ایک تو یہ کہ وہ بلا سبب نہیں ہوتی اور دوسرا

یہ کہ وہ آزمائش کا ذریعہ بھی ہوتی ہے اسی لیے اس آیت میں سچے مجاہدین اور منافقین یا کمزور ایمان لوگوں کی صفوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کا ذکر ہے اسی لیے آیت کے پہلے حصے میں فرمایا گیا ہے۔ اُحد کے دن جب مسلمانوں کا بت پرستوں سے آمنا سامنا ہوا اس وقت جو کچھ تم پر گزرا وہ حکم خدا سے تھا اور اسی کی مشیت اور ارادے سے ظہور پذیر ہوا۔

خلقت کے عمومی قانون کے مطابق ہر واقعے کی کوئی نہ کوئی علّت ہوتی ہے اور بنیادی طور پر یہ جہان علل واسباب کی دنیا ہے اور یہ ایک ثابت ودائمی اصول ہے اور اس کے مطابق بھی کہ جو فوج بھی میدان جنگ میں سستی کرے گی اور مال ودولت اور غنیمت کی لالچ میں پڑ جائے گی اور اپنے ہمدرد حاکم کا حکم فراموش کردے گی تو وہ شکست کھا جائے گی اس بناء پر اذن اللہ حکم خدا سے مراد اس کا وہی ارادہ ومشیت ہے جو قانون علیّت کی شکل میں عالم ہستی پر حکم فرما ہے۔

آیت کے دوسرے حصے میں فرمایا گیا ہے ہے۔ اس جنگ کا ایک مقصد یہ تھا کہ مومنین اور منافقین کی صفیں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور صاحب ایمان اور کمزور ایمان والوں میں امتیاز ہو سکے۔

اگر اُحد میں سخت معرکہ پیش نہ آتا تو یہ صفیں کبھی الگ الگ نہ ہوتیں اور ہر گروہ کے لوگ اپنی مخصوص صفات کے باوجود کسی معین صف میں نہ سمجھے جاتے اور ممکن تھا کہ دعویٰ کرتے وقت ہر شخص اپنے آپ کو بہترین مومن قرار دیتا۔

درحقیقت آیت میں دو چیزوں کی طرف اشارہ ہوا ہے پہلی جنگ اُحد کی شکست کی علت فاعلی اور دوسری اس کی علّت غائی اور اس کا آخری نتیجہ۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں فرمایا گیا۔ تاکہ وہ لوگ پہچانے جائیں جنہوں نے نفاق کیا ہے یہ نہیں فرمایا ''**لیعلم المنافقین**'' تاکہ منافق پہچانے جائیں دوسرے لفظوں میں نفاق کا ذکر فعل کی صورت میں ہوا ہے صفت کے طور پر نہیں یہ اس لیے ہے کہ نفاق ابھی تک ان سب میں صفت ثابت کے طور پر نہیں تھا اسی لیے تاریخ اسلام میں ہے کہ ان میں سے بعض کو توبہ کی توفیق نصیب ہوئی اور وہ مومنین کی صفوں سے وابستہ ہو گئے۔

اس کے بعد قرآن اس گفتگو کا تذکرہ کرتا ہے جو جنگ سے قبل مسلمانوں اور منافقوں کے درمیان ہوئی فرمایا:

ایک مسلمان (ابن عباس کے قول کے مطابق) عبداللہ بن عمر بن حزام نے جب دیکھا کہ عبداللہ بن ابی سلول اپنے ساتھیوں کے ساتھ لشکر اسلام سے کنارہ کش ہو کر مدینہ کی طرف پلٹنے کا مصمم ارادہ کر چکا ہے تو اس سے کہا آؤ خدا کے لئے اور اس کی راہ میں جنگ کرو یا کم از کم جو خطرہ تمہارے وطن اور قوم قبیلے کو درپیش ہے اس کا ہی دفاع کرو

مگر ان لوگوں نے ایک بے ہودہ بہانہ کیا اور کہنے لگے۔ ہمیں اگر معلوم ہوتا کہ جنگ ہو گی تو ہم بے دریغ تمہاری پیروی کرتے ہمارا خیال ہے کہ یہ سختی کسی جنگ اور خون ریزی کے بغیر ختم ہو جائے گی۔

ایک اور مفہوم کے مطابق منافقین کہنے لگے اگر ہم اسے جنگ سمجھتے تو تمہارا ساتھ دیتے لیکن ہماری نگاہ میں تو یہ جنگ نہیں بلکہ ایک طرح کی خودکشی ہے کیونکہ لشکر اسلام اور کفار میں جو عدم توازن نظر آ رہا ہے اس کے پیش نظر ان سے جنگ کرنا عقلمندی کا کام نہیں خصوصاً جبکہ لشکر اسلام کے پڑاؤ کی جگہ بھی نامناسب ہے۔

بہرحال یہ باتیں بہانے سے زیادہ واقعت نہیں رکھتی تھیں جنگ کا ہونا بھی یقینی تھا اور مسلمان ابتداء میں کامیاب اور فتح مند بھی ہوگئے تھے اب اگر انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے تو یہ ان کے اپنے اشتباہات اور خلاف ورزیوں کا نتیجہ تھا خدا تعالیٰ نے فرمایا: وہ جھوٹ بولتے ہیں۔اس روز وہ ایمان کی نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے اس جملے سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کفر و ایمان کے کئی درجے ہیں جو انسان کے عقیدے اور طرزِ عمل سے وابستہ ہیں۔

وہ زبان سے ایسی بات کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہے اور ان کی نیت ان کی گفتگو سے بالکل میل نہیں کھاتی انہوں نے اپنی اس تجویز میں اصرار کرتے ہوئے کہ جنگ مدینہ کے اندر ہونی چاہئے یا دشمن کے حملوں کے خوف سے اور یا پھر اسلام سے لا تعلق ہونے کی وجہ سے جنگ میں شرکت نہیں کی۔لیکن خدا اس سے مکمل طور پر آگاہ ہے جو کچھ منافق چھپائے ہوئے ہیں اور وہ اس جہاں میں بھی ان کے چہرے سے نقاب اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کو ان کے مقاصد سے آگاہ کرتا ہے اور آخرت میں بھی ان کا حساب چکائے گا۔

(۱٦۸)اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ۭ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ	(منافقین) وہ ہیں جنہوں نے اپنے بھائیوں سے ان کی حمایت سے دستکش ہو کر کہا کہ اگر وہ ہماری پیروی کرتے تو قتل نہ ہوتے۔کہہ دو (اگر تم موت کا وقت بتا سکتے ہو تو) پھر موت کو اپنے آپ ہی سے دور کر لو اگر تم سچے ہو۔

تفسیر

منافقین کی بے بنیاد باتیں

منافقین خود بھی جنگ اُحد سے کنارہ کش رہے اور دوسروں کے حوصلے کم کرنے کی کوشش کرتے رہے اور پھر مجاہدین واپس آئے تو انہیں سرزنش کرنے لگے اور کہنے لگے کہ اگر تم ہماری بات مانتے تو تمہارے آدمی قتل نہ ہوتے۔

مندرجہ بالا آیت میں قرآن ان کی اس بے بنیاد بات کا جواب دیتا ہے اور کہتا ہے۔جنہوں نے جنگ سے کنارہ کشی کی اور اپنے بھائیوں سے کہا کہ اگر ہماری اطاعت کی ہوتی تو تم قتل نہ ہوتے۔ان سے کہیے اگر تم آئندہ کے حوادث کی پیش بینی کر سکتے ہو تو اپنے آپ ہی سے موت دور کر لو اگر سچے ہو۔

یعنی حقیقت میں تمہارا دعویٰ ہے کہ تم عالم الغیب ہو اور آنے والے حوادث سے باخبر ہو،تو ایسا دعویٰ کرنے والے شخص کو چاہئے کہ وہ اپنی موت کے علل وعوامل کی پیش بینی کرتے ہوئے انہیں بیکار کر دے اور موت کو خود سے دور کر دے،کیا تم میں یہ قدرت و طاقت ہے؟

(۱۶۹)وَ لَاتَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ ۙ	راہ خدا میں قتل ہونیوالوں کے بارے میں ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے ہاں سے روزی پاتے ہیں۔
(۱۷۰)فَرِحِیۡنَ بِمَاۤ اٰتٰہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ۙ وَ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِالَّذِیۡنَ لَمۡ یَلۡحَقُوۡا بِہِمۡ مِّنۡ خَلۡفِہِمۡ ۙ اَلَّا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ۘ	وہ خدا کی عطا کردہ فراواں نعمتوں پر خوش ہیں اور وہ (مجاہد) کہ جو ان سے پیچھے رہ گئے ہیں اور ان سے ابھی آ کر نہیں ملے ان کے بارے میں بھی خوش ہیں کہ نہ ان کے لئے کوئی خوف ہے اور نہ ملال۔
(۱۷۱)یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِنِعۡمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ فَضۡلٍ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۚ	اور وہ خدا کی نعمت اور اس کے فضل سے خوشیاں منا رہے ہیں اور بے شک اللہ مومنین کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

تفسیر

زندہ جاوید

بعض مفسرین کے نزدیک مندرجہ بالا آیات شہدائے اُحد کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور بعض دوسرے سمجھتے ہیں کہ یہ شہدائے بدر سے متعلق ہیں لیکن حق یہ ہے کہ گذشتہ آیات سے ان کا ربط ظاہر کرتا ہے کہ یہ جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی ہیں لیکن ان کا عمومی مفہوم بھی ہے جو تمام شہداء ''جن میں بدر کے چودہ شہدا بھی شامل ہیں'' پر محیط ہے اسی لیے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا یہ آیات شہداء بدر و اُحد ہر دو کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

ایسے افکار اور ایسی باتیں نہ فقط یہ کہ درست اور واقع کے مطابق نہ تھیں بلکہ باقی رہ جانے والوں کے جذبوں کو بھی کمزور کرنے کا باعث تھیں زیرِ نظر آیات نے شہیدوں کے بلند مقام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: ''وَ لَاتَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتًا'' یہاں روئے سخن فقط پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے تا کہ دوسرے خود اندازہ کر لیں۔

آیت کے اس حصے کا مفہوم ہے کہ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یہ گمان ہرگز نہ کیجئے۔ کہ جو لوگ راہ خدا میں مارے گئے ہیں وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے ہاں سے نعمتیں حاصل کرتے ہیں۔

یہاں زندگی سے مراد برزخ کی زندگی ہے جو موت کے بعد کے زمانے میں ارواح کو حاصل ہوتی ہے یہ مادی و جسمانی زندگی نہیں البتہ یہ زندگی شہدا سے مخصوص نہیں اور دیگر بہت سے لوگ بھی اس زندگی کے حامل ہیں لیکن شہیدوں کی زندگی چونکہ بہت انواع و اقسام کی نعمتوں سے مالا مال ہے علاوہ ازیں آیت میں موضوعِ سخن شہدا ہی ہیں اس لیے صرف انہیں کا نام لیا گیا ہے اور وہ اس

قدر حیات معنوی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہیں گویا برزخ میں رہنے والے باقی لوگوں کی زندگی ان کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

(۱۷۰)اس کے بعد شہداء کی حیات برزخ کی بہت سی خوبیوں میں سے ایک پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ فراواں نعمتیں جو خدا نے اپنے فضل و کرم سے انہیں دی ہیں ان سے وہ خوشحال ہیں۔

ان کی دوسری مسرت اپنے ان مجاہد بھائیوں کے بارے میں ہے جنہوں نے میدان جنگ میں جام شہادت نوش نہیں کیا اور ان سے مل نہیں پائے وہ ان کے مقامات اور اجر و ثواب کو اس جہان میں اچھی طرح دیکھتے ہیں اس بناء پر وہ مسرور و شاداں ہیں جیسا کہ قرآن کہتا ہے "وَ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِالَّذِیۡنَ لَمۡ یَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ مِّنۡ خَلۡفِهِمۡ" اس کے بعد فرماتا ہے: شہدا محسوس کرتے ہیں کہ ان کے مجاہد بھائی ان چیزوں کے بارے میں کوئی غم نہیں کرتے جو وہ بعد از موت دنیا میں چھوڑ آئے ہیں اور نہ ہی انہیں قیامت اور اس کے وحشتناک حوادث کا خوف ہے۔

اس جملے کی ایک اور تفسیر بھی ہو سکتی ہے وہ یہ کہ شہداء اپنے ان مجاہد بھائیوں کے مقامات بلند دیکھ کر خوش ہوتے ہیں جو ان کے ساتھ نہیں مل سکے اور اس کے علاوہ انہیں خود بھی آئندہ کا کوئی خوف اور گذشتہ کا غم نہیں ہے

(۱۷۱)یہ آیت در حقیقت ان بشارتوں کی زیادہ تاکید اور توضیح ہے جو شہادت کے بعد شہداء کو حاصل ہوئی ہیں وہ دو وجوہ کی بناء پر خوش اور مسرور ہیں۔

پہلی یہ کہ وہ خدا کی نعمتیں پا لیتے ہیں نعمتیں ہی نہیں بلکہ اس کا فضل جس کا معنی ہے ان نعمتوں کی زیادتی اور تکرار دوسری یہ کہ وہ دیکھتے ہیں کہ خدا مومنین کا اجر ضائع نہیں کرتا نہ شہیدوں اور سچے مجاہدین جو جام شہادت نوش نہیں کر سکے گا اجر ضائع کرتا ہے۔ در حقیقت جو کچھ انہوں نے پہلے سنا ہوا تھا اب وہ اسے واضح طور پر دیکھیں گے۔

(۱۷۲)اَلَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوۡلِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الۡقَرۡحُ ؕۛ لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا مِنۡهُمۡ وَ اتَّقَوۡا اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ۚ	جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی خدا اور رسول کی دعوت کو قبول کیا ان میں سے نیک عمل کرنے والوں اور تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لئے اجر عظیم ہے۔
(۱۷۳)اَلَّذِیۡنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَكُمۡ فَاخۡشَوۡهُمۡ فَزَادَهُمۡ اِیۡمَانًا ۖۗ وَ قَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ وَ نِعۡمَ الۡوَكِیۡلُ	وہ ایسے اشخاص تھے جن سے (بعض) لوگوں نے کہا کہ (لشکر دشمن کے) افراد نے تم پر (حملہ کرنے کے لئے) اکٹھ کر لیا ہے ان سے ڈرو لیکن ان کا ایمان اور زیادہ ہو گیا اور وہ کہنے لگے کہ خدا ہمارے لیے کافی ہے اور وہ ہمارا بہترین حامی ہے۔

(۱۷۴)فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيْمٍ	اسی وجہ سے (وہ اس میدان سے) پروردگار کی نعمت وفضل کے ساتھ اس عالم میں لوٹے کہ انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچی اور انہوں نے اللہ کی خوشنودی کی اتباع کی اور اللہ تو بڑا صاحب فضل ہے۔

تفسیر

غزوۂ حمراء الاسد

ہم کہہ چکے ہیں کہ جنگ اُحد کے اختتام پر ابوسفیان کا فاتح لشکر بڑی تیزی سے مکہ کی طرف روانہ ہوا جب وہ روحاء کے مقام پر پہنچے تو اپنے کیے پر بہت پشیمان ہوئے اور انہوں نے مدینہ کی طرف لوٹنے اور باقی ماندہ مسلمانوں کو نابود کرنے کا ارادہ کیا یہ اطلاع پیغمبر اکرم ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے فوراً حکم دیا کہ جنگ اُحد میں شریک ہونے والا لشکر دوسری جنگ کے لئے تیار ہو جائے آپ ﷺ نے یہ حکم خصوصیت سے دیا کہ جنگ اُحد کے زخمی بھی لشکر کی صفوں میں جا شامل ہوں ایک صحابی کہتے ہیں۔

میں بھی زخمیوں میں سے تھا لیکن میرے بھائی کے زخم مجھ سے زیادہ شدید تھے ہم نے ارادہ کر لیا کہ جو بھی حالت ہو ہم پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں پہنچیں گے میری حالت چونکہ میرے بھائی سے کچھ بہتر تھی جہاں میرا بھائی نہ چل پاتا میں اسے کندھے پر اٹھا لیتا بڑی تکلیف سے ہم لشکر تک جا پہنچے پیغمبر اکرم ﷺ اور لشکر اسلام حمراء الاسد کے مقام پر پہنچ گئے اور وہاں پڑاؤ ڈالا یہ جگہ مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھی۔

یہ خبر جب لشکر قریش تک پہنچی خصوصاً جب انہوں نے مقابلے کے لئے ایسی آمادگی دیکھی کہ زخمی بھی میدان جنگ میں پہنچ گئے ہیں تو وہ پریشان ہو گئے اور شاید انہیں یہ فکر بھی لاحق ہوئی کہ مدینہ سے تازہ دم فوج ان سے آملی ہے۔

اس موقع پر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ان کے دلوں کو اور کمزور کر دیا اور ان میں مقابلے کی ہمت نہ رہی واقعہ یہ ہوا کہ ایک مشرک جس کا نام معبد خزاعی تھا مدینہ سے مکہ کی طرف جا رہا تھا اس نے پیغمبر اکرم ﷺ اور ان کے اصحاب کی کیفیت دیکھی تو انتہائی متاثر ہوا اس کے انسانی جذبات میں حرکت پیدا ہوئی اس نے پیغمبر اکرم ﷺ سے عرض کیا آپ کی یہ حالت وکیفیت ہمارے لیے بہت ہی ناگوار ہے آپ آرام کرتے تو ہمارے لیے بہتر ہوتا یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل پڑا اور روحاء کے مقام پر ابوسفیان کے لشکر سے ملا ابوسفیان نے اس سے پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں سوال کیا تو اس نے جواب میں کہا میں نے محمد ﷺ کو دیکھا ہے کہ وہ ایسا عظیم لشکر لیے ہوئے تمہارا تعاقب کر رہے ہیں جس جیسا لشکر اس سے پہلے میں نے نہیں دیکھا اور وہ تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں ابوسفیان نے اضطراب اور پریشانی کے عالم میں کہا تم کیا کہہ رہے ہو؟ ہم نے انہیں قتل کیا زخمی کیا اور منتشر کر کے رکھ دیا تھا معبد خزاعی نے کہا میں نہیں جانتا کہ تم نے کیا کیا ہے میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ ایک عظیم اور کثیر لشکر اس وقت تمہارا تعاقب کر رہا ہے۔

ابوسفیان اوراس کے ساتھیوں نے قطعی فیصلہ کرلیا کہ وہ تیزی سے پیچھے ہٹ جائیں اور مکہ کی طرف پلٹ جائیں اوراس مقصد کے لئے کہ مسلمان ان کا تعاقب نہ کریں اورانہیں پیچھے ہٹ جانے کا کافی موقع مل جائے انہوں نے قبیلہ عبدالقیس کی ایک جماعت سے خواہش کی کہ وہ پیغمبراسلام اور مسلمانوں تک یہ خبر پہنچادیں کہ ابوسفیان اور قریش کے بت پرست باقی ماندہ اصحاب پیغمبر کو ختم کرنے کے لئے ایک عظیم لشکر کے ساتھ تیزی سے مدینہ کی طرف آ رہے ہیں یہ جماعت گندم خریدنے کے لئے مدینہ جا رہی تھی جب یہ اطلاع پیغمبر اسلام ﷺ اور مسلمانوں تک پہنچی تو انہوں نے کہا: خدا ہمارے لیے کافی ہے اور وہ ہمارا بہترین حامی اور مدافع ہے

انہوں نے بہت انتظار کیا لیکن دشمن کے لشکر کی کوئی خبر نہ ہوئی لہٰذا تین روز توقف کے بعد وہ مدینہ کی طرف لوٹ گئے مندرجہ بالا آیات اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں

جنہوں نے خدااور پیغمبر کی دعوت قبول کی اور جنگ اُحد میں اٹھائے گئے زخموں کے باوجود دشمن سے دوسری جنگ کے لیے آمادہ ہو گئے ان میں سے نیک عمل کرنے والوں اور تقویٰ اختیار کرنے والوں یعنی پاکیزہ نیت اور خلوص کامل سے میدان میں شرکت کرنے والوں کے لیے اجر عظیم ہے۔

زیر نظر آیت میں ایک گروہ کے لئے اجر عظیم مخصوص کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی کچھ ایسے افراد تھے جو صحیح طور پر مخلص نہ تھے یہ بھی ممکن ہے کہ ''منھم'' (ان میں سے بعض) اس طرف اشارہ ہو کہ اُحد کے جنگجولوگوں میں سے بعض کسی بہانے سے اس میدان سے کنارہ کش ہو گئے

(۱۷۳) اس کے بعد قرآن نے ان کی پامردی واستقامت کی ایک درخشاں نشانی کا یوں تذکرہ کیا ہے: یہ وہی لوگ تھے جنہیں کچھ لوگوں نے قبیلہ عبدالقیس کے لوگ یا ایک روایت کے مطابق نعیم بن مسعود جو خبر لائے تھے کہا کہ دشمن کی فوج جمع ہوگئی ہے اور وہ حملہ کرنے کو تیار ہے ان سے ڈرو لیکن وہ نہ صرف یہ کہ ڈرے نہیں بلکہ اس کے برعکس ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے کہا خدا ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین حامی ہے۔

(۱۷۴) اس استقامت ایمان اور زبردست پامردی کے تذکرے کے بعد قرآن ان کے عمل کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: وہ اس میدان سے اللہ کے فضل ونعمت کے ساتھ لوٹے۔ نعمت وفضل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ دشمن سے کسی خطرناک ٹکراؤ کے بغیر ہی دشمن ان سے ڈر کر بھاگ گیا اور یہ صحیح سالم بغیر کوئی زحمت اٹھائے مدینہ پلٹ آئے۔ فضل ونعمت میں ممکن ہے یہ فرق ہو کہ نعمت استحقاق کے طور پر اجرت کے مفہوم میں ہو اور فضل استحقاق سے بڑھ کر اور اس پر اضافہ ہو۔

اس کے بعد تاکید کے طور پر ہے۔ انہیں اس واقعہ میں تھوڑی سی تکلیف بھی نہیں پہنچی جبکہ خوشنودی خدا ان کے ہاتھ آئی انہوں نے فرمان خدا کی اتباع کی۔ اور خدا کے پاس عظیم فضل وانعام ہے جو حقیقی مومنین اور سچے مجاہدین کے انتظار میں ہے۔

(۱۷۵)اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيۡطٰنُ يُخَوِّفُ اَوۡلِيَآءَهٗ ۖ فَلَا تَخَافُوۡهُمۡ وَخَافُوۡنِ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ	یہ صرف شیطان ہی ہے جو اپنے پیروکاروں کو ڈراتا ہے ان سے نہ ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو اگر ایمان رکھتے ہو۔

تفسیر

یہ آیت غزوۂ حمراء الاسد کے بارے میں نازل ہونے والی آیات کا ضمیمہ ہے لفظ ''ذلکم'' ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں کو فوج قریش کی طاقت سے ڈراتے تھے تا کہ ان کے دلوں کو کمزور کریں اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہے کہ نعیم بن مسعود یا کاروان عبدالقیس کا عمل فقط ایک شیطانی عمل ہے جو شیطان کے دوستوں کو ڈرانے کے لئے ہے یعنی ایسے وسوسے صرف شیطان کے دوستوں پر ہی اثر انداز ہوتے ہیں لیکن اہل ایمان اور ثابت قدم لوگ ایسے وسوسوں سے کبھی اثر نہیں لیتے اس بناء پر جب تم شیطان کے پیرو نہیں ہو تو تمہیں ان وسوسوں سے متزلزل نہیں ہونا چاہیئے۔

نعیم بن مسعود یا کاروان عبدالقیس کو اس لیے شیطان قرار دیا گیا ہے کیونکہ ان کا عمل واقعاً شیطانی تھا اور یہ اس کے الہام اور وسوسہ سے ظہور پذیر ہوا تھا قرآن و احادیث میں ہر برے اور غلط کام کو شیطانی عمل قرار دیا گیا ہے چونکہ ایسے ہر کام کا انجام شیطانی وسوسوں کا سا ہے۔

یا شیطان سے مراد خود وہی اشخاص ہیں اور یہ ان مواقع میں سے ایک ہے جہاں لفظ شیطان اپنی انسانی مصداق کے لئے استعمال ہوتا ہے کیونکہ شیطان کا ایک وسیع معنی ہے اور اس کے مفہوم میں تمام گمراہ کرنے والے شامل ہیں وہ انسان ہوں یا غیر انسان۔

(۱۷۶)وَ لَا يَحۡزُنۡكَ الَّذِيۡنَ يُسَارِعُوۡنَ فِى الۡكُفۡرِ ۚ اِنَّهُمۡ لَنۡ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيۡـًٔا ؕ يُرِيۡدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجۡعَلَ لَهُمۡ حَظًّا فِى الۡاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ	جو لوگ راہ کفر میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں وہ تمہیں غمگین نہ کردیں کیونکہ وہ ہرگز خدا کو نقصان نہیں پہنچا سکتے (علاوہ ازیں) خدا چاہتا ہے آخرت میں ان کا کوئی حصہ قرار نہ دے اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔
(۱۷۷)اِنَّ الَّذِيۡنَ اشۡتَرَوُا الۡكُفۡرَ بِالۡاِيۡمَانِ لَنۡ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيۡـًٔا ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ	جنہوں نے ایمان کے بدلے کفر خریدا ہے وہ خدا کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

تفسیر

پیغمبر کے لئے تسلی

اس آیت میں روئے سخن پیغمبر اکرم ﷺ کی طرف ہے اُحد کے دردناک واقعہ کے بعد خدا تعالیٰ نے انہیں تسلی دی کہ اے پیغمبر! یہ جو تم دیکھتے ہو کہ راہ کفر میں ایک گروہ دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے درپے ہے تو اس سے غمگین و محزون نہ ہونا وہ خدا کو ہر

گز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ بلکہ وہ خود اس راہ میں نقصان اٹھائیں گے اصولی طور پر نفع وضرر اور سود وزیاں ایسے موجدات کے لئے ہے جن کا وجود خود ان سے نہیں ہے لیکن خداوند ازلی وابدی جو ہر لحاظ سے بے نیاز ہے اور اس کا وجود غیر محدود ہے لوگوں کا کفر وایمان اور سعی وکاوش اس کے لیے کیا اثر رکھتی جبکہ لوگوں کا ایمان ان کے اپنے تکامل وارتقا کا باعث ہے اور کفر کی وجہ سے وہ خود تنزل وسقوط کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔

خدا چاہتا ہے کہ اس راہ میں انہیں آزاد رکھے اور وہ اتنی تیزی سے راہ کفر طے کریں کہ آخرت میں تھوڑا سا حصہ بھی نہ پائیں بلکہ عذاب عظیم ان کے انتظار میں ہو۔

(۱۷۷) اس آیت میں بات کو وسعت دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ راہ کفر پر تیزی سے جانے والے ہی ایسے نہیں بلکہ وہ تمام لوگ جو ایمان ہاتھ سے دے کر راہ کفر اختیار کیے ہوئے ہیں اور ایمان کے بدلے کفر خرید چکے ہیں وہ ہرگز خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے بلکہ اس کا نقصان خود انہیں کو پہنچے گا آیت کے آخر میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

(۱۷۸) وَ لَا یَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّمَا نُمۡلِیۡ لَهُمۡ خَیۡرٌ لِّاَنۡفُسِهِمۡ ؕ اِنَّمَا نُمۡلِیۡ لَهُمۡ لِیَزۡدَادُوۡۤا اِثۡمًا ۚ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ مُّهِیۡنٌ	جو کافر ہو گئے ہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ اگر ہم انہیں مہلت دیتے ہیں تو یہ ان کے نفع میں ہے ہم تو یہ مہلت انہیں اس لیے دیتے ہیں کہ وہ زیادہ گناہ کرلیں اور ان کے لئے رسوا کن عذاب ہے۔

تفسیر

جن پر بھاری بوجھ ہے

گذشتہ آیت میں دشمنان حق کی بہت زیادہ سعی وکاوش کے ضمن میں رسول اکرم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے اور ان کی دل جوئی کی گئی ہے اب اس آیت میں روئے سخن دشمنوں کی طرف ہے اس میں انہیں درپیش بدبختی کے بارے میں گفتگو ہے یہ آیت درحقیقت واقعہ اُحد اور اس کے بعد کے واقعات سے مربوط مباحث کی تکمیل کرتی ہے کیونکہ ایک جگہ روئے سخن نبی کریم کی طرف تھا دوسرے مقام پر مومنین کی طرف اور اب اس جگہ مشرکین مخاطب ہیں۔

مندرجہ بالا آیت مشرکین کو تنبیہ کرتی ہے اور انہیں ڈراتی ہے کہ وہ خدا کے عطا کردہ وسائل کبھی کبھار مل جانے والی کامیابیوں اور آزادی عمل کو اس بات کی دلیل قرار نہ دیں کہ وہ صالح افراد ہیں اور جو کچھ وہ کرتے ہیں صحیح یا یہ ان کے لئے خوشنودی خدا کی نشانی ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہ سوال بہت سے ذہنوں میں موجود ہے کہ بہت سے ستمگر گنہگار اور آلودہ دامن لوگ اس طرح نعمات میں کیوں مستغرق

ہیں اور انہیں سزا کیوں نہیں ملتی زیرِ نظر آیت سے ضمنی طور پر اس کا جواب بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو قابل اصلاح نہیں اور انہیں سنت آفرینش اور آزادی ارادہ و اختیار کے اصول کے مطابق ان کی حالت پر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ یہ سقوط کے آخری مرحلے تک پہنچ جائیں اور زیادہ سے زیادہ سزا کے مستحق ہو جائیں۔

(۱۷۹) مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ	ممکن نہ تھا کہ خدا مومنین کو اسی مشکل میں چھوڑ دیتا جس میں تم ہو مگر یہ کہ ناپاک کو پاک سے جدا کر دے نیز (یہ بھی) ممکن نہ تھا کہ خدا تمہیں مخفی رازوں سے آگاہ کرے لیکن خدا اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا چن لیتا ہے۔ پس خدا اور اسکے رسولوں پر ایمان لے آؤ اگر تم ایمان لے آئے اور تم نے تقویٰ اختیار کر لیا تو تمہارے لیے اجر عظیم ہوگا۔

تفسیر

مسلمانوں کی تطہیر

واقعہ اُحد سے پہلے منافقین کا موضوع مسلمانوں میں زیر بحث نہیں آیا تھا اسی لیے وہ زیادہ تر کفار ہی کو اپنا دشمن سمجھتے تھے لیکن اُحد کی شکست کے بعد سچے مسلمانوں کی وقتی کمزوری اور منافقین کی کارکردگی کے لئے زمین ہموار ہو جانے پر انہیں سمجھ آیا کہ ان کے اور بھی خطرناک دشمن ہیں جن پر کڑی نگاہ رکھنا پڑے گی یہ خطرناک دشمن منافق تھے جنگ اُحد کے نتائج میں سے یہ ایک اہم نتیجہ تھا۔

زیرِ نظر آیت جو اس مقام پر واقعہ اُحد کے سلسلے کی آخری آیت ہے اس حقیقت کو ایک عمومی قانون کی صورت میں بیان کرتے ہوئے کہتی ہے۔ ممکن نہیں کہ خدا مومنین کو اسی حالت میں رہنے دے جس میں تم ہو اور ان کی تطہیر نہ کرے اور طیب کو خبیث سے ممتاز نہ کر دے یہ حکم سب کے لئے ایک جیسا اور عوامی ہے پروردگار کی ایک دائمی سنت ہے کہ جو شخص ایمان کا دعویٰ کرے اور مسلمانوں میں مل جل کر رہنے لگے اسے ان کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے یہاں تک کہ پے در پے خدائی آزمائشوں سے آخر اس کے اندرونی راز فاش ہو جائیں گے۔

آیت کا دوسرا حصہ اسی سوال کا جواب ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

''خدا تمہیں پوشیدہ راز اور علم غیب نہیں دے گا''

کیونکہ مخفی اسرار پر آگاہی عام لوگوں کے خیالات کے برعکس مشکل کو حل نہیں کرتی بلکہ بہت سے مواقع پر رازوں کے عیاں ہو جانے سے ہرج مرج کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اجتماعی گرہیں کھل جاتی ہیں امید کے چراغ بجھ جاتے ہیں اور عام لوگ سعی و کاوش چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے لوگوں کی قدر و قیمت کا تعین ان کی کارکردگی کے حوالے سے ہونا چاہئے کسی اور طریقے سے نہیں۔

اس کے بعد مذکورہ حکم سے انبیاء الٰہی کا استثناء یوں بیان کیا گیا ہے: خدا جب چاہتا ہے اپنے پیغمبروں میں بعض کو منتخب کرتا ہے اور لامتناہی علم غیب کے کسی گوشے سے انہیں مطلع کر دیتا ہے اور لوگوں کے ایسے اسرار کی انہیں خبر دیتا ہے جن سے آگاہی ان کی رہبری کی تکمیل کے لئے ضروری ہوتی ہے لیکن ہر حال کلی و عمومی اور دائمی قانون یہی ہے کہ لوگوں کی پہچان کا آئینہ ان کے اعمال ہی ہیں۔

آیت کے آخر میں یہ بات ذہن نشین کروائی گئی ہے کہ یہ زندگی ایک آزمائش ہے اس میں پاک اور ناپاک کو جدا جدا کر دیا جاتا ہے اور مومن و منافق میں تمیز کی جاتی ہے تو پھر تم اس آزمائش کی کٹھالی سے اچھی طرح سے نکل آؤ اور خدا اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لے آؤ لیکن صرف ایمان لانے پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ فرماتا ہے اگر ایمان لے آؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو عظیم اجر و ثواب تمہارے انتظار میں ہے۔

(۱۸۰) وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۟	جو بخل کرتے ہیں اور خدا نے اپنے فضل و کرم سے جو کچھ دیا ہے خرچ نہیں کرتے وہ یہ گمان نہ کریں کہ یہ ان کے لئے کوئی اچھی چیز ہے بلکہ یہ ان کے لئے بری چیز ہے بہت جلدی روز قیامت جن کے بارے میں انہوں نے بخل کیا وہی چیزیں طوق کی طرح ان کی گردن میں ڈال دیں گے اور آسمانوں اور زمین کی میراث خدا کے لئے ہے اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

تفسیر

قید و بند کا بھاری طوق

زیر نظر آیت میں قیامت کے دن بخیلوں کے انجام کی وضاحت کی گئی ہے بخیل جو مال جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں اور دولت و ثروت کی حفاظت میں کوشاں رہتے ہیں لیکن اسے بندگان خدا پر خرچ کرنے سے اجتناب کرتے ہیں۔

آیت میں اگرچہ واجب مالی حقوق کا نام نہیں لیا گیا لیکن روایات اہل بیت علیہ السلام میں اور اقوال مفسرین میں اسے مانعین زکوٰۃ سے مخصوص قرار دیا گیا ہے اور آیت میں جس قدر شدت دکھائی دیتی ہے وہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے مراد مستحب انفاق اور خرچ کرنا نہیں ہے فرمایا گیا ہے جو لوگ بخل کرتے ہیں اور خدا نے جو اپنے فضل و کرم سے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ نہیں کرتے وہ یہ گمان نہ کریں کہ یہ ان کے نفع میں ہے بلکہ یہ تو ان کے نقصان میں جا پڑتا ہے پھر قیامت میں ان کے انجام کا تذکرہ

ہے۔جن اموال میں وہ بخل کرتے ہیں بہت جلد انہیں طوق بنا کر ان کی گردن میں ڈال دیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس مال سے واجب حقوق ادا نہیں کیے گئے اور معاشرے کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ انفرادی ہوس کی نذر ہو گیا ہے اور بعض اوقات احمقانہ امور میں خرچ ہو گیا ہے اور یا بلا وجہ اسے جمع کر کے رکھ دیا گیا اور اس سے کسی نے فائدہ نہیں اٹھایا وہ دیگر اعمال انسانی کی طرح تجسیم اعمال کے قانون کے مطابق روز قیامت مجسم ہوگا اور دردناک صورت عذاب کا ذریعہ بن کر آئے گا۔ایسا مال طوق کی شکل میں مجسم ہوگا اور گردن میں ڈالا جائے گا۔

اس کے بعد آیت ایک اور نکتے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔یہ مال راہ خدا میں اور بندگان خدا کے لئے خرچ ہو یا نہ ہو آخر کار اپنے مالکوں سے جدا ہو جائیں گے اور خدا تمام آسمانوں اور زمین کی وراثتوں کا وارث ہے جب ایسا ہی ہے تو پھر کیا ہی اچھا ہے کہ ان اموال کے جدا ہونے سے پہلے ان کی معنوی و روحانی برکات سے فائدہ اٹھایا جائے نہ کہ ان کی حسرت اور ذمہ داری کا بوجھ اٹھا لیا جائے۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہے خدا تمہارے اعمال سے آگاہ ہے بخل کرو گے تو بھی وہ جانتا ہے اور اگر انسانی معاشرے کے مفاد میں اسے کام میں لاؤ گے تو بھی اسے معلوم ہے اور وہ ہر شخص کو اس کے حسب حال اجر دے گا۔

(۱۸۱)لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ	خدا نے ان لوگوں کی بات سنی ہے جو کہتے ہیں کہ خدا فقیر ہے اور ہم غنی ہیں انہوں نے جو کچھ کہا یہ ہم لکھ لیں گے اور (اسی طرح ان کا) پیغمبروں کو ناحق قتل کرنا بھی (ہم نے لکھ رکھا ہے) اور ہم انہیں کہیں گے کہ جلانے والا عذاب چکھو۔
(۱۸۲)ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۚ	یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی آگے بھیجی ہوئی کمائی ہے اور خدا (اپنے) بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

شان نزول

یہ آیات یہودیوں کی سرزنش کے لئے نازل ہوئی ہیں۔

ابن عباس کہتے ہیں: پیغمبر اکرم ﷺ نے بنی قینقاع کے یہودیوں کو خط لکھا اس میں انہیں نماز ادا کرنے زکوٰۃ دینے اور خدا کو قرض دینے کی دعوت دی گئی۔

آنحضرت ﷺ کا قاصد اس گھر میں گیا جو یہودیوں کی مذہبی تعلیم و تدریس کا مرکز تھا اس کا نام بیت المدارس تھا

قاصد نے یہ خط یہودیوں کے سب سے بڑے عالم فنحاص کے ہاتھ میں دیا اس نے خط پڑھنے کے بعد طنزیہ لہجے میں کہا اگر تمہاری باتیں سچی ہیں تو پھر یہ کہنا چاہئے کہ خدا فقیر ہے اور ہم غنی ہیں کیونکہ اگر وہ فقیر نہ ہوتا تو ہم سے قرض کی خواہش نہ کرتا علاوہ ازیں محمد ﷺ کا اعتقاد ہے کہ خدا نے تمہیں سود کھانے سے منع کیا ہے حالانکہ وہ خود تمہارے انفاق اور خرچ کرنے کے بدلے ربا اور سود کا وعدہ کرتا ہے۔

بعد میں فنحاص نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ اس نے یہ باتیں کہی ہیں اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

تفسیر

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے خدا نے یہودیوں کو کفر آمیز باتیں سنیں وہ کہتے تھے کہ خدا فقیر ہے اور ہم غنی ہیں اب اگر وہ لوگوں کے سامنے انکار کرتے ہیں مگر خدا کے سامنے تو انکار نہیں کر سکتے کہ وہ سب باتوں کو سنتا ہے وہ آواز کی ان کمزور ترین اور قوی ترین سب لہروں کو سنتا ہے جن کے ادراک سے انسانوں کے کان عاجز ہیں اس لیے ان کا انکار کرنا فضول ہے۔

اس لئے مزید فرمایا: نہ صرف یہ کہ ہم ان کی باتیں سنتے ہیں ان سب کو لکھتے بھی ہیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ ان کی ان کفر آمیز باتوں ہی کو نہیں لکھا جاتا بلکہ وہ جو انبیاء مرسلین کو قتل کرتے رہے ہیں اسے بھی ثبت کیا گیا ہے۔

باقی رہا ان کے اعمال ثبت کیے جانے اور ان کے اعمال کی نگرانی کا مسئلہ تو یہ بے وجہ نہیں ہے بلکہ یہ تو اس لیے ہے تاکہ روز قیامت یہ سب ان کے سامنے رکھ دیا جائے اور ہم ان سے کہیں کہ اس وقت اپنے اعمال کا نتیجہ جلانے والے عذاب کی شکل میں چکھو۔

(۱۸۲) یہ دردناک عذاب جس کی اس وقت تم تلخی چکھ رہے ہو خود تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے تم ہی تھے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا خدا تو کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔ اصولی طور پر اگر تم جیسے ظالم اپنے اعمال کا بدلہ نہ پائیں اور وہ بھی نیک لوگوں کی صف میں کھڑے کیے جائیں تو یہ انتہائی ظلم ہے اور اگر خدا ایسا نہ کرے تو وہ ظلام یعنی بہت زیادہ ظلم کرنے والا ہوگا۔

(۱۸۳) اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِىْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِىْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ	(یہ) وہی (ہیں) جنہوں نے کہا کہ خدا نے ہم سے پیمان لیا ہے کہ ہم کسی پیغمبر پر ایمان نہ لائیں جب تک (وہ معجزہ کے طور پر) ایسی قربانی نہ کرے جسے (آسمانی) آگ کھا جائے ان سے کہیں کہ پھر تم نے مجھ سے پہلے آنے والے انبیاء کو کیوں قتل کیا اگر تم سچے ہو جبکہ وہ واضح دلائل اور جو کچھ تم کہتے ہو لے کر آئے تھے۔

(۱۸۴)فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْا بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ الْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ	پس اگر یہ (بہانہ تراش) تیری تکذیب کرتے ہیں (تو یہ کوئی نئی بات نہیں) یہ تم سے پہلے پیغمبروں کی (بھی) تکذیب کر چکے ہیں جبکہ وہ (پیغمبر) واضح دلائل متین ومحکم تحریریں اور ضیاء بخش کتاب لائے تھے۔

شان نزول

یہودیوں کے چند سر کردہ افراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور کہنے لگے تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ خدا نے تمہیں ہماری طرف بھیجا ہے اور تم پر کتاب بھی نازل کی ہے حالانکہ خدا نے تورات میں ہم سے یہ عہد لیا ہے کہ جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے ہم اس پر ایمان لے آئیں مگر شرط یہ ہے کہ وہ ہمارے سامنے ایک جانور کی قربانی کرے اور آسمان سے صاعقہ کی صورت میں آگ آئے جو اسے جلا دے اگر تم ایسا کر دکھاؤ تو ہم تم پر ایمان لے آئیں گے۔

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں

تفسیر

یہودیوں کی بہانہ تراشی

قبول اسلام سے بچنے کے لئے یہودی عجیب وغریب بہانے تراشتے تھے ان میں سے ایک کی طرف زیر نظر آیات میں اشارہ کیا گیا ہے وہ کہتے تھے خدا نے ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم کسی پیغمبر کی دعوت اس وقت تک قبول نہ کریں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ کرے جسے آسمان سے آگ آ کر اچک لے۔

مفسرین کہتے ہیں یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ انبیاء الٰہی اپنی حقانیت ثابت کرنے کے لئے لازمی طور پر اس مخصوص معجزے کے حامل ہوتے ہیں کہ وہ جانور ذبح کرتے ہیں اور آسمانی بجلی کے ذریعے وہ لوگوں کے سامنے جل جاتا ہے۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: ان بہانہ تراشیوں کے جواب میں ان سے کہیے کہ مجھ سے پہلے بنی اسرائیل کے کئی انبیاء آئے وہ اپنے ساتھ واضح نشانیاں بھی لائے یہاں تک کہ انہوں نے اس طرح سے قربانی بھی تمہارے سامنے کی اگر تم سچے ہو تو پھر ان پر ایمان کیوں نہیں لائے اور انہیں کیوں قتل کیا حضرت زکریا علیہ السلام حضرت یحییٰ علیہ السلام اور چند دیگر انبیاء بنی اسرائیل کی طرف اشارہ ہے جو ان کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے

(۱۸۴)اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو تسلی دیتا ہے اور ان کی دلجوئی کرتا ہے کہ اگر یہ لوگ آپ کی باتیں نہیں مانتے تو آپ پریشان نہ ہوں کیونکہ ایسا پہلے بھی بہت دفعہ ہو چکا ہے آپ سے پہلے کئی پیغمبر آئے ہیں جن کی انہوں نے تکذیب کی ہے۔

جبکہ ان انبیاء کے پاس واضح نشانیاں بھی تھیں وہ آشکار معجزے بھی لائے تھے۔ محکم وبلند مرتبہ کتب بھی ان کے پاس تھیں۔ اور وہ ضیاء بخش کتابوں کے بھی حامل تھے۔

(۱۸۵) كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ	ہر شخص موت کا ذائقہ چکھتا ہے اور تم روز قیامت اپنا اجر مکمل طور پر حاصل کرو گے پس جو لوگ (جہنم کی) آگ کی زد سے دور رہے اور بہشت میں داخل ہو گئے وہ سعادت سے ہمکنار ہوئے اور حیات دنیا سرمایہ فریب کے سوا کچھ نہیں۔

تفسیر

موت کا اٹل قانون

مخالفین اور بے ایمان لوگوں کی ہٹ دھرمی کے تذکرے کے بعد اس آیت میں موت کے عمومی قانون کا تذکرہ ہے اور قیامت میں لوگوں کے انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تا کہ اس سے پیغمبر اکرم ﷺ اور مومنین کی دلجوئی بھی ہو جائے اور گناہ پیشہ مخالفین کو تنبیہ بھی پہلے تو آیت میں ایک ایسے قانون کا تذکرہ ہے جو اس عالم کے تمام زندہ موجودات پر حاکم ہے فرمایا تمام زندہ چیزیں چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے ایک دن موت کا مزہ چکھیں گی۔

اگر چہ بہت سے لوگ چاہتے ہیں کہ وہ یہ بھول جائیں کہ وہ فنا پذیر ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر ہم اسے فراموش بھی کر دیں تب بھی وہ ہمیں نہیں بھلائے گی اس دنیا کی زندگی آخر کار ختم ہو جائے گی اور ایک دن ایسا آئے گا جب موت ہر شخص کی تلاش میں آئے گی اور پھر مجبوراً اس جہان سے رخت سفر باندھنا پڑے گا۔

اس آیت میں ''نفس سے مراد جسم و جاں کا مجموعہ ہے اگر چہ بعض اوقات قرآن میں ''نفس'' صرف روح کے لئے استعمال ہوا ہے۔

پھر فرمایا کہ اس دنیا کی زندگی کے بعد جزا و سزا کا مرحلہ شروع ہونا ہے یہاں عمل ہے جزا کے بغیر اور وہاں جزا ہے عمل کے بغیر۔ ''توفّون'' کا معنی ہے مکمل وصولی یہ لفظ نشاندہی کرتا ہے کہ روز قیامت انسان کو پورے طور پر جزا دی جائے گی اس بناء پر اس میں کوئی مانع نہیں کہ عالم برزخ میں بھی انسان اپنے اعمال کے کچھ نتائج اور جزا کا سامنا کرے گا کیونکہ برزخ کی جزا و سزا مکمل نہیں ہے۔

'' فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ''

زیر نظر جملے میں فرمایا گیا ہے جو لوگ آتش جہنم کے دائرہ کشش سے دور ہوں گے اور بہشت میں داخل ہوں گے وہ نجات یافتہ ہوں گے اور اپنے محبوب و مطلوب کو پا لیں گے۔

گویا دوزخ اپنی پوری قوت سے انسانوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جو عوامل انسان کو دوزخ کی طرف کھینچتے ہیں ان میں عجیب و غریب قوت جذب موجود ہوتی ہے کیا تیز رو ہوس رانیاں، غیر مشروع جنسی لذتیں، جاہ و منصب اور ناجائز دولت و ثروت انسان کے لئے قوت جاذبہ نہیں رکھتیں؟

''وَ مَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الۡغُرُوۡرِ''

یہ جملہ گذشتہ بحث کی تکمیل کرتا ہے اس میں فرمایا گیا ہے کہ حیات دنیا تو فقط غرور آمیز متاع ہے یہ زندگی اور اس کے سرگرم عوامل دور سے بہت پُر فریب ہیں لیکن جب انسان اسے پالیتا ہے اور اسے قریب سے چھو لیتا ہے تو عملی طور پر اسے اندر سے خالی چیز نظر آتی ہے اور متاع غرور کا بھی بس یہی مفہوم ہے۔

علاوہ ازیں مادی لذتیں دور سے تو خالص دکھائی دیتی ہیں لیکن جب انسان ان کے قریب جاتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ یہ طرح طرح کے رنج والم سے آلودہ ہیں۔ یہ بھی مادی دنیا کے فریبوں میں سے ایک فریب ہے۔ اسی طرح عموماً انسان ان کی فنا پذیری کی طرف بھی توجہ نہیں کرتا لیکن بہت جلد اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ کس قدر جلدی زائل اور فنا ہونے والی ہیں۔

یہ تعبیرات قرآن واحادیث میں بارہا آئی ہیں اور ان سب کا ہدف ایک ہی ہے کہ انسان عالم مادہ اور اس کی لذات کو اپنا آخری ہدف ومقصد قرار نہ دے کیونکہ اس کے نتیجے میں تو انسان طرح طرح کے جرائم اور گناہوں میں غرق ہوجاتا ہے اور انسانی تکامل وارتقاء کی حقیقت سے دور ہوجاتا ہے لیکن مادی دنیا اور اس کی نعمات سے اس حوالے سے استفادہ کرنا کہ یہ تکمیل بشریت کا ذریعہ ہیں نہ صرف مذموم وقبیح نہیں بلکہ لازم اور ضروری ہے۔

(۱۸۶) لَتُبۡلَوُنَّ فِیۡۤ اَمۡوَالِکُمۡ وَ اَنۡفُسِکُمۡ ۟ وَ لَتَسۡمَعُنَّ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ وَ مِنَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡۤا اَذًی کَثِیۡرًا ؕ وَ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ	یہ طے شدہ ہے کہ تمہارے اموال اور تمہاری جانوں کے ذریعے تمہاری آزمائش کی جائے گی اور جن لوگوں (یعنی یہودیوں) کو تم سے پہلے آسمانی کتاب دی گئی ہے اور (اسی طرح) جنہوں نے شرک کی راہ اختیار کر رکھی ہے ان سے تم بہت سی تکلیف دہ اور آزار رساں باتیں سنو گے اور اگر تم نے صبر و استقامت اور تقویٰ اختیار کیا کہ جو تمہارے لیے زیادہ مناسب ہے تو پھر یہ امر محکم اور قابل اطمینان امور میں سے ہے۔

شان نزول

جب مسلمانوں نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی اور اپنے گھر اور کاروبار سے دور ہو گئے تو مشرکین نے ان کے اموال کی طرف دست تجاوز دراز کیا اور انہیں اپنے زیر تصرف لے آئے اور جو شخص بھی ان کے ہاتھ لگا اسے زبانی اور جسمانی اذیت پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی

دوسری طرف جب مسلمان مدینہ آئے تو وہاں پر انہیں یہودیوں کی بدگوئی اور آزار رسانی کا سامنا کرنا پڑا خاص

طور پر ان میں سے ایک بدزبان اور کینہ پرور شاعر تھا اس کا نام کعب بن اشرف تھا وہ مسلسل پیغمبر اکرم ﷺ اور مسلمانوں کی ہجو کہتا تھا اور مشرکین کو ان کے خلاف ابھارتا تھا یہاں تک کہ مسلمان عورتوں اور لڑکیوں کے بارے میں غزل سرائی اور عشق بازی سے نہیں چوکتا تھا اس کی بے حیائی اور گستاخی آخر اس حد تک پہنچ گئی کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے مجبوراً اس کے قتل کا حکم صادر کر دیا اور وہ مسلمانوں کے ہاتھوں فی النار والسقر ہو گیا۔

مفسرین کی نقل کردہ روایات کے مطابق مندرجہ بالا آیت انہی موضوعات کی طرف اشارہ کرتی ہے اور مسلمانوں کو مقابلہ جاری رکھنے کے لئے شوق دلاتی ہے۔

تفسیر

مقابلے اور پامردی سے تھک نہ جاؤ

جان و مال کے ذریعے تمہارا امتحان لیا جائے گا اور اصولی طور پر یہ دنیا تو میدان آزمائش ہی ہے اور اپنے آپ کو سخت اور ناگوار حوادث ومشکلات کے مقابلے میں آمادہ رکھے بغیر کوئی چارہ نہیں درحقیقت یہ سب مسلمانوں کے لئے ایک تنبیہ ہے اور آمادہ رہنے کے لئے تلقین ہے تاکہ وہ یہ گمان نہ کرلیں کہ سخت حوادث ان کی زندگی سے ختم ہو چکے ہیں اور یا کعب بن اشرف جیسے بدگو، بد زبان اور فتنہ پرور شاعر کے خاتمے سے دشمن کی طرف سے کوئی اذیت یا زبان کا زخم نہیں پہنچے گا۔

اسی لیے فرمایا:

''یہ بات طے شدہ ہے کہ تم آئندہ بھی اہل کتاب یہود ونصاریٰ اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے دشمن سے ناروا باتیں سننا ان آزمائشوں کا حصہ ہے جن کا ذکر آیت کے ابتدائی حصے میں کیا گیا ہے''

یہاں شدید اور المناک حوادث کے موقع پر مسلمانوں کی ذمہ داری بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے اگر استقامت اور پامردی سے کام لو، صابر و بردبار ہو اور تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرو تو یہ ایسے کام ہیں جن کا نتیجہ واضح ہے لہٰذا ہر عقلمند آدمی کو ایسا کرنے کا مصمم ارادہ کر لینا چاہیئے۔

صبر اور تقویٰ کا آیت میں ایک ساتھ ذکر آیا ہے۔ یہ گویا اس طرف اشارہ ہے کہ بعض افراد استقامت و پامردی کے باوجود ناشکری کا اظہار کرتے ہیں اور زبان شکایت کھولے رکھتے ہیں لیکن حقیقی مومن وہ ہیں جو صبر واستقامت کے ساتھ تقویٰ و پرہیزگاری کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور ناشکری اور شکوہ وشکایت سے دور رہتے ہیں۔

(۱۸۷)وَ اِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكۡتُمُوۡنَهٗ فَنَبَذُوۡهُ وَرَآءَ ظُهُوۡرِهِمۡ وَاشۡتَرَوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ؕ فَبِئۡسَ مَا يَشۡتَرُوۡنَ	اور وہ وقت (یاد کرو) جب خدا نے اہل کتاب سے میثاق لیا کہ اسے لوگوں کے سامنے لازمی طور پر آشکار کریں اور چھپائیں نہیں لیکن انہوں نے اسے پس پشت ڈال دیا اور اسے تھوڑی سی قیمت پر فروخت کر دیا انہوں نے کیسی بری متاع خریدی۔

تفسیر

اہل کتاب کی چند غلط کاریوں کے تذکرے کے بعد اس آیت میں ان کے ایک اور برے کام کی نشاندہی کی گئی ہے اور وہ ہے حقائق کو چھپانا فرمایا گیا ہے وہ وقت نہ بھول جاؤ جب خدا نے اہل کتاب سے پیمان لیا کہ وہ آیات الٰہی کو لوگوں کے سامنے آشکار کریں اور انہیں ہرگز نہ چھپائیں۔

لیکن ان تمام امور کے باوجود انہوں نے خدا سے باندھے گئے محکم پیمان میں خیانت کی اور آسمانی کتب کے حقائق کو چھپایا اسی لیے فرمایا گیا ہے: انہوں نے کتاب خدا کو پس پشت ڈال دیا یہ جملہ عمل نہ کرنے اور اسے فراموش کر دینے کے بارے میں عمدہ کنایہ ہے کیونکہ جس پروگرام پر انسان کے عمل کا دارومدار ہوتا ہے اسے وہ اپنے سامنے رکھتا ہے اور اسے دیکھتا رہتا ہے لیکن اگر وہ اس پر عمل نہ کرنا چاہے اور اسے فراموش کر دینا چاہے تو سامنے سے اٹھا کر اسے پس پشت ڈال دیتا ہے۔

''وَاشۡتَرَوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ؕ فَبِئۡسَ مَا يَشۡتَرُوۡنَ''

یہ جملہ ان کی شدید دنیا پرستی اور فکری انحطاط کی طرف اشارہ کرتا ہے فرمایا گیا ہے اس کام کے بدلے انہوں نے حقیر سی قیمت حاصل کی اور یہ پونجی کیسی بری ہے جو انہوں نے حاصل کی ہے۔

علماء کی عظیم ذمہ داری

مندرجہ بالا آیت اگرچہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے علماء کے بارے میں ہے لیکن حقیقت میں تمام مذہبی علماء کو اس میں تنبیہ کی گئی ہے کہ ان کی ذمہ داری ہے کہ فرامین الٰہی اور معارف دینی واضح کرنے کی کوشش کریں اور خدا تعالیٰ نے ان سب سے اس سلسلے میں تاکید عہد و پیمان لیا ہے۔

(۱۸۸) لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّیُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ	یہ گمان نہ کیجئے کہ جو لوگ اپنے (برے) اعمال پر خوش ہوتے ہیں اور (دوسری طرف) یہ بھی چاہتے ہیں کہ ایسے (نیک) کام کے ضمن میں ان کی تعریف کی جائے جوانہوں نے سرانجام نہیں دیا وہ عذاب الٰہی سے امان میں ہیں (ایسا نہیں ہے بلکہ) ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔
(۱۸۹) وَلِلّٰهِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۠	اور آسمانوں اور زمین کی حکومت اللہ کے لئے ہے اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

شان نزول

محدثین ومفسرین نے مندرجہ بالا آیت کے بارے میں کئی ایک شان نزول نقل کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے

جب بعض یہودی اپنی آسمانی کتب کی تحریف اوران میں موجود چیزوں کو چھپانے میں لگے ہوئے تھےاوراپنے گمان میں اس سے کوئی نتیجہ حاصل کررہے تھےتووہ اپنے اس عمل پر بہت ہی شادومسرور تھے ساتھ ہی وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ لوگ انہیں حامی دین عالم اور ذمہ دار افراد سمجھیں۔اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اوران کے غلط خیال کا جواب دیا۔

تفسیر

خود پسندی

مندرجہ بالا آیت کہتی ہے: یہ گمان نہ کرو کہ ایسے لوگ جو اپنے اعمال پر خوش ہوتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ انہوں نے جو کام نہیں کیے ان کاموں کی وجہ سے ان کی عزت کی جائے اور شان وشوکت بیان کی جائے کہ وہ عذاب خدا سے دور ہیں اور نجات پا لیں گے حالانکہ نجات تو ان اشخاص کے لئے ہے جو کم از کم اپنے برے کاموں پر شرمندہ ہیں اور یہ سوچ کر کہ وہ نیک کام نہیں کر سکے پشیمان ہیں۔

نہ صرف اس کے خود پسند اور مغرور افراد نجات کے حقدار نہیں ہیں بلکہ دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔

(۱۸۹) خدا آسمان وزمین کا مالک ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے یہ آیت مومنین کے لئے خوشخبری اور کافروں کے لئے دھمکی ہے کوئی وجہ نہیں ہے کہ مومن ترقی کے لئے ٹیڑھے راستوں پر چلیں اور جو کام انہوں نے نہیں کیا اس کی تعریف چاہیں ہاں وہ یہ کر سکتے ہیں کہ آسمان وزمین کے مالک خدا کی قدرت کے سائے میں رہتے ہوئے جائز اور صحیح طریقوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آگے بڑھتے رہیں نیز بدکار اور منافق لوگ جو یہ چاہتے ہیں کہ ٹیڑھے راستوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی حیثیت اور مقام حاصل کر لیں تو وہ یہ تصور نہ کریں کیونکہ وہ اس خدا کے عذاب سے جس کی تمام موجودات پر حکومت ہے نجات حاصل نہ کر سکیں گے۔

(۱۹۰)اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ	بے شک زمین و آسمان کی تخلیق اور رات دن کے آنے جانے میں صاحبان عقل کے لئے (روشن) نشانیاں ہیں
(۱۹۱)الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ	وہ لوگ خدا کو اٹھتے بیٹھتے اور اس وقت جبکہ وہ پہلو کے بل لیٹے ہوں یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی پیدائش کے اسرار میں غور وفکر کرتے ہیں اور (کہتے ہیں) اے خدا! تو نے ہمیں فضول پیدا نہیں کیا تو پاک ہے ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔
(۱۹۲)رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ وَ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ	پالنے والے جس کو تو نے (اس کے اعمال کی وجہ سے) آگ میں ڈال دیا اسے تو نے ذلیل وخوار کیا اس قسم کے ظالم لوگوں کا کوئی مددگار نہیں۔
(۱۹۳)رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ	اے پروردگار! ہم نے توحید کے منادی کی آواز سنی ہے جو پکار رہا تھا کہ اپنے پالنے والے پر ایمان لاؤ اور ہم ایمان لے آئے (اب جبکہ ایسا ہے) اے خدا! ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری کوتاہیوں کی پردہ پوشی کر دے اور ہمیں نیکوں کے ساتھ (ان کے راستے پر) موت دینا۔
(۱۹۴)رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ	اے خالق! جس چیز کا تو نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے ہم سے وعدہ کیا ہے وہ ہمیں مرحمت فرما اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کرنا کیونکہ تو کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

آیات کی اہمیت

یوں تو قرآن مجید کی سب کی سب آیتیں اہمیت کی حامل ہیں کیونکہ وہ سب خدا کا کلام ہیں اور نوع بشر کی تعلیم و تربیت کے لئے نازل ہوئی ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں سے بعض خاص قسم کی چمک ودمک رکھتی ہیں ان میں سے

مندرجہ بالا پانچ آیات قرآن کی دل ہلا دینے والی عبارتوں میں سے ہیں یہ معارف دینی کا ایک ایسا نادر مجموعہ ہیں جن میں لطیف مناجات اور تضرع وزاری کی آمیزش ہے اور وہ ایک آسمانی سرود معلوم ہوتی ہیں اسی لیے تو احادیث اور روایات میں انہیں خاص اہمیت دی گئی ہے۔

تفسیر

خداشناسی کا روشن ترین راستہ

قرآنی آیات صرف پڑھنے کے لئے نہیں ہیں بلکہ لوگوں کے سمجھنے اور ادراک کے لئے نازل ہوئی ہیں ان کی تلاوت تو انہیں سمجھنے کی تمہید ہے اس لیے تو مندرجہ بالا آیت میں آسمان وزمین کی عظمت کا تذکرہ ہے اور فرمایا گیا ہے آسمان وزمین کی خلقت اور روز وشب کی آمدورفت میں صاحبان عقل وخرد اور اہل فکر ونظر کے لئے واضح نشانیاں ہیں یہ کہہ کر لوگوں کو اس عظیم خلقت میں غور وفکر کے لئے ابھارا گیا ہے تا کہ ہر شخص اپنی استعداد اور پیمانہ فکر کے مطابق اس بے کنار سمندر سے اپنا حصہ لے اور اسرار آفرینش کے شفاف چشمے سے سیراب ہو یہ حقیقت ہے کہ جہان آفرینش کے بدیع نقوش دلکش تصویریں اور اس پر حاکم خیرہ کرنے والا نظام ایک بہت بڑی کتاب ہے جس کا حرف حرف اور لفظ لفظ اس عالم کے پیدا کرنے والے کے وجود اور اس کی یکتائی کی بہت ہی واضح دلیل ہے۔

برگ درختان سبز درنظر ہوشیار　　　　ہر ورقش دفتر است معرفت کردگار

(۱۹۱) اس جہان کے گوشہ وکنار کی جو رعنائی اور دلکشی وسیع عالم ہستی میں دکھائی دیتی ہے وہ صاحبان عقل کے دلوں کو یوں جذب کرتی ہے کہ وہ کھڑے ہوں یا بیٹھے بستر پر محو آرام ہوں یا پہلو کے بل لیٹے وہ اس نظام کے خالق اور اس کے اسرار کی یاد میں مگن ہوتے ہیں لہٰذا مندرجہ بالا آیت میں ارشاد الٰہی ہے عقلمند وہ ہیں جو قیام میں ہوں یا قعود میں یا پہلو کے بل محو استراحت خدا کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کے اسرار میں غور وفکر کرتے رہتے ہیں یعنی ہمیشہ اور ہر حالت میں اس حیات بخش فکر میں غوطہ زن رہتے ہیں۔

اس آیت میں پہلے ذکر کا تذکرہ ہے اور پھر فکر کا یعنی صرف خدا کو یاد کرنا کافی نہیں یہ تذکر اس وقت بہترین ثمرات کا حامل ہوگا اگر اس کے ساتھ غور وفکر بھی شامل ہو جیسے آسمان وزمین کی خلقت پر غور کرنے میں یاد خدا شامل نہ ہو تو یہ غور وفکر بھی کسی کام کا نہیں ایسے کتنے ہی صاحبان علم ودانش ہیں جو فلکیات کا مطالعہ کرتے ہیں اور آسمانی کرّات کی خلقت کے باہمی ربط میں عجیب وغریب نظم وضبط کا مشاہدہ کرتے ہیں۔لیکن چونکہ وہ یاد خدا سے غافل ہوتے ہیں اور توحید کی عینک ان کی آنکھوں پر نہیں ہے اور وہ عالم ہستی کو مبداء عالم کی شناسائی کے زاویئے سے نہیں دیکھتے لہٰذا وہ انسانی تربیت کا لازمی نتیجہ اس مشاہدے سے اخذ نہیں کر پاتے ان لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایسی غذا کھاتا ہے جو صرف اس کے جسم کو تقویت بخشتی ہے اور اس کی فکر ونظر اور روح پر کوئی اثر نہیں کرتی۔

خلقت آسمان وزمین میں غور وفکر کرنے سے انسان کو ایک خاص آگاہی حاصل ہوتی ہے اس تفکر کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اس طرف متوجہ ہوتا ہے کہ یہ مخلوق بے کار فضول اور مہمل نہیں ہے کیونکہ جب انسان اس جہاں کی چھوٹی سے چھوٹی چیز میں بھی ایک عظیم مقصد کا مشاہدہ کرتا ہے تو کیا پھر وہ یہ باور کرسکتا ہے کہ سارے کا سارا جہاں بغیر کسی ہدف ومقصد کے ہو۔

انسان کو گھاس کے تنے کی مخصوص ساخت میں واضح اغراض ومقاصد دکھائی دیتے ہیں انسان کا دل' دل کی گہرائیاں اور دریچے ہر کوئی ایک پروگرام کے حامل ہے آنکھ کے طبقوں کی ساخت مقصد کے بغیر نہیں ہے یہاں تک پلکوں اور ناخن تک ایک معین مقصد کے حامل ہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ جس موجود کا ذرہ ذرہ مقصد وہدف کا حامل ہو وہ خود مجموعی اعتبار سے بالکل بے مقصد ہو۔

اسی لیے تو صاحبان عقل اس زمزمہ پر سر دھنتے ہیں کہ اے خداوند عالم تو نے اس عظیم کارخانے کو فضول پیدا نہیں کیا بارالہا! یہ اتنا بڑا جہاں اور یہ عجیب وغریب نظام سب کا سب یقیناً حکمت ومصلحت اور کسی صحیح ہدف وغرض کے تحت پیدا کیا گیا ہے پروردگار! یہ سب تیری وحدانیت کی نشانیاں ہیں اور تو عبث وفضول کام سے منزہ اور پاک ہے

عالم خلقت میں مقصد کے وجود کا اعتراف کرنے کے فوراً بعد صاحبان عقل وخرد اپنی خلقت کو یاد کرنے لگتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ انسان جو اس جہاں ہستی کا ثمرہ ونتیجہ ہے عبث نہیں پیدا کیا گیا اور مقصد اس کی تربیت اور تکامل کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا اور وہ اس جہاں کی جلد گزر جانے والی اور بے قیمت زندگی ہی کے لئے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے آگے ایک اور گھر ہے جہاں اس کے اعمال کی جزا وسزا ہوگی جب اہل عقل یہ سوچتے ہیں تو اپنی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور خدا سے ان کی انجام دہی کی توفیق کا تقاضا کرتے ہیں تاکہ وہ عذاب الٰہی سے مامون ہو جائیں اسی لیے وہ کہتے ہیں خداوندا! ہمیں آتش جہنم سے بچالے۔

(۱۹۲) بارالہا! جسے تو اس کے اعمال کے نتیجے میں دوزخ میں ڈال دے اسے تو نے رسوا وذلیل کر دیا اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبان عقل جہنم کی آگ کی نسبت رسوائی سے زیادہ ڈرتے ہیں اور وحشت زدہ ہیں بڑے انسان ایسے ہی ہوتے ہیں وہ رنج وغم اور دکھ درد تو برداشت کرنے کو آمادہ ہوتے ہیں لیکن اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کے بارے میں بہت حساس ہوتے ہیں اس لیے ایسے لوگوں کی نظر میں روز قیامت دردناک ترین عذاب خدا اور بندوں کے سامنے رسوا اور ذلیل ہونا ہے۔

(۱۹۳) صاحبان عقل وخرد مقصد تخلیق جان لینے کے بعد اس نکتے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ نشیب وفراز کے اس راستے کو خدائی رہنماؤں کی رہبری کے بغیر ہرگز طے نہیں کیا جا سکتا اسی لیے وہ ہر وقت ایمان اور صداقت کے منادیوں کی ندا سننے کے منتظر رہتے ہیں جب ان کی پہلی آواز ان کے کانوں میں پڑتی ہے تو وہ ان کی طرف لپکتے ہیں ضروری غور وفکر اور جستجو کے بعد وہ ان کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں اور اپنے پورے وجود کے ساتھ ایمان لے آتے ہیں لہٰذا وہ اپنے پروردگار کے سامنے عرض کرتے ہیں بارالہا! ہم نے

توحید کے منادی کی آواز سنی جو ہمیں ایمان کی طرف دعوت دے رہا تھا اس کے بعد ہم ایمان لے آئے۔

بارالٰہا! جب معاملہ اس طرح سے ہے اور ہم مکمل طور پر ایمان لے آئے ہیں لیکن ہم غرائز انسانی اور خواہشات نفسانی کے شدید طوفانوں اور آندھیوں کی زد میں ہیں اس لیے ہم سے لغزشیں سرزد ہو جاتی ہیں اور ہم مختلف گناہوں کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں اس لیے ہمیں بخش دے ہمارے گناہوں کو معاف کر دے اور ہماری کوتاہیوں کی پردہ پوشی کر دے ہمیں نیک اور صالح لوگوں کے راستے پر مرنے کی سعادت عطا فرما۔

اہلِ عقل انسانی معاشرے سے وابستہ ہیں مگر فرد پرستی سے بیزار ہیں۔ وہ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ نہ صرف ان کی زندگی نیک لوگوں کے ساتھ ہو بلکہ ان کی موت بھی............ چاہے وہ طبعی موت ہو یا راہِ خدا میں شہادت............ نیک لوگوں کے ساتھ ہو اور صالح لوگوں ساتھ ہو اور انہی کے طور طریقے کے مطابق ہو۔ کیوں بروں کے ساتھ مرنا بھی دوبھر ہے۔

(۱۹۴) وہ لوگ آخری مرحلے میں راہ توحید طے کرنے روز قیامت اپر ایمان لانے پیغمبروں کی دعوت قبول کرنے اور اپنی ذمہ داریاں انجام دینے کے بعد خدا سے تقاضا کرتے ہوئے کہتے ہیں اب جب ہم اپنا عہد و پیمان پورا کر چکے ہیں بارالٰہا! تو نے اپنے پیغمبروں کی معرفت ہم سے جو وعدہ فرمایا ہے اور خوشخبری دی ہے اس کو پورا فرما اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کرنا کیونکہ تو جس چیز کا وعدہ کرتا ہے اس میں وعدہ خلافی نہیں ہو سکتی۔

امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپ علیہ السلام نے فرمایا:

جس شخص کو کوئی مہم درپیش ہو اور وہ پانچ مرتبہ ربنا کہے تو خدا اسے اس چیز سے رہائی بخشے گا جس سے وہ خوفزدہ ہے اور وہ جس چیز کی امید رکھتا ہے اسے پالے گا کسی نے عرض کیا:

وہ پانچ مرتبہ کس طرح ربنا کہے؟

آپ علیہ السلام نے فرمایا:

ان آیات کو پڑھے جن میں پانچ مرتبہ ربنا آتا ہے تو فوراً ہی پروردگار کی طرف سے دعا قبول کر لی جاتی ہے کیونکہ وہ فرماتا ہے: **فاستجاب لهم ربهم.**

کچھ کہے بغیر واضح ہے کہ ان آیات کی حقیقی اور گہری تاثیر اسی صورت میں ہے جب انسان کی زبان اس کے دل اور عمل سے ہم آہنگ ہو اہل خرد کی طرز فکر خدا سے ان کا عشق ذمہ داریوں کی طرف ان کی توجہ اور نیک اعمال کی انجام دہی اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ دعا کرنے والوں کو یہی راہ اپنانا چاہئے اور وہی خشوع و خضوع پیدا کرنا چاہئے جو اہل عقل خدا سے مناجات کرتے وقت پیدا کرتے ہیں۔

(۱۹۵) فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُکُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَ قٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُکَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ	خدا نے ان (صاحبانِ عقل) کی درخواست قبول کر لی ہے اور فرمایا ہے کہ میں تم میں سے عمل کرنے والے کے عمل کو چاہے وہ عورت ہو یا مرد ضائع نہیں کروں گا تم سب ایک ہی نوع میں سے ہو اور ایک دوسرے کی جنس ہو جنہوں نے راہ خدا میں ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور انہوں نے میری راہ میں تکلیف اور اذیت کا سامنا کیا ہے اور جنگ کی ہے اور مارے گئے ہیں میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میں ان کے گناہ بخش دوں گا اور انہیں ان باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں یہ خدا کی طرف سے ثواب ہے اور خدا کے ہاں ہی بہترین ثواب ہے۔

شان نزول

یہ آیت گذشتہ آیات کا ضمیمہ ہے اس میں صاحبان عقل وخرد کے اعمال کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے آیت کے شروع میں فاء تفریع اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ گذشتہ آیات سے مربوط ہے اس کے باوجود اس کے بارے میں کئی ایک شان نزول مروی ہیں لیکن یہ بات اس کے گذشتہ آیات سے مربوط ہونے کے منافی نہیں ہے۔

ایک شان نزول یہ ہے کہ رسول اللہ کی ایک زوجہ محترمہ جناب ام سلمہ نے آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ قرآن میں مردوں کے جہاد، ہجرت اور فدا کاری کی بہت گفتگو ہے کیا عورتوں کا بھی اس میں کوئی حصہ ہے۔ زیر نظر آیت اسی سوال کے جواب میں نازل ہوئی۔

تفسیر

اہل خرد کے اعمال کا نتیجہ

گذشتہ آیات میں اہل خرد کے ایمان اعمال دعاؤں اور تضرع وزاری کا ذکر تھا اس آیت میں فرمایا گیا ہے فا ''فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ'' یعنی ان کے پروردگار نے ان درخواستوں کو فوراً قبول کر لیا ''رَبُّهُمْ'' ان کا پروردگار یہ تعبیر ان پر پروردگار کے انتہائی لطف وکرم کی حکایت کرتی ہے اس کے بعد مزید فرماتا ہے: اس بناء پر کہ کہیں اشتباہ نہ ہو اور نجات وکامرانی کو انسان کے اعمال وکردار سے

الگ نہ سمجھ لیا جائے فرمایا گیا تم میں سے عمل کرنے والے کے کسی عمل کو میں ہرگز ضائع نہیں کروں گا اس میں عمل کا ذکر بھی ہے اور عامل کا بھی تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ قبولیت دعا کا محور اصلی وہ اعمال صالح ہیں جو ایمان کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور ایسی درخواستیں فوراً قبول ہو جاتی ہیں جن کی ڈھال عمل صالح ہو۔

اس بناء پر کہ کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ خدا کا یہ وعدہ کسی خاص گروہ سے مخصوص ہے فرمایا گیا ہے کہ یہ عمل کرنے والا چاہے مرد ہو یا عورت اس میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ تم سب خلقت میں ایک دوسرے سے وابستہ ہو تم میں سے بعض دوسروں سے پیدا ہوتے ہیں عورتیں مردوں سے اور مرد عورتوں سے ''بَعۡضُكُمۡ مِنۡۢ بَعۡضٍ''، ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ تم سب کے سب ایک دین کے پیرو اور ایک ہی حقیقت کے طرفدار ہو اور ایک دوسرے سے ہم کاری رکھتے ہو لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ خدا تمہارے درمیان تبعیض روا رکھے۔

اس سے پھر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس بناء پر وہ تمام لوگ جنہوں نے خدا کی راہ میں ہجرت کی ہے اور اپنے گھر اور وطن سے نکالے گئے ہیں انہوں نے راہ خدا میں تکلیفیں اٹھائی ہیں جہاد کیا ہے اور جانیں دی ہیں۔

پہلا احسان جو خداوند عالم کی طرف سے ان پر ہو گا وہ یہ ہے کہ خدا تعالی نے قسم کھا رکھی ہے کہ وہ ان کے گناہوں کو بخش دے گا اور ان کی تکالیف اور شدائد کو گناہوں کا کفارہ قرار دے گا تاکہ وہ گناہوں سے بالکل پاک ہو جائیں۔

اس کے بعد فرماتا ہے کہ میں گناہوں کو بخشنے کے علاوہ یقیناً انہیں ایسی جنت میں جگہ دوں گا جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں جو گوناگوں نعمتوں سے بھری پڑی ہیں۔

یہ وہ جزا و ثواب ہے جو ان کی جان نثاری کی وجہ سے خداوند عالم ان کو مرحمت فرمائے گا بے شک بہترین ثواب اور اجر اسی کے پاس ہے یہ اشارہ اس طرف ہے کہ دنیا والوں کے لئے خدا کے اجر و ثواب کی تعریف و توصیف مکمل طور پر نہیں کی جا سکتی بس یہ سمجھ لیں کہ اس کی ذات والا صفات ہر ثواب اور جزا سے بالاتر ہے۔

(۱۹۶) لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فِى الۡبِلَادِ ؕ	کافروں کا شہروں میں (کامیابی سے) آنا جانا تمہیں دھوکا نہ دے۔
(۱۹۷) مَتَاعٌ قَلِيۡلٌ ۟ ثُمَّ مَاۡوٰٮهُمۡ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئۡسَ الۡمِهَادُ	یہ متاع ناچیز ہے پھر ان کے لئے رہنے کی جگہ دوزخ ہے اور (دوزخ) کتنی بری جگہ ہے۔

(۱۹۸) لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَ بْرَارِ	لیکن وہ لوگ (جو ایمان لے آئے ہیں اور) اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کیلئے باغات بہشت ہیں کہ جن کے درختوں تلے نہریں جاری ہیں اور وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ ان کیلئے خدا کی طرف سے پہلی پذیرائی ہے اور جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ نیک لوگوں کیلئے بہتر ہے۔

شان نزول

بہت سے مشرکین مکہ تجارت پیشہ تھے اس تجارت سے انہیں بہت سی دولت میسر آتی اور وہ ناز ونعمت کی زندگی بسر کرتے تھے مدینہ کے یہودی بھی تجارت میں مہارت رکھتے تھے تجارتی سفروں سے اکثر وہ بھرے ہاتھوں واپس لوٹتے تھے مسلمان ان دنوں مخصوص حالات کی وجہ سے مادی طور پر بڑی زحمتوں اور مشکلوں میں گرفتار تھے ان مشکلات کی وجوہ میں مکہ سے مسلمانوں کی مدینہ کی طرف ہجرت اور طاقتور دشمن کی طرف سے اقتصادی محاصرہ اور بائیکاٹ شامل ہیں مسلمان عسرت کی زندگی بسر کررہے تھے بعض لوگ جب یہ دومختلف حالتوں کی طرف دیکھتے تو سوچتے کہ بے ایمانوں کے لئے یہ ناز ونعمت اور اہل ایمان کے لئے یہ رنج والم آخر کیوں ہے مسلمان کیوں فقرو پریشانی کی زندگی بسر کررہے ہیں مندرجہ بالا آیات اسی سوال کا جواب ہیں۔

تفسیر

ایک تکلیف دہ سوال

شان نزول میں جو سوال سامنے آیا ہے وہ زمانہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مسلمانوں کے حسب حال ہے یہ دراصل ایک عمومی سوال ہے جو ہر دور میں اکثر لوگ پوچھتے رہتے ہیں یہ لوگ زیادہ تر ظالموں سرکشوں فرعونوں کی خوشحالی اور ناز ونعمت سے معمور زندگی کا موازانہ ایسے اہل ایمان سے کرتے ہیں جن کی زندگی مشقت وزحمت ہی سے بھری ہوئی ہے لوگ کہتے ہیں کہ برے لوگ اپنی ظالمانہ اور گناہ آلود زندگی کے باوجود خوشحال کیوں ہیں لیکن اہل ایمان اپنے ایمان وتقویٰ کے باوصف سختی وتنگی کی زندگی کیوں گزار رہے ہیں؟ بعض اوقات یہ چیز کمزور ایمان والوں میں شک وشبہ پیدا کرتی ہے۔

اس سوال کا اگر بغور جائزہ لیا جائے اور اس کے دونوں پہلوؤں پر گہری نظر کی جائے تو واضح اور روشن جوابات سامنے آئیں گے جن میں سے بعض کی طرف آیہ بالا میں اشارہ کیا گیا ہے مزید توجہ سے مطالعہ کیا جائے تو دوسرے جوابات بھی حاصل ہو جاتے ہیں

آیت کہتی ہے:

''مختلف شہروں میں کافروں کی کامیابی سے آمد و رفت تجھے ہر گز دھوکے میں نہ ڈال دے۔''

اگرچہ ظاہراً آیت میں رسول اللہ مخاطب ہیں لیکن واضح ہے کہ مقصود تمام مسلمان ہیں۔

(۱۹۷) اس کے بعد فرماتا ہے ''مَتَاعٌ قَلِیْلٌ'' یہ کامیابیاں اور یہ بلا شرط مادی فائدے جلد گزر جانے والے اور ناچیز ہیں۔ ان کامیابیوں کے پیچھے ان کے لئے انجام بد اور ایسی ذمہ داریاں ہیں جو ان کا دامن پکڑے رہیں گی اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہ کیسا برا ٹھکانا ہے۔

دوسرا یہ کہ بعض بے ایمانوں کی مادی ترقی اس لیے بھی ہے کہ وہ دولت سمیٹنے میں کسی اصول اور قانون کے قائل نہیں ہوتے اور جائز ناجائز ہر طریقے سے یہاں تک کہ بے کسوں کا خون چوس کر بھی دولت سمیٹنے میں لگے رہتے ہیں جبکہ اہل ایمان حق وعدالت کے اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں پابندیوں کو ملحوظ رکھتے ہیں اور ناجائز طریقوں سے دولت سمیٹنے پر پابندیاں ہونا بھی چاہئے اس لیے دونوں کے حالات کو ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اہل ایمان کو ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے جبکہ بے ایمانوں کی نظر میں کوئی ذمہ داری نہیں اور چونکہ یہ دنیا ارادہ و اختیار کی آزادی کی دنیا ہے اس لیے خدا تعالیٰ نے دونوں گروہوں کو آزاد چھوڑ رکھا ہے تاکہ ہر ایک کا انجام اس کے عمل کی روشنی میں مرتب ہو سکے اسی امر کی طرف آیہ بالا میں اشارہ کیا گیا ہے۔

(۱۹۸) گذشتہ آیت میں بے ایمان افراد کے انجام کی وضاحت کی گئی ہے اس آیت میں پرہیزگاروں کے انجام کا تذکرہ ہے ارشاد الٰہی ہے لیکن وہ لوگ جنہوں نے تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کی اور انہوں نے مادی سرمائے کے حصول کے لئے حق وعدالت کے اصول ملحوظ نظر رکھے یا خدا پر ایمان رکھنے کی بناء پر اپنے وطن سے نکال دیئے گئے اور اجتماعی و اقتصادی مشکلات کا شکار ہوئے انہیں ان مشکلات کے صلے میں خدا تعالیٰ نے باغات بہشت عطا کیے ہیں کہ جن کے درختوں تلے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے۔

لغت میں نزل کا معنی ہے ایسی چیز جو مہمان کی ضیافت کے لئے پیش کی جائے بعض کہتے ہیں اس کا معنی ہے وہ پہلی چیز جو مہمان کی پذیرائی کے لئے پیش کی جائے مثلاً شربت یا پھل جو ابتداء میں مہمان کو پیش کیے جاتے ہیں اس لیے مندرجہ بالا آیت میں فرمایا گیا ہے باغ جنت میں مادی نعمتیں پرہیزگاروں کی ضیافت کا آغاز ہیں باقی رہی اہم ترین اور عالی ترین ضیافت تو وہ روحانی اور معنوی نعمتیں ہیں جن کی طرف ''وَ مَا عِنْدَ اللهِ خَیْرٌ لِّلْاَبْرَارِ'' (خدا کے پاس جو نیک لوگوں کے لئے بہتر ہے) کے جملے میں اشارہ کیا گیا ہے۔

(۱۹۹)وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ	اہل کتاب میں بعض ایسے افراد ہیں جو خدا پر اور جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ ان پر نازل ہوا ہے ایمان رکھتے ہیں وہ خدا (کے حکم) کے سامنے خضوع کرتے ہیں اور آیات الٰہی کو کم قیمت پر نہیں بیچتے ان کا اجر وثواب ان کے پروردگار کے پاس ہے خدا سریع الحساب ہے۔

شان نزول

کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت حبشہ کے رعیت پرور بادشاہ نجاشی کے بارے میں نازل ہوئی ہے اگرچہ اس کا مفہوم بہت وسیع ہے ماہ رجب چھ ہجری میں نجاشی کی وفات کی خبر ایک خدائی الہام کے ذریعے روز وفات ہی حضرت رسول اکرم ﷺ کو پہنچی آپ ﷺ نے مسلمانوں سے فرمایا:

تمہارا ایک بھائی سرزمین حجاز سے باہر دنیا سے چل بسا ہے تم جمع ہو جاؤ تاکہ مسلمانوں کے حق میں اس نے جو خدمات سرانجام دی ہیں اس کے صلے میں اس کی نماز جنازہ پڑھیں بعض نے سوال کیا وہ کون ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا: نجاشی

پھر آپ مسلمانوں کے ہمراہ قبرستان جنت البقیع میں آئے اور اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی اور اس کیلئے دعائے مغفرت کی آپ نے اپنے اصحاب کو بھی حکم دیا اور انہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ بعض منافقین کہنے لگے محمد (ﷺ) نے ایک ایسے کافر کی نماز جنازہ پڑھی ہے جسے کبھی نہیں دیکھا حالانکہ اس نے ان کا دین قبول نہیں کیا۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا گیا۔

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نجاشی نے مکمل طور پر اسلام قبول کر لیا تھا اگرچہ وہ اس کا اظہار نہیں کرتا تھا۔

تفسیر

سب اہل کتاب ایک جیسے نہیں

یہ بات کہی جا چکی ہے کہ قرآن مجید میں دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے بارے میں جو گفتگو ہے اس میں کبھی بھی سب کو ایک جیسا قرار نہیں دے گا قرآن کا یہ طریق کار ہے کہ وہ کسی قوم یا جماعت کے بارے میں ضد اور تعصب کا رنگ اختیار نہیں کرتا بلکہ اس کا فیصلہ ان کے لائحہ عمل کی بنیاد پر کرتا ہے لہٰذا وہ اس اقلیت کو فراموش نہیں کرتا جو ایمان اور عمل صالح کی حامل ہو اور گمراہ اکثریت کے درمیان زندگی گزار رہی ہو یہاں بھی اہل کتاب کو بہت زیادہ سرزنش کی گئی کیونکہ وہ آیات خدا کو چھپاتے تھے اور سرکشی

اختیار کرتے اور پھر ان میں سے اس اقلیت کا تذکرہ ہے جس نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کو قبول کر لیا تھا ان لوگوں کی پانچ ممتاز صفات بیان فرمائی گئی ہیں۔

1۔يُؤْمِنُ بِاللهِ ۔۔۔وہ ایسے لوگ ہیں جو دل و جان سے خدا پر ایمان لے آتے ہیں۔

2۔وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ ۔۔۔۔اور قرآن پر اور جو کچھ تم مسلمانوں پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان لاتے ہیں۔

3۔وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ ۔۔۔۔درحقیقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ان کے ایمان لانے کی وجہ اپنی آسمانی کتاب پر ان کا حقیقی ایمان ہے جس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بشارتیں موجود ہیں۔

4۔خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ.۔۔۔فرمان خدا کے سامنے وہ سر تسلیم خم کیے ہوتے ہیں اور یہ ان کا خشوع و خضوع ہی ہے جس نے حقیقی ایمان اور جاہلانہ تعصّبات میں حد فاصل کھینچی ہے۔

5۔لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۔۔۔۔وہ آیت الٰہی کو کبھی کم قیمت پر فروخت نہیں کرتے اور وہ ایسے علماء یہود کی طرح نہیں جو اپنے منصب کے تحفظ کے لیے لوگوں پر اپنے اقتدار کی بقاء کے لئے اور رشوت لے کر آیات خدا میں تحریف کر دیتے ہیں واضح ہے کہ مطلب یہ نہیں کہ کم قیمت پر فروخت نہیں کرتے بلکہ مراد یہ ہے کہ کسی قیمت پر بھی فروخت نہیں کرتے کم قیمت کی طرف اشارہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان علماء کی طرح نہیں ہیں جو دنیا پرست اور کم ہمت ہیں علاوہ ازیں ان آیات کے مقابلے میں جو کچھ بھی وصول کیا جائے بے وقعت ہے۔

''اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ''

جن لوگوں کا اپنے پروردگار کے ہاں واضح و زندہ لائحہ عمل اور اعلیٰ انسانی صفات کی بنا پر اجر و ثواب ہے ان کے لئے یہاں ربھم کا لفظ ان پر پروردگار کے انتہائی لطف و کرم کا مظہر ہے نیز یہ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ راہ ہدایت میں اللہ تعالیٰ ان کی تربیت اور مدد کرتا ہے۔

''اِنَّ اللهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ''

خدا تعالیٰ بڑی تیزی سے بندوں کا حساب بے باق کر دے گا نہ نیکو کاروں کو اپنا اجر و ثواب معلوم کرنے کے لئے مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا اور نہ بدکاروں کی سزا میں تاخیر ہوگی یہ جملہ نیکوں کے لئے بشارت اور بدکاروں کے لئے تنبیہ و تہدید کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۲۰۰)یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۧ	اے صاحبانِ ایمان! صبر کرو اور صبر کرنے میں سبقت لے جاؤ اور مستعدر ہو اور خدا سے ڈرو تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔

تفسیر

یہ سورہ آل عمران کی آخری آیت ہے اس میں چار نکات پر محیط ایک جامع لائحہ عمل تمام مسلمانوں کے لئے پیش کیا گیا ہے اسی لیے اس کا آغاز یا ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا'' سے ہوا ہے۔

(1)اصْبِرُوا۔۔۔۔ یہ اس پروگرام کا پہلا نکتہ ہے جو کہ مسلمانوں کی سر بلندی اور کامیابی کا ضامن ہے اس کا مطلب استقامت وصبر اور حوادث کے مقابلے میں ڈٹ جانا ہے دراصل صبر واستقامت ہی ہر قسم کی مادی وروحانی کامیابی کی حقیقی جڑ ہے اجتماعی وانفرادی پیش رفت کے لئے اس کی جس قدر اہمیت بیان کی جائے وہ کم ہے اسی کو حضرت علی علیہ السلام کے کلمات قصار میں بدن کے ساتھ سر سے تشبیہ دی ہے فرماتے ہیں

''ان الصبر من الایمان کالراس من الجسد''

یعنی صبر کا ایمان سے وہی تعلق ہے جو سر کا بدن سے ہے

(2)وَصَابِرُوا۔۔۔ یہ مصابرہ سے مفاعلہ کے باب سے ہے اس کا معنی ہے دوسروں کے صبر واستقامت کے مقابلے میں صبر واستقامت دکھانا۔

اس طرح خدا تعالیٰ پہلے تو صاحبان ایمان کو صبر واستقامت کا حکم دیتا ہے جس میں ہر طرح کا جہاد نفس اور مشکلات حیات شامل ہیں اور دوسرے مرحلے میں دشمن کے مقابلے میں استقامت کا حکم دیتا ہے اس کا اثر یہ ہے کہ جب تک کوئی قوم جہاد بالنفس اور اندرونی کمزوری کے پہلوؤں کی اصلاح میں کامیاب نہیں ہوتی دشمن پر اس کی کامیابی ممکن نہیں ہے اور دشمنوں کے مقابلے میں ہماری زیادہ تر ہزیمتیں اسی وجہ سے ہیں کہ جہاد بالنفس نہیں کیا گیا اور اپنے کمزور پہلوؤں کی اصلاح نہیں کی گئی جو ہمارے لیے ضروری ہے۔

ضمنی طور پر اس حکم ''صابروا'' سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمن جس قدر زیادہ استقامت کا مظاہرہ کرے ہمیں اس سے بڑھ کر استقامت و پامردی کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔

(3)وَرَابِطُوا۔۔۔۔ اس لفظ کا مادہ رباط ہے اس کا معنی ہے کسی چیز کو کسی مکان میں باندھ دینا مثلاً گھوڑے کو کسی جگہ باندھنا اسی لیے سرائے یا کاروانوں کے ٹھہرنے کی جگہ کو رباط کہتے ہیں ربط قلب کا مطلب ہے دل کا اطمینان اور سکون۔ گویا وہ کسی جگہ بندھا ہوا ہے مرابطہ کا معنی ہے سرحدوں کی نگرانی کرنا کیونکہ وہاں سپاہی سواریاں اور جنگی وسائل فراہم کیے جاتے ہیں اور انہیں وہاں رکھا جاتا ہے۔

یہ لفظ مسلمانوں کو دشمن کے مقابلے کے لئے تیار رہنے اور اسلامی ملکوں کی سرحدوں کی حفاظت کا حکم دیتا ہے تا کہ دشمن ان پر بے خبری کے عالم میں اچانک حملہ نہ کر دے نیز انہیں شیطان اور سرکش ہوا و ہوس کے مقابلے کے لئے بھی ہمیشہ تیار رہنے اور ان کے ہتھکنڈوں سے چوکنا رہنے کا حکم دیتا ہے تا کہ وہ غفلت میں نہ پڑ جائیں۔

(4) وَاتَّقُوا اللّٰہَ۔۔۔۔اور آخری حکم جو تمام احکامات پر سایہ فگن ہے وہ پرہیزگاری کا حکم ہے استقامت صبر اور مرابطہ کے ساتھ ساتھ تقویٰ اور پرہیزگاری کا ہونا بھی نہایت ضروری ہے تا کہ ہر قسم کی خود پسندی، ریا کاری اور شخصی اغراض قریب نہ آنے پائیں ''لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ'' تم ان چاروں احکام کی پابندی کے سائے میں فلاح و کامیابی حاصل کر سکتے ہو اور ان سے روگردانی کرنے سے کامیابی کا راستہ تم پر بند ہو جائے گا۔

ایک سوال اور اس کا جواب

کبھی کبھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں بہت سے جملے ''لعل'' سے کیوں شروع ہوتے ہیں مثلاً **''لعلکم تفلحون''** شاید تم کامیاب ہو جاؤ **''لعلکم تتقون''** شاید تم پرہیزگار بن جاؤ۔ **''لعلکم ترحمون''** شاید رحمت خدا تمہارے شامل ہو۔

یہ لفظ شک اور تردید کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ تو ہر چیز کا جاننے والا ہے اس لئے اس کی ذات اقدس کے لئے مناسب نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تعبیر قرآن مجید کی عظمت، حقیقت بینی اور اظہار حق کی ایک واضح دلیل ہے۔ کیونکہ قرآن مجید یہ لفظ ایسی جگہ استعمال کرتا ہے جہاں نتیجہ حاصل کرنے کے لئے کچھ شرائط کی پابندی ضروری ہو۔

سُوْرَۃُ

نِسَاء

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوئی

اس کی ۱۷۶ آیات ہیں

محل نزول

ترتیب نزول کے مطابق یہ سورہ ممتحنہ کے بعد نازل ہوئی ہے۔ یہ سورہ آیات الفاظ اور حروف کی تعداد کے لحاظ سے سورہ بقرہ کے بعد طویل ترین سورت ہے اور ۱۷۶ آیات پر مشتمل ہے اس امر کے پیش نظر کہ اس میں بہت سی مباحث عورتوں کے احکام اور حقوق کے بارے میں ہیں اس کا نام سورہ نساء رکھا گیا ہے

اس سورہ کے اہم موضوعات

اس سورہ کی مباحث کو تین عمومی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1۔ ایمان وعدالت کی دعوت اور بدترین دشمنوں کا بائیکاٹ۔

2۔ برے معاشرے کا نتیجہ اور انجام سمجھانے کے لئے گزرے ہوئے لوگوں کے حالات زندگی سے روشناس کرانا۔

3۔ امداد کے مستحق افراد کی حمایت مثلاً یتیم اور ان کے حقوق کے متعلق ضروری احکامات۔

4۔ میراث کا قانون طبعی فطری اور عادلانہ طریقے کی بنیاد پر اس صورت کے خلاف جو اس زمانے میں رائج تھی جس کے ذریعے نہایت تکلیف دہ حیلے بہانوں سے کمزور لوگوں کو ان کے جائز حق سے محروم کر دیا جاتا تھا۔

5۔ شادی بیاہ کے متعلق قانون اور عام پاک دامنی کی حفاظت کے لئے لائحہ عمل۔

6۔ اموال کی حفاظت کے لئے کلی اور عمومی قوانین۔

7۔ اسلامی معاشرے کے دشمنوں کا تعارف اور ان کے مقابلے کے لئے مسلمانوں کو بیدار رہنے کی تلقین۔

8۔ حکومت اسلامی اور حکومت اسلامی کے رہبر کی اطاعت اور فرمانبرداری کا لزوم۔

9۔ ہجرت کی اہمیت اور اس کا ضروری ہونا جبکہ فاسد اور برے معاشرے کا سامنا کرنا پڑے۔

اس سورت کی تلاوت کی فضیلت

ایک روایت کے مطابق حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

''جو شخص سورہ نساء کی تلاوت کرے گویا اس نے اس قدر مال وزر راہ خدا میں دیا ہے جتنا کہ سورہ نساء کے لحاظ سے بطور وارث ہر ایک مسلمان کا حصہ ہے اور اسی طرح اسے اس شخص کے برابر ثواب دیا جائے گا جس نے ایک غلام آزاد کیا ہو''۔

واضح ہے کہ اس روایت میں اور اس قسم کی دوسری تمام روایتوں میں صرف آیتوں کا پڑھنا مقصد نہیں ہے بلکہ

پڑھنا تو سمجھنے کے لئے مقدمہ اور تمہید ہے اور وہ بھی اپنے مقام پر۔

یہ ایک قدم ہے اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اپنانے کے لئے یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان اس سورہ کی آیات سے اپنی زندگی میں عملی نصیحت حاصل کرلے تو وہ یہ تمام اجر وثواب دنیاوی نتائج کے علاوہ حاصل کرے گا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	اللہ کے نام سے جو بخشنے والا اور مہربان ہے
(۱) یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنۡہَا زَوۡجَہَا وَ بَثَّ مِنۡہُمَا رِجَالًا کَثِیۡرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِہٖ وَ الۡاَرۡحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیۡکُمۡ رَقِیۡبًا	اے لوگو! اپنے پالنے والے سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک ہی انسان سے پیدا کیا اور اس کی بیوی کو بھی اس کی جنس سے خلق فرمایا اور ان دونوں سے ان گنت مرد اور عورتیں (روئے زمین پر) پھیلا دیں۔ اس خدا سے ڈرو جس کے واسطے سے تم سوال کرتے ہو اور اپنے رشتہ داروں کے بارے میں (قطع تعلق کرنے سے) پرہیز کرو کیونکہ خداوند عالم تمہارا نگہبان ہے۔

تفسیر

طبقاتی تقسیم اور گروہ بندی کے خلاف جہاد

اس سورہ کی پہلی آیت میں تمام انسانی افراد سے خطاب ہے کیونکہ یہ سورہ ایسے مسائل پر مشتمل ہے جن کے تمام لوگ اپنی زندگی میں محتاج ہیں۔

اس کے بعد تقویٰ اور پرہیزگاری کی دعوت ہے جو کسی معاشرے کو صحیح وسالم اور صحت مند بنانے کے پروگراموں کی بنیاد ہے۔

''الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ ''

(وہ خدا جس نے تمام انسانوں کو ایک انسان سے پیدا کیا)

اب دیکھنا یہ ہے کہ نفس واحدہ سے کون مراد ہے؟ اس سے مراد ایک فرد شخص ہے یا ایک فرد نوعی (یعنی مذکر کی جنس) اس میں شک نہیں کہ اس تعبیر کا ظاہری مفہوم تو واحد فرد کے بارے میں ہے اور یہ اس پہلے انسان کی طرف اشارہ ہے جسے قرآن آدم علیہ السلام کے نام سے آج کے انسانوں کے باپ کے طور پر متعارف کراتا ہے بنی آدم کی تعبیر جو متعدد آیات قرآنی میں کی گئی ہے وہ بھی اسی طرف اشارہ ہے اور یہ احتمال کہ اس سے مراد وحدت نوعی ہے بعید معلوم ہوتا ہے۔

''وَخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا''

یہ جملہ بظاہر یہ بتاتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ انہی سے پیدا ہوئی ہیں بعض مفسرین اس سے یہ سمجھے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی بیوی حوا حضرت آدم علیہ السلام کے بدن سے پیدا ہوئی ہیں کچھ معتبر روایتیں یہ بھی کہتی ہیں کہ حضرت حوا علیہا السلام، آدم علیہ السلام کی پسلیوں سے پیدا ہوئی ہیں اور اس پر اس آیت کو گواہ ٹھہرایا گیا ہے (تورات کے سفر تکوین کی دوسری فصل بھی ان ہی معنوں کی وضاحت کرتی ہے) اور معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے حضرت آدم علیہ السلام کی بیوی کو انہی کی جنس (جنس بشر) سے پیدا کیا۔

حضرت آدم علیہ السلام کے بچوں کی شادیاں کس طرح ہوئیں؟

''وَ بَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِيۡرًا وَّ نِسَآءً''

یہ جملہ بتاتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا ہوئیں اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کے بیٹوں کی نسل کی بہتات حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی کے طریقہ سے ہی ظاہر ہوئی تھی اور اس میں کسی تیسرے وجود کا عمل دخل نہ تھا۔

وہ اہمیت جو تقویٰ کو کسی صحیح معاشرے کی بنیاد رکھنے کے لئے حاصل ہے وہ اس بات کا سبب بنی ہے کہ لوگوں کو دوبارہ پرہیزگاری اور تقویٰ کی طرف بلایا جائے البتہ یہاں پر ایک جملہ بڑھایا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے خدا سے ڈرو جو تمہاری نگاہ میں عظمت اور بزرگی کا مالک ہے اور تم جب کسی سے کوئی چیز مانگتے ہو تو اس کا نام لیتے ہو۔

پھر کہتا ہے: ''وَ الۡاَرۡحَامَ''

یہ لفظ اللہ پر عطف ہے اسی لیے مشہور قرأت میں مفتوح و منصوب پڑھا جاتا ہے اس وجہ سے اس کے معنی یہ ہوں گے ''واتقوا الارحام'' یعنی رشتہ داروں کی قطع رحمی سے ڈرو اور یہاں موضوع کا ذکر پہلے تو صلہ رحمی کی انتہائی اہمیت کا پتہ دیتا ہے کہ قرآن اس کا اس قدر قائل ہے کہ اس نے ارحام کا نام خداوند عالم کے نام نامی اور اسم گرامی کے ساتھ لیا ہے۔

''اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيۡكُمۡ رَقِيۡبًا''

رقیب اصل میں اس شخص کو کہتے ہیں جو بلند جگہ سے حالات کا جائزہ لے۔ اس کے بعد کسی چیز کے محافظ و نگہبان کے معنی میں استعمال ہونے لگا کیونکہ نگہبانی کے لئے دیکھنا اور دیکھ بھال کرنا ضروری ہے مندرجہ بالا جملہ میں فرماتا ہے خدا تمہارا رقیب ہے اور وہ تمہارے تمام اعمال اور نیتوں کو دیکھتا اور جانتا ہے اور ضمناً یہ مفہوم بھی ہے کہ حوادث میں وہی تمہارا نگہبان بھی ہے۔

(۲)وَ اٰتُوا الۡيَتٰمٰٓى اَمۡوَالَهُمۡ وَ لَا تَتَبَدَّلُوا الۡخَبِيۡثَ بِالطَّيِّبِ وَ لَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَهُمۡ اِلٰٓى اَمۡوَالِكُمۡ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوۡبًا كَبِيۡرًا	یتیموں کے مال (جب وہ بالغ ہو جائیں) انہیں دے دو اور (اپنے) برے مال (یتیموں کے) اچھے مال سے تبدیل نہ کرو اور ان کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر یا تبدیل کر کے نہ کھاؤ کیونکہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

شان نزول

بنی غطفان قبیلے کے ایک شخص کا بھائی بہت دولت مند تھا وہ دنیا سے چل بسا تو اس کے بھائی نے اپنے یتیم بھتیجوں کی سر پرستی کے نام پر اسکے مال میں تصرف کیا جس وقت اس کا بھتیجا بالغ ہو گیا تو اس نے اس یتیم کا حق دینے سے انکار کر دیا۔

جب یہ مقدمہ حضرت رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس غاصب نے آیت سننے کے بعد توبہ کر لی اور مال اس کے مالک کو واپس کرتے ہوئے کہا:

''اعوذ باللّٰہ من الحوب الکبیر'' (میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ کہیں بڑے گناہ میں آلودہ نہ ہو جائیں)

تفسیر

یتیموں کے مال میں خیانت حرام ہے ہر معاشرے میں نت نئے حوادث کی وجہ سے باپ دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچے رہ جاتے ہیں۔

البتہ برے معاشرے جو داخلی جنگ میں پھنسے رہتے ہیں جیسے زمانہ جاہلیت کا عرب معاشرہ تھا ان میں یتیم بچوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے جنہیں حکومت اسلامی اور ہر ایک مسلمان کی حمایت اور سر پرستی میں رہنا چاہئے۔

آیت مذکورہ بالا میں یتیموں کے مال کے بارے میں تین اہم حکم دیئے گئے ہیں۔

1۔وَ اٰتُوا الۡيَتٰمٰٓى اَمۡوَالَهُمۡ ....اس جملے میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب یتیم بالغ ہو جائیں تو ان کے مال ان کے سپرد کر دیئے جائیں یعنی ان کے اموال میں تمہارا تصرف صرف امین، ناظر اور وکیل کی حیثیت سے ہے نہ کہ مالک کے طور پر۔

2۔وَ لَا تَتَبَدَّلُوا الۡخَبِيۡثَ بِالطَّيِّبِ............اور کبھی ان کے اعلی اور پاکیزہ مال کو اپنے گھٹیا اور ناپاک مال سے تبدیل نہ کرو یہ حکم تو اصل میں ظلم وستم سے بچنے کے لئے ہے کیونکہ بعض اوقات یتیموں کے سر پرست اس بہانے سے کہ مال کی تبدیلی یتیم کے فائدے میں ہے یا اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور اگر پڑ رہا ہے تو صحیح ہو جائے گا یہ کہہ کر یتیموں کے اچھے اور خالص مال لے لیتے اور اپنے برے اور ناپسندیدہ مال ان کی جگہ رکھ دیتے تھے۔

3۔وَ لَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَهُمۡ اِلٰٓى اَمۡوَالِكُمۡ............اور ان کے مال اپنے مالوں کے ساتھ نہ کھاؤ یعنی یتیموں کے مال کو

اپنے مال کے ساتھ غلط ملط نہ کرو کہیں اس طریقے سے مقصد سب کو اپنی ملک بنانا ہو یا یہ کہ اپنے برے مال کو ان کے اچھے مال میں نہ ملاؤ کہ جس کا نتیجہ یتیموں کے حق کی پائمالی ہو۔

جملہ بالا میں لفظ "الی" دراصل "مع" (ساتھ) کے معنی میں ہے۔

"اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا"

آیت کے آخر میں اس امر کی اہمیت ثابت کرنے کے لئے تاکید فرماتا ہے کہ یتیموں کے مال میں اس قسم کی ہیرا پھیری بہت بڑا گناہ ہے۔

(۳) وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۭ	اور اگر تم کو اس بات کا ڈر ہو (کہ یتیم لڑکیوں سے شادی کی صورت میں) ان سے انصاف نہ کرسکو گے تو (ان سے شادی کرنے سے صرف نظر کرلو) اور دوسری پاک عورتوں سے نکاح کرو دو یا تین یا چار بیویاں اور اگر تم کو ڈر ہو (کہ متعدد بیویوں کے بارے میں) عدل ملحوظ نہ رکھ سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر قناعت کرو اور یا جن عورتوں کے تم مالک ہو ان سے استفادہ کرو یہ طریقہ بہتر طور پر ظلم و ستم سے محفوظ رکھتا ہے۔

شان نزول

اس آیت کے بارے میں ایک خاص شان نزول منقول ہے اور وہ یہ کہ قبل از اسلام اہل حجاز کفالت و سرپرستی کے لئے یتیم بچیوں کو اپنے گھر لے جاتے تھے اور پھر ان سے شادی کر کے ان کے مال کو اپنی ملکیت بنا لیتے تھے کیونکہ سب کچھ انہی کے ہاتھ میں ہوتا تھا یہاں تک کہ ان کا حق مہر بھی معمول سے کم مقرر کرتے تھے اور اگر ان سے معمولی سی تکلیف بھی پیدا ہوتی تو آسانی سے انہیں چھوڑ دیتے اور وہ اس بات پر تیار نہ ہوتے کہ ایک عام بیوی کی حیثیت سے ہی ان سے تعلق باقی رکھیں۔

ان حالات میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں یتیموں کی سرپرستی کرنے والوں کو حکم دیا گیا کہ اگر وہ یتیم لڑکیوں سے شادی کریں تو ان کے بارے میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھیں اور اگر ایسا نہ کرسکیں تو پھر ان سے شادی نہ کریں اور دوسری عورتوں میں سے شادی کے لئے کسی کو منتخب کریں۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں یتیموں کے مال کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے۔ اب اس آیت میں ان کے ایک اور حق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ: اگر خوف ہو کہ یتیم لڑکیوں سے شادی کے وقت تم حقوقِ زوجیت اور ان کے مال کے بارے میں عدل و

انصاف نہ کر سکو گے تو ان سے شادی نہ کرو اور دوسری عورتوں میں سے انتخاب کرو۔

ایک سے زیادہ شادیوں کی شرائط

لغت میں "مثنیٰ" کا معنی ہے دو دو "ثلاث" کا تین تین اور "رباع" کا چار چار آیت میں روئے سخن چونکہ تمام مسلمانوں کی طرف ہے اس لیے اس کا معنی یوں ہوگا یتیم لڑکیوں پر ظلم وستم سے بچنے کے لئے تم ان سے شادی کرنے سے اجتناب کرو اور ان کی بجائے ایسی عورتوں سے شادی کرو جن کی معاشرتی اور خاندانی حیثیت ایسی ہو جو تمہیں ان پر ظلم کرنے کی اجازت نہ دے اور تم ان میں سے دو تین یا چار عورتوں سے شادی کر سکتے ہو البتہ مخاطب چونکہ تمام مسلمان ہیں اس لیے دو دو یا تین تین یا چار چار کہا گیا ہے ورنہ اس میں شک نہیں کہ زیادہ سے زیادہ بیویوں کی تعداد وہ بھی خاص شرائط کی موجودگی میں چار ہے۔

اس کے بعد فوراً کہا گیا ہے کہ یہ اجازت مکمل عدالت کو ملحوظ رکھنے سے مشروط ہے اور اگر عدالت نہیں کر سکتے تو اسی ایک بیوی پر اکتفا کرو تا کہ دوسروں پر ظلم وستم کرنے سے بچ سکو۔

یا کسی اور بیوی کے انتخاب کی بجائے جو کنیز تمہاری ملکیت ہے اس سے استفادہ کرو کیونکہ ان کی شرائط آسان سی ہیں اگر چہ انہیں بھی ان کے حقوق ادا کیے جانا چاہیں۔

یہ (بیوی یا کنیز کے چناؤ کا) کام ظلم وستم اور عدالت سے انحراف سے بہتر بچاؤ کرتا ہے غلامی کے مسئلے کے بارے میں اور اس سلسلے میں اسلام کے نظریئے کے متعلق متعلقہ آیات میں تفصیلی بحث کی جائے گی۔

(۴)وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً ؕ فَاِنۡ طِبۡنَ لَكُمۡ عَنۡ شَىۡءٍ مِّنۡهُ نَفۡسًا فَكُلُوۡهُ هَنِيۡٓـئًا مَّرِيۡٓـئًا	اور عورتوں کا حق مہر ایک قرض سمجھتے ہوئے انہیں ادا کر دو اور اگر وہ راضی خوشی اس میں سے کوئی چیز تمہیں بخش دیں تو اسے حلال اور مناسب سمجھتے ہوئے استعمال کرلو۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں بیوی کے انتخاب کے بارے میں گفتگو تھی اب اس آیت میں عورتوں کے ایک مسلمہ حق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے آیت تاکید کرتی ہے کہ عورتوں کا حق مہر بالکل ایک قرض کی طرح ادا کرو یعنی جیسے دوسرے قرضوں کی ادائیگی کا خیال رکھتے ہو کہ ان میں سے کوئی چیز کم نہ ہو حق مہر ادا کرتے وقت بھی تمہاری یہی حالت ہونی چاہیئے (یہ اس صورت میں ہے اگر نحلة کا معنی قرض لیا جائے) اور اگر اس کا معنی عطیہ اور بخشش کیا جائے تو پھر آیت کی تفسیر اس طرح ہوگی حق مہر جو کہ ایک عطیہ الٰہی ہے اور خدا نے اس لیے مقرر کیا ہے کہ معاشرے میں عورت کے حقوق زیادہ ہوں اور اس کی جسمانی کمزوری کی اس طرح سے تلافی ہو جائے اسے مکمل طور پر ادا کرو۔

آیت کی ابتداء میں حقوق نسواں کی حفاظت کے لئے صراحت سے حکم دیا گیا ہے کہ تمام حق مہر انہیں ادا کرو لیکن آیت کے

ذیل میں طرفین کے احساسات کا احترام کرتے ہوئے قلبی رشتوں کے استحکام اور باہمی محبت کے فروغ کے لئے ارشاد فرمایا گیا ہے اگر عورتیں پوری رضا ورغبت سے اپنے مہر میں سے کچھ مقدار بخش دیں تو وہ تمہارے لیے حلال اور شائستہ ہے یہ اس لیے ہے تا کہ باہمی زندگی میں صرف خشک قانون اور کلیے ہی نہ چلتے رہیں بلکہ متوازی طور پر محبت والفت کے جذبے حکم فرما ہوں۔

حق مہر عورت کے لئے ایک معاشرتی سہارا ہے

زمانہ جاہلیت میں چونکہ لوگ عورت کی قدر و قیمت کے قائل نہیں تھے اس لیے اکثر اوقات حق مہر جو کہ عورت کا مسلم حق ہے وہ اس کے ولیوں کو دے دیتے تھے اور اسے ان کا مسلم حق سمجھتے تھے بعض اوقات ایک عورت کا حق مہر دوسری عورت کی شادی کو قرار دیتے تھے مثلاً ایک بھائی اپنی بہن کی شادی کسی سے کرتا تو اسے بھی مقابلے میں اپنی بہن اسے دینا پڑتی اور ان دونوں عورتوں کا یہی حق مہر ہوتا۔

درست ہے کہ قوانین اسلام کی رو سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوتے ہی حق مہر مرد کے ذمے ہو جاتا ہے اور عورت فوراً ہی اس کے مطالبے کا حق رکھتی ہے لیکن چونکہ عموماً وہ قرض کی صورت میں مرد کے ذمہ رہ جاتا ہے لہٰذا یہ عورت کے لئے ایک پس انداز بچت کی حیثیت رکھتا ہے اور رشتہ تزویج نہ ٹوٹنے کے لئے ایک سہارا کا کام دیتا ہے اس مسئلے کے کچھ استثنائی پہلو بھی ہیں لیکن ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ زیادہ تر مقامات پر صادق آتا ہے۔

اب اگر بعض لوگوں نے حق مہر کی غلط تفسیر کی ہے اور اسے عورت کی ایک طرح سے قیمت خیال کیا ہے اس کا قوانین اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ اسلام میں کسی طرح بھی حق مہر مال تجارت کی قیمت کا پہلو نہیں رکھتا اور اس کی بہترین دلیل نکاح کے صیغے ہیں جن میں قانونی طور پر مرد اور عورت ہی اس پیمان کے دو بنیادی رکن شمار ہوتے ہیں اور حق مہر ایک اضافی چیز ہے اور کتاب کے حاشیے کے مترادف ہے اسی بناء پر اگر صیغہ نکاح میں حق مہر کا تذکرہ نہ کیا جائے تو عقد باطل نہیں ہے (البتہ اس صورت میں شوہر کی ذمہ داری ہے کہ مباشرت سے قبل اس جیسی عورتوں کا سا حق مہر ادا کرے)۔

ایک اہم بات

حق مہر نقصان کی تلافی اور عورت کے حقوق کے احترام کے پیش نظر ہے نہ کہ اس کی قیمت ہے اور شاید ''نحلة'' بمعنی عطیہ اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہے۔

(۵)وَ لَا تُؤۡتُوا السُّفَهَآءَ اَمۡوَالَكُمُ الَّتِىۡ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمۡ قِيٰمًا وَّ ارۡزُقُوۡهُمۡ فِيۡهَا وَاكۡسُوۡهُمۡ وَ قُوۡلُوۡا لَهُمۡ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا	اور اپنے اموال کہ جنہیں خدا نے تمہاری زندگی کا وسیلہ قرار دیا ہے انہیں بے وقوفوں کے ہاتھ میں نہ دے دو اور انہیں اس میں سے روزی دے دو اور انہیں لباس پہناؤ اور ان سے شائستہ طریقے سے گفتگو کرو۔
(٦)وَابۡتَلُوا الۡيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ‌ۚ فَاِنۡ اٰنَسۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ رُشۡدًا فَادۡفَعُوۡٓا اِلَيۡهِمۡ اَمۡوَالَهُمۡ‌ۚ وَ لَا تَاۡكُلُوۡهَآ اِسۡرَافًا وَّ بِدَارًا اَنۡ يَّكۡبَرُوۡا‌ ؕ وَ مَنۡ كَانَ غَنِيًّا فَلۡيَسۡتَعۡفِفۡ‌ۚ وَ مَنۡ كَانَ فَقِيۡرًا فَلۡيَاۡكُلۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ‌ ؕ فَاِذَا دَفَعۡتُمۡ اِلَيۡهِمۡ اَمۡوَالَهُمۡ فَاَشۡهِدُوۡا عَلَيۡهِمۡ‌ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيۡبًا	اور یتیموں کو آزما کر دیکھو یہاں تک کہ جب (تم دیکھو کہ) وہ بلوغ کو پہنچ گئے ہیں تو اگر ان میں (کافی) رشد وشعور پاؤ تو ان کے اموال ان کے سپرد کرو اور ان کے بڑے ہونے سے پہلے ان کے اموال اسراف اور فضول خرچی کے طور پر نہ کھاؤ اور (سرپرستوں میں سے) جو شخص بے نیاز ہے وہ حق زحمت لینے سے اجتناب کرے اور جو شخص ضرورت مند ہے وہ شائستہ طریقے سے اور جو زحمت اس نے اٹھائی ہے اس کے مطابق اس میں سے کھائے اور جب ان کا مال انہیں دے دو تو اس ادائیگی پر گواہ بنا لو اگرچہ خدا محاسبہ کے لئے کافی ہے۔

تفسیر

مندرجہ بالا آیت یتیموں سے مربوط مباحث کی تکمیل کرتی ہیں کچھ بحث گذشتہ آیات میں ہو چکی ہے۔

اپنا مال و دولت بے وقوفوں کے سپرد نہ کرو اور انہیں رہنے دو یہاں تک کہ وہ اقتصادی معاملات میں شعور حاصل کر لیں تاکہ تمہاری دولت خطرے اور نقصان کی زد سے بچ جائے۔

سفیہ کسے کہتے ہیں؟

واضح ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں سفاہت کا تعلق خصوصیت سے مالی امور میں کافی سوجھ بوجھ نہ ہونے سے ہے۔ اور یہاں سفیہ سے مراد وہ ہے جو اموال کی سرپرستی اپنے ذمہ نہ لے سکے اور مال و دولت کے لین دین میں اپنے فائدے کو نہ سمجھ سکے اصطلاح میں کہتے ہیں کلاہ سرش برود (یعنی......لوگ اس کا سر مونڈ لیں) اس مفہوم کی شاہد زیرِ نظر دوسری آیت ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے:

''فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ''

(اگرانہیں سمجھدار پاؤ تو ان کے اموال ان کے سپرد کردو)

''الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا''

اس جملے میں قرآن نے مال وثروت کے لئے ایک عجیب وغریب تعبیر بیان فرمائی ہے تمہاری زندگی اور سوسائٹی کا قیام سرمایہ پر ہی منحصر ہے اس کے بغیر تم آزادی سے اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہوسکتے اسے سفیہ اور فضول خرچ لوگوں کے سپرد نہ کرو اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام اقتصادی اور مالی اہمیت کا قائل ہے اسکے برعکس موجودہ انجیل میں ہے کہ مالدار آدمی جنت میں نہیں جاسکے گا اسلام کہتا ہے کہ جوقوم فقیر ونادار ہو وہ کبھی اپنی کمر سیدھی نہیں کرسکتی تعجب کی بات یہ ہے کہ عیسائی اپنی غلط تعلیمات کے باوجود دنیا میں اوج کمال پر پہنچے ہوئے ہیں اور ہم ان اعلی اسلامی تعلیمات کے باوجود ٹھوکریں کھارہے ہیں۔

اصل میں انہوں نے خرافات چھوڑ دی ہیں اس لیے وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہیں اور کیونکہ ہم نے ان اعلی وارفع تعلیمات سے دوری اختیار کر لی ہے اس لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔

آیت کے آخر میں یتیموں کے بارے میں دواہم حکم دیئے گئے ہیں۔

1۔ان کی خوراک اور پوشاک انہی کے مال سے مہیا کروتا کہ وہ عزت وآبرو کے ساتھ پروان چڑھیں اور بالغ ہوں۔

2۔دوسرے یہ کہ آیت کہتی ہے کہ یتیموں کے ساتھ شائستگی سے گفتگو کرو یعنی دل کوخوش کرنے والی اچھی اچھی باتوں سے ان کی نفسیاتی کمی کودور کرواوران کونصیحت کرتے رہوتا کہ وہ سن بلوغ تک پہنچتے پہنچتے اچھے خاصے سمجھدار ہوجائیں اسی طرح یتیموں کی تشکیل سیرت اور تعمیر کردار بھی سرپرستوں کی ذمہ داری ہے۔

(۶) یہاں یتیموں اوران کے مال کے بارے میں ایک اورحکم دیتے ہوئے فرماتا ہے یتیموں کی آزمائش کرو انہیں تجربے میں ڈالو یہاں تک کہ جب وہ بلوغت کوپہنچ جائیں تو اس وقت اگران میں معاملہ فہمی اور مال کی حفاظت کی سوجھ بوجھ پاؤ توان کا مال انہیں واپس کردو۔

دواہم نکات

1۔ **اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ**...... میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب وہ زندگی کی اس حد میں قدم رکھیں کہ ازواج کی قدرت رکھتے ہوں اور ظاہر ہے کہ جوشادی بیاہ کی اہلیت رکھتا ہے گھریلو ذمہ داریوں کوبہتر طور پرانجام دینے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور ایسا شخص سرمایہ کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا بنابریں از دواجی زندگی مستقل اقتصادی زندگی کے ساتھ ساتھ شروع ہوتی ہے۔

2۔**فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا** ...... یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان کا رشد (سوجھ بوجھ) پوری طرح واضح ہو کیونکہ ''ائستم'' مادہ ''ایناس'' سے ہے جس کے معنی مشاہدہ کرنے اور دیکھنے کے ہیں اور یہ مادہ، مادۂ انسان سے ہے جس کے ایک

معنی آنکھ کی پتلی کے بھی ہیں حقیقت میں مشاہدہ اور دیکھنے کے وقت انسان یعنی آنکھ کی پتلی سے مدد لی جاتی ہے اسی لیے مشاہدہ کرنے کو "ایناس" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس کے بعد پھر سرپرستوں کو تاکید کر رہا ہے کہ کسی طرح سے بھی یتیموں کے مال میں خیانت اور بے ایمانی نہ کریں اور ان کے ہوش سنبھالنے سے پہلے ان کا سرمایہ ضائع نہ کریں۔

اگر یتیموں کے سرپرست صاحب حیثیت اور مالدار ہیں تو پھر کسی طریقے سے بھی ان کے مال سے فائدہ نہ اٹھائیں اور اگر فقیر و نادار ہیں تو صرف ان ذمہ داریوں کے بدلے جو انہوں نے یتیم کے مال کی حفاظت کے لئے اٹھائی ہیں عدل و انصاف کرتے ہوئے ان کے مال میں سے اپنی کارکردگی کے مطابق لے سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں کئی روایتیں بھی ہیں جنہوں نے اس آیت کے مضمون کی وضاحت کی ہے۔

آخری حکم جو یتیموں کے سرپرستوں کے متعلق اس آیت میں بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جب تم ان کے مال ان کے سپرد کرنا چاہو تو گواہ بنالو تاکہ اتہام، نزع اور کسی قسم کے اعتراض کی گنجائش باقی نہ رہے۔

البتہ یہ جان لو کہ حقیقی حساب کرنے والا تو خداوند عالم ہی ہے اور ہر چیز سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ تمہارا حساب کتاب اس خدا کے ہاں واضح ہو کیونکہ خدا وہ ہے کہ اگر تم سے کوئی ایسی بے ایمانی ہوئی ہوگی جو گواہوں کی نظروں سے بھی اوجھل ہو تو وہ اس کا حساب کرلے گا۔

(۷) لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا	مردوں کے لئے اس میں سے جو کچھ ان کے والدین اور رشتہ دار چھوڑ جائیں حصہ ہے اور عورتوں کے لئے بھی جو ان کے والدین اور رشتہ دار چھوڑ جائیں حصہ ہے چاہے وہ مال کم ہو کہ زیادہ۔ یہ حصہ مقرر اور لازمی ہے۔

شان نزول

زمانہ جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ وہ مشرک صرف مردوں کو وارث سمجھتے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ جو شخص مسلح ہو کر لڑنے اپنے زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے کبھی کبھی ڈاکہ ڈالنے کی طاقت نہیں رکھتا اسے ترکہ نہیں مل سکتا اسی وجہ سے وہ عورتوں اور بچوں کو میراث سے محروم کر دیتے تھے اور میت کا مال بہت دور کے مردوں میں بانٹ دیتے تھے یہاں تک کہ ایک انصاری جس کا نام اوس بن ثابت تھا فوت ہو گیا اور اپنے بعد چھوٹی چھوٹی بچیاں اور بچے چھوڑ گیا اس کے چچا زاد بھائی جن کے نام خالد اور ارفطہ تھے وہ آئے انہوں نے اس کا مال آپس میں بانٹ لیا اور اس کی بیوی اور چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں کو کچھ بھی نہ دیا تو اس کی بیوی نے حضرت رسول اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں شکایت کی اس وقت تک اس

سلسلے میں اسلام میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا اس موقع پر مذکورہ بالا آیت کا نزول ہوا چنانچہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ان دونوں کو بلایا کہ وہ اس مال میں بالکل چھینا جھپٹی نہکریں اور اسے پہلے طبقے کے پس ماندگان یعنی اولاد اور اس کی بیوی کے سپرد کردیں یہاں تک کہ ان کے درمیان اس کی تقسیم کا طریقہ آیات آئندہ میں واضح ہوا۔

تفسیر

عورت کی حفاظت کے لئے ایک اور قدم

حقیقت میں یہ آیت غلط عادتوں اور رسموں کے خلاف ایک اقدام ہے کیونکہ وہ عورتوں اور بچوں کو ان کے جائز حق سے محروم کردیتے تھے اس لیے یہ آیت ان بحثوں کی تکمیل کرتی ہے جو آیات گذشتہ میں ہوئی ہیں کیونکہ عرب اپنی غلط اور ظالمانہ رسموں کی وجہ سے عورتوں اور چھوٹے بچوں کو میراث کے حق سے محروم کردیتے تھے آیت نے اس باطل قانون کو غلط قرار دیا اور فرمایا کہ مرد اس مال سے جو ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ جاتے ہیں، حصہ رکھتے ہیں اور عورتیں بھی چاہے وہ کم ہو کہ زیادہ اس وجہ سے کوئی شخص حق نہیں رکھتا کہ وہ دوسرے کا حصہ ہڑپ کرجائے

اس کے بعد آیت کے آخر میں اس مقصد کی تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے یہ تعین شدہ حصہ ہے اور اس کا ادا کرنا واجب ہے تاکہ اس بحث میں کسی قسم کا شک وشبہ باقی نہ رہ جائے۔

(۸)وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا	اگر میراث کی تقسیم کے وقت رشتہ دار اور یتیم اور مسکین موجود ہوں تو اس مال میں سے کچھ تھوڑا بہت انہیں بھی دے دو اور ان سے اچھے طریقے سے بات کرو۔

تفسیر

ایک اخلاقی حکم

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ یہ آیت قانون تقسیم وراثت کے بعد نازل ہوئی ہے کیونکہ یہ بتاتی ہے کہ جب تقسیم میراث کی مجلس میں رشتہ دار یتیم اور مسکین موجود ہوں تو اس میں سے کچھ نہ کچھ انہیں بھی دے دو بنا بریں اس آیت کا مفہوم ایک مستحب اور اخلاقی حکم ہے ان طبقات کے بارے میں جو زیادہ نزدیکی ہوتے ہوئے بھی میراث سے محروم ہیں آیت کہتی ہے اگر تقسیم میراث کی مجلس میں کچھ دوسرے یا تیسرے درجے کے رشتہ دار اور اسی طرح بعض یتیم اور مسکین ہوں تو کچھ نہ کچھ مال انہیں بھی دے دو۔

اس طریقے سے حسد اور کینہ کا احساس جو میراث سے محرومی کی وجہ سے ممکن ہے ان کے دل میں موجزن ہو دور کردو اور اس ذریعے سے انسانی رشتے کے پیوند کو مستحکم کردو۔

(۹)وَلۡيَخۡشَ الَّذِيۡنَ لَوۡ تَرَكُوۡا مِنۡ خَلۡفِهِمۡ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوۡا عَلَيۡهِمۡ ۖ فَلۡيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلۡيَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِيۡدًا	جولوگ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اگر وہ اپنے بعد نا بالغ اولاد چھوڑ جائیں گے تو اس کا آنے والے دور میں کیا حشر ہوگا انہیں چاہئے کہ وہ یتیموں پر ظلم کرنے سے ڈریں اور خدا کی مخالفت سے بچیں اور یتیموں سے محبت اور نرمی سے گفتگو کریں۔

تفسیر

یتیموں پر لطف وکرم کی بارش

قرآن یتیموں کی حالت زار کے بارے میں لوگوں کے جذبات کرم ابھارنے کے لئے ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے کبھی کبھی لوگ غافل ہو جاتے ہیں اور یہ وہ کہ تم عام یتیموں کے ساتھ وہی سلوک کرو جو تم چاہتے ہو کہ کل لوگ تمہارے یتیموں کے ساتھ کریں۔

اپنے بے یارو مددگار اور لاوارث بچوں کی بری حالت پیش نظر رکھو جبکہ وہ ایک ظالم اور بے ایمان شخص کی سرپرستی میں ہوں جو نہ ان کے جذبات واحساسات پر نظر کرے اور نہ ان کے مال میں عدالت کا خیال رکھے تو یہ دردناک منظر تمہارے لیے کتنا تکلیف دہ ہوگا اور تم اپنی اولاد کے مستقبل کے لئے کتنے فکرمند ہو گے اسی طرح دوسرے کی اولاد اور یتیموں کے لئے فکر کرو ان کی تکلیف کا احساس کرو اس بنا پر آیت کا مطلب کچھ یوں ہوگا وہ لوگ جو اپنی اولاد کی آئندہ زندگی کے متعلق حیران و پریشان ہیں انہیں چاہئے کہ وہ یتیموں سے خیانت کرنے اور انہیں ستانے سے پرہیز کریں۔

اجتماعی مسئلے اصولی طور پر ہمیشہ ایک سنت کی شکل میں آج سے کل اور کل سے آئندہ زمانے تک اثر کرتے اور پھیلتے ہیں جو لوگ معاشرے میں کسی ظلم کی بنیاد ڈالتے ہیں مثلاً یتیموں کو ستانے کی رسم ڈالتے ہیں دراصل وہ خود اس بات کی دعوت اور عملی نمونہ ہوتے ہیں کہ کل ان کی اولاد کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے اس لیے وہ نہ صرف دوسروں کی اولاد پر مشقِ ستم کرتے ہیں بلکہ اپنی اولاد کے لئے بھی ظلم وستم کی راہ ہموار کر دیتے ہیں۔

اب جبکہ یہ حال ہے تو یتیموں کے سرپرستوں کو چاہئے کہ وہ خداوند عالم کے احکام کی مخالفت نہ کریں اور یتیموں کے ساتھ میٹھے لہجے میں بات کریں اور ان سے شفقت آمیز سلوک کریں تا کہ ان کے باطنی دکھ دور ہو جائیں اور دل کے زخم بھر جائیں اسلام کا یہ بلند پایہ حکم جو مندرجہ بالا جملے میں موجود ہے ایتام کی پرورش کے سلسلے میں ایک نفسیاتی نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے جو نہایت قابل غور ہے اور وہ یہ کہ ایک ننھے منے یتیم کی ضرورت صرف خوراک اور پوشاک تک محدود نہیں بلکہ ہمدردی اور مہربانی سے اس کے احساسات قلبی کی تسکین بھی ضروری ہے جو اس کی آئندہ تعمیر و تربیت میں اثر انداز ہوگی کیونکہ یتیم بھی دوسروں کی طرح انسان ہے اور چاہئے کہ اسے اس مہربانی کے برتاؤ سے ایک ایک روحانی غذا ملے اور اس محبت اور پیار سے اسے وہ راحت ملے جو ایک بچے کو ماں باپ کی گود

میں ملتی ہے وہ ایک بھیڑ کے بچے کی مانند نہیں ہے کہ صبح کے وقت ریوڑ کے ساتھ چراگاہ میں چلا جائے اور شام کے وقت واپس آ جائے جسمانی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ اس کے نفسیاتی میلانات کی بھی خاطر خواہ تعلیم وتربیت کا خیال رکھا جائے ورنہ وہ ایک ظالم معاشرے کا باغی برا اور خطرناک شخص بنے گا۔

(۱۰) اِنَّ الَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی ظُلۡمًا اِنَّمَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ نَارًا ؕ وَ سَیَصۡلَوۡنَ سَعِیۡرًا ۠	جو لوگ یتیموں کا مال ظلم وستم سے کھاتے ہیں وہ صرف آگ کھا رہے ہیں اور بہت جلد جلانے والی آگ میں جلیں گے۔

تفسیر

ہمارے اعمال کا باطنی چہرہ

ہم اس سورہ کے شروع میں تحریر کر چکے ہیں کہ اس سورہ کی آیتیں ایک صحیح وسالم معاشرے کی بنیاد قائم کرنے کے لئے نازل ہوئی ہیں اس لیے پہلے پہل جہالت کے زمانے کی رسموں اور مجرمانہ غلط کاریوں کو جو بعض نومسلموں کے دلوں میں تھیں دور کر کے ایک صحیح وسالم معاشرے کے لئے زمین ہموار کرتی ہیں اور یتیم کا مال کھانے سے زیادہ بدتر عمل کونسا ہوگا اسی لیے اس سورت کے شروع میں یتیموں کے مال میں بے جا تصرف کرنے کے خلاف سخت قسم کے احکام دکھائی دیتے ہیں جن میں آیت مذکورہ بالا سب سے زیادہ واضح ہے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ جو لوگ یتیموں کا مال ہیرا پھیری کر کے کھاتے ہیں وہ درحقیقت آگ کھاتے ہیں۔ سارے قرآن میں اس قسم کی تعبیر صرف ایک مقام پہ نظر آتی ہے اور وہ ایسے لوگوں سے متعلق ہے جو حقائق چھپا کر آیاتِ الٰہی میں ردوبدل کر کے نفع کماتے ہیں۔

''وَسَیَصۡلَوۡنَ سَعِیۡرًا''

''سیصلی'' اصل میں ''صلی'' (بروزن درد) کے مادے میں سے آگ میں داخل ہونے اور جلنے کے معنی میں ہے اور سعیر کے معنی ہیں بھڑکتی ہوئی آگ۔ قرآن اس آیت میں بتاتا ہے کہ اس دنیا میں آگ کھانے کے علاوہ وہ بہت جلد آخرت میں بھی بھڑکتی ہوئی آگ میں جائیں گے جو انہیں بری طرح جلائے گی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اعمال کا ظاہری چہرے کے علاوہ ایک حقیقی چہرہ بھی ہے جو اس دنیا میں ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے لیکن یہ باطنی چہرے آخرت میں ظاہر ہو جائیں گے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عمل مجسم حالت میں پیش ہوں گے۔

(۱۱)یُوۡصِیۡکُمُ اللّٰہُ فِیۡۤ اَوۡلَادِکُمۡ ۚ لِلذَّکَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَیَیۡنِ ۚ فَاِنۡ کُنَّ نِسَآءً فَوۡقَ اثۡنَتَیۡنِ فَلَہُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَکَ ۚ وَ اِنۡ کَانَتۡ وَاحِدَۃً فَلَہَا النِّصۡفُ ؕ وَلِاَبَوَیۡہِ لِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡہُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَکَ اِنۡ کَانَ لَہٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ یَکُنۡ لَّہٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَہٗۤ اَبَوٰہُ فَلِاُمِّہِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنۡ کَانَ لَہٗۤ اِخۡوَۃٌ فَلِاُمِّہِ السُّدُسُ مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِیَّۃٍ یُّوۡصِیۡ بِہَاۤ اَوۡ دَیۡنٍ ؕ اٰبَآؤُکُمۡ وَ اَبۡنَآؤُکُمۡ لَا تَدۡرُوۡنَ اَیُّہُمۡ اَقۡرَبُ لَکُمۡ نَفۡعًا ؕ فَرِیۡضَۃً مِّنَ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا

خدا تم کو تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے کہ (میراث میں سے) ایک بیٹے کا دو بیٹیوں کے برابر حصہ ہے اگر تمہاری (دو یا) دو سے زیادہ بیٹیاں ہوں تو میراث کی دو تہائی ان کے لئے ہے اور اگر ایک ہو تو اس کے لئے آدھی میراث ہے اور (مرنے والے کے) باپ اور ماں میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ ہے اگر اس کی اولاد ہو اور اگر اس کی اولاد نہ ہو اور صرف ماں باپ اس کی میراث لیں تو اس کی ماں کے لئے تیسرا حصہ ہے اور اگر اس کے بھائی موجود ہوں تو اس کی ماں چھٹا حصہ لے گی (اور باقی چھ میں سے پانچ حصے اس کے باپ کے لئے ہیں) یہ سب کچھ اس وصیت پر عمل کر چکنے کے بعد ہے جو مرنے والا کر گیا ہے قرض ادا کرنے کے بعد تم نہیں جانتے کہ باپ اور ماؤں اور تمہاری اولاد میں سے کون تمہارے لئے زیادہ اچھا ہے یہ خدائی حکم ہے اور وہ دانا اور حکیم ہے

(۱۲)وَ لَکُمۡ نِصۡفُ مَا تَرَکَ اَزۡوَاجُکُمۡ اِنۡ لَّمۡ یَکُنۡ لَّہُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنۡ کَانَ لَہُنَّ وَلَدٌ فَلَکُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَکۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِیَّۃٍ یُّوۡصِیۡنَ بِہَاۤ اَوۡ دَیۡنٍ ؕ وَ لَہُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَکۡتُمۡ اِنۡ لَّمۡ یَکُنۡ لَّکُمۡ وَلَدٌ ۚ فَاِنۡ کَانَ لَکُمۡ وَلَدٌ فَلَہُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَکۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ وَصِیَّۃٍ تُوۡصُوۡنَ بِہَاۤ اَوۡ دَیۡنٍ ؕ وَ اِنۡ کَانَ رَجُلٌ یُّوۡرَثُ کَلٰلَۃً

اور تمہارے لیے تمہاری بیویوں کی میراث میں سے اولاً آدھا ہے اگر ان کے ہاں اولاد نہ ہو اور اگر ان کی اولاد ہو تو ان کی وصیت اور قرض کی ادائیگی کے بعد چوتھا حصہ ہے اور تمہاری بیویوں کے لئے تمہاری میراث کا چوتھا حصہ ہے اگر تمہاری کوئی اولاد نہ ہو اور اگر تمہاری اولاد ہو تو ان کا تمہاری وصیت کی تکمیل اور قرض کی ادائیگی کے بعد آٹھواں حصہ ہے اور اگر کوئی ایسا شخص ہو کہ کلالہ (ایک بہن یا ایک بھائی) اس کی لے

اَوِ امۡرَاَةٌ وَّ لَهٗۤ اَخٌ اَوۡ اُخۡتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنۡ كَانُوۡۤا اَكۡثَرَ مِنۡ ذٰلِكَ فَهُمۡ شُرَكَآءُ فِى الثُّلُثِ مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصٰى بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ ۙ غَيۡرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَلِيۡمٌ ؕ	یا کوئی عورت ہے کہ جس کا ایک بھائی ایک بہن ہے تو ان میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے (اگر بھائی اور بہنیں مادری ہوں) اور ایک سے زیادہ ہوں تو پھر وہ وصیت کو پورا کرنے اور قرض ادا کرنے کے بعد تیسرے حصہ میں برابر برابر شریک ہیں بشرطیکہ (وصیت کے طریقے اور قرض کا اقرار) انہیں نقصان نہ پہنچائے یہ خدا کی سفارش ہے اور وہ جاننے والا اور حکیم ہے۔

شان نزول

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے منقول ہے وہ کہتے ہیں

میں بیمار ہو گیا تھا جب حضور ﷺ میری عیادت کے لئے تشریف لائے تو میں بے ہوش ہو چکا تھا حضرت رسول اکرم ﷺ نے پانی منگوایا کچھ پانی سے وضو فرمایا باقی مجھ پر چھڑک دیا تو میں ہوش میں آ گیا میں نے عرض کیا اے خدا کے رسول! میرے بعد میرے مال کا کیا ہوگا آپ ﷺ خاموش رہے کچھ دیر بعد یہ آیات نازل ہوئیں اور ان میں وارثوں کے حصے معین ہو گئے۔

تفسیر

اس آیت میں وارثوں کے پہلے طبقے اولاد اور ماں باپ کے بارے میں حکم بیان کیا گیا ہے واضح ہے کہ ربط و تعلق کی رو سے کوئی رشتہ اولاد ماں اور باپ سے زیادہ قریبی نہیں ہے اسی لیے قرآن نے انہیں میراث کے دیگر طبقات پر مقدم رکھا ہے پہلی آیت میں فرماتا ہے خدا تم سے تمہاری اولاد کے بارے میں سفارش اور وصیت کرتا ہے کہ بیٹوں کو بیٹیوں کی نسبت دوگنا حصہ دو قابل توجہ بات یہ ہے کہ ترتیب آیت اور طرز بیان کے لحاظ سے بیٹیوں کی میراث کو جڑ قرار دیا گیا ہے اور بیٹوں کے ورثے کو شاخ کیونکہ بیٹیوں کا حصہ مقرر کر کے بیٹوں کا حصہ مقرر کیا گیا ہے کہ بیٹے بیٹیوں سے دوگنا حصہ لیں گے اور یہ بیٹیوں کو میراث دینے کے لئے ایک طرح کی تاکید ہے اور زمانہ جاہلیت کی بدعتوں کا مقابلہ ہے کیونکہ وہ بیٹی کو بالکل محروم کر دیتے تھے باقی رہا ان دونوں کی میراث کے تفاوت و فرق کا فلسفہ تو وہ عنقریب بیان کیا جائے گا۔

اگر مرنے والے کی اولاد صرف دو لڑکیاں یا ان سے زیادہ ہوں تو انہیں مال کا دوتہائی ملے گا۔

لیکن اگر ایک بیٹی ہو تو اسے مال کا نصف ملے گا۔

مرد کی میراث عورت سے دوگنی کیوں ہے؟

بظاہر تو مرد کا ورثہ عورت سے دو چند ہے لیکن غور کرنے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ ایک لحاظ سے عورت کی میراث مرد سے دوگنی ہے اور یہ اس حمایت کو مد نظر رکھتے ہوئے ہے جو اسلام نے عورت کے حقوق کی فرمائی ہے

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر مردوں کی ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھا جائے تو مرد کی آدھی آمدنی عملی طور پر عورتوں پر خرچ ہوتی ہے جبکہ عورت کے ذمہ ایسی کوئی چیز نہیں۔ مرد کو چاہئے کہ وہ اپنی بیوی کی زندگی کے لوازمات اس کی ضرورت کے مطابق مکان لباس خوراک اور دیگر ضروریات زندگی مہیا کرے، چھوٹے بچوں کی زندگی کی ضروریات بھی مرد کے ذمہ ہیں جبکہ عورتوں کے ذمہ یہ لوازم نہیں ہیں یہاں تک کہ اپنی ضروریات زندگی بھی ان کے ذمہ نہیں ہیں اس وجہ سے ایک عورت یہ کر سکتی ہے کہ وہ اپنی تمام میراث کو اپنی بچت کے طور پر رکھے جبکہ مرد اپنے اور اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرنے کے لئے مجبور ہے اس کا عملی نتیجہ یہی نکلے گا کہ مرد کی آدھی آمدنی عورت پر اور آدھی اپنے پر خرچ ہوگی جبکہ عورت کا حصہ جوں کا توں باقی رہ جاتا ہے۔

ماں باپ کی میراث

باقی رہا ماں باپ کا ورثہ جو پہلے طبقہ کا حصہ ہیں اور ورثہ کے لحاظ سے اولاد کے برابر ہیں یعنی طبقہ اول سے تعلق رکھتے ہیں ان کی میراث وہی ہے جو مندرجہ بالا آیت میں آچکی ہے اس کی تین حالتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ مرنے والے کی ایک یا کئی بیٹے اور بیٹیاں ہوں تو اس صورت میں ماں باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔

دوسری یہ کہ مرنے والے کی کوئی اولاد نہ ہو اور ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں اس صورت میں ماں کا حصہ کل مال کا ایک تہائی ہے۔ یہاں باپ کے حصہ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے تو اس کی وجہ ہے کہ اس کا حصہ واضح ہے یعنی دو تہائی البتہ اگر مرنے والے کی بیوی ہو یا مرنے والے کا شوہر موجود ہو تو اس صورت میں بیوی یا شوہر کا حصہ باپ کے حصہ میں سے منہا ہو جائے گا یعنی اس صورت حال میں باپ کا حصہ دوسری شق میں تبدیل ہو جائے گا۔

تیسری یہ ہے کہ صرف ماں باپ وارث ہوں اولاد نہ ہو لیکن مرنے والے کے پدری مادری سگے بھائی یا صرف پدری سوتیلے بھائی موجود ہوں تو اس صورت میں ماں کا حصہ ایک تہائی کی بجائے چھٹا ہو جائے گا حقیقت میں اگرچہ بھائی میراث نہیں لیں گے لیکن اس صورت میں ماں اضافی مقدار نہ لے سکے گی اسی بنا پر انہیں حاجب کہتے ہیں۔

میراث وصیت اور قرض کے بعد ہے

اس کے بعد قرآن فرماتا ہے کہ وارث مال کو اپنے درمیان اس وقت تقسیم کر سکتے ہیں جبکہ مرنے والے نے وصیت نہ کی ہو اور نہ کسی کا قرض اس کے ذمہ ہو اگر وہ وصیت کر گیا ہے یا وہ کسی کا مقروض ہے تو پہلے وصیت کی تعمیل اور قرض کی ادائیگی ضروری ہے البتہ جیسا کہ باب وصیت میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ وصیت کرنے والا اپنے مال کے تہائی حصہ تک کی وصیت کر سکتا ہے اگر وہ اس سے زیادہ

مال کی وصیت کرے تو درست نہیں ہے ہاں البتہ وارث اجازت دے دیں تو صحیح ہے۔

خداوند عالم اس آیت میں فرماتا ہے تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے باپ دادا اور اولاد میں سے تمہارے لیے کون زیادہ مفید ہے یعنی قانون میراث نوع بشر کے حقیقی اور اصلی مصالح اور مفادات کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے اور ان مصلحتوں کی تشخیص خدا ہی کے ہاتھ میں ہے کیونکہ انسان ہر مقام پر اپنی بہتری کو سمجھنے سے قاصر ہے ہوسکتا ہے کہ بعض لوگ یہ گمان کریں کہ ماں باپ انسان کی بہت سی ضروریات کے ذمہ دار ہوتے ہیں اس لیے انہیں میراث میں اولاد پر مقدم ہونا چاہئے یہ بھی ممکن ہے کہ بعض لوگ اس کے برعکس سوچیں ان حالات میں اگر میراث کا قانون لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا تو اس میں طرح طرح کے اختلافات اور جھگڑے پیدا ہوتے لیکن خداوند عالم جو حقائق کو جس طرح کہ وہ ہیں بخوبی جانتا ہے اس نے قانون میراث کے مثبت نظام کو جس میں نوع بشر کی بھلائی ہے مقرر فرمایا۔

یہ ایک ایسا قانون ہے جو خدا تعالے کی طرف سے واجب ہے اور وہ دانا و حکیم ہے یہ جملہ گذشتہ مطالب کی تاکید کے لئے آیا ہے تا کہ لوگ میراث سے مربوط قوانین کے بارے میں کوئی اعتراض نہ کرسکیں۔

(۱۲) میراث میں میاں بیوی کا ایک دوسرے سے حصہ

گذشتہ آیت میں اولاد اور ماں باپ کے حصہ کی طرف اشارہ ہوا تھا یہاں میاں بیوی کے ایک دوسرے سے میراث لینے کی کیفیت کی وضاحت کی گئی ہے آیت کہتی ہے مرد صاحب اولاد نہ ہو تو اپنی بیوی کے مال میں سے آدھی میراث لے گا لیکن اگر اس کے ایک یا کئی بچے ہوں چاہے وہ کسی اور شوہر کے کیوں نہ ہوں تو پھر شوہر مال کا ایک چوتھائی حصہ لے گا۔

البتہ یہ تقسیم بھی بیوی کا قرض ادا کرنے اور اس کی مالی وصیتوں کو پورا کرنے کے بعد ہے جیسا کہ ارشاد قدرت ہے۔

رہی بیویوں کی میراث اپنے شوہر کے مال سے جبکہ شوہر کی کوئی اولاد نہ ہو تو پھر عورتوں کا آٹھواں حصہ ہوگا: لیکن اگر شوہر کی اولاد ہو (چاہے یہ کسی اور بیوی سے ہو) تو پھر عورتوں کا آٹھواں حصہ ہوگا۔

یہ تقسیم میراث بھی پہلی تقسیم کی طرح شوہر کے قرضوں کی ادائیگی اور مالی وصیت پوری کرنے کے بعد ہوگی۔

اب ہم آیت کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ اگر کوئی شخص دنیا سے اٹھ جائے اور بہن بھائی اس کی میراث لے لیں یا کوئی عورت دنیا سے چل بسے اور اس کا ایک بھائی اور ایک بہن زندہ ہو تو ان میں سے ہر ایک اس کے مال کا چھٹا حصہ لے گا۔

یہ اس صورت میں ہے جب کہ متوفی کا ایک بھائی یا بہن باقی رہ گئے ہوں اور اگر وہ ایک سے زیادہ ہوں تو پھر وہ کل مال کی ایک تہائی لیں گے یعنی ان کو چاہئے کہ ایک تہائی مال آپس میں بانٹ لیں۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے۔

یہ اس صورت میں ہے جبکہ وصیت پہلے پوری ہو چکی ہو اور قرض ادا کیا جا چکا ہو۔ یعنی اس حالت میں جبکہ وصیت اور قرض میں وارثوں کو نقصان پہنچنے کا کوئی پہلو نہ ہو مقصد یہ ہے کہ ایک تہائی سے زیادہ مال کی وصیت نہ کرے کیونکہ ان روایتوں کے مطابق جو

حضرت رسول اکرم ﷺ اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے مروی ہیں ایک تہائی سے زیادہ مال کی وصیت کرنا گویا وارثوں کو نقصان پہنچانا ہے ایسی وصیت کی تعمیل وارثوں کی اجازت سے ہوگی یا یہ کہ وارثوں کو محروم کرنے اور انہیں نقصان پہنچانے کے لئے مقروض نہ ہوتے ہوئے خواہ مخواہ قرض کی ادائیگی کا ذکر کر دیا جائے۔

آخر میں تاکید کے طور پر فرماتا ہے۔

یہ خدا کی وصیت اور نصیحت ہے اس کا احترام کرنا چاہئے کیونکہ وہ تمہاری بہتری کو خوب جانتا ہے جس نے یہ حکم مقرر کیے ہیں وہ وصیت کرنے والوں کی نیت سے بھی واقف ہے لیکن اس کے باوجود وہ بردبار بھی ہے چنانچہ ان لوگوں کو جو اس کے حکم کو نہیں مانتے فوراً سزا نہیں دیتا۔

(۱۳) تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ ؕ وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ یُدْخِلْہُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْہٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْہَا ؕ وَ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ	یہ خدا کی (مقرر کی ہوئی) سرحدیں ہیں جو شخص اللہ اور اسکے پیغمبر کی اطاعت کرے۔ وہ اسے ایسی جنت کے باغوں میں بھیجے گا جس کے درختوں کے نیچے پانی کی نہریں جاری رہتی ہیں اور یہ لوگ ہمیشہ کیلئے اس میں رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔
(۱۴) وَ مَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ وَ یَتَعَدَّ حُدُوْدَہٗ یُدْخِلْہُ نَارًا خَالِدًا فِیْہَا ۪ وَ لَہٗ عَذَابٌ مُّہِیْنٌ ؑ	اور جو کوئی خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی سرحدوں سے تجاوز کرے گا تو وہ اسے ایسی آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے ذلت آمیز سزا ہے۔

تفسیر

خداوند عالم ان چند خدائی حدود اور سرحدوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں اور ان سرحدوں کا احترام کرتے ہیں ہمیشہ ہمیشہ جنت کے باغوں میں رہیں گے جن کے درختوں کے نیچے سدا پانی بہتا رہتا ہے آیت کے آخر میں فرماتا ہے یہ بہت بڑی کامیابی وکامرانی ہے۔

(۱۴) زیر نظر دوسری آیت ان لوگوں کے مخالف نقطہ نظر کو بیان کرتی ہے جن کی طرف گذشتہ آیتوں میں اشارہ کیا جا چکا ہے ارشاد ہوتا ہے وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتے ہیں اور ان کے احکامات کی سرحدیں پھاند جاتے ہیں وہ ہمیشہ آگ میں رہیں گے۔

(۱۵) وَ الّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ فَاسۡتَشۡہِدُوۡا عَلَیۡہِنَّ اَرۡبَعَۃً مِّنۡکُمۡ ۚ فَاِنۡ شَہِدُوۡا فَاَمۡسِکُوۡہُنَّ فِی الۡبُیُوۡتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰہُنَّ الۡمَوۡتُ اَوۡ یَجۡعَلَ اللّٰہُ لَہُنَّ سَبِیۡلًا	اور تمہاری عورتوں میں سے جو زانی ہوں ان پر چار مسلمان مردوں کو گواہ کے طور پر طلب کرو اگر وہ گواہی دیں تو ان (عورتوں) کو (اپنے) گھروں میں بند کردو یہاں تک کہ وہ مر جائیں یا خدا ان کیلئے کوئی راستہ کھول دے۔
(۱۶) وَ الَّذٰنِ یَاۡتِیٰنِہَا مِنۡکُمۡ فَاٰذُوۡہُمَا ۚ فَاِنۡ تَابَا وَ اَصۡلَحَا فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡہُمَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا	اور وہ مرد اور عورتیں (جو شادی شدہ نہ ہوں) اور یہ برا کام کر بیٹھیں انہیں تکلیف پہنچاؤ (ان پر حد جاری کرو) اور اگر سچ مچ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کر لیں تو انہیں معاف کر دو کیونکہ خداوند عالم توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

مندرجہ بالا پہلی آیت زنائے محصنہ کی طرف اشارہ کرتی ہے اس قرینہ کے علاوہ جو آنے والی آیت میں ہے لفظ "مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ" (تمہاری بیویاں) بھی ہے کیونکہ یہ تعبیر قرآن مجید میں بار بار آئی ہے اسی وجہ سے شوہردار عورتوں کے عفت وعصمت کے منافی عمل کی سزا اس آیت میں عمر قید مقرر ہوئی ہے لیکن اس کے بعد یہ آیت فوراً بلا فاصلہ کہتی ہے: یا یہ کہ خدا ان کے لئے کوئی راستہ نکال دے یعنی ان کے لئے قید کی سزا جاری رہے یہاں تک کہ انہیں موت آ جائے یا یہ کہ کوئی نیا قانون خدا کی طرف سے ان کے لئے معین ہو۔

اس کے بعد خداوند عالم اس آیت میں غیر محصنہ (غیر شادی شدہ) سے سرزد ہونے والے زنا اور عفت کے منافی عمل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے اگر کنوارے مرد، عورت یہ برا کام کریں تو انہیں سزا دو۔ اگرچہ اس آیت میں زنائے غیر محصنہ کی صراحت نہیں ہے لیکن اس لحاظ سے کہ یہ گذشتہ آیت کے بعد آئی ہے اور زنا کی جس سزا کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے وہ اس سزا سے جدا اور الگ ہے جو گذشتہ آیت میں تھی اور اس سے ہلکی ہے بنا بریں اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حکم زنا کرنے والوں میں سے ایسے گروہ کے بارے میں ہے جو پہلی آیت میں داخل نہ تھا اور چونکہ گذشتہ آیت اس قرینہ سے جسکی طرف اشارہ کر چکے ہیں محصنہ کے زنا کے ساتھ مخصوص ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ آیت غیر محصنہ کے زنا کے بارے میں حکم بیان کر رہی ہے۔

یہ نکتہ بھی واضح ہے کہ اس آیت میں ذکر کی ہوئی سزا ایک کلی سزا ہے اور سورہ نور کی آیت ۲ میں جو حد زنا طرفین میں سے ہر ایک کے لئے سو کوڑے بیان کی گئی ہے، بہت ممکن ہے کہ وہ اس آیت کی تفسیر و توضیح ہو۔ اسی دلیل کی بناء پر یہ حکم منسوخ نہیں ہوا۔

خداوند عالم آیت کے آخر میں اس قسم کے گناہوں کے لیے توبہ اور بخشش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

اگر وہ واقعاً توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کر کے گذشتہ گناہوں کی تلافی کرلیں تو ان کی سزا سے صرف نظر اور چشم پوشی کرلو کیونکہ خداوندعالم توبہ قبول کرنیوالا اور مہربان ہے یہ حکم حقیقت میں اس قسم کے خطا کاروں کے لئے واپس آنے کی راہ کھولتا ہے کہ توبہ اور اصلاح کی صورت میں اسلامی معاشرہ فراخ دلی کے ساتھ دامن پھیلائے ہوئے انہیں قبول کر لیتا ہے اور اب وہ معاشرے کے دھتکارے ہوئے افراد بن کر نہیں رہتے۔

(۱۷)اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِيۡبٍ فَاُولٰٓئِکَ يَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا	توبہ صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو جہالت کی وجہ سے برا کام کرتے ہیں اور اس کے بعد جلدی سے توبہ کر لیتے ہیں خدا ایسے لوگوں کی توبہ قبول کر لیتا ہے اور وہ دانا وحکیم ہے۔
(۱۸)وَ لَيۡسَتِ التَّوۡبَةُ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ اِنِّىۡ تُبۡتُ الۡـٰٔنَ وَ لَا الَّذِيۡنَ يَمُوۡتُوۡنَ وَ هُمۡ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِکَ اَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا	اور برے کام کرنے والے لوگوں میں سے جب کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں یہ توبہ نہیں ہے اور نہ ان کے لئے جو حالت کفر میں دنیا سے اٹھ جاتے ہیں یہ ایسے لوگ ہیں جن کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تفسیر

قبولیت توبہ کے لئے شرطیں

گذشتہ آیت میں عفت اور پاک دامنی کے خلاف عمل کرنے والوں کو توبہ کے سبب سزا نہ ملنے کا مسئلہ تفصیل سے بیان ہو چکا ہے اور اسی سلسلے میں اس جملے کے ذریعے پروردگار کی طرف سے ان کی توبہ قبول ہونے کی طرف اشارہ بھی ہوا ہے۔

''خدا اپنے بندوں کی توبہ بہت قبول کرتا ہے اور ان پر رحم کرنے والا ہے''

خداوندعالم اس آیت میں وضاحت کے ساتھ مسئلہ توبہ اور اس کی کچھ شرطیں بیان کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ توبہ تو صرف ان کے لئے ہے جو جہالت کی وجہ سے گناہ کرتے ہیں۔

آیئے اب دیکھیں کہ جہالت کیا چیز ہے کیا یہ جہل ونادانی اور گناہ سے بے خبری ہے یا اس کے منحوس اثرات اور دردناک نتائج سے ناواقفیت کا نام ہے لفظ جہل اور اس کے مشتقات اگرچہ مختلف معانی کے لئے آئے ہیں لیکن قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زیر

بحث آیت میں خواہشات نفسانی کا تلاطم سرکش ہوا و ہوس کا غلبہ اور عقل و ایمان کی قوتوں پر ان کا تسلط مراد ہے اگر چہ اس حالت میں گناہ کی وجہ سے علم رخصت نہیں ہو جاتا لیکن وہ اغراض نفسانی سے دب کر عملی طور پر بے اثر ہو جاتا ہے اور جب علم اپنا اثر کھو بیٹھے تو وہ از روئے عمل جہل و نادانی کے برابر ہے اگر گناہ اس قسم کی جہالت کی وجہ سے نہ ہو بلکہ حکم پروردگار کے انکار اور دشمنی کی بنا پر ہو تو اس قسم کا گناہ کفر ہے اسی وجہ سے اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی مگر یہ کہ وہ اس روش کو چھوڑ دے اور عناد و انکار سے باز آ جائے۔

اس جملے میں توبہ کی ایک اور شرط کی طرف اشارہ ہے فرماتا ہے

ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ

یعنی وہ جلدی سے توبہ کر لیں

یعنی اپنے گناہ سے جلد از جلد پشیمان ہو اور خدا کی طرف لوٹ آئے کیونکہ مکمل توبہ وہ ہے جو گناہ کے آثار و نشانات کو روح و جسم سے بالکل دھوڈالے یہاں تک کہ گناہ کا کوئی اثر دل میں باقی نہ رہے اور یہ اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ انسان جلد از جلد اس سے پہلے کہ گناہ اس کے جسم میں جڑ پکڑے اور اس کی طبیعت ثانیہ بنے اس سے پچھتائے ورنہ بصورت دیگر زیادہ تر گناہوں کے اثرات انسان کے قلب و جان کے گوشوں میں باقی رہ جاتے ہیں پس مکمل توبہ وہ ہے جو گناہ کے فوراً بعد کی جائے قریب کا لفظ لغت اور عرف عام کی رو سے اسی معنی سے مناسبت رکھتا ہے۔

یہ درست ہے کہ ایک عرصہ گزرنے کے بعد بھی توبہ قبول ہو جاتی ہے لیکن وہ پوری توبہ نہیں ہے اور شاید علی اللہ (یعنی وہ توبہ جس کا قبول کرنا اللہ پر لازم ہے بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ یہ تعبیر قرآن کی صرف اسی آیت میں آئی ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس قسم کی توبہ قبول کرنا بندوں کے حقوق میں سے ہے جبکہ عرصہ دراز کی توبہ قبول کرنا تفضّل الٰہی ہے نہ کہ حق۔

خداوند عالم توبہ کی شرطوں کا ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے کہ خدا ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور وہ دانا و حکیم ہے۔

اس آیت میں ان افراد کی طرف اشارہ ہے جن کی توبہ قبول نہیں ہوتی، فرماتا ہے: وہ لوگ جو موت کی چوکھٹ پر پہنچ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب ہم گناہ سے توبہ کرتے ہیں ان کی توبہ قبول نہیں گی

دوسرا گروہ ان افراد کا ہے جن کی توبہ قبول نہ ہوگی یہ وہ ہیں جو کفر کی حالت میں مر جائیں خداوند عالم آیت بالا میں ان کے بارے میں فرماتا ہے۔

جو حالت کفر میں مر جاتے ہیں، ان کے لئے توبہ کا دروازہ بند ہے یہ حقیقت قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی واضح کی گئی ہے۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے: ہم نے ان دونوں گروہوں کے لئے دردناک عذاب تیار رکھا ہے۔

(۱۹) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَ لَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا

اے ایمان والو! تمہارے لیے حلال نہیں ہے کہ عورتوں سے سختی سے (اور انہیں تکلیف پہنچا کر) میراث لو اور جو کچھ (بطور حق مہر) انہیں دیا ہے اسے اپنی ملکیت بنانے کے لئے ان پر سختی نہ کرو مگر یہ کہ وہ کھلے بندوں برائی کریں۔ اور ان سے اچھا سلوک کرو اگرچہ تم ان سے کئی وجوہات کی وجہ سے نفرت وحقارت کرتے ہو (تو فورا علیحدگی کا پختہ ارادہ نہ کرو) کیونکہ اکثر اوقات تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور خدا اس میں بہت زیادہ نیکی قرار دیتا ہے۔

شان نزول

تفسیر مجمع البیان میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آیت ایسے افراد کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اپنی بیویوں کو اپنے پاس تو رکھتے تھے مگر ان سے بیویوں کا سا سلوک نہیں کرتے تھے اور اس انتظار میں رہتے تھے کہ کہ یہ مریں اور وہ ان کے مال پر قبضہ کریں۔

تفسیر

حقوق نسواں کا دفاع

ہم اس سورت کے شروع میں لکھ چکے ہیں کہ اس سورت کی آیتیں زمانہ جاہلیت کے بہت سے برے کاموں کے خلاف برسر پیکار ہیں چنانچہ زیر بحث آیت میں اس زمانہ کی چند بری عادتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ ان سے دور رہیں۔

1۔ عورتوں کو ان کے مال کی لالچ میں قیدی نہ بناؤ جیسا کہ شان نزول میں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں مردوں کی ایک ظالمانہ روش یہ تھی کہ وہ ان دولت مند عورتوں سے جو بدصورت ہوتی تھیں شادی کر لیتے پھر انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیتے تھے نہ انہیں طلاق دیتے اور نہ ہی ان سے بیوی کا سا برتاؤ کرتے اس امید پر کہ انہیں موت آ جائے تو ان کے مال پر قبضہ کر لیں آیہ مذکورہ بالا اعلان کرتی ہے کہ اے ایمان والو! تمہارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ عورتوں کی میراث انہیں تکلیف پہنچا کر زبردستی لے لو اس طرح سے قرآن نے مذکورہ کام کے خلاف فیصلہ دیا ہے۔

2۔ عورتوں سے مہر کا حق بخشوانے کے لئے سختیاں نہ کرو ان کی ایک بری عادت یہ تھی کہ وہ عورتوں کو طرح طرح سے ستاتے تھے تا کہ وہ حق مہر بخش دیں اور طلاق لے لیں خاص طور پر یہ معاملہ ایسے موقع پر ہوتا تھا جبکہ کسی عورت کو حق مہر زیادہ ہوا اس آیت نے اس کام سے منع فرمایا ہے "ولا تعضلوھن لتذھبوا ببعض ما اتیتموھن" یعنی ان پر اس لیے سختی نہ کرو کہ اس

طریقے سے جو حصہ تم نے انہیں دیا ہے اسے اپنی ملک بنا سکو لیکن اس کا ایک استثنائی حکم بھی ہے جس کی طرف "الا ان یاتین بفاحشہ مبینہ" کے ذریعے اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اگر وہ برے اور شرمناک کام کریں تو پھر شوہروں کو یہ حق حاصل ہے کہ ان پر سختی کریں تا کہ وہ اپنا حق مہر تمہارے لیے حلال کر کے طلاق لے لیں درحقیقت یہ ایک قسم کی سزا ہے جو بری عورتوں سے ان کے کرتوت کے بدلے تاوان لینے کی طرح ہے کیا آیت مذکورہ میں "فاحشتہ مبینة" واضح برائی سے مراد وہ برے کام ہیں جو عفت و پاکدامنی کے منافی ہیں یا اور کسی قسم کے سخت ناگوار اعمال ہیں مفسرین کے درمیان اس سلسلے میں ایک طولانی بحث ہے لیکن اس حدیث میں جو حضرت امام باقرؑ سے منقول ہے اس کی تشریح ہو چکی ہے کہ یہ عورت کی ہر طرح کی سخت مخالفت نافرمانی اور برے سلوک پر مشتمل ہے البتہ یہاں پر ہر چھوٹی بڑی مخالفت مراد نہیں ہے کیونکہ لفظ "فاحشة" میں اہمیت اور اس کا خلاف معمول ہونا مخفی ہے لفظ "مبینة" بھی اس کی تاکید کرتا ہے۔

3۔ ان کے ساتھ شائستہ اور مناسب طریقہ کے ساتھ زندگی بسر کرو "وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ" فرما کر عورتوں کے بارے میں شائستہ معاشرت اور مناسب انسانی سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے بعد مزید کہا گیا ہے۔

یہاں تک کہ اگر تم بعض وجوہات کی بنا پر اپنی بیویوں سے مکمل طور پر خوش نہیں ہو اور انہیں پسند نہیں کرتے ہو اور وہ تمہاری نظر میں کئی باتوں میں اچھی نہیں ہیں تو فوراً ان سے علیحدگی کا پختہ ارادہ یا ان سے برا سلوک نہ کرو بلکہ جہاں تک ہو سکے ان سے اچھا سلوک کرو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تمہاری رائے کا دارومدار شک وشبہ پر ہو اور جسے تم پسند نہیں کرتے خدا نے اسی میں بہت زیادہ خیر و برکت اور نفع رکھا ہو۔

(۲۰)وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنطَارًا فَلَاتَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا	اگر تمہارا یہ ارادہ ہو کہ اپنی بیوی کی جگہ دوسری بیوی کا انتخاب کرو اور تم اسے (حق مہر کے طور پر) بہت زیادہ مال دے چکے ہو تو اس میں سے کوئی چیز بھی واپس نہ لو کیا تم عورتوں سے مہر واپس لینے کے لئے تہمت اور کھلے گناہ کا سہارا لیتے ہو۔
(۲۱)وَ كَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَ قَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا	اور تم کس طرح اسے واپس لے سکتے ہو جبکہ ایک دوسرے کے ساتھ تعلق اور پورا پورا میل ملاپ رکھتے ہو (چھوڑنے کے باوجود) وہ تم سے شادی کے وقت مضبوط وعدہ لے چکی ہیں۔

شان نزول

اسلام سے پہلے یہ رسم تھی کہ اگر مرد چاہتے کہ پہلی بیوی کو طلاق دیں اور نئی شادی کریں تو حق مہر سے بچنے کے لئے اپنی بیوی پر عفت کے منافی تہمت لگاتے اور اس پر سختی کرتے تھے تا کہ وہ اس بات پر تیار ہو جائے کہ اپنا حق مہر جو عام طور پر پہلے ہی وصول ہو جاتا تھا واپس کر دے اور طلاق لے لے پھر وہی دوسری بیوی کو حق مہر مقرر کر دیتے تھے مندرجہ بالا آیت اس برے فعل سے بچنے کا حکم دیتے ہوئے اسے قابل مذمت قرار دیتی ہے۔

تفسیر

یہ آیت بھی عورتوں کے بعض حقوق کی حمایت میں نازل ہوئی ہے اور عام مسلمانوں کو حکم دیتی ہے کہ جب وہ پہلی بیوی سے علیحدگی اور نئی بیوی لانے کا ارادہ کریں تو انہیں یہ حق نہیں ہے کہ پہلی بیوی کے حق مہر میں کمی کریں یا اگر اسے ادا کر چکے ہیں تو اس سے واپس لے لیں قنطار کا معنی ہے بہت زیادہ مال و دولت چنانچہ راغب مفردات میں لکھتا ہے کہ قنطار کی اصل قنطرہ ہے جس کا معنی پل ہے اور چونکہ زیادہ مال بھی پل کی مانند ہے جس سے انسان زندگی بھر فائدہ اٹھاتا ہے اسی بنا پر اسے قنطار کہا گیا ہے یہاں گفتگو کی بنیاد یہ ہے کہ طلاق شوہر کے فائدے کے لئے دی جا رہی ہے نہ کہ عورت کے منافی عفت کاموں کی وجہ سے اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ عورتوں کا تسلیم شدہ حق پامال کیا جائے

اس کے بعد زمانہ جاہلیت کے اس طرز عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ وہ لوگ اپنی بیویوں پر بدکاری کی تہمت لگاتے تھے مزید فرماتا ہے کیا تم عورتوں کا حق مہر واپس لینے سے تہمت اور واضح گناہ کا ارتکاب کرنا چاہتے ہو یعنی ایک تو یہ ظلم ہے اور ایک بزدلانہ اور غلط کام ہے اور دوسرے کھلم کھلا گناہ ہے۔

(۲۱) اس آیت میں مردوں کے جذبہ محبت کو متحرک کرنے کے لئے نئے سرے سے استفہام انکاری سے کام لیتے ہوئے مزید ارشاد فرمایا گیا ہے تم اور تمہاری بیویاں مدتوں خلوت میں ایک دوسرے کے ساتھ رہے اور ایک روح دو قالب کی طرح آپس میں بھرپور میل ملاپ رکھتے رہے پھر کس طرح اس نزدیکی کے باوجود بیگانوں اور دشمنوں کی طرح ایک دوسرے سے برتاؤ کرتے ہو اور ان کے مانے ہوئے حقوق کو پامال کر رہے ہو۔ اس کے بعد فرماتا ہے اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ تمہاری بیویوں نے شادی کے وقت تم سے پختہ عہد و پیمان لیا ہوا ہے تم اب کس طرح اس مقدس اور مضبوط عہد کو ٹھکرا سکتے ہو اور واضح عہد شکنی کی طرف قدم بڑھا سکتے ہو۔

(۲۲) وَ لَا تَنۡكِحُوۡا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقۡتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيۡلًا ۬	اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں مگر وہ ہو چکا ہے (اس حکم کے نازل ہونے سے پہلے) کیونکہ یہ کام برا باعث نفرت اور غلط ہے۔

شان نزول

زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی شخص فوت ہو جاتا اور اپنے پیچھے بیوی بچے چھوڑ جاتا تو اگر وہ بیوی اس کے بیٹوں کی سگی ماں نہ ہوتی تو وہ بیٹے اسے مال کی طرح اپنی میراث بنا لیتے اور اس طرح وہ یہ حق سمجھتے کہ اپنی سوتیلی ماں سے خود شادی کر لیں یا اس کی کسی اور سے شادی کر دیں ظہور اسلام کے بعد ایک مسلمان کے بارے میں ایک حادثہ پیش آیا وہ یہ کہ ابوقیس نامی ایک انصاری فوت ہو گیا اس کے بیٹے نے اپنی سوتیلی ماں سے شادی کرنا چاہی تو اس عورت نے کہا میں تجھے اپنا بیٹا سمجھتی ہوں اس لیے یہ کام مناسب نہیں سمجھتی اس کے باوجود حضرت رسول اکرم ﷺ سے اپنی شرعی ذمہ داری معلوم کر لیتی ہوں اس کے بعد اس عورت نے یہ بات حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کی اس پر آیت مذکورہ بالا نازل ہوئی اور اس کام سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا۔

تفسیر

جیسا کہ ہم شانِ نزول میں اشارہ کر چکے ہیں کہ اس آیت نے زمانہ جاہلیت کے ایک نہایت مکروہ اور ناپسندیدہ فعل پر خط بطلان کھینچ دیا اور فرمایا: ان عورتوں کے ساتھ کہ جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں نکاح نہ کرو لیکن کیونکہ عام طور پر کوئی قانون گذشتہ امور پر حاوی نہیں ہوتا اس لیے مزید فرمایا: مگر وہ شادیاں جو اس سے پہلے ہو چکی ہیں۔

اس کے بعد تین سخت برائیاں اس قسم کی شادی کے بارے میں بیان فرمائیں پہلی یہ کہ ارشاد ہوتا ہے یہ بہت برا کام ہے۔اس کے بعد مزید فرماتا ہے یہ عمل ایسا ہے جو لوگوں کی نظروں میں نفرت کا سبب ہے یعنی انسان کی فطرت اسے پسند نہیں کرتی ۔اور آخر میں فرماتا ہے یہ غلط طریقہ ہے۔ یہاں تک کہ تاریخ میں ہے کہ زمانہ جاہلیت کے لوگ بھی اس قسم کی شادی کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے اور جو بچے اس سے پیدا ہوتے تھے انہیں "مقیت" (قابل نفرت اولاد) کے نام سے پکارتے تھے۔

(۲۳) حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَ اَخَوَاتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَ خَالٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوَاتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۫ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ ۫ وَ حَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۙ	تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں' تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، تمہاری خالائیں، تمہاری بھتیجیاں، تمہاری بھانجیاں اور وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے، تمہاری رضاعی بہنیں، تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری بیویوں کی وہ بیٹیاں جنہوں نے تمہاری گود میں پرورش پائی ہو اور جو اُن بیویوں سے ہیں جن کے ساتھ تمہاری جنسی آمیزش رہی ہے اور اگر ان سے جنسی آمیزش نہیں رہی تو ان کی بیٹیاں تمہارے لیے ممنوع نہیں ہیں (اسی طرح) تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری نسل سے ہیں (نہ کہ منہ بولے بیٹے) نیز (تم پر حرام ہے) یہ کہ دو بہنوں کو جمع کرو مگر وہ جو گذشتہ زمانے میں ہو چکا ہے خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

محارم سے نکاح کی حرمت

اس آیت میں محارم (وہ عورتیں جن سے رشتۂ زوجیت منع ہے) کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ممکن ہے کہ اس آیت کی بنیاد پر تین طریقوں سے محرمیت پیدا ہو۔

1۔ولادت: جسے نسبی تعلق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

2۔طریق ازدواج سے: جسے سببی ارتباط کہتے ہیں۔

3۔رضاعت (دودھ پلانے) سے: جسے ارتباط رضاعی بولتے ہیں۔

سب سے پہلے نسبی محارم کی طرف جو سات طرح کے ہیں، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

''تمہاری مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں، بھتیجیاں اور بھانجیاں تم پر حرام کر دی گئی ہیں''۔

یاد رکھئے کہ ماں سے مراد وہ عورت نہیں ہے جس سے انسان بلاواسطہ پیدا ہوا ہو بلکہ دادی، پردادی اور باپ کی ماں اور اسی قسم کی دوسری عورتیں مراد ہیں جس طرح بیٹی سے مراد صرف بلاواسطہ بیٹی نہیں ہے بلکہ بیٹی، پوتی، نواسی اور ان کی اولاد بھی ہے اسی طرح دوسرے پانچ مواقع پر بھی ایسا ہی ہے

اس کے بعد رضائی محارم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

''اور تمہاری وہ مائیں جو تمہیں دودھ پلاتی ہیں اور تمہاری رضاعی بہنیں تم پر حرام ہیں''

اگرچہ قرآن نے آیت کے اس حصے میں صرف دو گروہوں یعنی رضاعی بہنوں اور ماؤں کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن بے شمار موجود روایات کی بنا پر رضاعی محارم انہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ مشہور حدیث کے مطابق جو پیغمبر اکرم ﷺ سے منقول ہے:

یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب

یعنی تمام افراد جو نسبی رشتہ کے لحاظ سے حرام ہیں وہ رضاعت (دودھ پلائی) کی رو سے بھی حرام ہیں

البتہ دودھ پلانے کی مقدار جو محرمیت پر اثر ڈالتی ہے یہ اور اس طرح کی دیگر شرائط کی تفصیل فقہی کتب میں موجود ہے۔

محارم رضاعی کی حرمت کا فلسفہ

آخر میں محارم کے تیسرے گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں چند عنوانات کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

1۔''اُمَّھٰتُکُمْ''......

اور تمہاری بیویوں کی مائیں۔یعنی صرف اتنی سی بات کہ ایک عورت کسی شخص کے نکاح میں آ جائے اور صیغہ نکاح جاری ہو جائے تو اس عورت کی ماں اور اس کی ماں کی ماں اور اس طرح کے سب رشتے اس پر حرام ابدی ہو جائیں گے۔

2۔'' وَرَبَآئِبُکُمُ الّٰتِیۡ فِیۡ حُجُوۡرِکُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِکُمُ الّٰتِیۡ دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ ''......

اور تمہاری بیویوں کی وہ بیٹیاں جو تمہاری گود میں ہیں بشرطیکہ اس بیوی کے ساتھ ہم بستری کر چکے ہو یعنی ایک عورت سے صرف عقد شرعی کرنے سے اس کی وہ لڑکیاں جو دوسرے شوہر سے ہیں اس شخص پر حرام نہیں ہوتیں بلکہ ان کی حرمت کے لئے یہ شرط ہے کہ عقد شرعی کے علاوہ اس عورت سے مباشرت بھی کرے

آیت کے اس حصہ کے بعد مطلب کی تاکید کے طور پر مزید فرماتا ہے کہ اگر ان سے جنسی آمیزش نہیں رکھتے تو پھر ان کی

بیٹیاں تم پر حرام نہیں ہیں۔

3۔ ''وَ حَلَآئِلُ اَبۡنَآئِکُمُ الَّذِیۡنَ مِنۡ اَصۡلَابِکُمۡ''......

یعنی......اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری صلب و نسل سے ہیں حقیقت میں من اصلابکم یعنی وہ بیٹے جو تمہاری نسل سے ہیں اس وجہ سے ہے کہ زمانہ جاہلیت کی ایک غلط رسم پر خط بطلان کھینچا جائے کیونکہ اس زمانے میں معمول تھا کہ کچھ افراد کو اپنا بیٹا بنا لیتے تھے یعنی جو کسی اور کا بیٹا ہوتا اسے اپنے بیٹے کے نام سے پکارتے تھے اور منہ بولے بیٹے پر حقیقی بیٹے کے تمام احکام وقانون لاگو ہوتے تھے اور اسی وجہ سے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے شادی نہیں کرتے تھے اسلام میں منہ بولا بیٹا اور اس کے سب احکام کلی طور پر کوئی بنیاد نہیں رکھتے۔

4۔ ''وَ اَنۡ تَجۡمَعُوۡا بَیۡنَ الۡاُخۡتَیۡنِ''

اور تم پر دو بہنوں کا جمع کرنا منع ہے یعنی تم ایک ہی وقت میں دو بہنوں کے ساتھ شادی نہیں کر سکتے ہاں اگر دو بہنوں یا زیادہ کے ساتھ مختلف زمانوں میں یا پہلی بہن سے علیحدگی کے بعد دوسری سے شادی کی جائے تو کوئی ہرج نہیں چونکہ زمانہ جاہلیت میں دو بہنوں کو اکٹھا رکھنے کا رواج تھا اور کئی لوگ ایسی شادیاں کر چکے تھے اس لیے قرآن مندرجہ بالا جملہ کے بعد کہتا ہے:

''اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ''

یعنی اس حکم کا دوسرے احکام کی طرح گذشتہ شادیوں پر اثر نہیں پڑے گا یعنی جو لوگ اس قانون سے پہلے اس قسم کی شادیاں کر چکے ہیں ان کے لئے کوئی عذاب اور سزا نہیں ہے اگر چہ اس وقت ان میں سے صرف ایک کو چننا اور دوسری کو چھوڑنا پڑے گا۔

آیت کا آخری جملہ یعنی ''اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا'' بھی اس مفہوم سے مطابقت اور مناسبت رکھتا ہے۔

(۲۴) وَّ الۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ۚ کِتٰبَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ ۚ وَ اُحِلَّ لَکُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمۡ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا بِاَمۡوَالِکُمۡ مُّحۡصِنِیۡنَ غَیۡرَ مُسٰفِحِیۡنَ ؕ فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِہٖ مِنۡہُنَّ فَاٰتُوۡہُنَّ اُجُوۡرَہُنَّ فَرِیۡضَۃً ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ فِیۡمَا تَرٰضَیۡتُمۡ بِہٖ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡفَرِیۡضَۃِ ؕ	اور شوہر دار عورتیں (تم پر حرام ہیں) مگر وہ کہ جن کے تم مالک بن گئے ہو یہ ایسے احکام ہیں جو خدا نے تم پر مقرر کیے ہیں ان (مذکورہ) عورتوں کے علاوہ باقی عورتیں تم پر حلال ہیں اور جنہیں اپنے مال کے ذریعے اپناؤ بشرطیکہ تم پاک دامن رہو اور زنا سے بچو اور جن عورتوں سے متعہ کرو تو ان کا حق مہر جو تم پر واجب ہے ادا کرو اور تم پر اس کی نسبت کوئی گناہ نہیں جس پر ایک دوسرے کے ساتھ مہر مقرر کر کے موافقت کر لو

اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا	یقیناً خدادانا وحکیم ہے۔

تفسیر

یہ آیت گذشتہ آیت کی بحث کا ضمیمہ ہے جوان عورتوں کے متعلق ہے جن سے شادی کرنا حرام ہے یہ آیت مزید خبردار کرتی ہے کہ سہاگنوں کے ساتھ شادی اور مباشرت حرام ہے۔

اس حکم میں جو استثنا ہے وہ صرف ان غیر مسلم عورتوں کے بارے میں ہے جو جنگ میں مسلمانوں کی قیدی ہو جائیں۔اسلام کی نظر میں قید ہوتے ہی ان کا اپنے شوہروں سے کوئی تعلق نہیں رہتا اور وہ ایک طرح سے طلاق یافتہ ہو جاتی ہیں اسلام اجازت دیتا ہے کہ مدت عدت (ان کی عدت کی مقدار ایک بار ماہواری دیکھنا ہے اور اگر وہ حاملہ ہوں تو وضع حمل ہے) ختم ہو جانے کے بعد ان سے شادی کر لی جائے یا ان سے ایک کنیز کا سا سلوک کیا جائے۔لیکن یہ وہ استثناء ہے جسے اصطلاح میں استثنائے منقطع کہتے ہیں یعنی ایسی شوہر دار عورتیں جو مسلمانوں کی قید میں آ جائیں قید ہوتے ہی ان کا رابطہ ان کے شوہر سے منقطع ہو جاتا ہے بالکل اس غیر مسلم عورت کی طرح جس کا اسلام لانے کے بعد اپنے پہلے شوہر سے اگر وہ اسلام نہ لائے تو کوئی تعلق باقی نہیں رہتا اور وہ بے شوہر عورتوں کی صفت میں آ جاتی ہے۔

''کِتٰبَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ''

خدا تعالیٰ اس جملے میں ان گذشتہ احکامات کی تاکید کے طور پر جو محارم اور ان کی سی عورتوں کے بارے میں آئے ہیں، فرماتا ہے: یہ ایسے امور ہیں جنہیں خدا نے تمہارے لیے لکھا ہے اور مقرر کر دیا ہے اس لیے کسی صورت میں بھی ان میں کوئی تبدیلی اور کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد فرماتا ہے کہ ان چند قسموں کی عورتوں کے علاوہ جو اس آیت اور گذشتہ آیتوں میں بیان کی گئی ہیں باقی عورتوں سے اس شرط پر شادی بیاہ کر سکتے ہو کہ وہ ازدواج اسلامی قانون کے مطابق عفت و پاکدامنی سے وابستہ ہو اور بدچلنی اور بے حیائی سے دور ہو۔

''اَنۡ تَبۡتَغُوۡا بِاَمۡوَالِکُمۡ'' اس طرف اشارہ ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات یا تو حق مہر ادا کر کے ازدواجی شکل میں ہوں یا کنیز کا مالک ہونے کی صورت میں اس کی قیمت ادا کرنے کے بعد۔

اسلام میں وقتی شادی

آیت کے اس حصے میں وقتی شادی کی طرف اشارہ ہے جسے اصطلاح میں متعہ کہتے ہیں ارشاد رب العزت ہے: تم جن عورتوں کے ساتھ متعہ کرتے ہو ان کا حق مہر ایک حق واجب کے طور پر ادا کرو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ازدواج موقت کی اصل تشریح اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے ہی مسلمانوں میں تسلیم شدہ تھی۔

نکاح موقت ایک اجتماعی ضرورت ہے

یہ ایک کلی اور عمومی قانون ہے کہ اگر انسان کی نفسانی خواہشات کی تسکین کا صحیح طور پر خیال نہ رکھا جائے تو وہ اپنی پیاس بجھانے کے لئے غلط راستے اختیار کرے گا کیونکہ یہ حقیقت مسلّم ہے کہ خواہشات نفسانی کو کسی صورت میں ختم نہیں کیا جا سکتا اور بالفرض اگر ختم بھی کر دیا جائے تو یہ اقدام نا مناسب ہوگا کیونکہ یہ کارروائی قانون فطرت کے خلاف جنگ ہے اس بنا پر صحیح راستہ یہی ہے کہ اس کی تشنگی دور کرنے کا معقول انتظام کیا جائے اور اس کے لئے اصلاحی طریقہ اختیار کیا جائے اس بات کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جنسی خواہش انسان کی زبردست خواہشات اور طبائق میں سے ہے یہاں تک کہ بعض ماہرین نفسیات اسی کو فطرت وسرشت انسانی سمجھتے ہیں اور باقی تمام خواہشات کو اس کے ماتحت قرار دیتے ہیں۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بہت سے مقامات اور معاشروں میں ایسے لوگ بے شمار ہیں جو نکاح دائمی کی استطاعت و قدرت نہیں رکھتے یا کبھی شادی شدہ افراد طویل سفر یا ایسے فرائض پر مامور ہوتے ہیں جہاں وہ اپنی جنسی خواہشات کی تسکین کا کوئی بندوبست نہیں کر سکتے خصوصاً اس زمانے میں جبکہ شادی حصول علم اور معاشرے کے پیچیدہ مسائل کی وجہ سے بہت دیر میں ہوتی ہے اور بہت کم نوجوان ایسے ہوتے ہیں جو سن بلوغت کو پہنچتے ہی جو جنسی خواہشات کے شباب کا زمانہ ہے شادی کر سکتے ہوں یہ امر اُن دنوں خطرناک ترین صورت اختیار کر چکا ہے تو ایسے حالات میں کیا کرنا چاہئے۔

کیا اس صورت میں لوگوں کو (راہبوں اور راہباؤں کی طرح) خواہشات نفسانی کچلنے کی طرف مائل کیا جائے یا انہیں جنسی بے راہروی کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے اور موجودہ تباہ کن اور بے شرمی بے حیائی کی عام اجازت دے دی جائے یا یہ کہ تیسرا راستہ اختیار کیا جائے جس میں نہ نکاح دائمی کا سا بوجھ ہو اور نہ وہ جنسی بے راہروی ہو خلاصہ یہ ہے کہ نکاح دائمی گذشتہ زمانے میں اور موجودہ زمانے میں بھی تمام طبقات کی جنسی ضروریات کا کفیل اور متحمل نہیں ہو سکتا اب ہم دوراہے پر کھڑے ہیں یا تو فحشا ومنکر کو جائز قرار دیں۔ جیسا کہ آج کی مادی دنیا عملی طور پر اسے درست سمجھتی ہے اور اسے قانونی طور پر قبول کرتی ہے) اور یا یہ کہ نکاح موقت کو قبول کر لیں۔

معلوم نہیں کہ جو لوگ متعہ کے بھی فحشا ومنکر کی طرح مخالف ہیں، انہوں نے اس سوال کا کیا جواب سوچا ہے۔ نکاح موقت کے نصب العین میں نہ تو نکاح دائمی کی سی سخت شرطیں ہیں اور نہ ہی یہ خطرناک جنسی برائیوں اور نقصانات کا حامل ہے اسے لیے یہ معقول مالی استطاعت نہ رکھنے والوں تعلیمی اور دیگر مشاغل میں مصروف افراد کے لئے مناسب ہو سکتا ہے۔

آیت کے آخر میں یہ ذکر کرنے کے بعد کہ حق مہر کی ادائیگی ضروری ہے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اگر طرفین عقد ایک دوسرے کی رضامندی کے ساتھ حق مہر کی مقدار میں کمی بیشی کریں تو کوئی ہرج نہیں ہے اس لیے کہ مہر ایک ایسا قرض ہے جو طرفین کی مرضی سے تبدیل ہو سکتا ہے اس سلسلے میں عقد موقت ودائمی میں کوئی فرق نہیں ہے اگرچہ ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ یہ آیت نکاح موقت کے بارے میں ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک اور بھی احتمال ہے اور وہ یہ کہ اس میں کوئی مانع نہیں کہ نکاح موقت کے ختم ہونے پر طرفین مدت نکاح اور اسطرح حق مہر کے اضافے کے متعلق آپس میں موافقت کر لیں نکاح موقت مدت مقررہ ختم ہونے سے پہلے بھی قابل تجدید ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ طے کر لیتے ہیں کہ معین شدہ مدت نکاح اور مقررہ حق مہر دونوں میں بقدر ضرورت اضافہ کر دیا جائے روایات اہل بیت علیہم السلام میں بھی اس تفسیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

جن احکام کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے وہ ایسے ہیں جو نوع بشر کے لئے خیر و سعادت کے حامل ہیں کیونکہ پروردگار عالم بندوں کے مصالح سے آگاہ اور اجرا قانون میں حکیم ہے۔

(۲۵)وَ مَنۡ لَّمۡ یَسۡتَطِعۡ مِنۡکُمۡ طَوۡلًا اَنۡ یَّنۡکِحَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ فَمِنۡ مَّا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ مِّنۡ فَتَیٰتِکُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِاِیۡمَانِکُمۡ ؕ بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ فَانۡکِحُوۡہُنَّ بِاِذۡنِ اَہۡلِہِنَّ وَ اٰتُوۡہُنَّ اُجُوۡرَہُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ مُحۡصَنٰتٍ غَیۡرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخۡدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحۡصِنَّ فَاِنۡ اَتَیۡنَ بِفَاحِشَۃٍ فَعَلَیۡہِنَّ نِصۡفُ مَا عَلَی الۡمُحۡصَنٰتِ مِنَ الۡعَذَابِ ؕ ذٰلِکَ لِمَنۡ خَشِیَ الۡعَنَتَ مِنۡکُمۡ ؕ وَ اَنۡ تَصۡبِرُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۲۵﴾	اور جو لوگ (آزاد) پاک دامن عورتوں سے نکاہ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے وہ کنیزوں میں سے پاک دامن ایماندار عورتوں سے جو ان کی ملکیت میں ہیں نکاح کریں خدا تمہارے ایمان سے آگاہ ہے اور تم سب ایک ہی پیکر کے مختلف اجزا ہو اور ان (کنیزوں) سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کرو لیکن ان کا حق مہر ان ہی کو اس شرط کے ساتھ دو کہ وہ پاک دامن رہیں نہ یہ کہ وہ کھلے بندوں زنا کرتی پھریں اور نہ ڈھکے چھپے یار بنائیں اور جب وہ سہاگن ہوں اور پھر عفت کے منافی کام کریں تو ان کے لئے آزاد عورتوں سے آدھی سزا ہوگی (کنیزوں سے نکاح کرنے کی) یہ اجازت صرف ان لوگوں کے لئے ہے (جو جنسی تقاضوں کے حوالے سے) سخت تنگ ہوں اگر صبر و تحمل سے کام لو تو تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر

کنیزوں سے نکاح

گذشتہ آیات میں نکاح کے متعلق مباحث کے بعد یہ آیت کنیزوں سے نکاح کرنے کی شرطیں بیان کرتی ہیں سب سے پہلے کہتی ہے: جو لوگ آزاد عورتوں سے نکاح کرنے کے لئے مالی قدرت نہیں رکھتے وہ کنیزوں سے نکاح کر سکتے ہیں جن کا حق مہر اور

عام طور پر باقی مصارف ان کی نسبت زیادہ سہل اور آسان ہوتے ہیں البتہ کنیزوں سے نکاح سے مراد یہ نہیں ہے کہ کنیز کا مالک اپنی کنیز سے نکاح کرے کیونکہ وہ تو ان شرطوں کے مطابق جو فقہ کی کتابوں میں ہیں اپنی کنیز کو ایک بیوی کی طرح رکھ سکتا ہے بنابریں اس سے مراد مالک کے علاوہ دیگر افراد کا کسی کنیز سے نکاح کرنا ہے۔

ضمنی طور پر لفظ ''مومنات'' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کنیز کا یقینی طور پر مسلمان ہونا ضروری ہے تا کہ اس سے نکاح کر سکے اس بنا پر اہل کتاب کنیزوں سے نکاح نہیں کرسکتا۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن ان کنیزوں کے لئے ''فتیات'' کا لفظ استعمال کرتا ہے ''فتیات'' جمع ہے اور عام طور پر یہ لفظ قابل احترام عورتوں اور زیادہ تر نوجوان لڑکیوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

''وَ اللّٰہُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِکُمْ'' کا جملہ بتاتا ہے کہ تم ان کے ایمان کی تشخیص کے لئے ان کی ظاہری حالات اور اعتقاد کے پابند ہو۔ باقی رہا ان کا باطن اور ان کے دل کے بھید تو خدا تمہارے ایمان وعقیدہ سے زیادہ آگاہ ہے۔

چونکہ بعض لوگ کنیزوں سے نکاح کرنا پسند نہیں کرتے تھے اس لیے قرآن فرماتا ہے کہ تم سب ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئے ہو اور تم ایک دوسرے سے ہو اس بنا پر تمہیں کنیزوں سے نکاح کرنے میں کراہت نہیں کرنا چاہئے جو انسانی نقطہ نظر سے مختلف نہیں ہیں اور معنوی قدر و قیمت کی رو سے بھی دوسروں کی طرح ان کی قدر و منزلت تقویٰ و پرہیزگاری سے وابستہ ہے اور تم ایک ہی جسم کے مختلف اعضا ہو۔

لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ نکاح مالک کی اجازت سے ہو کیونکہ یہ اس کی اجازت کے بغیر باطل ہے اور مالک کو اہل سے تعبیر کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مالکوں کو چاہئے کہ وہ کنیزوں کے ساتھ جنس تجارت اور مال و دولت کا سا سلوک نہ کریں بلکہ ایک خاندان کے سرپرست کی طرح ان کے ساتھ اولاد اور اہل وعیال جیسا مکمل انسانی برتاؤ کریں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لئے مناسب حق مہر مقرر کیا جائے اور وہ خود ان ہی کو دیا جائے یعنی مہر کی مالک خود لونڈیاں ہوں گی۔

اس نکاح کی ایک اور شرط یہ ہے کہ ایسی کنیزوں کا انتخاب کیا جائے جو منافی عفت و پاک دامنی کوئی حرکت ظاہر بظاہر یا ڈھکے چھپے یار بنا کر نہ کریں۔

ممکن ہے اس موقع پر یہ سوال پیدا ہو کہ ''غَیْرَ مُسَافِحَاتٍ'' کی تعبیر کے ذریعے زنا سے منع کرنے کے بعد پوشیدہ دوست بنانے سے منع کرنے کی ضرورت نہ تھی لیکن اس امر کے پیش نظر کہ زمانہ جاہلیت میں بعض لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ صرف کھلے بندوں زنا برا فعل ہے لیکن ڈھکے چھپے یاری لگا کر یہ کارروائی بری نہیں ہے اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن نے ہر دو قسم کی وضاحت کیوں فرمائی ہے۔

''فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَۃٍ فَعَلَیْھِنَّ نِصْفُ مَا عَلَی الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ''

اس جملے میں ان احکام کی مناسبت سے جو کنیزوں کے ساتھ شادی کرنے اور ان کے حقوق کی حمایت کے بارے میں ہیں

درمیان میں ان کی سزا کے بارے میں بھی بحث آ گئی ہے اور وہ یہ کہ جب وہ پاکدامنی اور عفت کی راہ سے ہٹیں اور بدکاری کریں تو
آزادعورتوں میں ان کی سزا کے بارے میں بھی بحث آ گئی ہے اور وہ یہ کہ جب وہ پاکدامنی اور عفت کی راہ سے ہٹیں اور بدکاری کریں
تو آزادعورتوں کی نسبت انہیں آدھی سزادی جائے یعنی انہیں پچاس کوڑے مارے جائیں۔

''ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ مِنکُمْ''

اسی لیے''عنت'' کا لفظ روح فرسا مشکلوں اور دکھ تکلیف پہنچانے والے کاموں کے لئے استعمال ہوتا ہے قرآن مجید مندرجہ بالا جملے میں فرماتا ہے کنیزوں کیساتھ شادی ان لوگوں کے لئے ہے جو جنسی خواہش کی وجہ سے بہت تنگ ہوں اور آزادعورتوں سے شادی کرنے کی استطاعت بھی نہ رکھتے ہوں اس بنا پر اس قسم کی شادی دوسرے افراد کے لئے جائز نہیں ہے۔

جہاں تک تمہاری طاقت میں ہو کہ تمہارا دامن گناہ سے آلودہ نہ ہو اپنے آپ کو کنیزوں کے ساتھ شادی بیاہ سے بچانا فائدہ مند ہے۔

اور خدا ان برے کاموں کو جو تم گزرے ہوئے زمانے میں جہالت اور بے خبری کی وجہ سے کرتے رہے ہو بخشنے والا اور مہربان ہے۔

(۲۶)یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُبَیِّنَ لَکُمْ وَ یَھْدِیَکُمْ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَ یَتُوْبَ عَلَیْکُمْ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ	خدا چاہتا ہے کہ (نیکی اور خوش قسمتی کی راہیں) تمہارے لیے واضح کرے اور گزرے ہوئے لوگوں کے صحیح طریقوں اور سنتوں کی طرف تمہاری ہدایت و رہبری کرے اور تمہیں گناہوں سے پاک کرے اور خدا دانا و حکیم ہے۔
(۲۷)وَ اللّٰہُ یُرِیْدُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْکُمْ ۫ وَ یُرِیْدُ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الشَّھَوٰتِ اَنْ تَمِیْلُوْا مَیْلًا عَظِیْمًا	اور خدا چاہتا ہے کہ تمہیں بخش دے لیکن جو لوگ شہوت کے غلام ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم بالکل منحرف ہو جاؤ
(۲۸)یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْکُمْ ۚ وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا	خدا چاہتا ہے کنیزوں سے نکاح اور اسی قسم کے دوسرے احکامات کے ذریعے تمہارے لیے کام کو آسان کر دے اور انسان کمزور پیدا ہوا ہے۔

تفسیر

نکاح سے متعلق پابندیاں کس بنا پر ہیں

ان شروط و قیود اور مختلف احکام کے بعد جو گذشتہ آیتوں میں نکاح کے متعلق اشارہ بیان ہوئے ہیں ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں

کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ ان تمام قانونی قیدو بند اور حدود کا کیا مقصد ہے۔ مندرجہ بالا آیت حقیقت میں ان سوالات کا جواب دیتے ہوئے بتاتی ہیں کہ خدا چاہتا ہے کہ ان مقررات اور احکام کے ذریعے تمہارے لیے حقائق واضح کرے اور تمہاری رہبری ایسے راستوں کی طرف کرے جن میں تمہارے لیے فائدہ ہی فائدہ ہے اور دیکھو تمہارے لیے ہی یہ پروگرام نہیں ہے بلکہ گذشتہ پاکیزہ قومیں بھی اس قسم کی سنتیں (قواعد وضوابط) رکھتی تھیں علاوہ ازیں خدا چاہتا ہے کہ تمہیں بخش دے اور اس کی وہ نعمتیں جو تمہاری غلطیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے تم پر بند ہوگئی ہیں دوبارہ تمہیں عنایت فرمائے اور یہ اس صورت میں ہے کہ قبل از اسلام زمانہ جاہلیت میں نافرمانی کے جو راستے تم نے اختیار کرر کھے تھے ان سے پلٹ آؤ۔

خدا اپنے احکام کے اسرار ورموز کو جانتا ہے اس نے اپنی حکمت سے تمہارے لیے احکام کو نافذ کیا ہے۔

(۲۷) از سرنو تاکید کرتا ہے کہ خداوند عالم ان احکام کے ذریعے یہ چاہتا ہے کہ وہ نعمتیں اور برکتیں جو تمہاری شہوتوں میں آلودہ ہونے کی وجہ سے تم سے چھن گئی تھیں ان سے دوبارہ تمہیں نوازے لیکن وہ شہوت پرست جو گناہوں کی موجوں میں غرق ہیں یہ چاہتے ہیں کہ تم نیکی کے راستے سے بالکل منہ موڑ لو اور ان کی طرح سر سے لے کر پاؤں تک گناہوں میں ڈوب جاؤ اب تم خود فیصلہ کرلو کہ وہ پابندیاں جو تمہاری نیکی اور بلندی درجات کے لئے ہیں تمہارے لیے بہتر ہیں یا یہ آزادی اور شتر بے مہار ہونا جس میں شکست تنزل اور بدبختی ہے۔

یہ آیات حقیقت میں ان افراد کو جو ہمارے زمانے میں بھی دینی قوانین خصوصا جنسی مسائل کے سلسلے میں اعتراضات کرتے ہیں جواب دیتی ہیں کہ ان بے قیدو بند آزادیوں کی حقیقت سراب کی سی ہے اور ان کا نتیجہ انسانیت کی تکمیل وترقی، کامیابی اور خوش بختی کی راہ سے روگردانی، بے راہروی میں گرفتاری اور ہلاکت کے گڑھوں میں گرنے کے مترادف ہے جن کے بہت سے نمونے ہم اپنی آنکھوں سے خاندانوں کی تباہی مختلف قسم کے جنسی جرائم ناجائز اولاد جنسی بیماریوں اور نفسیاتی پریشانیوں کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔

(۲۸) یہ آیت اس نکتے کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ پہلا حکم مقررہ شرطوں کے ماتحت کنیزوں سے نکاح کی آزادی کے بارے میں ایک قسم کی آسانی اور کشادگی کے لئے تھا کیونکہ انسان اصولی طور پر ایک کمزور مخلوق ہے جس پر خواہشات نفسانی وشہوانی کے طوفان ہر طرف سے حملہ کرتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ انسان کو ان کے مقابلے کے لئے ایسے جائز شرعی طریقے بتائے جن سے انسان ان خواہشات کی تسکین کا سامان فراہم کر سکے اور اپنے آپ کو غلط راستوں پر چلنے سے محفوظ رکھ سکے۔

(۲۹) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَـكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ‌ ۚ وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمۡ رَحِيۡمًا	اے ایمان والو! ایک دوسرے کے مال باطل اور ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ ایسی تجارت ہو جو تمہاری رضامندی سے کی جائے اور خودکشی نہ کرو۔ خدا تم پر مہربان ہے۔

(۳۰)وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ عُدۡوَانًا وَّ ظُلۡمًا فَسَوۡفَ نُصۡلِیۡہِ نَارًا ؕ وَ کَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرًا	اور جو شخص اس کام کو از روئے ظلم کرے تو اسے ہم بہت جلد آگ میں ڈالیں گے اور یہ کام خداوند عالم کے لئے آسان ہے۔

تفسیر

معاشرے کی سلامتی کا دارو مدار اقتصادی سلامتی پر ہے

درحقیقت یہ آیت قوانین اسلام کی بنیاد کو مالی معاملات اور مبادلات سے تعلق رکھنے والے مسائل سے مربوط کرتی ہے اسی وجہ سے فقہائے اسلام لین دین اور معاملات کے تمام ابواب میں اسی سے استدلال کرتے ہیں آیت ایماندار لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہے ایک دوسرے کے اموال غلط اور باطل طریقوں سے نہ کھاؤ یعنی دوسروں کے مال میں ہر قسم کا تصرف جو منطقی اور عقلی جواز کے بغیر ہو ممنوع قرار دیا گیا ہے اور ان سب کو ایک لفظ باطل کے تحت بیان کر دیا گیا ہے جو ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے ہم جانتے ہیں کہ باطل حق کے مقابلے میں ہے اور وہ ہر اس چیز کو جو بری، بے مقصد اور بے بنیاد ہو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی مندرجہ بالا عبارت کے مشابہ عبارتوں کے ذریعہ اس امر کی تاکید کی گئی ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ آیت ۱۸۸ میں ارشاد ہوتا ہے۔

اس میں لوگوں کو بلا وجہ اور بے بنیاد دعووں کے ذریعہ مال ہڑپ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

''اِلَّاۤ اَنۡ تَکُوۡنَ تِجَارَۃً عَنۡ تَرَاضٍ''

یہ جملہ گذشتہ قانون کلی کی استثنائے صورت بیان کر رہا ہے لیکن اصطلاحی طور پر استثنائی منقطع ہے یعنی جو کچھ اس جملے میں آیا ہے وہ پہلے قانون میں شروع ہی سے داخل نہ تھا اور صرف ایک تاکید اور یاد دہانی کے طور پر ذکر ہوا ہے اور یہ اپنے مقام پر خود ایک کلی قانون ہے کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے مگر یہ کہ تمہارا دوسروں کے مالوں میں تصرف عدل وانصاف کے مطابق ہو جو طرفین کی باہمی رضا و رغبت سے ہو۔ اس لئے اس بیان کے مطابق تمام مالی مبادلات اور لوگوں میں مروج مختلف طرح کی تجارت اگر طرفین کی رضامندی سے ہو تو وہ اسلام میں جائز ہے۔ مگر وہ امور اس میں داخل نہیں ہیں جن سے بربنائے مصلحت صریحاً ممانعت کی گئی ہے۔

اس کے بعد آیت کے ذیل میں لوگوں کو قتل نفس سے منع کیا گیا ہے اگر قرآن کا یہ جملہ سامنے رکھا جائے۔ یعنی خداوند عالم تمہاری نسبت زیادہ مہربان ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں حکم خودکشی سے نہی کے بارے میں ہے یعنی مہربان خدا نہ صرف اس پر راضی نہیں کہ کوئی دوسرا تمہیں قتل کرے بلکہ خود تمہیں بھی یہ اجازت نہیں دیتا کہ تم خود سے اپنے آپ کو موت کے گھاٹ اتار دو۔ روایات اہل بیت علیہم السلام میں بھی زیر نظر آیت کا مفہوم خودکشی سے امتناع ہی بیان کیا گیا ہے اب یہ سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ قتل نفس اور لوگوں کے مال میں باطل و ناحق تصرف میں کیا تعلق ہے؟ اس سوال کا جواب واضح ہے اور حقیقت میں قرآن نے ان

دونوں احکام کا ایک دوسرے کے ساتھ ذکر کر کے ایک اہم اجتماعی نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر لوگوں کے مالی مسائل صحیح بنیادوں پر استوار نہ ہوں اور معاشرے کے اقتصادی معاملات خوشگوار طریقہ سے آگے نہ بڑھیں وہ ایک دوسرے کے اموال میں ناحق تصرف کریں تو سماج ایک قسم کی خودکشی پر گرفتار ہو جائے گا اس کے علاوہ کہ شخصی خودکشی میں اضافہ ہوگا اجتماعی اور معاشرتی خودکشی بھی اس کے ضمنی اثرات میں سے ہوگی اس سے دور حاضر کے مختلف معاشروں میں آنے والے حوادث وانقلاب اس حقیقت کے شاہد عادل ہیں چونکہ خداوند عالم اپنے بندوں پر مہربان ہے لہٰذا انہیں خطرے سے خبردار کرتا ہے تاکہ وہ ہوشیار اور چوکنے رہیں۔ کہیں غلط قسم کے مبادلات مال اور غیر صحیح اقتصادی نظام ان کے معاشرے کو نیست و نابود کر کے نہ رکھ دے۔

(۳۰) اور جو شخص اس حکم کو نہ مانے اور لوگوں کا ناحق مال کھا کر گناہگار ہو یا خودکشی کی طرف بڑھے تو نہ صرف یہ کہ وہ اس جہاں کی آگ میں جلے گا بلکہ وہ قہر وغضب پروردگار کی آگ میں بھی جلے گا اور یہ کام خدا کے لئے آسان ہے۔

(۳۱) اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا كَبٰٓٮِٕرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُكَفِّرۡ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَ نُدۡخِلۡكُمۡ مُّدۡخَلًا كَرِيۡمًا	اگر تم ان گناہان کبیرہ سے جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے بچو گے تو ہم تمہارے چھوٹے موٹے گناہوں کی پردہ پوشی کریں گے اور تمہیں نہایت عمدہ اور اچھی جگہ عنایت فرمائیں گے۔

تفسیر

گناہان کبیرہ وصغیرہ

یہ آیت صراحت کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ اگر تم گناہان کبیرہ کو جن کی ممانعت کی جا چکی ہے چھوڑ دو تو ہم تمہارے ''سیّأت'' کی پردہ پوشی کریں گے اور تمہیں بخش دیں گے اور تمہیں جنت عطا کریں گے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گناہ دو قسم کے ہیں ان میں سے ایک کا نام قرآن نے کبیرہ رکھا ہے اور دوسری قسم کا ''سیّئة''. اور سورہ نجم کی آیت ۳۲ میں ''سیئة'' کی بجائے ''لمم'' فرمایا ہے اور سورۂ کہف کی آیت ۴۹ میں کبیرہ کے مقابلے میں صغیرہ کا ذکر کیا ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے:

''یہ اعمال نامہ کسی چھوٹے بڑے گناہ کو نہ بھولے گا اور اسے ضرور شمار کرے گا''

اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ گناہ کی جانی پہچانی دو قسمیں ہیں کہ جن کو کبھی کبیرہ اور صغیرہ سے اور کبھی کبیرہ اور سیئة سے اور کبھی کبیرہ اور لمم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ گناہ صغیرہ وکبیرہ کے تعین کے لئے کیا ضابطہ اور میزان ہے۔

اگر کبیرہ کے لغوی معنی کو دیکھیں تو ہر وہ گناہ کبیرہ ہوگا جو اسلام کی نظر میں بڑا اور زیادہ اہم ہے اور اس کی اہمیت کی نشانی یہ ہو سکتی ہے کہ قرآن مجید نے صرف اس کی ممانعت پر قناعت نہ کی ہو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عذاب جہنم کی دھمکی بھی ہو مثلاً قتل، زنا، سود خوری وغیرہ۔

گناہ صغیرہ کس طرح گناہ کبیرہ میں تبدیل ہو جاتا ہے؟

اس موقع پر ہمیں ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دینی چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ گناہ صغیرہ اس صورت میں صغیرہ رہتا ہے جب اس میں تکرار نہ ہو علاوہ ازیں اسے معمولی سمجھتے ہوئے غرور اور سرکشی کے طور پر نہ کیا جائے کیونکہ قرآن اور اسلامی روایات کے مطابق یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اکثر مواقع پر گناہان صغیرہ گناہان کبیرہ میں بدل جاتے ہیں مثلاً

ا۔ جب انہیں بار بار کیا جائے۔ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا:

لا صغیرة مع الاصرار (کوئی گناہ بار بار کرنے سے گناہ صغیرہ نہیں رہتا۔)

(۳۲)وَ لَا تَتَمَنَّوۡا مَا فَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعۡضَکُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِیۡبٌ مِّمَّا اکۡتَسَبُوۡا ؕ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِیۡبٌ مِّمَّا اکۡتَسَبۡنَ ؕ وَسۡئَلُوا اللّٰہَ مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمًا	جو فضیلت خدا نے تم میں سے بعض کو بعض پر دی ہے اس کی تمنّا اور آرزو نہ کرو۔ مرد اس سے جو کسب و کوشش کرتے ہیں حصہ پا لیتے ہیں اور عورتیں جو کسب اور کوشش کرتی ہیں اس میں سے حصہ حاصل کرتی ہیں۔ اور خدا سے اس کے فضل کا سوال کرتے رہو اور وہ خدا ہر چیز کو جانتا ہے۔

شان نزول

مشہور مفسر طبرسی مجمع البیان میں نقل کرتے ہیں کہ حضرت ام سلمہ (زوجہ پیغمبرؐ) نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا:

جب مرد جہاد کے لئے جاتے ہیں تو عورتیں کیوں جہاد نہیں کر سکتیں اور ہمارے لیے آدھی میراث کیوں ہے؟

کاش ہم بھی مرد ہوتیں اور ان کی طرح جہاد پر جاتیں اور معاشرے میں ان کی سی حیثیت رکھتیں۔

اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس کے ذریعے اس سوال اور ایسے ہی دوسرے سوالات کا جواب دیا گیا۔

تفسیر

جیسا کہ ہم شان نزول میں لکھ چکے ہیں مردوں اور عورتوں کی میراث کا فرق کچھ مسلمانوں کے لئے ایک مشکل سوال بن گیا تھا گویا وہ اس بات کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے کہ یہ فرق اس بنا پر ہے کہ امور زندگی کا بوجھ زیادہ تر مردوں کے کندھوں پر ہوتا ہے اور عورتوں کو اس سے مستثنٰی سمجھا جاتا ہے مزید برآں عورتوں کے اخراجات بھی مردوں کو اٹھانے پڑتے ہیں جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ عملی طور پر عورتوں کا حصہ مردوں سے دوگنا ہو جاتا ہے اسی لیے آیت مندرجہ بالا کہتی ہے کہ خداوند عالم نے جو فرق تم میں سے بعض کے لئے دوسروں کی نسبت مقرر کر دیا ہے اس کی آرزو نہ کرو کیونکہ اس فرق میں بہت سے اسرار و رموز چھپے ہوئے ہیں جو تمہاری سمجھ سے بالا ہیں خلقت، آفرینش، جنسیت اور صنفیت کے اعتبار سے اور جسمانی و روحانی صفات کے حوالے سے تم آپس میں اختلافات

رکھتے ہواور یہی تمہارے نظام کی بنیاد ہے تم میں حقوق اور مختلف حیثیتوں کی وجہ سے احکام کا فرق مثلاً میراث میں رکھا گیا ہے یہ سب اختلافات اور فرق عدالت و قانون الٰہی کے مطابق ہیں اگر اس کے علاوہ کسی اور بات میں مصلحت ہوتی تو خدا ویسا ہی کرتا بنا بریں ان کی تبدیلی کی خواہش و آرزو سے مشیت ایزدی کی ممانعت ہے جو سراسر حق و عدالت ہے البتہ یہ شک نہیں کرنا چاہئے کہ آیت حقیقی اور طبعی فرق کی طرف اشارہ کرتی ہے نہ کہ اس خود ساختہ تفاوت کی جانب جو طبقاتی استعمار اور استثمار کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

اس لیے بلا فاصلہ فرماتا ہے مرد اور عورتوں میں سے ہر ایک اپنی سعی و کوشش اور حیثیت کے لحاظ سے بہرہ ور ہوتے ہیں چاہے طبعی حیثیت سے ہو (مثلاً مرد اور عورت کی جنس کا ایک دوسرے سے فرق) یا جستجو اور اختیاری کوشش سے ہو۔

اس کے بعد ارشاد فرماتا ہے۔ کہ اس قسم کے فرق کی تمنا کرنے کی بجائے خداوند عالم کے لطف و کرم کی آرزو کرو۔ تا کہ وہ تمہیں طرح طرح کی نعمتوں بلند توفیقات اور نیک جزاؤں سے نوازے اور ان کے نتیجہ میں تم خوش قسمت اور سعادت مند بن جاؤ۔

چونکہ پروردگار ہر چیز کو جانتا ہے کہ اجتماعی نظام کے لئے اختلاف طبعی اور حقوق کے پیش نظر کونسا فرق ضروری ہے اور اسی بنا پر اس کے کاموں میں کسی قسم کی بے انصافی فرقہ بندی اور نا مناسب فرق نہیں ہے نیز وہ لوگوں کے باطنی بھیدوں کو بھی جانتا ہے کہ کون سے لوگ اپنے دلوں میں غلط امیدوں کو پروان چڑھاتے رہتے ہیں اور کون سے افراد مثبت اور اصلاحی چیزوں کے بارے میں سوچتے ہیں۔

(۳۳)وَ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَ الَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۧ	ہم نے ہر شخص کے لئے وارث قرار دیئے ہیں جو ماں باپ اور نزدیکیوں سے ورثہ پاتے ہیں نیز جن لوگوں نے تم سے عہد و پیمان باندھا ہے ان کا حصہ بھی انہیں دے دو خدا ہر چیز پر شاہد و ناظر ہے۔

تفسیر

یہاں قرآن مسائل میراث کی طرف لوٹتا ہے اور فرماتا ہے ہم نے مرد اور عورت میں سے ہر ایک کے لئے وارث بنائے ہیں جو کچھ ماں، باپ اور نزدیکی رشتہ دار چھوڑ جائیں تو وہ خاص طریقے کے مطابق اس میں تقسیم ہوگا حقیقت میں یہ جملہ ان احکام میراث کا خلاصہ ہے جو گذشتہ آیات میں رشتہ داروں اور نزدیکیوں کے بارے میں بیان ہوئے ہیں اور یہ مقدمہ اور تمہید ہے اس حکم کے لئے جس کا بعد میں بیان ہوگا۔

اسکے بعد مزید ارشاد فرماتا ہے: اور جن لوگوں سے تم نے عہد و پیمان باندھا ہے میراث میں سے ان کا حصہ دے دو۔

یہ جو آیت میں پیمان کو عقد یمین (دائیں ہاتھ سے گرہ باندھنا) کہا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان عام طور پر کام دائیں ہاتھ سے کرتا اور پیمان بھی ایک قسم کی گرہ لگانا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ ہم عہد و پیمان لوگ جنہیں میراث میں سے حصہ دینا ہے کون ہیں جو کچھ مفہوم آیت سے زیادہ قریب ہے وہ یہ ہے کہ اس سے مراد ضمان جریرہ کا پیمان ہے جو اسلام سے پہلے مروج تھا اور اسلام نے آکر اس کی اصلاح کی ہے چونکہ اس

میں اصلاحی پہلو تھا اس لیے اسے صحیح قرار دیا گیا اور وہ یہ تھا کہ دو شخص ایک دوسرے سے یہ وعدہ کرتے تھے کہ وہ ایک دوسرے کی برادرانہ طور پر مدد کریں گے، مشکلات میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے اور جب ان میں سے کوئی دنیا سے اٹھ گیا تو جو شخص باقی رہ جائے گا وہ اس کی میراث لے گا اسلام نے اس دوستی کے عہد و پیان کی رسم کو قبول کر لیا لیکن یہ تاکید کی کہ اس قسم کے عہد و پیان کی میراث اس حالت میں ملے گی۔

جب مرنے والے کے نزدیکی رشتہ داروں کے طبقات میں سے کوئی بھی زندہ نہ ہو اس بات کی مزید تفصیل فقہی کتب کی کتاب میراث میں موجود ہے۔

اگر تم صاحبان میراث کا حصہ دینے میں کوتاہی کرو گے یا ان کا حق انہیں پورا دے دو گے تو خدا ہر حالت سے آگاہ ہے کیونکہ وہ ہر کام اور ہر چیز کا شاہد و ناظر ہے۔

(۳۴) اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَ الّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَ اهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَ اضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا	مرد عورتوں کے سرپرست اور خدمت گزار ہیں ان برتریوں کی وجہ سے (جو نظام اجتماعی کے لحاظ سے) خدا تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر دی ہیں اور ان اخراجات کی بنا پر جو وہ اپنے مال سے (عورتوں کے لئے) کرتے ہیں اور نیک اور صالح عورتیں وہ ہیں جو متواضع اور منکسر المزاج ہیں اور جو (اپنے شوہر کی) عدم موجودگی میں اس کے اسرار اور حقوق کی حفاظت کرتی ہیں ان حقوق کی وجہ سے جو خدا نے ان کو دیئے ہیں اور باقی رہیں وہ عورتیں جن کی مخالفت اور سرکشی کا تمہیں خوف ہے انہیں وعظ و نصیحت کرو اگر یہ اثر نہ کرے تو ان کے بستر سے دور رہو اور اگر یہ بھی کارگر نہ ہو اور انہیں کوئی راستہ اور طریقہ سختی کے سوا اپنی ذمہ داریوں پر آمادہ نہ کرے تو پھر انہیں خبردار کرو اب اگر وہ تمہاری بات مان لیں تو ان پر سختی اور زیادتی نہ کرو (اور جان لو) کہ خدا بلند مرتبہ اور بزرگ ہے۔

تفسیر

گھریلو نظام میں سرپرستی

مردوں عورتوں کے سرپرست اور خدمت گزار ہیں اس جملے کی وضاحت کے لئے توجہ رہے کہ گھر ایک چھوٹا سا معاشرہ ہے اور بڑے معاشرے کی طرح اس کا بھی کوئی رہبر اور سرپرست ہونا چاہئے کیونکہ اگر مرد اور عورت دونوں مل کر

سر پرستی اور رہبری کریں تو یہ بے معنی ہے اس لیے مرد یا عورت میں سے کوئی ایک گھر کا رئیس اور سردار ہونا چاہئے اور دوسرا اس کا مددگار اور اس کی نگرانی میں ہو قرآن یہاں وضاحت کرتا ہے کہ سر پرستی کا مقام مرد کو دیا جائے اس کا مقصد ظلم وستم نہیں ہے بلکہ ایک منظّم رہبری ہے جس میں ذمہ داریوں اور مشوروں کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔

''بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعۡضَھُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ وَّ بِمَاۤ اَنۡفَقُوۡا مِنۡ اَمۡوَالِھِمۡ''

یہ جملہ بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ پہلے حصہ میں فرماتا ہے: یہ سر پرستی اس تفاوت اور اختلاف کی وجہ سے ہے جو خداوند عالم نے مقصد تخلیق اور نوع بشر کی مصلحت کے لحاظ سے ان میں رکھا ہے اور آخری حصہ میں فرماتا ہے نیز یہ سر پرستی ان فرائض کی وجہ سے ہے جو افراد خانہ کی مالی ضرورت کی انجام دہی کے لئے مرد کے ذمہ ہیں لیکن یہ بات واضح ہے کہ ان ذمہ داریوں کا مردوں کے سپرد ہونا نہ ان کی شخصیت کی بلندی کی دلیل ہے اور نہ ہی آخرت کے امتیاز کی کیونکہ وہ تو تقویٰ اور پرہیزگاری پر منحصر ہے جیسے ممکن ہے کہ کسی معاون کی شخصیت مختلف پہلوؤں سے اپنے سربراہ کی نسبت زیادہ ہو لیکن سربراہ اس کام کی سر پرستی کے لئے زیادہ موزوں ہو۔

یہاں مزید فرماتا ہے کہ عورتیں ان ذمہ داریوں کے لحاظ سے جو ایک خاندان کی ان کے سپرد ہیں دو قسم کی ہیں پہلی قسم صالح اور نیک عورتوں کی ہے اور وہ ایسی ہیں جو گھریلو نظام میں اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے والی ہیں وہ نہ صرف شوہر کے ہوتے ہوئے بلکہ اس کی عدم موجودگی میں بھی عزت وناموس کے حوالے سے اور مالی لحاظ سے خیانت نہیں کرتیں اور شوہر کی غیر حاضری میں بھی اس کی شخصیت اور خاندانی اسرار ورموز کی حفاظت کرتی ہیں اور ان حقوق کے بدلے میں جو خدا نے ان کے لئے مقرر کیے ہیں وہ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دیتی ہیں خداوند عالم نے ''بما حفظ اللّٰہ'' فرما کر اسی طرف اشارہ فرمایا ہے واضح ہے کہ مردوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس قسم کی عورتوں کے ساتھ انتہائی احترام اور حق شناسی سے پیش آئیں۔

نافرمان عورتیں

دوسری قسم کی عورتیں وہ ہیں جو اپنے فرائض سے روگردانی کرتی ہیں اور ان میں ناموافقت کا مظاہرہ کرتی ہیں ایسی عورتوں کے بارے میں مردوں کے کچھ فرض اور ذمہ داریاں ہیں کہ جنہیں مرحلہ بمرحلہ یکے بعد دیگرے انجام دینا چاہئے وہ ہر صورت میں یہ توجہ رکھیں کہ وہ کسی صورت میں عدالت کی حدود سے باہر نہ نکلنے پائیں یہ ذمہ داریاں مندرجہ ذیل آیت میں ترتیب سے بیان کی گئی ہیں۔

پہلا مرحلہ ان عورتوں کے بارے میں ہے کہ جو سرکشی اور دشمنی کا مظاہرہ کریں، قرآن مندرجہ بالا آیت میں ارشاد فرماتا ہے وہ عورتیں جن کی بغاوت اور سرکشی کا تمہیں خوف ہے انہیں وعظ ونصیحت کرو جو گھریلو نظام کی چار دیواری سے پاؤں باہر نکالتی ہیں پہلے انہیں مشفقانہ نصیحتیں کی جانا چاہئیں اور ایسے کاموں کے برے نتائج بیان کرکے راہ راست پر لانے کی کوشش کی جانا چاہئے اور انہیں ان کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی جانا چاہئے۔

اگر تمہاری نصیحتیں اور ہدا تیں ان پر کوئی اثر نہ کریں تو ان کے بستر سے دور رہو اس بے تو جہی اور لا پرواہی سے جسے اصطلاح میں بائیکاٹ کہتے ہیں ان کے برتاؤ کے خلاف اپنی ناراضگی ظاہر کرو شاید یہی ہلکی سی تنبیہ ان پر اثر کرے۔

اب اگر ان کی سرکشی اور فرائض سے بے توجہی حد سے بڑھ جائے اور اس طرح قانون شکنی پر ڈٹی رہیں اور سختی سے قدم آگے بڑھاتی رہیں نہ ان پر پند و نصائح اثر کریں اور نہ بستر سے دوراور بے توجہی سوائے عملی سختی کے کوئی راستہ باقی نہ رہے اور انہیں ذمہ داریوں کی ادائیگی پر آمادہ کرنے کے لئے عملی شدت کے سوا کوئی چارہ نہ رہے تو یہاں اجازت دی گئی ہے کہ بدنی سرزنش کے ذریعے انہیں ان کے فرائض انجام دینے پر آمادہ کیا جائے۔

آیت کے آخر میں مردوں کو دوبارہ خبردار کیا گیا ہے کہ وہ خاندان کے سرپرست ہونے کی حیثیت سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں اور خدا کی قدرت کو جو تمام قدرتوں سے بالاتر ہے اپنے تصور میں رکھیں کیونکہ خدا بلند مرتبہ اور بہت ہی بڑا ہے۔

(۳۵)وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَيۡنِهِمَا فَابۡعَثُوۡا حَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَحَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهَا ۚ اِنۡ يُّرِيۡدَاۤ اِصۡلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيۡنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا خَبِيۡرًا	اور اگر تمہیں ان کے درمیان علیحدگی کا خوف ہو تو ایک نمائندہ شوہر کے خاندان سے اور ایک نمائندہ بیوی کے خاندان سے چن لو (تاکہ وہ یہ معاملہ حل کریں) اب اگر یہ دونوں فیصلہ کرنے والے اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں تو خداوند عالم ان کی توفیق میں اضافہ فرمائے گا کیونکہ وہ دانا اور خبردار ہے اور سب کی نیتوں سے بخوبی جانتا ہے۔

تفسیر

خاندان کی مصالحتی عدالت

خداوند عالم اس آیت میں میاں بیوی کے درمیان اختلاف ونزاع ہونے کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے اگر میاں بیوی میں ناچاقی اور جدائی کی نشانیاں پیدا ہو جائیں تو ناچاقی کی وجوہات کو سمجھنے اور صلح وآشتی کے لئے ایک فیصلہ کرنے والا مرد کے خاندان سے اور دوسرا عورت کے خاندان سے چنو۔اس کے بعد فرماتا ہے: اب اگر یہ دونوں فیصلہ کرنے والے نیک نیتی اور ہمدردی کے ساتھ یہ معاملہ طے کریں گے اور ان کا مقصد دونوں میاں بیوی میں صلح کرانا ہوگا تو خدا مدد کرے گا ان کے ذریعے میاں بیوی کے درمیان الفت پیدا کر دے گا اور حکمین کو تنبیہ کرنے کے لئے تاکہ وہ نیک نیتی سے کام کریں اس آیت کے آخر میں فرماتا ہے خدا ان کی نیت سے خوب آگاہ ہے۔خاندان کی مصالحتی عدالت جس کی طرف آیت میں اشارہ ہوا ہے اسلام کا ایک شاہکار ہے اس عدالت کی کچھ ایسی خصوصیات ہیں جن سے باقی محکمے عاری ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں۔

1۔خاندان کا ماحول احساس ومحبت کا مرکز ہوتا ہے فطری طور پر جو طریق کار اس ماحول میں اختیار کیا جائے وہ دوسری

فضاؤں سے مختلف ہونا چاہئے یعنی جس طرح عام جرائم کی عدالتوں میں محبت ہمدردی اور مہربانی کے ساتھ کام نہیں چل سکتا اسی طرح خاندانی ماحول میں خشک قانون بے روح رواج اور دستور سے گزارہ نہیں ہوتا یہاں جہاں تک ہو سکے اختلافات کو محبت اور مہربانی کے طریقے سے حل کرنا چاہئے اس لیے خداوند عالم حکم دیتا ہے کہ اس محکمہ کے جج ایسے لوگ ہوں جو دونوں میاں بیوی کے رشتہ دار ہوں تا کہ وہ میاں بیوی کے احساسات محبت و مہربانی کو متحرک کر سکیں واضح ہے کہ یہ خصوصیت صرف ایسی عدالت میں ہی ہو سکتی ہے باقی عدالتیں اس سے عاری ہیں۔

2۔ عام عدالتوں میں طرفین دعویٰ مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے دفاع کے لئے ہر قسم کے اسرار و رموز وہ جانتے ہیں فاش کریں یہ بات مانی ہوئی ہے کہ اگر میاں بیوی بیگانوں کے سامنے اپنے ازدواجی راز فاش کریں تو ایک دوسرے کے جذبات ایسے مجروح کریں گے کہ اگر عدالت کے مجبور کرنے پر اپنے گھر واپس بھی آ جائیں پھر بھی پہلا سا خلوص و محبت ان میں باقی نہ رہے گا اور ایک طرح کی ایسی بیگانگت پیدا ہو جائے گی جس میں مجبوراً اپنے فرائض اور ذمہ داریاں نبھانی پڑیں اصولی طور پر تجربہ یہ بتاتا ہے کہ جو میاں بیوی ایک مرتبہ اس قسم کی عدالتوں میں چلے جاتے ہیں وہ پھر پہلے جیسے میاں بیوی نہیں رہتے لیکن خاندان کی مصالحتی عدالت میں اول تو اس قسم کی شرمناک باتیں شرما حضوری نہیں کہی جاتیں ان کا ذکر آ بھی جائے تو کیونکہ رشتہ دار اور محرم افراد سامنے ہوتے ہیں اس لیے اتنے برے اثرات کا اندیشہ نہیں ہوتا۔

3۔ عام عدالتوں کے جج اختلافات کے بڑھنے کی کوئی پرواہ نہیں کرتے معاملہ چاہے کوئی صورت کیوں نہ اختیار کرے ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا ان کی بلا سے میاں بیوی گھر لوٹ جائیں یا ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں لیکن خاندانی مصالحتی عدالت میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے کیونکہ اس عدالت کے جج میاں بیوی کے نزدیکی رشتہ دار ہوتے ہیں اس لیے ان میاں بیوی کی مصالحت اور جدائی کا ان ججوں کی زندگی پر دلی رجحانات اور ان سے پیدا ہونے والے سوالات کی جواب دہی کے لحاظ سے گہرا اثر پڑتا ہے اسی لیے وہ پوری پوری کوشش کرتے' ہیں کہ کسی طرح ان دونوں میں مصالحت اور خلوص و محبت برقرار رہے اور وہ شیر و شکر ہو جائیں۔

4۔ ان سب سے قطع نظر یہ مصالحتی عدالت کسی قسم کی مشکلات کمر توڑ اور کثیر اخراجات اور عام عدالتوں کی سی پریشانیوں اور الجھنوں میں نہیں ڈالتے اور فریقین کو چکر پر چکر لگوائے بغیر تھوڑی سی مدت میں مقصد تک پہنچانے کی کوشش کرتی ہے واضح ہے کہ دونوں خاندانوں میں حکمین تجربہ کار مدّبر اور باخبر چننے چاہئیں جو خصوصیات ہم نے گنوائی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عدالت میں میاں بیوی کی مصالحت کا موقع دوسری عدالتوں کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔

(۳۶)وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ	اور خدا کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور ماں باپ سے نیکی کرو (اسی طرح) رشتہ داروں یتیموں، مسکینوں، نزدیکی اور دور کے پڑوسیوں، ساتھیوں اور خرچ نہ رکھنے والے مسافروں کے ساتھ اور ان غلاموں سے جن کے تم مالک ہو نیکی کرو کیونکہ خداوند عالم اس شخص کو جو تکبر اور گھمنڈ کرنے والا ہو (اور دوسروں کا حق ادا نہ کرے) دوست نہیں رکھتا۔

تفسیر

خداوند عالم مندرجہ بالا آیت میں حقوق اسلامی کے ایک اور سلسلے کو بیان کرتا ہے ان میں خدا کے حقوق بندوں کے حقوق یا لوگوں سے معاشرت کے آداب شامل ہیں مجموعی طور پر اس آیت سے دس احکامات اور قاعدوں کا پتہ چلتا ہے۔

1۔وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا

قرآن سب سے پہلے لوگوں کو خدا کی عبادت کرنے اور شرک و بت پرستی ترک کرنے کی دعوت دیتا ہے جو تمام اسلامی احکامات کی جڑ ہے توحید باری کی دعوت روح کو پاک نیت کو خالص، ارادہ کو قوی اور ہر مفید منصوبہ انجام دینے کا ارادہ مضبوط کرتی ہے چونکہ یہ آیت اسلامی حقوق کا ایک سلسلہ بیان کر رہی ہے تو سب سے پہلے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے تاکید کرتی ہے کہ خدا کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک بناؤ۔

2۔وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا

اس کے بعد ماں باپ کے حق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نصیحت کرتی ہے کہ ان کے ساتھ نیکی کرو ماں باپ کا حق ایسے مسائل میں سے ہے جن کا قرآن میں اکثر ذکر کیا گیا ہے شاید ہی کوئی امر ایسا ہو جس کی اس قدر تاکید کی گئی ہو یہ بات قرآن میں چار مقامات پر توحید کے ذکر کے فوراً بعد آئی ہے۔

3۔وَّ بِذِي الْقُرْبٰى

اس کے بعد تمام رشتہ داروں سے نیکی کرنے کا حکم دیا گیا ہے یہ بھی ایسے مسائل میں سے ہے جن کے متعلق بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے کبھی صلہ رحم کے عنوان سے اور کبھی ان سے نیکی اور احسان کے ذیل میں حقیقت میں اسلام یہ چاہتا ہے کہ نوع انسانی کے وسیع رشتے میں کچھ زیادہ مضبوط رشتے استوار کرے یہ رشتے چھوٹی چھوٹی اکائیوں اور زیادہ تر ہم شکل اکائیوں میں موجود ہیں جنہیں عرف عام میں کنبہ اور خاندان کہتے ہیں یہ اس لیے ہے تاکہ مشکلات اور حادثات میں وہ ایک دوسرے کی مدد کریں اور اپنے حقوق کی

حفاظت کریں۔

4۔وَ الۡیَتٰمٰی

اس کے بعد اہل ایمان کو یتیموں کے حقوق کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ان کے حق میں نیکی کرنے کی وصیت کی گئی ہے کیونکہ ہر معاشرے میں طرح طرح کے حادثات کے نتیجے میں ہمیشہ بچے یتیم ہوتے رہتے ہیں جنہیں نظر انداز کر دینا صرف انہیں خطرے میں ڈالنا نہیں ہے بلکہ معاشرے کو بھی خطرے سے دو چار کرنا ہے کیونکہ اگر یتیم بچوں کی سر پرستی نہ کی جائے اور ان سے خاطر خواہ ہمدردی اور محبت کا سلوک نہ کیا جائے تو وہ بے ہودہ خطرناک اور چور ڈاکو بن سکتے ہیں بنا بریں یتیموں کے ساتھ نیکی معاشرے کے اپنے حق میں ہے۔

5۔وَ الۡمَسٰکِیۡنِ

اس کے بعد ضرورت مندوں کے حقوق کی یاد دہانی کروائی گئی ہے کیونکہ ایک صحت مند عادلانہ معاشرہ میں بھی لاچار اور محتاج لوگ ہو سکتے ہیں جنہیں نظر انداز کر دینا تمام انسانی اصولوں کے خلاف ہے اور اگر اجتماعی اصول عدالت سے انحراف کی وجہ سے صحیح سالم لوگ فقر و فاقہ اور محرومیت میں مبتلا ہو جائیں پھر بھی ایسے معاشرے کی اصلاح کے لئے اٹھ کھڑا ہونا چاہئے۔

6۔وَ الۡجَارِ ذِی الۡقُرۡبٰی

اس کے بعد نزدیک کے ہمسایوں کے ساتھ نیکی کرنے کی وصیت کی گئی ہے اس کے متعلق کہ نزدیک کے ہمسائے کون ہیں مفسرین نے مختلف احتمالات پیش کیے ہیں بعض نے اس کے یہ معنی لیے ہیں کہ جو ہمسائے رشتہ دار بھی ہوں لیکن یہ تفسیر اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ آیت میں رشتہ داروں کے حقوق کی طرف الگ سے اشارہ ہو چکا ہے بعید دکھائی دیتی ہے بلکہ مراد وہی مکان کی نزدیکی ہے کیونکہ جو ہمسائے زیادہ قریب ہیں ان کے حقوق اور احترام زیادہ ہے یا وہ ہمسائے مراد ہیں جو دین و مذہب کے لحاظ سے زیادہ قریب ہوں

7۔وَ الۡجَارِ الۡجُنُبِ

اس کے بعد دور کے پڑوسیوں کی سفارش کی گئی ہے۔

اسلام میں حق ہمسائیگی اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی مشہور وصیتوں میں ہے فرماتے ہیں:

" مازال رسوال اللّٰہ یوصی بھم حتی ظننا انه سیورثم" (پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے بارے میں اس قدر سفارش فرمائی کہ ہمیں یہ گمان ہونے لگا کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ حکم فرمائیں کہ ہمسائے ایک دوسرے کے وارث ہوں گے)۔

یہ حدیث اہل سنت کی مشہور کتب میں بھی ہے چنانچہ تفسیر المنار اور تفسیر قرطبی میں بخاری سے یہی مضمون نقل کیا گیا ہے۔ایک دوسری حدیث میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دن تین مرتبہ فرمایا: واللّٰہ لا یومن........(ایسا شخص ایماندار نہیں ہے)۔

کسی نے پوچھا کونسا شخص تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الذین لا یامن جارہ بوائقه (جس کا ہمسایہ اس سے

تکلیف میں ہو)

8۔وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ

اس کے بعد ان لوگوں کو جو انصاف کا دم بھرتے ہیں وصیت کرتا ہے لیکن غور کرنا چاہئے کہ صاحب بالجنب کے معنی دوست اور رفیق سے زیادہ وسیع ہیں اور حقیقت میں یہ ہر اس شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے جو کسی طرح ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہو چاہے پرانا دوست ہو یا تھوڑی دیر کا رفیق مثلاً وہ شخص جو سفر کرتے ہوئے انسان کا دوست بن جائے بعض روایات میں ہے کہ ''وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ'' سے مراد رفیق سفر (رفیقک فی السفر) ہے یا وہ شخص ہے جو نفع کی امید میں کسی کے ساتھ ہو (المنقطع الیک جو نفعک) اس سے مراد ان کی تخصیص نہیں ہے بلکہ یہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور ایسے تمام لوگوں کے لئے بولا جاتا ہے بنا بریں یہ آیت ایک جامع اور کلی حکم کی حامل ہے اور یہ ایسے سب افراد سے حسن سلوک کرنے کے لئے ہے جن سے انسان کا سابقہ پڑتا ہے چاہے وہ سچ مچ دوست ہوں رفیق کار ہوں ہم سفر ہوں اس کے پاس آنے جانے والے ہوں شاگرد ہوں مشورہ لینے والے ہوں یا خدمت گزار ہوں کچھ روایات میں ''وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ'' کی تفسیر بیوی سے کی گئی ہے۔

9۔وَ ابْنِ السَّبِیْلِ

یہاں ایک اور گروہ کے بارے میں سفارش کی گئی ہے یہ وہ لوگ ہیں جو باوجود یکہ اپنے وطن اور شہر میں صاحب حیثیت اور کھاتے پیتے ہوں لیکن عالم سفر میں اجنبی شہر میں کسی وجہ سے محتاج ہو جائیں اور ابن سبیل کی عمدہ تفسیر (راستے کا بیٹا) بھی اسی وجہ سے ہے کہ ہم ان سے کسی قسم کی جان پہچان نہیں رکھتے کہ انہیں کسی قبیلے، کنبے یا شخص سے نسبت دے سکیں صرف اس حکم کی بنا پر کہ وہ حاجت مند مسافر ہیں انہیں مدد کا مستحق قرار دیں۔

10۔وَ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ

آخری مرحلے میں غلاموں سے نیکی کرنے کی وصیت کی گئی ہے اور حقیقت میں آیت خدا کے حق سے شروع ہوتی ہے اور غلاموں کے حقوق پر ختم ہوتی ہے کیونکہ یہ حقوق ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا

خداوند عالم آیت کے آخر میں اس جملہ کے ساتھ ''خدا تکبر کرنے والے اور گھمنڈ کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا'' خبردار کر رہا ہے کہ جو شخص خدا کے حکم سے روگردانی کرے اور تکبر کی وجہ سے رشتہ داروں، ماں، باپ، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور دوستوں کے حقوق کا خیال نہ رکھے وہ محبوب خدا اور بندہ خدا نہیں ہو سکتا اور جو لطف و کرم الٰہی کا مستحق نہ ہو وہ ہر خیر و برکت خوش قسمتی اور نیکی سے محروم ہے۔

(۳۷)اِلَّذِیۡنَ یَبۡخَلُوۡنَ وَ یَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبُخۡلِ وَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اٰتٰہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ وَ اَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابًا مُّہِیۡنًا ۚ	وہ ایسے لوگ ہیں جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور جو کچھ خداوند عالم نے اپنے فضل وکرم سے انہیں دیا ہے اسے چھپاتے ہیں اور ہم نے کافروں کے لئے ذلیل وخوار کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔
(۳۸)وَ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَہُمۡ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ لَا بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ وَ مَنۡ یَّکُنِ الشَّیۡطٰنُ لَہٗ قَرِیۡنًا فَسَآءَ قَرِیۡنًا	وہ ایسے لوگ ہیں جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور خدا اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے (کیونکہ شیطان ان کا دوست اور ساتھی ہے) اور جس کا ساتھی شیطان ہو اس نے برا ساتھی چنا ہوا ہے۔
(۳۹)وَ مَاذَا عَلَیۡہِمۡ لَوۡ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ اَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقَہُمُ اللّٰہُ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ بِہِمۡ عَلِیۡمًا	کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لے آتے اور خداوند عالم نے جو روزی انہیں عطا فرمائی ہے (اس میں سے) خرچ کرتے اور خدا تعالیٰ ان سے آگاہ ہے۔

تفسیر

دکھلاوا اور رضائے الٰہی

یہ آیت حقیقت میں گذشتہ آیتوں کا ضمیمہ ہے جو متکبر اور بندہ ہوا و ہوس افراد کی طرف اشارہ کر رہی ہے وہ ایسے گئے گزرے لوگ ہیں جو نہ صرف لوگوں سے نیکی میں بخل کرتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی بخل پر ابھارتے ہیں۔

علاوہ ازیں وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ خداوند عالم نے جو کچھ انہیں مرحمت فرمایا ہے اسے چھپا کر رکھیں۔اس کے بعد ان کے انجام اور نتیجہ کو اس طرح بیان فرماتا ہے کہ ہم نے کافروں کے لئے ذلیل وخوار کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

شاید اس تعبیر کا راز یہ ہو کہ بخل کا سرچشمہ زیادہ تر کفر ہی ہوتا ہے کیونکہ بخیل لوگ حقیقت میں خداوند عالم کی لامحدود نعمتوں اور اس کے نیک لوگوں سے کیے ہوئے وعدوں پر ایمان کامل نہیں رکھتے اور وہ یہ سوچتے ہیں کہ اگر وہ دوسروں کی مدد کریں گے تو فقیر بن جائیں گے اور یہ جو فرمایا ہے کہ ان کے لئے ذلیل وخوار کرنے والا عذاب ہے تو یہ اس لیے ہے تاکہ وہ تکبر اور گھمنڈ کی سزا کو اپنے کیے کا سبب سمجھیں۔

ضمنی طور پر سوچنا چاہئے کہ بخل صرف مالی امور تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ خداوند عالم کی ہر قسم کی نعمت کو روکنے کے معنی بھی

اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے بہت سے لوگ ایسے ہیں جو مالی لحاظ سے بخل نہیں کرتے لیکن علم ودانش اوراسی قسم کے دوسرے مسائل میں بخیل ہیں دوسری آیت میں من مانی کرنے والے متکبروں کی ایک اور صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

(۳۸) وہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر خرچ کرتے بھی ہیں تو لوگوں کو دکھانے اور شہرت کے لئے اور ان کا مقصد خدمت خلق اور رضائے خالق نہیں ہے اسی لیے تو خرچ کے وقت لینے والے کے مستحق ہونے کی پابندی نہیں ہے بلکہ ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ کس طرح خرچ کریں جس سے خود انہیں زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے اور وہ اپنی حیثیت کو ثابت کرسکیں کیونکہ وہ خدا تعالیٰ اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اس لیے ان کی سخاوت میں روحانی جذبہ نہیں ہے بلکہ ان کا جذبہ نام ونمود اور جھوٹا وقار ہے جو کہ تکبر اور خود غرضی کی نشانیوں میں سے ہے۔

انہوں نے شیطان کو اپنا ساتھی بنالیا ہے اور جو ایسا کرے اس نے اپنے لیے بہت برا ساتھی چنا ہے اور اس کی تقدیر اس سے بہتر نہیں ہوگی کیونکہ ان کی منطق اور پروگرام شیطان کی منطق اور پروگرام ہی ہے۔

(۳۹) یہاں اس گروہ کی حالت پر اظہار افسوس کے طور پر فرماتا ہے کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ اس بے راہروی سے باز آجاتے اور خدا اور روز جزا پر ایمان لے آتے اور ان نعمتوں میں سے جو خدا تعالیٰ نے ان کے اختیار میں دی ہیں نیک نیتی کے ساتھ اس کے بندوں کو دیتے اور اس طرح اپنے لیے دنیا اور آخرت کی سعادت حاصل کرتے اب وہ کیوں اپنے طریق کار پر نظر ثانی نہیں کرتے باوجود اسکے کہ یہ راستہ زیادہ صاف روشن تر اور مفید ترین ہے اور جو راستہ انہوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ سوائے نقصان اور بدبختی کے کسی نتیجہ پر نہیں پہنچاتا۔

ہر حالت میں خداوند عالم ان کی نیتوں اور اعمال سے باخبر ہے اور اس کے مطابق انہیں جزا یا سزا دیتا ہے۔

(۴۰) اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ ۚ وَ اِنْ تَکُ حَسَنَۃً یُّضٰعِفْھَا وَیُؤْتِ مِنْ لَّدُنْہُ اَجْرًا عَظِیْمًا	خداوند عالم کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور اگر نیک کام ہو تو اسے کئی گنا کر دیتا ہے (اور اس کے بدلے) اجر عظیم دیتا ہے۔

تفسیر

''ذرہ'' کیا چیز ہے؟

''ذرۃ'' اصل میں بہت ہی چھوٹی چیونٹی کو کہتے ہیں جو بڑی مشکل سے دکھائی دیتی ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں غبار کے بہت چھوٹے چھوٹے اجزا کے معنی میں ہے۔

مثقال کے معنی وزن اور بھاری پن کے ہیں تو مثقال ذرہ سے مراد جسم کا ایک چھوٹے سے چھوٹا مسلم اور محسوس ذرہ ہے اور بوجھ کے معنی میں ہے آیت مندرجہ بالا کہتی ہے کہ خدا ذرہ بھر وزن کے برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور نہ صرف یہ کہ ظلم نہیں کرتا بلکہ اگر نیک کام

انجام پائے تو اسے کئی گنا کر دیتا ہے۔

باقی رہی اس بات کی دلیل کہ خدا ظلم کیوں نہیں کرتا تو وہ واضح ہے کیونکہ ظلم وستم یا تو جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے یا ضرورت نفسانی کمزوریوں اور نقائص کے سبب سے اب جو ذات تمام چیزوں اور سب لوگوں کے متعلق علم رکھتی ہے اور سب سے بے نیاز ہے اور کسی قسم کی کمی اور نقص اس کی ذات اقدس میں نہیں ہے اس لیے ظلم کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے یہ نہیں کہ وہ ظلم نہیں کرسکتا اور نہ یہ کہ اس کے بارے میں ظلم وستم کا تصور نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ گروہ اشاعرہ کا خیال ہے بلکہ وہ باوجود قدرت کے علیم وحکیم ہونے کی بناء پر ظلم نہیں کرتا ہر چیز کو اس وسیع وعریض دنیا میں اپنی جگہ برقرار رکھتا ہے اور ہر شخص کیساتھ اس کی لیاقت اور اس کے اعمال وکردار کے مطابق سلوک کرتا ہے۔

(۴۱)فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ؕ	اس دن ان کی کیا حالت ہوگی جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ ان کے اعمال پر لائیں گے اور تجھے ان کا گواہ بنا کر لائیں گے۔
(۴۲)يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَ لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۧ	اس دن وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے اور پیغمبر کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے یہ تمنا کریں گے کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ (وہ مٹی ہوتے اور) ان کی خاک زمین کی سطح سے ملی ہوتی اور وہ بالکل محو اور خاموش ہو جاتے اور اس دن خدا سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے۔

تفسیر

گذشتہ آیتوں کے بعد جو بروں اور نیکوں کو سزا و جزا کے بارے میں تھیں یہ آیات روز قیامت کے گواہوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں پہلی آیت میں ہے اس دن ان لوگوں کی کیا حالت ہوگی جب ہم ہر امت کے لئے ان کے اعمال کا گواہ لے آئیں گے اور تمہیں ان کا گواہ مقرر کریں گے۔

اسی طرح جسم انسانی کے اعضاء کی گواہی اس زمین کی گواہی جس پر وہ رہتے تھے اور اس کے اعمال پر خدا کے فرشتوں کی گواہی کے علاوہ ہر پیغمبر بھی اپنی امت کے اعمال پر گواہ ہوگا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو سب سے آخری اور سب سے عظیم پیغمبر خدا ہیں اپنی امت کے اعمال پر گواہ ہوں گے۔ برے لوگ ان سب گواہوں کے ہوتے ہوئے کس طرح حقیقت کا انکار کرسکیں گے اور کیسے اپنے تئیں اپنے اعمال کی سزا سے بچا سکیں گے۔

(۴۲) جس وقت کافر اور خداوند عالم کے بھیجے ہوئے نبیوں کے مقابلے میں کھڑے ہونے والے لوگ اس عدالت الٰہی میں ناقابل انکار شہود اور گواہ دیکھیں گے تو وہ اپنے کیے پر اتنے پشیمان ہوں گے کہ وہ تمنا کریں گے کہ کاش وہ خاک ہوتے اور زمین کی مٹی کے برابر ہو جاتے قرآن مجید فرماتا ہے۔

(۴۳) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَیْدِیْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا	اے ایمان والو جب تم نشے میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک تم یہ نہ سمجھ سکو کہ تم کیا کہہ رہے ہو اور اسی طرح جب تم جنابت کی حالت میں ہو جب تک غسل نہ کر لو مگر یہ کہ عالم مسافرت میں ہو اب اگر تم بیمار یا مسافر ہو یا قضائے حاجت کی ہے اور یا عورتوں سے مباشرت کی ہے اور اس حالت میں تمہیں (وضو یا غسل کے لئے) پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمّم کرو اس طرح سے کہ اپنے چہروں اور ہاتھوں کا اس سے مسح کرو خدا بخشنے والا اور مغفرت کرنے والا ہے۔

تفسیر

چند فقہی احکام

مذکورہ بالا آیت سے چند اسلامی احکام معلوم ہوتے ہیں:

1۔ **نشے کی حالت میں نماز کا بطلان**۔ یعنی جو لوگ مست ہوں وہ نماز ادا نہیں کر سکتے اور ان کی نماز اس حالت میں باطل ہے اس کا فلسفہ بھی واضح ہے کیونکہ نماز بندے کی خدا کے ساتھ گفتگو اور راز و نیاز ہے اسے انتہائی توجہ اور ہوش مندی کے ساتھ انجام پانا چاہئے اور مست لوگ اس منزل سے دور اور بے خبر ہوتے ہیں۔

2۔ **حالت جنابت میں نماز کا باطل ہونا**۔ جس کی طرف ''ولا جنبا'' سے اشارہ کیا گیا ہے اس کے بعد اس حکم سے استثناء کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوا ہے۔ مگر یہ کہ مسافرت میں ہوں اگر مسافرت میں پانی نہ ملے تو پھر تیمّم سے نماز پڑھو۔

3۔ غسل کر چکنے کے بعد نماز پڑھنے یا مسجد سے گزرنے کے جواز کو ''حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا'' سے بیان کیا گیا ہے۔

4۔ اس کے بعد جو پانی نہ ملنے یا کسی اور وجہ سے معذور ہوں ان کے لئے تیمّم کا حکم بیان کیا گیا ہے: اگر بیمار ہو جاؤ یا سفر میں ہو در حقیقت اس مختصر سی عبارت میں تشریع تیمّم کے تمام مواقع جمع ہیں پہلا مقام وہ ہے جہاں پانی جسم کے لئے ضرر رساں ہو اور دوسرا مقام وہ ہے جہاں انسان کو پانی نہ ملے یا اس کے استعمال کی طاقت نہ ہو۔

پھر فرمایا"اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡکُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ"اس جملے سے تیمّم کی ضرورت کے اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب قضائے حاجت سے فارغ ہو یا عورتوں سے ہم بستری کرو اور تمہیں پانی نہ ملے تو اس موقع پر پاکیزہ مٹی سے تیمّم کرلو اس کے بعد تیمّم کا طریقہ بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔اس کے بعد اپنے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرو آیت کے آخر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ مذکورہ حکم تمہارے لیے ایک قسم کی سہولت اور آسانی ہے چونکہ خدا معاف کرنے والا بخشنے والا ہے۔

(۴۴)اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ یَشۡتَرُوۡنَ الضَّلٰلَةَ وَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَضِلُّوا السَّبِیۡلَ	کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں (خدا کی) کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا تھا اس سے اپنے لیے گمراہی خریدتے ہیں اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ۔
(۴۵)وَ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِاَعۡدَآئِکُمۡ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَلِیًّا وَّ کَفٰی بِاللّٰہِ نَصِیۡرًا	خدا تمہارے دشمنوں سے آگاہ ہے کافی ہے کہ خدا تمہارا ولی ہو اور کافی ہے کہ وہ تمہارا ناصر و مددگار رہو۔

تفسیر

خداوند عالم اس آیت میں تعجب آمیز عبارت سے اپنے پیغمبر ﷺ سے خطاب فرماتا ہے: اس گروہ کی حالت حیران کن ہے جو کتاب آسمانی کا کچھ حصہ اپنے پاس رکھتے تھے لیکن بجائے اس کے کہ وہ اس کے ذریعے اپنے اور دوسروں کے لئے ہدایت و سعادت حاصل کرتے گمراہی کا راستہ اپناتے ہیں اور تمہارے لیے بھی چاہتے ہیں کہ گمراہ ہو جاؤ۔اس طریقے سے وہ چیز جو خود ان کے لئے اور دوسروں کے لئے ہدایت کا ذریعہ تھی ان کی بری نیتوں کی وجہ سے گمراہی اور وسیلہ گمراہی میں بدل گئی ہے کیونکہ وہ کبھی حقیقت کی تلاش میں کوشاں نہیں تھے بلکہ ہر چیز کو نفاق، حسد اور مادیت کی سیاہ عینک سے دیکھتے ہیں۔

(۴۵)اس کے بعد فرماتا ہے یہ لوگ اگرچہ دوستی کے لباس میں جلوہ گر ہوتے ہیں لیکن یہ دراصل تمہارے جانی دشمن ہیں اور خدا ان سے آگاہ ہے۔اس سے بڑھ کر اور کیا دشمنی ہوگی کہ وہ کبھی خیر خواہی کے لہجے میں اور کبھی بدگوئی کی زبان میں تمہاری ہدایت اور سعادت کی مخالفت کرتے ہیں اور ہر وقت اپنے برے مقاصد کی تکمیل کے درپے ہیں لیکن تم ان کی دشمنی سے نہ گھبراؤ تم اکیلے نہیں ہو یہی کافی ہے کہ خدا تمہارا رہبر و ولی اور مددگار رہے۔کیونکہ وہ کچھ نہ کرسکیں گے اگر تم ان کی باتوں کو پاؤں کے نیچے روند ڈالو تو کسی قسم کا ڈر نہیں ہے۔

(۴۶)مِنَ الَّذِیۡنَ ہَادُوۡا یُحَرِّفُوۡنَ الۡکَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِہٖ وَ یَقُوۡلُوۡنَ سَمِعۡنَا وَعَصَیۡنَا وَاسۡمَعۡ غَیۡرَ مُسۡمَعٍ وَّ رَاعِنَا لَیًّۢا بِاَلۡسِنَتِہِمۡ وَطَعۡنًا فِی الدِّیۡنِ ؕ وَ لَوۡ اَنَّہُمۡ قَالُوۡا سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا وَاسۡمَعۡ وَانۡظُرۡنَا لَکَانَ خَیۡرًا لَّہُمۡ وَ اَقۡوَمَ ۙ وَ لٰکِنۡ لَّعَنَہُمُ اللّٰہُ بِکُفۡرِہِمۡ فَلَا یُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِیۡلًا	بعض یہودی تورات کے کچھ فقروں کو ان کے مقام سے بدل دیتے تھے اور یہ کہتے کہ ہم نے سنا اور مخالفت کی اور نیز کہتے کہ سنو کہ ہرگز نہ سنو اور (بطور طنز کہتے ”راعنا“ یعنی) ہمیں بے وقوف بناؤ یہ اس لیے ہے تا کہ وہ اپنی زبان سے حقائق کو بدل ڈالیں اور دین خدا پر لعن و تشنیع کریں لیکن اگر وہ (اس ہٹ دھرمی اور اصرار کی بجائے) یہ کہتے کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی اور ہماری بات کو سنو اور ہمیں مہلت دو (تا کہ ہم حقائق کی تہ کو پہنچ سکیں) تو یہ بات ان کے نفع میں تھی اور حقیقت کے ساتھ ساز گار تھی لیکن خدا نے انہیں ان کے کفر کی وجہ سے اپنی رحمت سے محروم کر دیا اس لیے ان میں سے تھوڑے لوگوں کے سوا ایمان نہیں لائیں گے۔

تفسیر

یہودیوں کے کردار کا ایک اور رخ

یہ آیت گذشتہ آیتوں کے بعد بعض دشمنان اسلام کی کچھ اور صفتوں کی تشریح کرتی ہے اور ان کے بعض اعمال کی طرف اشارہ کرتی ہے پہلے یہ بتاتی ہے کہ ان کا کام حقائق کی تحریف اور احکام خدا کے چہرے کو مسخ کرنا تھا۔ یہودیوں کا ایک گروہ کلمات خدا کو ان کی جگہ سے تبدیل کر دیتا تھا یہ تحریف نہ معلوم لفظی تھی کہ معنوی لیکن بعد کے کے جملے بتاتے ہیں کہ یہاں تحریف سے مراد تحریف لفظ اور تغیر عبارت ہے کیونکہ اس جملہ کے بعد فرماتا ہے۔ہم نے سنا اور نافرمانی کی یعنی بجائے اس کے کہ ”سمعنا و اطعنا“ (یعنی ہم نے سنا اور اطاعت کی) کہیں کہتے ہیں ہم نے سن کر مخالفت کی اور یہ بالکل ان لوگوں کی طرح ہے جو بعض اوقات بطور استہزا کہتے ہیں آپ کا کہنا اور ہمارا بات پر کان نہ دھرنا آیت کے دوسرے جملے بھی اسی مطلب کی گواہی دیتے ہیں۔

اس کے بعد ان کی عداوت آمیز جسارت اور بے ادبی کی گفتگو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ وہ کہتے ہیں۔سنو کہ کبھی نہ سنو اور اس طرح وہ ایک نادان اور جاہل گروہ بن کر حقائق کو بدلنے اور کتب آسمانی میں خیانت کرنے میں مصروف ہیں حالانکہ یہ کتاب آسمانی فرعون جیسے ظالم و جابر کے چنگل سے ان کی نجات کا ماحصل ہے انہوں نے استہزا اور مسخرہ پن جیسے نامردانہ حربے اختیار کر رکھے ہیں یہ حربے ہٹ دھرم اور غرور کرنے والوں کا ہتھیار ہیں وہ کبھی ان باتوں کے علاوہ پاک دل مسلمانوں کے بعض جملوں سے جو وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کرتے تھے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے ان جملوں کو دوسرے

مطالب و معانی کا لباس پہنا کر استہزا اور تمسخر کے طور پر استعمال کرتے تھے مثلاً ''راعنا'' جس کے معنی ہیں ہم سب سے رعایت کیجئے اور ہمیں مہلت دیجئے سچے مسلمان دعوت اسلام کی ابتداء میں اس بنا پر کہ زیادہ اچھے اور بہتر طریقے سے آپ ﷺ کی باتوں کو سنیں اور دل میں جگہ دیں۔ رسول اکرم ﷺ کے سامنے ایسے جملے عرض کرتے لیکن یہودیوں کا یہ گروہ اسے بگاڑ کر حضور ﷺ کے سامنے اسے دہراتا تھا اس لفظ سے ان کی مراد اس کا عبرانی معنی تھا اور وہ یہ کہ سنو کہ کبھی نہ سنو یا پھر دوسرے عربی معنی یعنی ہمیں بے وقوف بناؤ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہ ظاہر کریں کہ خاکم بدہن پیغمبر ﷺ کا کام لوگوں کو الو بنانا اور بے خبر رکھنا ہے وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتے تھے تاکہ اپنی زبان سے حقائق کو اصلی محور سے ہٹا دیں اور دین حق پر زبان اعتراض دراز کریں۔

لیکن اگر وہ اس ہٹ دھرمی اصرار حق دشمنی اور بے ادبی کی بجائے سیدھی راہ اپناتے اور یہ کہتے کہ ہم نے خدا کا کلام سنا اور ہم نے اطاعت کی آپ ہماری گذارشات سنیئے اور ہم سے رعایت کیجئے اور ہمیں مہلت دیجئے کہ ہم حقائق کو سمجھ سکیں تو یہ ان کے فائدے میں ہوتا اور عدل منطق اور ادب کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا۔

لیکن وہ کفر سرکشی اور بغاوت کی وجہ سے رحمت خدا سے دور ہو گئے ہیں اور ان کے دل اس قدر مردہ ہو چکے ہیں کہ وہ جلدی زندہ اور بیدار نہیں ہو سکتے ان میں صرف تھوڑے سے لوگ پاک دل ہیں جو حقائق قبول کرنے کے لئے تیار ہیں اور حق کی باتوں کو سنتے ہیں اور ان پر ایمان لاتے ہیں۔

(۴۷) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا	اے وہ لوگو! کہ جنہیں اللہ کی کتاب دی گئی ہے جو کچھ ہم نے (اپنے رسول پر) نازل کیا ہے اور جو ان نشانیوں سے ہم آہنگ بھی ہے جو تمہارے پاس ہیں ایمان لے آؤ اس سے پہلے کہ چہروں کو مسخ کر دیں اور پھر انہیں پشت کی طرف پھیر دیں یا انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیں جیسا کہ ہم نے اصحاب سبت کو دور کر دیا تھا اور خدا کا فرمان ہر حالت میں روبہ عمل ہو کے رہتا ہے۔

تفسیر

ہٹ دھرم افراد کی سرنوشت

اس بحث کے بعد جو گذشتہ آیات میں اہل کتاب کے بارے میں تھی یہاں انہی کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے فرماتا ہے: اے وہ لوگو جنہیں آسمانی کتاب دی جا چکی ہے قرآن مجید کی آیتوں پر ایمان لے آؤ جو کہ ان نشانیوں سے ہم آہنگ ہیں جو اس کے بارے میں تمہاری کتابوں میں موجود ہیں اور مسلم ہے کہ ان نشانیوں کی موجودگی میں تم دوسرے لوگوں کی نسبت اس بات کا زیادہ

حق رکھتے ہو کہ اس پاک دین کے ماننے والے بن جاؤ۔

اس کے بعد انہیں دھمکی دیتا ہے کہ اس سے پہلے کہ تم دو سزاؤں میں سے کسی ایک میں گرفتار ہو جاؤ حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دو پہلی سزا یہ کہ تمہارے چہروں کو کلی طور پر نیست و نابود کر دیا جائے اور ان تمام اعضاء کو جن کے ذریعے تم حقائق کو دیکھتے سنتے اور سمجھتے ہو مٹا دیں اور اس کے بعد تمہارے چہروں کو پیٹھ کی طرف پھیر دیں۔شاید یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس جملہ سے مراد عقل و ہوش آنکھ اور کان کا حقائق و واقعات زندگی کو نہ سمجھنے اور صراط مستقیم سے روگردانی کے لحاظ سے بیکار ہو جانا ہے۔

باقی رہی دوسری سزا جس کی انہیں دھمکی دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ انہیں اصحاب سبت کی طرح اپنی رحمت سے دور کرے گا۔

آیت کے آخر میں ان دھمکیوں کی تاکید کے طور پر فرماتا ہے فرمان خدا ہر حال میں روبہ عمل ہوگا اور اسے کوئی طاقت بھی نہ روک سکے گی۔

(۴۸)اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَ یَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ۚ وَ مَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ فَقَدِ افۡتَرٰۤی اِثۡمًا عَظِیۡمًا	خدا کبھی مشرک کو نہیں بخشے گا اور اس سے نیچے جو کچھ ہے وہ جسے چاہے (بشرطیکہ وہ اہلیت رکھتا ہو) بخش دے گا اور جو کسی کو اللہ کا شریک بنائے وہ عظیم گناہ کا مرتکب ہوا ہے۔

تفسیر

امید سے معمور آیت

مندرجہ بالا آیت صراحت سے بتاتی ہے کہ سب گناہ بخشے جا سکتے ہیں لیکن شرک کسی صورت میں نہ بخشا جائے گا مگر یہ کہ اسے چھوڑ دیں تو بہ کر لیں اور موحد بن جائیں دوسرے لفظوں میں کوئی گناہ بھی ایمان کو ختم نہیں کر سکتا جس طرح کہ کوئی نیک عمل بھی شرک کی موجودگی میں انسان کی نجات نہیں دلوا سکتا۔

اس آیت کا ربط گذشتہ آیات کے ساتھ اس لحاظ سے ہے کہ یہود و نصاریٰ میں سے ہر ایک، ایک طرح سے مشرک تھے قرآن اس آیت کے ذریعے خطرے سے خبردار کرتا ہے کہ وہ اس عقیدے کو ترک کر دیں کیونکہ یہ ایسا گناہ ہے جو بخشا نہیں جا سکتا اس کے بعد آیت کے آخر میں اس کی دلیل بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے جو شخص خداوند عالم کے لئے شریک قرار دے اس نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔

یہ آیت ان آیتوں میں سے ہے جو موحدین کو پروردگار عالم کے لطف و کرم سے اطمینان اور امید دلاتی ہیں کیونکہ اس آیت میں خدا نے شرک کے علاوہ باقی گناہوں کی بخشش کا امکان بیان کیا ہے اس روایت کے مطابق جو طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں

حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام سے نقل کی ہے یہ آیت آیات قرآن میں سب سے زیادہ امید افزا ہے:

''ما فی القرآن آیة ارجی عندی من هذه الایة''

گناہوں کی بخشش کے اسباب

قرآن کی بہت سی آیتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کی بخشش کے کئی ایک ذریعے ہیں جن کا خلاصہ پانچ موضوعات میں کیا جاسکتا ہے۔

1۔توبہ گذشتہ گناہوں پر پشیمانی اور آئندہ گناہوں سے اجتناب کے پختہ ارادے کے ساتھ صراط مستقیم پر گامزن ہونا اور برے اعمال کی نیک اعمال کے ذریعے عملی طور پر تلافی کرنا جو آیات میں اس معنی پر دلالت کرتی ہیں بہت زیادہ ہیں ان میں سے ایک آیت یہ ہے۔

''وہ خدا وہ ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور گناہوں کو بخش دیتا ہے''(شوری............۲۵)

2۔بہت زیادہ نیک کام کرنا یہ بھی برے اعمال کی بخشش کا ذریعہ بن جاتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے

''نیک کام کچھ گناہوں کو ختم کردیتے ہیں''(ہود............۱۱۴)

3۔شفاعت اس کی تفصیل تفسیر نمونہ کی جلد اول میں آچکی ہے۔

4۔گناہان کبیرہ سے پرہیز کرنا یہ بھی گناہان صغیرہ کی بخشش کا سبب بن جاتا ہے اس کی تشریح اسی سورہ کی آیت......۳۱ اور ۳۲ کے ذیل میں گزر چکی ہے۔

5۔عفو خداوندی یہ بھی بعض صاحب استعداد افراد کو میسر آتی ہے جیسا کہ ہم اسی آیت کے ذیل میں بیان کرچکے ہیں۔

اب ہم دوبارہ یاد دلاتے ہیں کہ عفو الٰہی اس کی مشیت کے ساتھ مشروط ہے یہ کوئی عمومی اور بلا قید و شرط مسئلہ نہیں ہے اس کی مشیت اور ارادہ صرف ایسے افراد کے بارے میں ہے جو عملی طور پر کسی نہ کسی طریقے سے اپنی قابلیت اور اہلیت ظاہر کرتے ہیں۔

یہاں سے واضح ہوجاتا ہے کہ شرک کیوں قابل عفو و بخشش نہیں ہے کیونکہ مشرک اپنا رابطہ خداوند عالم سے بالکل توڑ لیتا ہے ایسے برے فعل کا مرتکب ہوتا ہے جو تمام ادیان اور فطرت کے قوانین کی بنیاد کے خلاف ہے۔

(۴۹) اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ يُزَكُّوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّىۡ مَنۡ يَّشَآءُ وَ لَا يُظۡلَمُوۡنَ فَتِيۡلًا	کیا تو نے انہیں نہیں دیکھا جو اپنی تعریفیں کرتے ہیں لیکن خدا جس کی چاہتا ہے تعریف کرتا ہے اور ان پر تھوڑا سا بھی ظلم نہیں ہوگا۔

(۵۰)اُنْظُرْ کَیْفَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْکَذِبَ ؕ وَ کَفٰی بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِیْنًا ۠	دیکھئے وہ کس طرح خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں یہی واضح گناہ (اس کی سزا کے لئے) کافی ہے۔

شان نزول

بہت سی اسلامی تفاسیر میں اس آیت کے بارے میں لکھا ہے کہ یہود و نصاریٰ اپنے لیے کچھ خصوصیات اور امتیازات کے قائل تھے چنانچہ آیات قرآنی میں ہے کہ کبھی وہ کہتے ہم خدا کے بیٹے ہیں کبھی کہتے ہمارے لیے بہشت مخصوص ہے اور ہمارے سوا کوئی وہاں نہیں جا سکتا مائدہ ۱۸ بقرہ ۱۱۱ یہ آیتیں نازل ہوئیں اور ان کے باطل خیالات کا جواب دیا گیا۔

تفسیر

خودستائی

اس آیت میں ایک مذموم صفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں بہت سے لوگ اور قومیں مبتلا ہیں اور وہ ہے خودستائی اپنے آپ کو نیک پاک ظاہر کرنا اور اپنے لیے فضیلتیں گھڑنا آیت میں ہے کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنی تعریفیں کرتے ہیں اس کے بعد فرماتا ہے خدا جس کی چاہتا ہے تعریف کرتا ہے۔ صرف وہی ذات اقدس ہے جو حکمت و مشیت بالغہ کی رو سے کسی کمی اور زیادتی کے بغیر بعض افراد کی ان کی قابلیت لیاقت اور استعداد کے مطابق مدح کرتی ہے اور کبھی کسی شخص پر سوئی کی نوک کے برابر بھی ظلم نہیں کرتی۔ حقیقت میں فضیلت وہی ہے جسے خداوند عالم فضیلت قرار دے نہ کہ وہ جسے خودستائی کرنے والے خودغرضی کی وجہ سے اپنے ساتھ چسپاں کرلیں اور یوں اپنے پر اور دوسروں پر ظلم کریں۔

زیر نظر آیت میں قرآن شدت سے اس قسم کے توہمات اور برتری کی خواہشات کی سرکوبی کرتا ہے اور اسے افترا خدا پر جھوٹ باندھنا اور بڑا گناہ شمار کرتا ہے اور فرماتا ہے۔ دیکھئے یہ گروہ کس طرح جھوٹے فضائل بنانے اور ان کو خدا کی طرف منسوب کرنے کے ذریعے خدا پر جھوٹ باندھتا ہے اگر انہوں نے اس گناہ کے علاوہ اور کوئی گناہ نہ بھی کیا ہو تو یہی ان کی سزا کے لئے کافی ہے۔

(۵۱)اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ وَ یَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا	کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں خدا کی کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا ہے کہ وہ (اس کے باوجود) جبت و طاغوت (بت اور بت پرستوں) پر ایمان رکھتے ہیں اور مشرکین سے کہتے ہیں کہ ہم ان لوگوں سے جو ایمان لا چکے ہیں زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔

(۵۲)اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَمَنۡ یَّلۡعَنِ اللّٰهُ فَلَنۡ تَجِدَ لَهٗ نَصِیۡرًا ؕ	وہ ایسے لوگ ہیں خداوند عالم نے جنہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور جسے خدا اپنی رحمت سے دور کر دے اس کا تجھے کوئی بھی مدد گار نہیں ملے گا۔

شان نزول

اکثر مفسرین مندرجہ بالا آیتوں کی شان نزول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جنگ احد کے واقعہ کے بعد یہودیوں کے بزرگوں میں سے ایک شخص جس کا نام کعب بن اشرف تھا ستر آدمیوں کے ہمراہ مکہ مکرمہ آیا تا کہ رسول اکرم ﷺ کے خلاف اہل مکہ سے عہد و پیمان کرے اور جو معاہدہ حضور ﷺ کے ساتھ تھا اسے توڑ دے کعب ابوسفیان کے گھر گیا ابو سفیان نے اس کا بڑا احترام کیا۔ باقی یہودی قریش کے مختلف گھروں میں الگ الگ مہمان رہے اہل مکہ میں سے کسی نے کعب سے کہا کہ تم بھی اہل کتاب ہو اور محمد ﷺ بھی صاحب کتاب ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہمیں یہ شک ہے کہ یہ ایک سازش ہے جو ہمیں ختم کرنے کے لئے کی جارہی ہے اگر تم یہ چاہتے ہو کہ ہم آپس میں عہد و پیمان کریں تو پہلی شرط یہ ہے کہ ان دو بتوں (دو بڑے بتوں کی طرف اشارہ کیا) کو سجدہ کرو اور ان پر ایمان لے آؤ تو انہوں نے ایسا ہی کیا اس کے بعد کعب نے اہل مکہ سے یہ پیشکش کی کہ تیس افراد تم میں سے اور تیس افراد ہم میں سے خانہ کعبہ کے پاس جائیں اور اپنے شکم خانہ کعبہ کی دیوار سے لگا کر کعبہ کے پروردگار سے عہد کریں کہ ہم محمد (ﷺ) سے جنگ کرنے میں کوتاہی نہیں کریں گے غرض یہ پروگرام طے پایا گیا آخر میں ابوسفیان نے کعب کی طرف رخ کر کے کہا تو ایک پڑھا لکھا آدمی ہے اور ہم جاہل اور ان پڑھ ہیں تیرے خیال میں ہم اور محمد (ﷺ) میں سے کون حق سے زیادہ نزدیک ہے۔

کعب نے کہا اپنا دین میرے سامنے تفصیل سے بیان کرو

ابوسفیان نے کہا ہم حاجیوں کے لئے بڑے بڑے اونٹوں کی قربانی کرتے ہیں انہیں پانی پلاتے ہیں مہمان نوازی کرتے ہیں قیدیوں کو آزاد کرتے ہیں صلہ رحمی کرتے ہیں اپنے پروردگار کے گھر کو آباد کرتے ہیں اس کے گرد طواف کرتے ہیں اور ہم سرزمین مکہ میں اللہ کے اہل خانہ ہیں لیکن محمد ﷺ اپنے بزرگوں کے دین سے دست بردار ہو گیا ہے اس نے اپنے رشتہ داروں سے قطعی رحمی کی ہے دین خدا اور قدیمی دین سے نکل گیا ہے اور محمد ﷺ کا دین نیا اور نو خیز ہے۔

اس پر کعب نے کہا: خدا کی قسم تمہارا دین محمد ﷺ کے دین سے بہتر ہے۔

اس وقت مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور ان باتوں کا جواب دیا گیا۔

تفسیر

سازشی لوگ

پہلی آیت اس شان نزول کو پیش نظر رکھتے ہوئے جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے یہودیوں کی ایک اور ناپسندیدہ صفت کی تصویر کشی کرتی ہے کہ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے ہر گروہ کے ساتھ سازشیں کرتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے بت پرستوں کو خوش کرنے کے لئے بتوں کے سامنے سجدہ بھی کرلیا اور جو کچھ انہوں نے عظمت اسلام اور صفات پیغمبر اکرم ﷺ دیکھی اور پڑھی تھیں انہیں نظر انداز کر دیا یہاں تک کہ بت پرستوں کو خوش کرنے کے لئے ان کے لئے بے ہودہ اور برائیوں سے معمور مذہب کو اسلام سے بہتر قرار دے دیا باوجودیکہ وہ اہل کتاب تھے اور بت پرستوں کی نسبت اسلام سے ان کے مشترک مسائل کہیں زیادہ تھے اسی لیے آیت بطور تعجب بیان کرتی ہے کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو کتاب خدا کا کچھ حصہ رکھنے کے باوجود بتوں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں اور باغیوں اور سرکشوں کے ساتھ اظہار ایمان کرتے ہیں۔

اس پر بھی قناعت نہیں کی بلکہ انہوں نے کافروں سے کہا کہ تمہارا راستہ مسلمانوں کی نسبت ہدایت سے زیادہ قریب ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں اس قسم کی سازشیں کرنے والوں کا انجام بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں خداوند عالم نے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور جسے خدا تعالیٰ اپنی رحمت سے دور کر دے اس کا تمہیں یار و مددگار کہیں نہیں ملے گا۔ آیت کے اعلان کے مطابق یہودی اپنی سنگین سازشوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے آخر کار ناکام ہو کر شکست کھائی اور ان کے بارے میں قرآن کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔

(۵۳) اَمۡ لَهُمۡ نَصِيۡبٌ مِّنَ الۡمُلۡكِ فَاِذًا لَّا يُؤۡتُوۡنَ النَّاسَ نَقِيۡرًا ۙ	کیا ان یہودیوں کا حکومت میں کوئی حصہ ہے حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ لوگوں کو ان کا کوئی حق نہ دیتے۔
(۵۴) اَمۡ يَحۡسُدُوۡنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ۚ فَقَدۡ اٰتَيۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ الۡكِتٰبَ وَ الۡحِكۡمَةَ وَ اٰتَيۡنٰهُمۡ مُّلۡكًا عَظِيۡمًا	یا یہ کہ وہ لوگوں کے ساتھ (پیغمبر اور ان کے اہل بیت سے) اس کے بدلے میں جو خداوند عالم نے اپنے فضل و کرم سے انہیں مرحمت فرمایا ہے حسد کرتے ہیں (وہ کیوں حسد کرتے ہیں) حالانکہ ہم نے آل ابراہیم کو (کہ یہودی بھی اسی خاندان سے ہیں) کتاب و حکمت عطا کی اور انہیں ایک عظیم حکومت عطا کی۔

(۵۵)فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ صَدَّ عَنۡهُ ؕ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيۡرًا	ان میں سے ایک جماعت تو اس پر ایمان لے آئی لیکن ایک گروہ نے اس کے راستے میں رکاوٹ پیدا کر دی اور جہنم کی آگ کا بھڑکتا شعلہ ان کے لئے کافی ہے۔

تفسیر

گذشتہ دو آیتوں کی تفسیر میں لکھا جا چکا ہے کہ یہودیوں نے مکہ کے بت پرستوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے یہ گواہی دی کہ قریش کی بت پرستی مسلمانوں کی خدا پرستی سے بہتر ہے یہاں تک کہ انہوں نے خود بتوں کے آگے ماتھا رگڑا اس آیت میں اس نکتہ کی یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ دو دلیلوں کی وجہ سے ان کا فیصلہ کوئی حیثیت اور قیمت نہیں رکھتا۔

1۔ وہ معاشرے میں ایسی حیثیت مرتبہ اور قدر و قیمت نہیں رکھتے کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کر سکیں لوگوں نے کبھی حکومت یا انصاف کی خدمت انہیں نہیں سونپی کہ وہ اس کام کی طرف قدم بڑھا سکیں۔ اس کے علاوہ وہ کوئی مادی روحانی معنوی اور باطنی طور پر لوگوں پر حکومت کرنے کی لیاقت و قابلیت نہیں رکھتے کیونکہ ان میں دوسروں پر بھروسہ کرنے کی روح ہی نہیں اگر انہیں یہ حیثیت مل بھی جائے تو وہ کسی شخص کو کوئی حق دینے کے لئے تیار نہ ہوں گے بلکہ تمام اختیارات اور خصائص اپنے ساتھ مخصوص کر لیں گے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ یہودیوں کا جذبہ انصاف ایسا ہے کہ وہ ہمیشہ یا تو اپنے حق میں فیصلہ دیتے ہیں یا پھر ان کے حق میں جو ان کی راہ پر گامزن ہوں اس لیے مسلمان کبھی اس قسم کی باتوں سے پریشان نہ ہو۔

(۵۴) 2۔ اس قسم کے غلط فیصلے پیغمبر اکرم ﷺ کے خاندان سے حسد کی بنا پر ہیں اس وجہ سے ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے وہ کفران نعمت اور ظلم و ستم کی وجہ سے مقام نبوت و حکومت اپنے ہاتھ سے کھو بیٹھے ہیں اس لیے وہ نہیں چاہتے کہ یہ الٰہی منصب کسی کے سپرد کیا جائے اس لیے وہ پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کے خاندان سے جنہیں اس نعمت الٰہی سے نوازا گیا ہے حسد کرتے ہیں اور اس قسم کے بے بنیاد فیصلوں سے اپنی حسد کی آگ پر پانی چھڑکتے ہیں۔

اس کے بعد فرماتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ اور خاندان بنی ہاشم کو یہ منصب ملنے پر کیوں تعجب کرتے ہیں پریشان ہوتے ہیں اور حسد کرتے ہیں جبکہ خداوند عالم نے آل ابراہیم کو آسمانی کتاب حکمت و دانش اور وسیع حکومت حضرت موسیٰ علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام اور داؤد علیہ السلام کو دی۔ لیکن افسوس کہ تم ناخلف لوگوں نے وہ قیمتی معنوی اور مادی سرمائے شرارت اور قساوت و بے رحمی کے ہاتھوں ضائع کر دیئے۔

ایک حدیث میں ہے کہ اس آیت کے بارے میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

''نحن المحسودون'' (ہم ہیں کہ جن پر دشمنوں نے حسد کیا)

(۵۵) اس کے بعد قرآن اس آیت میں فرماتا ہے کہ اس زمانے کے لوگوں کا ایک گروہ اس آسمانی کتاب پر ایمان لایا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی اور کچھ لوگ نہ صرف یہ کہ وہ ایمان نہیں لائے بلکہ وہ اس کی تبلیغ اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن گئے

ان کے لئے جہنم کی آگ کا بھڑکتا ہوا شعلہ کافی ہے۔اسی طرح اس کتابِ آسمانی سے جو پیغمبر اسلام ﷺ پر نازل ہوئی جو لوگ کفر کرتے ہیں وہ بھی اسی عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

حسد باطنی اور روحانی طور پر وسعت قلب ونظر کی کمی، نادانی، ایمان کی کمزوری کوتاہ فکری اور نقص کی نشانی ہے کیونکہ حاسد در اصل اپنے آپ کو محسود کے مرتبہ تک پہنچنے سے عاجز پاتا ہے اس لیے وہ محسود کو پیچھے دھکیلنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے اس کے علاوہ وہ عملی طور پر خداوند عالم کی حکمت پر جو ان نعمتوں کا اصل سرچشمہ ہے اعتراض کرتا ہے اور خداوند عالم کی طرف سے نعمتیں پانے والوں پر انگلیاں اٹھاتا ہے۔

اسی لیے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"الحسد اصله من عمى القلب والجحود لفضل الله تعالى و هما جناحان للكفر و بالحسد وقع ابن ادم فى حسرة الابدو هلك مهلكا لا ينجو منه ابدا"

(حسد اور بدخواہی دل کی تاریکی اور اندھا پن ہے اور اس کا سرچشمہ خدا کی نعمتوں کا انکار ہے اور یہ دونوں دل کا اندھا پن اور خدا کی بخشش پر اعتراض کفر کے دو پر ہیں حسد کے سبب سے فرزند آدم ہمیشہ کی حسرت میں ڈوب گیا اور ایسی ہلاکت میں گرا ہے جس سے ہرگز رہائی حاصل نہیں کرسکتا)۔

(۵۶) اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا	وہ لوگ جو ہماری آیتوں کا انکار کرتے ہیں عنقریب ہم انہیں آگ میں ڈال دیں گے جب ان کی جلد جل جائے گی ہم انہیں دوسری جلد دیں گے تاکہ وہ سزا کا مزہ چکھتے رہیں خدا توانا، قادر اور حکیم ہے۔
(۵۷) وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ؗ وَّ نُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا	اور وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک عمل کیے وہ عنقریب باغات بہشت میں داخل ہوں گے جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے ان کے لئے پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور انہیں ایسے گھنے سایوں میں لے جائیں گے جو منقطع نہ ہوں گے۔

تفسیر

گذشتہ آیتوں کے بعد ان دو آیتوں میں ایماندار اور بے ایمان کے انجام کی وضاحت کی گئی ہے پہلی آیت اعلان کرتی ہے

کہ ہم کافروں کو آگ میں ڈالیں گے اور جس وقت ان کے بدن کی کھال جل جائے گی تو دوسری کھال اگا دیں گے تاکہ وہ خداوند عالم کی سزا کا دیر تک مزا چکھیں۔

کھال کے تبدیل ہونے کا سبب بظاہر یہ ہے کہ ممکن ہے جلد کے جل جانے کے بعد درد کم محسوس ہو۔ مگر اس وجہ سے تاکہ سزا میں تخفیف نہ ہو بلکہ وہ پورے زور پر رہے اس کے جسم پر نئی جلد چڑھا دی جائے گی یہ حق وعدالت کو پاؤں تلے روندنے اور خدا کے حکم سے منہ موڑنے پر اصرار کا نتیجہ ہے آیت کے آخر میں فرماتا ہے خدا اس قسم کی سزا دینے پر قادر وتوانا ہے اور صاحب حکمت بھی ہے وہ حساب کے مطابق سزا دیتا ہے۔

اس کے بعد میں آنے والی آیت میں ان افراد کو جو ایمان اور عمل صالح رکھنے والے ہیں وعدہ کرتا ہے کہ وہ انہیں بہت جلد جنت کے ان باغوں میں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں داخل کرے گا جہاں ایک ابدی اور جاودانی زندگی ہوگی اس کے علاوہ انہیں پاک بیویاں دی جائیں گی جو ان کی روح اور جسم کی تسکین اور آرام کا سبب ہوں گی اور وہ ایسے درختوں کے سائے میں زندگی بسر کریں گے جو اس دنیا کی ڈھلتی چھاؤں کے خلاف ہمیشہ رہنے والے سائے ہوں گے وہاں کبھی گرمی کی لو اور سردی کی ہوا کا گزر نہ ہوگا۔

(۵۸) اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا	خداوند عالم تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو پہنچا دو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے لگو تو عدل کے مطابق فیصلہ کرو خدا تمہیں اچھی نصیحت اور وعظ کرتا ہے خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

شان نزول

تفسیر مجمع البیان اور دوسری اسلامی تفسیروں میں ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب پیغمبر اکرم ﷺ فتح مبین کیساتھ شہر مکہ میں داخل ہوئے اور عثمان بن طلحہ کو جو خانہ کعبہ کا کلید بردار تھا طلب فرمایا اور اس سے چابی لی تاکہ خانہ خدا کو بتوں سے پاک وصاف کریں حضرت عباس نے جو حضرت رسول اکرم ﷺ کے چچا تھے اس کام سے فراغت پانے کے بعد تقاضا کیا کہ خدا کے گھر کی چابی انہیں دے کر بیت اللہ کی کلید برادری کا منصب ان کے سپرد کر دیں یہ منصب عربوں میں ایک بلند وبالا مرتبہ تھا گویا عباس چاہتے تھے کہ اپنے بھیجتے کے اجتماعی وسیاسی اثر ورسوخ سے ذاتی نفع حاصل کریں لیکن حضرت پیغمبر اکرم ﷺ نے اس تقاضا کے خلاف خانہ کعبہ کو بتوں کی نجاست سے پاک کرنے کے بعد کعبہ کا دروازہ بند کر کے یہ آیت تلاوت فرماتے ہوئے ''اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا'' چابی عثمان بن طلحہ ہی کو دے دی۔

تفسیر

دواہم اسلامی قانون امامت اورعدالت

زیرنظرآیت اگرچہ بہت سی دوسری آیتوں کی طرح خاص موقع پرمحل پرنازل ہوئی ہےلیکن واضح ہے کہ اس سے ایک عام حکم کا پتہ چلتا ہے آیت تفصیل سے بتاتی ہے کہ خداتمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کودے دو۔واضح ہے کہ یہاں امانت کالفظ ایک وسیع معنی میں اوروہ ہرقسم کی مادی اورروحانی چیزوں اورامورپرمحیط ہے ہرمسلمان اس آیت کے مطابق ذمہ دار ہے کہ کسی کی امانت میں کسی استثناء کی بغیر خیانت نہ کرے صاحب امانت مسلمان ہوکہ غیرمسلم اوریہ حقیقت میں اسلام میں حقوق انسانی کا اعلان ہے جس میں تمام انسان برابر ہیں یہ امرقابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا شان نزول میں امانت صرف ایک مادی امانت نہیں تھی اوردوسرا فریق مشرک تھا۔

آیت کے دوسرے حصے میں ایک اوراہم قانون کی طرف اشارہ ہےاوروہ ہےحکومت اورقضاوت میں عدالت آیت خبردارکرتی ہے کہ خدانےتمہیں یہ بھی حکم دیاہے کہ جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کروتوعدالت کے مطابق حکم دو۔اس کے بعدان دونوں احکام کی تاکید کےطورپرفرماتاہے خداتمہیں بہترین وعظ ونصیحت کرتاہے۔پھرتاکید کرتے ہوئےفرماتاہے ہرحالت میں خدا تمہارےاعمال کادیکھنے والاہے وہ تمہاری باتوں کوبھی سنتاہےاورتمہارےکاموں کوبھی دیکھتاہے۔یہ قانون بھی کلی اورعمومی ہے۔

(۵۹)یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ۠	اےایمان والو!خدا کی اطاعت کرواوررسول اورصاحبان امرکی اطاعت کرواورجب کسی چیزمیں جھگڑوتواگرخدااور آخرت پرایمان رکھتے ہوتواسےخدااورپیغمبرکی طرف لوٹادو یہ تمہارے لیے بہترہےاوراس کا انجام واختتام بہت اچھا ہے۔

تفسیر

یہ آیت اوربعد کی چندآیتیں ایک اہم ترین اسلامی مسئلے یعنی مسئلہ رہبری کے بارے میں بحث کررہی ہیں اورمسلمانوں کےمختلف دینی اوراجتماعی مسائل میں حقیقی مراجع جن کی طرف رجوع کیاجائےکومشخص اورمتعین کرتی ہیں سب سے پہلے ایمانداروں کو حکم دیاگیاہے کہ وہ خداوندعالم کی اطاعت کریں اوریہ بات روشن ہے کہ ایک ایماندارشخص پرواجب ہے کہ اس کی تمام اطاعتوں کی انتہا خداوندعالم کی اطاعت پرہواوراس کےحکم کے مطابق ہرقسم کی رہبری کاسرچشمہ اس کی ذات گرامی ہوکیونکہ جہان ہستی کا مالک تکوینی اورحاکم اعلی وہی ہےاس لیے ہرقسم کی حاکمیت مالکیت اسی کےفرمان کےمطابق ہوناچاہیے۔

دوسرےمرحلے میں پیغمبراکرم ﷺ کی پیروی کاحکم دیاگیاہےوہ رسول ﷺ جومعصوم ہےاورکبھی ہواوہوس سے بات

نہیں کرتا پیغمبر ﷺ جولوگوں میں خدائی نمائندہ ہے جس کی بات خدا کی بات ہے اسے یہ مرتبہ یہ بلند مقام خداوند عالم نے مرحمت فرمایا ہے اس وجہ سے کہ خدا کی اطاعت تو اس کی ذات کی خالقیت وحاکمیت کی بنا پر ہے لیکن حضور ﷺ کی اطاعت فرمان پروردگار کی وجہ سے ہے دوسرے لفظوں میں خدا بالذات واجب الاطاعت ہے اور پیغمبر ﷺ بالغیر واجب الاطاعت ہیں شاید آیت میں اطیعوا کا تکرار اسی بات کی طرف اشارہ ہے یعنی دونوں اطاعتوں میں یہ فرق ہے۔

تیسرے مرحلے میں اولوالامر کی اطاعت کا حکم ہے جو اسلامی معاشرے میں سے ہو اور لوگوں کے دین ودنیا کی حفاظت کرے۔

اولوالامر کون ہیں؟

تمام شیعہ مفسرین اس سلسلے میں ایک متفق نظریہ رکھتے ہیں کہ اولوالامر سے مراد ائمہ معصومین علیہم السلام ہیں جن کو تمام امور زندگی میں اسلامی معاشرے کی مادی اور روحانی رہنمائی خدا اور پیغمبر ﷺ کی طرف سے سپرد کی گئی ہے ان کے علاوہ یہ لفظ کسی پر صادق نہیں آتا البتہ ایسے لوگ جو ان کی طرف سے کسی مرتبے یا عہدے کے لئے مقرر کیے جائیں اور اسلامی معاشرے کے کسی عہدہ پر فائز ہوں تو معینہ شرائط کے ساتھ ان کی اطاعت بھی ضروری ہے لیکن یہ اس لحاظ سے نہیں کہ وہ اولوالامر ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ اولوالامر کے نمائندے ہیں اب مندرجہ بالا تفاسیر کی تحقیق اور مطالعہ کے لیے پوری تن دہی سے توجہ دیتے ہیں۔

اگر کسی چیز میں اختلاف پڑ جائے تو اسے خدا اور رسول ﷺ کی طرف پلٹا دو اگر تم خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اس کا انجام بھی بہت ہی اچھا ہے۔

(٦٠) اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَ يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا	کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ ان (کتب آسمانی) پر جو تم پر اور تم سے پہلے نازل ہوئی ہیں ایمان لے آئے ہیں لیکن وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت اور حکام باطل سے فیصلہ کرائیں جبکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ طاغوت کا انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ انہیں بری طرح گمراہ کردے۔

شان نزول

مدینہ منورہ کے ایک یہودی کو ایک منافق سے کسی چیز میں اختلاف تھا انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک شخص کو قاضی کے طور پر چن لیں یہودی چونکہ پیغمبر اسلام ﷺ کی عدالت اور غیر جانبداری پر مطمئن تھا اس لیے اس نے کہا کہ میں تمہارے پیغمبر ﷺ کے فیصلہ پر رضامند ہوں لیکن منافق نے یہودیوں کے ایک بڑے آدمی کعب بن اشرف کو چنا

کیونکہ وہ جانتا تھا کہ رشوت دے کر اس کی رائے کو اپنی طرف پھیر لے گا غرض اس نے اس طرح رسول اکرم ﷺ کے فیصلہ کرنے کی مخالفت کی اس پر یہ آیہ شریفہ نازل ہوئی جس میں ایسے افراد کی شدید مذمت کی گئی۔

تفسیر

طاغوت کا فیصلہ

زیر نظر آیت درحقیقت گذشتہ آیت کی تکمیل کرتی ہے کیونکہ گذشتہ آیت مومنین کو خدا تعالیٰ پیغمبر ﷺ اور اولوا الامر کی اطاعت اور کتاب وسنت سے فیصلہ کرانے کی دعوت دیتی ہے اور یہ آیت طاغوت کی اطاعت پیروی اور اس سے فیصلہ کروانے سے منع کرتی ہے

مندرجہ بالا آیت ان مسلمانوں کو (جو اپنے فیصلے کروانے کے لئے ایسے حکام کے پاس جاتے تھے) ملامت کرتے ہوئے کہتی ہے اے رسول کیا آپ ان لوگوں کو نہیں دیکھتے جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تمام کتابوں پر جو آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ سے پہلے نبیوں پر نازل ہوئی ہیں ایمان لے آئے ہیں لیکن اس کے باوجود اپنے جھگڑوں کا فیصلہ طاغوت سے کرواتے ہیں جبکہ انہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ ہرگز طاغوت کا حکم نہ مانیں۔اس کے بعد قرآن مزید اعلان کرتا ہے کہ طاغوت کی طرف توجہ ایک ایسا شیطانی جال ہے جو چاہتا ہے کہ لوگوں کو سیدھی راہ سے ہٹا کر دور دراز کے گمراہی کے راستوں میں پھینک دے۔

(۶۱)وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۚ	جب ان سے کہا جائے کہ جو خدا نے نازل کیا ہے اس کی طرف آؤ اور پیغمبر کی جانب آؤ تو تم دیکھو گے کہ منافق تمہاری دعوت قبول کرنے سے روگردانی کرتے ہیں۔
(۶۲)فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّ تَوْفِيْقًا	جب وہ اپنے اعمالوں کی وجہ سے کسی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں تو پھر کیوں تمہارے پاس آ کر قسم کھاتے ہیں کہ (ہمارا مقصد دوسروں کے پاس فیصلہ لے جانے سے) نیکی کرنے (اور طرفین نزاع میں) موافقت کروانے کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

(۶۳)اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ یَعۡلَمُ اللّٰہُ مَا فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ ٭ فَاَعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ وَ عِظۡہُمۡ وَ قُلۡ لَّہُمۡ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ قَوۡلًۢا بَلِیۡغًا	وہ ایسے لوگ ہیں کہ جو کچھ ان کے دل میں ہے خدا اسے جانتا ہے انہیں (سزا دینے سے) نظر انداز کرو اور انہیں وعظ و نصیحت کرو اور عمدہ بیان کے ساتھ ان کے اعمال ان کے گوش گزار کرو۔

تفسیر

طاغوت کے فیصلے کا نتیجہ

طاغوت اور ظالم و جابر فیصلہ کرنے والوں کی طرف جانے سے منع کرنے کے بعد جس کا ذکر گذشتہ آیت میں آ چکا ہے اب ان تین آیتوں میں اسی طرح کے فیصلوں کے نتیجے اور وہ حیلے جن سے منافق سہارا لیتے تھے ان پر تحقیق اور بحث کی گئی ہے چنانچہ خداوند عالم پہلی آیت میں فرماتا ہے اس قسم کے مسلمان نما لوگ نہ صرف یہ کہ اپنا فیصلہ کروانے کے لئے طاغوت کے پاس جاتے ہیں بلکہ جب انہیں یاد دہانی کروائی جاتی ہے کہ حکم خدا کی طرف پلٹ آ ؤ اور پیغمبر کا فیصلہ قبول کرلو تو وہ پیغمبر کی دعوت سے ڈٹ کر روگردانی کرتے ہیں اور اس کام کو کرنے کے لئے اصرار کرتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ حقیقت میں ان کا طاغوت کی طرف لوٹنا وقتی اور ہنگامی نہیں تھا کہ اس کی یاد دہانی سے اصلاح ہو جاتی بلکہ ان کا مخالفت کرنا اور اس کام میں ڈٹ جانا ان میں روح نفاق کی کارفرمائی اور ایمان کی کمزوری پر روشنی ڈالتا ہے ورنہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت سے بیدار ہو جاتے اور اپنی غلطی مان لیتے۔

(۶۲) اس آیت میں اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ یہی منافق افراد جب اپنے اعمال کے نتیجے میں کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور بچاؤ کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تو پھر بادل ناخواستہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آتے ہیں۔

پھر اس موقع پر قسمیں کھاتے ہیں کہ ہمارا دوسروں کے پاس مقدمہ لے جانے سے مقصد نیکی کے سوا اور دعویٰ کرنے والوں کے درمیان موافقت اور صلح کروانے کے کچھ نہیں تھا۔

(۶۳) لیکن خدا اس آیت میں ان کے چہروں سے نقاب اٹھا دیتا ہے اور اس قسم کے جھوٹے بہانوں کو باطل قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جن کے دل کے بھیدوں کو خدا خوب جانتا ہے۔ خداوند عالم اس کے باوجود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ انہیں سزا دینے سے چشم پوشی فرمائیے۔ اسی لیے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منافقین کے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے پر جہاں تک ممکن تھا نرمی فرماتے تھے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظاہر پر مامور تھے اور انہیں غیر معمولی جرم کے سوا سزا نہیں دیتے تھے کیونکہ وہ ظاہری طور پر مسلمانوں کی صفوں میں دکھائی دیتے تھے اور ممکن تھا کہ ان کو سزا ایک قسم کا انتقام سمجھی جائے اس کے بعد حکم دیتا ہے کہ انہیں وعظ و نصیحت کیجئے اور عمدہ بیان سے ان کے دلوں پر اثر ڈالیے اور ان کے اچھے اعمال کے خوشگوار نتائج ان کو بتائیے۔

(۶۴)وَ مَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَ لَوۡ اَنَّهُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡٓا اَنۡفُسَهُمۡ جَآءُوۡكَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰهَ وَاسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا	ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ حکم خدا سے اس کی اطاعت کی جائے اگر یہ مخالفت کرنے والے جو اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں آپ کے پاس آتے اور خدا سے مغفرت مانگتے اور پیغمبر بھی ان کے لئے استغفار کرتے تو وہ خداوند عالم کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔

تفسیر

قرآن نے گذشتہ آیات میں ظالم حکام اور قاضیوں کی طرف جانے کی مذمت کی ہے اس آیت میں تاکید کے طور پر یہ فرماتا ہے کہ جن پیغمبروں کو ہم بھیجتے ہیں وہ سب کے سب اس لیے ہیں تا کہ حکم خدا سے ان کی اطاعت کی جائے اور ان کی کسی قسم کی مخالفت نہ ہونے پائے۔ کیونکہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے تھے اور حکومت الٰہیہ کے رئیس بھی تھے اس لیے لوگوں کا فرض تھا کہ وہ خدا کے احکام کے بیان اور ان کی تعمیل میں ان کی پیروی کریں اور صرف ایمان کا دعویٰ کرنے پر قناعت نہ کریں اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کو بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ سب لوگ ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کریں اگر بعض لوگوں نے اپنی آزادی سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے اطاعت نہیں کی تو یہ ان کی اپنی کوتاہی ہے۔

اس کے بعد آیت آخر میں گناہگاروں اور ان لوگوں کے لئے جو طاغوت کی طرف آتے جاتے ہیں یا اور کسی صورت میں گناہ کر چکے ہیں واپسی کی راہ کھولتے ہوئے فرماتا ہے جنہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا تھا اگر وہ آپ کے پاس آجاتے اور خدا سے بخشش طلب کرتے اور پیغمبر بھی ان کے لئے طلب مغفرت کرتے تو خداوند عالم کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔

یہ امر توجہ طلب ہے کہ بجائے اس کے کہ قرآن کہتا کہ انہوں نے خدا کی نافرمانی کی ہے اور ظالم حاکموں کی طرف گئے ہیں فرماتا ہے۔ جب انہوں نے اپنے پر ظلم کیا مقصد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے حکم اور پیغمبر کی اطاعت میں تمہارا اپنا ہی فائدہ ہے اور ان کی مخالفت اپنے آپ پر ہی ظلم ہے کیونکہ یہ تمہاری مادی زندگی کو تباہ کر دیتا ہے اور حقیقت میں معنوی طور پر تمہاری پسماندگی کا سبب ہے

یہ آیت ان لوگوں کے لئے بھی واضح جواب ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام کے وسیلے کو ایک قسم کا شرک جانتے ہیں کیونکہ یہ آیت صراحت کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ بارگاہ پیغمبر میں آنا اور انہیں بارگاہ رب العزت میں شفیع قرار دینا اور ان کے وسیلہ اور ان کی جانب سے دعائے مغفرت توبہ کی قبولیت اور رحمت الٰہی کا ذریعہ ہیں اگر پیغمبر کا واسطہ، دعا، استغفار اور شفاعت شرک ہوتے تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ خدا گناہگاروں کو اس طرح کا حکم دیتا البتہ گناہگاروں کو چاہیئے کہ وہ پہلے توبہ کریں اور گناہوں کو ترک کر دیں اس کے بعد اپنی توبہ کی قبولیت کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فیض حاصل کریں۔

(۶۵)فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا	تیرے پروردگار کی قسم وہ مومن نہیں ہوسکتے مگر یہ کہ وہ اپنے اختلافات میں آپ کو حکم اور فیصلہ کرنے والا مانیں اور پھر آپ کے فیصلہ پر اپنے دل میں کوئی ناراضگی محسوس نہ کریں بلکہ اسے مکمل طور پر تسلیم کرلیں۔

شان نزول

زبیر بن عوام جو مہاجرین میں سے تھے ان کا ایک انصاری کے ساتھ جو مدینہ کے مسلمانوں سے تھا ان باغوں کے سیراب کرنے کے متعلق جو ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے اختلاف ہوگیا دونوں حضرات اپنے جھگڑے کا فیصلہ کروانے کے لئے پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے کیونکہ زبیر کا باغ نہر کے بلند حصہ کی طرف تھا اور انصاری کا باغ نشیب میں تھا اس لیے حضرت رسول اکرم ﷺ نے زبیر کو حکم دیا کہ پہلے تم اپنے باغ کو پانی دے لو اور اس کے بعد یہ انصاری مسلمان پانی دے یہ اس رواج کے مطابق تھا جو ایک دوسرے کے قریب باغوں کے بارے میں تھا لیکن وہ انصاری جو بظاہر مسلمان تھا پیغمبر اکرم ﷺ کے عادلانہ فیصلہ سے ناراض ہوکر کہنے لگا کیا آپ نے یہ فیصلہ اس لیے کیا ہے کہ زبیر آپ کی پھوپھی کا بیٹا ہے؟ حضور ﷺ کو اس کی اس گفتگو سے تکلیف پہنچی یہاں تک کہ آپ ﷺ کے چہرے کا رنگ دگرگوں ہوگیا اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس میں ایسے مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی۔

تفسیر

حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنا

اگرچہ آیت مندرجہ بالا کے ابتدائی حصے کے بارے میں شان نزول بیان کی جاچکی ہے تاہم جیسا کہ ہم بارہا لکھ چکے ہیں کہ آیت کی مخصوص شان نزول کبھی اس کے عام مفہوم کے خلاف نہیں ہوتی اس بنا پر ہوسکتا ہے کہ یہ آیت گذشتہ آیت کی بحث کی تکمیل کرتی ہو۔غرض خداوند عالم اس آیت میں قسم کھا کر فرماتا ہے کہ انسانوں کا ایمان حقیقی اور واقعی اس وقت ہوگا جب وہ اپنے اختلافات میں پیغمبر کو فیصل اور حاکم مانیں اور دوسروں کی طرف رجوع نہ کریں۔اس کے بعد فرماتا ہے کہ نہ صرف فیصلہ آپ کے پاس لے کر آئیں بلکہ جب آپ ﷺ اس کے درمیان فیصلہ کریں تو چاہے وہ ان کے نفع میں ہو یا نقصان میں نہ صرف یہ کہ وہ زبان اعتراض نہ کھولیں بلکہ ان کا دل بھی مطمئن ہونا چاہیئے۔

آیت مندرجہ بالا سے ضمنی طور پر دو اہم مطلب معلوم ہوتے ہیں۔

1۔ یہ آیت رسول اکرم ﷺ کے معصوم ہونے کی دلیل ہے کیونکہ پیغمبر ﷺ کے تمام احکامات کی گفتار و کردار میں

مطلق اور کامل طور پر پذیرائی یہاں تک کہ دلی طور پر ان کے آگے جھکنا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ آپ ﷺ کو احکام خداوندی اور اپنے فیصلوں میں نہ کوئی اشتباہ ہوتا ہے اور نہ آپؐ جان بوجھ کر خلاف حق کہتے یا کرتے ہیں لہٰذا آپ ﷺ خطا سے بھی معصوم ہیں اور گناہ سے بھی۔

2۔ آیت مندرجہ بالا نص پیغمبر ﷺ کے مقابلہ میں اجتہاد اور ایسے مسائل میں جن کے بارے میں خدا اور حضرت رسول اکرم ﷺ کی طرف سے حکم صریح موجود ہو اظہارِ رائے اور اظہار عقیدہ کی نفی کرتی ہے لہٰذا اگر تاریخ اسلام ہمیں یہ بتائے کہ بعض لوگ خدا و پیغمبر کے حکم کے مقابلے میں اجتہاد اظہار رائے اور اظہار عقیدہ کیا کرتے تھے مثلاً یہ کہتے تھے کہ پیغمبر ﷺ نے اس طرح کہا ہے اور میں یہ کہتا ہوں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ ان کا عمل مندرجہ بالا آیت کی صراحت کے بالکل خلاف ہے۔

(٦٦)وَ لَوۡ اَنَّا كَتَبۡنَا عَلَيۡهِمۡ اَنِ اقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ اَوِ اخۡرُجُوۡا مِنۡ دِيَارِكُمۡ مَّا فَعَلُوۡهُ اِلَّا قَلِيۡلٌ مِّنۡهُمۡ‌ؕ وَ لَوۡ اَنَّهُمۡ فَعَلُوۡا مَا يُوۡعَظُوۡنَ بِهٖ لَكَانَ خَيۡرًا لَّهُمۡ وَ اَشَدَّ تَثۡبِيۡتًا ۙ	اگر انہیں بھی ہم حکم دیتے کہ ایک دوسرے کو قتل کریں یا اپنے وطن سے نکل جائیں تو بہت تھوڑے لوگ اس پر عمل کرتے اور اگر وہ ان نصیحتوں پر چلتے تو ان کے فائدہ میں تھا کیونکہ ایسا کرنا ان کے ایمان کی تقویت کا سبب بنتا۔
(٦٧)وَّ اِذًا لَّاٰتَيۡنٰهُمۡ مِّنۡ لَّدُنَّاۤ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ۙ	اور اس صورت میں ہم انہیں اپنی طرف سے بہت بڑی جزا اور ثواب عطا فرماتے۔
(٦٨)وَّ لَهَدَيۡنٰهُمۡ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا	اور انہیں صراط مستقیم کی ہدایت کرتے۔

تفسیر

یہاں گذشتہ بحث کی تکمیل کی گئی ہے جو ان لوگوں کے متعلق تھی جو رسول اکرم ﷺ کے عادلانہ فیصلوں پر چیں بہ جبیں ہوتے تھے گذشتہ امتوں کے تکلیف دہ اور سخت احکام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے ہم نے کوئی مشکل فرض ان کے کندھوں پر نہیں رکھا اگر ہم گذشتہ امتوں کی طرح مثلاً یہودی کہ جنہیں ان کی بت پرستی اور گوسالہ پرستی کے بعد یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس عظیم گناہ کے کفارہ میں ایک دوسرے کو قتل کریں یا اپنے عزیز وطن کو چھوڑ کر کہیں باہر چلے جائیں انہیں بھی اس قسم کا سخت حکم دیتے تو اس کو کس طرح بجا لاتے یہ تو ایک باغ کی آبیاری کے بارے میں بھی پیغمبر ﷺ کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے تو پھر یہ دوسری آزمائشوں پر کس طرح پورا اتر سکتے ہیں مسلّم ہے کہ اگر انہیں اس قسم کا حکم دیتے کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کریں یا وطن چھوڑ دیں تو بہت کم لوگ اس پر عمل کرتے۔

اس کے بعد فرماتا ہے اگر وہ خدا اور رسول ﷺ کے پند و نصائح قبول کر لیں تو اس میں خود ان کا بھی فائدہ ہے اور ان کے

ایمان کی تقویت کا سبب بھی ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ یہاں خداوند عالم کے احکام کو وعظ ونصیحت سے تعبیر کیا گیا ہےاس کا مقصد یہ ہے کہ یہ احکام ایسے نہیں ہیں جن سے حکم دینے والے (خداوند عالم) کو ذرہ بھر فائدہ پہنچے، بلکہ حقیقت میں وہ ایسی نصیحتیں ہیں جو خود تمہارے نفع میں ہیں اس لیے بلا فاصلہ فرماتا ہےان کی اطاعت بھی تمہارے لیے منفعت بخش ہےاور تمہارے ایمان کی تقویت کا موجب بھی ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ رہے کہ آیت کا آخری حصہ بتاتا ہے کہ جس قدر انسان خدا کے حکم کی اطاعت کی راہ میں قدم بڑھائے اس قدر اس میں اثبات اور استقامت پیدا ہوتی ہے حقیقت میں خدا کے فرمان کی اطاعت ایک روحانی ورزش ہے جس کا لگا تار عمل جسمانی ورزش کی طرح روز بروز قوت، قدرت، ثبات اور استحکام میں اضافہ کرتا رہتا ہےاس طرح آہستہ آہستہ انسان ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ کوئی طاقت اس کے ایمان کی قوت پر غلبہ حاصل نہیں کرسکتی اور نہ اسے دھوکا دے سکتی ہے۔

(٦٧) اس کے بعد والی آیت میں خدا کے سامنے تسلیم واطاعت کا تیسرا فائدہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہےاس وقت (علاوہ اس کے جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے) انہیں عظیم اجر وثواب بھی دیں گے۔

(٦٨) زیر نظر آیات میں سے آخری آیت میں چوتھے فائدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ ہم انہیں سیدھی راہ کی ہدایت کریں گے۔

واضح ہے کہ اس ہدایت سے مراد اصل دین وآئین کی ہدایت نہیں ہے بلکہ یہ نئے الطاف الٰہی ہیں جو خداوند عالم کی طرف سے ہدایت ثانوی کی صورت میں اور اجر وثواب کے طور پر ایسے اہل افراد کو دیئے جائیں گے۔

(٦٩)وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ الرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیۡقِیۡنَ وَ الشُّہَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیۡنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیۡقًا ؕ	جو شخص خدا اور رسول کی اطاعت کرے تو وہ (قیامت کے دن) ایسے لوگوں کا ساتھی ہوگا جن پر خدا نے اپنی نعمت تمام کر دی ہے اور وہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین میں سے ہیں اور وہ بہترین رفیق ہیں۔
(٧٠)ذٰلِکَ الۡفَضۡلُ مِنَ اللّٰہِ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ عَلِیۡمًا ٪	یہ خداوند عالم کا فضل وکرم ہےاور یہ بات کافی ہے کہ وہ (بندوں کے نیتوں اور اعمال سے) آگاہ ہے۔

شان نزول

ثوبان رسول اللہ کا ایک صحابی تھا وہ حضور ﷺ سے بہت الفت ومحبت رکھتا تھا ایک دن نہایت پریشانی کے عالم میں آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا آپ ﷺ نے اس سے پریشانی کا سبب دریافت فرمایا تو اس نے عرض کیا کہ جب میں ﷺ سے جدا ہوتا ہوں اور آپ ﷺ کو نہیں دیکھتا تو پریشان ہو جاتا

ہوں۔آج میں اس فکر میں غوطہ زن تھا کہ کل قیامت کے دن اگر میں اہل بہشت میں سے ہوا تو یہ مسلم ہے کہ میں آپ ﷺ کے درجے میں تو نہیں ہوں گا اس وجہ سے آپ ﷺ کو تو کبھی نہ دیکھ سکوں گا اور اگر اہل جنت میں سے نہ ہوا تو پھر بھی زیارت سے محروم رہوں گا بنا بریں ہر دوصورت میں آپ ﷺ کی حضور کے شرف سے مشرف نہ ہوسکوں گا پھر ان حالات میں کیسے پریشان نہ ہوں۔اس وقت مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور ایسے لوگوں کو بشارت دی گئی کہ مطیع اور فرمانبردار افراد جنت میں بھی انبیاء اور بزرگان دین کے ساتھی ہوں گے اس کے بعد حضرت رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ خدا کی قسم کسی مسلمان کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک وہ مجھے اپنی ذات، ماں، باپ اور تمام رشتہ داروں سے زیادہ دوست نہ رکھے اور میری بات کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرے۔

تفسیر

جنت کے ساتھی

اس آیت میں ان لوگوں کا ایک اور افتخار و اعزاز بیان کیا گیا ہے جو خداوند عالم اور اس کے رسول کے مطیع وفرمانبردار ہیں اور حقیقت میں ان خصوصیات و امتیازات کی تکمیل کرتا ہے جن کا ذکر گذشتہ آیتوں میں ہو چکا ہے

جیسا کہ سورہ الحمد کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ جو لوگ اس نعمت کے حامل ہیں وہ ہمیشہ صراط مستقیم پر گامزن رہتے ہیں اور کم سے کم گمراہی اور روگردانی بھی نہیں کرتے اس کے بعد خداوند عالم نے اس جملہ کی وضاحت اور ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جن پر اس نے اپنی نعمت کی تکمیل فرمائی ہے چار قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو حقیقتا اس موضوع کے چار رکن ہیں۔

1۔خدا کے مخصوص بھیجے ہوئے انبیاء جو لوگوں کی ہدایت اور رہبری کے لئے صراط مستقیم کی طرف سب سے پہلے اپنا قدم بڑھاتے ہیں۔

2۔سچ بولنے والے وہ لوگ جو بات کے سچے ہوتے ہیں اور اپنے عمل اور کردار سے اپنی بات کی سچائی کو ثابت بھی کرتے ہیں اور اس امر کا ثبوت دیتے ہیں کہ وہ ایمان کے دعویٰ دار ہی نہیں ہیں بلکہ واقعی خدا کے احکام پر ایمان بھی رکھتے ہیں۔

3۔شہداء پاکیزہ الٰہی عقیدہ اور مقصد کی راہ میں قتل ہونے والے یا منتخب نیک لوگ جو قیامت کے دن انسانوں کے اعمال پر گواہ ہوں گے۔

4۔صالحین علم و عمل کے لحاظ سے لائق اور شائستہ افراد جو مثبت اصلاحی اور مفید کام کرنے کی وجہ سے اور انبیاء کے احکام کی پیروی کرکے بلند مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں۔

ان آیتوں سے ضمنی طور پر یہ حقیقت بھی خوب واضح ہوتی ہے کہ اچھی معاشرت رکھنے والے بے مثل ساتھی اس قدر اہم ہیں کہ عالم آخرت میں بھی جنت کی نعمتوں کی تکمیل کے لئے اطاعت گزاروں کو اس عظیم نعمت سے نوازا جائے گا دوسرے افتخارات اور

اعزازات کے علاوہ وہ انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین کی رفاقت بھی حاصل کریں گے۔

(۷۰) آیت میں اس امتیاز عظیم (منتخب افراد کی ہم نشینی) کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے یہ خداوند عالم کا خاص فضل و کرم ہے اور وہ بندوں کی حالتوں، نیتوں، لیاقتوں اور قابلیتوں سے خوب آگاہ ہے۔ جو بعید کا اسم اشارہ ہے اس قسم کے مقامات پر اہمیت اور مرتبہ کی بلندی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

(۷۱) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا	اے ایمان والو! اپنی پوری طرح احتیاط کرو اور دستے دستے (ہوکر) نکلو یا سب اکٹھے نکلو

تفسیر

قرآن مجید مندرجہ بالا آیت میں تمام مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے انہیں اپنے اجتماع اور وجود کے تحفظ کے لئے دو احکام اور ہدایات دیتا ہے پہلے کہتا ہے اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو بڑی باریک بینی سے دشمنوں اور ان کے جاسوسوں پر نظر رکھے رہو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان کی طرف سے غافل ہو کر کسی خطرے سے دوچار ہو جاؤ۔ اس کے بعد حکم دیتا ہے کہ دشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے مختلف طریقوں اور ٹکنیکوں (Techniques) سے استفادہ کرو اور متعدد دستوں کی صورت میں یا اکٹھے ہو کر دشمن کو زیر کرنے نکل پڑو۔ جہاں مختلف دستوں اور بکھری ہوئی ٹولیوں کی صورت میں حرکت کرنا ضروری ہو وہاں اس طریقے سے آگے بڑھو اور جہاں یہ امر لازمی ہو کہ سب ایک متحدہ لشکر کی صورت میں دشمن کے مقابلے پر نکلیں وہاں اجتماعیت سے غفلت نہ برتو۔

بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیت میں حذر کی تفسیر صرف اسلحہ کے معنی میں کی ہے حالانکہ حذر کے وسیع معنی ہیں اور اس کا مفہوم اسلحہ تک محدود نہیں ہے علاوہ ازیں خود اسی سورہ کی آیت ۱۰۲ میں واضح دلیل موجود ہے جہاں حذر اسلحہ کے مختلف معنی میں استعمال ہوا ہے۔

(۷۲) وَ اِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا	تمہارے درمیان کچھ (منافق) لوگ ہیں کہ وہ خود بھی کاہل ہیں اور دوسروں کو بھی سست بناتے ہیں اگر کوئی مصیبت آ پہنچے تو وہ کہتے ہیں کہ خدا نے ہم پر احسان کیا کہ ہم مجاہدین کے ساتھ نہیں تھے کہ ہم اس (مصیبت) کو دیکھتے۔

(۷۳)وَ لَئِنۡ اَصَابَکُمۡ فَضۡلٌ مِّنَ اللّٰہِ لَیَقُوۡلَنَّ کَاَنۡ لَّمۡ تَکُنۡۢ بَیۡنَکُمۡ وَبَیۡنَہٗ مَوَدَّۃٌ یّٰلَیۡتَنِیۡ کُنۡتُ مَعَہُمۡ فَاَفُوۡزَ فَوۡزًا عَظِیۡمًا	اگر کوئی مال غنیمت تمہیں مل جائے تو ٹھیک حالانکہ تم میں اور ان میں کوئی مودت و دوستی نہیں پھر بھی وہ بالکل اس طرح سے کہتے ہیں کاش ہم بھی ان کے ساتھ ہوتے اور نجات اور عظیم کامیابی سے ہمکنار ہوتے۔

تفسیر

دشمن کے مقابلہ میں جہاد اور تیاری کے عمومی حکم کے بعد کہ جو گذشتہ آیت میں بیان ہوا ہے اس آیت میں منافقین کی ایک جماعت کی حالت بتاتے ہوئے اللہ فرماتا ہے یہ دو چہروں والے افراد جو تمہارے درمیان ہیں پوری کوشش کرتے ہیں کہ حق کی راہ میں لڑنے والوں کی صفوں میں شریک ہونے سے بچ جائیں۔

لیکن جب مجاہدین میدان جنگ سے واپس آتے ہیں یا میدان جنگ کی خبریں انہیں ملتی ہیں اگر مسلمانوں کو شکست یا شہادت نصیب ہوئی ہو تو وہ مسرت وانبساط سے کہتے ہیں کہ خدا نے ہمیں کتنی بڑی نعمت دی ہے ہم یہ دلخراش منظر دیکھنے کے لئے ان کے ساتھ نہیں تھے۔

لیکن اگر انہیں یہ خبر ملے کہ حقیقی مومنین کامیاب ہو گئے ہیں اور نتیجے میں مال غنیمت ان کے ہاتھ لگا ہے تو یہ منچلے بیگانوں کی طرح حسرت ویاس سے کہتے ہیں کہ کاش ہم بھی مجاہدین کے ساتھ ہوتے اور ہمیں بھی بڑا حصہ (مال غنیمت) ملتا جیسے مومنین سے تو ان کا کوئی ربط ہی نہ ہو۔

(۷۳) اگر چہ اس آیت میں مال غنیمت کا ذکر نہیں ہوا لیکن واضح ہے کہ جو راہ خدا میں شہادت کو ایک بلا اور مصیبت تصور کرتا ہے اور شہادت کا شعور نہ رکھنے کو خدا کی نعمت تصور کرتا ہے اس کے نزدیک صرف مادی اور جنگی غنائم کا حصول عظیم کامیابی اور فتح ہے۔

(۷۴)فَلۡیُقَاتِلۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ یَشۡرُوۡنَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا بِالۡاٰخِرَۃِ ؕ وَ مَنۡ یُّقَاتِلۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَیُقۡتَلۡ اَوۡ یَغۡلِبۡ فَسَوۡفَ نُؤۡتِیۡہِ اَجۡرًا عَظِیۡمًا	وہ لوگ جنہوں نے دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے بیچی ہے انہیں چاہئے کہ خدا کی راہ میں جنگ کریں اور جو شخص راہ خدا میں جنگ کرے اور قتل ہو جائے یا غالب آ جائے تو ہم اسے اجر عظیم دیں گے۔

تفسیر

مومنین کو جہاد کے لئے آمادہ کرنا

گذشتہ آیات میں منافقین کو مومنین کی صفوں سے جدا کر کے دکھایا گیا ہے اس آیت میں اور اس کے بعد آنے والی چند

آیات میں صاحب ایمان افراد کو اثر انگیز دلائل کے ساتھ راہ خدا میں جہاد کرنے کی دعوت دی گئی ہے اس طرف بھی توجہ کرنی چاہئے کہ یہ آیات ایک ایسے زمانے میں نازل ہوئی ہیں جب طرح طرح کے اندرونی اور بیرونی دشمن اہل اسلام کو ڈرا دھمکا رہے تھے ایسے میں ان آیات کی اہمیت زیادہ واضح ہو جاتی ہیں جن میں مسلمانوں کی روح جہاد کو ابھارا گیا ہے آیت کی ابتدا میں خدا فرماتا ہے راہ خدا میں وہ افراد جنگ کریں جو دنیا کی پست مادی زندگی کا دوسرے جہان کی ابدی اور جاوداں زندگی سے تبادلہ کرنے کو تیار ہیں۔

صرف وہ لوگ حقیقی مجاہدین کہلا سکتے ہیں جو اس بات کے لئے آمادہ ہوں اور انہوں نے بجا طور پر یہ جان لیا ہو کہ مادی دنیا کی زندگی جیسا کہ لفظ دنیا (بمعنی پست تر) سے ظاہر ہوتا ہے ہمیشہ رہنے والی زندگی کے لئے باعزت موت کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن جو لوگ مادی زندگی کو گراں بہا اور خدائی وانسانی مقدس اہداف و مقاصد سے بالاتر سمجھتے ہیں وہ کبھی اچھے مجاہد نہیں ہو سکتے اس کے بعد آیت کے ذیل میں فرماتا ہے ایسے مجاہدین کا انجام واضح ہے کیونکہ وہ شہید ہو جائیں گے یا دشمن کو تباہ کر دینگے اور ان پر غالب آ جائیں گے اور دونوں صورتوں میں ہم انہیں اجر عظیم دیں گے۔

یہ مسلم ہے کہ ایسے جانبازوں کی لغت میں شکست کا وجود نہیں ہے وہ دونوں صورتوں میں اپنے آپ کو کامیاب سمجھتے ہیں یہی ایک جذبہ اس امر کے لئے کافی ہے کہ دشمن ان کے لئے کامیابی کے وسائل فراہم کرے تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ مسلمانوں کو ایسے دشمنوں پر تیزی سے غلبہ حاصل ہو جو تعداد ساز و سامان اور جنگی تیاریوں کے لحاظ سے ان کے مقابلے میں کئی گنا بالا دستی رکھتے تھے اس کا محرک یہی ناقابل شکست جذبہ تھا یہاں تک کہ غیر مسلم علماء جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے اور آپ ﷺ کے بعد اسلام اور مسلمانوں کی تیز رفتار کامیابیوں پر بحث کی ہے انہوں نے بھی اس جذبے کو ان کی پیش رفت کا محرک قرار دیا ہے۔

(۷۵)وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۭ	کیوں تم خدا کی راہ میں ان مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے کہ (جو ستمگروں کے ہاتھوں) کمزور کر دیئے گئے ہیں جنگ نہیں کرتے وہ (ستم زدہ) افراد جو کہتے ہیں کہ خدایا ہمیں اس شہر (مکّہ) سے نکال لے جہاں کے رہنے والے ظالم ہیں اور ہمارے لیے اپنی طرف سے ایک سرپرست بھیج اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی یار و مددگار بھیج۔

تفسیر

انسانی جذبوں کو مظلوموں کی مدد کے لئے ابھارا گیا ہے

گذشتہ آیت میں مومنین کو جہاد کی دعوت دی گئی ہے لیکن خدا و قیامت پر ایمان اور سود و زیاں کے استدلال کا سہارا لیا گیا

ہے اس آیت میں انسانی جذبات واحساسات کی بنیاد پر جہاد کی طرف دعوت دیتے ہوئے کہتا ہے کیوں تم راہ خدا میں اور مظلوم وبیکس مردوں ،عورتوں اور بچوں کے لئے جو ستم گروں کے چنگل میں گرفتار ہیں جنگ نہیں کرتے کیا تمہارے انسانی جذبات اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ خاموش بیٹھے رہو اور ان رقت انگیز مناظر کو دیکھتے رہو۔

اس کے بعد مومنین کے احساسات کو ولولہ انگیز بنانے کے لئے کہتا ہے یہ مستضعفین وہی لوگ ہیں جو گھٹے ہوئے ماحول میں گرفتار ہو چکے ہیں اور ہر جگہ سے ناامید ہو گئے ہیں لہٰذا دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہوئے خدا سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس ظلم و ستم کے ماحول سے انہیں نجات دے۔

نیز اپنے خدا سے یہ تقاضا بھی کرتے ہیں کہ وہ ایک ولی وسرپرست ان کی حمایت کے لئے بھیج دے (وَاجۡعَل لَنَا مِنۡ لَدُنۡکَ وَلِیًّا) اور کہتے ہیں ہمارے لیے کوئی یارومددگار بھیج۔

حقیقت میں اوپر والی آیت اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ خدا نے ان کی دعا کو قبول کر لیا ہے اور اس عظیم انسانی پیغام رسالت کو تمہارے ذمہ قرار دیا ہے اور تم خدا کی طرف سے ''ولی و نصیر '' ہو جو ان کی حمایت اور نجات کے لئے معین کیے گئے ہو لہٰذا ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ تم اس موقع اور اعلیٰ حیثیت کو اپنے ہاتھ سے گنوا بیٹھو۔

(٧٦)اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۚ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ الطَّاغُوۡتِ فَقَاتِلُوۡۤا اَوۡلِیَآءَ الشَّیۡطٰنِ ۚ اِنَّ کَیۡدَ الشَّیۡطٰنِ کَانَ ضَعِیۡفًا ؑ	جو صاحب ایمان ہیں وہ راہ خدا میں جنگ کرتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ طاغوت (اور فسادی لوگوں) کی راہ میں لڑتے ہیں لہٰذا تم ان شیطان کے دوستوں سے جنگ کرو (اور ان سے ڈرو نہیں) کیونکہ شیطان کا مکروفریب (اس کی طاقت کی طرح) ضعیف وکمزور ہے۔

تفسیر

پھر اس آیت میں مجاہدین کو شجاعت پر ابھارا گیا ہے اور انہیں دشمن کے ساتھ مبارزہ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اس کے علاوہ مجاہدین کی صفوں اور اہداف ومقاصد کو مشخص وممتاز کرنے کے لئے اس طرح فرماتا ہے

''صاحب ایمان افراد خدا کی راہ میں اور اس کے لئے جو خدا کے بندوں کے لئے سودمند ہے جنگ کرتے ہیں لیکن بے ایمان افراد طاغوت یعنی تباہ کرنے والی طاقتوں کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔''

بہر حال ان کی زندگی کے دن مبارزہ اور مقابلہ سے خالی نہیں ہیں زیادہ سے زیادہ ایک گروہ حق کی راہ میں اور دوسرا باطل اور شیطان کی راہ میں برسرپیکار ہے اس کے بعد کہتا ہے شیطان کے ساتھیوں سے جنگ کرو اور ان سے ڈرو نہیں۔

طاغوت ،فسادی قوتیں اور ظالم طاقتیں ظاہراً جتنی بھی بڑی اور قوی نظر آئیں لیکن باطن میں زبوں حال اور ناتواں ہیں ان

کے ظاہری ساز و سامان تیاری اور آراستہ و پیراستہ ہونے سے نہ ڈرو کیونکہ ان کا باطل کھوکھلا ہے اور ان کے منصوبے اور سازشیں ان کی طاقت اور توانائی کی طرح ناقص و کمزور ہیں کیونکہ خدائے لایزل کی قدرت پر ان کا تکیہ نہیں ہے بلکہ وہ شیطانی طاقتوں پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں۔

(۷۷)اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ قِیۡلَ لَھُمۡ کُفُّوۡۤا اَیۡدِیَکُمۡ وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ۚ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیۡھِمُ الۡقِتَالُ اِذَا فَرِیۡقٌ مِّنۡھُمۡ یَخۡشَوۡنَ النَّاسَ کَخَشۡیَۃِ اللّٰہِ اَوۡ اَشَدَّ خَشۡیَۃً ۚ وَ قَالُوۡا رَبَّنَا لِمَ کَتَبۡتَ عَلَیۡنَا الۡقِتَالَ ۚ لَوۡ لَاۤ اَخَّرۡتَنَاۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیۡبٍ ؕ قُلۡ مَتَاعُ الدُّنۡیَا قَلِیۡلٌ ۚ وَ الۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لِّمَنِ اتَّقٰی ۟ وَ لَا تُظۡلَمُوۡنَ فَتِیۡلًا	کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں (مکہ میں) کہا گیا کہ (وقتی طور پر) جہاد سے دستبردار ہو جاؤ اور نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو (مگر وہ اس حکم سے رنجیدہ اور غیر مطمئن تھے) لیکن جس وقت (مدینہ میں) انہیں جہاد کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے ایسے ڈرتا تھا جس طرح خدا سے ڈرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ وہ کہنے لگے پروردگار! تو نے ہم پر جہاد کیوں فرض کیا ہے کیوں یہ حکم دینے میں تاخیر نہیں کی ان سے کہہ دو زندگانی دنیا کا سرمایہ ناچیز اور کم تر ہے اور جو پرہیزگار ہو اس کی آخرت بہتر ہے اور تم پر چھوٹے سے چھوٹا ظلم بھی نہیں ہوگا۔

شان نزول

مفسرین کی ایک جماعت مثلاً عظیم مفسر طوسی مؤلف ''تبیان'' اور مولفین ''تفسیر قرطبی'' اور ''المنار'' ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی ایک جماعت جب مکہ میں مقیم تھی اور مشرکین کی طرف سے اس پر ظلم وستم توڑے جا رہے تھے اس جماعت کے افراد پیغمبر ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم قبول اسلام سے پہلے محترم اور معزز تھے لیکن قبول اسلام کے بعد ہماری حالت دگرگوں ہوگئی ہے اور ہم وہ عزت اور احترام کھو بیٹھے ہیں ہمیں دشمن نے اذیت اور مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے اگر آپ اجازت دیں تو ہم دشمنوں سے جنگ کریں تاکہ اپنا وقار اور مرتبہ دوبارہ بحال کر سکیں اس روز پیغمبر ﷺ نے فرمایا! ابھی مجھے جنگ کرنے کا حکم نہیں ہے لیکن جب مسلمان مدینہ میں جا بسے اور مقابلے کے لئے زمین ہموار ہوگئی جہاد کا حکم نازل ہوا تو ان میں سے بعض جو پہلے لڑنے کے لئے تلے بیٹھے تھے اب میدان جہاد میں جانے سے کترانے لگے اور اس دن کا جوش و ولولہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں میں جذبۂ شجاعت بیدار کرنے کے لئے اور جہاد سے گریز کرنے والے افراد کو ملامت کرتے ہوئے حقائق

بیان کیے۔

تفسیر

وہ جو صرف باتیں کرنا جانتے ہیں

قرآن یہاں کہتا ہے: اس گروہ کی حالت واقعاً تعجب خیز ہے جو ایک نامناسب موقع پر بڑی گرم جوشی اور شوروغوغا سے تقاضا کرتا تھا کہ انہیں جہاد کی اجازت دی جائے انہیں حکم دیا گیا کہ ابھی اپنی حفاظت اور تعمیر کا کام کریں نماز پڑھیں اپنی تعداد بڑھائیں اور زکوۃ دیتے رہیں لیکن جب ہر لحاظ سے فضا ہموار ہوگئی اور جہاد کا حکم نازل ہوا تو ان پر خوف و ہراس طاری ہوگیا اور وہ اس حکم کے سامنے زبان اعتراض دراز کرنے لگے۔

وہ اپنے اعتراض میں صراحت کے ساتھ کہتے تھے خدایا تو نے اتنا جلدی جہاد کا حکم نازل کر دیا کیا اچھا ہوتا اگر اس حکم کو تاخیر میں ڈال دیتا یا یہ پیغام رسالت آئندہ کی نسلوں کے ذمہ ڈال دیا جاتا۔

قرآن اس قسم کے افراد کو دو طرح کے جواب دیتا ہے پہلا جواب یہ ہے کہ جو" یَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً" کی عبارت کے دوران دیا جا چکا ہے یعنی وہ لوگ بجائے اس کے کہ خدائے قادر و قاہر سے ڈریں کمزور اور ناتواں انسانوں سے خوف زدہ ہیں بلکہ وہ ان نحیف و ناتواں لوگوں سے خدا کی نسبت زیادہ ڈرتے ہیں دوسرا یہ کہ ایسے افراد سے کہا جائے کہ فرض کرو چند دن جہاد نہ کرنے کی وجہ سے آرام و سکون حاصل کر لو گے پھر بھی یہ زندگی فانی اور بے قیمت ہے لیکن ابدی اور دائمی جہان تو پرہیز گار لوگوں کیلیے زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے خصوصاً جب انہیں مکمل طور پر عوض اور اجر مل جائے گا اور معمولی سے معمولی ظلم بھی ان پر نہیں ہو گا......................

(۷۸) اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا	تم جہاں کہیں بھی رہو موت تمہیں پا لے گی اگرچہ محکم برجوں میں جا رہو اور اگر انہیں (منافقین کو) حسنہ (اور کامیابی) حاصل ہو تو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور سیئہ (اور شکست) سے دو چار ہوں تو کہتے ہیں یہ تمہاری طرف سے ہے کہہ دو کہ سب اللہ کی طرف سے ہیں پس یہ گروہ کیوں تیار نہیں ہوتا کہ حقائق کا ادراک کرے۔

(۷۹)مَآ اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰہِ وَ مَآ اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ وَ اَرْسَلْنٰکَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا وَ کَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا	جو نیکیاں تجھ پر پہنچتی ہیں وہ خدا کی طرف سے ہیں اور جو برائی تجھے پہنچتی ہے وہ خود تیری طرف سے ہے اور ہم نے تجھے لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس بارے میں خدا کی گواہی کافی ہے۔

تفسیر

گذشتہ اور بعد کی آیات پر غور کریں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں آیات بھی منافقین سے متعلق ہیں جو مسلمانوں کی صفوں میں رہتے تھے جیسا کہ گذشتہ آیات میں ہے کہ وہ میدان جہاد میں شرکت کرنے سے ڈرتے تھے اور جب جہاد کا حکم صادر ہوا تو انہیں تکلیف ہوئی قرآن ان کے اس طرز فکر کا دو طرح سے جواب دے رہا ہے پہلا جواب تو وہی تھا جو گذشتہ آیت کے آخر میں گزر چکا ہے۔

''کہہ دو کہ دنیاوی زندگی بہت کم ہے لیکن پرہیز گاروں کے لئے دوسرے جہان میں اس کا صلہ موجود ہے''

(۷۸) دوسرا جواب جو زیر بحث ہے کہ موت سے فرار اختیار کرنا تمہارے لیے مفید نہیں حالانکہ تم جہاں کہیں بھی ہو موت سے تم کو مفر نہیں آخر ایک دن تمہیں اس کا نوالہ بننا ہے یہاں تک کہ تم مضبوط گنبدوں میں کیوں نہ چھپ جاؤ پس وہ موت جسے ضرور آنا ہے اور جس سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے کیوں نہ اسے اصلاح اور سچائی کے لئے قبول کیا جائے جیسے جہاد کی صورت میں، بجائے اس کے کہ بے کار اور لاحاصل موت قبول کی جائے۔

جب یہ حقیقت مدنظر ہو تو کیا یہ عقل مندی ہے کہ انسان میدان جہاد میں جانے اور قابل فخر مرتبے پر فائز ہونے کی بجائے اس سے کنارہ کش ہو کر گھر میں آرام کرتا رہے فرض کرلیں کہ جہاد سے کنارہ کش ہو کر وہ زندگی کے چند روز اور گزار لے اور وہی کام دہراتا رہے جو پہلے کرتا رہا ہے۔

راہ خدا میں جہاد کرنے والے کے اجر و ثواب سے بے بہرہ ہو جائے تو کیا یہ عقل اور منطق کے مطابق صحیح ہے اصولی طور پر موت ایک عظیم حقیقت ہے اور موت کے استقبال کے لئے افتخار کے ساتھ آلودہ ہونا چاہئے۔

یہ بجا ہے کہ مضبوط قلعے بعض اوقات غیر طبعی موت سے بچا لیتے ہیں مگر پھر بھی موت سے مکمل نجات نہیں دلا سکتے اور چند دنوں بعد طبعی موت انسان کو آلیتی ہے۔

کامرانیوں اور ناکامیوں کا سرچشمہ

قرآن اس آیت کے ذیل میں منافقین کی کچھ اور بے بنیاد باتوں اور باطل خیالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے وہ جب بھی کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں اور نیکیاں اور حسنات ان کے ہاتھ آتی ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے یعنی ہم اس قابل تھے کہ خدا نے ہمیں یہ شفقتیں اور نعمتیں عطا کی ہیں۔

لیکن جب انہیں شکست کا سامنا ہو یا میدان جنگ میں کوئی مشکل لاحق ہو تو کہتے ہیں کہ یہ پیغمبر ﷺ کی غلط تدبیر اور ان کی جنگی حکمت عملی کے خام ہونے کی وجہ سے تھا اس ضمن میں وہ جنگ احد کی شکست کا حوالہ دیتے ہیں۔

لیکن اس آیت کا ربطہ پہلے اور بعد کی ان آیات سے ہے جو منافقین کے بارے میں نشاندہی کرتی ہیں یہ آیت بھی زیادہ تر انہی سے مربوط ہے بہرحال قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ ایک مؤحد اور بالغ نظر خدا پرست کی نگاہ میں یہ تمام حوادث، کامیابیاں اور شکستیں خدا کی طرف سے ہیں جو لوگوں کی قابلیت اور اہلیت کے مطابق انہیں دی جاتی ہیں۔

اور آیت کے آخر میں اعتراض کے طور پر ان منافقین کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ لوگ فکر اور غور نہیں کرتے ''پس کیوں یہ لوگ حقائق کا ادراک کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔''

(۷۹) اس کے بعد زیر نظر آخری آیت میں اس طرح ارشاد ہوتا ہے کہ تمام نیکیاں کامیابیاں اور حسنات جو تمہیں ملتی ہیں وہ خدا کی طرف سے ہیں اور جو برائیاں اور شکستیں تمہیں درپیش ہوتی ہیں اور وہ خود تمہاری طرف سے ہیں۔

اور آیت کے آخر میں ان لوگوں کو جو اپنی شکستوں اور ناکامیوں کی نسبت پیغمبر ﷺ سے دیتے ہیں اور اصطلاحاً پیغمبر ﷺ کی وجہ سے سمجھتے تھے انہیں جواب دیا گیا پیغمبر ﷺ سے ارشاد ہوتا ہے اور ہم نے تجھے لوگوں کے لئے اپنا پیامبر قرار دیا ہے اور خدا اس پر گواہ ہے اور اس کی گواہی کافی ہے۔

تو کیا یہ ممکن ہے کہ خدا کا بھیجا ہوا لوگوں کی شکست، ناکامی اور برائی کا سبب ہو؟

(۸۰) مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ ۚ وَ مَنۡ تَوَلّٰی فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا ؕ	جس شخص نے پیغمبر کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جو روگردانی کرے تو تم اسکے جوابدہ نہیں ہو۔
(۸۱) وَ یَقُوۡلُوۡنَ طَاعَۃٌ ۫ فَاِذَا بَرَزُوۡا مِنۡ عِنۡدِکَ بَیَّتَ طَآئِفَۃٌ مِّنۡہُمۡ غَیۡرَ الَّذِیۡ تَقُوۡلُ ؕ وَ اللّٰہُ یَکۡتُبُ مَا یُبَیِّتُوۡنَ ۚ فَاَعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ وَ تَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیۡلًا	وہ تیرے سامنے کہتے ہیں کہ ہم فرمانبردار ہیں لیکن جب وہ تمہاری بزم سے باہر جاتے ہیں تو ان میں ایک گروہ تمہاری گفتگو کے برخلاف رات کو خفیہ میٹنگیں تشکیل دیتا ہے جو کچھ وہ ان میٹنگوں میں کہتے ہیں خدا اسے لکھتا ہے ان کی پرواہ نہ کرو۔ اور خدا پر توکل کرو اور کافی ہے کہ وہ تمہارا مددگار اور حفاظت کرنے والا ہو۔

تفسیر

اس آیت میں لوگوں اور ان کے حسنات اور سیئات کے مقابلہ میں رسول ﷺ کی حیثیت بیان کی گئی ہے خدا پہلے فرماتا

ہے کہ جوشخص پیغمبر کی اطاعت کرے اس نے خدا کی اطاعت کی۔

لہٰذا خدا کی اطاعت پیغمبر کی اطاعت سے جدا نہیں ہوسکتی کیونکہ پیغمبر کوئی قدم خدا کی مشیت کے خلاف نہیں اٹھاتا اس کی گفتار کردار، اعمال سب خدا کے فرمان کے مطابق ہیں۔اس کے بعد فرماتا ہے اگر کچھ لوگ اعراض اور روگردانی کرتے ہیں اور وہ تمہارے احکام کے خلاف کھڑے ہوجاتے ہیں تو تم ان کے اعمال کے جواب دہ نہیں ہو اور یہ تمہارا کام نہیں کہ ان سے تکرار کرو یا نافرمانی کرنے سے انہیں جبراً روکو تمہارا فرض تبلیغ رسالت امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور گمراہ و بےخبر لوگوں کی رہنمائی کرنا ہے۔

غور کرنا چاہئے کہ یہ آیت قرآن کی واضح ترین آیات میں سے ہے جو سنت پیغمبر کے حجت ہونے اور آپ کی احادیث کو قبول کرنے کے لئے دلیل ہے لہٰذا کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں قرآن کو قبول کرتا ہوں لیکن پیغمبر کی حدیث اور سنت کو قبول نہیں کرتا کیونکہ درج بالا آیت میں صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ پیغمبر کی حدیث اور سنت کی اطاعت فرمان خدا کی اطاعت ہے۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر ﷺ نے حدیث ثقلین کے مطابق جو کہ مشہور مآخذ اور کتب اسلامی میں مذکور ہے چاہے وہ کتب شیعہ ہوں یا کتب اہل سنت صراحت کے ساتھ اہل بیت علیہم السلام کو سند اور حجت قرار دیا ہے اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اہل بیت علیہم السلام کے فرمان کی اطاعت بھی فرمان خدا کی اطاعت سے الگ نہیں ہے اور کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں قرآن کو تو قبول کرتا ہوں لیکن اہل بیت کے فرامین کو نہیں مانتا کیونکہ یہ بات درج بالا آیت اور اس کی مشابہ آیات کے برخلاف ہے۔

(۸۱) اس کے ساتھ دوسری آیت میں منافقین کے ایک گروہ یا کمزور ایمان والے کچھ لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے وہ لوگ جس وقت مسلمانوں کی صفوں میں پیغمبر کے پاس کھڑے ہوتے ہیں تو اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے یا کسی ضرر سے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لئے دوسروں کے ہم آواز ہوتے اور فرمان پیغمبر ﷺ کی اطاعت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم جان و دل سے پیغمبر کی پیروی کرنے کو تیار ہیں۔

لیکن جب لوگ بزم رسالت سے نکلتے ہیں تو وہ منافقین اور کمزور ایمان والے افراد اپنے عہد و پیمان کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور خفیہ اجتماعات میں پیغمبر کے ارشادات کے خلاف پروگرام بناتے ہیں ''فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِىْ تَقُوْلُ''، اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین پیغمبر ﷺ کے زمانہ میں نچلے نہیں بیٹھتے تھے بلکہ وہ رات کو خفیہ اجتماعات میں ایک دوسرے سے مشورہ کرتے تھے اور پیغمبر اکرم ﷺ کے لائحہ عمل میں رخنہ اندازیاں کرتے تھے لیکن خدا اپنے رسول ﷺ کو حکم دیتا ہے کہ وہ ان سے منہ پھیر لیں اور ان کی سازشوں سے گھبرائیں نہیں اور اپنے لائحہ عمل کے لئے ان پر انحصار نہ کریں بلکہ فقط خدا پر بھروسہ رکھیں خدا جو سب سے زیادہ مدد اور حفاظت کرنے والا ہے۔

(۸۲)اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَ لَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا	کیا قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے کہ اگر وہ غیر خدا کی طرف سے ہوتا تو اس میں وہ بہت سے اختلافات پاتے۔

تفسیر

اعجاز قرآن کی زندہ مثال

ان سرزنشوں کے بعد جو گزشتہ آیات میں منافقین کو کی گئی تھیں یہاں انہیں اور دوسرے تمام ان لوگوں کی طرف جو قرآن کی حقانیت میں شک وتردد کرتے ہیں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کیا یہ لوگ قرآن کی مخصوص وضع وکیفیت پر غور وفکر نہیں کرتے اور اس کے نتائج کو نہیں دیکھتے قرآن اگر خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے نازل ہوتا تو یقیناً اس میں انہیں بہت سے تفاوات اور اختلافات ملتے اب جب کہ اس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف اور تناقص نہیں ہے تو انہیں جان لینا چاہئے کہ وہ خدا ہی کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اصول دین اور ایسے مسائل مثلاً پیغمبر کے دعوے کی سچائی اور قرآن کی حقانیت کے بارے میں تحقیق ومطالعہ کریں اور اندھی تقلید اور بغیر سوچے سمجھے فیصلوں سے اجتناب کریں۔

(۸۳)وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤی اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَا تَّبَعْتُمُ الشَّیْطٰنَ اِلَّا قَلِیْلًا	اور جب کامیابی یا شکست کی خبر انہیں ملے تو وہ (تحقیق کیے بغیر) اسے مشہور کردیتے ہیں لیکن اگر وہ پیغمبر اور صاحبان امر کی طرف (جو تشخیص کی کافی اہلیت وقدرت رکھتے ہیں) پلٹا دیں تو وہ مسائل کی تہہ سے آگاہ ہو جائیں اور خدا کا فضل اور رحمت شامل حال نہ ہوتی تو سوائے قلیل گروہ کے سب کے سب شیطان کی پیروی کرنے لگتے۔

تفسیر

افواہیں پھیلانا

اس آیت میں منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کے ایک اور منفی عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب انہیں مسلمانوں کی فتح یا شکست کے متعلق خبریں پہنچتی ہیں تو وہ تحقیق کیے بغیر انہیں لوگوں میں پھیلاتے ہیں جب کہ بیشتر یہ خبریں بے بنیاد ہوتی ہیں اور دشمنوں کی جانب سے خاص مقاصد کے لئے گھڑی جاتی ہیں ان کا شہرت پانا مسلمانوں کے

لیےضرررساں ہوتا ہے۔حالانکہ ان کی ذمہ داری ہے کہ اس قسم کی خبریں سب سے پہلے اپنے رہبروں اور پیشواؤں کے سامنے رکھیں اوران کی وسیع اطلاعات اور گہری فکر سے استفادہ کریں اور بلاوجہ نہ تو مسلمانوں کو اچھے نتائج کے غرور میں مبتلا کریں جو خیالی کامیابیوں سے پیدا ہوتے ہیں اور نہ شکست کی جھوٹی خبروں سے ان کی ہمتوں کو پست کریں۔

غلط خبریں اور افواہیں پھیلانے کے نقصانات

مختلف معاشروں کو جو بڑے مسائل درپیش ہوتے ہیں اور جو معاشروں سے اجتماعی فکرافہام وتفہیم اور ہم آہنگی کو ختم کر دیتے ہیں ان کا سبب جھوٹی خبریں گھڑنا اوران کی نشر واشاعت ہے اس طرح سے کہ بعض اوقات ایک منافق ایک غلط خبر گھڑ لیتا ہے وہ چند افراد تک پہنچا تا ہے اور وہ بلاتحقیق اس کی نشر واشاعت کرنے لگتے ہیں اور شاید کچھ اس میں اپنی طرف سے اضافے بھی کرتے ہیں اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ کافی حد تک لوگوں کی فکری توانائی ضائع کر دیتے ہیں اور لوگوں کو اس طرف مشغول کر کے انہیں اضطراب اور پریشانی میں مبتلا کر دیتے ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس طرح کی خبریں لوگوں کے اعتماد کو متزلزل کر دیتی ہیں اور معاشرے کو اہم فرائض کی انجام دہی سے سست رو اور متردد کر دیتی ہیں اگر چہ وہ گروہ اور معاشرے جن میں جبر ہے اوران کے گلے گھونٹ دیئے گئے ہیں ان میں بھی جھوٹی خبریں گھڑنا اوران کی نشر واشاعت کرنا ایک قسم کے مقابلے یا انتقام جوئی کے زمرے میں آتا ہے لیکن صحیح معاشروں میں غلط خبروں کی نشر واشاعت بہت زیادہ نقصان دہ ہے اگر اس قسم کی خبریں قابل مثبت اور مفید افراد کے متعلق ہوں تو وہ انہیں خدمات اور کارنامے انجام دینے کے معاملے میں دل سرد اور سست کر دیتی ہیں اور بعض اوقات ان کی برس ہابرس کی حیثیت کو برباد کر دیتی ہیں لوگوں کوان کے وجود کے فوائد سے محروم کر دیتی ہیں اسی بنا پر اسلام صراحت کے ساتھ جھوٹی خبریں گھڑنے کے عمل سے جنگ کرتا ہے اور جعلسازی، جھوٹ اور تہمت گوئی اوراس کی نشر واشاعت بھی ممنوع قرار دیتا ہے درج بالا آیت اس کا ایک نمونہ ہے۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر فضل ورحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی اور پروردگار کے مقرر شدہ رہنماؤں کے ذریعے تم اس قسم کی جھوٹی خبروں اوران کے برے نتائج سے چھٹکارہ حاصل نہ کرتے تو تم میں سے بہت سے لوگ شیطانی راستوں پر چل پڑتے اور قلیل افراد ایسے رہ جاتے جو شیطان کی پیروی سے اجتناب کرتے۔پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صاحب نظر واہل بصیرت علماء ہی ہیں جو غلط مشتہر ہونیوالی خبروں کے وسوسوں سے بچ سکتے ہیں لیکن معاشرے کی اکثریت اگر صحیح رہبری سے محروم رہ جائے تو من گھڑت خبروں اوران کے ضرررساں اثرات سے نہیں بچ سکتی۔

(۸۴)فَقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۚ لَا تُکَلَّفُ اِلَّا نَفْسَکَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّکُفَّ بَاْسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ؕ وَ اللّٰہُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّ اَشَدُّ تَنْکِیْلًا	راہ خدا میں جنگ کرو تم صرف اپنی ذمہ داری کے جواب دہ ہو اور مومنین کو (اس کام کا) شوق دلاؤ امید ہے کہ خدا کافروں کی قوت کو روک دے (چاہے تم اکیلے ہی میدان میں چلے جاؤ) خدا کی قدرت بہت زیادہ ہے اور اس کی سزا دردناک ہے۔

شان نزول

جس وقت ابوسفیان اور قریش کا لشکر فتح و کامیابی کے ساتھ میدان احد سے پلٹا تو ابوسفیان نے پیغمبر ﷺ سے معاہدہ کیا کہ بدر صغری کے موقع پر یعنی ماہ ذی القعدہ میں جو بازار بدر کی زمین پر لگتا تھا دوبارہ ایک دوسرے سے مقابلہ کریں گے۔ جب مقررہ وقت آیا تو حضرت پیغمبر اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو مذکورہ مقام کی طرف جانے کی دعوت دی لیکن مسلمانوں کی ایک جماعت جو جنگ احد کی شکست کی تلخی کو ابھی تک نہیں بھولی تھی اس نے شدت کے ساتھ جانے کی مخالفت کی اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو دوبارہ چلنے کی دعوت دی تو اس موقع پر صرف ستر آدمی پیغمبر اکرم ﷺ کے ہم رکاب ہو کر اس مقام پر پہنچے لیکن ابوسفیان جو مسلمانوں کا سامنا کرنے سے خوف زدہ تھا مقابلہ کرنے نہ آیا اور پیغمبر اکرم ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ صحیح وسلامت مدینہ لوٹ آئے۔

تفسیر

ہر شخص اپنے فرائض کا جوابدہ ہے

جہاد سے متعلق آیات کے بعد اس آیت میں ایک بہت بڑا حکم پیغمبر ﷺ کو دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ ان کی ذمہ داری ہے کہ اکیلے دشمن کے مقابلہ میں کھڑے ہو جائیں چاہے ایک شخص بھی میدان میں ان کا ہم قدم نہ ہو کیونکہ وہ صرف اپنی ذمہ داری کے لئے جوابدہ ہیں اور وہ دوسرے لوگوں کے بارے میں شوق دلانے اور دعوت جہاد دینے کے علاوہ ان کی کوئی مسئولیت نہیں ہے۔

حقیقت میں یہ آیت ایک اہم اجتماعی حکم خصوصاً رہبروں کے متعلق اپنے اندر سموئے ہوئے ہے وہ یہ ہے کہ انہیں اپنے کام میں اس قدر پختہ عزم ثابت قدم اور اٹل ہونا چاہئے کہ اگر کوئی شخص بھی ان کی دعوت پر لبیک نہ کہے تب بھی وہ اپنے مقدس مقصد اور منزل کے حصول کی جد و جہد سے دستبردار نہ ہوں دوسروں کو اپنے فرائض کی انجام دہی کی دعوت دینے کے باوجود اپنے لائحہ عمل کو دوسروں کی مرضی پر نہ چھوڑیں کوئی رہبر بھی جب تک ایسے عزم صمیم کا حامل نہ ہو وہ رہبری کے اہل نہیں اور نہ ہی وہ اپنے مقاصد کے حصول کی صلاحیت رکھتا ہے خصوصاً خدا کے مقرر شدہ رہبر و رہنما بلند عزم و حوصلہ اور کردار کے مالک ہوتے ہیں کیونکہ انہیں خدا کی ذات پر تکیہ ہوتا ہے وہ خدا کہ جو تمام توانائیوں اور طاقتوں کا سرچشمہ ہے۔

لہٰذا اس حکم کے بعد خدا فرماتا ہے امید ہے کہ خدا تیری سعی و کوشش کے ذریعہ دشمنوں کی قدرت و طاقت کو ختم کر دے

گا چاہے ان کے مدمقابل تو اکیلا ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اس کی قدرت تمام قدرتوں سے مافوق اور اس کی سزا تمام عذابوں سے بڑھ کر ہے۔

(۸۵)مَنۡ یَّشۡفَعۡ شَفَاعَةً حَسَنَةً یَّكُنۡ لَّهٗ نَصِیۡبٌ مِّنۡهَا ۚ وَمَنۡ یَّشۡفَعۡ شَفَاعَةً سَیِّئَةً یَّكُنۡ لَّهٗ كِفۡلٌ مِّنۡهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ مُّقِیۡتًا	جو شخص نیک کام کی تحریک دے اس میں سے اس کا حصہ ہو گا اور جو برے کام کے لئے ابھارے گا تو اس میں سے (بھی) اسے حصہ ملے گا۔ اور خدا ہر چیز کا حساب کرتا اور اسے محفوظ رکھتا ہے۔

تفسیر

اچھے یا برے کام کی تحریک دلانے کا نتیجہ

جیسا کہ گذشتہ آیت کی تفسیر میں اشارہ ہو چکا ہے قرآن کہتا ہے کہ ہر شخص پہلے مرحلے میں اپنے کام کا جوابدہ ہے نہ کہ دوسروں کا لیکن اس بنا پر کہ اس سے غلط فائدہ نہ اٹھایا جائے اس آیت میں کہتا ہے یہ درست ہے کہ ہر شخص اپنے فعل کا جوابدہ ہے لیکن جو شخص دوسرے کو نیک کام پر ابھارے تو اس کا حصہ ملے گا اور جو شخص دوسرے کو کسی برے کام پر اکسائے تو اس کا حصہ بھی اس میں ہو گا۔ اس بنا پر ہر شخص کا اپنے اعمال کا جواب دہ ہونے کے معنی یہ نہیں کہ وہ دوسروں کو دعوت حق دینے اور فساد کا مقابلہ کرنے سے آنکھیں بند کر لے اور اسلام کی روح اجتماعیت کو مجروح کرتے ہوئے تجرد وانفرادیت کے ذریعے معاشرے سے بیگانگی کا راستہ اختیار کرے۔

چند ایک روایات جو اس آیت کی تفسیر میں آئی ہیں سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ شفاعت حسنہ یا سیئہ کے معنی میں سے ایک کسی کے حق میں اچھی یا بری دعا کرنا بھی ہے جو کہ بارگاہ خداوندی میں ایک قسم کی شفاعت ہے۔

یہ تفسیر گذشتہ تفسیر سے اختلاف نہیں رکھتی بلکہ شفاعت کے معنی میں وسعت ہے یعنی مسلمان کسی دوسرے کی کسی طرح کی مدد کرے وہ چاہے نیکی کی ترغیب کی صورت میں ہو یا بارگاہ خداوندی میں دعا کی شکل میں ہو یا کسی اور طرح سے اس کے نتیجہ میں شریک ہو گا۔ یہ بات اسلامی پروگراموں کی روح اجتماعیت کو اجاگر کرتی ہے اور مسلمانوں کو شخصی اور فقط ذاتی زندگی گزارنے سے منع کرتی ہے۔

آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے خدا توانا اور صاحب قدرت ہے اور تمہارے اعمال کی حفاظت کرتا اور حساب رکھتا ہے اور حسنات وسیئات کے نتیجے میں مناسب جزا وسزا دے گا۔

(۸۶)وَ اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَسِيْبًا	جس وقت کوئی شخص تمہیں تحیہ (اور سلام) کہے تو اس کا جواب بہتر انداز سے دو یا (کم ازکم) اسی طرح کا جواب دو خدا ہر چیز کا حساب رکھتا ہے۔

تفسیر

احترام محبت

اگر چہ بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ اس آیت کا تعلق گذشتہ آیات کے ساتھ اس لحاظ سے ہے کہ گذشتہ آیات کی مباحث جہاد سے متعلق تھیں اور اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ اگر دشمن دوستی اور مصالحت چاہیں تو تم بھی مناسب جواب دو لیکن واضح ہے کہ یہ تعلق اس سے مانع نہیں کہ ایک کلی اور عمومی حکم تمام تحیات اور نوازشات کے اظہار سے متعلق ہو جو مختلف افراد کی طرف سے ہو آیت کی ابتدا میں آیا ہے جب کوئی شخص تمہیں تحیہ کہے تو اس کا جواب بہتر طریقہ سے دو یا کم ازکم اس کے مساوی جواب دو۔ تحیت لغت میں حیات کے مادہ سے دوسرے کے لئے حیات و زندگی کی دعا کرنے کے معنی میں ہے چاہے یہ دعا ''سلام علیک'' کی صورت میں ہو (خدا تجھے سلامت رکھے) یا حیاک اللّٰہ (خدا تجھے زندہ رکھے) یا اس قسم کے اور الفاظ سے ہو لیکن عام طور پر یہ ہر قسم کے اظہار محبت کے لئے ہے جو لوگ الفاظ کے ذریعہ ایک دوسرے سے کرتے ہیں جس کا واضح ترین اظہار سلام کرنا ہے۔

آیت کے آخر میں اس لیے کہ لوگ جان لیں کہ تحیات ان کے جوابات اور ان کی برتری و مساوات، جس قدر اور جیسے ہوں ،خدا سے پوشیدہ پنہاں نہیں ہیں فرماتا ہے، خدا تمام چیزوں کے حساب سے آگاہ ہے۔

سلام عظیم اسلامی تحیہ ہے

جہاں تک ہمیں معلوم ہے دنیا کی تمام ملل و اقوام کے افراد جب ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں تو ایک دوسرے سے اظہار محبت کے لئے کچھ تحیہ پیش کرتے ہیں جو بعض اوقات لفظی ہوتا ہے اور کبھی عملی بھی۔ عمل عموماً تحیت کی علامت ہوتا ہے۔ اسلام میں بھی ''سلام'' ایک واضح ترین تحیت ہے جیسا کہ اس آیت میں اشارہ ہو چکا ہے تحیہ اگر چہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے۔ تاہم اس کا ایک واضح اظہار سلام کرنا ہے۔ لہٰذا اس آیت اور اس کے بعد والی آیت کے مطابق تمام مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ سلام کا عالی تر یا کم ازکم مساوی جواب دیں۔

(۸۷)اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ۧ	وہ خدا جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں تم سب کو یقینی طور پر قیامت کے دن کہ جس میں کوئی شک نہیں جمع کرے گا اور کون ہے جو خدا سے زیادہ سچا ہو۔

تفسیر

درج بالا آیت گذشتہ آیات کی تکمیل اور بعد میں آنے والی آیات کا مقدمہ ہے کیونکہ گذشتہ آیت میں تحیت کے حکم کے بعد فرمایا ہے کہ خدا تمہارے اعمال کا حساب رکھتا ہے اس آیت میں مسئلہ قیامت اور روز قیامت ہونے والی عام عدالت کا ذکر ہے اور اسے مسئلہ توحید اور خدا کی یکتائی کے مسئلہ کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے جو کہ ایمان کا ایک اور رکن ہے فرماتا ہے کوئی معبود اس کے علاوہ نہیں ہے اور لازمی طور پر تمہیں قیامت کے دن اکٹھا مبعوث کرے گا وہی قیامت کا دن کہ جس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

یجمعنکم کا لفظ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ تمام افراد کے لئے روز محشر ایک ہی ہوگا جیسا کہ سورہ مریم کے آخر میں آیت ۹۳ سے لے کر ۹۵ تک اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ خدا کے تمام بندے چاہے وہ اہل زمین ہوں یا دوسرے کرات کے رہنے والے سب ایک ہی دن مبعوث ہوں گے۔

لا ریب فیه (اس میں کوئی شک وشبہ نہیں) قیامت کے آنے کے بارے میں اس آیت میں اور قرآن کی دوسری آیات میں یہ تعبیر ان قطعی اور مسلم دلائل کی طرف اشارہ ہے جو اس دن قیامت کی خبر دیتے ہیں مثلاً قانون تکامل تخلیق کا حکمت وفلسفہ اور قانون عدالت پروردگار معاد کی بحث میں ان کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے آخر میں اس مطلب کی تاکید کے لئے فرماتا ہے کون ہے جو خدا سے زیادہ سچا ہے۔

لہٰذا وہ جس قسم کا وعدہ روز قیامت یا اس کے علاوہ کسی چیز کے بارے میں کرتا ہے اس پر شک نہیں کرنا چاہئے کیونکہ جھوٹ کا سرچشمہ جہالت ہے یا کمزوری اور ضرورت مندی ہے لیکن وہ خدا جو سب سے زیادہ جاننے والا ہے اور سب سے بے نیاز ہے وہ سب سے زیادہ سچا ہے اور اصولی طور پر جھوٹ اس کے لئے کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔

(۸۸)فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَ اللهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللهُ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا	منافقین کے بارے میں تم دو گروہ کیوں ہو گئے ہو کچھ ان سے جنگ کرنے کو ممنوع اور کچھ جائز سمجھتے ہو حالانکہ خدا نے ان کے اعمال کی بنا پر ان کے افکار پلٹ کر رکھ دیئے ہیں کیا تم چاہتے ہو ایسے اشخاص کو جنہیں خدا نے (ان کے برے اعمال کی وجہ سے) گمراہ رکھا ہے۔

شان نزول

بعض مفسرین نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ مکہ کے کچھ لوگ بظاہر مسلمان تھے لیکن حقیقت میں منافقین کی صفت میں سے تھے اسی لیے وہ مدینہ کی طرف ہجرت کرنا نہیں چاہتے تھے اور عملی طور پر بت پرستوں کے خیر خواہ اور مدد گار تھے لیکن آخر کار مکہ کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے (تاکہ وہ مدینہ کے قریب آ جائیں اور شاید اپنی خصوصی حیثیت کی وجہ سے جاسوسی کے مقصد کے لئے انہوں نے ہجرت کی ہو) اور وہ خوش تھے کہ انہیں مسلمان اپنے میں سے سمجھتے ہیں لہٰذا ان کا خیال تھا کہ مدینہ میں داخل ہونا ان کے لئے قدرتی طور پر کوئی مشکل پیدا نہیں کرے گا مسلمانوں کو اس بات کا پتہ چل گیا لیکن بہت جلد منافقین سے سلوک کے بارے میں مسلمانوں میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا ایک گروہ کا نظریہ تھا کہ ان کو دھتکار دیا جائے کیونکہ حقیقت میں یہ دشمنان اسلام کے مددگار ہیں لیکن کچھ مسلمان ظاہر بین اور سادہ لوح تھے وہ اس کے مخالف تھے اور کہتے تھے کہ ہم کس طرح ایسے لوگوں سے محاذ آرائی کریں جو توحید اور رسالت کی گواہی دیتے ہیں اور صرف ہجرت نہ کرنے کے جرم میں ان کے خون کو مباح اور حلال قرار دیں اس پر درج بالا آیت نازل ہوئی جس میں دوسرے گروہ کو اس غلط فہمی پر ملامت کی گئی اور پھر ان کی راہنمائی بھی کی گئی۔

تفسیر

مندرجہ بالا شان نزول کی طرف توجہ کرنے سے اس آیت اور بعد والی آیت کا منافقین سے متعلق گذشتہ آیات سے ربط مکمل طور پر واضح ہوتا ہے آیت کی ابتدا میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے منافقین کے بارے میں کیوں بٹ گئے ہو اور تم میں سے ہر ایک جدا فیصلہ کرتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے منافقین کے اس گروہ سے ان کے برے اور شرمناک اعمال کی وجہ سے خدا نے اپنی حمایت اور توفیق منقطع کر لی ہے اور منصوبے مکمل طور پر ناکام کر دیئے ہیں اور ان کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی شخص پاؤں پر کھڑا ہونے کی بجائے سر کے بل کھڑا ہو (وَاللهُ أَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوا) ضمنی طور پر ''بما کسبوا'' سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت سعادت اور نجات کے راستے سے ہٹ جانا انسان کے خود اسکے اعمال کا نتیجہ ہے اور اگر اس عمل کو خدا سے نسبت دی جائے تو وہ اس وجہ سے ہے کہ خدا حکیم ہے

اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق سزا دیتا ہے اور لیاقت واہلیت کی مناسبت سے اسے جزا بھی دے گا آیت کے آخر میں سادہ لوح افراد کو جو منافقین کے اس گروہ کی حمایت کرتے ہیں خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کیا تم چاہتے ہو کہ ان لوگوں کو جنھیں خدا نے ان کے برے اعمال کی وجہ سے ہدایت سے محروم کر دیا ہے ہدایت کرو حالانکہ یہ لوگ ہدایت کے قابل نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ تو خدا کی انمٹ سنت ہے کہ کسی شخص کے اعمال کے اثرات اس سے جبر نہیں ہوں گے تو تم یہ توقع کیوں رکھتے ہو کہ وہ افراد جن کی نیت صحیح نہیں اور جن کے دلوں میں نفاق بھرا ہوا ہے اور جو عملاً خدا کے دشمنوں کی حمایت کرتے ہیں انہیں ہدایت نصیب ہوگی یہ تو بے جا اور غیر منطقی توقع ہے۔

(۸۹) وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَ لَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ۙ	یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی طرح کافر ہو جاؤ اور پھر وہ اور تم ایک دوسرے کے برابر ہو جاؤ۔ پس ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ مگر یہ کہ (وہ توبہ کریں اور) خدا کی راہ میں ہجرت کریں لیکن وہ لوگ جو کام سے منہ موڑ لیں (اور تمہارے خلاف اقدامات جاری رکھیں) انہیں جہاں پاؤ قید کر لو اور (اگر ضروری ہو تو) انہیں قتل کر دو اور ان میں سے کسی کو دوست اور مددگار نہ بناؤ۔

تفسیر

گذشتہ آیت ان منافقین کے بارے میں تھی جن کی حمایت میں کچھ سادہ لوح مسلمان اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور انکی سفارش کرتے تھے جبکہ قرآن نے انہیں اسلام سے بیگانہ قرار دے دیا اور اب اس آیت میں فرماتا ہے ان کے اندر اس قدر جہالت اور تاریکی ہے کہ نہ صرف وہ خود کافر ہیں بلکہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی طرح کافر ہو جاؤ تاکہ ایک دوسرے کے مساوی ہو جاؤ۔ اس وجہ سے وہ تو عام کفار سے بھی بدتر ہیں کیونکہ عام کافر دوسروں کے عقائد باطل کرنے کے در پے رہتے ہیں کیونکہ وہ ایسے ہیں اس لیے مسلمانوں کو چاہیئے کہ ان میں سے کسی کو دوست نہ بنائیں۔ مگر یہ کہ وہ اپنے افعال سے باز آجائیں اور نفاق اور تخریب کاری سے دستبردار ہو جائیں اور اس کا ثبوت اور نشانی یہ ہے کہ وہ کفر اور نفاق کے مرکز سے اسلام کے مرکز مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کریں۔

لیکن اگر وہ ہجرت کے لئے تیار نہ ہوں تو پھر سمجھ لو کہ وہ کفر ونفاق سے دستبردار نہیں ہوئے اور ان کا مسلمان کہلانا صرف جاسوسی اور تخریب کاری کی غرض سے ہے اور اس صورت میں وہ تمہیں جہاں کہیں بھی مل جائیں انہیں قید کر لو یا اگر ضروری ہو تو انہیں قتل کر دو۔

آیت کے آخر میں دوبارہ تاکید کی گئی ہے کہ کبھی ان میں سے کسی کو دوست اور مددگار نہ بناؤ۔

درج بالا آیت میں منافقین کے اس گروہ کے بارے میں جو سخت احکام آئے ہیں اس وجہ سے ہیں کہ ایک زندہ معاشرے کی تشکیل کے لئے جو اصلاح کے راستے پر چلتا ہے ایسے دوست نما خطرناک دشمن سے چھٹکارا حاصل کرنے کا اس کے علاوہ کوئی راستہ

نہیں ہے۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ اسلام غیر مسلم افراد سے چند شرائط کے ساتھ صلح کی اجازت دے دیتا ہے اور ان سے کوئی تعرض نہ کرنے کے لئے تیار ہے مگر منافقین کے اس گروہ کے بارے میں اس قدر شدت سے کام لیتا ہے۔ بظاہر وہ مسلمان ہیں پھر بھی انہیں قید کرنے بلکہ بوقت ضرورت ان کے قتل کا حکم دیتا ہے۔ اس امر کی اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایسے افراد اسلام کو ایسی گزند پہنچا سکتے ہیں جیسی کوئی دشمن نہیں پہنچا سکتا۔

(۹۰) اِلَّا الَّذِيۡنَ يَصِلُوۡنَ اِلٰى قَوۡمٍۢ بَيۡنَكُمۡ وَ بَيۡنَهُمۡ مِّيۡثَاقٌ اَوۡ جَآءُوۡكُمۡ حَصِرَتۡ صُدُوۡرُهُمۡ اَنۡ يُّقَاتِلُوۡكُمۡ اَوۡ يُقَاتِلُوۡا قَوۡمَهُمۡ ؕ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمۡ عَلَيۡكُمۡ فَلَقَاتَلُوۡكُمۡ ۚ فَاِنِ اعۡتَزَلُوۡكُمۡ فَلَمۡ يُقَاتِلُوۡكُمۡ وَ اَلۡقَوۡا اِلَيۡكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمۡ عَلَيۡهِمۡ سَبِيۡلًا	مگر وہ لوگ جنہوں نے تمہارے ہم پیمان لوگوں سے عہد و پیمان باندھا ہے یا وہ جو تمہاری طرف آتے ہیں اور تم سے جنگ کرنے یا اپنی قوم سے جنگ کرنے سے عاجز ہیں (نہ تم سے جنگ کرنا چاہتے ہیں اور نہ اپنی قوم سے لڑنے کی طاقت رکھتے ہیں) اور اگر خدا چاہے تو انہیں تم پر مسلط کر دے تا کہ وہ تم سے جنگ کریں (اب جبکہ) انہوں نے صلح کی پیشکش کی ہے تو خدا تمہیں اجازت نہیں دیتا کہ ان سے تعرض کرو۔

شان نزول

مختلف روایات سے جو آیت کی شان نزول کے بارے میں آئی ہیں اور مفسرین نے ہر قسم کی تفاسیر میں انہیں نقل کیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قبائل عرب میں دو قبیلے ''بنی حمزہ'' اور ''اشجع'' نام کے تھے ان میں سے پہلے قبیلے نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا عہد کیا تھا اور قبیلہ اشجع نے بھی بنی حمزہ سے ایسا معاہدہ کر رکھا تھا بعض مسلمان بنی حمزہ کی طاقت اور عہد شکنی سے خوفزدہ تھے لہٰذا انہوں نے پیغمبر اکرم ﷺ کو تجویز پیش کی کہ اس سے پہلے کہ وہ حملہ آور ہوں مسلمان ان پر حملہ کر دیں پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا:

'' کلا فانهم ابرالعرب بالوالدين و اوصلهم للرحم او فاهم بالعهد '' (نہیں کبھی یہ کام نہ کریں کیونکہ وہ تمام قبائل عرب میں اپنے ماں باپ کے ساتھ بہتر سلوک کرنیوالے ہیں اور اپنے عزیز و اقارب پر سب سے زیادہ مہربان ہیں اور بہتر ایفائے عہد کرنے والے ہیں)۔

کچھ عرصہ بعد مسلمانوں کو اطلاع ملی کہ اشجع قبیلہ کے سات سو افراد مسعود بن رجیلہ کی سرکردگی میں مدینہ کے قریب پہنچ چکے ہیں پیغمبر اکرم ﷺ اپنے نمائندے ان کے پاس بھیجے کہ وہ کس مقصد کے لئے آئے ہیں انہوں نے جواب

دیا کہ ہم محمد ﷺ کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے کے لئے آئے ہیں جب پیغمبر اکرم ﷺ کو یہ معلوم ہوا تو حکم دیا کہ بہت سی مقدار میں کھجوریں تحفہ کے طور پر ان کے پاس لے جاؤ اس کے بعد حضور ﷺ نے ان سے ملاقات کی تو انہوں نے کہا کہ ایک طرف ہم آپ کے دشمنوں سے مقابلے کی سکت نہیں رکھتے کیونکہ ہماری تعداد کم ہے اور دوسری طرف نہ آپ سے مقابلے کی ہم طاقت رکھتے ہیں نہ آپ سے ہم لڑنا چاہتے ہیں کیونکہ ہماری سکونت آپ کے قریب نہیں ہے لہٰذا ہم اس لیے آئے ہیں کہ آپ سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کریں اس موقع پر درج بالا آیات نازل ہوئیں جن میں اس ضمن میں مسلمانوں کو ضروری احکام جاری کیے گئے۔

تفسیر

صلح کی پیش کش کا استقبال

ان منافقین کے لیے جو دشمنان اسلام کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اس سخت حکم کے بعد زیر نظر آیت میں حکم دیتا ہے کہ اس قانون سے دو گروہ مستثنیٰ ہیں۔

1۔ جو تمہارے کسی ہم پیمان کے ساتھ مربوط ہیں اور انہوں نے اس سے معاہدہ کر رکھا ہے۔

2۔ وہ جو اپنی مخصوص حالت کی وجہ سے ایسے حالات سے دوچار ہیں کہ نہ تو وہ تمہارے ساتھ مقابلے کی طاقت رکھتے ہیں نہ تمہارا ساتھ دے سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے قبیلہ سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ پہلے گروہ کو معاہدے کے احترام کی وجہ سے اس قانون سے مستثنیٰ ہونا چاہئے اور دوسرا گروہ بھی اگرچہ مقدور نہیں ہے اسے چاہئے کہ حق کی تلاش کے بعد اس سے اپنا رشتہ جوڑ لے لیکن چونکہ وہ غیر جانبدار رہنے کا اعلان کرتا ہے لہٰذا اس پر اعتراض کرنا عدل اور مردانگی کے اصولوں کے خلاف ہے اس کے بعد اس بنا پر کہ مسلمان اور اپنی شاندار کامیابیوں پر مغرور نہ ہو جائیں اور انہیں اپنی لشکری قوت اور مہارت کا مرہونِ منت سمجھیں اس غیر جانبدار گروہ کے مقابلہ میں ان کے انسانی جذبات کو تحریک دیتے ہوئے فرماتا ہے اگر خدا چاہے تو ان کمزور لوگوں کو تم پر مسلط کر سکتا ہے تا کہ وہ تم سے برسر پیکار ہوں۔ لہٰذا ہمیشہ کامیابیوں پر اپنے خدا کو نہ بھولو اور کسی جہت بھی اپنی طاقت پر غرور نہ کرو نیز کمزور لوگوں کو معاف کرنے کو اپنے نقصان میں نہ سمجھو۔ آیت کے آخر میں دوبارہ آخری گروہ کے لئے تاکید زیادہ واضح انداز میں کرتے ہوئے کہتا ہے اگر وہ تم سے جنگ کریں اور صلح و مصالحت کی پیش کش کریں تو خدا تمہیں ان سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں دیتا تمہارا فرض ہے کہ جو ہاتھ صلح کے لئے تمہاری طرف بڑھے اسے مضبوطی سے تھام لو۔

(۹۱)سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِیْنَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّاْمَنُوْکُمْ وَ یَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَی الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِیْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ یَعْتَزِلُوْكُمْ وَیُلْقُوْۤا اِلَیْكُمُ السَّلَمَ وَ یَكُفُّوْۤا اَیْدِیَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَ اُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا ۠	بہت جلد تم کچھ ایسے لوگوں سے ملو گے جو چاہتے ہیں کہ تمہاری طرف سے بھی امان میں ہوں اور اپنی قوم کی طرف سے بھی مامون ہوں (یہ مشرک ہیں لہٰذا جو تمہارے سامنے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں) لیکن جس وقت وہ فتنہ اور بت پرستی کی طرف پلٹ جاتے ہیں تو وہ سر کے بل اس میں ڈوب جاتے ہیں اگر وہ تم سے الجھنے سے کنارہ کش نہ ہوئے اور انہوں نے صلح کی پیش کش نہ کی اور تم سے دستبردار نہ ہوئے تو انہیں جہاں کہیں پاؤ قید کر لو (یا) انہیں قتل کر دو اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جن پر ہم نے تمہارا واضح تسلط قرار دیا ہے۔

شان نزول

درج بالا آیت کے لئے مختلف شان نزول منقول ہوئے ہیں زیادہ مشہور ان میں سے یہ ہے کہ اہل مکہ میں سے کچھ لوگ پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دھوکے بازی اور چال بازی کے طور پر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا لیکن جب بھی وہ قریش اور ان کے بتوں کے سامنے جاتے تو ان کے بتوں کی عبادت اور پرستش شروع کر دیتے اس طرح وہ چاہتے تھے کہ وہ اسلام اور قریش دونوں سے محفوظ رہیں دونوں طرف سے فائدہ اٹھائیں اور کسی سے انہیں نقصان نہ پہنچے اصطلاح کے مطابق دونوں گروہوں سے دوطرفہ تعلقات استوار رکھیں اس پر زیر نظر آیت نازل ہوئی جس میں اس گروہ کے خلاف سخت کارروائی کا حکم دیا گیا۔

تفسیر

طرفین سے ساز باز رکھنے والوں کی سزا

یہاں ایک اور گروہ سے تعارف ہوتا ہے جو سراسر اس گروہ کا مخالف ہے جس کے بارے میں گذشتہ آیات میں صلح کا حکم دیا گیا ہے یہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان آزادی سے کام کرنا چاہتے ہیں اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے دھوکے اور خیانت کی راہ اختیار کر رکھی ہے وہ دونوں گروہوں سے ہم قدم اور ہم فکر ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے جب فتنہ سازی اور بت پرستی کا موقع ان کے ہاتھ آتا ہے تو ان کے سارے پروگرام الٹے ہو جاتے ہیں اور سر کے بل بت پرستی میں ڈوب جاتے ہیں۔ یہ پہلے گروہ کے بالکل برعکس ہیں کیونکہ ان کی کوشش یہ تھی کہ یہ مسلمانوں سے برسرِ پیکار نہ ہوں۔ جب کہ ان کی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں سے الجھتے رہیں وہ صلح کی پیش کش کرتے تھے جبکہ یہ مسلمانوں سے برسر پیکار تھے وہ مسلمان کو

تکلیف نہیں پہنچاتے تھے لیکن یہ ظلم وجور سے اجتناب نہیں کرتے تھے یہ تینوں فرق جن کی طرف ''فَاِنۡ لَّمۡ یَعۡتَزِلُوۡکُمۡ وَیُلۡقُوۡۤا اِلَیۡکُمُ السَّلَمَ وَ یَکُفُّوۡۤا اَیۡدِیَهُمۡ'' میں اشارہ ہوا ہے اس امر کا سبب ہیں کہ ان کے بارے میں حکم پچھلے گروہ سے مکمل طور پر مختلف حکم ہو مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ انہیں جہاں کہیں پائیں اسیر کرلیں اور مقابلہ کرنے کی صورت میں قتل کردیں۔لہٰذا جہاں ان کے لیے کافی اتمام حجت کیا گیا ہے وہاں آیت کے آخر میں یہ بھی فرمایا گیا ہے وہ ایسے لوگ ہیں کہ ہم نے واضح طور پر ان پر تمہارا تسلط قائم کیا ہے۔

(۹۲)وَ مَا كَانَ لِمُؤۡمِنٍ اَنۡ یَّقۡتُلَ مُؤۡمِنًا اِلَّا خَطَاً ۚ وَ مَنۡ قَتَلَ مُؤۡمِنًا خَطَاً فَتَحۡرِیۡرُ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ وَّ دِیَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤی اَهۡلِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ یَّصَّدَّقُوۡا ؕ فَاِنۡ كَانَ مِنۡ قَوۡمٍ عَدُوٍّ لَّكُمۡ وَ هُوَ مُؤۡمِنٌ فَتَحۡرِیۡرُ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ ؕ وَ اِنۡ كَانَ مِنۡ قَوۡمٍۭ بَیۡنَكُمۡ وَ بَیۡنَهُمۡ مِّیۡثَاقٌ فَدِیَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤی اَهۡلِهٖ وَ تَحۡرِیۡرُ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ ۚ فَمَنۡ لَّمۡ یَجِدۡ فَصِیَامُ شَهۡرَیۡنِ مُتَتَابِعَیۡنِ ۫ تَوۡبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیۡمًا حَكِیۡمًا	کسی صاحب ایمان فرد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی صاحب ایمان کو قتل کرے مگر یہ کہ یہ کام غلطی اور اشتباہ میں اس سے سرزد ہو جائے اور پھر جس نے کسی مومن کو غلطی سے قتل کیا ہے اسے چاہئے کہ وہ ایک غلام آزاد کرے اور خون بہا مقتول کے گھر والوں کو دے مگر یہ کہ وہ خون بہا بخش دیں اور اگر مقتول ایسے گروہ سے ہے جو تمہارے دشمن ہیں (اور کافر ہیں) لیکن قاتل خود مومن تھا تو چاہئے (کہ صرف) ایک غلام آزاد کرے (اور خون بہا ادا کرنا ضروری نہیں ہے) اور اگر ایسے گروہ میں سے ہے جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو چکا ہے تو چاہئے کہ اس کا خون بہا اس کے اہل خانہ کو دے اور ایک غلام (بھی) آزاد کرے اور جو شخص (غلام کے آزاد کرنے پر) دسترس نہیں رکھتا، وہ دو ماہ مسلسل روزے رکھے۔ یہ (ایک قسم کی تخفیف اور) اللہ کے حضور توبہ ہے اور خدا دانا و حکیم ہے۔

شان نزول

مکہ کے ایک بت پرست حارث بن یزید نے ''ابوجہل'' کی مدد سے ایک مسلمان ''عیاش بن ابی ربیعہ'' کو اسلام کی طرف مائل ہونے کی پاداش میں ایک عرصہ تک شکنجہ ظلم میں جکڑے رکھا مسلمانوں کی مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد عیاش نے بھی مدینہ کی طرف ہجرت کی اور مسلمانوں میں شامل ہوگیا اتفاقاً ایک دن مدینہ کے قریب ایک محلّہ میں اس کا سامنا اسے آزار دینے والے حارث بن یزید سے ہوگیا عیاش نے موقع غنیمت جان کر حارث کو قتل کر دیا اس کا خیال تھا کہ اس نے ایک دشمن کو قتل کیا ہے حالانکہ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ حارث توبہ کر کے مسلمان ہو چکا تھا اور پیغمبر

اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے جا رہا تھا یہ واقعہ آنحضرت ﷺ سے عرض کیا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی اور اس قتل کے بارے میں جو خطا سے اور اشتباہ میں ہو گیا حکم بیان کیا گیا۔

تفسیر

قتل اشتباہ کے احکام

چونکہ گذشتہ آیات میں مسلمانوں کو عملی طور پر اپنے اندرونی خطرناک دشمنوں منافقین کی سرکوبی کی اجازت دی گئی ہے تو اب اس بنا پر کہ کہیں کچھ لوگ اس قانون سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں اور اپنے ذاتی دشمنوں کو منافقین کہہ کر قتل نہ کر دیں یا لا پرواہی سے کسی بے گناہ کا خون نہ بہا دیں اس آیت میں اور بعد والی آیت میں قتل اشتباہ اور قتل عمد کے احکام بیان ہوئے تا کہ قتل جو اسلام کے نزدیک نہایت سنگین معاملہ ہے اس کے بارے میں تمام لازمی پہلوؤں کو ملحوظ نظر رکھا جائے۔

اس آیت کی ابتدا میں کہ جس میں قتل اشتباہ کا ذکر ہے فرماتا ہے کسی مومن کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ کسی صاحب ایمان شخص کو قتل کرے مگر یہ کہ اشتباہ میں ایسا ہو جائے وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَاً ' حقیقت میں یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اصولی طور پر کوئی مومن یہ نہیں چاہتا کہ اپنے ہاتھ کسی بے گناہ کے خون سے رنگین کریں کیونکہ حریم ایمان میں تمام افراد ایک جسم کے اعضاء کی طرح ہیں کیا یہ ہو سکتا ہے کہ بدن انسانی کا ایک عضو دوسرے عضو کو سوائے اشتباہ کے کاٹ دے یا اسے کوئی آزار دیا جائے۔ اس سبب سے جو اس قسم کے کام میں مشغول ہیں ان کا ایمان صحیح نہیں ہے اور حقیقت میں وہ ایمان سے بے بہرہ ہیں ''اِلَّا خَطَاً'' (مگر غلطی سے) کے الفاظ اس معنی میں نہیں کہ انہیں اجازت ہے کہ شک کی بنا پر قتل جیسا عمل کریں کیونکہ شک وشبہ میں انسان دور تک نہیں دیکھ سکتا اور کوئی شخص شک کی حالت میں اپنے اشتباہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتا مقصد یہ ہے کہ مومنین شک وشبہ کی حالت کے علاوہ ایسا گناہ کبیرہ نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد قتل اشتباہ کا جرمانہ اور کفارہ تین مراحل میں بیان کیا گیا ہے۔

پہلی صورت یہ ہے کہ بے گناہ شخص جو شک اور شبہ میں قتل ہو گیا ہو اگر وہ مسلمان خاندان سے تعلق رکھتا ہو تو اس صورت میں قاتل کے لئے دو حکم ہیں ایک یہ کہ غلام کو آزاد کرے اور دوسرا یہ کہ مقتول کا خون بہا مقتول کے وارثوں کو ادا کرے۔

مگر یہ کہ مقتول کے وارث دیت کو اپنی رضا اور رغبت سے چھوڑ دیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مقتول ایسے خاندان سے وابستہ ہو جو مسلمانوں سے دشمنی رکھتا ہو، تو اس صورت میں قتل اشتباہ کا کفارہ صرف غلام آزاد کرنا ہے اور ایسے گروہ کو دیت دینا ضروری نہیں کہ جو مالی طور پر مسلمانوں کے خلاف مضبوط ہو جائے۔ اس کے علاوہ اسلام ایسے شخص کو اپنے خاندان سے ربط رکھنے سے منع کرتا ہے جس کے خاندان میں سب کے سب اسلام کے دشمن ہوں اس بنا پر یہ نقصان کی تلافی کا مقام نہیں ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ مقتول کا خاندان ایسے کفار میں سے ہو جنہوں نے مسلمانوں سے معاہدہ کر رکھا ہو اس صورت میں معاہدہ کے احترام میں ایک غلام آزاد کرنے کے علاوہ مسلمان اس کا خون بہا اس کے پس ماندگان کو دیں۔

اس بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ کیا مقتول اس صورت میں پہلی دونوں صورتوں کی طرح مرد مومن ہوگا یا یہ حکم کافر اور ذمی کے لئے بھی ہے لیکن بظاہر آیات اور روایات جو اس آیت کی تفسیر میں آئی ہیں ان کے مطابق اس سے مراد بھی مقتول مومن ہی ہے اور کیا اس قسم کے مسلمان مقتول کی دیت کافر وارث کو دی جاسکتی ہے جبکہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا۔

آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ دیت اس کے ورثہ کو دی جائے گی چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہوں یہ مسلمانوں کے ساتھ ان کے معاہدے کی بنیاد پر ہے لیکن چونکہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا لہٰذا بعض مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ اوپر والے جملے سے مراد یہ ہے کہ اس کی دیت وخون بہا صرف اس کے مسلمان وارثوں کو دیا جائے نہ کہ کفار وارثوں کو بعض روایات میں بھی اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن ''من قوم بینکم و بینهم میثاق'' میثاق ایسے گروہ سے جو تمہارے ساتھ معاہدہ رکھتے ہیں کے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ مقتول کے وارث مسلمان نہ ہوں کیونکہ مسلمان ایک دوسرے سے معاہدہ نہیں کرتے (غور کیجئے گا)۔

آیت کے آخری میں ان لوگوں کے بارے میں جو غلام آزاد کرنے کے بارے میں دسترس نہیں رکھتے (یعنی مالی طور پر استطاعت نہیں رکھتے یا آزاد کرنے کے لئے غلام ملتا ہی نہ ہو موجود زمانے کی طرح فرماتا ہے ایسے افراد کو چاہئے کہ وہ مسلسل دو ماہ روزے رکھے۔

آخر میں کہتا ہے یہ غلام آزاد کرنے کی بجائے دو ماہ روزہ رکھنے کا حکم ایک قسم کی تخفیف اور خدا کے حضور توبہ ہے یا یہ کہ جو کچھ قتل اشتباہ کے کفار کے طور پر کہا گیا ہے اس سب کو خدا سے توبہ قرار دیا گیا ہے اور خدا ہمیشہ ہر چیز سے باخبر ہے اور اس کے تمام احکام حکمت کے مطابق ہیں۔

(۹۳)وَ مَنۡ یَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِیۡهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیۡمًا	اور جو شخص کسی صاحب ایمان کو جان بوجھ کر قتل کردے تو اس کی سزا جہنم ہے کہ جس میں وہ ہمیشہ کے لیے رہے گا اور خدا اس پر غضب نازل کرتا ہے اور اسے اپنی رحمت سے محروم کر دیتا ہے اور اس کے لئے اس نے عذاب عظیم مہیا کر رکھا ہے۔

شان نزول

مقیس بن صبابہ کنانی ایک مسلمان تھا اس نے اپنے مقتول بھائی کی لاش محلّہ ''بنی بخار'' میں دیکھی اس نے حضرت پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں یہ واقعہ بیان کیا رسول اکرم ﷺ نے اسے قیس بن ہلال مہزی کے ساتھ بنی بخار کے سرداروں کے پاس بھیجا اور حکم دیا کہ اگر وہ ہشام کے قاتل کو پہچانتے ہیں تو اسے اس کے بھائی مقیس کے حوالے کر دیں اور اگر نہیں پہچانتے تو اس کا خون بہا اور دیت ادا کر دیں وہ چونکہ ہشام کے قاتل کو نہیں پہچانتے تھے لہٰذا انہوں نے مقتول کی دیت اسے ادا کردی اور اس نے بھی قبول کر لی اور قیس بن ہلال کی معیت میں مدینہ کی طرف روانہ ہوا۔

اثنائے راہ میں زمانہ جاہلیت کے باقی رہنے والے افکار نے مقیس کے جذبات کو ابھارا اور وہ اپنے آپ سے کہنے لگا کہ دیت قبول کرنا شکست اور ذلت کا باعث ہے لہٰذا اپنے ہم سفر کو جو قبیلہ بنی بخار میں سے تھا اپنے بھائی کے خون کے بدلے قتل کر دیا اور مکہ کی طرف بھاگ گیا اور اسلام سے بھی کنارہ کش ہو گیا پیغمبر اکرم ﷺ نے بھی اس خیانت کے بدلے اس کا خون مباح قرار دیا اور اوپر والی آیت اسی مناسبت سے نازل ہوئی جس میں قتل عمد (جان بوجھ کر قتل) کی سزا بیان ہوئی ہے۔

تفسیر

قتل عمد کی سزا

قتل اشتباہ کی سزا بیان کرنے کے بعد اس آیت میں اس شخص کی سزا بیان ہوئی ہے جو جان بوجھ کر کسی باایمان شخص کو قتل کر دے چونکہ انسان کشی ایک بہت بڑا جرم اور گناہ کبیرہ ہے اور اگر اسے روکا نہ جائے اور اس کا مقابلہ نہ کیا جائے تو امن و امان جو ایک صحیح معاشرے کی اہم ترین شرائط میں سے ہے بالکل ختم ہو جائے گا قرآن نے مختلف آیات میں اسے اہمیت دی ہے یہاں تک کہ ایک انسان کا قتل روئے زمین کے تمام لوگوں کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے۔

''جو شخص کسی نفس کو اگر وہ قاتل نہ ہو یا زمین پر فساد نہ پھیلائے قتل کر دے گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا ہے''۔(مائدہ............۳۲)

اسی لیے زیر بحث آیت میں ان لوگوں کے لئے جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کر دے، چار سزائیں اور آخرت کے شدید عذاب کا علاوہ قصاص کے جو دنیاوی سزا ہے ذکر ہوا ہے۔

1۔خلود یعنی ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہنا۔

2۔خشم وغضب الٰہی۔

3۔رحمت خداوندی سے محرومی۔

4۔عذاب عظیم میں مبتلا کیا جانا۔

اس طرح قتل عمد کے لئے اس قدر سخت ترین سزا کا ذکر ہوا ہے جس قدر سخت سزا قرآن میں کسی اور چیز کے متعلق بیان نہیں ہوئی اس کے علاوہ قتل عمد کی دنیاوی سزا وہی قصاص ہے جس کی تفصیل جلد اول میں سورہ بقرہ آیت ۱۷۹ کے ذیل میں بیان ہو چکی ہے۔

(۹۴) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا	اے ایمان لانے والو! جس وقت تم راہ خدا میں قدم اٹھاتے ہو (اور جہاد کے لیے آمادہ سفر ہوتے ہو) تو تحقیق کرواور اس شخص کو جو صلح اور اسلام کا اظہار کرتا ہے اسے (فقط اس بنا پر) یہ نہ کہو کہ تو مسلمان (مومن) نہیں کہ دنیائے نا پائیدار کا سرمایہ (اور مال غنیمت) حاصل کرسکو۔ کیونکہ خدا کے ہاں (تمہارے لیے) بڑی بڑی غنیمتیں موجود ہیں تم پہلے ایسے ہی تھے اور خدا نے تم پر احسان کیا (اورتمہاری ہدایت کی) اس بنا پر (اس عظیم شکرانے کے طور پر) تحقیق کرو، جو کچھ تم عمل کرتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

شان نزول

درج بالا آیت کے بارے میں کئی ایک شان نزول اسلامی روایات تفاسیر میں آئی ہیں جو کم وبیش ایک دوسرے سے مماثلت رکھتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے جنگ خیبر سے واپسی کے بعد اسامہ بن زید کو مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ ان یہودیوں کی طرف بھیجا جو فدک کی ایک بستی میں رہتے تھے تا کہ انہیں اسلامی شرائط قبول کرنے کی دعوت دی جائے ایک یہودی مرد جسے لشکر اسلام کے آنے کی خبر ہوئی تو اس نے اپنے مال اور اولاد کے ساتھ ایک پہاڑ کے دامن میں پناہ لی۔ پھر خود مسلمانوں کے استقبال کے لئے دوڑ آیا اسامہ بن زید نے سوچا کہ یہ یہودی جان اور مال کے خوف سے قبول اسلام کر رہا ہے اور دلی طور پر مسلمان نہیں اس پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا اور اس کا مال اسباب بھیڑ بکریوں پر بطور غنیمت قبضہ کر لیا جب یہ خبر پیغمبر کو ملی تو آپ ﷺ اس واقعہ پر نہایت برہم اور رنجیدہ ہوئے اور فرمایا تو نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا اسامہ پریشان ہو کر کہنے لگا اس شخص نے جان و مال کی حفاظت کے لئے قبول اسلام کیا تھا پیغمبر ﷺ نے کہا تم اس کے باطن سے آگاہ نہیں تھے تمہیں کیا معلوم شاید وہ حقیقی طور پر مسلمان ہوا ہو تو اس موقع پر اوپر والی آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو تنبیہ کی جنگی غنائم کی وجہ سے کبھی ایسے لوگوں کو مت جھٹلاؤ جو قبول اسلام کرتے ہیں بلکہ جو شخص بھی قبول اسلام کرے اس کی بات کو مان لینا چاہئے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں بے گناہ افراد کی جان کی حفاظت کے سلسلہ میں ضروری تاکیدات ہو چکیں اب اس آیت میں ان بے گناہ افراد کی جان کی حفاظت کیلئے ایک احتیاطی حکم جو ممکن ہے تہمت کی زد میں آجائیں بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے اے ایمان لانے والو جس وقت جہاد کی راہ میں قدم اٹھاؤ تو تحقیق اور جستجو کر لو اور ایسے لوگوں کو جو قبول اسلام کریں نہ کہو کہ تم مسلمان نہیں ہو۔

اور حکم دیتا ہے کہ جو لوگ ایمان کا اقرار کرتے ہیں انہیں خندہ پیشانی سے قبول کرلو اور ان کے قبول اسلام کے بارے میں ہر قسم کی بدگمانی اور سوئے ظن سے صرف نظر کرلو اس کے بعد مزید کہتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ جہاں ناپائیدار کی ان نعمتوں کے لیے قبول اسلام کرنے والوں کو تہمت دو اور انہیں ایک دشمن سمجھ کر قتل کردو اور ان کا مال و اسباب بطور غنیمت لے لو۔ جبکہ ہمیشہ رہنے والی گراں بہا غنیمتیں تو خدا کے پاس ہیں۔ اگرچہ پہلے تم ایسے ہی تھے اور زمانہ جاہلیت میں تمہاری جنگیں غارت گری کی بنا پر ہوتی تھیں۔ لیکن اب اسلام کے سائے میں اور اس احسان کی وجہ سے جو خدا نے تم پر کیا ہے۔ اور یہ بات جان لو کہ خدا تمہارے اعمال اور نیتوں سے آگاہ ہے۔

(۹۵) لَا يَسْتَوِى الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِى الضَّرَرِ وَ الْمُجٰهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ۭ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ	وہ صاحب ایمان جو بغیر بیماری اور تکلیف کے جہاد سے دستبردار ہو گئے اور وہ مجاہد جنہوں نے اپنے مال اور جان کے ذریعے جہاد میں حصہ لیا برابر نہیں ہیں۔ خدا نے ان مجاہدین کو جنہوں نے اپنی جان اور مال سے جہاد کیا ہے بیٹھ رہنے والوں پر فضیلت اور برتری دی ہے ان دونوں گروہوں میں سے ایک کو (ان کے نیک اعمال پر) خدا نیک جزا کا وعدہ کرتا ہے اور مجاہدین کو بیٹھ رہنے والوں پر فضیلت اور اجر عظیم بخشتا ہے۔
(۹۶) دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَ مَغْفِرَةً وَّ رَحْمَةً ۭ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۧ	خدا کی طرف سے (اہم) درجات اور بخشش و رحمت (انہیں نصیب ہو گی) اور (اگر ان سے کچھ لغزشیں ہوئی ہیں) تو خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں جہاد کے متعلق گفتگو ہوئی تھی یہ دو آیات مجاہدین اور غیر مجاہدین کا تقابل اور موازنہ کرتی ہیں خدا کہتا ہے وہ باایمان کہ جو میدان جہاد میں شرکت کرنے سے اجتناب کرتے ہیں جبکہ انہیں ایسی کوئی خاص بیماری بھی لاحق نہیں کہ جو انہیں میدان جہاد میں شرکت کرنے سے مانع ہو کبھی ان مجاہدین کے ہم پلہ اور برابر نہیں ہو سکتے جو راہ خدا میں اور کلمۂ حق کی بلندی کے لئے اپنی جان و مال سے جہاد کرتے ہیں

واضح ہے کہ "قاعدون" سے مراد یہاں وہ افراد ہیں جنہوں نے اصول ایمان پر ایمان رکھنے کے باوجود ہمت اور جوانمردی نہ دکھانے کی

وجہ سے جہاد میں شرکت نہیں کی اگرچہ ان کے لئے یہ جہاد واجب عینی نہیں تھا کیونکہ اگر ان کے لئے واجب ہوتا تو قرآن ان کے بارے میں ایسے نرم اور ملائم لہجے میں بات نہ کرتا اور آیت کے آخر میں ان سے بدلے اور جزا کا وعدہ نہ کرتا اس وجہ سے جب یہ صورتحال ہو کہ جہاد واجب عینی نہ ہو "مجاہدین" "قاعدین" کے مقابلے میں واضح طور پر برتر ہیں بہر حال اس آیت میں وہ لوگ شامل نہیں ہیں جو نفاق یا دشمنی کی وجہ سے جہاد میں شریک نہیں ہوئے۔

ضمنی طور یہ خیال رکھنا چاہئے کہ "غیر اولی الضرر" کی تعبیر ایک وسیع مفہوم رکھی ہے جو ان تمام افراد کو جہاد سے مستثنٰی قرار دیتی ہے جو کسی عضو کے نقص بیماری یا بہت زیادہ کمزوری اور ضعف وغیرہ کے سبب جہاد میں شرکت کی سکت نہیں رکھتے اس کے بعد پھر مجاہدین کی برتری اور فضیلت کو صراحت اور فصاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: خدا ان مجاہدین کو جو اپنے جان و مال سے اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں ان لوگوں پر عظیم فضیلت بخشتا ہے جو میدان جہاد میں شرکت سے اجتناب اور کنارہ کشی کرتے ہیں۔

لیکن باوجود اس کے جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ مجاہدین کے گروہ کے مدمقابل دو افراد ہیں جن پر جہاد "واجب عینی" نہیں تھا یا وہ بیماری، ناتوانی یا دیگر علل کی وجوہ سے میدان جہاد میں شرکت کی سکت نہیں رکھتے تھے لہٰذا اس وجہ سے کہ ان کی صالح نیت' ایمان اور نیک اعمال نظر انداز نہ ہوں انہیں بھی خوشخبری دیتے ہوئے فرماتا ہے دونوں گروہوں مجاہدین وغیر مجاہدین سے اچھائی کا وعدہ کیا گیا ہے۔

لیکن چونکہ اسلام میں جہاد کی اہمیت اس سے بھی کہیں زیادہ ہے لہٰذا دوبارہ مجاہدین کا ذکر کرتے ہوئے تاکید کرتا ہے۔ خدا نے مجاہدین کو قاعدین پر اجر عظیم بخشتا ہے۔

(۹۶) اس آیت میں اجر عظیم کی وضاحت کی گئی ہے کہ جو خدا کی طرف سے اہم درجات اور اس کی بخشش و رحمت ہے (دَرَجَاتٍ مِنْهُ وَمَغْفِرَةً وَرَحْمَةً) اور اگر اس دوران میں کچھ افراد اپنے فرائض کی انجام دہی کرتے ہوئے کچھ لغزشوں کے مرتکب ہوئے ہیں اور اپنے کیے پر پشیمان ہیں تو خدا نے ان سے بھی بخشش و نجات کا وعدہ کیا ہے لہٰذا آیت کے آخر میں فرماتا ہے۔

(۹۷)اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَفّٰىهُمُ الۡمَلٰٓـئِكَةُ ظٰلِمِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قَالُوۡا فِيۡمَ كُنۡتُمۡ‌ؕ قَالُوۡا كُنَّا مُسۡتَضۡعَفِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ‌ؕ قَالُوۡۤا اَلَمۡ تَكُنۡ اَرۡضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوۡا فِيۡهَا‌ؕ فَاُولٰۤـئِكَ مَاۡوٰٮهُمۡ جَهَنَّمُ‌ؕ وَ سَآءَتۡ مَصِيۡرًا ۙ	وہ لوگ کہ جن کی روح (قابض ارواح) فرشتوں نے قبض کی جب کہ وہ اپنے اوپر ظلم کر چکے تھے اور ان سے کہا کہ تم کس حالت میں تھے (اور مسلمان ہونے کے باوجود کفار کی صف میں کیوں جا کھڑے ہوئے) تو انہوں نے کہا کہ ہم اپنی سرزمین پر انتشار اور دباؤ میں تھے تو ان (فرشتوں) نے کہا تو کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم ہجرت کر جاتے پس ان (کے پاس کوئی عذر و معذرت نہیں تھی اور ان) کے رہنے کی جگہ جہنم ہے اور ان کا انجام برا ہے۔
(۹۸)اِلَّا الۡمُسۡتَضۡعَفِيۡنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الۡوِلۡدَانِ لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ حِيۡلَةً وَّ لَا يَهۡتَدُوۡنَ سَبِيۡلًا ۙ	مگر ایسے مرد، عورتیں اور بچے جو واقعاً دباؤ اور جبر کا شکار تھے کہ جن کے پاس (اس آلودہ ماحول سے نجات پانے کے لئے) نہ کوئی چارہ تھا اور نہ کوئی راہ۔
(۹۹)فَاُولٰۤـئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّعۡفُوَ عَنۡهُمۡ‌ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوۡرًا	ممکن ہے خدا انہیں عفو کے قابل قرار دے اور خدا معاف کرنیوالا اور بخشنے والا ہے۔

شان نزول

جنگ بدر کی ابتدا سے قبل سرداران قریش نے یہ خطرناک اعلان کیا تھا کہ مکہ کے تمام رہنے والے جو میدان جنگ میں شرکت کرنا چاہتے ہیں مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوں اور جو اس کام کی مخالفت کرے گا اس کا گھر ویران کر دیا جائے گا اور اس کا مال ضبط کر لیا جائے گا اس دھمکی کے بعد کچھ ایسے افراد جو بظاہر ایمان لا چکے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں گھر اور مال و متاع انتہائی عزیز تھا وہ ہجرت کے لئے تیار نہ ہوئے اور بت پرستوں کے ساتھ میدان جنگ کی طرف چل پڑے میدان جنگ میں انہوں نے مشرکین کا ساتھ دیا وہ مسلمانوں کی کم تعداد کو دیکھ کر شک و شبے میں مبتلا ہو گئے اور آخر کار میدان جنگ میں قتل ہو گئے درج بالا آیت اسی ضمن میں نازل ہوئی جس میں ان کا عبرت ناک انجام بیان کیا گیا ہے۔

تفسیر

جہاد سے متعلق مباحث کے بعد ان آیات میں ایسے لوگوں کے عبرت ناک انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اسلام کا دم بھرتے تھے لیکن انہوں نے اسلام کے اہم لائحۂ عمل یعنی ہجرت کو عملاً نظر انداز کیے رکھا جس کے نتیجے میں وہ خطرناک وادیوں میں پہنچ گئے اور مشرکین کی صفوں میں شامل ہو کر انہوں نے جانیں گنوا دیں قرآن کہتا ہے وہ لوگ کہ قبض روح کرنے والے فرشتوں نے جن کی روح اس حالت میں قبض کی کہ جب انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کر رکھا تھا انہوں نے ان سے پوچھا کہ اگر تم لوگ مسلمان تھے تو پھر کفار کی صفوں میں شامل ہو کر تم نے مسلمانوں سے کیوں جنگ کی۔

وہ جواب میں معذرت خواہی سے کہتے ہیں ہم اپنے ماحول میں جبر اور دباؤ میں تھے اس لیے ہم فرمان الٰہی پر عمل کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ لیکن ان کی یہ معذرت قابل قبول نہ ہوگی اور فوراً وہ خدا کے فرشتوں سے یہ جواب سنیں گے کہ کیا پروردگار کی زمین وسیع و عریض نہ تھی کہ تم ہجرت کرتے اور اپنے آپ کو اس آلودہ اور گھٹے ہوئے ماحول سے نکال کر لے جاتے۔

آخر میں ان کے انجام کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے اس قسم کے لوگ جنہوں نے بیکار عذر داری اور ذاتی مصلحت اندیشیوں کے سبب ہجرت نہیں کی اور انہوں نے اس گھٹے ہوئے ماحول میں زندگی گزارنے کو ترجیح دی ہے ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت برا انجام ہے۔

(۹۸) اس آیت میں مستضعفین حقیقی کمزور اور عاجز افراد نہ کہ جھوٹے مستضعفین کے استثناء کے ساتھ فرماتا ہے وہ مرد، عورتیں اور بچے جو اس گھٹن زدہ ماحول سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں پاتے وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ یہ لوگ حقیقتاً معذور ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ خدا نا قابل عمل ذمہ داری لاگو کر دے۔

(۹۹) زیر نظر آخری آیت میں فرماتا ہے ہوسکتا ہے عفو خداوندی ان کے شامل حال ہو اور خدا ہمیشہ سے معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

مستضعف کون ہے؟

آیات قرآن اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو افراد فکری جسمانی یا اقتصادی طور پر اتنے ضعیف اور کمزور ہوں کہ حق و باطل میں تمیز نہ کر سکیں یا جو باوجود صحیح عقیدہ رکھنے کے جسمانی یا مالی طور پر کمزوری کے باعث یا معاشرے کی ناروا پابندیوں کے سبب اپنے فرائض ادا نہ کر سکتے ہوں اور نہ ہی ہجرت کے قابل ہوں انہیں مستضعف کہتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے آپ علیہ السلام نے فرمایا:

"و لا يقع اسم الاستضعاف على من بلغته الحجة فسمعتها اذنه و دوعاها قلبه"

(وہ شخص مستضعف نہیں ہے جس پر حجت تمام ہو چکی ہو اس نے حق کو سنا ہو اور اس کے ذہن نے اس کا ادراک کیا ہو)

امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے پوچھا گیا مستضعف کون ہے؟ امام نے اس سوال کے جواب میں تحریر فرمایا:

"الضعيف من لم ترفع له حجته ولم يعرف الاختلاف فاذا عرف الاختلاف فليس بضعيف "

(مستضعف وہ شخص ہے جس تک حجت اور دلیل نہ پہنچی ہو اور وہ مذاہب اور عقائد کے بارے میں موجود اختلاف کو نہ سمجھ سکا ہو (جو کہ محرک تحریک ہے) اور جو اس چیز کو سمجھ چکا ہو وہ مستضعف نہیں ہے)

(۱۰۰) وَ مَنۡ یُّهَاجِرۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ یَجِدۡ فِی الۡاَرۡضِ مُرٰغَمًا کَثِیۡرًا وَّسَعَةً ؕ وَ مَنۡ یَّخۡرُجۡ مِنۡۢ بَیۡتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ثُمَّ یُدۡرِکۡهُ الۡمَوۡتُ فَقَدۡ وَقَعَ اَجۡرُهٗ عَلَی اللّٰهِ ؕ وَ کَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ۚ	اور جو شخص راہ خدا میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت سے اور وسیع امن کے خطے پا لے گا اور جو شخص اپنے شہر سے خدا اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرے پھر اسے موت آ جائے تو اس کا اجر وثواب خدا پر ہے اور خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

ہجرت اسلام کا ایک اصلاحی حکم

جو لوگ ہجرت کے فریضہ سے کوتاہی کر کے طرح طرح کی ذلتوں اور بدبختیوں کا شکار ہو جاتے ہیں ان کے تذکرے کے بعد اس آیت میں قطعی طور پر ہجرت کی اہمیت کے سلسلہ میں دو حصوں میں بحث ہوئی ہے۔

سب سے پہلے دنیاوی زندگی میں ہجرت کے ثمرات اور برکات بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے جو لوگ خدا کی راہ میں اور خدا کے لئے ہجرت کرتے ہیں انہیں خدا کے اس وسیع جہان میں امن کی بہت سی اور وسیع جگہیں میسر آئیں گی جن میں رہ کر وہ حق کو فروغ دیں گے اور مخالفین کو زیر کر سکیں گے۔ غور کرنا چاہئے کہ "مراغم" "رغام" (بروزن کلام) کے مادہ سے بمعنی خاک اور مٹی لیا گیا ہے ارغام کا معنی ہے کسی کو مٹی میں رگیدنا اور ذلیل کرنا ور مراغم اسم مفعول بھی ہے اور اسم مکان بھی لیکن زیر نظر آیت میں اسم مکان کے معنی میں آیا ہے یعنی وہ مکان جہاں حق کا اجرا کر سکتے ہیں اور اگر کوئی شخص عناد کی وجہ سے حق کی مخالفت کرے تو اسے مغلوب کر کے اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد ہجرت کے معنوی اور اخروی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے اگر کچھ لوگ ہجرت کے ارادہ سے

اپنے گھر اور وطن سے خدا اور پیغمبر کی طرف ہجرت کریں اور ہجرت کے مقام تک پہنچنے سے پہلے انہیں موت آ جائے تو ان کا اجر اور ثواب خدا کے ذمہ ہے اور خدا ان کے گناہوں کو بخش دے گا۔

اس وجہ سے ہجرت کرنے والے ہر صورت میں ایک عظیم کامیابی حاصل کریں گے چاہے وہ اپنی منزل پر پہنچ جائیں اور حریّت و آزادی کے ساتھ اپنے فرائض کی ادائیگی سے بہرہ ور ہوں اور منزل مقصود تک پہنچ جائیں اور چاہے وہ ایسا نہ کر سکیں اور اپنی جان اس راہ میں قربان کر دیں اس کے باوجود ہر قسم کا اجر و ثواب خدا ہی کے ذمہ ہے لیکن یہاں خصوصیت کے ساتھ اس بات کا تذکرہ ہے۔ اس کا اجر خدا پر لازم ہو چکا ہے یہ امر ہجرت کرنے والوں کے اجر و ثواب کی انتہائی عظمت و اہمیت کا مظہر ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ وہ ہجرت جو اپنی حفاظت کی بجائے دین اسلام کے تحفظ کے لئے ہوئی مسلمانوں کی تاریخ کی ابتداء ہے اور یہ ہجرت ہمارے تمام سیاسی تبلیغی اور معاشرتی معاملات کے لئے بنیاد فراہم کرتی ہے۔

واضح ہے کہ ہجرت کوئی ایسا حکم نہیں کہ جو زمانِ پیغمبر اکرم ﷺ کے ساتھ مخصوص ہو بلکہ ہر عہد اور زمانہ میں کسی جگہ بھی ایسے حالات ہوں تو مسلمانوں کی ذمہ داری اور فریضہ ہے کہ ہجرت کریں۔

(۱۰۱) وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْکٰفِرِیْنَ کَانُوْا لَکُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا	اور جس وقت سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز میں قصر کرو، اگر تمہیں کافروں کے فتنے کا ڈر ہو، کیونکہ کافر تمہارے واضح دشمن ہیں۔

تفسیر

نماز مسافر

گذشتہ آیات جہاد اور ہجرت کے بارے میں بحث کر رہی تھیں اب اس آیت میں نماز مسافر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب سفر کرو تو کوئی حرج نہیں کہ نماز کو کم اور قصر کر لو اگر کفار کی طرف سے تمہیں خدشہ ہو کیونکہ کافر تمہارے واضح دشمن ہیں۔

اس آیت میں سفر کو ''ضرب فی الارض'' سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ مسافر سفر کرتے وقت زمین کو اپنے پاؤں تلے روندتا ہے۔

(۱۰۲)وَ اِذَا كُنۡتَ فِيۡهِمۡ فَاَقَمۡتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلۡتَقُمۡ طَآئِفَةٌ مِّنۡهُمۡ مَّعَكَ وَ لۡيَاۡخُذُوۡۤا اَسۡلِحَتَهُمۡ‌ فَاِذَا سَجَدُوۡا فَلۡيَكُوۡنُوۡا مِنۡ وَّرَآئِكُمۡ وَلۡتَاۡتِ طَآئِفَةٌ اُخۡرٰى لَمۡ يُصَلُّوۡا فَلۡيُصَلُّوۡا مَعَكَ وَ لۡيَاۡخُذُوۡا حِذۡرَهُمۡ وَ اَسۡلِحَتَهُمۡ‌ وَدَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَوۡ تَغۡفُلُوۡنَ عَنۡ اَسۡلِحَتِكُمۡ وَ اَمۡتِعَتِكُمۡ فَيَمِيۡلُوۡنَ عَلَيۡكُمۡ مَّيۡلَةً وَّاحِدَةً‌ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ اِنۡ كَانَ بِكُمۡ اَذًى مِّنۡ مَّطَرٍ اَوۡ كُنۡتُمۡ مَّرۡضٰۤى اَنۡ تَضَعُوۡۤا اَسۡلِحَتَكُمۡ‌ وَخُذُوۡا حِذۡرَكُمۡ‌ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابًا مُّهِيۡنًا	اور جس وقت تم ان کے درمیان ہو (اور میدان جنگ میں) ان کے لئے نماز قائم کروان میں سے ایک دستہ تمہارے ساتھ (نماز کے لیے) کھڑا ہو جائے گا۔ ایسے لوگ اپنے ہتھیار اپنے پاس رکھیں اور جب سجدہ کریں (اور نماز کو ختم کریں) تو تمہارے پیچھے سے ہٹ کر (میدان جنگ) کی طرف پلٹ جائیں اور دوسرا گروہ جس نے نماز نہیں پڑھی (اور وہ جنگ میں مشغول تھا) آ کر تمہارے ساتھ نماز پڑھے اور یہ لوگ (بھی) وسائل دفاع اور اپنے ہتھیار اپنے ساتھ (حالت نماز میں) اٹھائے رکھیں (کیونکہ) کفار یہی چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور مال ومتاع سے غافل ہو جاؤ اور وہ اچانک تم پر حملہ کر دیں اور اگر بارش کی وجہ سے تم تکلیف میں ہو یا بیمار (اور مجروح) ہو تو کوئی حرج نہیں کہ تم اپنے ہتھیار زمین پر رکھ دو لیکن دفاعی وسائل (مثلاً زرہ اور خود) پہنے رکھو خدا نے کافروں کے لئے ذلیل وخوار کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

شان نزول

جب پیغمبر اکرم ﷺ کچھ مسلمانوں کے ساتھ مکہ جانے کے ارادہ سے سرزمین حدیبیہ میں پہنچے تو اس بات کا قریش کو پتہ چلا خالد بن ولید کی سرکردگی میں دوسو افراد مکہ کی طرف مسلمانوں کی پیش رفت روکنے کے لئے مکہ کے قریبی پہاڑوں میں مورچہ زن ہو گئے ظہر کے وقت حضرت بلال نے اذان دی اور پیغمبر اکرم ﷺ نے مسلمانوں کے ساتھ نماز ظہر باجماعت ادا کی خالد بن ولید یہ منظر دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مسلمانوں کے

نزدیک نماز عصر بڑی قدرومنزلت رکھتی ہے یہاں تک کہ وہ اسے اپنی آنکھوں کی بینائی سے زیادہ محترم سمجھتے ہیں جب مسلمان حالت نماز میں ہوں ان کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بجلی کی سی تیزی سے ان کا کام تمام کردو اس موقع پر درج بالا آیت اتری اور مسلمانوں کو نماز خوف کا حکم دیا گیا یہ آیت ہر قسم کی غفلت کے دوران ہونے والے اچانک حملے سے متعلق ہے اعجاز قرآن کا یہ ایک نکتہ ہے کہ دشمن کے کسی قدم اٹھانے سے پہلے اس کے منصوبوں کو نقش برآب کر دیا جائے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ خالد بن ولید یہ منظر دیکھ کر ایمان لے آیا اور مسلمان ہو گیا۔

تفسیر

جہاد سے متعلق آیات کے بعد یہ آیت مسلمانوں کو نماز خوف کی تعلیم دے رہی ہے جسے دوران جنگ پڑھا جاتا ہے آیت پیغمبر اکرم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے کہتی ہے جب آپ ان کے درمیان ہوں انہیں نماز پڑھائیں تو چاہئے کہ مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں پہلا حصہ مسلح ہو کر آپ کے ساتھ نماز کے لئے کھڑا ہو جائے۔ مکمل ہو جائے تو آپ اپنی جگہ توقف کریں اور وہ تیزی کے ساتھ دوسری رکعت مکمل کر کے میدان جہاد کی طرف پلٹ جائیں اور دشمن کا مقابلہ کریں اور دوسرا گروہ جس نے نماز نہیں پڑھی وہ پہلے گروہ کی جگہ لے اور آپ کے ساتھ نماز پڑھے۔ دوسرے گروہ کو بھی چاہئے کہ وہ دفاعی وسائل اور ہتھیار سنبھالے رکھے اور انہیں زمین پر نہ رکھ دے۔ اس طرح نماز اس لیے پڑھی جاتی ہے تاکہ دشمن تمہیں غفلت میں زیر نہ کر سکے کیونکہ دشمن تو ہمیشہ اسی انتظار میں رہتا ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھائے اور وہ دشمن چاہتا ہے کہ تم اپنے ہتھیاروں اور سامان جنگ سے غافل ہو جاؤ اور وہ تم پر اچانک حملہ کر دے۔ لیکن چونکہ ہوسکتا ہے کہ کچھ ایسی ضرورت پیش آ پڑے کہ ہتھیار اور دفاعی وسائل کا اٹھائے رکھنا حالت نماز میں مشکل ہو یا کمزوری بیماری اور زخموں کی وجہ سے جو کہ جنگ میں لڑنے والوں کو آتے ہیں۔ ہتھیاروں اور دفاعی ساز وسامان کا اٹھائے رکھنا زحمت اور تکلیف کا باعث ہو لہٰذا آیت کے آخر میں یہ حکم دیتا ہے اور تمہارے لیے کوئی گناہ اور حرج نہیں کہ اگر بارش سے تمہیں تکلیف ہو یا بیمار ہو جاؤ تو اس حالت میں اپنے ہتھیار زمین پر رکھ دو۔ مگر پھر بھی ہر صورت میں تحفظ اور احتیاط کے وسائل زرہ اور خود وغیرہ اپنے پاس رکھنے سے غفلت نہ برتو یہاں تک کہ مجبوری کی حالت میں بھی انہیں اپنے پاس ضرور رکھو۔ اگر کبھی دشمن حملہ کرے تو تم مدد پہنچنے تک اپنی حفاظت کر سکو۔ تم ان احکامات اور قوانین کو پلے باندھ لو اور مطمئن رہو کہ کامیابی تمہارے لیے ہے کیونکہ خدا نے کافروں کے لئے ذلیل وخوار کرنیوالا عذاب مہیا کر رکھا ہے۔

(۱۰۳)فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا	اور جب نماز ختم کرلو تو خدا کو کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے اور پہلو پر لیٹے ہوئے یاد کرو اور جس وقت تمہیں اطمینان ہو جائے (اور خوف کی کیفیت ختم ہو جائے) تو نماز کو (معمول کے مطابق) انجام دو کیونکہ نماز مومنین کے لیے ثابت اور معیّن فریضہ ہے۔

تفسیر

فریضہ نماز کی اہمیت

گذشتہ آیت میں نماز خوف کا حکم دیا گیا اور یہ بتایا گیا ہے کہ حالت جنگ میں بھی نماز قائم کرنا لازم ہے اس کے بعد اب اس آیت میں فرماتا ہے نماز کی ادائیگی کے بعد خدا کو بھول نہ جاؤ بلکہ کھڑے ہوئے بیٹھے ہوئے اور پہلو پر لیٹے ہوئے بھی یاد خدا میں رہو اور اس سے مدد طلب کرو۔ حالت قیام وقعود اور پہلو پر لیٹنے کے وقت یاد خدا سے مراد ممکن ہے کہ وہی استراحت کے اوقات ہوں جو میدان جنگ میں وقفوں میں ہوتے ہیں۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جنگ کے مختلف حالات کے معنی ہیں ہوجبکہ مجاہدین کبھی کھڑے ہوکر کبھی بیٹھ کر اور کبھی پہلو کے بل لیٹ کر مختلف جنگی ہتھیاروں کے ساتھ تیراندازی کرتے ہیں۔

حقیقت میں اوپر والی آیت ایک اہم اسلامی حکم کی طرف اشارہ ہے کہ اوقات معینہ میں نماز پڑھنے کا یہ معنی نہیں ہے کہ باقی حالات میں انسان خدا سے غافل رہے نماز ایک انضباطی حکم ہے جو پروردگار کی طرف متوجہ ہونے کی روح انسان میں زندہ کرتا ہے اور ہوسکتا ہے اس سے نمازوں کے درمیانی فاصلوں میں دل میں یاد خدا باقی رہنے کی طرف اشارہ ہو چاہے میدان جنگ میں ہو اور چاہے میدان جنگ کے علاوہ کہیں ہو متعدد روایات میں اس آیت کو بیماروں کے نماز پڑھنے کی کیفیت کے بارے میں قرار دیا گیا ہے۔

اگر ان میں توانائی ہو تو کھڑے ہوکر ورنہ بیٹھ کر اور اگر ایسا بھی نہیں کرسکتے تو پہلو کے بل لیٹ کر نماز ادا کریں یہ تفسیر حقیقت میں آیت کے معنی کے ایک مفہوم کی نشاندہی اور وسعت معنی کی مظہر ہے اور آیت اس موقع کے لئے مخصوص نہیں ہے۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ نماز خوف کا حکم ایک استثنائی حکم ہے اور جب حالت خوف ختم ہو جائے تو پھر نماز عمومی صورت میں ادا کی جائے۔ اور آخر میں نماز کے بارے میں تاکید وقت کی گئی ہے اور وہ اس طرح ہے کیونکہ نماز مومنین کے لئے ایک ثابت رہنے والا اور متغیّر نہ ہونے والا فریضہ ہے۔ لفظ موقوت وقت کے مادہ سے ہے اس بنا پر آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر تم دیکھتے ہو کہ میدان جنگ جیسی جگہ پر بھی مسلمانوں کو چاہئے کہ اس فریضہ نماز کو انجام دیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز کے اوقات معین ہیں کہ جن سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن متعدد روایات میں جو اس آیت کے ذیل میں وارد ہوئی ہیں موقوت کی ثابت اور واجب کے معنی میں تفسیر ہوئی ہے جو کہ آیت کے مفہوم کے ساتھ بھی مطابقت رکھتی ہے اور اس کا نتیجہ تقریباً پہلے معنی جیسا ہی ہے۔

(۱۰۴) وَ لَا تَهِنُوْا فِی ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ یَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَ تَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا یَرْجُوْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ۠	اور دشمن کا تعاقب کرنے میں سستی نہ کرو (کیونکہ) اگر تمہیں درد و رنج پہنچتا ہے تو انہیں بھی تمہاری طرح رنج و تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن تم (پھر بھی) خدا سے امید رکھتے ہو اور وہ نہیں رکھتے اور خدا دانا اور حکیم ہے۔

شان نزول

ابن عباس اور کچھ دوسرے مفسرین نے نقل کیا ہے کہ جنگ احد کے دردناک حوادث کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوہ احد کی چوٹی پر تشریف لے گئے اور ابوسفیان بھی پہاڑ پر چڑھ گیا اور فاتحانہ لہجے میں پکار کر کہنے لگا۔ اے محمد! ایک دن ہم کامیاب ہوئے اور دوسرے دن تم یعنی ہماری یہ کامیابی اس شکست کے مقابلہ میں ہے جو ہمیں جنگ بدر میں ہوئی تھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں سے فرمایا فوراً سے جواب دو (گویا ابوسفیان پر آپ ثابت کر رہے تھے کہ میرے مکتب میں تربیت پانے والے بہت باخبر و آگاہ ہیں) مسلمانوں نے کہا ہماری اور تمہاری کیفیت ہرگز ایک جیسی نہیں ہے ہمارے شہید بہشت میں ہیں جبکہ تمہارے مقتول جہنم میں ہیں ابوسفیان نے پکار کر یہ جملہ فخریہ نعرے کی طور پر کہا

''لنا العزی ولا عزی لکم''

(ہم بہت بڑا عزی بت رکھتے ہیں اور تمہارے پاس وہ بھی نہیں)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم بھی اس کے جواب میں کہو

''اللّٰہ مولنا ولا مولی لکم''

(ہمارا ولی و سرپرست خدا ہے اور ہمارا تکیہ خدا پر ہے اور تمہارا کوئی سرپرست نہیں تمہاری کوئی تکیہ گاہ نہیں۔)

ابوسفیان نے جب اپنے آپ کو اس زندہ اسلامی شعار کے مقابلے میں بے بس اور کمزور پایا تو بت ''عزیٰ'' کو چھوڑ کر بت ہبل کے دامن کو جا پکڑا اور پکارا

''اعل ھبل''

(ہبل سربلند ہو)

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ اس جاہلانہ شعار کو مضبوط اور پختہ شعار کے ساتھ شکست دو اور کہو ''اللّٰہ اعلی و اجل'' (خدا برتر و بالاتر ہے)

ابوسفیان کو جب اپنے ان مختلف شعار سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو اس نے پکار کر کہا ہماری وعدہ گاہ ''بدر حضری'' ہے مسلمان میدان جنگ سے بہت سے زخم لے کر پلٹے وہ احد کے دردناک حوادث پر بہت دکھی تھے اسی وقت اوپر والی آیت نازل ہوئی جس میں انہیں بیدار کیا گیا کہ وہ مشرکین کا تعاقب کرنے میں کوتاہی نہ کریں اور اس دردناک واقعہ سے پریشان نہ ہوں مسلمان اسی حالت میں دشمن کا پیچھا کرنے اٹھ کھڑے ہوئے اور جب اس کی اطلاع مشرکین کو پہنچی تو وہ بڑی تیزی کے ساتھ مدینہ سے دور نکل گئے اور مکہ کی طرف پلٹ گئے۔

یہ شان نزول ہمیں تعلیم دیتی ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ دشمن کی کسی تکنیک سے بے خبر نہ ہو اور ان کی جنگ کے ہر ذریعہ کے مقابل چاہے وہ جسمانی جنگ ہو یا نفسیاتی اس سے زیادہ مضبوط اور غلبہ پانے والا ذریعہ اپنائیں دشمنوں کی منطق کے مقابلے میں زیادہ ٹھوس منطق اور ان کے ہتھیار کے مقابلے میں بہتر ہتھیار استعمال کریں یہاں تک کہ ان کے نعرے کے مقابلے میں زیادہ زوردار نعرہ اپنائیں ورنہ واقعات دشمن کے فائدہ میں چلے جائیں گے۔

لہٰذا ہمارے زمانے میں بھی مسلمانوں کو جن دردناک حوادث اور وحشت ناک مفاسد نے گھیر رکھا ہے بجائے اس کے کہ افسوس کرتے رہیں فعالیت سے کام لیں غلط کتابوں اور مطبوعات کے مقابلے میں صحیح کتب اور مطبوعات فراہم کریں دشمنوں کے پراپیگنڈہ کے جدید ذرائع کے مقابلے میں آج کے جدید ترین تبلیغاتی وسائل کو کام میں لائیں اور غلط مراکز کے مقابلے میں تفریح کے صحیح ذرائع اپنے نوجوانوں کے لئے فراہم کریں اور ان کے منصوبوں سازشوں اور حیلوں کے مقابلے میں موجودہ زمانے کی مناسبت سے جامع اسلامی منصوبے پیش کریں جو مختلف سیاسی اقتصادی اور اجتماعی نظریات رکھنے والوں کا مقابلہ کرسکیں صرف انہی طریقوں سے ہم اپنے وجود کا تحفظ کر سکتے ہیں اور ہمیں چاہئے کہ ہم قیادت کرنے والے طبقہ کی حیثیت سے آج کی کی دنیا میں آگے بڑھیں۔

تفسیر

ہر ہتھیار کے مقابلے میں اس جیسا ہتھیار

جہاد اور ہجرت سے متعلق آیات کے بعد زیر نظر آیت میں مسلمانوں میں وفاداری کی روح بیدار کرنے کے لئے کہا گیا ہے دشمن کا تعاقب کرنے میں سستی نہ کرو (وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ) یہ اس طرف اشارہ ہے کہ کبھی بھی سخت ترین دشمن کے مقابلے میں دفاعی حالت کو نہ اپناؤ بلکہ ہمیشہ اس قسم کے افراد کے مقابلے میں یورش کر کے اور بڑھ کر حملہ کر کے اپنی حفاظت کرو کیونکہ نفسیاتی طور پر یہ حربہ دشمن کے حوصلے پست کرنے کے لئے بہت موثر ہے جس طرح احد کے واقعہ میں شدید شکست کے بعد اس روش پر چل کر فائدہ اٹھایا گیا وہ دشمنان اسلام جنہوں نے جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد میدان جنگ چھوڑ دیا اور راستے میں میدان جنگ کی طرف پلٹنے کی جو فکر ان میں پیدا ہوئی وہ ان کے دماغ سے نکل گئی اور وہ بڑی تیزی کے ساتھ مدینہ سے دور ہٹ گئے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک زندہ اور واضح استدلال اس حکم کے لئے بیان کرتے ہوئے فرمایا تم کیوں کاہل بنتے ہو

حالانکہ اگر تم میدان جہاد میں درد و رنج میں گرفتار ہوئے ہو تو تمہارے دشمن بھی پریشانیوں میں مبتلا تھے لیکن اس میں فرق یہ ہے کہ تمہیں تو پھر بھی پروردگار عالم کی زیادہ سے زیادہ مدد و رحمت کی امید تھی لیکن وہ تو اس امید سے بھی محروم تھے۔

آخر میں زیادہ تاکید کے لئے فرماتا ہے یہ بات نہ بھولنا کہ تمہاری یہ تمام پریشانیاں، تکلیفیں، زحمتیں اور بعض اوقات کاہلی اور چشم پوشیاں خدا کی نظر سے مخفی نہیں۔ لہٰذا ان سب کا نتیجہ تم دیکھ لوگے۔

(۱۰۵) اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَ لَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ۙ	ہم نے یہ کتاب تم پر حق کے ساتھ نازل کی تاکہ اس کے ساتھ جو خدا نے تجھے علم دیا ہے لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اور خیانت کرنے والوں کے حامی نہ بنو۔
(۱۰۶) وَّ اسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۚ	اور خدا سے مغفرت طلب کرو کہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

شان نزول

زیرِ نظر آیات کی شان نزول کے بارے میں ایک طویل واقعہ نقل ہوا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

قبیلہ بنی ابیرق نسبتاً ایک مشہور قبیلہ تھا اس قبیلہ کے تین بھائی بشر، بشیر، مبشر نامی تھے۔ بشر ایک مسلمان رفاعہ کے گھر میں داخل ہوا اور تلوار زرہ اور کچھ خوراک چوری کر لیں اس کے بھتیجے قتادہ نے جو مجاہدین بدر میں سے تھا یہ واقعہ حضرت پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں بیان کیا لیکن ان تین بھائیوں نے اپنے ایک پڑوسی صاحب ایمان مسلمان لبید پر اس معاملے میں تہمت لگائی لبید اس ناروا تہمت سے بہت زیادہ برہم ہوا اور تلوار نکال کر اس کے پاس آیا اور چیخ کر کہا تم مجھ پر چوری کی تہمت لگاتے ہو حالانکہ اس الزام کے زیادہ اہل تم ہو اور تم وہی منافق ہو جو پیغمبر ﷺ خدا کی ہجو کہتے تھے اور پھر ہجو کے اشعار کو قریش سے منسوب کر دیتے تھے یا تو اس تہمت کو جو تم نے مجھ پر لگائی ہے ثابت کرو ورنہ میں اپنی تلوار تمہیں گھونپ دوں گا چور کے بھائیوں نے جب یہ صورت حال دیکھی تو لبید سے نرمی کا سلوک کیا لیکن جب انہیں یہ خبر ملی کہ واقعہ قتادہ کے ذریعے پیغمبر اکرم ﷺ کے گوش گزار ہو چکا ہے تو وہ اپنے قبیلے کے ایک خطیب کے پاس گئے کہ وہ چند افراد کے ساتھ پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں جائے اور قیافہ سے حقیقی چوروں کو بری الذمہ قرار دے اور کہے کہ قتادہ نے جھوٹا الزام لگایا ہے پیغمبر اکرم ﷺ نے ظاہر پر عمل کرنے کے فریضہ کے مطابق اس گروہ کی شہادت کو قبول کر لیا اور قتادہ کو سزا کا مستحق قرار دیا قتادہ جو بے گناہ تھا اس سے بہت پریشان ہوا اور اپنے چچا کے پاس لوٹ کر گیا

اور بہت زیادہ افسوس کے ساتھ واقعہ بیان کیا تو اس کے چچا نے اس کی دلجوئی کی اور کہا کہ پریشان نہ ہو خدا ہمارا نگہبان ہے اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور اس بے گناہ شخص کو بری الذمہ قرار دیا اور حقیقی خیانت کرنے والوں کی شدید سرزنش کی۔

تفسیر

خیانت کرنے والوں کی حمایت نہ کرو

خدا ان آیات میں پہلے تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وصیت کرتا ہے کہ اس آسمانی کتاب کو بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان حق وانصاف کے اصول جاری ہوں ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تم پر نازل کی ہے تا کہ اس کے ذریعے خدا نے تجھے جو علم دیا ہے لوگوں کے درمیان فیصلے کرو۔ اس کے بعد کہتا ہے کبھی بھی خیانت کرنے والوں کی حمایت نہ کر۔ اگر چہ بظاہر روئے سخن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے لیکن اس میں شک وشبہ نہیں کہ یہ ایک عمومی حکم ہے جو تمام قاضیوں اور فیصلہ کرنے والوں کے لئے ہے اس بنا پر اس قسم کے خطاب کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ممکن ہے کہ اس قسم کا معاملہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ پیش آیا ہے کیونکہ اس مذکورہ حکم کا تعلق تمام افراد سے ہے۔

(۱۰۶) اس آیت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بارگاہ خداوندی سے طلب مغفرت کے لئے کہا گیا ہے۔ کیونکہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

(۱۰۷) وَ لَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ۚ	اور جنہوں نے اپنے آپ سے خیانت کی ہے ان کا دفاع نہ کرو، کیونکہ خدا خیانت کرنے والے گنہ گاروں کو دوست نہیں رکھتا۔
(۱۰۸) يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَ لَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَ هُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا	وہ اپنے برے کاموں کو لوگوں سے چھپاتے ہیں لیکن خدا سے نہیں چھپاتے اور رات کی مجالس میں ایسی باتیں کرتے تھے جن سے خدا راضی نہ تھا خدا ان کیساتھ تھا اور وہ جو عمل کرتے ہیں خدا اس پر محیط ہے۔

(۱۰۹)هَٰٓأَنتُمْ هَٰٓؤُلَآءِ جَٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا فَمَن يُجَٰدِلُ ٱللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ أَم مَّن يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا	جی ہاں! تم تو وہی ہو جنہوں نے اس جہان کی زندگی میں ان کو بچایا (اور ان کا دفاع کیا) لیکن کون ہے جو خدا کے سامنے قیامت کے دن ان کا دفاع کرے گا یا کون ہے جو ان کا وکیل اور حامی ہوگا۔

تفسیر

خیانت کرنے والوں کی حمایت نہ کرنے کے احکامات کے بعد ان آیات میں اس سلسلہ کو یوں جاری رکھا گیا ہے کسی وقت بھی خیانت کرنے والوں کی اور ان کی جو اپنے آپ سے خیانت کرتے ہیں حمایت نہ کرو۔ کیونکہ خدا خیانت کرنے والے گنہگاروں کو پسند نہیں کرتا۔

(۱۰۸) پھر ایسے خیانت کاروں کی سرزنش کرتے ہوئے کہتا ہے انہیں شرم آتی ہے کہ ان کے اعمال کا باطن لوگوں کے سامنے ظاہر ہو۔ لیکن وہ خدا سے تو شرم نہیں کرتے۔ وہ خدا جو ہر جگہ ان کے ساتھ ہے اور جس وقت رات کی تاریکی میں وہ خیانت کار سازشیں اور منصوبے بناتے تھے اور وہ باتیں کرتے تھے کہ جن سے خدا راضی نہیں وہ خدا ان کے ساتھ تھا (یعنی انہیں دیکھ اور سن رہا تھا) اور وہ ان کے تمام اعمال پر محیط ہے۔

(۱۰۹) اس کے بعد روئے سخن چور کے قبیلے کے ان افراد کی طرف ہے جنہوں نے اس کا دفاع کیا تھا خدا انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے تعجب ہے کہ تم اس جہان کی زندگی میں تو ان کا دفاع کرتے ہو لیکن کون ہے جو قیامت کے دن ان کا دفاع کرے یا وکیل بن کر ان کے کام آئے اور ان کی مصیبتوں اور ابتلاؤں کو ختم کرے۔ اس وجہ سے تمہاری طرف سے ان کا دفاع معمولی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ دائمی زندگی میں خدا کے سامنے ان کا کوئی دفاع کرنے والا نہیں ہے وہاں تو سب کو اپنی اپنی پڑی ہو کوئی کسی کا کیا دفاع کرے گا۔

حقیقت میں اوپر والی تین آیات میں پہلے تو پیغمبر اسلام ﷺ اور سب قاضیوں کو حق کی وصیت کی گئی ہے کہ وہ مکمل طور پر نگرانی اور دھیان رکھیں کہ کچھ لوگ حیلہ سازی اور جھوٹے گواہوں کے ذریعہ دوسرے کے حقوق پامال نہ کریں پھر خیانت کرنیوالوں اور بعد میں ان کا دفاع کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ اس جہان اور دوسرے جہان میں اپنے اعمال کے برے نتائج پر نظر رکھیں۔

(۱۱۰)وَ مَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا اَوۡ یَظۡلِمۡ نَفۡسَہٗ ثُمَّ یَسۡتَغۡفِرِ اللّٰہَ یَجِدِ اللّٰہَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا	جوشخص کوئی برا کام کرے یا اپنے اوپر ظلم کرے پھر خدا سے مغفرت طلب کرے تو وہ خدا کو بخشنے والا اورمہربان پائے گا۔
(۱۱۱)وَ مَنۡ یَّکۡسِبۡ اِثۡمًا فَاِنَّمَا یَکۡسِبُہٗ عَلٰی نَفۡسِہٖ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا	اور جو کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہےاور خدا دانا وحکیم ہے۔
(۱۱۲)وَ مَنۡ یَّکۡسِبۡ خَطِیۡٓئَۃً اَوۡ اِثۡمًا ثُمَّ یَرۡمِ بِہٖ بَرِیۡٓئًا فَقَدِ احۡتَمَلَ بُہۡتَانًا وَّ اِثۡمًا مُّبِیۡنًا ۠	جوشخص غلطی یا گناہ کا مرتکب ہو پھر بے گناہ پر الزام دھرے اس نے بہتان اور واضح گناہ کا بوجھ اپنے کندھوں پر لادلیا ہے۔

تفسیر

ان تین آیات میں خیانت اور تہمت سے متعلق بحث کے بعد جو گذشتہ آیات میں ہو چکی ہے تین عمومی احکامات بیان ہوئے ہیں۔

1۔ پہلے تو اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ توبہ کی راہ بدکارلوگوں کے لئے بہر حال کھلی ہےاور جوشخص اپنے اوپر یا کسی دوسرے پر ظلم کرے اور بعد میں حقیقتاً پشیمان ہو اور خدا سے مغفرت طلب کرے اور وہ اس کی تلافی کی کوشش بھی کرے تو وہ خدا کو بخشنے والا اورمہربان پائے گا۔غور کرنا چاہئے کہ آیت میں دو چیزیں بیان ہوئی ہیں ایک ''سوء'' اور دوسری کسی پر ''ظلم'' قرینہ مقابلہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے اور ''سوء'' کے اصل لغوی معنی دوسرے کونقصان پہنچانا سے اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کا گناہ جس سے انسان دوسرے کونقصان پہنچائے یا اپنے آپ کو وہ حقیقی توبہ اور تلافی کی صورت میں قابل بخشش ہے۔

ضمنی طور پر ''یَجِدِ اللّٰہَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا'' (خدا کو بخشنے والا مہربان پائے گا) سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی توبہ یہ اثر رکھتی ہے کہ انسان اپنے نفس کے اندر ہی اس کا نتیجہ پالیتا ہے ایک طرف خدا کے غفور ہونے کے تصور سے گناہ کا پریشان کن اثر زائل ہو جاتا ہے اور دوسری طرف وہ محسوس کرتا ہے کہ معصیت کے سبب وہ رحمت والطاف الٰہی سے دور ہو گیا تھا اور اب اس کی رحیمیت کی وجہ سے دوریاں ختم ہوگئی ہیں اور وہ خدا کے نزدیک ہو گیا ہے۔

(۱۱۱)2۔دوسری آیت اس حقیقت کی وضاحت ہے کہ جس کا اجمالی ذکر گذشتہ آیات میں ہو چکا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان جس گناہ کا مرتکب ہوتا ہے نتیجتاً اس سے اپنے آپ کو ضرور نقصان میں مبتلا کر لیتا ہے۔اور آیت کے آخر میں فرماتا ہے کہ خدا عالم ہے اور بندوں کے اعمال سے باخبر ہے اور وہ حکیم ودانا بھی ہے اور ہر شخص کو اس کے استحقاق کے مطابق سزا و جزا دیتا ہے۔

اس طرح گناہ اگر چہ ظاہر میں مختلف ہیں کبھی کسی گناہ کا نقصان دوسروں کو پہنچتا ہے اور کبھی اس کا نقصان اپنے آپ کو ہوتا ہے لیکن اس کا حقیقی اور آخری نتیجہ بہر حال خود انسان کے اپنی طرف لوٹتا ہے اور گناہ کے برے اثرات سب سے پہلے خود انسان کی روح اور نفس میں ظاہر ہوتے ہیں۔

(۱۱۲)3۔آخری آیت میں بے گناہ افراد پرتہمت لگانے کے گناہ کی شدت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے جو شخص خطا یا گناہ کا مرتکب ہوتا ہےاوراسے کسی بے گناہ کے سرتھوپتا ہےاس نے بہتان باندھا ہےاورواضح گناہ کاارتکاب کیا ہے۔

جرم تہمت

کسی بے گناہ پرتہمت باندھنابدترین افعال میں سے ہے کہ جس کی اسلام نے شدت سے مذمت کی ہے۔زیرنظرآیت اور متعدداسلامی روایات جواس ضمن میں ملتی ہیں اس کے لئے اسلام کانظریہ واضح کرتی ہیں۔

حقیقت میں بہتان اورتہمت جھوٹ کی بدترین اقسام میں سے ہے کیونکہ اس میں جھوٹ کے عظیم مفاسداورغیبت کے نقصانات بھی شامل ہیں اور یہ ظلم وستم کی بدترین قسم بھی ہے۔اس لیے پیغمبراسلام ﷺ سے منقول ہے آپ ﷺ نے فرمایا:

من بهت مؤمنا او مؤمنة او قال فيهما ما ليس فيه اقامه اللّٰه تعالى يوم القيٰمة على قل من نارحتى يخرج مما قالد

(جوشخص کسی مومن مردیاعورت پر بہتان باندھے یاان کے بارے میں کوئی ایسی بات کہے جوان میں نہ ہوتو خداوندعالم اسے قیامت کے دن آگ کے ایک ٹیلے پرکھڑاکردے گا یہاں تک کہ وہ اس بات سے بری الذمہ ہوجائے جواس نے کہی ہے)

حقیقت میں اس گھٹیااور بزدلانہ کام کے رائج ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرے کانظم ونسق اوراجتماعی انصاف برباد ہو جاتا ہےحق اور باطل آپس میں خلط ملط ہوجاتے ہیں بے گناہ افرادگرفتار بلا ہوجاتے ہیں گنہ گارافراد بچے رہتے ہیں اور باہمی اعتماد ختم ہوکررہ جاتا ہے۔

(۱۱۳)وَ لَوۡ لَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکَ وَ رَحۡمَتُہٗ لَہَمَّتۡ طَّآئِفَۃٌ مِّنۡہُمۡ اَنۡ یُّضِلُّوۡکَ ؕ وَ مَا یُضِلُّوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَہُمۡ وَ مَا یَضُرُّوۡنَکَ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ وَ اَنۡزَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ عَلَّمَکَ مَا لَمۡ تَکُنۡ تَعۡلَمُ ؕ وَ کَانَ فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکَ عَظِیۡمًا	اگرخدا کافضل اوراس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ پختہ ارادہ کر چکا تھا کہ وہ تمہیں گمراہ کر دےلیکن وہ اپنے سوا کسی کوگمراہ نہیں کر سکتے اور وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور خدا نے کتاب وحکمت تم پر نازل کی اورتمہیں اس چیز کی تعلیم دی جوتم نہیں جانتے تھےاورتم پر خدا کا عظیم فضل تھا۔

تفسیر

یہ آیت بنی ابیرق کے حادثہ کے ایک پہلوکی طرف اشارہ کرتی ہےقبل کی چندآیات کی شان نزول میں اس کی نشاندہی کی جا

چکی ہے۔

آیت کہتی ہے اگر خدا کا فضل و رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتا تو منافقین یا ان جیسے) بعض لوگ مصمم ارادہ کر چکے تھے کہ تمہیں راہ حق و عدالت سے منحرف کر دیں لیکن لطفِ الٰہی تمہارے شامل حال رہا اور اس نے تمہاری حفاظت کی۔

وہ چاہتے تھے کہ ایک بیگناہ شخص پر تہمت لگائیں اور پھر پیغمبر ﷺ کو اس واقعے میں ملوث کریں تاکہ اس طرح ایک تو پیغمبر اکرم ﷺ کی اجتماعی اور معنوی حیثیت کو نقصان پہنچے اور دوسرا ایک بیگناہ مسلمان کے ذریعے اپنی بری اغراض پوری کرسکیں۔ لیکن وہ خدا جو اپنے پیغمبر ﷺ کا محافظ ہے اس نے ان کے منصوبوں کو نقش بر آب کر دیا۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: یہ لوگ صرف اپنے آپ کو گمراہ کرتے ہیں اور آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

آخر میں گمراہی، خطا اور گناہ سے پیغمبر ﷺ کے محفوظ رہنے اور پیغمبر ﷺ کی معنویت کی علت بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: آپ پر خدا نے کتاب و حکمت نازل کی اور جو آپ نہیں جانتے تھے آپ کو اس کی تعلیم دی۔

آیت میں مسئلہ عصمت کی ایک بنیاد دلیل اجمالی طور پر بیان کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا نے پیغمبر کو علوم تعلیم فرمائے جن کی وجہ سے وہ گناہ اور خطا سے بالکل مامون و محفوظ ہو گئے ہیں کیونکہ علم و دانش (جب اپنے آخری مرحلے کو پہنچ جائیں تو) موجب عصمت ہوتے ہیں۔

(۱۱۴) لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا	ان کی بہت سی سرگوشیوں (اور خفیہ میٹنگوں) میں خیر و سودمندی نہیں ہے مگر یہ کہ کوئی شخص (اس طریقے سے) دوسروں کی مدد، کوئی نیک کام یا لوگوں کے درمیان اصلاح کی کوشش کرے اور جو شخص رضائے الٰہی کے لئے یہ سب کچھ کرے تو اسے ہم عظیم اجر دیں گے۔

تفسیر

سرگوشیاں

گذشتہ آیات میں بعض منافقین یا ان جیسے لوگوں کے راتوں کے مخفی اور شیطانی جلسوں اور میٹنگوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اب اس آیت میں ''نجویٰ'' کے زیر عنوان ذرا تفصیل سے بات کی گئی ہے۔

''نجویٰ'' کا معنی صرف کان میں باتیں کرنا یا سرگوشی ہی نہیں بلکہ ہر قسم کی مخفی اور پوشیدہ میٹنگوں کو بھی ''نجویٰ'' کہتے ہیں۔

بہر حال آیت کہتی ہے ان کی زیادہ تر خفیہ میٹنگیں جو شیطانی سازشوں اور منصوبوں کے تحت منعقد ہوتی ہیں ان میں کوئی بھلائی اور فائدہ نہیں ہے۔

اس کے بعد اس لیے کہ کہیں یہ گمان نہ ہو کہ ہر طرح کی سرگوشی اور مخفی میٹنگ مذموم و ممنوع ہے ایک کلی قانون میں استثنائی

صورت کے مواقع بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے مگر یہ کہ کوئی شخص اس کے ذریعے صدقہ کی وصیت کرتا ہو دوسروں کی مدد کا اقدام کرتا ہو نیک کام انجام دیتا ہو یا لوگوں کے درمیان صلح کرواتا ہو۔

ایسی سرگوشیاں اور میٹنگیں اگر ریاکاری اور تظاہر کے لئے نہ ہوں بلکہ ان کا مقصد رضائے پروردگار ہو تو خدا ان کے لئے اجرعظیم مقرر فرمائے گا۔

اصولی طور پر سرگوشیوں کا ناپھوسیوں اور خفیہ میٹنگوں کو قرآن نے ایک شیطانی عمل قرار دیا ہے۔

نجوی شیطان کی طرف سے ہے (مجادلہ ۱۰)

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا عمل عموماً غلط کاموں کے لئے ہوتا ہے چونکہ نیک مفید اور مثبت کاموں کی انجام دہی کے لئے عموما کوئی خفیہ اور پوشیدہ چیز نہیں ہوتی ہاں البتہ بعض اوقات خلاف معمول حالات کی وجہ سے انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ نیک کاموں کو مثبت طور پر مخفیانہ بجالائے یہ استثنائی صورت بارہا قرآن میں بیان کی گئی۔

(۱۱۵) وَ مَنۡ یُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الۡهُدٰی وَ یَتَّبِعۡ غَیۡرَ سَبِیۡلِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَ نُصۡلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتۡ مَصِیۡرًا ۠	جو شخص حق واضح ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور راہ مومنین کے علاوہ کسی راستے کی پیروی کرے تو ہم اسے اسی راہ پر لیے جاتے ہیں جس پر وہ جا رہا ہے اور اسے دوزخ میں داخل کریں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

شان نزول

گذشتہ آیات کی شانِ نزول میں ہم کہہ چکے ہیں کہ بشیر بن ابیرق نے ایک مسلمان کی چوری کرنے کے بعد اس کا الزام ایک بے گناہ شخص پر دھر دیا اور حیلہ سازی سے پیغمبر اکرم ﷺ کے سامنے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے دیا لیکن مذکورہ آیات کے نزول سے وہ رسوا ہو گیا اس رسوائی کے بعد بجائے اس کے کہ توبہ کرتا اور راہِ حق پر لوٹ آتا اس نے کفر کا راستہ اختیار کر لیا اور واضح طور پر مسلمانوں سے الگ ہو گیا اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس سلسلے میں اسلام کا ایک عمومی حکم بیان کیا۔

تفسیر

جب انسان کسی غلطی کا مرتکب ہوتا ہے تو آگاہی کے بعد اس کے سامنے دو راستے ہوتے ایک ہے بازگشت اور توبہ کا راستہ جس کے ذریعے گناہ کے اثرات دھل جاتے ہیں اور اس کا تذکرہ گذشتہ چند آیات میں ہو چکا ہے دوسرا ہے ہٹ دھرمی اور عناد کا راستہ جس کے منحوس نتیجے کے بارے میں زیر بحث آیت میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے جو شخص حق آشکار ہونے کے بعد رسول کے سامنے مخالفت اور عناد کا مظاہرہ کرے اور راہ مومنین کو چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کرے تو ہم اسے اسی راستے کی طرف کھینچے لیے جائیں گے جس پر وہ جا رہا ہے اور روز قیامت ہم اسے جہنم میں ڈالیں گے اور کیسی بری جگہ اس کے انتظار میں ہے۔

(۱۱۶)اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا	خدا اپنے ساتھ کیے جانے والے شرک کو نہیں بخشتا (لیکن) اس سے کم تر کو جسے چاہے (اور مناسب سمجھے) بخش دیتا ہے اور جو شخص خدا کے لئے شریک کا قائل ہو، وہ دور کی گمراہی میں جا پڑا ہے۔

تفسیر

شرک......نا قابل معافی گناہ

منافقین اور مرتدین یعنی اسلام قبول کر لینے بعد کفر پر پلٹ جانے والوں سے مربوط مباحث کے بعد یہاں دوبارہ گناہ شرک کی شدت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ ایسا گناہ ہے جو عفو بخشش کے قابل نہیں ہے اور اس سے بڑھ کر کسی گناہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ فرق کے ساتھ یہی مضمون اسی سورہ کی آیت ۴۸ میں گذر چکا ہے۔ ایسی تکرار تربیتی مسائل میں لازمہ بلاغت ہے کیونکہ بنیادی اور اہم مسائل کی فاصلے سے تکرار ہونا چاہیئے تا کہ وہ نفوس وافکار میں راسخ ہو جائیں۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ آیت اس سورہ میں کچھ فرق کے ساتھ دو مرتبہ آئی ہے تا کہ شرک و بت پرستی کے وہ آثار جو سال ہا سال سے لوگوں کے نفوس کی گہرائیوں میں گھر بنا چکے تھے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں اور توحید کے معنوی و مادہ آثار ان کے شجر وجود پر آشکار ہو جائیں البتہ دونوں آیات میں تھوڑا سا فرق ہے یہاں فرمایا گیا ہے۔ جو شخص خدا کے لئے شریک کا قائل ہو وہ دور کی گمراہی میں گرفتار ہے............لیکن گذشتہ آیت میں ارشاد ہوا ہے۔ جو شخص کسی کو خدا کا شریک بنا دے اس نے بہت بڑا جھوٹ اور افتراء باندھا ہے۔

درحقیت وہاں جنبہ الٰہی اور خدا شناسی کے لحاظ سے شرک کے عظیم نقصان کی طرف اشارہ ہوا ہے اور یہاں لوگوں کے لیے اس کے نا قابل تلافی نقصانات بیان ہوئے ہیں وہاں مسئلے کا عملی پہلو مدنظر رکھا گیا ہے اور یہاں اس کے عملی پہلو اور خارجی نتائج کا ذکر ہے واضح ہے کہ اصطلاح کے مطابق یہ دونوں لازم وملزوم ہیں

(۱۱۷)اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَ اِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ۙ	وہ خدا کو چھوڑ کر صرف بتوں کو پکارتے ہیں جن کا کوئی اثر نہیں اور (یا) وہ صرف سرکش اور تباہ کار شیطان کو پکارتے ہیں۔
(۱۱۸)لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَ قَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۙ	خدا نے اسے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور اس نے کہا ہے کہ میں تیرے بندوں سے ایک معین مقدار لے کر رہوں گا۔

(۱۱۹)وَّ لَاُضِلَّنَّهُمۡ وَ لَاُمَنِّیَنَّهُمۡ وَ لَاٰمُرَنَّهُمۡ فَلَیُبَتِّکُنَّ اٰذَانَ الۡاَنۡعَامِ وَ لَاٰمُرَنَّهُمۡ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلۡقَ اللّٰهِ ؕ وَمَنۡ یَّتَّخِذِ الشَّیۡطٰنَ وَلِیًّا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَقَدۡ خَسِرَ خُسۡرَانًا مُّبِیۡنًا ؕ	اور میں انہیں گمراہ کروں گا اور آرزوؤں اور تمناؤں کے حصول میں سرگرم رکھوں گا اور انہیں حکم دوں گا کہ وہ (بے ہودہ اور فضول کام انجام دیں اور) چوپایوں کے کان چیر دیں اور خدا کی (پاک) خلقت کو خراب کر دیں (فطرت توحید کو شرک آلود کر دیں) اور وہ لوگ جنہوں نے خدا کی بجائے شیطان کو اپنا ولی چنا ہے انہوں نے واضح نقصان کیا ہے۔
(۱۲۰)یَعِدُهُمۡ وَ یُمَنِّیۡهِمۡ ؕ وَ مَا یَعِدُهُمُ الشَّیۡطٰنُ اِلَّا غُرُوۡرًا	شیطان ان سے (جھوٹے) وعدے کرتا ہے اور انہیں آرزوؤں میں سرگرم رکھتا ہے اور مکر و فریب کے سوا انہیں کوئی وعدہ نہیں دیتا۔
(۱۲۱)اُولٰٓئِکَ مَاۡوٰهُمۡ جَهَنَّمُ ۫ وَ لَا یَجِدُوۡنَ عَنۡهَا مَحِیۡصًا	(شیطان کے) ان (پیروکاروں) کے رہنے کی جگہ جہنم ہے اور ان کے لئے کوئی راہ فرار نہیں ہے۔

تفسیر

شیطانی سازشیں

پہلی آیت ان مشرکین کی حالت بیان کر رہی ہے جن کے منحوس انجام کا تذکرہ گذشتہ آیت میں کیا گیا ہے اس میں درحقیقت ان کی سخت گمراہی کا سبب بیان کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے وہ اس قدر کوتاہ فکر ہیں کہ وہ وسیع عالم ہستی کے خالق کو چھوڑ کر ایسے موجودات کے در پر رجوع کرتے ہیں کہ جن کا کچھ بھی مثبت اثر نہیں بلکہ بعض اوقات تو شیطان کی طرح تباہ کار اور گمراہ کن بھی ہوتے ہیں۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں مشرکین کے معبود دو چیزوں میں منحصر قرار دیئے گئے ہیں اول ''اناث'' اور دوم ''شیطان مرید''۔

''اناث'' جمع ہے ''انثی'' کی جو کہ ''انث'' (بروزن ''ادب'') کے مادہ سے ہے ''انثی'' نرم اور قابل انعطاف موجود کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ لوہا جب آگ میں نرم ہو جائے تو عرب ''انث الحدید'' کہتے ہیں عورت کو بھی ''اناث'' یا ''مونث'' اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ زیادہ نرم دل لطیف اور انعطاف پذیر صنف ہے

لہٰذا شیطان مرید سے مراد وہ شیطان ہے جس کے شجر وجود کی تمام صفات فضیلت گر چکی ہوں اور بھلائی اور طاقت کی کوئی

چیز اس میں باقی نہ رہی ہو۔

(۱۱۸)اس میں اور اس کے بعد کی آیات میں شیطان کی صفات اس کے مقاصد واہداف اور بنی آدم سے اس کی مخصوص دشمنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے نیز اس کے لائحہ عمل کے مختلف حصوں کی تشریح کی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے خدا نے اسے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے(**لعنه الله**)اس کی تمام تباہ کاریوں اور بدبختیوں کی بنیاد دراصل یہی ہے کہ وہ رحمت الٰہی سے دور ہو چکا ہے اور یہ دوری اس کے غرور وتکبر کا نتیجہ ہے یہ بات واضح ہے کہ ایسا وجود جو رحمت خدا سے دور ہو کر ہر طرح کی خیر وخوبی سے محروم ہو چکا ہو وہ دوسروں کی زندگی کے لئے مفید نہیں ہوسکتا جس نے حیات بخشنے والے سے کچھ نہ پایا ہو وہ ہستی آفریں کیسے ہوسکتا ہے ایسا وجود نہ صرف یہ کہ مفید نہیں ہوسکتا بلکہ نقصان دہ بھی ہوگا۔اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ شیطان نے قسم کھا رکھی ہے کہ وہ یہ کام سرانجام دے گا۔

1۔تیرے بندوں سے ایک معین حصہ لوں گا۔

وہ جانتا ہے کہ وہ خدا کے سب بندوں کو گمراہ نہیں کر سکتا اور صرف ہوس پرست ضعیف ایمان والے اور کمزور ارادے کے مالک ہی اس کے سامنے جھکیں گے۔

(۱۱۹)2۔انہیں گمراہ کروں گا۔

3۔انہیں لمبی چوڑی امیدوں اور آرزوؤں کے سہارے مصروف رکھوں گا۔

4۔انہیں فضول اور بے ہودہ کاموں کی دعوت دوں گا ان میں سے یہ بھی ہے کہ انہیں حکم دوں گا کہ وہ چوپایوں کے کانوں میں سوراخ کریں یا انہیں کاٹ ڈالیں۔

یہ زمانہ جاہلیت کے ایک بدترین عمل کی طرف اشارہ ہے بت پرستوں میں یہ کام مروج تھا کہ وہ بعض چوپایوں کے کان چیر دیتے یا انہیں قطع کر دیتے پھر ان پر سواری کو ممنوع سمجھ لیتے اور ان سے کسی قسم کا کوئی فائدہ نہ اٹھاتے۔

5۔انہیں اس کام پر ابھاروں گا کہ خدا کی پاک خلقت کو بگاڑ دیں۔

یہ جملہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نے انسان کی فطرت اولی میں توحید یگانہ پرستی اور ہر طرح کی پسندیدہ صفت رکھی ہے لیکن شیطانی وسوسے اور ہوا وہوس اسے اس صحیح راستے سے منحرف کر دیتے ہیں اور بے راہ روی کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔

آخر میں ایک حکم عمومی بیان کیا گیا ہے جو شخص خدا کی بجائے شیطان کو اپنا سرپرست بناتا ہے وہ کھلے نقصان کا مرتکب ہوا ہے۔

(۱۲۰)اس آیت میں گذشتہ گفتگو کی دلیل کے طور پر چند نکات بیان کیے ہیں۔

شیطان ہمیشہ ان سے جھوٹے وعدے کرتا رہتا ہے اور انہیں لمبی چوڑی آرزوؤں میں محو رکھا ہے لیکن مکر وفریب کے علاوہ کرتا ان کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔

(۱۲۱)محل بحث آیات میں سے آخری آیت میں شیطان کے پیروکاروں کے آخری انجام کا تذکرہ ہے فرمایا گیا ہے۔ان کا ٹھکانا جہنم میں ہے اور ان کے لئے بھاگ نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے۔

(۱۲۲)وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدۡخِلُهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَبَدًا ؕ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَ مَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیۡلًا	اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک کام سر انجام دیئے ہم انہیں عنقریب ان باغات بہشت میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ہمیشہ کے لئے ان میں رہیں گے اللہ تم سے سچا وعدہ کرتا ہے اور کون ہے جو قول اور اپنے وعدوں میں اللہ سے زیادہ سچا ہو۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ جو لوگ شیطان کو اپنا ولی بناتے ہیں وہ واضح طور پر خسارے اور نقصان میں ہیں شیطان ان سے جھوٹے وعدے کرتا ہے انہیں آرزوؤں میں محو رکھتا ہے اور اس کا وعدہ مکر وفریب کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا ان کے مقابلے میں اس آیت میں اہل ایمان کا انجام بیان کیا گیا ہے کہ وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک اعمال انجام دیئے ہیں وہ بہت جلد فردوس بریں کے باغات میں جائیں گے یہ وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ یہ نعمت دنیاوی نعمتوں کی طرح ناپائیدار نہیں ہے بلکہ ہمیشہ مومنین کو میسر رہے گی۔

یہ وعدہ شیطان کے جھوٹے وعدوں کی طرح نہیں ہے بلکہ سچا ہے اور خدا کا وعدہ ہے۔ اور یہ واضح ہے کہ خدا سے بڑھ کر اپنے قول وقرار کا سچا کوئی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وعدہ خلافی یا تو عجز وناتوانی کی وجہ سے ہوتی ہے اور یا جہالت واحتیاج کی بنا پر جو کہ اللہ کی ذات مقدس سے بعید ہے۔

(۱۲۳)لَیۡسَ بِاَمَانِیِّکُمۡ وَ لَاۤ اَمَانِیِّ اَهۡلِ الۡکِتٰبِ ؕ مَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا یُّجۡزَ بِهٖ ۙ وَ لَا یَجِدۡ لَهٗ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیۡرًا	تمہاری اور اہل کتاب کی آرزوؤں سے (فضیلت و برتری) نہیں ہوتی، جو شخص برا عمل کرے گا اسے سزا دی جائے گی اور وہ خدا کے علاوہ کسی کو اپنا ولی ویاور نہیں پائے گا۔
(۱۲۴)وَ مَنۡ یَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی وَ هُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّةَ وَ لَا یُظۡلَمُوۡنَ نَقِیۡرًا	اور جو شخص اعمال صالح میں سے کچھ انجام دے چاہے مرد ہو یا عورت اگر وہ ایمان رکھتا ہے تو ایسے لوگ بہشت میں داخل ہوں گے اور ان پر تھوڑا سا ظلم بھی نہیں ہوگا۔

شان نزول

تفسیر مجمع البیان اور دیگر تفاسیر میں ہے کہ مسلمان اور اہل کتاب ایک دوسرے پر فخر کرتے تھے اہل کتاب کہتے کہ ہمارا پیغمبر تمہارے پیغمبر سے پہلے آیا ہے اور ہماری کتاب تمہاری کتاب سے مقدم ہے اور مسلمان کہتے کہ ہمارا پیغمبر تمام

پیغمبروں کا خاتم ہے اور اس کی کتاب آخری کتاب ہے اور دیگر آسمانی کتب سے زیادہ کامل و اکمل ہے لہٰذا ہم تم سے زیادہ افضل ہیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ ہم برگزیدہ قوم ہیں اور جہنم کی آگ چند دنوں کے سوا ہم تک نہیں پہنچے گی (وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً)۔

اور مسلمان کہتے کہ ہم بہترین امت ہیں کیونکہ خدا نے ہمارے بارے میں فرمایا ہے:

(كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ)

اسی ضمن میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور ان دعوؤں پر خط بطلان کھینچ دیا گیا اور یہ واضح کیا گیا کہ ہر انسان کی قدر و قیمت ان کے اعمال کے مطابق ہوگی۔

تفسیر

سچے اور جھوٹے امتیازات

ان دو آیات میں اسلام کی ایک بہت ہی اہم اساس کو بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ افراد کی وجودی قدر و قیمت اور جزاء سزا ان کے دعوؤں اور آرزوؤں سے مربوط نہیں ہے بلکہ صرف ایمان اور عمل سے وابستہ ہے اسلام کی یہ بنیاد ثابت اور سنت ہے اور غیر متبدل ہے یہ وہ قانون ہے جس کی نظر میں تمام امتیں یکساں ہیں لہٰذا پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے فضیلت و برتری کا انحصار تمہاری اور اہل کتاب کی آرزوؤں پر نہیں ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے جو شخص کوئی عمل بجالائے گا وہ اس کے بدلے اپنی سزا پائے گا اور خدا کے علاوہ کسی کو اپنا ولی یا یاور نہ پائے گا۔

(۱۲۴) اور اسی طرح جو لوگ نیک عمل بجالائیں گے اور صاحب ایمان ہوں گے وہ مرد ہوں یا عورتیں جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

اسی طرح قرآن نے نہایت سادگی سے بقول سب کے ہاتھ پر پاک پانی ڈالا ہے اور کسی مذہب سے دعوے کی حد تک خیالی اجتماعی یا نسلی وابستگی کو بے فائدہ قرار دیا ہے اور نجات کی بنیاد اس مکتب کے اصولوں پر ایمان لانے اور اس کے پروگراموں پر عمل کرنے کو ٹھہرایا ہے۔

(۱۲۵) وَ مَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ وَّ اتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَ اتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا	جو اپنے آپ کو خدا کے سپرد کردے اس سے بہتر کس کا دین ہے اور پھر جو نیکوکار بھی ہو اور ابراہیم کے خالص اور پاک دین کا پیرو ہو اور خدا نے ابراہیم کو اپنی دوستی کے لئے منتخب کرلیا ہے۔

(۱۲۶)وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ۧ	جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب خدا کا ہے اور خدا ہر چیز پر محیط ہے

تفسیر

گذشتہ آیات میں ایمان وعمل کی تاثیر کے بارے میں گفتگوتھی ان میں بتایا گیا تھا کہ کسی دین وآئین سے منسوب ہوجانا ہی کافی نہیں لیکن زیرنظرآیت میں اس بناپر کہ کہیں گذشتہ بحث سے کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ دین اسلام کی تمام ادیان پر برتری کا اظہار یوں کیا گیا ہے کون سا دین اس شخص کے دین سے بہتر ہے جو بارگاہ الٰہی میں سراپا تسلیم ہو اور نیک عمل سے دستبردار نہ ہو اور ابراہیم کے پاک اور خالص دین کا پیروکار ہو۔

البتہ آیت یہاں استفہامیہ صورت میں ہے لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ سننے والے سے اس حقیقت کا اقرار لیا جائے اس آیت میں تین چیز کو بہترین دین کے مقیاس کے طور پر شمار کیا گیا ہے۔

پہلے پورے طور پر خدا کے حضور سپردگی۔

دوسری نیکوکاری۔ یہاں نیکوکاری سے مراد دل زبان اور عمل سے ہر طرح کی نیکی ہے تفسیر نورالثقلین میں اس آیت کے ذیل میں پیغمبر اسلام ﷺ سے ایک حدیث نقل کی گئی ہے جو اس سوال کے جواب میں ہے کہ احسان سے کیا مراد ہے حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

''ان تعبداللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فان یراک''

اس آیت میں احسان سے مراد یہ ہے کہ جو کام بھی عبادت خدا کے لئے انجام دو وہ اس طرح ہو گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے اور وہ تم پر شاہد وناظر ہے۔

تیسری ابراہیم کے پاک دین وآئین کی پیروی کرنا۔

آیت کے آخر میں دین ابراہیم پر اعتماد کی یہ دلیل بیان کی گئی ہے کہ خدا نے ابراہیم کو اپنے خلیل کی حیثیت سے منتخب کرلیا ہے۔

(۱۲۶) اس آیت میں پروردگار کی مالکیت مطلقہ اور تمام اشیاء پر اس کے احاطے کا تذکرہ ہے ارشاد ہوتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خدا کی ملکیت ہے کیونکہ خدا تمام چیزوں پر محیط ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدا نے ابراہیم کو اپنا دوست اس وجہ سے نہیں بنایا کہ خدا کو کسی چیز کی ضرورت اور احتیاج تھی بلکہ خدا تو سب سے بے نیاز ہے یہ انتخاب تو ابراہیم کی خوبیوں اور بہترین صفات کی وجہ سے ہے۔

(۱۲۷)وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَ مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا	تجھ سے عورتوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ خدا اس بارے میں تمہیں جواب دیتا ہے اور جو کچھ قرآن میں یتیم عورتوں کے متعلق جن کے حقوق تم ادا نہیں کرتے اور ان سے شادی کر لینا چاہتے ہیں اور اسی طرح چھوٹے بچوں اور ناتوانوں کے متعلق تمہارے لیے بیان ہوا ہے (اس سلسلے میں خدا کی کچھ وصیتیں ہیں اور خدا یہ بھی سفارش کرتا ہے) کہ یتیموں کے ساتھ عادلانہ برتاؤ کرو اور جو نیکیاں تم انجام دیتے ہو خدا ان سے آگاہ ہے (اور وہ تمہیں ان کا مناسب بدلہ دے گا)۔

تفسیر

حقوق نسواں کے بارے میں مزید گفتگو

زیر نظر آیت میں کچھ لوگوں کے اعتراضات اور سوالات کا جواب دیا گیا ہے جو انہوں نے عورتوں (خصوصا یتیم لڑکیوں) کے متعلق کیے تھے ارشاد ہوتا ہے اے پیغمبر! تم سے عورتوں سے متعلق احکام پوچھتے ہیں کہو کہ خدا اس سلسلے میں تمہیں جواب دیتا ہے۔

مزید ارشاد ہوتا ہے وہ یتیم لڑکیاں جن کے مال پر تم قبضہ کرتے تھے نہ ان سے شادی کرتے تھے اور نہ ان کا مال ان کے سپرد کرتے تھے تا کہ وہ کسی اور سے شادی کر لیں قرآن مجید ان کے بارے میں کچھ اور سوالوں کا جواب دیتا ہے اور اس ظالمانہ روش کی برائی کو واضح کرتا ہے۔

اس کے بعد چھوٹے بچوں کے بارے میں وصیت کی گئی ہے جو کہ زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق میراث سے محروم رہتے تھے فرمایا گیا ہے خدا تمہیں وصیت کرتا ہے کہ تم کمزور بچوں کے حقوق کا لحاظ رکھو۔ ایک مرتبہ پھر یتیموں کے حقوق کے بارے میں ایک مجموعی تاکید کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: خدا تمہیں وصیت کرتا ہے کہ یتیموں سے عدل کرو۔

آخر میں اس مسئلے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جیسا عمل خصوصاً یتیموں اور کمزوروں سے متعلق تم سے سرزد ہو وہ علم خدا کی نظر سے مخفی نہیں رہتا اور اس کی مناسب جزا ملے گی۔

(۱۲۸)وَ اِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَاجُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَ الصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَ اِنْ تُحْسِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا	اور اگر کوئی عورت اپنے شوہر کے بارے میں اس بات سے خوفزدہ ہو کہ وہ سرکشی یا اعراض کا مرتکب ہوگا تو کوئی حرج نہیں کہ وہ آپس میں صلح کریں اور صلح بہتر ہے اگرچہ یہ لوگ (حب ذات کی فطرت کے مطابق ایسے مواقع پر) بخل سے کام لیتے ہیں اور اگر نیکی کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو (اور صلح کی وجہ سے درگذر کر دو) تو خدا اس سے آگاہ ہے جو کچھ تم انجام دیتے ہو (اور وہ تمہیں مناسب جزا دے گا)

شان نزول

بہت سی اسلامی تفاسیر اور کتب احادیث میں اس آیت کی شان نزول یوں بیان ہوئی ہے:

رافع بن خدیج کی دو بیویاں تھیں ایک سن رسیدہ تھی اور دوسری جوان (بعض اختلافات کی بنیاد پر) اس نے اپنی سن رسیدہ بیوی کو طلاق دے دی ابھی عدت ختم نہ ہوئی تھی کہ رافع نے اس سے کہا اگر تم چاہو تو میں تم سے مصالحت کر لیتا ہوں البتہ اگر میں نے دوسری بیوی کو تجھ پر ترجیح دی تو تمہیں صبر کرنا ہوگا اور اگر ایسا نہ چاہو تو پھر عدت کی مدت ختم ہونے تک صبر کرو تاکہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔

اس عورت نے پہلی تجویز قبول کر لی یوں ان کی آپس میں صلح ہوگئی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں اس معاملے کے بارے میں حکم شریعت بیان کیا گیا ہے۔

تفسیر

صلح بہتر ہے

جیسا کہ اسی سورت کی چونتیسویں اور پنتیسویں آیات کی تفسیر میں ہم کہہ چکے ہیں کہ "نشوز" اصل میں "نشز" کے مادہ سے ہے اور اس کا مطلب ہے "بلند زمین"۔ یہ لفظ جب عورت اور مرد کے بارے میں استعمال ہوتا ہے تو سرکشی اور طغیان کا مفہوم دیتا ہے۔

گذشتہ آیات میں عورت کے نشوز سے مربوط احکام بیان ہوئے تھے اور زیر نظر آیت میں مرد کے نشوز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے جب عورت یہ محسوس کرے کہ اس کا شوہر سرکشی اور اعراض کا ارتکاب کر رہا ہے تو کوئی حرج نہیں کہ حریم زوجیت کی حفاظت کے لئے اپنے کچھ حقوق سے صرف نظر کرتے ہوئے صلح کر لے۔

عورت نے چونکہ اپنے کچھ حقوق سے اپنی رضا اور غبت سے اعراض کرلیا ہے اور جبر و اکراہ والی کوئی بات نہیں لہٰذا اس کا کوئی گناہ نہیں اس کے لئے ''لا جناح'' (کوئی حرج اور گناہ نہیں) کا استعمال بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے

بعد از اں صلح پر تاکید کے لئے فرمایا گیا ہے بہر حال صلح بہتر ہے ''وَالصُّلْحُ خَيْرٌ'' یہ ایک چھوٹا سا پر معنی اور پر مغز جملہ ہے اس آیت میں جملہ اگر چہ خانگی اختلافات سے متعلق آیا ہے لیکن واضح ہے کہ یہ ایک کلی اور عمومی قانون ہے۔

اس کے بعد بہت سے لڑائی جھگڑوں اور درگذر نہ کرنے کی بنیاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے لوگ ذاتی طور پر اور حب ذات کی فطرت کے باعث بخل کی موجوں میں پھنس کے رہ جاتے ہیں اور ہر شخص کوشش کرتا ہے کہ اپنے حقوق بے کم و کاست وصول کرے اور یہی تمام لڑائی جھگڑوں کی بنیاد ہے۔

لہٰذا اگر عورت اور مرد اس حقیقت کی طرف توجہ کریں کہ بہت سے اختلافات کا سرچشمہ بخل ہے اور بخل ایک مذموم صفت ہے پھر وہ اپنی اصلاح کی کوشش کریں اور درگذر کی راہ اختیار کریں تو نہ صرف یہ کہ خانگی اختلافات ختم ہو جائیں گے بلکہ بہت سے اجتماعی جھگڑے بھی جاتے رہیں گے اس کے باوجود اس بناء پر کہ مرد کہیں اس حکم سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں آیت کے آخر میں روئے سخن ان کی طرف کرتے ہوئے انہیں نیکی اور پرہیز گاری کی وصیت کی گئی ہے اور انہیں کہا گیا ہے کہ وہ اپنے اعمال و کردار پر نگاہ رکھیں اور راہ حق و عدالت سے منحرف نہ ہوں کیونکہ خدا ان کے تمام اعمال سے آگاہ ہے۔

(۱۲۹)وَ لَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَ لَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ وَ اِنْ تُصْلِحُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا	اور تم ہرگز یہ استطاعت نہیں رکھتے کہ (دلی محبت کے اعتبار سے) عورتوں کے درمیان عدالت کر سکو چاہے جتنی بھی کوشش کرو لیکن اپنا میلان بالکل ایک طرف نہ رکھو اور دوسری کو معلق نہ چھوڑ دو اور اگر اصلاح اور پرہیز گاری کی راہ اختیار کرو تو خدا بخشنے والا مہربان ہے۔
(۱۳۰)وَ اِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا	اور اگر (صلح صفائی کی کوئی صورت نہ ہو اور) ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو خداوند عالم ان میں سے ہر ایک کو اپنے فضل و کرم سے مطمئن کر دے گا اور خدا صاحبِ فضل و کرم اور حکیم ہے۔

تفسیر

ایک سے زیادہ شادیوں کے لئے عدالت شرط ہے

گذشتہ آیت کے آخر میں جس جملے میں احسان تقویٰ اور پرہیز گاری کا حکم دیا گیا ہے وہ شوہروں کے بارے ایک طرح کی دھمکی بھی ہے کہ انہیں اپنے بیویوں کے بارے میں راہ عدالت سے تھوڑا سا انحراف بھی نہیں کرنا چاہئے اس مقام پر سوال پیدا ہوتا

ہے کہ عدالت تو ولی لگاؤ کے سلسلے میں بھی ممکن نہیں ہے لہٰذا متعدد بیویاں ہونے کی صورت میں کیا کیا جائے۔

زیر بحث آیت اس سوال کے جواب میں کہتی ہے محبت کے حوالے سے تو بیویوں کے درمیان عدالت ممکن نہیں ہے چاہے اس کے لئے کتنی بھی کوشش کیوں نہ جائے۔

اس بناء پر کہ مرد اس سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں اس جملے کے بعد فرمایا گیا ہے: جب کہ تم محبت کے حوالے سے بیویوں کے درمیان مساوات قائم نہیں کر سکتے تو پھر سارا رجحان اور قلبی لگاؤ تو ایک طرف نہ رکھو کہ جس سے دوسری بالکل معلّق ہو کر ہی رہ جائے اور اس کے حقوق عملی طور پر ضائع ہو جائیں۔

آیت کے آخر میں ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو اس حکم کے نزول سے قبل اپنی بیویوں کے درمیان عدل میں کوتاہی کرتے تھے ارشاد ہوتا ہے اگر وہ اصلاح اور تقویٰ کی راہ اپنائیں اور گذشتہ رویے کی تلافی کریں تو خدا اپنی رحمت وبخشش ان کے شامل حال کر دے گا۔

(۱۳۰) پھر زیر نظر دوسری آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اگر ازدواجی زندگی کو باقی رکھنا طرفین کے لئے مشکل ہو گیا ہے اور ایسی وجوہ پیدا ہو گئی ہیں کہ جن سے افق حیات ان کے لئے تاریک ہو گیا ہے اور کسی طرح مصالحت نہیں ہو سکتی تو وہ مجبور نہیں ہیں کہ ایسی ازدواجی زندگی کو باقی رکھیں اور آخر دم تک خانگی زندان کے ماحول میں تلخ کلامی سے رہیں بلکہ وہ ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر سکتے ہیں ایسے عالم میں انہیں چاہئے کہ جرات سے اقدام کریں اور آنے والے حالات سے خوف زدہ نہ ہوں کیونکہ اگر وہ ان حالات میں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو خداوند بزرگ و برتر دونوں کو اپنے فضل وکرم سے مطمئن کر دے گا اور امید ہے کہ بہتر جیون ساتھی اور روشن تر زندگی ان کے انتظار میں ہو۔ کیونکہ خدا کی حکمت آمیز رحمت بہت وسیع ہے۔

(۱۳۱) وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ لَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ اِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا	جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ کا ہے اور جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور تمہیں ہم نے وصیت کی کہ خدا (کی نافرمانی) سے ڈرو اور پرہیز کرو اور اگر کافر ہو جاؤ تو (خدا کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ کا مال ہے اور خدا بے نیاز ہے اور لائق تعریف ہے۔
(۱۳۲) وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا	اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے خدا کے لئے ہے اور خدا ان کی حفاظت اور نگہبانی کے لئے کافی ہے۔

(۱۳۳)اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡهِبۡكُمۡ اَیُّهَا النَّاسُ وَ یَاۡتِ بِاٰخَرِیۡنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰی ذٰلِكَ قَدِیۡرًا	اے لوگو! اگر وہ چاہے تو تمہیں یہاں سے لے جائے اور تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے اور خدا اس کام کی طاقت وقدرت رکھتا ہے۔
(۱۳۴)مَنۡ كَانَ یُرِیۡدُ ثَوَابَ الدُّنۡیَا فَعِنۡدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَةِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِیۡعًاۢ بَصِیۡرًا ؑ	جو لوگ دنیا کی جزا اور سزا چاہتے ہیں (اور معنوی اور اخروی نتائج کے طلبگار نہیں وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ) خدا کے پاس تو دنیا وآخرت دونوں کی جزا وثواب ہے اور وہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو چکا ہے کہ اگر حالات مجبور کریں کہ میاں بیوی ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہ ہو تو اس اقدام میں کوئی حرج نہیں اور آئندہ کے حالات میں نہیں ڈرنا چاہئے کیونکہ خدا انہیں اپنے فضل وکرم سے مطمئن اور بے نیاز کردے گا۔

زیر نظر آیات میں سلسلہ کلام جاری ہے پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ہم انہیں بے نیاز اور مستغنیٰ کرنے کی قدرت رکھتے ہیں کیونکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ کی ملکیت ہے۔

جو ذات ایسی لامتناہی ملکیت اور بے پایاں قدرت رکھتی ہے وہ اپنے بندوں کو بے نیاز کرنے سے عاجز نہیں ہوسکتی اس کے بعد اس موقع پر اور دیگر مواقع پر پرہیزگاری اختیار کرنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے یہود ونصاری کو اور ان لوگوں کو جو تم سے پہلے صاحب کتاب ہیں اور اسی طرح تمہیں بھی ہم نے وصیت کی ہے کہ پرہیزگاری اختیار کر۔

اس کے بعد روئے سخن مسلمانوں کی طرف کرتے ہوئے فرمایا تقویٰ اختیار کرنے کا یہ حکم تمہارے فائدے میں ہے اور خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے اور اگر تم روگردانی کرو نافرمانی کی راہ اپناؤ تو خدا کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کی ملکیت ہے اور وہ بے نیاز ہے اور لائق ستائش ہے۔

(۱۳۲) اس آیت میں یہ جملہ تیسری مرتبہ آیا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے خدا کی ملکیت ہے اور خدا ان کی حفاظت ونگہبانی اور انتظام وانصرام کرتا ہے۔

(۱۳۳) تیسری مرتبہ آیت ۱۳۳ میں موجود بحث کے عنوان کے طور پر اس کا تذکرہ اس کے بعد فرمایا گیا ہے خدا کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں کہ تمہیں ختم کردے اور تمہاری جگہ زیادہ آمادہ پختہ ارادے والا گروہ پیدا کردے جو اس کی اطاعت میں زیادہ کوشاں ہو اور خدا ایسا کرنے پر قادر ہے۔

(۱۳۴) آخری آیت میں ان لوگوں کے بارے میں گفتگو آ گئی ہے جو خدا پر ایمان لانے کا دم بھرتے ہیں میدان جہاد میں شرکت کرتے ہیں اور احکام اسلام کی پابندی کرتے ہیں مگر ان کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول نہیں ہوتا بلکہ مادی نتائج مثلاً مال غنیمت کا حصول ہوتا ہے ارشاد فرمایا گیا ہے جو لوگ صرف دنیا کی جزا چاہتے ہیں وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ خدا کے پاس تو دنیا و آخرت دونوں کی جزا اور ثواب ہے۔ لہٰذا وہ دونوں کی جستجو کیوں نہیں کرتے اور خدا سب کی نیتوں سے آگاہ اور ہر محل و مقام پر اس کی نظر ہے اور منافق صفت لوگوں کے اعمال سے باخبر ہے۔

(۱۳۵) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ ۚ اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَ اِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا	اے ایمان والو! مکمل طور پر عدالت کے ساتھ قیام کرو خدا کے لئے گواہی دو اگر چہ یہ خود تمہارے لیے یا تمہارے والدین کے لئے یا تمہارے اقربا کے لیے نقصان دہ ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اگر وہ غنی یا فقیر ہوں تو خدا حق رکھتا ہے کہ ان کی حمایت کرے اس لیے ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو، اس طرح تو حق سے منحرف ہو جاؤ گے اور اگر حق میں تحریف کرو گے یا اس کے اظہار سے اعراض کرو گے تو جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

تفسیر

عدالت اجتماعی

گذشتہ آیات میں خصوصیت سے یتیموں اور بیویوں سے عدالت کے بارے میں احکام تھے اب زیر نظر آیت میں بلا استثناء ایک بنیادی اور کلی قانون کے ذریعے سب اہل ایمان کو اجرائے عدالت کا حکم دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ وہ عدالت قائم کریں اور عدالت سے کام لیں۔

توجہ رہے کہ "قوامین" "قوام" کی جمع ہے یہ مبالغے کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے "بہت قیام کرنے والا" یعنی ہر حالت میں ہر کام میں ہر مقام پر اور ہر دور میں عدالت کے ساتھ قیام کرو تا کہ یہ عمل تمہارے اخلاق اور عادات کا حصہ بن جائے اور اس سے انحراف تمہاری طبیعت مزاج اور روح کے خلاف ہو جائے۔

قیام شاید یہاں اس بنا پر استعمال کیا گیا ہے کہ انسان کو چاہئے کہ عام طور پر کام کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہو اور کام کے پیچھے لگے جائے اس لیے کسی کام کے لئے قیام کا مطلب یہ ہے کہ اس کام کے لئے عزم راسخ اور مضبوط ارادے سے اقدام کیا جائے اگر چہ وہ کام حکم قاضی کی مثل قیام و تحریک کا محتاج بھی نہ ہو نیز ممکن ہے لفظ قیام کا استعمال اس لحاظ سے ہو کہ عام طور پر قائم اس چیز کو کہتے ہیں

جوزمین پرعمودی شکل میں ہواورکسی طرف بھی تھوڑا سا جھکاؤ بھی نہ رکھتی ہویعنی تمہیں عدالت کا اجرااس طرح سے کرنا چاہئے کہ تھوڑا سا انحراف بھی نہ ہو۔

اس کے بعد تاکید کے لئے مسئلہ شہادت کے حوالے سے ارشاد ہوتا ہے خاص طور پر شہادت اور گواہی کے معاملے میں تمام مفادات اور تعلقات کو ایک طرف کر کے فقط خدا کے لئے گواہی دو اگر چہ وہ خود تمہاری ذات تمہارے ماں باپ اوراعزاواقرباء کے نقصان میں ہو۔

اس جملے سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عدالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے رشتہ دار ایک دوسرے کے نفع یا نقصان میں گواہی دے سکتے ہیں ہاں البتہ اس میں اس تہمت کا اندیشہ نہ ہو کہ طرفداری یا تعصب سے کام لیا جارہا ہے۔

اس کے بعد اصول عدالت سے انحراف کے کچھ اورعوامل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے نہ دولت مندوں کی دولت شہادت حق سے مانع ہواور نہ فقیر کے فقر کو دیکھ کر پیدا ہونے والے جذبات کیونکہ شہادت حق جس کے نقصان میں جارہی ہو وہ دولت مند ہو یا فقیر خدا اس کے حالات سے زیادہ آگاہ ہے پروردگار کی حمایت کے مقابلے میں اہل ثروت واہل اقتدار سچی گواہی دینے والے کو نقصان نہیں پہنچا سکتے اور نہ عدالت کے اجراء سے فقیر ہی بھوکا رہ سکتا ہے۔

دوبارہ تاکید کے طور پر حکم دیا گیا ہے ہواوہوس کی پیروی نہ کرو، مبادا اجرائے عدالت میں رکاوٹ پیدا ہو جائے۔

اس جملے سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ظلم وستم کا سرچشمہ ہوا پرستی ہے اوراگر کوئی معاشرہ ہوا پرست نہ ہو تو ظلم وستم وہاں قدم نہیں رکھ سکتا۔

دوبارہ قیام عدالت کی اہمیت کے پیش نظر فرماتا ہے اگر تم حق دار تک اس کا حق پہنچنے میں حائل ہوئے یا حق میں تحریف کی یا حق آشکار ہو جانے کے بعد اس سے اعراض کیا تو خدا تمہارے اعمال سے آگاہ ہے۔

(۱۳۶)يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا	اے ایمان لانے والو! (واقعی) ایمان لے آؤ خدا پراس کے پیغمبر پر، اس کی کتاب پر جو اس پر نازل ہوئی اور ان (آسمانی) کتب پر جو اس سے پہلے بھیجی گئی ہیں اور جو شخص خدا، اس کے ملائکہ، اس کی کتب، اس کے رسولوں اور روز آخرت کا انکار کرے وہ بہت دور کی گمراہی میں مبتلا ہے۔

شان نزول

ابن عباس سے منقول ہے کہ یہ آیت اہل کتاب کے بعض سربرآوردہ لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے ان میں عبداللہ بن سلام اسد بن کعب اوراس کا بھائی اسید بن کعب اوربعض دوسرے لوگ شامل تھے وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ ابتدا

میں خدمت پیغمبر ﷺ میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم آپ پر آپ کی کتاب پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات پر اور عزیر پر ایمان لائے ہیں لیکن ہم باقی آسمانی کتب اور اسی طرح دیگر انبیاء پر ایمان نہیں لائے۔

مندرجہ بالا آیت اسی سلسلے میں نازل ہوئی جس میں انہیں تعلیم دی گئی کہ انہیں سب پر ایمان لانا چاہئے۔

تفسیر

شانِ نزول سے معلوم ہے کہ آیت کا روئے سخن اہل کتاب کے بعض مومنین کی طرف ہے جو مخصوص تعصّبات کی وجہ سے اسلام قبول کر لینے کے بعد صرف اپنے سابق مذہب اور دین اسلام پر اظہار ایمان کرتے تھے اور باقی انبیاء اور آسمانی کتب کو قبول نہیں کرتے تھے لیکن قرآن انہیں نصیحت کرتا ہے کہ وہ تمام انبیاء اور آسمانی کتب کو باقاعدہ تسلیم کریں کیونکہ سب ایک ہی حقیقت کا تسلسل ہیں سب کا ہدف ایک ہی ہے اور سب ایک ہی مبداء کی طرف سے مبعوث ہوئے ہیں اگرچہ تعلیم کے درجوں کی مختلف کلاسوں کی طرح مراتب کا فرق موجود ہے اور ہر کوئی گذشتہ دین سے کامل ترین کے ساتھ آیا ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ان میں سے بعض کو تو قبول کر لیا جائے اور بعض کو نہ کیا جائے کیا ایک ہی حقیقت کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اور کیا تعصّبات حقائق پر پردہ ڈال سکتے ہیں لہٰذا آیت کہتی ہے۔

اے ایمان لانے والو! خدا پر اس کے پیغمبر (رسول اکرم ﷺ) پر اور جو کتاب اس پر نازل ہوئی ہے اس پر نیز گذشتہ آسمانی کتب پر ایمان لے آؤ۔

یہ بھی احتمال ہے کہ روئے سخن ان تمام مومنین کی طرف ہو جو اجمالی طور پر خدا اور پیغمبر پر ایمان لا چکے ہیں لیکن اسلام کی جزئیات اور عقائد کی تفصیلات سے آگاہ نہیں ہیں۔ قرآن انہیں حکم دیتا ہے کہ حقیقی مومنین کو چاہئے کہ وہ تمام انبیاء، گذشتہ کتب اور خدا کے فرشتوں پر ایمان لے آئیں۔

آیت کے آخر میں ان لوگوں کا انجام بیان کیا گیا ہے جو ان حقائق سے غافل ہیں ارشاد ہوتا ہے جو شخص خدا ملائکہ کتب الٰہی خدا کے فرستادہ انبیاء اور یوم آخرت کا انکار کرے تو وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا ہے۔ درحقیقت اس آیت میں پانچ اصولوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے اور وہ ہیں مبداء معاد آسمانی کتب انبیاء اور ملائکہ۔

''ضَلٰلًاۢ بَعِيۡدًا'' (دور کی گمراہی) یہ ایک لطیف تعبیر ہے یعنی ایسے لوگ اس طرح سے دور پھینک دیئے گئے ہیں کہ حقیقی شاہراہ کی طرف ان کی واپسی آسانی سے ممکن نہیں ہے۔

(۱۳۷) اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ثُمَّ كَفَرُوۡا ثُمَّ اٰمَنُوۡا ثُمَّ كَفَرُوۡا ثُمَّ ازۡدَادُوۡا كُفۡرًا لَّمۡ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَـغۡفِرَ لَهُمۡ وَ لَا لِيَـهۡدِيَهُمۡ سَبِيۡلًا ؕ	وہ لوگ جو ایمان لا کر کافر ہو گئے پھر ایمان لائے اور دوبارہ کافر ہو گئے پھر اپنے کفر میں بڑھ گئے خدا انہیں ہرگز نہیں بخشے گا اور نہ ہی انہیں راہ راست کی ہدایت کرے گا۔

(۱۳۸)بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا	منافقین کو بشارت دو کہ دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔
(۱۳۹)اِلَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا	جولوگ اہل ایمان کی بجائے کفار کو اپنا دوست چن لیتے ہیں کیا وہ چاہتے ہیں کہ ان سے عزت و آبرو حاصل کریں حالانکہ تمام عزتیں تو خدا کے ساتھ مخصوص ہیں۔

تفسیر

ہٹ دھرم منافقین کا انجام

گذشتہ آیت میں بتایا گیا ہے کہ کفار دور کی گمراہی میں ہیں اب اسی مناسبت سے زیرنظر آیت میں سلسلہ کلام آگے بڑھتا ہے پہلی آیت میں ایک ایسے گروہ کی طرف اشارہ ہے جو ہر روز اپنے کو ایک نئی شکل وصورت میں پیش کرتا ہے یہ لوگ ایک دن مومنین کی صف میں ہوتے ہیں دوسرے دن کفار کے ساتھ اگلے روز پھر اہل ایمان کے ساتھ ہوتے ہیں پھر خطرناک اور متعصب کافروں کی صفوں میں موجود ہوتے ہیں خلاصہ یہ کہ وہ بت عیار کی طرح ہر لحہ ایک نیا روپ اختیار کرتے ہیں ہر روز ایک نئے رنگ میں ظاہر ہوتے ہیں اور آخر کار کفر اور بے ایمانی کی حالت میں جان دے دیتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیت میں سے پہلی آیت ایسے اشخاص کے انجام کے بارے میں کہتی ہے وہ لوگ جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے پھر ایمان لائے اور پھر کافر ہو گئے اور اپنے کفر میں بڑھ گئے خدا انہیں ہرگز نہیں بخشے گا اور راہ راست کی ہدایت نہیں کرے گا۔

(۱۳۸) زیرنظر دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے ان منافقین کو بشارت دیجئے کہ دردناک عذاب ان کے لئے تیار ہے۔

(۱۳۹) زیرنظر آخری آیت میں ان منافقین کی یوں توصیف کی گئی ہے وہ مومنین کی بجائے کافروں کو اپنے دوست بناتے ہیں۔ پھر بتایا گیا ہے کہ اس میں ان کا ہدف اور مقصد کیا ہے کیا وہ اس دوستی کے ذریعہ واقعی کوئی عزت و آبرو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جبکہ تمام عزتیں خدا کے لئے مخصوص ہیں۔ کیونکہ علم کا سرچشمہ ہمیشہ علم وقدرت ہوتا ہے اور جن کی قدرت کی کوئی حیثیت نہ ہو اور ان کا علم بھی ان کی قدرت جیسا ہو وہ کسی کو کیا صاحب عزت کر سکتے ہیں۔

یہ آیت تمام مسلمانوں کو تنبیہ کرتی ہے کہ وہ اپنی عزت و آبرو کے لئے چاہے وہ اقتصادی یا ثقافتی پہلو سے ہو یا سیاسی حوالے سے دشمنان اسلام کی دوستی تلاش نہ کریں بلکہ وہ ذات الٰہی پر بھروسہ کریں جو تمام عزتوں کا سرچشمہ ہے دشمنان اسلام کی اپنی بھی کوئی عزت نہیں وہ دوسروں کو کیا دیں گے اور اگر ان کی بظاہر کچھ عزت ہو بھی تو وہ قابل اعتماد نہیں ہیں کیونکہ جب بھی ان کے مفاد کا تقاضا ہوا وہ فوراً اپنے مخلص ترین اتحادیوں کو بھی چھوڑ کر اپنی راہ لیں گے اور ان کی یہ حالت ہوگی جیسے کبھی شناسائی ہی نہ تھی۔ دور حاضر کی تاریخ بھی ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

(۱۴۰)وَقَدۡ نَزَّلَ عَلَيۡكُمۡ فِى الۡكِتٰبِ اَنۡ اِذَا سَمِعۡتُمۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكۡفَرُ بِهَا وَ يُسۡتَهۡزَاُ بِهَا فَلَا تَقۡعُدُوۡا مَعَهُمۡ حَتّٰى يَخُوۡضُوۡا فِىۡ حَدِيۡثٍ غَيۡرِهٖۤ‌ ‌ۖ اِنَّكُمۡ اِذًا مِّثۡلُهُمۡ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الۡمُنٰفِقِيۡنَ وَ الۡكٰفِرِيۡنَ فِىۡ جَهَنَّمَ جَمِيۡعَا ۙ	اللہ نے قرآن میں تم پر (یہ حکم) نازل کیا ہے کہ جب تم سنو کہ کچھ لوگ آیات الٰہی کا انکار اور استہزا کر رہے ہیں تو ان کے ساتھ نہ بیٹھو جب تک وہ کوئی اور گفتگو نہ کرنے لگیں ورنہ اس صورت میں تم بھی ان جیسے ہو جاؤ گے خدا منافقوں اور کافروں سب کو جہنم میں جمع کر دے گا۔

شان نزول

ابن عباس سے اس آیت کی شان نزول کے بارے میں منقول ہے کہ بعض منافقین یہودی علماء کی بیٹھکوں میں جا بیٹھتے تھے۔ ان میٹنگوں میں آیات قرآنی کا مذاق اڑایا جاتا تھا اسی سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی جس میں اس کام کا برا انجام بتایا گیا۔

تفسیر

بری مجلس میں نہ بیٹھو

سورہ انعام قرآن حکیم کی مکی سورتوں میں سے ہے اس کی آیت ۶۸ میں صراحت سے پیغمبر اکرم ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر آپ دیکھیں کہ کچھ لوگ قرآنی آیات کا مذاق اڑاتے ہیں اور ناپسندیدہ باتیں کہتے ہیں تو ان سے اعراض کیجئے۔

یہ بات مسلم ہے کہ یہ حکم نبی کریم ﷺ سے مخصوص نہیں بلکہ ایک عمومی حکم ہے البتہ اس میں خطاب پیغمبر سے کیا گیا ہے اس کا فلسفہ بھی بالکل واضح ہے کیونکہ یہ ایسے کاموں سے مقابلے کی ایک منفی صورت ہے زیر بحث آیت میں اس اسلامی حکم کی تاکید کی گئی ہے اور مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ قرآن میں تمہیں پہلے حکم دیا گیا ہے کہ جب سنو کہ کچھ لوگ آیات قرآنی سے کفر کرتے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں تو اس وقت تک ان کے ساتھ نہ بیٹھو جب تک وہ اس کام سے صرف نظر کر کے دوسرا کام شروع نہ کریں۔

اس کے بعد اس کام کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے اگر تم ایسی مجالس میں شرکت کرو گے تو ان جیسے ہو جاؤ گے اور تمہارا انجام بھی ان جیسا ہوگا۔

تاکید مزید کے لئے فرمایا گیا ہے ایسی میٹنگوں میں شرکت روح نفاق کی علامت ہے اور خدا منافقین اور کفار سب کو جہنم میں جمع کر دے گا۔

(۱۴۱) اِلَّذِیْنَ یَتَرَبَّصُوْنَ بِکُمْ فَاِنْ کَانَ لَکُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰہِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَکُنْ مَّعَکُمْ وَ اِنْ کَانَ لِلْکٰفِرِیْنَ نَصِیْبٌ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَیْکُمْ وَ نَمْنَعْکُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فَاللّٰہُ یَحْکُمُ بَیْنَکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَ لَنْ یَّجْعَلَ اللّٰہُ لِلْکٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا	منافقین وہ ہیں جو ہمیشہ منتظر رہتے ہیں اورتمہارے نگران رہتے ہیں اگر تو تمہیں فتح و کامیابی نصیب ہو تو کہتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے (لہٰذا ہم بھی افتخار، اعزاز اور مال غنیمت میں تمہارے شریک ہیں) اوراگر کفار کامیاب ہو جائیں تو انہیں کہتے ہیں کیا ہم نے تمہیں جنگ اور مومنین کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کی ترغیب نہیں دی تھی (لہٰذا ہم تمہارے ساتھ اس کامیابی میں شریک ہیں) خدا تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا اوراس نے ہرگز مومنین پر کافروں کے غلبے کی راہ نہیں بنائی۔

تفسیر

منافقین کی صفات

زیر نظر آیت اوراس کے بعد کی کچھ آیات میں منافقین کی صفات اوران کے افکار پریشاں کا تذکرہ ہے ارشاد ہوتا ہے منافق وہ ہیں جو ہمیشہ یہ چاہتے ہیں کہ ہر پیش آنے والے واقعہ سے مفاد اٹھائیں اگر تو تمہیں کامیابی حاصل ہو جائے تو فوراً اہل ایمان کی صفوں میں آ کھڑے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے کیا ہماری بھاری امداد اس کامیابی میں تمہارے کام نہیں آئی لہٰذا ہم بھی ان تمام فوائد میں اور مادی ومعنوی منافع میں تمہارے شریک اور حصہ دار ہیں۔

لیکن اگر کامیابی اسلام کے دشمنوں کو ہوئی تو فوراً اپنے آپ کو ان کے قریب کر لیتے ہیں اوراس پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ ہم ہی تھے جو تمہیں مسلمانوں سے جنگ کرنے اوران کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کی ترغیب دیتے تھے اس لیے ہم بھی تمہاری ان کامیابیوں میں حصہ دار ہیں۔

اس طرح یہ لوگ اپنی موقع پرستی کے ذریعے چاہتے ہیں کہ مومنین کی کامیابی کی صورت میں افتخار و اعزاز پائیں یہاں تک کہ مال غنیمت میں بھی حصہ دار بنیں اوران پر احسان جتلائیں اور دوسری طرف کفار کی کامیابی پر بھی خوش ہوتے ہیں انہیں کفر میں پختہ تر کرتے ہیں مسلمانوں کے خلاف ان کے حق میں جاسوسی کرتے ہیں اوران کی کامیابی کی راہ ہموار کرتے ہیں گویا وہ رفیق قافلہ بھی ہیں اور شریک راہزن بھی وہ اپنی زندگی اسی دوہرے کھیل میں گزار دیتے ہیں۔

قرآن ایک مختصر سے جملے میں ایسے لوگوں کا انجام بیان کرتے ہوئے کہتا ہے آخر کار ایک دن آ ہی جائے گا جب پردے اٹھ جائیں گے اوران کے برے چہروں سے نقاب پلٹ دیئے جائیں گے ہاں قیامت کے دن تمہارے درمیان خدا فیصلہ کرے گا

۔لہٰذا حقیقی مومنین کو چاہئے کہ ان سے مرعوب نہ ہوں۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے کبھی خدا مومنین پر کافروں کے تسلط کی راہ نہیں بناتا ''وَ لَنۡ یَّجۡعَلَ اللّٰہُ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ سَبِیۡلًا ا'' کیا اس جملے سے مراد یہ ہے کہ منطق واستدلال کے لحاظ سے کفار کبھی مومنین پر غلبہ نہیں پائیں گے یا اس سے فوجی کامیابی یا ایسی کوئی اور کامیابی مراد ہے اس سلسلے میں ہم بعض پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں۔

لفظ ''سبیل'' اصطلاح کے مطابق ''نکرہ سیاق نفی میں'' کے قبیل سے ہے جو کہ عمومیت کے معنی دیتا ہے لہٰذا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف منطق واستدلال سے بلکہ سیاسی فوجی ثقافتی اقتصادی غرض کسی لحاظ سے بھی کفار اہل ایمان پر غالب نہیں آئیں گے آج اگر مختلف میدانوں میں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ کفار مسلمانوں پر غالب ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بیشتر مسلمان حقیقی مومن نہیں ہیں آج مسلمان ایمان کے تقاضے اپنی ذمہ داریاں اپنا حقیقی طرز عمل اور اسلامی افکار سب کچھ فراموش کر چکے ہیں نہ ان میں اتحاد اور اخوت اسلامی کی کوئی خبر ہے نہ حقیقی معنی میں جہاد کرتے ہیں اور نہ وہ علم وآگہی کے حامل ہیں حالانکہ اسلام نے ان سب پر حصول علم لحہ ولادت سے لے کر لحظہ موت تک لازم قرار دے رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ آج وہ ایسی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

(۱۴۲)اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰہَ وَ ہُوَ خَادِعُہُمۡ ۚ وَ اِذَا قَامُوۡۤا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوۡا کُسَالٰی ۙ یُرَآءُوۡنَ النَّاسَ وَ لَا یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیۡلًا ۫	منافقین اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں حالانکہ وہ انہیں دھوکا دیتا ہے (یعنی ان کا فریب باطل کر دیتا ہے) اور جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو وہ سستی اور کسالت کے ساتھ، لوگوں کے سامنے ریاکاری کرتے ہیں اور خدا کو یاد نہیں کرتے مگر تھوڑا سا۔
(۱۴۳)مُّذَبۡذَبِیۡنَ بَیۡنَ ذٰلِکَ ٭ۖ لَاۤ اِلٰی ہٰۤؤُلَآءِ وَ لَاۤ اِلٰی ہٰۤؤُلَآءِ ؕ وَمَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَلَنۡ تَجِدَ لَہٗ سَبِیۡلًا	وہ بے ہدف افراد ہیں نہ ان کی طرف مائل ہیں نہ ان کی طرف (نہ اہل ایمان کی صف میں ہیں نہ کافروں کی قطار میں) اور جسے خدا گمراہ کر دے اس کے لئے تمہیں کوئی راہ نہ ملے گی۔

تفسیر

منافقین کی پانچ صفات

1۔وہ اپنے منحوس مقاصد کی تکمیل کے لئے دھوکا اور فریب دہی کی راہ اختیار کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ چاہتے ہیں کہ خدا کو بھی دھوکا دے دیں حالانکہ جب وہ ایسا کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں خود فریب میں مبتلا ہوتے ہیں کیونکہ وہ ناچیز اور حقیر سرمائیے کے حصول کے لالچ میں اپنا وجود اور انسانیت کا عظیم سرمایہ اپنے ہاتھ سے دے بیٹھتے ہیں.

مندرجہ بالا تفسیر ''وَھُوَ خَادِعُھُمۡ'' کی ''واؤ'' سے معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہاں واؤ حالیہ ہے۔بعض بزرگوں سے ایک قصہ

منقول ہے ایک بزرگ پیشہ وروں سے کہتے تھے۔

ڈرو! کہیں غریب مسافر تمہیں دھوکا نہ دے دیں۔

کسی نے کہا وہ تو انجان اور سادہ لوح ہوتے ہیں اور ہم انہیں دھوکا دے سکتے ہیں۔

بزرگ نے کہا میرا مقصد بھی یہی ہے اس طرح دھوکا دے کر تم ناچیز سرمایہ تو حاصل کر بیٹھتے ہو اور ایمان کا عظیم سرمایہ گنوا بیٹھتے ہو۔

2۔ وہ خدا سے دور ہیں اس سے راز و نیاز کی لذت سے محروم ہیں لہٰذا جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو سرتاپا کسالت سستی اور بے حالی میں غرق ہوتے ہیں۔

3۔ وہ چونکہ خدا اور اس کے عظیم وعدوں پر ایمان نہیں رکھتے لہٰذا اگر کوئی عبادت یا کوئی نیک کام انجام بھی دیتے ہیں تو وہ بھی ریا کاری کے لئے نہ کہ خدا کے لئے۔

(۱۴۳) 4۔ وہ اگر کوئی ذکر بھی کرتے ہیں یا خدا کو یاد کرتے ہیں تو صمیم قلب سے نہیں اور نہ آگاہی و بیداری سے اور اگر ہو بھی تو بہت ہی کم۔

5۔ یہ لوگ سرگرداں اور بے ہدف جیتے ہیں ان کے پاس نہ زندگی کا کوئی پروگرام ہے نہ کوئی واضح راستہ نہ وہ مومنین میں سے ہیں اور نہ کفار میں سے۔

آیت کے آخر میں ان کا انجام اس طرح بیان کیا گیا ہے وہ ایسے لوگ ہیں کہ جن کے اعمال کے باعث اللہ نے اپنا دست حمایت ان سے اٹھالیا اور انہیں بے راہ رویوں میں گمراہ چھوڑ دیا ہے اور جسے خدا گمراہ کر دے اس کے لئے تمہیں کبھی راہ نجات نہیں ملے گی۔

(۱۴۴) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا	اے ایمان والو! مومنین کو چھوڑ کر کفار کو اپنا ولی اور سہارا نہ بناوَ کیا تم چاہتے ہو کہ ایسا کر کے اپنے خلاف بارگاہ الٰہی میں ایک واضح دلیل قائم کرلو۔
(۱۴۵) اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۙ	کیونکہ منافقین تو دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں ہیں اور تمہیں ان کا ہرگز کوئی مددگار نہیں ملے گا (لہٰذا دشمنان خدا کی دوستی سے پرہیز کرو کیونکہ یہ نفاق کی علامت ہے)

(۱۴۶)اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَ اَصۡلَحُوۡا وَاعۡتَصَمُوۡا بِاللّٰہِ وَ اَخۡلَصُوۡا دِیۡنَہُمۡ لِلّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ؕ وَ سَوۡفَ یُؤۡتِ اللّٰہُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَجۡرًا عَظِیۡمًا	مگر وہ جوتو بہ کرلیں اور اصلاح وتلافی کرلیں اور خدا (کے لطف کے دامن) سے وابستہ ہو جائیں اور اپنے آپ کو خدا کے لیے خالص کرلیں وہ مومنین کے ساتھ ہوں گے اور خدا اہل ایمان کو اجرعظیم عطا کرے گا۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں منافقون اور کافروں کی کچھ صفات کی نشاندہی کی گئی تھی ان آیات میں پہلے تو مومنین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ مومنین کی بجائے کافروں اور منافقوں کو اپنا سہارا اور ولی نہ سمجھیں۔ کیونکہ یہ قانون شکنی اور خدا سے شرک کے مترادف ہے اور عدالت الٰہی کے قانون کے مطابق اس کی بہت سخت سزا ہے اسی لیے فرماتا ہے کیا تم چاہتے ہو کہ بارگاہ الٰہی میں اپنے خلاف ایک دلیل قائم کرلو۔

(۱۴۵) زیرنظر دوسری آیت میں ان منافقین کی حالت واضح کی گئی ہے جن کی دوستی کا طوق غافل مسلمانوں نے اپنی گردن میں ڈال رکھا ہے یا پھر انھی کی حالت بیان کی گئی ہے جو اظہار اسلام کے باوجود نفاق کی راہ اختیار کیے ہوئے ہیں ارشاد ہوتا ہے منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے اور تمہیں ان کا کوئی مددگار دکھائی نہ دے گا۔

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ اسلام کی نظر میں نفاق کفر کی بدترین اقسام میں سے ہے اور منافق خدا سے سب سے زیادہ دور ہیں اسی لیے ان کا ٹھکانا جہنم کا بدترین اور پست ترین طبقہ ہے اور ایسا ہونا بھی چاہئے کیونکہ انسانی معاشرے کو منافقین سے جو خطرات لاحق ہوتے ہیں ان کا کسی اور خطرے سے موازنہ نہیں کیا جا سکے گا۔

(۱۴۶) یہ بات واضح کرنے کے لئے کہ ایسے افراد بھی جو اس قدر آلودہ گناہ ہیں چاہیں تو خدا کی طرف لوٹ آئیں اور اپنی اصلاح کرلیں مزید فرمایا مگر یہ کہ ایسے لوگ توبہ کریں اپنے اعمال کی اصلاح کریں اور گذشتہ اعمال کی تلافی کریں لطف الٰہی سے متمسک ہوں اور اپنا دین وایمان اللہ کے لیے خالص کریں۔ ایسے لوگ آخرکار نجات یافتہ ہو سکتے ہیں اور مومنین کے ساتھی بن سکتے ہیں۔ اور خدا تمام صاحبان ایمان کو اجرعظیم اور جزائے جزیل سے نوازے گا۔

(۱۴۷)مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا	خدا تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر ادا کرو (اور نعمتوں کو مناسب طریقے سے استعمال کرو) اور ایمان لے آؤ خدا شکر گزار (قدردان) اور آگاہ ہے۔

تفسیر

خدا کی سزا انتقامی نہیں

گذشتہ آیات میں کافروں اور منافقون کے لئے سخت سزاؤں کا ذکر تھا اب اس آیت میں ایک اہم حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے اور وہ یہ کہ خدا کی طرف سے دردناک سزائیں اس بنا پر نہیں ہیں کہ وہ چاہتا ہے کہ گنہگار بندوں سے انتقام لے یا اپنی قدرت کا مظاہرہ کرے یا ان کی نافرمانی اور عصیان سے اسے کوئی نقصان پہنچا ہے جس کی وہ تلافی کرنا چاہتا ہے کیونکہ یہ سب چیزیں تو کسی نقص اور کمی کا مظہر ہیں جبکہ خدا کی ذات ہر نقص اور کمی سے مبرا ہے بلکہ یہ سب سزائیں خود انسانوں کے برے افکار و اعمال کا ردعمل اور نتیجہ ہیں اسی لیے فرماتا ہے اگر تم شکر گزاری کرو اور ایمان لے آؤ تو خدا کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ تمہیں سزا دے۔

شکر کا مفہوم یہ ہے کہ ہر نعمت کو اس طریقے سے استعمال کیا جائے جس کے لیے وہ بنائی گئی ہے اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مندرجہ بالا جملے سے مراد یہ ہے کہ اگر تم ایمان لے آؤ اور عمل صالح کرو نعمات الٰہی کو مناسب طور پر استعمال کرو اور ان سے غلط فائدہ نہ اٹھاؤ تو بلاشبہ تھوڑی سی سزا بھی تمہارے دامن کو نہ چھوئے گی۔

تاکید مزید کے لئے کہتا ہے خدا تمہارے اعمال اور نیتوں سے آگاہ اور تمہارے نیک اعمال کے بدلے میں وہ بھی شاکر اور جزا دینے والا ہے۔

زیر نظر آیت میں شکر کو ایمان پر مقدم رکھا گیا ہے یہ اس بناء پر ہے کہ انسان جب تک اس کی نعمتوں کو پہچان نہ لے اور شکر گزاری کے مقام تک نہ پہنچ جائے اس وقت تک خدا سے نہیں پہچان سکتا کیونکہ اس کی نعمتیں اس کی معرفت کا ذریعہ ہیں اسلامی عقائد کی کتب میں بھی وجوب معرفت الٰہی کے لئے بعض لوگ وجوب شکر نعم کی دلیل پیش کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ شکر گزاری انسانی فطرت ہے اور نعمتیں بخشنے والے کا شکر ادا کرنا واجب ہے لہٰذا اس نعمتیں عطا کرنے والے کی معرفت بھی واجب ہے (غور کیجئے گا)۔

(۱۴۸)لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا	خدا پسند نہیں کرتا کہ کوئی شخص بری باتیں کہے مگر یہ کہ جو ظلم و ستم سے مجبور ہو اور خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

(۱۴۹) اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا	(لیکن) اگر نیکیوں کو آشکار کرو یا مخفی رکھو یا برائیوں سے صرف نظر رکھو (تو تمہیں اس کی جزا دی جائے گی) خدا بخشنے والا اور قادر و توانا ہے

تفسیر

اسلام کے چند اخلاقی احکام

ان دو آیتوں میں اسلام کے کچھ اخلاقی احکام بیان ہوئے ہیں پہلے فرمایا گیا ہے خدا پسند نہیں کرتا کہ بدگوئی کی جائے یا بعض لوگوں کے عیب اور برے کام برملا بیان کیے جائیں۔ کیونکہ خدا خود ستار العیوب ہے وہ پسند نہیں کرتا کہ لوگوں کی پردہ دری کی جائے اور لوگوں کے عیب فاش کیے جائیں اور ان کی عزت و آبرو برباد کی جائے علاوہ ازیں ہم جانتے ہیں کہ ہر انسان کے عام طور پر کچھ نہ کچھ کمزور اور مخفی پہلو ہوتے ہیں اگر یہ عیب ظاہر ہو جائیں تو پورے معاشرے میں بداعتمادی کی ایک ایسی فضا پیدا ہو جائے کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنا مشکل ہو جائے لہٰذا اجتماعی رشتوں کا استحکام اور بشری تقاضوں کو ملحوظ نظر رکھنا بھی ضروری ہے تاکہ کسی صحیح مقصد کے بغیر کسی کے مخفی اور کمزور پہلوؤں کا اظہار نہ ہو۔

ضمناً توجہ رہے کہ ''سوء'' سے مراد ہر طرح کی برائی اور قباحت ہے اور ''جہر''، ''من القول'' سے ہر قسم کا لفظی اظہار ہے، چاہے وہ شکایت کی صورت میں ہو یا چغلی کی۔ یہی وجہ ہے کہ جن آیات سے غیبت کی حرمت کے بارے میں استدلال کیا گیا ہے ان میں زیر نظر آیت بھی شامل ہے لیکن آیت کا مفہوم غیبت میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس میں ہر طرح کی بدگوئی کی ممانعت کی گئی ہے۔

اس کے بعد بدگوئی کی استثنائی صورت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے مگر وہ شخص جو ظلم و ستم کے ہاتھوں مجبور ہو۔ ایسے لوگ حق رکھتے ہیں کہ اپنے دفاع کے لئے ظالم کے ظلم کی شکایت کریں یا واضح طور پر ظلم و ستم کی مذمت کریں اور ان پر تنقید کریں اور جب تک اپنا حق نہ لے لیں اور ظلم و ستم کا ازالہ نہ کر لیں اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں۔ درحقیقت یہ استثناء اس لیے ہے کہ کہیں مندرجہ بالا حکم سے ظالم اور ستمگر غلط فائدہ نہ اٹھائیں یا یہ حکم ظلم و ستم کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کا بہانہ نہ بنایا جائے۔

واضح ہے کہ ایسے مواقع پر صرف ظالم کے ظلم اور مظلوم کے دفاع سے مربوط باتوں پر ہی اکتفا کیا جانا چاہئے۔

آیت کے آخر میں قرآن اپنی روش کے مطابق کہ کہیں کوئی مظلوم بن کر اس استثناء سے سوئے استفادہ نہ کرے اور بلا وجہ لوگوں کے عیب بیان کرتا پھرے فرماتا ہے خدا باتوں کو سنتا اور نیتوں سے واقف ہے۔

(۱۴۹) اس آیت میں اس حکم کے نقطہ مقابل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے فرمایا اگر لوگوں کی نیکیوں کو ظاہر کر دیا پوشیدہ رکھو تو اس میں کوئی حرج نہیں (جبکہ برائیاں استثنائی مواقع کے علاوہ مطلقاً چھپائی جانا چاہیں) نیز اگر برائیوں کے مقابلے میں لوگوں سے عفو بخشش کی راہ اپناؤ تو بہتر ہے کیونکہ درحقیقت یہ الٰہی طرز عمل ہے کہ جو ہر قسم کے انتقام کی قدرت رکھنے کے باوجود اپنے اہل بندوں کے

بارے میں عفو وبخشش سے کام لیتا ہے۔

زیر نظر دوسری آیت دراصل دو پہلوؤں سے پہلی آیت کا نقطہ مقابل قرار دی جا سکتی ہے پہلا یہ کہ برائیوں کے اظہار کے مقابلے میں نیکیوں کا اظہار اور دوسرا جن پر ظلم وستم ہوا ان کی طرف سے عفو وبخشش۔

(۱۵۰) اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یَقُوۡلُوۡنَ نُؤۡمِنُ بِبَعۡضٍ وَّ نَکۡفُرُ بِبَعۡضٍ ۙ وَّ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَّخِذُوۡا بَیۡنَ ذٰلِکَ سَبِیۡلًا ۙ	جو لوگ خدا اور پیغمبروں کا انکار کرتے ہیں اور ان میں تبعیض اور فرق روا رکھنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان دو کے درمیان کوئی راہ منتخب کریں۔
(۱۵۱) اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ حَقًّا ۚ وَ اَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابًا مُّہِیۡنًا	وہ پکّے کافر ہیں اور کفار کے لئے ہم نے ذلّت آمیز سزا فراہم کر رکھی ہے۔
(۱۵۲) وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ لَمۡ یُفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡہُمۡ اُولٰٓئِکَ سَوۡفَ یُؤۡتِیۡہِمۡ اُجُوۡرَہُمۡ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ۟	(لیکن) وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں اور ان میں سے کسی کے درمیان فرق روا نہیں رکھتے انہیں عنقریب جزا دیں گے خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

انبیاء میں فرق نہیں ہے

ان آیات میں کفار اور مومنین کی حالت بیان کی گئی ہے اور ان کے انجام کا تذکرہ ہے یہ آیات گذشتہ آیات کی تکمیل کرتی ہیں جن میں منافقین کا ذکر تھا۔

پہلے تو ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو انبیاء الٰہی میں فرق روا رکھتے ہیں بعض کو حق پر سمجھتے ہیں اور بعض کو باطل پر ارشاد ہوتا ہے وہ لوگ جو خدا اور اس کے پیغمبروں کے کافر اور منکر ہیں اور چاہتے ہیں کہ خدا اور اس کے پیغمبروں میں فرق روا رکھیں اور کہتے ہیں کہ ہم ان میں سے بعض پر تو ایمان رکھتے ہیں اگر چہ بعض کو قبول نہیں کرتے اپنے گمان میں وہ چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان کی کوئی راہ نکالیں۔

یہ جملہ دراصل یہودیوں اور عیسائیوں کی حالت بیان کر رہا ہے یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہیں مانتے اور یہودی اور عیسائی دونوں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں مانتے حالانکہ ان کی اپنی کتابوں کے مطابق ان پیغمبروں کی نبوت ثابت شدہ ہے حقائق کو قبول کرنے میں اس تبعیض کا سرچشمہ ہوا وہوس اور جاہلانہ تعصّبات ہیں اور بعض اوقات بے وجہ کا حسد اور تنگ نظری سد راہ ہوتی ہے یہ طرز عمل دراصل خدا پر اور انبیاء پر ایمان نہ لانے کی نشاندہی ہے کیونکہ ایمان یہ نہیں ہے کہ جو کچھ اپنی طبیعت اور میلان کے مطابق ہوا سے

تسلیم کرلیا جائے اور جو مزاج اور ہوس کے خلاف ہواسے رد کردیا جائے یہ تو ایک طرح کی نفس پرستی ہے نہ کہ خدا پرستی حقیقی ایمان تو یہ ہے کہ انسان حقیقت کو قبول کرلے چاہے اس کے میلان طبع کے خلاف ہی کیوں نہ ہو لہٰذا قرآن ایسے افراد کو مندرجہ بالا آیت میں کافر قرار دیتا ہے اگرچہ وہ خدا پر اور بعض انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں۔

اس لیے جن چیزوں پر وہ اظہار ایمان کرتے ہیں اسے بھی بے وقعت قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس ایمان کا سر چشمہ جستجوئے حق نہیں ہے۔

(۱۵۱) زیر نظر دوسری آیت میں سابقہ آیت کی بحث کو جاری رکھتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے یہ لوگ حقیقی کافر ہیں (أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا) آخر میں انہیں سرزنش کرتے ہوئے کہتا ہے ہم نے کفار کے لئے ذلت آمیز اور رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اس میں عذاب کو مہین (ذلت آمیز) قرار دیا گیا ہے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انہوں نے انبیاء میں تبعیض اور فرق روا رکھ کے دراصل ان میں سے بعض کی توہین کی ہے لہٰذا ان کی سزا ان کے عمل کی مناسبت سے ہونا چاہئے۔

(۱۵۲) اس کے بعد مومنین کی کیفیت اور انجام کا ذکر ہے فرمایا وہ لوگ جو خدا اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے ہیں اور ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور اس طرح حق کے سامنے اپنے جذبہ تسلیم اور خلوص کا اظہار کرتے ہیں اور وہ ہر طرح کے ناروا تعصب کے مقابلے میں اپنے قیام کا ثبوت دیتے ہیں خدا بہت جلد انہیں جزا دے گا۔

البتہ پیغمبروں پر ایمان لانا اور عملاً انہیں تسلیم کر لینا اس بات کے منافی نہیں کہ ان میں سے بعض کو بعض سے افضل مانا جائے کیونکہ ان کی ماموریت اور ذمہ داریوں کے فرق کے لحاظ سے ان کے مراتب میں فرق یقینی ہے مقصد یہاں یہ ہے کہ انبیاء پر ایمان لانے اور انہیں عملا تسلیم کرنے میں ہم کوئی فرق نہ کریں

آیت کے آخر میں اس مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ اگر یہ مومنین پہلے ایسے تعصّبات اور تفریق کے قائل رہے ہیں یا دوسرے گناہوں کے مرتکب رہے ہیں تو اب اگر وہ اپنے ایمان کو خالص کر کے خدا کی طرف لوٹ آئیں تو خدا انہیں بخش دے گا اور خدا ہمیشہ سے بخشنے والا اور مہربان ہے۔

(۱۵۳) يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ	اہل کتاب تم سے تقاضا کرتے ہیں کہ ایک ہی مرتبہ آسمان سے ایک کتاب ان پر نازل کردو (حالانکہ یہ تو ایک بہانہ ہی ہے) انہوں نے موسیٰ سے اس سے بھی بہت بڑا سوال کیا تھا اور کہا تھا کہ ہمیں ظاہر بظاہر خدا دکھا دے۔ اسی ظلم کی وجہ سے بجلی نے انہیں آ لیا تھا۔

ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَ اٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطَانًا مُّبِيْنًا	پھر انہوں نے ان واضح دلائل کے باوجود جو ان کے لئے آئے تھے (سامری کے) گوسالہ کو (خدا کے طور پر) منتخب کر لیا پھر بھی ہم نے انہیں معاف کر دیا اور موسیٰ کو ہم نے واضح برتری عطا کی۔
(۱۵۴) وَ رَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا	اور ہم نے کوہ طور ان کے اوپر بلند کیا اور اسی حالت میں ان سے عہد و پیمان لیا اور ان سے کہا کہ (توبہ کے طور پر بیت المقدس کے) دروازے سے خضوع کے ساتھ آؤ (نیز) ہم نے ان سے کہا کہ ہفتہ کے روز تجاوز نہ کرو (اور کاروبار سے ہاتھ کھینچ لو) اور ان تمام باتوں کے بارے میں ہم نے ان سے محکم عہد و پیمان لیا۔

شان نزول

تفسیر تبیان مجمع البیان اور روح المعانی میں ان آیات کی شان نزول میں لکھا ہے کہ کچھ یہودی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے کہ اگر تم اللہ کے پیغمبر ہو تو اپنی آسمانی کتاب ایک ہی دفعہ ہمارے سامنے پیش کرو جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام تورات کو اکٹھا لے کر آئے تھے۔

تفسیر

یہودیوں کی بہانہ سازی

آیات میں پہلے اہل کتاب یہودیوں کے تقاضے کا تذکرہ ہے فرمایا اہل کتاب تم میں سے تقاضا کرتے ہیں کہ یکجا ایک کتاب آسمان سے ان پر نازل کرو۔

اس میں شک نہیں کہ ان کی اس فرمائش میں حسن نیت شامل نہ تھی کیونکہ کتب آسمانی کے نزول کا مقصد ارشاد ہدایت اور تربیت ہے بعض اوقات یہ ہدف آسمانی کتب کے یکجا نازل ہونے سے حاصل ہوتا ہے اور بعض اوقات اس کی تدریجی تنزیل اس مقصد کے لئے زیادہ مددگار ہوتی ہے لہذا انہیں چاہئے کہ وہ پیغمبر سے دلیل کا مطالبہ کریں اور اعلیٰ وارفع تعلیمات کی فرمائش کریں نہ یہ کہ آسمانی کتب کے نزول کی کیفیت معین کریں لہذا اس کے بعد خدا نے ان کے عدم حسن نیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور اپنے

پیغمبر ﷺ کی تسلی کے لئے یہودیوں کی سابقہ ہٹ دھرمی عناد اور بہانہ جوئی کا تذکرہ کیا ہے جو وہ اپنے عظیم پیغمبر حضرت موسیٰ بن عمران سے کرتے رہے تھے فرمایا انہوں نے موسیٰ سے اس سے بڑی اور زیادہ عجیب چیزوں کی خواہش کی تھی اور کہا تھا کہ ہمیں ظاہر خدا دکھادے۔

یہ عجیب وغریب اور غیر منطقی فرمائش تھی جس سے بت پرستوں کا سا عقیدہ ظاہر ہوتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خدا کو جسم میں اور محدود دیکھنے کا تقاضا کر رہے تھے اور بلاشبہ اس کی وجہ ہٹ دھرمی اور عناد تھی ان کے اسی ظلم کے باعث صاعقہ آسمانی نے انہیں آ لیا۔

اس کے بعد ان کے ایک اور برے عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے گوسالہ پرستی فرمایا انہوں نے ان معجزات اور واضح دلائل کو دیکھنے اور جاننے کے باوجود بچھڑے کو اپنا معبود قرار دے دیا۔

ان تمام چیزوں کے باوجود اس لیے کہ وہ صحیح راستے کی طرف لوٹ آئیں اور ہٹ دھرمی اور عناد کی سواری سے اتر پڑیں ارشاد فرمایا: پھر بھی ہم نے انہیں بخش دیا اور موسیٰ کو برتری عطا کی اور واضح حکومت بخشی نیز سامری اور بچھڑا پرستوں کی بساط الٹ دی۔

(۱۵۴) یہ پھر بھی خواب غفلت سے بیدار نہ ہوئے اور مرکب غرور سے نیچے نہ اترے اسی لیے ہم نے کوہ طور کو ان کے سروں پر متحرک کر دیا اور اسی حالت میں ان سے پیمان لیا اور ان سے کہا کہ اپنے گناہوں کی توبہ کے طور پر بیت المقدس کے دروازے سے خضوع وخشوع کے ساتھ داخل ہو جاؤ نیز انہیں تاکید کی کہ ہفتے کے روز کسب وکار سے دست کش ہو جاؤ اور تجاوز کی راہ نہ لو نیز اس دن دریائی مچھلیوں کا شکار نہ کرو کہ جو اس دن حرام ہے اور ان تمام چیزوں کے بارے میں ہم نے ان سے سخت عہد و پیمان لیا لیکن انہوں نے ان میں سے کسی بھی تاکیدی عہد کو پورا نہیں کیا۔

(۱۵۵) فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ قَتْلِهِمُ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّ قَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۠	وہ اس بنا پر کہ انہوں نے اپنا عہد توڑ دیا آیات الٰہی کا انکار کیا اور انبیاء کو ناحق قتل کیا اور وہ (بطور تمسخر) کہتے تھے کہ ہمارے دلوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے (اور ہم انبیاء کی باتوں کو سمجھ نہیں پاتے)، (لہٰذا وہ بارگاہ الٰہی سے دھتکارے گئے) جی ہاں! خدا نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے لہٰذا تھوڑے سے لوگوں کے علاوہ باقی ایمان نہیں لائیں گے۔
(۱۵۶) وَّ بِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۙ	نیز ان کے کفر کے باعث اور اس عظیم تہمت کی وجہ سے جو انہوں نے مریم پر لگائی ہے۔

(۱۵۷)وَّ قَوۡلِهِمۡ اِنَّا قَتَلۡنَا الۡمَسِيۡحَ عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ رَسُوۡلَ اللّٰهِ‌ۚ وَ مَا قَتَلُوۡهُ وَ مَا صَلَبُوۡهُ وَ لٰكِنۡ شُبِّهَ لَهُمۡ‌ؕ وَ اِنَّ الَّذِيۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ‌ؕ مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ‌ۚ وَ مَا قَتَلُوۡهُ يَقِيۡنًا ۙ	اوران کا یہ کہنا کہ ہم نے عیسیٰ بن مریم پیغمبر خدا کو قتل کر دیا حالانکہ نہ انہوں نے اسے قتل کیا ہے اور نہ سولی پر لٹکایا ہے مگر یہ کہ معاملہ ان پر مشتبہ ہو گیا اور جنہوں نے اس کے قتل کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ اس کے متعلق شک میں ہیں اور اس کا علم نہیں رکھتے اور صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں اور انہوں نے یقیناً اسے قتل نہیں کیا۔
(۱۵۸)بَلۡ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيۡهِ‌ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا	بلکہ خدا اسے اپنی طرف لے گیا اور خدا توانا و حکیم ہے۔

تفسیر

یہودیوں کی کچھ اور کارستانیاں

ان آیات میں بنی اسرائیل کی کچھ اور کارستانیوں قانون شکنیوں عداوتوں اور انبیاء الٰہی سے دشمنیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلی آیت میں ان میں سے ایک گروہ کی پیمان شکنی کفر اور قتل انبیاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے ہم نے انہیں پیمان شکنی کی وجہ سے اپنی زحمت سے دور کر دیا یا اپنی بعض پاکیزہ نعمتوں کو ان پر حرام قرار دے دیا۔

اس عہد شکنی کے بعد انہوں نے آیات الٰہی کا انکار کیا اور مخالفت کا راستہ اختیار کیا۔ اور انہوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ایک اور بڑے جرم کی طرف ہاتھ بڑھایا اور وہ یہ کہ راہ حق کے ہادیوں یعنی انبیاء کو بلا جواز قتل کیا۔

وہ خلاف حق اعمال میں اس قدر جسارت مند اور بے باک تھے کہ انبیاء کی گفتگو کا مذاق اڑاتے تھے اور انہیں صراحت سے کہتے تھے ہمارے دلوں پر تو پردہ ڈال دیا گیا ہے جو تمہاری دعوت کو سننے اور اسے قبول کرنے میں حائل ہے۔ یہاں قرآن مجید مزید کہتا ہے جی ہاں ان کے دلوں پر واقعی مہر لگا دی گئی ہے اب کوئی حق بات ان میں جاگزیں نہیں ہو سکتی لیکن اس کا عامل ان کا اپنا کفر اور بے ایمانی ہے اس لیے تھوڑے سے افراد جو ایسی ہٹ دھرمیوں میں نہیں پڑتے وہی ایمان لائیں گے باقی نہیں۔

(۱۵۶)ان کی قانون شکنیاں صرف یہیں تک محدود نہیں ہیں وہ کفر کی راہ میں اتنے تیز دوڑتے ہیں کہ انہوں نے مریم جیسی پاک دامن خاتون اور خدا کے ایک عظیم پیغمبر کی والدہ جو حکم خدا سے بغیر شوہر کے حاملہ ہو گئی تھی پر بہت بڑی تہمت لگائی۔ یہاں تک وہ قتل انبیاء پر فخر کرتے تھے اور کہتے تھے ہم نے عیسیٰ بن مریم اللہ کے رسول کو قتل کر دیا۔

(۱۵۷) شاید مسیح کو رسول اللہ تمسخر اور استہزاء کے طور پر کہتے تھے وہ قتل عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اپنے دعوے میں جھوٹے تھے انہوں نے ہرگز مسیح کو قتل نہیں کیا اور نہ سولی پر لٹکایا بلکہ ایک اور شخص کو جوان سے مشابہت رکھتا تھا اشتباہ میں سولی پر لٹکا دیا۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے مسیح کے بارے میں اختلاف کرنے والے خود شک میں تھے اور اپنی کہی ہوئی بات پر ایمان نہیں رکھتے تھے وہ صرف تخمینے اور اندازے کی پیروی کرتے تھے۔ اس بارے میں کہ انہوں نے کس بات میں اختلاف کیا مفسرین میں اختلاف ہے بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ انہوں نے اختلاف حضرت مسیح کی اصل حیثیت اور مقام کے بارے میں کیا تھا ایک گروہ جناب مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتا تھا اور بعض یہودیوں کی طرح انہیں پیغمبر ہی نہیں سمجھتے تھے اور یہ سب کے سب اشتباہ میں تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے قتل کی کیفیت کے بارے میں اختلاف ہو بعض کہتے ہیں کہ وہ قتل ہو گئے ہیں اور بعض کہتے کہ وہ قتل نہیں ہوئے اور ان میں سے کوئی بھی اپنی بات پر مطمئن نہیں تھا۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے قتل کے مدعی انہیں نہ پہچاننے کی وجہ سے شک میں ہوں اور وہ یہ ہے کہ جسے انہوں نے قتل کیا تھا وہ مسیح ہی تھے یا ان کی جگہ کوئی اور شخص تھا۔

(۱۵۸) اس پر قرآن تاکیداً کہتا ہے انہوں نے قطعاً اسے قتل نہیں کیا بلکہ خدا اسے اپنی طرف اٹھا لے گیا اور خدا قادر و حکیم ہے۔

(۱۵۹) وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۚ	کوئی اہل کتاب ایسا نہیں جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے گا اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوگا۔

تفسیر

مندرجہ بالا آیت کی تفسیر کے بارے میں دو احتمال ہیں ان میں سے ہر ایک قابل ملاحظہ ہے۔

1۔ آیت کہتی ہے کوئی اہل کتاب نہیں مگر یہ کہ وہ مسیح علیہ السلام پر اپنی موت سے پہلے ایمان لے آئے گا۔

اور یہ وقت وہ ہوگا جب انسان موت کے دہانے پر کھڑا ہوتا ہے اس وقت اس کا ربط اس جہان سے کمزور پڑ جاتا ہے اور بعد والے جہان سے قوی ہو جاتا ہے پردے اس کی آنکھوں کے سامنے سے اٹھ جاتے ہیں بہت سے حقائق اسے نظر آنے لگتے ہیں اور وہ ان کے بارے میں آگاہی حاصل کر لیتا ہے اس موقع پر اس کی حقیقت میں آنکھیں مقام مسیح کو دیکھتی ہیں اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کر لیتی ہیں جو اس کے منکر تھے اب مومن ہو جاتے ہیں اور جو اسے خدا سمجھتے تھے اب اپنے اشتباہ کو جان لیتے ہیں۔

یہ ایمان فرعون اور دیگر ایسے لوگوں کا سا ایمان ہے جو عذاب میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور اپنی بربادی کا سامان اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں پھر اظہار ایمان کرتے ہیں ایسا ایمان انہیں کوئی فائدہ نہیں دیتا لہٰذا کس قدر اچھا ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ ایسے حساس لمحے پر ایمان لائیں جبکہ ایمان انہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا ابھی ایمان لے آئیں اور مومن بن جائیں جب ایمان ان کے لیے فائدہ مند بھی ہے۔

اس تفسیر کے مطابق "قبل موتہ" کی ضمیر اہل کتاب کے بارے میں ہے۔

2۔ دوسری تفسیر کے مطابق تمام اہل کتاب حضرت مسیح علیہ السلام پر ان کی موت سے پہلے ایمان لے آئیں گے یہودی ان کی نبوت قبول کرلیں گے اور عیسائی ان کی الوہیت کے عقیدے سے دست کش ہو جائیں گے یہ اس وقت ہوگا جب اسلامی روایات کے مطابق حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کے موقع پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اتریں گے اور ان کے پیچھے نماز پڑھیں گے یہود و نصاریٰ بھی انہیں دیکھیں گے اور ان پر اور حضرت مہدی علیہ السلام پر ایمان لے آئیں گے۔

واضح رہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا دین گذشتہ زمانے سے تعلق رکھتا ہے اور اب ان کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ دین اسلام کی پیروی کریں جس کے جاری اور نافذ کرنے والے حضرت مہدی علیہ السلام ہوں گے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے قیامت کے دن حضرت مسیح ان پر گواہ ہوں۔ حضرت مسیح کی ان کے خلاف گواہی سے مراد یہ ہے کہ وہ گواہی دیں گے کہ میں نے تبلیغ رسالت کی اور انہیں کبھی اپنی الوہیت کی دعوت نہیں دی بلکہ پروردگار کی ربوبیت کی دعوت دی۔

(۱۶۰) فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۙ	اس ظلم کی وجہ سے جو یہودیوں نے کیا نیز راہ خدا سے بہت زیادہ روکنے کی بنا پر کچھ پاکیزہ چیزیں جو ان پر حلال تھیں ہم نے حرام قرار دے دیں۔
(۱۶۱) وَّ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا	اور (اسی طرح) ان کی سودخوری (بھی) جبکہ انہیں اس سے منع کر دیا گیا تھا اور باطل طریقے سے لوگوں کا مال کھانے کی وجہ سے اور ان میں سے کافروں کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔
(۱۶۲) لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ۧ	لیکن ان میں وہ لوگ جو علم میں راسخ ہیں اور وہ جو ایمان لائے ہیں ان تمام چیزوں پر جو تم پر نازل ہوئی ہیں اور ان پر جو تم سے پہلے نازل ہو چکی ہیں ایمان لا چکے ہیں اور وہ جو نماز قائم کرتے اور زکوۃ ادا کرتے ہیں اور وہ جو خدا اور روز قیامت پر ایمان لائے ہیں ہم جلد ہی ان سب کو اجر عظیم دیں گے۔

تفسیر

یہودیوں میں سے صالح اور غیر صالح افراد کا انجام

گذشتہ آیات میں یہودیوں کی قانون شکنی کے چند نمونوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے مندرجہ بالا آیات میں ان کے کچھ اور

ناشائستہ اعمال کا ذکر کرنے کے بعد ان سزاؤں کا تذکرہ ہے جو ان کے اعمال کی وجہ سے دنیا اور آخرت میں ان کے دامن گیر ہوئیں اور ہوں گی۔

پہلے ارشاد فرمایا اس ظلم وستم کی وجہ سے جو یہودیوں نے کیا اور لوگوں کو راہ خدا سے باز رکھنے کی وجہ سے کچھ پاک و پاکیزہ چیزیں ہم نے ان پر حرام کر دیں اور انہیں ان سے استفادہ سے محروم کر دیا۔

(۱۶۱) نیز اس بنا پر کہ وہ سود کھاتے تھے حالانکہ انہیں اس سے منع کیا گیا تھا اور اسی طرح لوگوں کا مال ناحق کھاتے تھے ان کے یہی کام ان کی اس محرومیت کا سبب بنے۔

اس دنیاوی سزا کے علاوہ ہم انہیں اخروی سزاؤں میں مبتلا کریں گے اور ان میں سے جو کافر ہیں ان کے لیے دردناک عذاب تیار ہے۔

یہودیوں میں سے اہل ایمان

زیر نظر آیات میں سے آخری آیت میں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے جس کا قرآن نے بارہا اظہار کیا ہے اور وہ یہ کہ قرآن اگر یہودیوں کی مذمت کرتا ہے تو یہ نسلی اور گروہی جھگڑے کے حوالے سے نہیں ہے اسلام کسی قوم و قبیلے کی مذمت قوم اور قبیلے کی وجہ سے نہیں کرتا بلکہ اس مذمت کا ہدف صرف آلودہ گناہ اور منحرف لوگ ہوتے ہیں اسی لیے اس آیت میں یہودیوں میں سے صاحب ایمان اور پاک دامن افراد کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے اور ان کی تعریف کی گئی ہے اور انہیں اجر عظیم کی بشارت دی گئی ہے قرآن کہتا ہے لیکن یہودیوں میں سے وہ لوگ جو علم و دانش میں راسخ ہیں خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ تم سے پہلے نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان لے آئے ہیں، ہم بہت جلد انہیں اجر عظیم سے نوازیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ یہودیوں کے بڑے لوگوں میں ایک جماعت اسلام کے ظہور اور اس کی حقانیت اور اس کی حقانیت کو دیکھتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہو گئی اور دل و جان سے اس کی حمایت کی یہ لوگ پیغمبر اسلام ﷺ اور باقی مسلمانوں کے لئے قابل احترام قرار پائے۔

(۱۶۳) اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۚ	ہم نے تم پر وحی کی جس طرح کہ نوح اور اس کے بعد والے انبیاء پر وحی کی تھی نیز ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، (بنی اسرائیل میں سے) اسباط، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان پر وحی کی اور (جیسے) داؤد کو ہم نے زبور دی۔

(۱۶۴)وَ رُسُلًا قَدۡ قَصَصۡنٰهُمۡ عَلَیۡکَ مِنۡ قَبۡلُ وَ رُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡهُمۡ عَلَیۡکَ ؕ وَ کَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰی تَکۡلِیۡمًا ۚ	اور وہ پیغمبر جن کی سرگذشت ہم تمہیں پہلے بیان کر چکے ہیں اور وہ پیغمبر کہ جن کا قصہ ہم نے بیان نہیں کیا اور خدا نے موسیٰ سے کلام کیا۔
(۱۶۵)رُسُلًا مُّبَشِّرِیۡنَ وَ مُنۡذِرِیۡنَ لِئَلَّا یَکُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعۡدَ الرُّسُلِ ؕ وَ کَانَ اللّٰهُ عَزِیۡزًا حَکِیۡمًا	وہ پیغمبر کہ جو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے تھے تا کہ لوگوں کے لئے ان پیغمبروں کے بعد خدا پر کوئی حجت باقی نہ رہے (اور سب پر اتمام حجت ہو جائے) اور خدا توانا و حکیم ہے۔
(۱۶۶)لٰکِنِ اللّٰهُ یَشۡهَدُ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اِلَیۡکَ اَنۡزَلَهٗ بِعِلۡمِهٖ ۚ وَ الۡمَلٰٓئِکَةُ یَشۡهَدُوۡنَ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیۡدًا ؕ	لیکن خدا گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ تجھ پر نازل ہوا ہے وہ اس نے اپنے علم کی رُو سے نازل کیا ہے اور فرشتے (بھی) گواہی دیتے ہیں اگرچہ خدا کی گواہی کافی ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ یہودی انبیاء میں فرق کرتے تھے بعض کی تصدیق کرتے تھے اور بعض کی تردید کرتے تھے زیرنظر آیات میں دوبارہ انہیں جواب دیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے ہم نے تجھ پر وحی نازل کی جس طرح نوح اور اس کے بعد والے انبیاء پر وحی بھیجی تھی اور جیسے ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام یعقوب علیہ السلام، وہ پیغمبر جو اولا د یعقوب میں سے تھے، عیسیٰ علیہ السلام، ایوب علیہ السلام، یونس علیہ السلام، ہارون علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام پر وحی نازل کی تھی اور داؤد علیہ السلام کو زبور دی تھی۔ لہٰذا ان بزرگ انبیاء میں کیوں تفریق کرتے ہو جب کہ سب کے سب ایک ہی راستے کے مسافر ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس آیت کے مخاطب عرب کے مشرکین اور بت پرست ہوں جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نزول وحی پر تعجب کرتے تھے، آیت کہتی ہے کہ اس میں کون سی تعجب کی بات ہے کیا پہلے پیغمبروں پر وحی نازل نہیں ہوئی۔

(۱۶۴) اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے وہ انبیاء جن پر وحی نازل ہوئی وہ یہی نہیں تھے بلکہ دوسرے پیغمبر کہ جن کا ذکر تم سے پہلے کیا جا چکا ہے اور وہ پیغمبر کہ جن کا قصہ ابھی تک بیان نہیں ہوا سب کی یہی ماموریت تھی اور ان پر بھی وحی نازل ہوتی رہی۔ اور اس سے بالاتر یہ کہ خدا نے موسیٰ سے کلام کیا۔

(۱۶۵) لہٰذا رشتہ وحی تو ہمیشہ سے نوع بشر میں تھا اور کیسے ممکن ہے کہ ہم نوع انسانی کو بغیر راہبر و رہنما کے چھوڑ دیں اور پھر ان کے لئے جوابدہی اور ذمہ داری کے بھی قائل ہوں؟ لہٰذا ہم نے ان پیغمبروں کو بشارت دینے والا اور ڈرانے والا قرار دیا تا کہ خدا کی

رحمت اور ثواب کا لوگوں کو امیدوار بنائیں اور اس کی سزاؤں سے ڈرائیں تاکہ اس طرح ان پر اتمام حجت ہو جائے اور ان کے پاس کوئی بہانہ نہ رہے۔

خدا نے ان رہبروں کو بھیجنے کا پروگرام نہایت باریک بینی سے منظم اور جاری کیا ہے ایسا کیوں نہ ہو جبکہ وہ تمام چیزوں پر توانائی رکھتا ہے اور حکیم بھی ہے۔ اس کی حکمت سبب بنتی ہے کہ یہ کام عملی صورت اختیار کرے اور اس کی قدرت راہ ہموار کرتی ہے کیونکہ ایک صحیح پروگرام اگر انجام پذیر نہ ہو تو اس کی وجہ یا عدم حکمت ہوگی یا عدم قدرت حالانکہ ان میں سے کوئی بھی نقص خدا کی ذات پاک میں نہیں ہے۔

(۱۶۶) آیت کے آخر میں پیغمبر اکرم ﷺ کی دلجوئی اور تسلی کے لئے کہتا ہے اگر یہ لوگ تیری نبوت و رسالت کا انکار کرتے ہیں تو اس کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ خدا نے جو کچھ تجھ پر نازل کیا ہے وہ خود اس کا گواہ ہے۔ البتہ اس مقصد کے لئے تمہارا انتخاب بلاوجہ نہیں تھا بلکہ تمہاری اصلیت کو جانتے ہوئے اس نے یہ آیات تم پر نازل کی ہیں۔

ممکن ہے یہ جملہ ایک اور مفہوم کا بھی حامل ہو اور وہ یہ کہ جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اس کا سرچشمہ علم الٰہی کا دریائے بے کنار ہے اور اس کے مضامین شاہد ہیں کہ ان کا سرچشمہ علم الٰہی ہے اس لئے تمہارے دعویٰ صداقت کی گواہی خود متن آیات میں ثبت ہے اور کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے کیسے ممکن ہے کہ جس شخص نے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا وہ علم الٰہی کے بغیر ایک ایسی کتاب لے کر آئے جو اعلیٰ ترین تعلیمات فلسفوں قوانین، اخلاقی احکام اور اجتماعی پروگرام پر مشتمل ہو۔ آخر میں مزید فرماتا ہے نہ صرف خدا تمہاری حقانیت کی گواہی دیتا ہے بلکہ فرشتگان الٰہی بھی گواہی دیتے ہیں اگرچہ خدا کی گواہی کافی ہے۔

(۱۶۷)اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ قَدۡ ضَلُّوۡا ضَلٰلًاۢ بَعِیۡدًا	جو لوگ کافر ہو گئے ہیں اور انہوں نے (لوگوں کو) راہ خدا سے روکا ہے وہ دُور دراز کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔
(۱۶۸)اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَظَلَمُوۡا لَمۡ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغۡفِرَ لَہُمۡ وَ لَا لِیَہۡدِیَہُمۡ طَرِیۡقًا ۙ	جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور (اپنے اوپر اور دوسروں پر) ظلم کیا خدا انہیں ہرگز نہیں بخشے گا اور انہیں کسی راستے کی ہدایت نہیں کرے گا۔
(۱۶۹)اِلَّا طَرِیۡقَ جَہَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ؕ وَ کَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرًا	مگر جہنم کے راستے کی کہ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ کام خدا کے لئے آسان ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں بے ایمان افراد اور اہل ایمان کے بارے میں متعدد مباحث گزر چکے ہیں ان آیات میں ایک اور گروہ

کی نشاندہی کی گئی ہے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے بدترین قسم کا کفر انتخاب کر رکھا ہے انہوں نے اپنی گمراہی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اوپر بھی ظلم و ستم روا سمجھتے ہیں اور دوسروں پر بھی کیونکہ نہ وہ خود راہ ہدایت پر چلتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی راہ ہدایت پر نہ چلیں۔

لہٰذا پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے جو لوگ کافر ہو گئے ہیں اور لوگوں کے راہ خدا میں قدم اٹھانے میں حائل ہوتے ہیں وہ بہت دور کی گمراہی کا شکار ہیں۔

(۱۶۸) اس آیت میں مزید کہتا ہے جو لوگ کافر ہو گئے ہیں اور انہوں نے ظلم کیا ہے انہوں نے حق پر بھی ظلم کیا ہے کہ جو چیز اس کے شایان شان تھی اسے انجام نہیں دیا اور اپنے اوپر بھی ظلم کیا ہے کہ خود کو سعادت سے محروم کر دیا ہے اور وہ گمراہی میں جا پڑے ہیں نیز دوسروں پر بھی ظلم کیا ہے کہ انہیں راہ حق سے روکا ہے ایسے افراد کو پروردگار کی مغفرت میسر نہیں آئے گی اور خدا انہیں جہنم کے علاوہ کسی اور راستے کی راہنمائی نہیں کرے گا۔

(۱۶۹) اور وہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہیں گے۔ انہیں جاننا چاہئے کہ خدائی تہدید اور دھمکی عمل پذیر ہو کے رہے گی کیونکہ خدا کے لئے یہ کام آسان ہے اور وہ اس پر قدرت رکھتا ہے۔

(۱۷۰) یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا	اے لوگو! (جس) پیغمبر (کے انتظار میں تم تھے وہ) پروردگار کی طرف سے حق کے (پروگرام کے) ساتھ تمہارے پاس آ گیا ہے اس پر ایمان لے آؤ کہ اس میں تمہارا فائدہ ہے اور اگر کافر ہو جاؤ (تو خدا کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خدا کے لئے ہے اور اللہ دانا و حکیم ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں غیر مومن افراد کا انجام بیان کیا گیا ہے اب اس آیت میں ایمان کی طرف دعوت دی گئی ہے اور اس کے نتیجے کا ذکر کیا گیا ہے اور مختلف تعبیرات جو انسان میں اشتیاق پیدا کریں اس میں سب موجود ہیں تمام لوگوں کو اس بلند مقصد کی ترغیب دی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے اے لوگو! وہی پیغمبر کہ جس کے تم منتظر تھے اور جس کے بارے میں گذشتہ آسمانی کتب میں نشاندہی کی جا چکی ہے وہ دین حق لے کر تمہاری طرف آ چکا ہے۔

اس کے بعد فرمایا یہ پیغمبر اس ذات کی طرف سے آیا ہے جس نے تمہاری پرورش و تربیت اپنے ذمہ لے رکھی ہے (مِنْ رَّبِّكُمْ) پھر مزید فرمایا اگر ایمان لے آؤ تو تمہارے فائدے میں ہے اس سے تم کسی دوسرے کی خدمت نہیں کرو گے بلکہ یہ خود تمہاری

اپنی خدمت ہوگی۔اور آخر میں فرمایا یہ خیال نہ کرو کہ اگر تم نے راہ کفر اختیار کی تو اس سے خدا کو کوئی نقصان ہوگا ایسا نہیں ہے کیونکہ خدا ان تمام چیزوں کا مالک ہے جو آسمانوں اور زمینوں میں ہے۔علاوہ ازیں چونکہ خدا عالم اور حکیم ہے اس نے جو احکام تمہیں دیئے ہیں اور جو پروگرام ترتیب دیئے ہیں سب میں حکمت اور مصلحتیں پوشیدہ ہیں اور تمہارے فائدے میں ہیں۔لہٰذا اگر اس نے انبیاء اور پروگرام بھیجے ہیں تو یہ اس لیے نہیں کہ اسے ضرورت تھی بلکہ اس کے علم وحکمت کا تقاضا ہے اس لیے ان تمام پہلوؤں کی طرف توجہ رکھتے ہوئے کیا یہ مناسب ہے کہ تم راہ ایمان کو چھوڑ کر راہ کفر پر گامزن ہو جاؤ۔

(۱۷۱) یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْیَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ وَ لَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَیْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ یَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِیْلًا ۧ	اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو (اور زیادہ روی) نہ کرو اور حق کے سوا خدا کے بارے میں کچھ نہ کہو مسیح عیسیٰ بن مریم صرف خدا کے فرستادہ اور اس کا کلمہ (اور مخلوق) ہیں کہ جنہیں اس نے مریم کی طرف القا کیا اور وہ اس کی طرف سے (شائستہ) روح تھے اس لیے خدا اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لے آؤ اور نہ یہ کہو کہ (خدا) تین ہیں۔اس بات سے رک جاؤ کہ یہ (بات) تمہارے فائدے میں نہیں ہے خدا تنہا معبود یگانہ ہے وہ منزہ ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو (بلکہ) جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اس کا ہے اور ان کی تدبیر وسرپرستی کے لئے خدا کافی ہے۔

تفسیر

خیالی تثلیث

اس آیت میں اور اس کے بعد والی آیت میں کفار اور اہل کتاب کے بارے میں جاری مباحث کے حوالے سے مسیحی معاشرے کے اہم ترین انحراف کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ ہے تثلیث یا تین خداؤں کا مسئلہ مختصر سے استدلالی جملوں کے ساتھ انہیں اس عظیم انحراف کے انجام بد سے ڈرایا گیا ہے۔

پہلے انہیں خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کہتا ہے اپنے دین میں غلو کی راہ نہ چلو اور حق کے علاوہ خدا کے بارے میں کچھ نہ کہو۔

آسمانی ادیان سے انحراف میں ایک اہم ترین بات یہ ہے کہ لوگوں نے پیشواؤں اور راہنماؤں کے بارے میں غلو سے کام لیا انسان چونکہ اپنے آپ سے لگاؤ رکھتا ہے لہٰذا وہ چاہتا ہے کہ اپنے رہبروں کو بھی ان کے اصل مقام سے بلند تر بنا کر پیش کرے تا کہ اس طرح اس کی اپنی عظمت میں اضافہ ہو بعض اوقات لوگ اس ہولناک بھنور میں اس لیے پھنس جاتے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ پیشواؤں کے بارے میں ان سے عشق اور لگاؤ کی نشانی ہے۔

غلو کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ وہ مذہب کی اصلی بنیاد یعنی خدا پرستی اور توحید کو خراب کر دیتا ہے اسی لیے غالیوں کے بارے میں اسلام کا رویہ نہایت شدید اور سخت ہے اور عقائد وفقہ کی کتب میں غالیوں کو کفار کی بدترین قسم قرار دیا گیا ہے۔

تثلیث اور الوہیت مسیح علیہ السلام کا ابطال

اس سلسلے میں چند نکات پیش خدمت ہیں۔

۱۔ عیسیٰ علیہ السلام مریم کے بیٹے ہیں

قرآن حکیم میں عیسیٰ علیہ السلام کا نام ان کی والدہ کے نام کے ساتھ سولہ مرتبہ آیا ہے عیسیٰ علیہ السلام صرف مریم علیہا السلام کے بیٹے ہیں۔

یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ مسیح علیہ السلام بھی دیگر انسانوں کی طرح رحم مادر میں رہے اور ان پر بھی جنین کا دور گزرا وہ دیگر انسانوں کی طرح پیدا ہوئے دودھ پیا اور آغوش مادر میں پرورش پائی یعنی تمام بشری صفات ان میں موجود تھیں لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ ایسا شخص جو قوانین طبیعت اور عالم مادہ کا متمول ومحکوم ہو وہ خدائے ازلی وابدی بن جائے۔

خصوصاً لفظ "انما" جو زیر بحث آیت میں آیا ہے وہ اس وہم کا جواب ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کا باپ نہیں تو اس کا یہ معنی نہیں کہ وہ خدا کا بیٹا ہے بلکہ وہ صرف مریم کا بیٹا ہے۔

۲۔ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے رسول ہیں

عیسیٰ خدا کے فرستادہ اور رسول ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کا یہ مقام اور حیثیت بھی ان کی الوہیت سے مناسبت نہیں رکھتا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی مختلف باتیں جن میں سے کچھ اناجیل موجودہ میں بھی ہیں سب کی سب انسانی ہدایت کے لئے ان کی نبوت ورسالت کی حکایت کرتی ہیں نہ کہ ان کی الوہیت اور خدائی کی۔

۳۔ عیسیٰ علیہ السلام خدا کا کلمہ ہیں

عیسیٰ علیہ السلام خدا کا کلمہ ہیں جو مریم کی طرف القاء ہوا۔

قرآن کی چند آیات میں عیسیٰ علیہ السلام کو کلمہ کہا گیا ہے یہ تعبیر مسیح کے مخلوق ہونے کی طرف اشارہ کے لیے ہے جیسے ہمارے

کلمات ہماری مخلوق اور ایجاد ہیں اسی طرح عالم آفرنیش کے موجودات بھی خدا کی مخلوق ہیں۔

نیز جیسے ہمارے کلمات ہمارے اندرونی اسرار کا مظہر ہوتے ہیں اور ہمارے جذبات وصفات کے ترجمان ہوتے ہیں اسی طرح مخلوقات عالم بھی خدا کی صفات جمال وجلال کو واضح کرتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آیات قرآنی میں متعدد مقامات پر تمام مخلوقات کے لئے لفظ کلمۃ استعمال کیا گیا ہے مثلاً (کہف ۱۰۹، اور لقمان ۲۹) البتہ یہ کلمات آپس میں مختلف ہیں بعض بہت اہم اور بلند ہیں اور بعض نسبتاً معمولی اور کم تر ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام آفرنیش کے لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ مقام رسالت کے علاوہ یہ امتیاز بھی رکھتے تھے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا کئے گئے۔

۴۔ عیسیٰ علیہ السلام روح ہیں

حضرت عیسیٰ علیہ السلام روح ہیں جنہیں خدا نے پیدا کیا ہے یہ تعبیر قرآن حکیم میں حضرت آدم کے بارے میں بھی آئی ہے ایک معنی کے لحاظ سے تمام نوع انسانی کے بارے میں ہے یہ اس روح کی عظمت کی طرف اشارہ ہے جسے خدا نے دیگر انسانوں میں عموماً اور حضرت مسیح علیہ السلام اور باقی انبیاء میں خصوصیت سے پیدا کیا۔

اس بیان کے بعد قرآن کہتا ہے اب جبکہ ایسا ہے تو خدائے یگانہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لے آؤ اور یہ نہ کہو کہ تین خدا ہیں اور اگر اس بات سے اجتناب کرو تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔

دوبارہ تاکید کی گئی ہے کہ خدا ہی معبود یکتا ہے۔ تم اس بات کو مانتے ہو کہ تثلیث کے ہوتے ہوئے بھی خدا اکیلا اور یگانہ ہے حالانکہ اگر اس کا بیٹا ہو تو وہ اس کا شبیہ ہوگا تو پھر یکتائی کا کوئی معنی نہیں رہے گا کیسے ممکن ہے کہ خدا کا کوئی بیٹا ہو جبکہ وہ بیوی اور بیٹے کی احتیاج کے نقص سے اور جسم اور عوارض جسم کے نقص سے مبرا و منزہ ہے۔

علاوہ ازیں وہ ان تمام چیزوں کا مالک ہے جو آسمان وزمین میں ہیں سب اس کی مخلوق ہیں اور وہ ان کا خالق ہے اور مسیح بھی ان کی مخلوق میں سے ایک ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ ان کے لئے ایک استثنائی حالت کا قائل ہوا جائے کیا ممکن ہے کہ مملوک ومخلوق اپنے خالق ومالک کا بیٹا بن جائے۔ خدا صرف ان کا خالق ومالک ہے بلکہ ان کا مدبّر محافظ رزاق اور سرپرست بھی ہے۔

اصولی طور پر وہ خدا جو ازلی و ابدی ہے اور ازل تا ابد تمام مخلوقات کی سرپرستی اپنے ذمہ لیے ہوئے ہے اسے بیٹے کی کیا ضرورت ہے کیا وہ ہماری طرح ہے کہ اپنی موت کے بعد جانشینی کے لئے بیٹے کی خواہش رکھتا ہو۔

(۱۷۲)لَنۡ یَّسۡتَنۡکِفَ الۡمَسِیۡحُ اَنۡ یَّکُوۡنَ عَبۡدًا لِّلّٰہِ وَ لَا الۡمَلٰٓئِکَۃُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ ؕ وَ مَنۡ یَّسۡتَنۡکِفۡ عَنۡ عِبَادَتِہٖ وَ یَسۡتَکۡبِرۡ فَسَیَحۡشُرُہُمۡ اِلَیۡہِ جَمِیۡعًا	مسیح اس سے ہرگز پہلو تہی اور انکار نہیں کرتا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ اس کے مقرب فرشتے (اس کا انکار کرتے ہیں) اور جو اس کی عبودیت اور بندگی سے پہلو تہی کرے اور تکبر کرے بہت جلد وہ ان سب کو اپنی طرف محشور کرے گا (اور انہیں قیامت میں اٹھائے گا)
(۱۷۳)فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیۡہِمۡ اُجُوۡرَہُمۡ وَ یَزِیۡدُہُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ ۚ وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ اسۡتَنۡکَفُوۡا وَاسۡتَکۡبَرُوۡا فَیُعَذِّبُہُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ۬ۙ وَّ لَا یَجِدُوۡنَ لَہُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیۡرًا	باقی رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال انجام دیئے ان کی پوری جزا انہیں دے گا اور اپنے فضل و بخشش سے انہیں مزید دے گا لیکن جنہوں نے پہلو تہی کی اور تکبر کیا انہیں دردناک سزا دے گا اور وہ خدا کے علاوہ اپنے لیے کوئی سرپرست اور یاور و مددگار نہیں پائیں گے۔

شان نزول

بعض مفسرین نے ان آیات کے سلسلے میں ایک شان نزول روایت کی ہے روایت یہ ہے کہ نجران کے کچھ عیسائی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے انہوں نے عرض کیا کہ آپ ہمارے پیشوا پر کیوں تنقید کرتے ہیں؟

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نے ان پر کون سا عیب لگایا ہے؟

وہ کہنے لگے آپ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

اس پر یہ آیات نازل ہوئیں اور انہیں جواب دیا گیا۔

تفسیر

عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بندے ہیں۔

اگرچہ زیر نظر آیات کی مخصوص شان نزول ہے اس کے باوجود وہ گذشتہ آیات سے مربوط ہیں جن میں الوہیت مسیح کی نفی اور مسئلہ تثلیث کا ابطال کیا گیا ہے۔

پہلے تو ایک پہلو سے الوہیت مسیح کی نفی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے تم عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کا کیسے عقیدہ رکھتے ہو جبکہ نہ

عیسیٰ علیہ السلام پروردگار کی بندگی سے پہلوتہی کرتے ہیں نہ خدا کے مقرب فرشتے اس سے پہلوتہی کرتے ہیں۔ مسلم ہے کہ جو شخص خود عبادت کرنے والا ہو اس کے معبود ہونے کا کوئی معنی نہیں ہے کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی اپنی ہی عبادت کرے یا یہ کہ عابد و معبود اور بندہ و خدا ایک ہی ہوں یہ بات قابل توجہ ہے کہ امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے ایک حدیث مروی ہے: آپ علیہ السلام نے کجرو عیسائیوں کو جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے مدعی تھے مغلوب کرنے کے لئے ان کے ایک بزرگ جاثلیق سے فرمایا: ''عیسیٰ علیہ السلام کی باقی باتیں تو اچھی ہیں ان میں صرف ایک عیب تھا اور وہ یہ کہ وہ زیادہ عبادت نہیں کرتے تھے''۔ وہ عیسائی جھنجھلا اٹھا اور امام علیہ السلام سے کہنے لگا آپ کتنی غلط بات کہہ رہے ہیں اس بات پر تو اتفاق ہے کہ وہ سب سے زیادہ عبادت گزار تھے۔ امام علیہ السلام نے فوراً فرمایا: ''وہ کس کی عبادت کرتے تھے؟ کیا خدا کے علاوہ کسی کی عبادت کرتے تھے؟ لہٰذا خود تیرے اعتراف کے مطابق وہ خدا کے بندے مخلوق اور اس کی عبادت کرنے والے تھے نہ کہ معبود اور خدا تھے''۔ وہ عیسائی خاموش ہو گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے جو لوگ پروردگار کی عبادت اور بندگی سے پہلوتہی کریں اور اس کی وجہ تکبر ہو تو خدا ان سب کو قیامت کے دن حاضر کرے گا اور ہر ایک کو مناسب سزا دے گا۔

(۱۷۳) اس دن اہل ایمان اور نیک عمل کرنے والوں کو ان کی مکمل جزا دے گا اور اپنے فضل و رحمت سے اس پر اضافہ کرے گا اور جنہوں نے بندگی سے انکار کیا اور راہ تکبر اختیار کی وہ دردناک عذاب میں گرفتار ہوں گے اور خدا کے سوا انہیں کوئی سرپرست حامی اور مددگار نہیں ملے گا۔

(۱۷۴) یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا	اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے واضح دلیل آئی اور ہم نے واضح نور تمہاری طرف بھیجا۔
(۱۷۵) فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ اعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَیُدْخِلُهُمْ فِیْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ فَضْلٍ ۙ وَّ یَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ؕ	رہے وہ لوگ جو خدا پر ایمان لے آئے اور اس (آسمانی کتاب) سے وابستہ ہوئے بہت جلد ان سب کو اپنی رحمت اور فضل میں داخل کردے گا اور اپنی طرف سیدھے راستے کی ہدایت کرے گا۔

تفسیر

نور مبین

جیسا کہ بعض مفسرین کہتے ہیں اور قرآن بھی گواہی دیتے ہیں کہ زیر نظر آیت میں برہان سے مراد حضرت پیغمبر

اسلام ﷺ کی ذات بابرکات ہے اور نور سے مراد قرآن مجید ہے جبکہ دوسری آیات میں بھی اسے نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۱۷۵) اس آیت میں اس برہان اور نور کی پیروی کے نتیجے کا ذکر ہے باقی رہے وہ لوگ جو خدا پر ایمان لائے اور انہوں نے اس آسمانی کتاب سے تمسک کیا بہت جلد وہ انہیں اپنی وسیع رحمت میں داخل کرے گا اور اپنے فضل و رحمت سے ان کی جزا میں اضافہ کرے گا اور انہیں صراط مستقیم اور راہ راست کی طرف ہدایت کرے گا۔

(۱۷۶) یَسْتَفْتُوْنَکَ ؕ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْکُمْ فِی الْکَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَکَ لَیْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَکَ ۚ وَ هُوَ یَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ یَکُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ کَانَتَا اثْنَتَیْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَکَ ؕ وَ اِنْ کَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّ نِسَآءً فَلِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ ؕ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَ اللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۧ	تجھ سے (بہن بھائیوں کی میراث کے بارے میں) سوال کرتے ہیں ان سے کہہ دو کہ خدا تمہارے لیے کلالہ (بہن بھائی) کا حکم بیان کرتا ہے اگر ایک مرد مر جائے جس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو وہ اس کے چھوڑے ہوئے مال سے آدھا (بطور میراث) لے گی (اور اگر بہن مر جائے اور اس کا وارث صرف ایک بھائی ہو تو) وہ اس بہن کا سارا مال میراث میں لے گا اس صورت میں کہ (متوفی کی) کوئی اولاد نہ ہو اور اگر (متوفی کی) دو بہنیں باقی ہوں تو وہ مال کا دو تہائی لیں گی اور اگر بہن بھائی اکٹھے ہوں تو (تمام مال اس طرح سے تقسیم کریں گے کہ) ہر مذکر کے لئے مؤنث کے حصے سے دوگنا ہوگا خدا تمہارے لیے (اپنے احکام) بیان کرتا ہے تا کہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ اور خدا تمام چیزوں کو جانتا ہے۔

شان نزول

بہت سے مفسرین جابر بن عبداللہ انصاری سے اس آیت کی شان نزول اس طرح نقل کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں:

میں بہت سخت بیمار ہو گیا تھا تو پیغمبر ﷺ میری عیادت کے لئے تشریف لائے اور وہیں وضو کیا اور اپنے وضو کا

پانی مجھ پر چھڑکا میں چونکہ موت کی فکر میں تھا پیغمبر سے عرض کیا میری وارث فقط میری بہنیں ہیں ان کی میراث کس طرح ہوگی؟

اس پر یہ آیت نازل ہوئی جسے آیت فرائض کہتے ہیں۔

بعض کے نظریئے کے مطابق احکام اسلام کے بارے میں پیغمبر اکرم ﷺ پر نازل ہونے والی یہ آخری آیت ہے۔

تفسیر

زیرنظر آیت میں بھائی بہنوں کی میراث کی مقدار بیان کی گئی ہے جیسا کہ اس سورہ کے اوائل میں آیت بارہ (۱۲) کی تفسیر میں ہم کہہ چکے ہیں کہ بہنوں اور بھائیوں کی میراث کے بارے میں قرآن حکیم میں دو آیتیں ہیں ایک وہی آیت ۱۲ اور دوسری یہ آیت جو سورہ نساء کی آخری آیت ہے اگرچہ دونوں آیات میراث کی مقدار کے بارے میں مختلف ہیں۔

لیکن جیسا کہ سورہ کی ابتداء میں بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ ان میں ہر ایک بہنوں اور بھائیوں کی الگ الگ قسم کے بارے میں ہے آیت بارہ (۱۲) مادری بہن بھائیوں کے بارے میں ہے لیکن زیر بحث آیت پدری مادری یا صرف پدری بہن بھائیوں کے بارے میں ہے۔

توجہ رہے کہ یہ آیت کلالہ (بہن بھائی) کے بارے میں سوال کے جواب کے طور پر نازل ہوئی ہے اسی لیے فرمایا گیا ہے تم سے اس بارے میں سوال کرتے ہیں تو کہہ دو کہ خدا کلالہ (بھائی بہن) کے بارے میں تمہارے لیے حکم بیان کرتا ہے۔ اس کے بعد چند احکام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

بہن بھائی کی میراث کے چند احکام

۱۔ جب کوئی مرد دنیا سے چلا جائے اس کی کوئی اولاد نہ ہو فقط ایک بہن ہو تو اس کی آدھی میراث اس ایک بہن کو ملے گی۔

۲۔ اگر کوئی عورت مر جائے اس کی اولاد نہ ہو اس کا بس ایک بھائی ہو (جو پدری ہو یا مادری پدری ہو) تو اس کی ساری میراث اس کے اس اکیلے بھائی کو ملے گی۔

۳۔ اگر کوئی شخص دنیا سے چلا جائے اور دو بہنیں پیچھے چھوڑ جائے تو وہ اس کی دو تہائی میراث لیں گی۔

۴۔ اگر مرنے والے شخص کی چند بہنیں اور چند بھائی ہوں (جو دو سے زیادہ ہوں) تو وہ اس کی تمام میراث آپس میں تقسیم کریں گے اس طرح سے کہ ہر بھائی کا حصہ ایک بہن سے دوگنا ہوگا۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے خدا یہ حقائق تم سے بیان کرتا ہے تا کہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ اور سعادت کی راہ پا لو اور یقیناً جس

راستے کی خدا نشاندہی کرتا ہے وہی صحیح اور حقیقی راستہ ہے کیونکہ وہ ہر چیز سے دانا ہے۔

یہ بات بنا کہے نہ رہ جائے کہ زیر نظر آیت میں بہن بھائیوں کی میراث اس صورت میں بیان کی گئی ہے جبکہ اولاد نہ ہو اور ماں باپ کے ہونے یا نہ ہونے کے متعلق اس میں کوئی بات نہیں آئی لیکن اس سورہ کی ابتدائی آیات کے مطابق ماں باپ ہمیشہ اولاد کے یعنی میراث کے پہلے طبقے کے ہم پلہ قرار پاتے ہیں اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت اس مقام کے لئے ہے جب نہ اولاد ہو اور نہ ماں باپ۔

سُورَۃ

مائدۃ

مدینہ میں نازل ہوئی

۱۲۰ آیات ہیں

سورہ مائدہ کے مضامین

یہ سورہ مدنی سورتوں میں سے ہے۔اس کی ۱۲۰ آیتیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ سورہ سورہ فتح کے بعد نازل ہوئی۔ایک روایت کے مطابق یہ ساری سورہ حجۃ الوداع میں اور مکہ و مدینہ کے درمیان نازل ہوئی۔ یہ سورہ معارف' عقائد اسلامی اور احکام دینی پر مشتمل ہے۔

پہلے حصے میں پیغمبر اکرم ﷺ کے بعد کے لیے مسئلہ ولایت و رہبری، عیسائیوں کے مسئلہ تثلیث، قیامت و معاد کے کچھ مسائل اور انبیاء سے ان کی امتوں کے بارے میں پرسش کے معاملات ہیں۔

دوسرے حصے میں ایفائے عہد کا مسئلہ، عدالت اجتماعی کا معاملہ، عادلانہ شہادت اور قتل نفس کی حرمت کا حکم ہے۔ (اسی مناسبت سے آدم علیہ السلام کے بیٹوں کا واقعہ ہے جبکہ قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تھا) اسی طرح کچھ حلال و حرام غذاؤں کی وضاحت ہے کچھ وضو اور تیمّم کے احکام ہیں۔

اس کا نام ''مائدہ'' اس لیے ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انصار کے لیے مائدہ کے نزول کی داستان اسی سورہ کی آیت ۱۱۴ میں بیان کی گئی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔
(۱) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ ؕ اُحِلَّتۡ لَكُمۡ بَهِيۡمَةُ الۡاَنۡعَامِ اِلَّا مَا يُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ غَيۡرَ مُحِلِّى الصَّيۡدِ وَاَنۡتُمۡ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحۡكُمُ مَا يُرِيۡدُ	اپنے عہد و پیمان اور قول و قرار پورے کرو، چوپائے (اور چوپایوں کے جنین) تمہارے لیے حلال کر دیئے گئے ہیں مگر وہ جو تم سے بیان کئے جائیں گے (ان کے سوا جن کی استثناء کی جائے گی) اور احرام کے وقت شکار کو حلال نہ سمجھو اور خدا جو چاہتا ہے (اور مصلحت دیکھتا ہے) حکم کرتا ہے۔

تفسیر

ایفائے عہد ضروری ہے

جیسا کہ اسلامی روایات اور بڑے بڑے مفسرین کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے، یہ سورہ پیغمبر اکرم ﷺ پر نازل ہونے والی آخری سورہ ہے (یا آخری سورتوں میں سے ہے)۔

اس سورہ میں اس کے خاص موقع کی وجہ سے مفاہیم اسلامی بیان کیے گئے ہیں دین سے متعلق آخری پروگراموں کا تذکرہ ہے۔اس میں امت کی رہبری اور پیغمبر اسلام کی جانشینی کا ذکر ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس سورہ کا آغاز عہد و پیمان کے لازمی ایفا کے

حکم سے ہوتا ہے۔

پہلے جملے میں فرمایا گیا ہے اے ایمان والو! اپنے عہد و پیمان کے ساتھ وفا کرو۔ یہ اس لیے ہے تا کہ اہل ایمان کے لیے ان پیمانوں اور وعدوں کا ایفاء ضروری قرار دیا جائے جو وہ خدا سے پہلے باندھ چکے ہیں یا جن کے متعلق اس سورہ میں اشارہ ہوا ہے یہ اسی طرح ہے جیسے کوئی مسافر اپنے رشتہ داروں اور پیروکاروں سے وداع ہوتے ہوئے آخری لمحوں میں تاکید کرتا ہے کہ میری وصیتوں اور نصیحتوں کو بھول نہ جانا اور جو قول و قرار تم نے میرے ساتھ باندھے ہیں ان کے وفادار رہنا۔

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اصطلاح کے مطابق "**العقود**" "**جمع محلی به الف لام**" ہے جو عمومیت کے لیے ہوتی ہے اور جملہ بھی بالکل مطلق ہے لہٰذا مندرجہ بالا آیت ہر طرح کے عہد و پیمان کے وفا کرنے کے واجب ہونے کی دلیل ہے۔ چاہے یہ محکم عہد و پیمان انسان کا انسان کے ساتھ ہو یا انسان کا خدا کے ساتھ ہو۔ اسی طرح یہ تمام خدائی اور انسانی سیاسی اقتصادی، اجتماعی، تجارتی، از دواجی وغیرہ عہدہ و پیمان پر محیط ہے اور اس کا ایک مکمل وسیع مفہوم ہے، اس کی نظر تمام انسانی پہلوؤں پر ہے، چاہے ان کا تعلق عقیدے سے ہو یا عمل سے، وہ فطری عہدہ و پیمان ہوں یا توحیدی، اور چاہے ان کا تعلق ان معاہدوں سے ہو جو لوگ زندگی کے مختلف مسائل میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔

بہر حال آیت کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ اس میں وہ عہد و پیمان بھی آ جاتے ہیں جو مسلمان غیر مسلموں سے باندھتے ہیں۔

> وفائے عہد کے بارے میں نہج البلاغہ میں مالک اشتر کے نام اپنے فرمان میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔
> دنیا بھر کے لوگوں میں تمام تر اختلافات کے باوجود ایفائے عہد کی طرح کسی اور امر پر اتفاق نہیں ہے۔ اسی لیے تو زمانہ جاہلیت کے بت پرست بھی اپنے عہد و پیمان کا احترام کرتے تھے۔ کیونکہ وہ عہد شکنی کے دردناک انجام کو جان چکے تھے۔

عہد و پیمان کے بارے میں حکم پر گفتگو ہو چکی جو کہ تمام احکام اور خدائی پیمانوں پر محیط ہے اس کے بعد احکامِ اسلام کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے ان میں سے پہلا حکم کچھ جانوروں کے گوشت کے حلال ہونے کے بارے میں ہے، فرمایا گیا ہے۔ چوپائے (اور ان کے جنین) تمہارے لئے حلال کئے گئے ہیں۔ "انعام"، جمع ہے "نعم" کی جس کا معنی ہے اونٹ، گائے اور گوسفند۔

پھر آیت میں چوپایوں کے گوشت کی حرمت کے بارے میں دو استثنائی حکم ہیں ان جانوروں کے گوشت کا استثناء ہے جن کی تحریم عنقریب تمہارے لیے بیان کی جائے گی۔ اور حالت احرام میں بھی شکار کرنا حرام ہے۔ یعنی۔۔ حج کے مناسک یا عمرہ کے مناسک انجام دینے کے لیے باندھے گئے احرام کی حالت میں شکار کرنا حرام ہے۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے۔ خدا جو حکم چاہتا ہے، صادر کرتا ہے۔ یعنی خدا چونکہ ہر چیز سے آگاہ ہے اور چیز کا مالک ہے لہٰذا جو حکم بندوں کی مصلحت میں ہو اور حکمت اسی کی متقاضی ہو اسے جاری کر دیتا ہے۔

(۲)یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْیَ وَ لَا الْقَلَآئِدَ وَ لَآ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًا ؕ وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی ۪ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ	اے ایمان والو! شعائر خداوندی (اور مراسم حج کو محترم سمجھو اوران کی مخالفت) کو حلال قرار نہ دو اور نہ ہی حرام مہینہ کو اور نہ بغیر نشانی والی قربانیوں کو اور نہ نشانیوں والی کو اور نہ وہ کہ جنہیں خانہ خدا کے قصد سے پروردگار کے فضل اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے لاتے ہو اور جب تم حالتِ احرام سے نکل جاؤ تو پھر شکار کرنا تمہارے لیے کوئی منع نہیں ہے اور وہ گروہ جو مسجد الحرام کی طرف (حدیبیہ کے سال) تمہارے آنے میں حائل ہوا تھا۔اس کی دشمنی تمہیں تجاوز پر نہ ابھارے اور (ہمیشہ) نیکی اور پرہیزگاری کی راہ میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور (ہرگز) گناہ اور تجاوز کی راہ میں ساتھ نہ دو اور خدا سے ڈرو، جس کی سزا سخت ہے۔

تفسیر

ایک آیت میں آٹھ احکام

اس آیت میں چند اہم اسلامی احکام بیان ہوئے ہیں یہ پیغمبر اکرم ﷺ پر نازل ہونے والی آخری احکامات میں سے ہیں یہ سب کے سب یا ان میں سے زیادہ تر حج اور خانہ خدا کی زیارت سے مربوط ہیں احکام یہ ہیں۔

1۔سب سے پہلے اہلِ ایمان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ شعائر خداوندی کو نہ توڑ و اور ان کی حرمت کا خیال رکھو۔

اس سلسلے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے کہ شعائر اللہ سے کیا مراد ہے لیکن اس آیت کے دوسرے حصوں سے اس کی مناسبت سے اور اس کے سالِ نزول (دس ہجری) جو پیغمبر اکرم ﷺ کے حجۃ الوداع کا سال تھا، کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شعائر سے مراد مناسک حج اور حج کا پروگرام ہے، مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان سب کا احترام کریں اس تفسیر کا شاہد یہ ہے کہ قرآن میں لفظ شعائر عام طور پر مراسم حج کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔

2۔حرام مہینوں کا احترام کرو اوران مہینوں میں جنگ وجدال سے احتراز کرو۔

3۔ وہ قربانیاں جو حج کے لیے لاتے ہو چاہے وہ نشانی کے بغیر (ھَدْیَ) ہوں یا نشانی والی ہوں، انہیں حلال نہ سمجھو اور انہیں رہنے دو کہ وہ قربان گاہ تک پہنچ جائیں اور وہاں قربان ہوں۔

4۔ خانہ خدا کے تمام زائرین کو ان عظیم اسلامی مراسم کے لیے پوری آزادی ہونا چاہئے اور اس سلسلے میں افراد، قبائل، خاندانوں اور زبانوں کا کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہئے اس لیے جو لوگ خدا کی خوشنودی اور رضا حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں، حتیٰ کہ جو تجارتی فائدے کے لیے زیارتِ بیت اللہ کے قصد سے آتے ہیں ان سے بھی کوئی مزاحمت نہ کی جائے چاہے وہ تمہارے دوست ہوں یا دشمن، بس اتنا کافی ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور خانہ خدا کے زائر ہیں، یہی ان کے مامون ومحفوظ ہونے کے لیے کافی ہے۔

5۔ شکار کی حرمت زمانہ احرام کے لیے ہے اس لیے فرمایا گیا ہے جب حج یا عمرہ کے احرام سے نکل جاؤ تو پھر شکار کرنا تمہارے لیے جائز ہے۔

6۔ زمانہ جاہلیت کے بت پرست (حدیبیہ کے موقع پر) خانہ خدا کی زیارت میں تم سے مزاحم ہوئے اور انہوں نے تمہیں خانہ خدا کی زیارت سے مناسک انجام نہیں دینے دیئے۔ اس واقعہ کو اس بات کا سبب نہیں بننا چاہئے۔ کہ ان کے اسلام لے آنے کے بعد پرانی دشمنی کو زندہ کرو اور خانہ خدا کی زیارت میں ان کے لیے رکاوٹ بنو۔

یہ حکم اگرچہ خانہ خدا کی زیارت کے بارے میں نازل ہوا ہے لیکن حقیقت میں اس سے ایک عمومی قانون معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کو کینہ پرور نہیں ہونا چاہئے اور جو حوادث گذشتہ دور میں گزر چکے ہیں انہیں اپنے ذہن پر سوار نہیں کر لینا چاہئے اور ان کے انتقام کے درپے نہیں ہونا چاہئے۔

7۔ اس کے بعد بحث کی تکمیل کے لیے فرمایا گیا ہے، بجائے اس کے کہ تم اپنے پرانے دشمن اور موجودہ دوستوں سے انتقام کے لیے ایک ہو جاؤ، تمہیں چاہئے کہ نیکی اور تقویٰ کی راہ میں ایک دوسرے سے دستِ تعاون بڑھاؤ۔ نہ یہ کہ گناہ اور تجاوز میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے لگو۔

8۔ آیت کے آخر میں گذشتہ احکام کو محکم کرنے کے لیے اور ان کی تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے پرہیزگاری اختیار کرو اور حکمِ خدا کی نافرمانی سے بچو، کیونکہ خدا کا عذاب اور اس کی سزائیں بڑی سخت ہیں۔

(۳) حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَ الدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَ الْمُنْخَنِقَةُ وَ الْمَوْقُوْذَةُ وَ الْمُتَرَدِّيَةُ وَ النَّطِيْحَةُ وَ مَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۚ وَ مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ	مردار کا گوشت، خون، سؤر کا گوشت، وہ جانور جو غیر خدا کے نام پر ذبح ہوں، وہ جانور جن کا گلا گھونٹ دیا جائے اور تشدد کر کے انہیں مار دیا جائے، وہ جانور جو بلندی سے گر کر مر جائیں، وہ جانور جو دوسرے جانور کے سینگ مارنے سے مر جائیں اور درندہ جانور کے شکار کا باقی ماندہ مگر یہ کہ (بر موقع اس جانور کے پاس جا پہنچیں اور) اسے ذبح کر لیں اور وہ جانور جو کسی بت کے اوپر (یا اس کے سامنے) ذبح کئے جائیں (سب کے سب) تم پر حرام ہیں

وَ اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ	اور (اسی طرح) قسمت آزمائی کے لیے مخصوص تیر کی لکڑیوں سے جانور کا گوشت تقسیم کرنا۔ یہ تمام اعمال فسق اور گناہ ہیں۔ آج کے دن کفار تمہارے دین (کے زوال) سے مایوس ہو گئے ہیں لہٰذا ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے (میری مخالفت سے) ڈرو۔ آج (غدیر خم اور ولایت علیؑ) کے روز میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور اسلام کو تمہارے لیے (ہمیشہ رہنے والے) دین کے طور پر قبول کر لیا لیکن وہ لوگ کہ بھوک کی حالت میں جن کا ہاتھ کسی اور کھانے تک نہ پہنچے اور وہ گناہ کی طرف مائل بھی نہ ہوں (تو ان کے لئے کوئی حرج نہیں کہ وہ ممنوع گوشت میں سے کھالیں) خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

اس سورہ کی ابتداء میں چوپایوں کا گوشت حلال ہونے کا تذکرہ ہے اور ساتھ ہی یہ فرمایا گیا تھا کہ اس سلسلے میں جن کے بارے میں استثناء ہے ان کا ذکر بعد میں آئے گا۔ زیر بحث آیت میں دراصل وہی استثنائی حکم ہے جس کے بارے میں وعدہ کیا گیا تھا۔ اس میں گیارہ چیزوں کے حرام ہونے کا ذکر ہے ان میں سے بعض کے حرام ہونے کا حکم قرآن کی بعض دیگر آیات میں بھی آیا ہے یہاں ان کی تکرار تاکید کے طور پر ہے۔

1۔ پہلے فرماتا ہے۔ مردار تم پر حرام کیا گیا۔

2۔ اسی طرح خون بھی حرام ہے۔

3۔ سؤر کا گوشت بھی حرام ہے۔

4۔ اور وہ جانور جو زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق بتوں کے نام پر اور اصولی طور پر غیر خدا کے نام پر ذبح کیے جائیں۔ ان کا گوشت بھی حرام ہے۔

ان چار چیزوں کی تحریم اور اس کے فلسفہ کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد اول میں ہم کافی بحث کر چکے ہیں (اردو ترجمہ صفحہ ۴۱۰)۔

5۔ نیز وہ جانور بھی کہ جن کا گلا گھونٹ دیا جائے، حرام ہیں۔ چاہے خود بخود ایسا ہو یا پھندے کے سبب ہو یا کوئی انسان ایسا کام انجام دے۔ جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں رواج تھا کہ بعض اوقات کسی جانور کو دو لکڑیوں یا درخت کی دو شاخوں میں سختی سے دباتے تھے یہاں تک کہ وہ مر جاتا تھا اور پھر اس کا گوشت استعمال کرتے تھے۔

بعض روایات میں ہے کہ خاص طور پر مجوسی ایسا کرتے تھے کہ جانور کا گلا گھونٹ کر مارتے اس کے بعد اس کا گوشت کھاتے لہٰذا ممکن ہے کہ آیت کا ان کے اس طریقے کی طرف بھی اشارہ ہو۔

6۔ اور وہ جانور بھی حرام ہیں جو تشدد اور مار پیٹ سے مر جائیں یا بیماری کی وجہ سے مر جائیں۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ عربوں میں رواج تھا کہ وہ بعض جانوروں کو بتوں کی خاطر اس قدر مارتے کہ وہ مر جاتے، اور وہ اسے ایک طرح کی عبادت سمجھتے تھے۔

7۔ اور وہ جانور بھی حرام ہیں جو بلندی سے گر کر مر جائیں۔

8۔ نیز وہ جانور جو سینگ مارنے سے مر جائیں ان کا گوشت بھی حرام ہے۔

9۔ اور وہ جانور بھی حرام ہیں جو درندوں کے حملے کی وجہ سے مر جائیں۔

ان آخر والے پانچ قسم کے جانوروں کے گوشت کی حرمت کا ایک فلسفہ ممکن ہے یہ ہو کہ ان سے کافی مقدار میں خون نہیں نکلتا۔ کیونکہ جب تک گردن کی اصلی رگیں نہ کاٹی جائیں اس وقت تک خون کی کافی مقدار نہیں نکلتی اور ہم جانتے ہیں کہ خون طرح طرح کے جراثیم کا مرکز ہوتا ہے اور جانور کے مرتے ہی سب سے پہلے خون میں بدبو پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایسے گوشت میں ایک طرح کا زہریلا پن زیادہ ہوتا ہے، علاوہ ازیں ذبح کرنے میں خدا کا نام لیا جاتا ہے اور قبلہ رو ہو کر ذبح کیا جاتا ہے اس طرح سے جو معنوی پہلو پیدا ہوتا ہے وہ مذکورہ بالا صورتوں میں نہیں ہے۔

لیکن اگر جانور کے مرنے سے پہلے ان تک پہنچ جائیں اور آداب اسلامی کے مطابق اسے ذبح کرلیں اور اس کا خون کافی مقدار میں نکل آئے تو وہ حلال ہو جائے گا۔ اسی لیے مندرجہ بالا مواقع کی حرمت کے بعد فرمایا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ استثناء صرف آخری قسم یعنی ''وَمَا اَکَلَ السَّبُعُ '' کے بارے میں ہے لیکن اکثر مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ تمام قسموں کے بارے میں ہے اور یہی بات زیادہ قرینِ حقیقت ہے۔

ممکن ہے سوال کیا جائے کہ جب آیت کی ابتداء میں ''میتۃ'' کہہ دیا گیا ہے تو پھر ان مواقع کا ذکر کیوں کیا گیا ہے اور کیا یہ سب ''میتۃ'' کے مفہوم میں داخل ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ فقہی اور شرعی لحاظ سے ''میتة'' کا ایک وسیع مفہوم ہے اس لحاظ سے جو بھی حیوان شرعی طریقے سے ذبح نہ ہو وہ اس کے مفہوم میں داخل ہے لیکن لغت میں عموماً ''میتة'' اس جانور کو کہتے ہیں جو خود بخود مر جائے اس لیے مندرجہ بالا مواقع ''میتة'' کے لغوی معنی میں داخل نہیں ہیں اور نہیں تو کم از کم اس کا احتمال ہے کہ داخل نہ ہوں۔ لہٰذا ان کی صراحت کی ضرورت تھی۔

10۔ زمانہ جاہلیت میں بت پرستوں نے کچھ پتھر خانہ کعبہ کے گرد نصب کر رکھے تھے ان کی کوئی خاص شکل وصورت نہ تھی۔

انہیں ''نصب'' کہتے تھے۔ان کے سامنے قربانی کرتے تھے اور قربانی کا خون اس پر مل دیتے تھے ان کے اور دیگر بتوں کے درمیان فرق یہ تھا کہ دیگر بتوں کی کوئی مخصوص شکل ہوتی تھی۔لیکن ''نصب'' کی کوئی خاص صورت نہ ہوتی تھی۔اسلام نے زیرِنظر آیت میں ایسی قربانی کے گوشت کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔واضح ہے کہ ایسے گوشت کی حرمت اخلاقی اور معنوی پہلو رکھتی ہے نہ کہ مادی اور جسمانی۔درحقیقت یہ'' وَمَا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ بِهٖ'' کی دو اقسام میں سے ہے۔

11۔جانوروں کی ایک اور طرح کی حرمت بھی زیرِنظر آیت میں آئی ہے اور وہ ہے قسمت آزمائی کے طور پر ذبح ہونے والے جانور۔ہوتا یہ تھا کہ دس آدمی آپس میں شرط لگاتے تھے اور ایک جانور خرید کر اسے ذبح کرتے تھے پھر تیر کی دس لکڑیاں جن میں سے سات پر'' کامیاب'' اور تین پر'' ناکام'' لکھا ہوتا تھا ایک مخصوص تھیلے میں رکھ دیتے تھے پھر قرعہ اندازی کی صورت میں ان دس آدمیوں میں سے ایک ایک کے نام پر ایک تیر باہر نکالتے جن سات لکڑیوں پر'' کامیاب'' لکھا ہوتا وہ جس جس کے نام نکلتیں اسے دے دیتے اور وہ گوشت کا ایک حصہ اٹھا لیتا اور اسے اس کے بدلے کچھ نہ دینا پڑتا۔دوسری طرف وہ تین افراد جن کے نام'' ناکام'' والی لکڑیاں نکلتیں ان میں سے ہر ایک کے لیے لازمی ہوتا کہ وہ اس جانور کی ایک تہائی قیمت ادا کرے۔جبکہ گوشت کا بھی اسے کوئی حصہ نہ ملتا۔ان لکڑیوں کو ''ازلام'' کہتے ہیں۔''ازلام''''زلم''(بروزن''قلم'') کی جمع ہے۔اسلام نے ایسے گوشت کا کھانا حرام قرار دے دیا۔یہ حرمت اس بنا پر نہیں کہ اصل گوشت حرام ہے بلکہ اس لیے کہ یہ کام قمار بازی اور قسمت آزمائی (لاٹری وغیرہ) کا پہلو لیے ہوئے ہے قرآن فرماتا ہے۔

واضح ہے کہ قمار بازی وغیرہ کی حرمت جانوروں کے گوشت سے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر جگہ اور ہر صورت میں قمار بازی ممنوع ہے اور اس کے مفہوم میں تمام نقصان دہ امور، بے مقصد کام اور بیہودہ پروگرام شامل ہیں آخر میں ان احکامِ حرمت کی تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے۔یہ تمام احکام فسق ہیں اور اطاعت پروردگار کی حدود سے خارج ہیں۔

گوشت کے استعمال میں اعتدال

مندرجہ بالا تمام بحث سے اور دیگر اسلامی مصادر سے معلوم ہوتا ہے کہ گوشت سے استفادہ کے بارے میں اسلام کی روش اس کے دیگر احکام کی طرح اعتدال پر مبنی ہے۔نہ زمانہ جاہلیت کی طرح ہے کہ وہ تو گوہ، مردار، خون وغیرہ سب کھا جاتے تھے، نہ آج کے بہت سے مغربی ممالک کی طرح ہے جہاں کے لوگ کیکڑا اور کیڑے مکوڑے تک کھانے سے نہیں کتراتے اور نہ ہی اسلام کا طریقہ ہندوؤں کا سا ہے جنہوں نے گوشت کھانا مطلقاً ممنوع قرار دے رکھا ہے بلکہ ان جانوروں کا گوشت کھانا حلال قرار دیا ہے جن کی غذا پاک ہے اور جو باعث تنفر نہیں اور افراط وتفریط کے راستے پر خط بطلان کھینچ دیا ہے اور مختلف قسم کا گوشت کھانے کے لیے شرائط معین کر دی ہیں۔

مندرجہ بالا احکام کے بعد زیر بحث آیت میں دو معنی خیز جملے نظر آتے ہیں پہلے فرمایا گیا ہے آج کے دن کافر تمہارے دین سے مایوس ہو گئے ہیں لہٰذا اب ان سے نہ ڈرو اور صرف میری مخالفت سے ڈرو۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔ آج کے دن میں نے تمہارے دین اور آئین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور اسلام کو تمہارے دین کے طور پر قبول کر لیا۔

دین کس روز اپنے کمال کو پہنچا

یہاں تک ایک اہم بحث سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ ''اَلْیَوْمَ'' (یعنی۔۔۔آج کا دن) جس کا مندرجہ بالا آیت کے دو جملوں میں ذکر ہے، کون سا دن ہے؟

ایک احتمال جو تمام شیعہ مفسرین نے اپنی کتب میں پیش کیا ہے اور متعدد اہل سنت وشیعہ روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔ نیز آیت کے مضامین اس سے بھی مناسبت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے مراد غدیر خم کا دن ہے، جس روز پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو باقاعدہ اپنی جانشینی کے لیے مقرر کیا تھا۔ یہی وہ روز تھا جب دین اسلام کامل ہوا اور کفار مایوسیوں کے سمندر میں ڈوب گئے۔ کیونکہ انہیں توقع تھی کہ دین اسلام کا قیام بس ایک شخص سے مربوط ہے اور پیغمبر اسلام کے بعد صورتِ حال پھر پرانی ڈگر پر لوٹ آئے گی اور اسلام خود بخود ختم ہو جائے گا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ایک ایسا شخص پیغمبر کی جانشینی کے لیے منتخب ہوا ہے جو علم وتقویٰ اور قدرت وعدالت کے لحاظ سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بے نظیر ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں سے اس کی بیعت لے لی ہے تو وہ اسلام کے بارے میں یاس وناامیدی کا شکار ہو گئے وہ سمجھ گئے کہ اس دین کی جڑیں مضبوط اور پائیدار ہیں۔

ایک جاذب نظر نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا چاہئے یہ ہے کہ قرآنِ حکیم سورہ نور آیہ ۵۵ میں کہتا ہے۔

تم میں سے وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں اور انہوں نے اعمالِ صالح انجام دیئے ہیں خدا نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ انہیں روئے زمین پر خلیفہ بنا دے گا۔ جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو اس نے خلیفہ بنایا ہے (نیز یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ) جس دین کو ان کے لیے پسند کیا ہے اسے محکم ومستقر کرے گا اور خوف کے بعد انہیں امن دے گا۔

اس آیت میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو دین ان کے لیے ''پسند'' کیا ہے اسے روئے زمین پر مستقر اور محکم کرے گا۔ یہ بات پیش نظر رکھتے ہوئے کہ سورہ نور، سورہ مائدہ سے پہلے نازل ہوئی ہے اور ''رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلاَمَ دِیْنًا'' کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو زیر بحث آیت میں ولایت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوا ہے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسلام اس صورت میں روئے زمین پر مستحکم ہو سکتا ہے جب ''ولایت'' کے ساتھ منسلک ہو۔ کیونکہ یہ وہی اسلام ہے جسے خدا نے ''پسند'' کیا ہے اور اس کے استقرار و استحکام کا وعدہ کیا ہے۔ واضح تر الفاظ میں اسلام اسی صورت میں عالمگیر ہو سکتا ہے جب وہ ولایت اہل بیت علیہم السلام کے مسئلے سے جدا نہ ہو۔

سورہ نور کی مذکورہ آیت اور زیر بحث آیت کو منضم کرنے سے جو دوسرا مطلب سامنے آتا ہے یہ ہے کہ سورہ نور کی آیت میں باایمان افراد سے تین وعدے کیے گئے ہیں۔

پہلا۔ روئے زمین پر خلافت

دوسرا۔ عبادت پروردگار کے لیے امن وامان اور

تیسرا۔ اس دین کا استحکام کہ جو خدا کا پسندیدہ ہے۔

یہ تین وعدے غدیرِ خم کے روز آیہ "اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ" کے نزول کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچے، کیونکہ ایمان وعمل صالح کا کامل نمونہ یعنی۔ علی علیہ السلام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی کے لیے منصوب اور مقرر ہوئے اور "اَلۡیَوۡمَ یَئِسَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ دِیۡنِکُمۡ" کے ذریعے مسلمانوں کو نسبتاً امن نصیب ہوا۔ نیز "رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا" کے ذریعے پروردگار کا پسندیدہ دین مسلمانوں میں مستحکم ہوا۔

اضطراری کیفیت میں حرام گوشت کا حکم

آیت کے آخر میں پھر حرام گوشت سے مربوط مسائل کا ذکر ہے یہاں اضطراری صورت کے لیے حکم بیان کیا گیا ہے اور جو لوگ بھوک کی حالت میں حرام گوشت کھانے پر مجبور ہو جائیں جبکہ وہ گناہ کی طرف رغبت نہ رکھتے ہوں تو پھر یہ ان کے لیے حلال ہے کیونکہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے اور ضرورت کے وقت وہ اپنے بندوں کو مشقت میں نہیں ڈالتا اور نہ انہیں اس پر سزا دیتا ہے۔

(۴) یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَاۤ اُحِلَّ لَهُمۡ ؕ قُلۡ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ۙ وَ مَا عَلَّمۡتُمۡ مِّنَ الۡجَوَارِحِ مُکَلِّبِیۡنَ تُعَلِّمُوۡنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَکُمُ اللّٰهُ ۫ فَکُلُوۡا مِمَّاۤ اَمۡسَکۡنَ عَلَیۡکُمۡ وَاذۡکُرُوا اسۡمَ اللّٰهِ عَلَیۡهِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ	تم سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کون سی چیزیں حلال کی گئی ہیں، کہہ دو کہ پاکیزہ چیزیں تمہارے لیے حلال کی گئی ہیں۔ نیز ان شکاری جانوروں کا شکار (بھی تمہارے لیے حلال ہے) جنہیں تم نے وہ کچھ سکھایا جس کی خدا نے تمہیں تعلیم دی تھی۔ بس جو کچھ یہ جانور تمہارے لیے (شکار کرتے ہیں اور) روک رکھتے ہیں وہ کھالو اور (جب جانور کو شکار کے لیے چھوڑو (تو) اس پر خدا کا نام لیا کرو اور خدا سے ڈرو کیونکہ خدا جلد حساب لینے والا ہے۔

شانِ نزول

اس آیت کے بارے میں کئی ایک شانِ نزول ذکر کی گئی ہیں ان میں سے زیادہ مناسب یہ ہے:

زید الخیر اور عدی بن حاتم جو صحابیِ رسول تھے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ ہم کچھ لوگ ہیں جو شکاری کتوں اور بازوں کی مدد سے شکار کرتے ہیں، اور ہمارے شکاری کتے حلال جنگلی جانوروں کو پکڑ لیتے ہیں ان میں سے بعض تو زندہ ہمارے ہاتھ لگ جاتے ہیں اور ہم انہیں ذبح کر لیتے ہیں لیکن ان میں سے بعض کتوں کی وجہ سے

مارے جاتے ہیں اور ہمیں انہیں ذبح کرنے کا موقع نہیں ملتا ہم جانتے ہیں کہ خدا نے مردار کا گوشت حرام قرار دیا ہے اب ہماری کیا ذمہ داری ہے؟

اسی سلسلے میں زیرِنظر آیت نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا گیا۔

تفسیر

حلال شکار

گذشتہ دو آیات میں حرام و حلال گوشت کے بارے میں احکام بیان ہو چکے ہیں یہاں ان میں سے کچھ مزید احکام کا تذکرہ ہے اس سلسلے میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا گیا ہے تم سے کھانے والی چیزوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ پھر پیغمبر اکرمؐ سے فرمایا گیا ہے پہلے تو ان سے کہو کہ ہر پاکیزہ چیز تمہارے لیے حلال ہے۔ یعنی اسلام نے جو کچھ حرام قرار دیا ہے وہ ناپاک ہے اور جنائث کے زمرے میں آتا ہے اور قوانینِ الٰہی کسی ایسی چیز کو کبھی حرام قرار نہیں دیتے جو پاکیزہ ہو اور فطری طور پر نوعِ بشر کے فائدے اور نفع کے لیے پیدا کی گئی ہو لہٰذا حقیقی شریعت قوانین تکوین سے ہمیشہ ہم آہنگ ہوتی ہے۔

پھر شکار کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ تمہارے سدھائے ہوئے یعنی جنہیں تم نے وہ کچھ سکھایا ہے جس کی خدا نے تعلیم دی ہے ان شکاری جانوروں کا شکار تمہارے لیے حلال ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جس جانور کو کتے شکار کرتے ہیں اگر وہ زندہ ہاتھ آ جائے تو اسے آدابِ اسلامی کے مطابق ذبح کیا جانا چاہئے، لیکن شکاری کے پہنچنے سے پہلے اس کی جان نکل جائے تو وہ حلال ہے اگرچہ اسے ذبح نہیں بھی کیا گیا۔

اس کے بعد ایسے شکار کی حلیت میں شرائط میں سے دو کا ذکر کیا گیا ہے اس شکار کو جسے شکاری کتے تمہارے لیے روکے رکھیں، کھالو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر شکاری کتے اس بات کے عادی ہوں کہ اپنے شکار کا کچھ حصہ کھا لیتے ہیں اور کچھ چھوڑ دیتے ہوں تو ایسا شکار حلال نہیں ہے اور وہ ''و ما اکل السبع'' کے زمرے میں داخل ہو جاتا ہے جس کا گذشتہ آیت میں ذکر ہے۔ حقیقت میں ایسا کتا نہ تو تعلیم یافتہ ہے اور نہ اس سے جو کچھ بچا رکھا ہے وہ ''عَلَیْکُمْ'' (تمہارے لیے) کا مصداق ہے۔

خلاصہ یہ کہ ان کی ایسے تربیت ہونا چاہئے کہ وہ اپنا شکار کھائیں نہیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ جب شکاری کتے کو چھوڑا جائے تو خدا کا نام لیا جائے۔

آخر میں ان تمام احکام کا احترام کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے۔ خدا سے ڈرو کیونکہ وہ سریع الحساب ہے۔

(۵)اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ وَ لَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۫ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۧ	آج کے دن پاکیزہ چیزیں تمہارے لیے حلال ہو گئی ہیں (اوراسی طرح) اہلِ کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہےاورتمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے نیز مسلمانوں میں پاک دامن عورتیں اور اہلِ کتاب میں سے پاک دامن عورتیں حلال ہیں جبکہ ان کا حق مہرادا کر دواور پاک دامن رہو نیز پوشیدہ طور پراور غیر شرعی طریقے سے یاری نہ لگاؤ، اور جوشخص اس چیز سے کفر اختیار کرے کہ جس پر ایمان لانا چاہیئے ، اس کے اعمال باطل اور بے اثر ہو جاتے ہیں اور آخرت میں وہ زیاں کاروں میں سے ہوگا۔

تفسیر

اہلِ کتاب کا کھانا کھانا اوران میں شادی بیاہ کرنا

یہ آیت گذشتہ آیات کے مباحث کی تکمیل کرتی ہے، پہلے فرمایا! آج کے دن سے پاکیزہ چیزیں تمہارے لیے حلال ہوگئی ہیں اوراہل کتاب کے کھانے تمہارے لیےاورتمہارے کھانے ان کے لیے حلال ہیں۔

غیر مسلم عورتوں سے شادی

اہل کتاب کے کھانے کی حلیت کا حکم دینے کے بعد آیت میں پاکدامن اہلِ کتاب عورتوں سے شادی بیاہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔تمہارے لیے مسلمان اوراہلِ کتاب پاکدامن عورتیں حلال ہیں اورتم ان سے شادی کر سکتے ہو بشرطیکہ ان کا حق مہرانہیں ادا کردو۔اور یہ بھی شرط ہے کہ شادی مشروع اور جائز طریقے سے ہو نہ کہ کھلے بندوں زنا ہو یامخفی یاری لگاتے پھرو۔

درحقیقت آیت کا یہ حصہ بھی غیر مسلم عورتوں سے مسلمانوں کی شادی بیاہ کے سلسلے میں پابندیوں میں کمی کے لیے ہے اس میں اہل کتاب عورتوں سے مسلمانوں کی شادی بیاہ پر پابندیوں میں کمی کے لیے ہے اس میں اہل کتاب عورتوں سے مسلمان مردوں کی شادی کومشروط طور پر جائز قرار دیا گیا ہے(تفصیل کے لئے فقہی کتب سے رجوع کریں)۔

یہ بات بنا کہے نہ رہ جائے کہ آج جبکہ زمانہ جاہلیت کی بہت سی رسمیں زندہ ہو چکی ہیں یہ نظریہ بھی وجود میں آ چکا ہے کہ غیر شادی شدہ افراد کے لئے عورت یا مرد سے دوستانہ تعلقات میں نہ صرف مخفی صورت میں بلکہ کھلے بندوں بھی کوئی حرج نہیں۔درحقیقت

آج کی دنیا نے گناہ اور جنسی بے راہ روی میں زمانہ جاہلیت سے بھی قدم آگے بڑھا لیا ہے کیونکہ اس دور میں تو مخفی تعلقات کو جائز سمجھا جاتا تھا لیکن آج علی الاعلان ایسی دوستی کو جائز قرار دیا جاتا ہے یہاں تک کہ انتہائی بے شرمی سے اس پر فخر بھی کیا جاتا ہے یہ رسوا کن رسم جو واضح اور شرمناک بدکاری ہے مغرب کی طرف سے مشرق کے لئے منحوس سوغات ہے یہ بہت سی بدبختیوں اور جرائم کا سرچشمہ ہے۔

مندرجہ بالا سہولتیں جو کہ اہل کتاب سے معاشرت اور ان کی عورتوں سے ازدواج کرنے کے بارے میں ہیں جن سے ممکن ہے کہ بعض لوگ غلط فائدہ اٹھائیں اور شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کی طرف کھنچے چلے جائیں لہٰذا آیت کے آخر میں مسلمان کو تنبیہ کی گئی ہے کہ جو شخص ان چیزوں سے کفر اختیار کرے کہ جن پر ایمان لانا چاہئے اور مومنین کا راستہ چھوڑ کر کفار کی راہ اختیار کرلے اس کے اعمال برباد ہو جائیں گے اور آخرت میں وہ زیاں کاروں میں سے ہوگا۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ مذکورہ سہولتیں تمام تمہاری زندگی کی کشائش و آرام کے علاوہ اس چیز کا باعث بننا چاہیں کہ تم ان بے گانوں میں اثر و نفوذ پیدا کرو نہ یہ کہ تم ان کے زیر اثر ہو جاؤ اور اپنے دین سے دستبردار ہو جاؤ کیونکہ اس صورت میں تمہاری سزا بہت سخت ہوگی۔

(٦) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّ لٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ	اے ایمان والو! جب تم نماز کے لئے اٹھ کھڑے ہو تو اپنے چہرے اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولو اور سر اور پاؤں کا مفصل (یا ابھری ہوئی جگہ تک) مسح کرو اور اگر حالت جنب میں ہو تو غسل کرو اور اگر بیمار ہو یا مسافر ہو تم میں سے کوئی (قضائے حاجت) کی پست جگہ سے آیا ہے یا عورتوں سے مباشرت کے لئے لمس کیا ہو اور غسل یا وضو کے لئے پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمّم کرو اور اس مٹی سے چہرے کے اوپر پیشانی پر اور ہاتھوں پر مسح کرو خدا نہیں چاہتا کہ تمہارے لیے مشکل پیدا کرے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کرے شاید تم اس کا شکر ادا کرو۔

تفسیر

جسم اور روح کی پاکیزگی

گذشتہ آیات میں جسمانی پاکیزگی اور مادی نعمات کے بارے میں بحثیں تھیں زیر نظر آیت میں روحانی پاکیزگی سے متعلق

گفتگو ہے اس میں ان امور کا تذکرہ ہے جو روحانی طہارت کا باعث ہیں اس میں وضو غسل اور تیمّم کے احکام ہیں اور روح کی صفائی کا باعث ہیں پہلے تو اہل ایمان سے خطاب کرتے ہوئے احکام وضو بیان کیے گئے ہیں اے ایمان والو! جب نماز کے لئے کھڑے ہو جاؤ تو اپنے چہرے اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوؤ اور سر کے ایک حصے کا اور اسی طرح پاؤں کا مفصل (یا ابھری ہوئی جگہ تک) مسح کرو۔

آیت میں وضو میں دھونے کے لئے چہرے کی حدود کا ذکر نہیں لیکن روایات اہل بیت علیہم السلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وضو کرنے کا طریقہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

اس کے بعد غسل کے بارے میں حکم ہے فرمایا گیا ہے اگر مجنب ہو تو غسل کرو۔ واضح ہے کہ ''فَاطَّهَّرُوا'' سے مراد پورے جسم کا دھونا ہے۔

''حتی تغسلوا''

جیسا کہ تفسیر نمونہ جلد۳ میں سورہ نساء آیہ۴۳ کے ضمن میں نشاندہی کی جا چکی ہے کہ لفظ جنب مصدر ہے جو اسم فاعل کے معنی میں آیا ہے دراصل اس کا مطلب ہے دور ہونے والا اس کی وجہ یہ ہے کہ مجنب کو اس حالت میں نماز کی ادائیگی، مسجد میں توقف اور اس طرح کے دیگر کاموں سے دوری اختیار کرنا چاہئے۔

قرآن مندرجہ بالا آیت میں کہتا ہے نماز کے وقت مجنب ہو جاؤ تو غسل کرو ممکن ہے اس سے یہ بھی اخذ کیا جا سکے کہ غسل جنابت وضو کا بھی جانشین ہے اس کے بعد تیمّم کا حکم بیان کیا گیا ہے اگر نیند سے اٹھے ہو اور نماز کا ارادہ رکھتے ہو اور بیمار یا مسافر ہو یا قضائے حاجت سے لوٹے ہو یا عورتوں سے جنسی ملاپ کر چکے ہو اور پانی تک تمہاری رسائی نہیں ہے تو پاک مٹی سے تیمّم کرلو۔

اس کے بعد تیمّم کا طریقہ بیان کیا گیا ہے اس کے ذریعے اپنے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرو۔

آیت کے آخر میں یہ بات واضح کرنے کے لئے مذکورہ احکام میں کوئی سختی نہیں ہے بلکہ وہ سارے احکام مصلحتوں اور حکمتوں کی بنا پر نافذ کیے گئے ہیں فرمایا گیا ہے خدا نہیں چاہتا کہ تمہیں مشقت اور زحمت میں ڈال دے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک و پاکیزہ رکھے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے تاکہ تم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔

دراصل اس جملے میں اس حقیقت کی تاکید کی گئی ہے کہ تمام خدائی احکام اور اسلامی پروگرام لوگوں کی خاطر اور انہی کے فائدے میں ہیں اور ان سے کچھ اور مقصود نہیں خدا چاہتا ہے کہ ان احکام کے ذریعے لوگوں کو روحانی اور جسمانی طور پر پاکیزہ رکھے۔

ضمناً اس طرف بھی توجہ رہے کہ خدا نہیں چاہتا کہ تمہارے دوش پر کوئی طاقت سے زیادہ اور مشکل ذمہ داری ڈال دے۔

(۷)وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَ مِيۡثَاقَهُ الَّذِىۡ وَاثَقَكُمۡ بِهٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ	اپنے اوپر خدا کی نعمت کو یاد کرو اور اس عہد و پیمان کو بھی یاد کرو جو اس نے تم سے لیا ہے اس وقت جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی اور خدا کی نافرمانی سے ڈرو کیونکہ خدا سینوں کے اندر کے حالات سے آگاہ ہے۔

تفسیر

خدا سے باندھے گئے پیمان

اس آیت میں مسلمانوں کو دوبارہ خدا کی لامتناہی نعمات کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ان نعمات میں سب سے اہم ایمان اسلام اور ہدایت کی نعمت ہے ارشاد فرمایا گیا ہے خدا کی نعمتوں کو یاد رکھو۔

اس سے بڑھ کر کون سی نعمت ہوسکتی ہے اسلام ہی کے زیر سایہ مسلمانوں کو تمام تر نعمتیں افتخارات اور وسائل نصیب ہوئے وہ لوگ جو پہلے بالکل منتشر جاہل گمراہ خوں خوار فاسد اور مفسد تھے اسلام نے انہیں اتحاد اور دانائی عطا کی اور وہ مادی و روحانی نعمتوں سے مالا مال ہوگئے۔اس کے بعد وہ عہد و پیمان جو انہوں نے خدا سے باندھا ہے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے اور میثاق الٰہی کو فراموش نہ کرو جبکہ اس وقت تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

یہ آیت تمام تکوینی اور تشریعی عہد و پیمان جو خدا نے بحکم فطرت لیے ہیں یا رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں سے مختلف موقعوں پر لیے ہیں کی طرف اشارہ ہو۔

آیت کے آخر میں تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: پرہیز گاری اختیار کرو کہ خدا سینوں کے اندر کے اسرار سے آگاہ ہے۔

(۸)يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِيۡنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ ۚ وَ لَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعۡدِلُوۡا ؕ اِعۡدِلُوۡا ۛ هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ	اے ایمان والو! ہمیشہ خدا کے لیے قیام کرو اور عادلانہ گواہی دو اور کسی گروہ کی دشمنی تمھیں ترک عدالت کی طرف نہ لے جائے عدل کرو کہ وہ پرہیز گاری کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو کہ جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔
(۹)وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ	خدا نے ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں سے بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

(۱۰) وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ	اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں اور ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں وہ اہل جہنم ہیں۔

تفسیر

قیام عدالت کا تاکیدی حکم

زیرِ نظر پہلی آیت قیام عدالت کی دعوت دیتی ہے ایسی ہی دعوت کچھ فرق کے ساتھ سورہ نساء آیہ ۱۳۵ میں گذر چکی ہے۔

پہلے تو صاحب ایمان افراد کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے اے ایمان والو! ہمیشہ خدا کے لئے قیام کرو اور عادلانہ گواہی دو۔

اس کے بعد عدالت سے انحراف کے ایک عمومی سبب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ قومی عداوتیں اور شخصی معاملات کہیں تمہیں اجرائے عدالت سے روک نہ دیں اور کہیں دوسروں کے حقوق پر تجاوز کا سبب نہ بن جائیں کیونکہ عدالت ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے۔

مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر دوبارہ عدالت ہی کا حکم دیا گیا ہے عدالت اختیار کرو کہ وہ پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے۔

عدالت چونکہ تقویٰ و پرہیزگاری کا بہترین رکن ہے لہٰذا تیسری مرتبہ بطور تاکید فرمایا گیا ہے خدا سے ڈرو کیونکہ خدا تمہارے تمام اعمال سے آگاہ ہے۔

(۹) اس آیت میں خصوصی احکام کی تاکید اور تکمیل کے لئے سنت قرآن کے مطابق کلی قانون اور اصول کی نشاندہی کی گئی ہے۔ایمان لانے والوں سے خدا بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کرتا ہے۔

اور جو اللہ اور اسکی نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں وہ اہل دوزخ ہیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ بخشش اور اجر عظیم کا ذکر اس آیت میں خدا تعالیٰ کے وعدہ کے طور پر آیا ہے اور فرمایا گیا ہے "وَعَدَ اللّٰهُ" یعنی اللہ کا وعدہ ہے لیکن دوزخ کی سزا کا ذکر عمل کے نتیجہ کی صورت میں ہے فرمایا گیا ہے جن لوگوں کے ایسے اعمال ہوں گے ان کا انجام بھی ایسا ہی ہوگا یہ درحقیقت دار آخرت کی جزا میں خدا کے فضل و رحمت کی طرف اشارہ ہے جو کسی طرح بھی انسان کے ناچیز اعمال کے برابر نہیں ہے جیسا کہ وہاں کی سزا بھی انتقامی پہلو نہیں رکھتی بلکہ خود آدمی کے اعمال کا نتیجہ ہے۔

(۱۱)يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۗ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۫	اے ایمان والو! وہ نعمت یاد کرو جو خدا نے تمہیں بخشی جبکہ (دشمنوں کی) ایک جماعت نے ارادہ کر رکھا تھا کہ تم پر ہاتھ اٹھائے (اور تمہیں ختم کر دے) لیکن خدا نے ان کا ہاتھ تم سے روک دیا خدا سے ڈرو اور مومنین کو چاہئے کہ وہ صرف خدا پر ہی توکل (اور بھروسہ) کریں۔

تفسیر

گذشتہ چند آیات میں نعمات الٰہی کے ذکر کے بعد اس آیت میں پھر روئے سخن مسلمانوں کی طرف ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کچھ اور نعمتیں مسلمانوں کو یاد دلائی ہیں تاکہ ان کے شکرانے کے طور پر فرمان خدا کی اطاعت کریں اور عدالت کے قیام کی کوشش کریں۔ فرمایا گیا ہے اے ایمان لے آنے والو! خدا کی اس وقت کی نعمت کو یاد کرو جب ایک گروہ مصمم ارادہ کر چکا تھا کہ تمہاری طرف ہاتھ بڑھائے اور تمہیں ختم کر دے لیکن خدا نے ان کے شر کو تم سے دور کر دیا۔

بہر حال آیت مسلمانوں کی توجہ ان خطرات کی طرف دلا رہی ہے جن میں ممکن تھا کہ ان کا نام ہمیشہ کے لئے صفحہ ہستی سے مٹ جاتا آیت تنبیہ کر رہی ہے کہ ان نعمتوں کی قدر دانی کرتے ہوئے تقویٰ اختیار کرو خدا پر بھروسہ رکھو اور جان لو کہ اگر تم پرہیزگار رہے تو زندگی میں اکیلے نہیں رہو گے اور وہ دست غیب جو ہمیشہ تمہارا محافظ رہا ہے آئندہ بھی حمایت کرتا رہے گا۔

(۱۲)وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۗ وَ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ ۗ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَ اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَ عَزَّرْتُمُوْهُمْ وَ اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ لَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ	خدا نے بنی اسرائیل سے پیمان لیا اور ان میں سے بارہ رہبر اور سرپرست ہم نے مبعوث کیے اور خدا نے (انہیں) کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم کرو زکوۃ ادا کرو میرے رسولوں پر ایمان لے آؤ اور ان کی مدد کرو اور خدا کو قرض حسنہ دو (اس کی راہ میں ضرورت مندوں کی مدد کرو) تو تمہارے گناہوں کو چھپا دوں گا (بخش دوں گا) اور تمہیں باغات جنت میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں داخل کروں گا لیکن جو شخص اس کے بعد بھی کافر ہو جائے تو وہ راہ راست سے منحرف ہو گیا ہے۔

تفسیر

اس سورہ کی ابتداء میں ایفائے عہد کے مسئلہ کی طرف اشارہ ہو چکا ہے مختلف طریقوں سے اس کی تکرار بھی کی گئی ہے مندرجہ

بالا آیت بھی اسی مناسبت سے ہے شاید یہ پے در پے سب تاکیدیں جو ایفائے عہد کے بارے میں اور پیمان شکنی کی مذمت کے لئے ہیں پیمان غدیر کی اہمیت واضح کرنے کے لئے ہوں جن کا ذکر آیت ۶۷ میں آئے گا۔

زیر بحث آیت کی ابتداء میں ہے ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ وہ ہمارے احکام پر عمل کریں اور اس پیمان کے بعد ہم نے ان کے لئے بارہ رہبر اور سرپرست بھیجے تاکہ ان میں سے ہر ایک بنی اسرائیل کے بارہ گروہوں میں سے ایک ایک کی سرپرستی کرے۔

اس کے بعد بنی اسرائیل سے خدا کے وعدہ کی یوں وضاحت کرتا ہے خدا نے ان سے کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں گا اور تمہاری حمایت کروں گا۔لیکن اس کے لئے چند شرائط ہیں۔

1۔بشرطیکہ تم نماز قائم کرو۔

2۔اور اپنی زکوۃ ادا کرو۔

3۔میرے پیغمبروں پر ایمان لے آؤ اور ان کی مدد کرو۔

4۔اور اس کے علاوہ مستحب مصارف اور انفاق جو خدا کو قرض حسنہ دینے کے مترادف ہیں سے احتراز نہ کرو۔

اگر اس عہد و پیمان پر عمل کرو تو میں تمہارے گذشتہ گناہ بخش دوں گا۔اور تمہیں ان باغات بہشت میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔لیکن جو لوگ کفر، انکار اور عصیان کی راہ اپنائیں مسلم ہے کہ وہ صراط مستقیم سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

(۱۳)فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَ نَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَ لَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ	پس ہم نے ان کی پیمان شکنی کے باعث انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا (یہاں تک کہ) وہ خدا کے کلام میں تحریف کرتے (اور مقام سے بدل دیتے) تھے اور اس کے کچھ حصے کی جو ہم نے انہیں تعلیم دی تھی اسے انہوں نے فراموش کر دیا اور تمہیں ہر وقت ان کی کسی (نئی) خیانت کی خبر ملے گی مگر ان میں سے ایک چھوٹا سا گروہ (ایسا نہیں ہے) پھر بھی ان سے درگذر کرو اور صرف نظر کرو کیونکہ خدا نیک لوگوں کو پسند کرتا ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں بنی اسرائیل سے خدا تعالی کے پیمان لینے کا ذکر ہے اب اس آیت میں ان کی پیمان شکنی اور اس کے

انجام کا تذکرہ ہے فرمایا گیا ہے انہوں نے چونکہ اپنا عہد توڑ ڈالا لہٰذا ہم نے انہیں دھکیل کر اپنی رحمت سے دور کر دیا اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔

درحقیقت انہیں یہ دو سزائیں عہد شکنی کے جرم میں دی گئی ہیں وہ رحمت الٰہی سے بھی دور ہو گئے ہیں اور ان کے افکار و قلوب بھی پتھر ہو گئے ہیں اور میلان و انعطاف کے قابل نہیں رہے۔

اس کے بعد آثار قساوت کی اس طرح تشریح کی گئی ہے وہ کلمات کی تحریف کرتے ہیں اور انہیں ان کے اصلی مقام سے بدل دیتے ہیں۔ اور جو کچھ ان سے کہا گیا تھا اس کا ایک حصہ فراموش کر دیتے ہیں۔

بعید نہیں کہ جو حصہ انہوں نے بھلا دیا وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نشانیاں اور آثار ہوں جن کی طرف قرآن کی دیگر آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

ممکن ہے یہ اس طرف اشارہ ہو جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ایک طویل عرصے تک تورات مفقود رہی پھر چند یہودی علماء نے اسے لکھا فطری امر ہے کہ اس کا بہت سا حصہ تو نابود ہو گیا اور کچھ میں تحریف کر دی گئی یا فراموش ہو گیا لہٰذا یہودیوں کے ہاتھ جو کچھ لگا وہ کتاب موسیٰ علیہ السلام کا کچھ حصہ تھا جس میں بہت سے خرافات ملا دیئے گئے تھے اور انہوں نے یہ حصہ بھی بھلا ڈالا۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے ہمیں ہر روز ان کی ایک نئی خیانت کا پتہ چلتا ہے ہاں البتہ ان میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو ان جرائم سے کنارہ کش ہے لیکن وہ اقلیت میں ہے۔

آخر میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ ان سے صرف نظر کرلیں اور چشم پوشی کریں کیونکہ خدا نیک لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ آیت کے اس حصے سے کیا یہ مراد ہے کہ اس صالح اور نیک اقلیت کے گذشتہ گناہوں سے صرف نظر کریں یا غیر صالح اکثریت کے گناہوں سے آیت کا ظاہر دوسرے مفہوم کو تقویت دیتا ہے کیونکہ صالح اقلیت نے تو کوئی خیانت نہیں کی کہ جس سے عفو و بخشش کی جائے مسلم ہے کہ یہاں درگذر اور عفو ان تکالیف سے متعلق ہے جو انہوں نے ذات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہنچائی تھیں اور یہ معافی اسلام کے اہداف اور اصول سے متعلق نہیں ہے کیونکہ ان میں تو معافی کا کوئی معنیٰ نہیں۔

(۱۴)وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ	اور جو لوگ (مسیح کی دوستی اور) نصرانیت کا دعویٰ کرتے ہیں ان سے بھی ہم نے عہد و پیمان لیا لیکن ان لوگوں نے بھی اس چیز کا ایک حصہ فراموش کر دیا جو انہیں دی گئی تھی لہٰذا ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لئے عداوت ڈال دی اور جو کچھ انہوں نے انجام دیا عنقریب خدا انہیں اس کے (نتائج کے) بارے میں آگاہ کرے گا۔

تفسیر

دائمی دشمن

گذشتہ آیت میں بنی اسرائیل کی عہد شکنی سے متعلق گفتگو تھی اب اس آیت میں نصاریٰ کی پیمان شکنی کا تذکرہ ہے ارشاد فرمایا گیا ہے دعوائے نصرانیت کرنے والوں کی ایک جماعت جس سے ہم نے عہد وفا لیا تھا پیمان شکنی کی مرتکب ہوئی انہیں جو احکام دیئے گئے تھے ان کا ایک حصہ انہوں نے فراموش کر دیا۔

ہاں انہوں نے بھی خدا سے پیمان باندھا تھا کہ وہ حقیقت توحید سے منحرف نہیں ہوں گے اور احکام الٰہی کو فراموش نہیں کریں گے اور آخری پیغمبر کی نشانیاں نہیں چھپائیں گے لیکن انہوں نے بھی یہودیوں کا سا طرز عمل اختیار کر لیا۔

ضمناً توجہ رہے کہ نصاریٰ نصرانی کی جمع ہے عیسائیوں کو اس نام سے کیوں موسوم کیا گیا ہے اس سلسلے میں ممکن ہے کہ کہا جائے جب حضرت مسیح علیہ السلام نے لوگوں میں سے یار و انصار طلب کئے تو انہوں نے آپ کی دعوت قبول کر لی جیسا کہ قرآن میں ہے۔

جیسا کہ عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا کہ کون اللہ کے لئے میری نصرت کرنے والا ہوگا۔ تو حواریوں نے کہا کہ ہم انصار خدا ہیں۔ صف۔۔۱۴)

اس کے بعد قرآن عیسائیوں کے اعمال کے بارے میں کہتا ہے کہ ان کے اعمال کے نتیجے میں ہم نے قیامت تک کے لئے ان میں دشمنی ڈال دی۔

ان کے لئے دوسری سزا کہ جس کی طرف آیت کے آخری حصے میں اشارہ کیا گیا ہے یہ ہے کہ عنقریب خدا انہیں ان کے اعمال کے نتائج کی خبر دے گا اور وہ عملی طور پر اسے اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔

(۱۵) يَٰٓأَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمۡ كَثِيۡرًا مِّمَّا كُنۡتُمۡ تُخۡفُوۡنَ مِنَ الۡكِتٰبِ وَ يَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ ۠ قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ ۙ	اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول آیا ہے جو آسمانی کتاب کے ان بہت سے حقائق کو واضح کرے گا جنہیں تم چھپاتے تھے اور بہت سی چیزوں سے (جن کی عملاً ضرورت نہیں) صرف نظر کرلے گا خدا کی طرف سے تمہارے پاس نور اور واضح کتاب آئی ہے۔
(۱۶) يَّهۡدِىۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ بِاِذۡنِهٖ وَ يَهۡدِيۡهِمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ	جولوگ اس کی خوشنودی کی پیروی کرتے ہیں خدا انہیں سلامتی کے راستوں کی ہدایت کرے گا اور اپنے حکم سے تاریکیوں سے نکال کر انہیں روشنی میں لے جائے گا اور انہیں راہ راست کی ہدایت کرے گا۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں یہود و نصاریٰ اور ان کی عہد شکنیوں کے بارے میں گفتگو تھی اب ان آیات میں ان سے بلاواسطہ خطاب کے ذریعے انہیں اس اسلام کی طرف دعوت دی گئی ہے جس نے ان کے آسمانی دین کو خرافات سے پاک کیا اور انہیں اس راہ راست کی ہدایت کی جارہی ہے جو ہر قسم کے انحراف اور کجروی سے دور ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے اے اہل کتاب ہمارا بھیجا ہوا تمہاری طرف آیا ہے تاکہ آسمانی کتب کے وہ بہت سے حقائق آشکار کرے گا جنہیں تم نے چھپا رکھا تھا جبکہ بہت سی ایسی چیزیں جنہیں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں اور جو گذشتہ ادوار سے مربوط ہیں ان سے صرف نظر کرلے۔

اس کے بعد قرآن مجید کی نصیحت وعظمت اور نوع بشر کی ہدایت و تربیت کے لئے اس کے گہرے اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے خدا کی جانب سے تمہارے پاس نور اور واضح کتاب آئی ہے۔

(۱۶) وہ نور آیا ہے جس کے ذریعے خدا ان لوگوں کو سلامتی کے راستوں کی ہدایت کرتا ہے جو اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے درپے ہیں۔علاوہ ازیں انہیں طرح طرح کی ظلمتوں یعنی شرک، جہالت، پراگندگی اور نفاق جیسی تاریکیوں سے توحید، علم اور اتحاد کے نور کی طرف رہبری کرتا ہے۔ نیز انہیں اس جادۂ مستقیم کی ہدایت کرتا ہے جس میں اعتقاد اور عملی پروگرام کے حوالے سے کوئی کجی اور خامی نہیں ہے۔

(۱۷)لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ‌ؕ قُلۡ فَمَنۡ يَّمۡلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيۡـــًٔا اِنۡ اَرَادَ اَنۡ يُّهۡلِكَ الۡمَسِيۡحَ ابۡنَ مَرۡيَمَ وَ اُمَّهٗ وَمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا‌ؕ وَ لِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا بَيۡنَهُمَا‌ؕ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ‌ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ	یقیناً جنہوں نے کہا کہ مسیح بن مریم خدا ہے وہ کافر ہو گئے ہیں کہہ دو اگر خدا چاہے کہ مسیح بن مریم اس کی ماں اور روئے زمین پر موجود تمام لوگوں کو ہلاک کر دے تو اسے کون روک سکتا ہے؟ (ہاں) آسمانوں زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان کی حکومت خدا ہی کے لئے ہے جو وہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر

کیسے ممکن ہے کہ مسیح علیہ السلام خدا ہو؟

گذشتہ مباحث کی تکمیل کے لئے اس آیت میں حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت کے دعویٰ پر شدید حملہ کیا گیا ہے اور اسے ایک واضح کفر قرار دیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے یہ امر مسلم ہے کہ جن لوگوں نے کہا ہے کہ مسیح بن مریم علیہما السلام خدا ہے وہ کافر ہو گئے ہیں اور درحقیقت انہوں نے خدا کا انکار کیا ہے۔

اس جملے کا مفہوم واضح ہونے کے لئے ہمیں جاننا چاہئے کہ عیسائی خدا کے بارے میں بے بنیاد دعوے کرتے ہیں۔

پہلا............وہ تین خداؤں کا عقیدہ رکھتے ہیں جسے سورہ نساء کی آیت ......۱۷۱ میں باطل قرار دیا گیا ہے:

''نہ کہو کہ تین خدا ہیں اس عقیدے سے باز آ جاؤ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے معبود تو فقط تنہا خدا ہے''

دوسرا............وہ عالم ہستی پیدا کرنے والے کو ان تین میں سے ایک خدا شمار کرتے ہیں اور اسے باپ خدا کہتے ہیں سورہ مائدہ......۷۳ میں قرآن مجید نے اس عقیدے کو بھی باطل قرار دیا ہے

''کافر کہتے ہیں کہ خدا تین میں سے تیسرا ہے جب کہ ایک اکیلے معبود کے علاوہ کوئی معبود نہیں''

تیسرا............وہ کہتے ہیں کہ تینوں خدا تعدد حقیقی کے باوجود ایک ہیں اس عقیدے کو وہ وحدت و تثلیث بھی کہتے ہیں اس بات کی طرف زیر نظر آیت میں اشارہ کیا گیا ہے وہ کہتے ہیں کہ خدا مسیح بن مریم ہے اور مسیح بن مریم خدا ہے اور دونوں روح القدس سے مل کر تین متعدد ذاتیں ہونے کے باوجود ایک ہیں۔

اس کے بعد عقیدہ الوہیت کے بطلان کے لئے قرآن کہتا ہے اگر خدا چاہے کہ مسیح اس کی والدہ اور زمین میں بسنے والے تمام لوگوں کو ہلاک کر دے تو کون اسے روک سکتا ہے۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ مریم دیگر انسانوں کی طرح انسان ہونے سے زیادہ حیثیت نہیں

رکھتے اس بنا پر مخلوق ہونے کے لحاظ سے وہ دیگر مخلوقات کی طرح ہیں لہٰذا نابودی ان کے لئے بھی ہے اور وہ چیز جس کے لیے نیستی کا تصور ہو سکے کس طرح ممکن ہے کہ وہ ازلی و ابدی خدا ہو۔

جو لوگ بغیر باپ کے پیدا ہونے کو مسیح علیہ السلام کی الوہیت کی دلیل سمجھتے ہیں آیت کے آخر میں انہیں جواب دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے وہ سب خدا کے قبضہ قدرت میں ہے وہ جیسی مخلوق چاہے پیدا کرتا ہے وہ چاہے تو کسی کو بغیر ماں باپ کے پیدا کرے جیسے اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا وہ چاہے تو ماں باپ کے توسط سے پیدا کرے جیسے عام انسانوں کو پیدا کرتا ہے اور وہ چاہے تو کسی کو صرف ماں کے توسط سے پیدا کرے جیسے اس نے حضرت مسیح علیہ السلام کو پیدا کیا ہے خلقت کا یہ تنوع کسی اور چیز کا نہیں بلکہ اس کی قدرت کی دلیل ہے اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

(۱۸) وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ۫ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ	یہود و نصاریٰ کہتے تھے کہ ہم خدا کے بیٹے ہیں اور اس کے خاص دوست ہیں ان سے کہہ دو کہ پھر وہ تمہیں تمہارے گناہوں کی سزا کیوں دیتا ہے بلکہ تم اس کی مخلوقات میں سے انسان ہو وہ جسے چاہتا ہے اور اہل پاتا ہے اسے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے (اور مستحق سمجھتا ہے) اسے سزا دیتا ہے آسمانوں اور زمین کی حکومت اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے سب اس کے لئے ہے اور تمام موجودات کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔

تفسیر

اس آیت میں گذشتہ مباحث کی تکمیل کی گئی ہے یہود و نصاریٰ کے بے بنیاد دعوؤں اور موہوم امتیازات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ قرآن ان تمام موہوم امتیازات سے جنگ کرتا ہے اور ہر شخص کا امتیاز صرف ایمان عمل صالح اور اس کی پرہیزگاری میں سمجھتا ہے اسی لیے زیر نظر آیت میں اس دعویٰ کے بطلان کے لئے فرمایا گیا ہے ان سے کہیے کہ اگر ایسا ہے تو پھر وہ تمہیں تمہارے گناہوں کی سزا کیوں دیتا ہے۔

یعنی تم خود اعتراف کرتے ہو کہ تمہیں تھوڑی سی مدت کے لئے سزا دے گا گناہ گاروں والی جو یہ سزا تمہیں ملے گی اس بات کی دلیل ہے کہ تمہارا یہ دعویٰ بے بنیاد ہے کہ تم خدا سے کوئی خاص تعلق رکھتے ہو بلکہ اپنے آپ کو خدا کا بیٹا شمار کرتے ہو علاوہ ازیں تمہاری تاریخ شاہد ہے کہ خود اسی دنیا میں تم کئی سزاؤں اور عذابوں میں مبتلا ہوئے ہو یہ تمہارے دعویٰ کے بطلان پر دوسری دلیل ہے۔

اس مفہوم کی تاکید کے لیے مزید ارشاد ہوتا ہے تم مخلوقات خدا میں سے دیگر انسانوں جیسے انسان ہو۔ یہ سب کے لئے

قانون عام ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے اور اہل سمجھتا ہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اور مستحق پاتا ہے) سزا دیتا ہے۔

علاوہ ازیں سب خدا کی مخلوق اس کے بندے اور مملوک ہیں لہٰذا کسی کو خدا کا بیٹا کہنا منطقی اور اصولی بات نہیں ہے۔ اور آخر کار ساری مخلوق نے اسی کی طرف لوٹ جانا ہے۔

(۱۹) یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّ لَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّ نَذِيْرٌ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ	اے اہل کتاب! ہمارا رسول تمہاری طرف آ گیا ہے اور وہ پیغمبروں کے درمیانی عرصے اور فاصلے کے بعد تمہارے لیے حقائق بیان کرتا ہے کہ مبادا (روز قیامت) کہو کہ ہمارے پاس نہ بشارت دینے والا آیا ہے نہ ڈرانے والا۔ (لہٰذا اب) بشارت دینے والا اور ڈرانے والا (پیغمبر) تمہارے پاس آ گیا ہے اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر

اس آیت میں پھر روئے سخن اہل کتاب کی طرف ہے اے اہل کتاب اے یہود و نصاریٰ ہمارا پیغمبر تمہاری طرف آیا ہے اور اس دور میں جب کہ انبیاء الٰہی کے درمیان فاصلہ اور وقفہ ہو چکا ہے اس نے تمہارے سامنے حقائق بیان کیے ہیں ایسا نہ ہو کہ تم کہو کہ خدا کی طرف سے ہماری طرف کوئی بشارت دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔

بشیر اور نذیر یعنی پیغمبر اسلام ﷺ جنہوں نے صاحب ایمان اور نیک افراد کو خدا کی رحمت و جزا کی بشارت دی اور بے ایمان گنہ گار اور آلودہ افراد کو عذاب الٰہی سے ڈرایا ایسا پیغمبر تمہاری طرف آ گیا ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ یعنی پیغمبروں کو بھیجنا اس کی قدرت کے سامنے آسان کام ہے۔

(۲۰) وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّ اٰتٰكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ	وہ (وقت یاد) کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے قوم! تم پر خدا نے جو نعمت کی ہے اسے یاد رکھو جب اس نے تمہارے درمیان انبیاء مقرر کیے (اور فرعونی استعمار کی زنجیر توڑ دی) اور تمہیں خود اپنا مختار بنا دیا اور تمہیں ایسی کئی چیزیں بخشیں جو عالمین میں سے کسی کو نہیں دیں۔

(۲۱)یٰقَوۡمِ ادۡخُلُوا الۡاَرۡضَ الۡمُقَدَّسَةَ الَّتِیۡ کَتَبَ اللّٰهُ لَکُمۡ وَ لَا تَرۡتَدُّوۡا عَلٰۤی اَدۡبَارِکُمۡ فَتَنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِیۡنَ	(حضرت موسیٰ نے کہا:) اے قوم! سرزمین مقدس میں داخل ہو جاؤ جسے خدا نے تمہارے لیے مقرر فرمایا ہے اور پچھلے پاؤں نہ لوٹ جاؤ (اور پیچھے نہ ہٹو) کہ خسارے میں رہو گے۔
(۲۲)قَالُوۡا یٰمُوۡسٰۤی اِنَّ فِیۡهَا قَوۡمًا جَبَّارِیۡنَ ٭ۖ وَ اِنَّا لَنۡ نَّدۡخُلَهَا حَتّٰی یَخۡرُجُوۡا مِنۡهَا ۚ فَاِنۡ یَّخۡرُجُوۡا مِنۡهَا فَاِنَّا دٰخِلُوۡنَ	وہ کہنے لگے: اے موسیٰ! اس سرزمین میں ظالم رہتے ہیں جب تک وہ نہ نکل جائیں ہم اس میں ہرگز داخل نہ ہوں گے پس اگر وہ اس (سرزمین) سے نکل جائیں تو ہم اس میں داخل ہو جائیں گے۔
(۲۳)قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیۡنَ یَخَافُوۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَیۡهِمَا ادۡخُلُوۡا عَلَیۡهِمُ الۡبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلۡتُمُوۡهُ فَاِنَّکُمۡ غٰلِبُوۡنَ ۚ وَ عَلَی اللّٰهِ فَتَوَکَّلُوۡۤا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ	ان لوگوں میں سے دو شخص جو خدا سے ڈرتے تھے اور خدا نے (عقل ایمان اور شجاعت کی صورت میں) انہیں اپنی نعمت سے نوازا تھا کہنے لگے ان کے شہر کے دروازے میں داخل ہو جاؤ جب تم داخل ہو گئے تو کامیاب ہو جاؤ گے اور خدا پر توکل کرو اگر ایمان رکھتے ہو۔
(۲۴)قَالُوۡا یٰمُوۡسٰۤی اِنَّا لَنۡ نَّدۡخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوۡا فِیۡهَا فَاذۡهَبۡ اَنۡتَ وَ رَبُّکَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوۡنَ	بنی اسرائیل کہنے لگے: اے موسیٰ! جب تک وہ اس میں ہیں ہم ہرگز وہاں نہیں جائیں گے تو اور تیرا پروردگار جائے اور (ان سے) جنگ کرے ہم تو یہیں بیٹھیں گے۔
(۲۵)قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ لَاۤ اَمۡلِکُ اِلَّا نَفۡسِیۡ وَ اَخِیۡ فَافۡرُقۡ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ	موسیٰ نے کہا: پروردگار! میرا تو بس اپنے پر اور اپنے بھائی پر بس چلتا ہے میرے اور اس گنہگار جماعت کے درمیان جدائی ڈال دے۔

(۲۶) قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيۡهِمۡ اَرۡبَعِيۡنَ سَنَةً ۚ يَتِيۡهُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ؕ فَلَا تَاۡسَ عَلَى الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِيۡنَ ۚ	خدا نے موسیٰ سے فرمایا: یہ سرزمین چالیس سال تک ان کے لئے ممنوع ہے (اور یہ اس تک نہیں پہنچ سکیں گے) اور ہمیشہ زمین میں سرگرداں رہیں گے اور اس گنہ گار جمعیت کے (انجام کے) بارے میں غمگین نہ ہو۔

تفسیر

بنی اسرائیل اور سرزمین مقدس

ان آیات میں یہودیوں میں روح حق شناسی بیدار کرنے گذشتہ خطاؤں کے بارے میں ان کے شعور کو دعوت دینے اور انہیں ان خطاؤں کی تلافی پر ابھارنے کے لئے فرمایا گیا ہے وہ وقت یاد کرو جب موسیٰ نے اپنے پیروکاروں سے کہا کہ خدا نے تمہیں جو نعمتیں بخشی ہیں انہیں فراموش نہ کرو۔ واضح ہے کہ "نعمة اللّٰه" کا مفہوم پروردگار کی تمام نعمات پر محیط ہے لیکن یہاں ان تین کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلی نعمت یہ ہے کہ بہت سے انبیاء اور رہبران ان میں پیدا ہوئے یہ دراصل ان کے لئے سب سے بڑی نعمت تھی۔ یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ صرف حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کے زمانے میں ستر سے زیادہ پیغمبر تھے وہ تمام ستر افراد جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ کوہ طور پر گئے تھے انبیاء کے زمرے میں آتے ہیں اسی نعمت کی برکت سے وہ شرک بت پرستی اور گوسالہ پرستی جیسی ہولناک مصیبتوں سے رہا ہوئے اور انہوں نے طرح طرح کے خرافات موہومات قباحتوں اور نجاستوں سے نجات حاصل کی یہ ان کے لیے عظیم ترین نعمت تھی۔

ایک عظیم مادی نعمت تھی جو اپنے مقام پر روحانی نعمتوں کے لئے ایک مقدمہ بھی ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے تمہاری جان و مال اور زندگی کا اختیار خود تمہارے ہاتھ میں دے دیا۔ بنی اسرائیل سالہا سال سے فرعون اور فرعونیوں کی قید و بند کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور ان کے اپنے ہاتھ میں کوئی اختیار نہ تھا ان کیساتھ قیدی جانوروں کا سا سلوک روا رکھا جاتا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام بن عمران نے حکم خدا سے قیام کیا اور ان کے پاؤں میں پڑی غلامی اور استعمار کی زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیا اور انہیں ان کی زندگی کا مختار بنا دیا۔

آیت کے آخر میں کلی طور پر ان اہم نعمتوں کا ذکر ہے جو اس زمانے میں کسی اور کو نہیں دی گئی تھی تمہیں ایسی چیزیں دی گئیں جو عالمین میں سے کسی کو نہیں دی گئی تھیں۔

ایسی طرح طرح کی بہت زیادہ نعمتیں تھیں ان میں سے یہ بھی تھیں کہ انہیں معجزانہ طور پر فرعون سے نجات ملی ان کے لئے دریا شق ہوا اور من و سلویٰ جیسی خاص غذا انہیں میسر آئی اس کی تفصیل سورہ بقرہ آیت ۵۷ کے ذیل میں جلد میں گزر چکی ہے۔

(۲۱) اس کے بعد سرزمین مقدس میں بنی اسرائیل کے حدود کے بارے میں یوں بیان کیا گیا ہے موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ تم سرزمین مقدس میں جسے خدا نے تمہارے لیے مقرر کیا ہے داخل ہو جاؤ اس سلسلے میں مشکلات سے نہ ڈرو فدا کاری سے منہ نہ موڑ واور اگر تم نے اس حکم سے پیٹھ پھیری تو خسارے میں رہو گے۔

(۲۲) بنی اسرائیل نے اس حکم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہی جواب دیا جو ایسے موقع پر کمزور بزدل اور جاہل لوگ دیا کرتے ہیں ایسے لوگ چاہتے ہیں کہ تمام کامیابیاں انہیں اتفاقاً اور معجزانہ طور پر ہی حاصل ہو جائیں یعنی لقمہ بھی کوئی اٹھا کر ان کے منہ میں ڈال دے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے آپ جانتے ہیں کہ اس علاقے میں ایک جابر اور جنگجو گروہ رہتا ہے جب تک وہ اسے خالی کر کے باہر نہ چلا جائے ہم تو اس علاقے میں قدم تک نہیں رکھیں گے اسی صورت میں ہم آپ کی اطاعت کریں گے اور سرزمین مقدس میں داخل ہوں گے۔

بنی اسرائیل کا یہ جواب اچھی طرح نشاندہی کرتا ہے کہ طویل فرعونی استعمار نے ان کی نسلوں پر کیسا منحوس اثر چھوڑا تھا لفظ '' لَنْ '' جو دائمی نفی پر دلالت کرتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ سرزمین مقدس کی آزادی کے لئے مقابلے سے کس قدر خوفزدہ تھے۔

(۲۳) اس کے بعد قرآن کہتا ہے اس وقت اہل ایمان میں سے دو افراد ایسے تھے جن کے دل میں خوف خدا تھا اور اس بنا پر انہیں عظیم نعمتیں میسر تھیں ان میں استقامت و شجاعت بھی تھی وہ دور اندیش بھی تھے اور اجتماعی اور فوجی نقطہ نظر سے بھی بصیرت رکھتے تھے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دفاعی تجویز کی حمایت کی اور بنی اسرائیل سے کہنے لگے تم شہر کے دروازے سے داخل ہو جاؤ اور اگر تم داخل ہو گئے تو کامیاب ہو جاؤ گے۔ لیکن ہر صورت میں تمہیں روح ایمان سے مدد حاصل کرنا چاہیے خدا پر بھروسہ کرو تا کہ اس مقصد کو پالو۔

(۲۴) مگر بنی اسرائیل نے یہ تجویز قبول نہ کی اور ضعف و کمزوری ''جو ان کی روح پر قبضہ کر چکی تھی'' کے باعث انہوں نے صراحت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا جب تک وہ لوگ اس سرزمین پر ہیں ہم ہرگز داخل نہ ہوں گے تم اور تمہارا پروردگار جس نے تم سے کامیابی کا وعدہ کیا ہے، جاؤ اور عمالقہ سے جنگ کرو اور جب کامیاب ہو جاؤ تو ہمیں بتا دینا ہم یہیں بیٹھے ہیں۔

یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنے پیغمبروں کے سامنے جسارت کی انتہا کر دی تھی۔

(۲۵) اس آیت میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان لوگوں سے بالکل مایوس ہو گئے اور انہوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے اور ان سے علیحدگی کے لئے یوں تقاضا کیا پروردگار! میرا تو صرف اپنے آپ پر اور اپنے بھائی پر بس چلتا ہے خدایا ہمارے اور اس فاسق و سرکش گروہ میں جدائی ڈال دے تا کہ وہ اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھ لیں اور ان کی اصلاح ہو جائے۔

البتہ بنی اسرائیل نے جو کام کیا تھا یعنی اپنے پیغمبر کے حکم کی صریح نافرمانی کفر کی حد تک پہنچی ہوئی تھی اور اگر قرآن نے انہیں فاسق کا لقب دیا ہے تو اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ فاسق ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور اس میں ہر طرح کی عبودیت اور خدا کی بندگی سے خارج ہونے کا مفہوم شامل ہے۔

آخر کار حضرت موسیٰؑ کی دعا قبول ہوئی اور بنی اسرائیل اپنے ان برے اعمال کے انجام سے دو چار ہوئے خدا کی طرف سے حضرت موسیٰؑ کو وحی ہوئی یہ لوگ اس مقدس سرزمین سے چالیس سال تک محروم رہیں گے جو طرح طرح کی مادی اور روحانی نعمات سے مالا مال ہے۔ علاوہ ازیں ان چالیس سالوں میں انہیں اس بیابان مین سرگرداں رہنا ہوگا۔ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ سے فرمایا گیا ہے اس قوم کے سر پر جو کچھ بھی آئے وہ صحیح ہے ان کے اس انجام پر کبھی غمگین نہ ہونا۔

(۲۷) وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَ لَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ	آدم کے دو بیٹوں کا قصہ حق کے ساتھ ان کے سامنے پڑھیئے جبکہ ان میں سے ہر ایک نے (پروردگار کے) تقرب کے لئے ایک کام کیا مگر وہ ایک کا عمل تو قبول ہو گیا لیکن دوسرے سے قبول نہ کیا گیا وہ بھائی جس کا (عمل) قبول نہیں ہوا تھا دوسرے بھائی سے کہنے لگا خدا کی قسم میں تجھے قتل کر دوں گا (دوسرے بھائی نے) کہا: (میں نے کونسا گناہ کیا ہے کیونکہ) خدا تو صرف پرہیزگاروں سے قبول کرتا ہے۔
(۲۸) لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ	اگر تو میرے قتل کے لئے ہاتھ بڑھائے تو میں تو تجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا کیونکہ میں عالمین کے پروردگار سے ڈرتا ہوں۔
(۲۹) اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَ اِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۚ	میں تو چاہتا ہوں کہ (تو یہ عمل انجام دے کر) میرا اور اپنا بوجھ اٹھائے ہوئے لوٹے اور (دونوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے) تو جہنمیوں میں سے ہو جائے اور ستمگروں کی یہی سزا ہے۔

تفسیر

روئے زمین پر پہلا قتل

ان آیات میں حضرت آدمؑ کے بیٹوں کا ذکر ہے ان میں سے ایک کے ہاتھوں دوسرے کے قتل کے بارے میں داستان بیان کی گئی ہے ان آیات کا گذشتہ آیات سے شاید یہ ربط ہو کہ بنی اسرائیل کے بہت سے غلط اعمال کا سبب حسد تھا ان آیات

کے ذریعے خدا تعالیٰ انہیں متوجہ کر رہا ہے کہ حسد کا انجام کتنا ناگوار اور ہولناک ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کی وجہ سے ایک بھائی اپنے بھائی کے خون سے بھی ہاتھ رنگین کر لیتا ہے پہلے فرمایا اے پیغمبر! انہیں آدم کے دو بیٹوں کا حقیقی قصہ سنا دیجئے۔

"بالحق"، ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ مذکورہ سرگذشت عہد قدیم (تورات) میں بڑی خرافات کی آمیزش کے ساتھ بیان کی گئی ہے لیکن قرآن میں اس کی حقیقت و واقعیت کو بیان کیا گیا ہے۔

(۲۷) اس کے بعد واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے جب ہر ایک نے تقرب پروردگار کے لئے ایک کام انجام دیا تو ایک کا عمل تو قبول کر لیا گیا لیکن دوسرے کا قبول نہ ہوا۔ اسی وجہ سے جس کا عمل قبول نہ ہوا تھا اس نے دوسرے بھائی کو قتل کی دھمکی دی اور قسم کھا کر کہا کہ میں تجھے قتل کر دوں گا۔

لیکن دوسرے بھائی نے اسے نصیحت کی اور کہا کہ اگر یہ واقعہ پیش آیا ہے تو اس میں میرا کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ اعتراض تو تجھ پر ہونا چاہئے کیونکہ تیرے عمل میں تقویٰ شامل نہیں تھا اور خداوند عالم تو صرف پرہیزگاروں کا عمل قبول کرتا ہے۔ یعنی تیرے عمل میں تقویٰ و پرہیزگاری کی کمی تھی جس وجہ سے تیرا عمل قبول نہ ہوا۔

(۲۸) اس آیت میں مزید کہا کہ حتیٰ اگر تم اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہناؤ اور میرے قتل کے لئے ہاتھ بڑھاؤ تو میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا اور تمہارے قتل کے لئے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا۔ کیونکہ میں تو خدا سے ڈرتا ہوں اور ایسے گناہ سے ہرگز اپنے ہاتھوں کو آلودہ نہیں کروں گا۔

(۲۹) زیر نظر آخری آیت میں ہے کہ علاوہ ازیں میں نہیں چاہتا کہ دوسرے کے گناہ کا بوجھ اپنی گردن پر لا دلوں بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ تم ہی میرے اپنے گناہ کا بار اپنے کندھے پر اٹھا لو۔ کیونکہ اگر واقعی تم اپنی اس دھمکی کو عملی جامہ پہناؤ تو میرے گذشتہ گناہوں کا بوجھ بھی تمہارے کندھوں پر آ پڑے گا اس کی وجہ یہ ہے کہ تم مجھ سے حق حیات چھینو گے تو تاوان بھی تمہی کو دینا ہوگا اور چونکہ تمہارے پاس کوئی صالح اور نیک عمل نہیں ہے لہٰذا میرے گناہوں کا بوجھ بھی تمہیں اپنے کندھوں پر اٹھانا ہوگا۔ اور یہ بہت ہی بڑا خسارا ہے۔

اور مسلم ہے کہ یہ بوجھ اٹھا کر تم جہنمیوں میں سے ہو جاؤ گے اور ستمگروں کی یہی سزا ہے۔

(۳۰) فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ	نفس سرکش نے آہستہ آہستہ اسے بھائی کے قتل کے لئے پختہ کر دیا اور اس نے اسے قتل کر دیا اور وہ زیاں کاروں میں سے ہو گیا۔

(۳۱)فَبَعَثَ اللّٰہُ غُرَابًا یَّبۡحَثُ فِی الۡاَرۡضِ لِیُرِیَهٗ کَیۡفَ یُوَارِیۡ سَوۡءَۃَ اَخِیۡهِ ؕ قَالَ یٰوَیۡلَتٰۤی اَعَجَزۡتُ اَنۡ اَکُوۡنَ مِثۡلَ هٰذَا الۡغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوۡءَۃَ اَخِیۡ ۚ فَاَصۡبَحَ مِنَ النّٰدِمِیۡنَ ۚۛ	اس کے بعد خدا نے ایک کوا بھیجا جو زمین میں کوشش کرتا (اور اسے کھودتا) تا کہ وہ اسے بتائے کہ اپنے بھائی کا جسم زمین میں کیسے دفنائے تو وہ کہنے لگا: وائے ہو مجھ پر کہ میں اس کوے جیسا (بھی) نہیں ہوسکا کہ اپنے بھائی کو دفن کرتا اور آخر کار وہ (رسوائی کے خوف اور وجدان کے دباؤ سے اپنے کام پر) پشیمان ہوا۔

تفسیر

ظلم پر پردہ پوشی

ان آیات میں حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں کا واقعہ ایک بھائی کا دوسرے کے ہاتھوں قتل اور قتل کے بعد کے حالات بیان کیے گئے ہیں پہلے فرمایا سرکش نفس نے بھائی کے قتل کے لئے اسے پختہ کر دیا اور اس نے اسے قتل کر دیا۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے اس کام کے نتیجے میں وہ زیاں کاروں میں سے ہو گیا۔ اس سے بڑھ کر اور کیسا خسارہ ہوگا کہا اس نے وجدان کا عذاب خدا کی طرف سے سزا اور قیامت تک کے لئے اپنے نام پر ننگ و عار خرید لی۔

امام صادق علیہ السلام سے منقول بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قابیل نے جب اپنے بھای کو قتل کر دیا تو اس کی لاش اس نے صحرا میں ڈال رکھی تھی اور اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے زیادہ دیر نہ گذری کہ درندے ہابیل کے جسم کی طرف آنے لگے قابیل ضمیر کے شدید دباؤ کا شکار تھا بھائی کے جسم کو بچانے کے لئے وہ لاش کو ایک مدت تک کندھے پر لیے پھرتا رہا کچھ پرندوں نے پھر بھی اسے گھیر رکھا تھا اور وہ اس انتظار میں تھے کہ وہ کب اسے زمین پر پھینکتا ہے تا کہ وہ لاش پر جھپٹ پڑیں۔

جیسا کہ قرآن کہتا ہے اس موقع پر خدا تعالیٰ نے ایک کوا بھیجا مقصد یہ تھا کہ وہ زمین کھودے اور اس میں دوسرے مردہ کوے کا جسم چھپا دے یا اپنے کھانے کی چیزوں کو زمین میں چھپا دے جیسا کہ کوے کی عادت ہے تا کہ قابیل سمجھ سکے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کس طرح سپرد خاک کرے۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے اس وقت قابیل اپنی غفلت اور جہالت سے پشیمان ہو گیا اور چیخ اٹھا کہ وائے ہو مجھ پر کیا میں اس کوے سے بھی زیادہ ناتواں اور عاجز ہوں مجھ سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ میں اس طرح اپنے بھائی کا جسم دفن کروں۔ بہر حال وہ اپنے کیے پر نادم و پشیمان ہوا جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔

کیا اس کی پشیمانی اس بنا پر تھی کہ اس کا گھٹیا اور برا عمل آخر کار اس کے ماں باپ پر اور احتمالی طور پر جو دوسرے بھائی تھے ان

پرآشکار ہوجائے گا اوروہ اسے بہت سرزنش کریں گے ۔۔۔۔۔۔۔ یا کیا یہ پشیمانی اس بناء پرتھی کہ کیوں میں ایک مدت تک بھائی کی لاش کندھے پر لیے پھرتا رہا اوراسے دفن نہ کیا اور یا پھر کیا یہ ندامت اس وجہ سے تھی کہ اصولی طور پرانسان ہر برا کام انجام دے لینے کے بعد اپنے دل میں ہرطرح کی پریشانی اور ندامت محسوس کرتا ہے لیکن واضح ہے کہ اس کی ندامت کی جو بھی وجہ ہو وہ اس کے گناہ سے توبہ کی دلیل نہیں ہے کیونکہ توبہ یہ ہے کہ ندامت خوف خدا کے باعث اور عمل کے برا ہونے کے احساس کی بناء پر ہو اور یہ احساس اسے اس بات پرآمادہ کرے کہ وہ آئندہ ہرگز ایسا کام نہ کرے۔قرآن میں قابیل کی ایسی کسی توبہ کی نشاندہی نہیں کی گئی۔بلکہ شاید اگلی آیت میں ایسی توبہ کے نہ ہونے کی طرف ہی اشارہ ہے۔

پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث منقول ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

لا تقتل نفس ظلما الا كان على ابن آدم الاول كفل من دمها لانه كان اول من سن القتل.

جس کسی انسان کا بھی خون بہایا جاتا ہے اس کی جوابدہی کا ایک حصہ قابیل کے ذمہ ہوتا ہے کہ جس نے انسان کشی کی اس بری سنت کی دنیا میں بنیاد رکھی تھی۔

(۳۲)مِنْ اَجْلِ ذٰلِکَ ۛ ؕ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَ مَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَیِّنٰتِ٘ ثُمَّ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِکَ فِی الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ	اس بنا پر ہم نے بنی اسرائیل کے لئے یہ قرار دیا کہ جو شخص کسی انسان کو بغیر اس کے کہ وہ ارتکاب قتل کرے اور روئے زمین پر فساد پھیلائے قتل کردے تو یہ اس طرح ہے گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جو کسی ایک انسان کو قتل سے بچا لے تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخشی ہے اور ہمارے رسول واضح دلائل کے ساتھ بنی اسرائیل کی طرف آئے پھر بھی ان میں سے بہت سے لوگوں نے روئے زمین پر ظلم اور تجاوز کیا۔

تفسیر

انسانی رشتہ

حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں کا ذکر کرنے کے بعد اس آیت میں ایک عمومی نتیجہ بیان کیا گیا ہے پہلے ارشاد ہوتا ہے اس بنا پر ہم نے بنی اسرائیل کے لئے یہ قرار دیا کہ جب کوئی انسان کسی شخص کو ارتکاب قتل اور زمین پر فساد پھیلانے کے جرم کے بغیر قتل کر دے تو ایسے ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جو کسی ایک انسان کو موت سے بچالے ایسے ہے گوی اس نے تمام انسانوں کو موت

سے بچالیا۔

یہاں یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ ایک انسان کا قتل سب انسانوں کے قتل کے برابر کیسے ہوسکتا ہے اور اسی طرح ایک انساان کو بچالینا سب کی نجات کیسے قرار پاسکتا ہے۔

بہرحال مذکورہ سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن اس آیت میں ایک اجتماعی اور تربیتی حقیقت بیان کرتا ہے درحقیقت جو شخص کسی بے گناہ کے خون میں ہاتھ رنگتا ہے وہ اس بات پر تیار ہوتا ہے کہ وہ اس مقتول جیسے دیگر بے گناہ انسانوں پر بھی حملہ کر کے انہیں قتل کر دے وہ حقیقت میں ایک درندہ ہے جس کی غذا بے گناہ انسان ہیں ہم جانتے ہیں کہ اس لحاظ سے بے گناہ انسانوں میں کوئی فرق نہیں اسی طرح جو شخص بھی انسانی جذبے اور انسان دوستی کی بنیاد پر ایک انسان کو موت سے نجات دیتا ہے وہ اس بات پر تیار ہوتا ہے کہ ایسا سلوک ہر انسان کے ساتھ کرے وہ بے گناہ انسانوں کی نجات سے لگاؤ رکھتا ہے اس لحاظ سے اس کی نگاہ میں اس انسان میں اور اس انسان میں کوئی فرق نہیں اور قرآن جو یہ کہتا ہے: فَكَأَنَّمَا۔۔۔۔۔ (یعنی۔۔۔ یہ ایسے ہے گویا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک آدمی کی موت یا حیات اگرچہ پورے معاشرے کی موت یا حیات کے برابر نہیں لیکن اس سے شباہت ضروری رکھتی ہے۔

یہ قابل توجہ ہے کہ متعدد روایات میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ آیت ظاہری طور پر اگرچہ مادی موت وحیات کے بارے میں ہے لیکن اس سے زیادہ اہم معنوی موت وحیات ہے یعنی کسی شخص کو گمراہ کرنا یا کسی شخص کو گمراہی سے نجات دلانا کسی نے امام صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر پوچھی تو آپ علیہ السلام نے فرمایا

من حرق او غرق.....ثم سكت........ ثم قال تاويلها الاعظم ان دعاها فاستجاب له

یعنی۔۔۔۔قتل کرنے اور موت سے نجات دینے سے آیت میں مراد جلنے سے نجات یا غرق ہونے سے بچانا وغیرہ ہے۔

پھر امام علیہ السلام خاموش ہو گئے کچھ توقف کے بعد مزید فرمایا

آیت کی سب سے بڑی تاویل اور سب سے بڑا مفہوم یہ ہے کہ دوسرے کو راہ حق کی طرف دعوت دی جائے یا باطل کی طرف اور وہ یہ دعوت قبول کر لے۔

آیت کے آخر میں بنی اسرائیل کی قانون شکنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے ہمارے پیغمبر روشن دلائل کے ساتھ ان کی ہدایت کے لئے آئے لیکن ان میں سے بہت سوں نے قوانین الٰہی کو توڑ دیا اور تجاوز کا راستہ اختیار کیا۔

توجہ رہے کہ ''اسراف'' لغت میں وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں حد سے ایسا تجاوز بھی شامل ہے اگرچہ اکثر اوقات مصارف واخراجات میں تجاوز کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

(۳۳)اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیۡنَ یُحَارِبُوۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ یَسۡعَوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَسَادًا اَنۡ یُّقَتَّلُوۡۤا اَوۡ یُصَلَّبُوۡۤا اَوۡ تُقَطَّعَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ اَرۡجُلُہُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ اَوۡ یُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ ؕ ذٰلِکَ لَہُمۡ خِزۡیٌ فِی الدُّنۡیَا وَ لَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ۙ	جو لوگ خدا اور پیغمبر سے جنگ کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور روئے زمین پر فساد برپا کرتے ہیں اور ڈرا دھمکا کر لوگوں کی جان و مال اور ناموس پر حملہ کرتے ہیں) ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے یا سولی پر لٹکا دیا جائے یا ان کے دائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں کی چار انگلیوں کو کاٹ دیا جائے اور یا انہیں انکی زمین سے جلا وطن کر دیا جائے یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔
(۳۴)اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَقۡدِرُوۡا عَلَیۡہِمۡ ۚ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۠	مگر وہ جوان پر تمہارے ہاتھ ڈالنے سے پہلے توبہ کر لیں اور جان لو کہ خدا ان کی توبہ قبول کر لے گا کیونکہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

شان نزول

اس آیت کی شان نزول کے بارے میں منقول ہے کہ مشرکین کی ایک جماعت خدمت پیغمبر ﷺ میں پہنچی اور یہ لوگ مسلمان ہو گئے لیکن مدینہ کی آب و ہوا انہیں راس نہ آئی ان کے رنگ زرد ہو گئے اور وہ بیمار پڑ گئے پیغمبر ﷺ اسلام نے ان کی صحت کے پیش نظر حکم دیا کہ وہ مدینہ سے باہر ایک صحت افزا صحرائی علاقے میں چلے جائیں جس میں زکوۃ کے اونٹوں کو چرایا جاتا تھا تا کہ اونٹنیوں کا تازہ دودھ بھی انہیں میسر آ سکے وہ صحت مند ہو گئے لیکن پیغمبر اکرم ﷺ کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے انہوں نے مسلمان چرواہوں کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے، ان کی آنکھیں نکال لیں، انہیں قتل کرنا شروع کر دیا، زکوۃ کے اونٹ لوٹ لیے اور اسلام سے خارج ہو گئے پیغمبر اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ انہیں گرفتار کر لیا جائے اور جو سلوک انہوں نے چرواہوں سے کیا ہے قصاص کے طور پر وہی ان سے کیا جائے۔ آنکھیں نکال لی گئیں ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے گئے اور انہیں قتل کر دیا گیا تا کہ دوسرے لوگ اس سے عبرت حاصل کریں اور ایسے انسانیت کش افعال کا ارتکاب نہ کریں زیر نظر آیت ایسے ہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جس میں ان کے بارے میں حکم شریعت بیان کیا گیا۔

تفسیر

لوگوں کی جان و مال پرحملہ کرنے والوں کی سزا

یہ آیت حقیقت میں قتل نفس کے بارے میں جاری بحث کی تکمیل کرتی ہے اس میں مسلمانوں کے خلاف مسلح ہوکر دھمکیاں دیتے ہوئے بلکہ انہیں قتل کر کے ان کا مال واسباب لوٹنے والوں کی نہایت سخت سزا بیان کی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے جولوگ خدااور پیغمبر کے خلاف جنگ کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں یہ ہے کہ ان چار سزاؤں میں سے کوئی ایک ان پر جاری کی جائے۔

پہلی یہ کہ وہ قتل کردیئے جائیں

دوسری یہ کہ انہیں سولی پرلٹکا دیا جائے

تیسری یہ کہ ان کے الٹے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں

چوتھی یہ کہ وہ جس علاقے میں رہتے ہوں انہیں اس سے جلاوطن کردیا جائے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے یہ رسوائی اور سزا تو ان کے لیے دنیا میں ہے لیکن صرف اسی سزا پراکتفانہیں کی جائے گی بلکہ آخرت میں بھی انہیں سخت سزادی جائے گی ''ذٰلِکَ لَھُمۡ خِزۡیٌ فِی الدُّنیَا وَ لَھُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیۡم''اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی حدودداورسزائیں اگر دنیا میں جاری ہوجائیں تو وہ آخرت کی سزاؤں سے مانع نہیں ہیں۔

(۳۴)اس کے بعداس بناء پرکہ لوٹ آنے کا راستہ ایسے خطرناک مجرموں پربھی بند نہ کیا جائے اوراگروہ مائل بہ اصلاح ہو جائیں تو ان کے تلافی اور تجدیدنظر کا راستہ کھلا رکھا جائے ارشاد ہوتا ہے مگر وہ لوگ کہ جو قابو آنے سے پہلے توبہ کرلیں تو عفوالٰہی ان کے شامل حال ہوگا اور جان لو کہ خدا غفور ورحیم ہے۔

توجہ رہے صرف حقوق اللہ میں ان کی سزا توبہ کی صورت میں ساقط ہوجائے گی لیکن حقوق الناس میں صاحبان حق کی رضا کے بغیر ساقط نہیں ہوگی (غور کیجئے گا)

(۳۵)یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابۡتَغُوۡٓا اِلَیۡہِ الۡوَسِیۡلَۃَ وَ جَاھِدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِہٖ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ	اے ایمان والو! اللہ سے ڈرواورقرب خدا کا وسیلہ تلاش کرو اورراہ خدا میں جہاد کروتا کہ فلاح اورنجات پاجاؤ۔

تفسیر

توسل کی حقیقت

اس آیت میں روئے سخن اہل ایمان کی طرف ہے اورنجات کے لئے انہیں تین حکم دیئے گئے ہیں پہلے فرمایا گیا ہے اے

ایمان والو! تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرو۔ اس کے بعد حکم دیا گیا ہے تقرب الٰہی کا وسیلہ اختیار کرو۔ آخر میں راہ خدا میں جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ ان سب احکام پر عمل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم نجات پا جاؤ گے۔

آیت میں لفظ وسیلہ ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے اس کے مفہوم میں ہر وہ کام اور چیز شامل ہے جو پروردگار کی بارگاہ مقدس سے قریب ہونے کا باعث ہو اس میں اہم ترین خدا اور پیغمبر اکرم ﷺ پر ایمان لانا اور جہاد کرنا نیز نماز زکوۃ روزہ اور خانہ خدا کا حج اسی طرح صلہ رحمی راہ خدا میں پنہاں و با آشکار خرچ کرنا اور ایسا ہر اچھا اور نیک کام اس کے مفہوم میں داخل ہے۔

جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں فرمایا ہے۔

ان افضل ما توسل به المتوسلون الى اللّٰه سبحانه و تعالىٰ الايمان به و برسوله و الجهاد فى سبيله فانه ذروة الاسلام و كلمة الاخلاص فانها الفطرة و اقام الصلوة فانها الملة و ايتا ء الزكوة فانها فريضة واجبة و صوم شهر رمضان فانه جنة من العقاب و حج البيت و اعتماره فانهما يقيان الفقر و يرحضان الذنب و صلة الرحم فانها مثراة فى المال ومنساة فى الاجل وصدقة فانها تكفر الخطيئة و صدقة العلانئة فانها تدفع ميتة السوء و صنائع المعروف فانها تقى مصار ع الهوان.

یعنی۔۔۔۔ بہترین چیز جس کے ذریعے اور وسیلے سے تقرب الٰہی حاصل ہوسکتا ہے وہ خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لانا اور جہاد کرنا ہے کہ جو کہ حصار اسلام کی چوٹی ہے اسی طرح جملہ اخلاص ''لااله الا اللّٰه'' کہ جو وہی فطرت توحید ہے اور نماز قائم کرنا کہ جو آئین اسلام ہے اور زکوۃ کہ جو واجب فریضہ ہے اور ماہ رمضان کے روزے کہ جو گناہ اور عذاب خدا کے سامنے سپر ہیں اور حج وعمرہ کہ جو فقر و فاقہ اور پریشانی کو دور کرتے ہیں اور گناہوں کو دھوڈالتے ہیں اور صلہ رحمی کو جو مال وثروت کو زیادہ اور زندگی کو طویل کرتا ہے اور مخفی طور پر خرچ کرنا کہ جو گناہوں کی تلافی کا باعث بنتا ہے اور ظاہری طور خرچ کرنا کہ جو ناگہانی اور بری موت کو دور کرتا ہے اور نیک کام جو انسان کو ذلت وخواری کے گڑھے میں گرنے سے بچاتے ہیں (سب تقرب الٰہی کا وسیلہ ہیں)۔

انبیاء آئمہ اور خدا کے نیک بندوں کی شفاعت بھی کہ جو صراحت قرآنی کے مطابق تقرب الٰہی کا ذریعہ ہے وسیلہ کے وسیع مفہوم میں داخل ہے۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ توسل سے مراد یہ نہیں کہ کوئی شخص پیغمبر ﷺ یا آئمہ علیہم السلام سے حاجت طلب کرے بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان کے مقام ومنزلت کو بارگاہ خدا میں رابطے کا وسیلہ قرار دے یہ درحقیقت خدا کی طرف ہی توجہ کرنا ہے کیونکہ پیغمبر ﷺ کا احترام بھی اس بنا پر ہے کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے تھے اور انہوں نے اسی راہ میں قدم بڑھایا ہے ہمیں ایسے لوگوں پر تعجب ہوتا ہے جو اس قسم کے توسل کو شرک کی ایک قسم خیال کرتے ہیں حالانکہ شرک تو یہ ہے کہ خدا کی صفات اور افعال میں کسی کو خدا کا شریک سمجھا جائے لیکن ایسا توسل جس کا ہم نے ذکر کیا ہے کسی طرح سے بھی شرک سے مشابہ نہیں ہے۔

(۳٦)اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَوۡ اَنَّ لَهُمۡ مَّا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا وَّ مِثۡلَهٗ مَعَهٗ لِيَفۡتَدُوۡا بِهٖ مِنۡ عَذَابِ يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنۡهُمۡ‌ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ	جولوگ کافر ہوگئے ہیں اگر روئے زمین میں جو کچھ ہے اس کے برابر ان کے پاس ہواور وہ روز قیامت سزا سے نجات کے لئے فدیہ کے طور پر دے دیں تو بھی ان سے قبول نہیں کیا جائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔
(۳۷) يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يَّخۡرُجُوۡا مِنَ النَّارِ وَ مَا هُمۡ بِخٰرِجِيۡنَ مِنۡهَا‌ؗ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ مُّقِيۡمٌ	وہ ہمیشہ چاہیں گے کہ آگ سے نکل آئیں لیکن وہ اس سے نکل نہ پائیں گے اور ان کے لئے پائیدار عذاب ہوگا۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں مومنین کو تقویٰ راہ جہاد اور وسیلہ تلاش کرنے کا حکم دیا گیا تھا اب ان دو آیات میں گذشتہ حکم کا سبب بیان کرنے کے حوالے سے بے ایمان اور آلودہ گناہ افراد کے انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے جولوگ کافر ہو گئے ہیں اگر جو کچھ روئے زمین میں ہے اس جتنا سرمایہ رکھتے ہوں اور اسے روز قیامت سے سزا سے نجات کے لئے دے دیں تو ان سے قبول نہیں کیا جائے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

نجات فقط ایمان۔تقویٰ، جہاد اور عمل ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔خواہش بدون عمل کسی کام کی نہیں ہوتی۔اور اگر ایسا ہوتا تو کفار و مشرکین بھی نجات پا جاتے کیونکہ عذاب سے بچنے کی خواہش تو وہ بھی رکھتے ہیں لیکن عملی کوشش کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

(۳۷)اس کے بعد اس سزا کے دائمی ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے وہ ہمیشہ چاہیں گے کہ جہنم کی آگ سے باہر نکل آئیں لیکن نکل نہ سکیں گے اور ان کی سزا باقی اور برقرار رہے گی۔

(۳۸)وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقۡطَعُوۡۤا اَيۡدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ‌ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ	چور مرد اور عورت کا ہاتھ اس کے انجام دیئے گئے عمل کی پاداش میں خدائی سزا کے طور پر کاٹ دو خدا توانا اور حکمت والا ہے۔
(۳۹) فَمَنۡ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِ ظُلۡمِهٖ وَ اَصۡلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوۡبُ عَلَيۡهِ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ	لیکن جو شخص ظلم کرنے کے بعد توبہ،اصلاح اور تلافی کر لے تو خدا اس کی توبہ قبول کر لے گا کیونکہ خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

(۴۰)اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ	کیا تمہیں معلوم نہیں کہ خدا آسمانوں اور زمین کا مالک اور حکمران ہے جسے چاہتا ہے (اور مستحق سمجھتا ہے) سزا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے (اور اہل سمجھتا ہے) بخش دیتا ہے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر

چور کی سزا

قبل ازیں چند آیات میں "محارب" یعنی ڈرا دھمکا کر علی الاعلان مسلح ہو کر لوگوں کی جان و مال اور ناموس کے خلاف حملہ کرنے والے شخص کے بارے میں احکام بیان ہوئے ہیں اسی مناسبت کی بنا پر ان آیات میں چور کو جو مخفی طور پر لوگوں کا مال لے جاتا ہے کے بارے میں حکم بیان ہوا ہے

پہلے فرمایا گیا ہے چور مرد اور چور عورت کا ہاتھ کاٹ دو۔ یہاں چور مرد کو چور عورت پر مقدم رکھا گیا ہے درحالانکہ آیت حد زنا میں عورت کو مرد پر مقدم کیا گیا ہے شاید علت یہ ہو کہ چوری کے سلسلے میں اصلی عامل زیادہ تر مرد ہوتے ہیں لیکن ارتکاب زنا کے موقع پر زیادہ اہم عامل اور محرک بے لگام عورتیں ہوتی ہیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے یہ سزا ان اعمال پر ہے جو انہوں نے انجام دیئے ہیں اور یہ خدا کی طرف سے عذاب ہے "جَزَآءً بِمَا کَسَبَا نَکَالًا مِّنَ اللّٰہِ" اس جملے میں درحقیقت اس طرف اشارہ ہے کہ اول تو یہ سزا ان کے کام کا نتیجہ ہے اور ایسی چیز ہے جو انہوں نے خود اپنے لیے خریدی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ ایک طرح سے پیش بندی اور حق و عدالت کی طرف بازگشت ہے کیونکہ "نکال" کا معنی ہے ایسی سزا جو پیش بندی کے لئے اور ترک گناہ کے مقصد کے لئے ہو۔ دراصل اس کا معنی ہے "لگام" بعد ازاں ہر اس کام کے لئے استعمال ہونے لگا جو انحراف اور کج روی سے روکے۔

آیت کے آخر میں اس لیے کہ مبادہ یہ وہم ہو کہ مذکورہ سزا عادلانہ نہیں فرمایا گیا ہے خدا قادر و توانا ہے لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ وہ کسی سے انتقام لے اور حکیم بھی ہے اس لیے وہ کسی کو بلا وجہ سزا نہیں دے گا۔

(۳۹) اس آیت میں ان کے لئے لوٹ آنے کا راستہ کھولتے ہوئے فرماتا ہے اس ظلم کے بعد جو شخص توبہ کر لے اور اصلاح و تلافی کی راہ اپنائے خدا اسے بخش دے گا کیونکہ وہ بخشنے والا مہربان ہے۔

کیا توبہ کرنے سے صرف اس کا گناہ بخشا جائے گا یا چوری کی سزا (ہاتھ کاٹنا) بھی ساقط ہو جائے گی اس سلسلے میں ہمارے فقہا میں یہی مشہور ہے کہ اگر وہ اسلامی عدالت میں چوری ثابت ہو جانے سے پہلے توبہ کر لے تو چوری کی حد بھی برطرف ہو جائے گی لیکن جب دو عادل گواہوں کے ذریعے اس کا جرم ثابت ہو جائے تو پھر توبہ سے حد ساقط نہیں ہو گی۔

دراصل حقیقی توبہ جس کی طرف آیت میں اشارہ کیا گیا ہے وہ ہے جو عدالت میں ثبوت جرم سے پہلے انجام پائے ورنہ تو ہر چور جب اپنے آپ کو سزا کے سامنے پائے گا توبہ کرے گا اور اس طرح تو کسی پر سزا جاری ہی نہ ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں ''اختیاری توبہ'' وہ ہے جو شرعی عدالت میں جرم ثابت ہونے سے پہلے انجام پائے ورنہ ''اضطراری توبہ'' ہوگی اور اضطراری توبہ تو ایسی ہی ہے جیسے عذاب الٰہی یا آثار موت دیکھ کر کی جائے اور ایسی توبہ کی کوئی قیمت نہیں۔

(۴۰) چوروں کے بارے میں توبہ کا حکم بیان کرنے کے بعد روئے سخن اسلام کے عظیم پیغمبر ﷺ کی طرف کیا گیا ہے فرمایا کیا تمہیں معلوم نہیں کہ خداوند عالم آسمانوں اور زمین کا مالک ہے اور جس طرح مناسب سمجھتا ہے ان میں تصرف کرتا ہے۔ جس شخص کو سزا کا مستحق سمجھتا ہے سزا دیتا ہے اور جسے بخشش کے لائق سمجھتا ہے بخش دیتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

(۴۱) يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَ لَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛۚ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ؕ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَ اِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ؕ وَ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۖۚ وَّ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ	اے خدا کے رسول! وہ لوگ جو زبان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور ان کے دل ایمان نہیں لائے اور وہ راہ کفر میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں تم ان کے بارے میں غم نہ کرو اور یونہی یہودیوں کے بارے میں (جو اسی راہ پر چلتے ہیں) وہ زیادہ آپ کی باتیں سنتے ہیں تا کہ انہیں تمہاری تکذیب کے لئے کوئی بات ہاتھ آ جائے وہ دوسرے لوگوں کے جاسوس ہیں جو (لوگ) خود تمہارے پاس نہیں آئے وہ باتوں کو ان کی جگہ سے بدل دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ (جو ہم چاہتے ہیں) تمہیں دیں اور (محمد تمہاری خواہش کے مطابق فیصلہ کریں) تو اسے قبول کرلو (ورنہ دوری اختیار کرو) اور اس پر عمل نہ کرو اور جسے خدا (اس کے پے در پے گناہوں کی وجہ سے) سزا دینا چاہے تو کوئی اسے بچا نہیں سکتا وہ ایسے لوگ ہیں کہ خدا ان کے دلوں کی پاکیزگی (طہارت) نہیں چاہتا انہیں دنیا میں رسوائی نصیب ہوگی اور آخرت میں وہ عذاب عظیم سے دوچار ہوں گے۔

(۴۲)سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَ اِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْئًا ؕ وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ	وہ تمہاری باتیں بہت غور سے سنتے ہیں تا کہ انہیں جھٹلائیں وہ مال حرام زیادہ کھاتے ہیں اگر وہ تمہارے پاس آئیں تو ان کے درمیان قضاوت کرو یا (اگر مصلحت ہوتو) انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دواور اگر ان سے صرف نظر کرلوتو وہ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے اور اگر ان کے درمیان فیصلہ کروتو عدالت سے کام لو کہ خدا عدل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

شان نزول

اس آیت کی شان نزول کے بارے میں متعدد روایات ہیں ان میں سے زیادہ واضح روایت وہ ہے جو امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

خیبر کے یہودیوں کے ایک بڑے آدمی نے جو شادی شدہ تھا ایک شوہر دار عورت سے غلاف عفت کام کیا وہ عورت بھی خیبر کے ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ تورات میں اس سلسلے میں سنگساری کا حکم تھا یہودی اس کے اجراء میں پریشان تھے اور ایسے حل کی تلاش میں تھے جس میں دونوں کی معافی ہو جائے اور اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو احکام الٰہی کا پابند بھی کہیں۔ انہوں نے اپنے ہم مذہب اہل مدینہ کو پیغام بھیجا کہ وہ اس حادثہ کے بارے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام سے حکم دریافت کریں تاکہ اگر اسلام میں اس سے کوئی آسان حکم ہوتو اسے انتخاب کرلیا جائے ورنہ اس سے بھی صرف نظر کرلیا جائے اور شاید اس طرح سے وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائیں اور اپنے آپ کو مسلمانوں کا دوست ظاہر کریں۔

اسی مقصد کے لئے مدینہ کے بڑے یہودی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آنخضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں جو حکم کروں گا کیا اسے قبول کرو گے؟ وہ کہنے لگے ہم اسی لیے آپ کے پاس آئے ہیں۔ اس موقع پر زنائے محضہ کا ارتکاب کرنے والوں کے لئے سنگسار کیے جانے کا حکم نازل ہوا لیکن انہوں نے اسے قبول نہ کیا اور عذر یہ پیش کیا کہ ہمارے مذہب میں تو ایسا حکم نہیں آیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام نے مزید فرمایا یہ وہی حکم ہے جو تمہاری تورات میں بھی آیا ہے کیا تم اس بات سے اتفاق کرتے ہو کہ میں تم میں سے ایک شخص کو فیصلے کے لئے بلاؤں اور جو کچھ وہ تورات سے بیان کرے اسے قبول کرلو۔ وہ کہنے لگے جی ہاں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام نے فرمایا ابن صوریا.................. جو کہ فدک میں رہتا ہے کیسا عالم ہے؟ وہ بولے وہ تو تورات کا سب سے بڑا عالم ہے۔

کسی کو اسے لینے کے لئے بھیجا گیا جب وہ آنحضرتﷺ کی خدمت میں پہنچا تو آپﷺ نے اس سے فرمایا: تجھے اس خدائے یکتا کی قسم دیتا ہوں جس نے تورات کو موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا تمہارے لیے دریا شگاف کیا' تمہارے دشمن فرعون کو غرق کیا اور تمہیں بیابان میں اپنی نعمتوں سے نوازا...... کہو کیا ایسے موقع پر تورات میں تمہارے لیے سنگسار کرنے کا حکم نازل ہوا ہے یا نہیں؟ وہ کہنے لگا آپ نے مجھے ایسی قسم دی ہے کہ میں مجبور ہو گیا ہوں کہ کہوں جی ہاں! ایسا ہی حکم تورات میں موجود ہے پیغمبر اسلامﷺ نے فرمایا پھر اس حکم کے اجرا کی مخالفت کیوں کرتے ہو؟

وہ بولا حقیقت یہ ہے کہ ہم گذشتہ زمانے میں یہ حد عام افراد پر تو جاری کر دیتے تھے لیکن دولتمندوں اور بڑے لوگوں پر نہیں کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ ہمارے معاشرہ کے خوش حال طبقوں میں یہ گناہ رائج ہو گیا۔ یہاں تک کہ ہمارے ایک سردار کا چچا زاد بھائی اس قبیح عمل کا مرتکب ہوا اور حسب معمول اسے سزا نہ دی گئی اسی اثنا میں ایک عام آدمی اس کا مرتکب ہوا جب اسے سنگسار کرنے لگے تو اس کے رشتہ داروں نے اعتراض کیا اور کہنے لگے اگر یہ حکم جاری ہونا ہے تو پھر دونوں پر ہو اس صورت حال کے پیش نظر ہم بیٹھ گئے اور سنگسار کے قانون کی جگہ ایک آسان قانون بنالیا اور وہ یہ تھا کہ ہر ایک کو چالیس کوڑے لگائے جائیں اور ان کا منہ کالا کر کے اور سواری پر بٹھا کر انہیں گلی کوچوں میں پھرایا جائے۔

اس وقت پیغمبر اکرمﷺ نے حکم دیا کہ اس مرد اور عورت کو مسجد کے سامنے سنگسار کیا جائے پھر آپﷺ نے فرمایا خدایا! میں پہلا شخص ہوں جس نے تیرے حکم کو زندہ کیا جبکہ یہودی اسے ختم کر چکے تھے۔

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

تفسیر

دوست اور دشمن کے درمیان فیصلہ

زیر نظر آیات اور بعد کی چند آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے قاضی حق رکھتے ہیں کہ مخصوص شرائط کے ساتھ غیر مسلموں کے مقدمات کا بھی فیصلہ کریں تفصیل آیات کے ذیل میں بیان کی جائے گی۔

زیر نظر آیات میں سے پہلی آیت '' یَاایُّھَا الرَّسُولُ ''(اے بھیجے ہوئے) سے شروع ہوتی ہے قرآن میں یہ تعبیر صرف دو جگہ پر نظر آتی ہے ایک اس مقام پر اور ایک اسی سورہ کی آیہ ٦٧ میں جہاں ولایت وخلافت کے مسئلے پر گفتگو کی گئی ہے معاملہ چونکہ اہم ہے اور دشمن کا خوف بھی ہے لہٰذا چاہتا ہے پیغمبر میں احساس مسئولیت کو اور متحرک کرے اور ان کے ارادے کو تقویت پہنچائے یہ کہتے ہوئے کہ تو صاحب رسالت ہے اور رسالت بھی ہماری.................. اس لیے حکم بیان کرنے میں استقامت اور پامردی سے کام لو۔

اس کے بعد پیغمبر کی دلجوئی اور تسلی کے لئے بعد والے حکم کی تمہید کے طور پر فرمایا گیا ہے جو لوگ زبان سے ایمان کے دعویدار ہیں اور ان کا دل ہرگز ایمان نہیں لایا اور کفر میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں وہ تمہارے غم واندوہ کا سبب نہ بنیں کیونکہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

منافقین اور داخلی دشمنوں کی کارستانیوں پر ان کی حوصلہ شکنی کے بعد خارجی دشمنوں اور یہودیوں کی کیفیت بیان کی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے اسی طرح یہودیوں میں سے بھی جو لوگ اس راہ پر چل رہے ہیں وہ بھی تمہارے لئے حزن و ملال کا باعث نہ ہوں۔

اس کے بعد ان کے منافقانہ افعال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے وہ تمہاری باتوں کو بڑے غور سے سنتے ہیں لیکن ان کی یہ توجہ اطاعت کے لئے نہیں بلکہ اس لیے ہے کہ انہیں تمہاری تکذیب کے لئے اور تم پر افترا باندھنے کے لئے کوئی عذر ہاتھ آجائے۔

''سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ''

اس جملے کی ایک اور تفسیر بھی ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے گذشتہ لوگوں کے جھوٹ اور افتراء کی طرف زیادہ کان دھرتے ہیں لیکن حق بات قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

ان کی ایک اور صفت یہ ہے کہ یہ نہ صرف جھوٹ باندھنے کے لئے تمہاری مجلس میں آتے ہیں بلکہ جو لوگ تمہارے پاس نہیں آتے ان کے جاسوس کا کردار بھی ادا کرتے ہیں۔

ان کی صفات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ کلام الٰہی میں تحریف کرتے ہیں (چاہے تحریف لفظی ہو یا تحریف معنوی) جس حکم کو وہ اپنے مفاد اور ہوا و ہوس کے خلاف سمجھتے ہیں اس کی کوئی توجیہ کر لیتے ہیں یا اسے بالکل مسترد کر دیتے ہیں۔ زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ تمہارے پاس آنے سے پہلے ہی پختہ ارادہ کر لیتے ہیں ان کے بڑوں نے انہیں حکم دیا ہے کہ اگر محمد ﷺ کوئی حکم ہماری خواہش کے مطابق دے تو اسے قبول کر لو اور اگر ہماری خواہش کے خلاف ہو تو اس سے دور رہو۔

وہ اس طرح سے گمراہی میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اپنے ان افکار و نظریات میں اتنے پختہ ہیں کہ بغیر کسی سوچ بچار اور تحقیق و مطالعہ کے جو کچھ بھی ان کے تحریف شدہ مطالب کے خلاف ہوا سے رد کر دیتے ہیں اس طرح ان کی ہدایت کی کوئی امید نہیں اور خدا چاہتا ہے کہ اس ذریعے سے سزا دے کر انہیں رسوا کرے اور جس کی سزا اور رسوائی کا خدا ارادہ کر لے تو تم ہرگز اس کا دفاع نہیں کر سکتے۔

وہ اس قدر آلودہ ہیں کہ ان کی آلودگی دھلنے کے قابل نہیں ہے لہٰذا وہ ایسے لوگ ہیں کہ خدا ان کے دلوں کو پاک نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ خدا کا کام ہمیشہ حکمت آمیز ہوتا ہے اور وہ لوگ جو اپنے ارادے سے زندگی کا ایک حصہ کجروی میں گزار چکے ہیں اور نفاق جھوٹ مخالفت حق اور قوانین الٰہی میں تحریف کا جرم کر چکے ہیں ان کے لئے پلٹنا عادتاً ممکن نہیں ہے اور آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے وہ اس دنیا میں بھی رسوا ہوں گے اور آخرت میں بھی انہیں عذاب عظیم ہوگا۔

(۴۲) دوسری آیت میں قرآن دوبارہ تاکید کرتا ہے کہ ان کے سننے والے کان تو تمہاری بات سن کر اس کی تکذیب کرنے کے لئے ہیں یا پھر وہ اپنے بڑوں کے جھوٹ سننے کے لئے گوش شنوار کھتے ہیں۔

''سَمّٰعُونَ لِلْکَذِبِ''

یہ جملہ تاکید کے طور پر ہے اور اس بری صفت کے اثبات کے لئے تکرار ہے۔

اس کے علاوہ وہ ناحق حرام اور رشوت زیادہ کھاتے ہیں۔

اس کے بعد پیغمبر اکرم ﷺ کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر ایسے لوگ فیصلہ حاصل کرنے کے لئے ان کی طرف رجوع کریں تو وہ احکام اسلام کے مطابق ان کے درمیان فیصلہ کر سکتے ہیں اور یہ بھی کہ ان سے منہ پھیر بھی سکتے ہیں۔

روح پیغمبر ﷺ کی تقویت کے لئے مزید فرمایا گیا ہے اگر مصلحت اس میں ہو کہ ان سے منہ پھیر لو تو وہ تمہیں کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

اور اگر ان کے درمیان فیصلہ کرنا چاہو تو یقیناً تمہیں اصول عدالت کو ملحوظ رکھنا چاہئے کیونکہ خدا حق' انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

(۴۳) وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَ عِنْدَهُمُ التَّوْرٰةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَ مَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۧ	وہ کس طرح تجھے فیصلہ کے لئے بلاتے ہیں جبکہ ان کے پاس تورات ہے اور اس میں خدا کا حکم موجود ہے اور پھر فیصلہ کے بعد انہوں نے چاہا کہ تجھ سے منہ پھیر لیں اور وہ مومن نہیں ہیں۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں پیغمبر اکرم ﷺ سے یہودیوں کے فیصلہ طلب کرنے کا ذکر تھا یہ آیت بھی اسی معاملے کے بارے میں ہے یہاں تعجب کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے وہ کس طرح تجھے فیصلہ کے لئے بلاتے ہیں جب کہ تورات ان کے پاس ہے اور اس میں خدا کا حکم بھی آ چکا ہے۔

یاد رہے کہ زنائے محصنہ کے مرتکب مرد عورت کو سنگسار کرنے کا مذکور حکم موجودہ تورات کے سفر تثنیہ فصل بائیس میں موجود ہے تعجب اس بات پر ہے کہ وہ تو تورات کو ایک منسوخ کتاب نہیں مانتے اور دین اسلام کو باطل سمجھتے ہیں اس کے باوجود وہ تورات کے ان احکام کو چھوڑ کر جو ان کی طبیعت کے مطابق نہیں ہیں ایسے کم کی تلاش کرتے ہیں جو اصولی طور پر ان کے موافق نہیں ہے اس سے بھی بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ تجھے فیصلہ کرنے کے لئے منتخب کر لینے کے بعد تیرا حکم قبول نہیں کرتے کہ جو حکم تورات کے مطابق ہے کیونکہ یہ حکم ان کے میلان اور رغبت کے خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایمان ہی نہیں رکھتے ورنہ احکام خدا کے ساتھ ایسا کھیل نہ کھیلتے۔

(۴۴) إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ فَلاتَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِي وَلاتَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنزَلَ اللهُ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ	ہم نے تورات کو نازل کیا کہ جس میں ہدایت اور نور تھا اور انبیاء کو جو حکم خدا کے سامنے تسلیم تھے اس کے مطابق یہودیوں میں فیصلہ کرتے تھے اور (اسی طرح) علماء بھی اس کتاب کے مطابق حکم کرتے تھے کہ جو ان کے سپرد تھی اور وہ اس پر گواہ تھے اس بنا پر (آیات الٰہی کے مطابق فیصلہ کرنے کے بارے میں) لوگوں سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور میری آیات معمولی قیمت پر نہ بیچو اور جو لوگ خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق حکم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

تفسیر

زیر نظر اور آئندہ آیت گذشتہ بحث کی تکمیل کرتی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آسمانی کتب کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور نور ہے ہدایت حق کی طرف راہنمائی کے لئے اور نور جہل و نادانی کی تاریکیوں کو دور کرنے کے لئے۔

اس بنا پر وہ پیغمبران خدا جو حکم خدا کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے تھے اور نزول تورات کے بعد مصروف کار تھے سب یہودیوں کے لئے اس کے مطابق حکم کرتے تھے۔

صرف وہی ایسا نہ کرتے تھے بلکہ یہودیوں کے بزرگ علماء اور صاحب ایمان پاکباز دانشور اس آسمانی کتاب کے ہی مطابق فیصلہ کرتے تھ جو ان کے سپرد کی گئی تھی اور وہ اس پر گواہ تھے۔

یہاں روئے سخن اہل کتاب کے ان علماء کی طرف ہے جو اس زمانے میں موجود تھے ارشاد ہوتا ہے لوگوں سے نہ ڈرو اور خدا کے حقیقی احکام بیان کرو اور چاہئے تو یہ کہ میری مخالفت سے ڈرو کیونکہ اگر تم نے حق کو چھپایا تو تمہیں سزا دی جائے گی۔ اور اسی طرح آیات خدا کو کم قیمت پر نہ بیچو۔

دراصل حق کو چھپانے کی وجہ یا لوگوں کا خوف ہے یا پھر ذاتی مفاد کا حصول بہر حال جو کچھ بھی ہو ضعف ایمان کی دلیل اور مقام انسانیت کی نفی ہے اور مندرجہ بالا جملوں میں دونوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ایسے اشخاص کے بارے میں آیت کے آخر میں قطعی فیصلہ صادر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے جو لوگ احکام خدا کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

(۴۵)وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ	اورہم نے اس تورات میں ان بنی اسرائیل کے لئے مقرر کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت ہے اور ہر زخم کے لئے قصاص ہے اور اگر کوئی قصاص سے صرف نظر کرتے ہوئے اسے بخش دے تو یہ اس کے گناہوں کا کفارہ شمار ہوگا اور جو شخص خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔

تفسیر

قصاص اور درگذر

اس آیت میں ان حدود الٰہی کا ایک اور حصہ بیان کیا گیا ہے جو تورات میں ہیں فرمایا گیا ہے ہم نے تورات میں قانون قصاص مقرر کیا ہے کہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو قتل کردے تو مقتول کے اولیاء قاتل کو اس کے بدلے قتل کرسکتے ہیں۔

اور اگر کوئی دوسرے کی آنکھ کو نقصان پہنچائے اور اسے ختم کردے تو وہ اس کی آنکھ نکال سکتا ہے۔

اسی طرح کسی کی ناک کاٹنے کے بدلے جائز ہے کہ مجرم کی ناک کاٹی جائے۔ نیز کان کاٹنے کے بدلے مدمقابل کا کان کاٹا جاسکتا ہے۔

اور اگر کوئی کسی کا دانت توڑ دے تو وہ بھی ااس کا دانت توڑ سکتا ہے۔

اسی طرح جو بھی کسی کو کوئی زخم لگائے تو وہ اس کے بدلے قصاص لے سکتا ہے۔

لہٰذا حکم قصاص بغیر کسی نسلی طبقاتی اجتماعی قبائلی اور شخصی امتیاز کے جاری ہوگا اور اس سلسلے میں کسی کے لیے بھی کسی پہلو سے کوئی فرق اور تبعیض نہیں ہے البتہ دیگر اسلامی احکام کی طرح اس حکم کی بھی کچھ شرائط ہیں جو فقہی کتب میں موجود ہیں کیونکہ یہ حکم بنی اسرائیل سے مخصوص نہیں ہے اسلام میں بھی اس کی نظیر موجود ہے جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت......۱۷۸ میں مذکور ہے کہ جو آیہ قصاص ہے)۔

لیکن اس بنا پر کہ کہیں یہ گمان نہ ہو کہ خدا نے قصاص کو لازمی قرار دیا ہے اور مقابلہ بمثل کی دعوت دی ہے مزید فرمایا گیا ہے اگر کوئی اپنے حق سے درگذر کرے اور عفو بخشش سے کام لے تو یہ اس کے گناہوں کا کفارہ شمار ہوگا اور جس طرح اس نے درگذر سے کام لیا ہے خدا اس سے درگذر کرے گا۔

یہ جملہ درحقیقت ان لوگوں کے لئے دندان شکن جواب ہے جو قانون قصاص کو غیر عادلانہ سمجھتے ہیں اور اسے ایک آدم کش قانون قرار دیتے ہیں پوری آیت پر غور وخوض سے معلوم ہوتا ہے کہ قصاص کی اجازت مجرموں کو خوف زدہ کرنے کیلئے ہے تا کہ بے گناہ لوگ ان کے اقدام جرم سے مامون رہیں لیکن اس کے باوجود عفو و بازگشت کا راستہ بھی کھلا رکھا گیا ہے۔خوف وامید کی یہ کیفیت پیدا کرتے ہوئے اسلام چاہتا ہے کہ ظلم وزیادتی کو بھی روکے اور جتنا ہوسکے اور مناسب ہو خون کو خون سے پاک کرنے کی پیش بندی بھی کرے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے اور جو لوگ خدا کے حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ ظالم ہیں۔

اس سے بڑھ کر کیا ظلم ہوگا کہ ہم جھوٹے احساسات اور جذبات سے مغلوب ہو کر قاتل سے اس بہانے سے صرف نظر کر لیں کہ خون کو خون سے نہ دھویا جائے اور قاتلوں کے ہاتھ دوسرے لوگوں کو قتل کرنے کے لئے کھلے چھوڑ دیں اور اس طرح سے بے گناہوں پر ظلم وستم کریں۔

(۴۶) وَ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰةِ ۠ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّ نُوْرٌ ۙ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰةِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ؕ	اور ان گذشتہ انبیاء کے بعد ہم نے عیسیٰ کو مقرر کیا تا کہ اس سے پہلے جو تورات میں بھیجا گیا تھا اس کی تصدیق کرے اور ہم نے اسے انجیل دی کہ جس میں ہدایت اور نور تھا اور اس کی یہ آسمانی کتاب بھی تورات کی تصدیق کرتی تھی جو اس سے پہلے تھے اور متقیوں کے لئے ہدایت اور موعظہ ہے۔

تفسیر

تورات سے مربوط آیات کے بعد یہ آیت انجیل کی کیفیت بیان کررہی ہے ارشاد ہوتا ہے گذشتہ رہبروں اور پیغمبروں کے بعد ہم نے مسیح علیہ السلام کو مبعوث کیا جبکہ اس کی نشانیاں بالکل ان نشانیوں کے مطابق تھیں جو تورات نے بیان کی تھیں۔

اس جملے کی ایک اور تفسیر بھی ہے اور وہ یہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے تورات کی حقانیت کا اعتراف کیا کہ جو حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی جیسے تمام آسمانی پیغمبر اپنے سے پہلے انبیاء کی حقانیت کے معترف تھے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے ہم نے اسے انجیل سونپی کہ جس میں ہدایت اور نور تھا۔

قرآن مجید میں تورات انجیل اور قرآن تینوں کو نور کہا گیا ہے حقیقت میں اصلی تورات اور انجیل مراد ہیں۔

نور کا اطلاق اصلی تورات اور انجیل پر ہوتا ہے تحریف شدہ کتب پر نہیں دوبارہ بطور تاکید فرمایا گیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام تورات کی تصدیق کرتے تھے بلکہ ان کی آسمانی کتاب انجیل بھی تورات کی صداقت پر گواہ تھی۔

آخر میں ارشاد ہوتا ہے یہ آسمانی کتاب پرہیز گاروں کے لئے ہدایت اور وعظ ونصیحت کا سرمایہ ہے۔

(۴۷) وَ لْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ	ہم نے اہل انجیل (پیروان مسیح) سے کہا کہ جو کچھ خدا نے اس میں نازل کیا ہے وہ اس کے مطابق حکم کریں اور جو لوگ اس کے مطابق حکم نہیں کرتے جو خدا نے نازل کیا ہے وہ فاسق ہیں۔

تفسیر

وہ جو قانون الٰہی کے مطابق حکم نہیں کرتے

گذشتہ آیات میں انجیل کے نازل ہونے کا ذکر ہے اب اس آیت میں فرمایا گیا ہے ہم نے اہل انجیل کو حکم دیا کہ جو کچھ خدا نے اس میں نازل کیا ہے اس کے مطابق حکم اور فیصلہ کریں۔

اس میں شک نہیں کہ اس جملے میں یہ مراد نہیں کہ قرآن عیسائیوں کو یہ حکم دے رہا ہے کہ انہیں اس وقت انجیل کے احکام پر عمل کرنا چاہئے کیونکہ یہ بات تو قرآن کی دیگر آیات اور خود وجود قرآن سے مناسبت نہیں رکھتی کہ جو نئے آئین اور دین کا اعلان کر رہا ہے پرانے دین کو منسوخ کر رہا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل نازل کرنے کے بعد اس کے پیروکاروں کو حکم دیا تھا کہ وہ اس پر عمل کریں اور اس کے مطابق فیصلے کریں۔

آیت کے آخر میں پھر بطور تاکید فرماتا ہے جو لوگ حکم خدا کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ فاسق ہیں۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ ان آیات میں ایک مقام پر ان افراد کو کافر کہا گیا ہے دوسرے مقام پر ظالم قرار دیا گیا ہے اور تیسرے مقام پر فاسق کہا گیا ہے تعبیر میں یہ فرق ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ ہر حکم تین پہلو رکھتا ہے ایک طرف سے وہ قانون بنانے والے خدا پر منتہی ہوتا ہے دوسری طرف قانون جاری کرنے والے حاکم و قاضی تک پہنچتا ہے اور تیسری طرف اس شخص کو جس پر قانون جاری ہو رہا ہے محکوم تک پہنچتا ہے گویا ہر تعبیر تین میں سے ایک پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ جو شخص خدا کے ایک حکم کے خلاف فیصلہ کرتا ہے وہ ایک طرف سے قانون الٰہی کو پاؤں تلے روند کر کفر اختیار کرتا ہے دوسری طرف ایک بے گناہ انسان پر ظلم کرتا ہے اور تیسری طرف وہ اپنی ذمہ داری اور مسئولیت کی سرحد سے انحراف کر کے فاسق بن جاتا ہے جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ فسق کا معنی بندگی اور مسئولیت کی سرحد سے تجاوز ہے۔

(۴۸)وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ مُهَیۡمِنًا عَلَیۡهِ فَاحۡكُمۡ بَیۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَ لَاتَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الۡحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ شِرۡعَةً وَّ مِنۡهَاجًا ؕ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَلَجَعَلَكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنۡ لِّیَبۡلُوَكُمۡ فِیۡ مَاۤ اٰتٰكُمۡ فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ ؕ اِلَی اللّٰهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِیۡعًا فَیُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ فِیۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ۙ	اوراس کتاب کو ہم نے حق کے ساتھ تم پر نازل کیا جبکہ یہ گذشتہ کتب کی تصدیق کرتی ہے اوران کی محافظ ونگہبان ہے لہٰذا خدا نے جو احکام نازل کیے ہیں ان کے مطابق حکم کرو اوران کے ہوا و ہوس اور خواہشات کی پیروی نہ کرو اور حق (احکام الٰہی سے) جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اس سے منہ نہ پھیرو، ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے واضح آئین اور طریقہ مقرر کر دیا ہے اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت قرار دیتا۔ لیکن خدا چاہتا ہے کہ اس نے جو کچھ تمہیں بخشا ہے اس میں تمہیں آزمائے (اور تمہاری صلاحتیوں کی نشو ونما کرے) اس لیے تم کوشش کرو اور نیکیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاؤ تم سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور جس میں تم نے اختلاف کیا ہے وہ تمہیں اس کی خبر دیتا ہے۔

تفسیر

گذشتہ انبیاء کا ذکر کرنے کے بعد اس آیت میں قرآن کے مقام و مرتبے کا تذکرہ ہے ''مھیمن'' دراصل ایسی چیز کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز کی محافظ شاہد امین اور نگہدار ہو قرآن چونکہ گذشتہ آسمانی کتب کے اصولوں کی مکمل حفاظت ونگہداری کرتا ہے اور ان کی تکمیل کرتا ہے لہٰذا اسے مہین قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے ہم نے اس آسمانی کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے جبکہ یہ گذشتہ کتب کی تصدیق کرتا ہے اور اس کی نشانیاں اور علامات اس کے مطابق ہیں جو گذشتہ کتب نے بتائی ہیں اور یہ ان کا محافظ ونگہبان ہے۔

بنیادی طور پر تمام آسمانی کتابیں اصول مسائل میں ہم آہنگ ہیں اور سب کا ہدف و مقصد ایک ہی ہے یعنی سب انسانی تربیت ارتقاء اور تکامل کے درپے ہیں۔

اس کے بعد حکم دیا گیا ہے کہ جب ایسا ہے تو ان احکام کے مطابق فیصلہ کرو جو تم پر نازل ہوئے ہیں'' فَاحۡكُمۡ بَیۡنَهُمۡ بِمَا اَنۡزَلَ اللّٰهُ''

یہ جملہ فاء تفریع کے ساتھ آیا ہے جو گذشتہ ادیان کے احکام کی نسبت احکام اسلام کی جامعیت کا نتیجہ ہے یہ حکم گذشتہ آیات کے اس حکم کے منافی نہیں کہ جن میں پیغمبر کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ ان کے درمیان خود فیصلہ کریں یا انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں کیونکہ یہ آیت کہتی ہے کہ جب اہل کتاب کے درمیان فیصلہ کرنا چاہو تو قرآن کے احکام کے مطابق فیصلہ کرو۔

پھر مزید فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ چاہتے ہیں کہ احکام الٰہی کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال لیں تم ان کے ہوا و ہوس اور خواہشات کی اتباع نہ کرو اور حق میں سے جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اس سے منہ نہ پھیرو۔

بحث کی تکمیل کے لئے فرمایا گیا ہے تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے دین شریعت طریقہ اور واضح راستے کا تعین کر دیا ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے خدا میں یہ طاقت تھی کہ وہ تمام لوگوں کو ایک ہی امت قرار دے دیتا اور سب کو ایک ہی دین کا پیرو بنا دیتا لیکن یہ بات تدریجی تکامل کے قانون اور مختلف تربیتی مراحل کے اصول سے مناسبت نہیں رکھتی تھی۔

بالآخر تمام اقوام و ملل کو مخاطب کر کے دعوت دیتا ہے کہ بجائے اس کے کہ اپنی توانائیاں اختلافات و مشاجرات میں صرف کرو نیکیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ کیونکہ سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور وہی روز قیامت ان چیزوں سے آگاہ کرے گا جن میں تم اختلاف کرتے ہو۔

(۴۹)وَ اَنِ احۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ وَ احۡذَرۡہُمۡ اَنۡ یَّفۡتِنُوۡکَ عَنۡۢ بَعۡضِ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ اِلَیۡکَ ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاعۡلَمۡ اَنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ اَنۡ یُّصِیۡبَہُمۡ بِبَعۡضِ ذُنُوۡبِہِمۡ ؕ وَ اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوۡنَ	اور ان (اہل کتاب) کے درمیان تمہیں اس کے مطابق حکم کرنا چاہئے جو خدا نے نازل کیا ہے اور ان کی ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو اور اس سے بچو کہ کہیں تمہیں وہ بعض ایسے احکام سے منحرف کر دیں جو تم پر نازل ہوئے ہیں اور اگر وہ (تمہارے کام اور فیصلے سے) روگردانی کریں تو جان لو کہ خدا چاہتا ہے کہ ان کے کچھ گناہوں کے بدلے انہیں سزا دے اور بہت سے لوگ فاسق ہیں۔
(۵۰)اَفَحُکۡمَ الۡجَاہِلِیَّۃِ یَبۡغُوۡنَ ؕ وَ مَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰہِ حُکۡمًا لِّقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ ٪	کیا وہ (تم سے) زمانہ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں اور اہل ایمان کے لئے خدا سے بہتر حکم کون کر سکتا ہے۔

شان نزول

بعض مفسرین نے اس پہلی آیت کی شان نزول میں ابن عباس سے نقل کیا ہے۔

یہودیوں کے بڑوں کی ایک جماعت نے آپس میں سازش کی اور کہا کہ محمد صلى الله عليه وآله وسلم کے پاس جاتے ہیں شاید اسے ہم اس کے دین سے منحرف کر دیں یہ طے کر کے وہ پیغمبر اسلام کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم یہودیوں کے علماء اور اشراف ہیں اگر ہم آپ کی پیروی کر لیں تو مسلم ہے کہ باقی یہودی ہماری اقتداء کریں گے لیکن ہمارے اور ایک اور گروہ کے

درمیان ایک نزاع ہے (ایک شخص کے قتل یا کسی اور بات کے بارے میں اگر اس جھگڑے میں آپ ہمارے فائدے میں فیصلہ کردیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔

اس پر پیغمبر اسلام ﷺ نے ایسے غیر عادلانہ فیصلے سے منہ موڑ لیا اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

اس کے بعد پیغمبر ﷺ کو متوجہ کیا گیا ہے کہ انہوں نے سازش کی ہے کہ تمہیں آئین حق وعدالت سے روگرداں کردیں تم ہوشیار اور آگاہ رہو۔

اور اگر اہل کتاب تمہارے عادلانہ فیصلے کے سامنے سر نہیں جھکاتے تو جان لو کہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان کے گناہوں نے ان کا دامن پکڑ رکھا ہے اور ان سے توفیق سلب ہو چکی ہے اور خدا چاہتا ہے کہ ان کے بعض گناہوں کی وجہ سے انہیں سزا دے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے اگر یہ لوگ راہ باطل میں ڈٹے ہوئے ہیں تو تم پریشان نہ ہونا کیونکہ بہت سے لوگ فاسق ہیں۔

(۵۰) اس آیت میں استفہام انکاری کے طور پر فرمایا گیا ہے کیا یہ لوگ آسمانی کتب کی پیروی کے مدعی ہیں توقع رکھتے ہیں کہ تم زمانہ جاہلیت کے احکام کی طرح اور تبعیض وامتیاز برتتے ہوئے ان کے درمیان قضاوت کرو۔ حالانکہ اہل ایمان کے لئے حکم خدا سے بہتر اور بالاتر کوئی فیصلہ نہیں ہے۔

(۵۱) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ	اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست اور ہم پیمان نہ بناؤ۔ وہ تو ایک دوسرے کے لئے دوست اور ہم پیمان ہیں (لہٰذا) تم میں سے جو کوئی بھی ان سے دوستی اور عہد و پیمان باندھے تو وہ انہی میں سے ہیں اور خدا ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔
(۵۲) فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ؕ	تم ایسے لوگوں کو دیکھتے ہو جن کے دلوں میں بیماری ہے جو ایک دوسرے کی دوستی میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں ڈر ہے کہ ہمیں کوئی حادثہ پیش نہ آئے کہ جس میں ہمیں ان کی مدد کی ضرورت پڑے شاید خدا کی طرف سے کوئی اور کامیابی یا واقعہ (مسلمانوں کے فائدے میں) رونما ہو جائے اور یہ لوگ اپنے دلوں میں جو کچھ چھپائے ہوئے ہیں اس پر پشیمان ہیں۔

(۵۳)وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ	اوروہ جوایمان لائے ہیں کہتے ہیں کیا یہ وہی منافق ہیں جو بڑی تاکید سے قسم کھاتے ہیں کہ وہ تمہارے ساتھ ہیں ان کا معاملہ یہاں تک کیوں آ پہنچا کہ ان کے اعمال نابود ہو گئے اور وہ خسارے میں جاپڑے۔

شان نزول

بہت سے مفسرین نے نقل کیا ہے کہ جنگ بدر کے بعد عبادہ بن صامت خزرجی پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا یہودیوں میں کچھ میرے ہم پیمان ہیں جو تعداد میں بہت ہیں اور طاقت ور ہیں اب جبکہ وہ ہمیں جنگ کی دھمکی دے رہے ہیں اور مسلمانوں کا معاملہ غیر مسلموں سے الگ ہو گیا ہے تو میں ان کی دوستی اور عہد و پیمان سے برأت کا اظہار کرتا ہوں میرا اہم پیمان صرف خدا اور اس کا رسول ﷺ ہے۔

عبداللہ بن ابی کہنے لگا میں تو یہودیوں کی ہم پیمانی سے برأت نہیں کرتا کیونکہ میں مشکل حوادث سے ڈرتا ہوں اور مجھے ان لوگوں کی ضرورت ہے۔

اس پر پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا یہودیوں کی دوستی کے سلسلہ میں مجھے جس بات کا ڈر عبادہ کے بارے تھا وہی تیرے متعلق بھی ہے (اور اس دوستی اور ہم پیمانی کا خطرہ اس کی نسبت تیرے لیے بہت زیادہ ہے)

عبداللہ کہنے لگا اگر ایسی بات ہے تو میں بھی قبول کرتا ہوں اور ان سے رابطہ منقطع کر لیتا ہوں اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ سے دوستی کرنے سے ڈرایا گیا۔

تفسیر

قرآن مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کی دوستی اور ہم کاری سے شدت کے ساتھ ڈراتا ہے پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا سہارا اور ہم پیمان نہ بناؤ (یعنی خدا پر ایمان کا تقاضا ہے کہ مادی مفاد کے لئے ان سے ہم کاری اور دوستی نہ کرو۔

اس کے بعد ایک مختصر سے جملے سے اس نہی کی دلیل بیان فرمائی گئی ہے۔

ان دونوں گروہوں میں سے ہر ایک اپنے ہم مسلک لوگوں کے دوست اور ہم پیمان ہیں۔یعنی جب تک ان کے اپنے اور ان کے دوستوں کے مفادات بیچ میں ہیں وہ تمہاری طرف ہرگز متوجہ نہیں ہوں گے لہٰذا تم میں سے جو کوئی بھی ان سے دوستی کرے اور عہد و پیمان باندھے وہ اجتماعی اور مذہبی تقسیم کے لحاظ سے انہی کا جزء شمار ہوگا۔

اور اس میں شک نہیں کہ خدا ایسے ظالم افراد کو جو اپنے ساتھ اور اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ خیانت کریں اور

دشمنوں پر بھروسہ کریں ہدایت نہیں کرے گا۔

(۵۲) اس آیت میں ان بہانہ تراشیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو بیمار فکر افراد غیر سے اپنے غیر شرعی روابط کے لیے پیش کرتے ہیں ارشاد ہوتا ہے جن کے دلوں میں بیماری ہے وہ اصرار کرتے ہیں کہ انہیں اپنے لیے سہارا سمجھیں اور انہیں اپنا ہم پیمان بنائیں اور ان کا عذر یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم ڈرتے ہیں کہ قدرت طاقت ان کے ہاتھ میں آ جائے اور پھر ہم مصیبت میں گرفتار ہو جائیں۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے جیسے انہیں اس بات کا احتمال ہے کہ کسی دن طاقت یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاتھ آ جائے گی اسی طرح انہیں یہ خیال بھی آنا چاہئے کہ آخر کار ہوسکتا ہے کہ خدا مسلمانوں کو کامیاب کرے اور قدرت وطاقت ان کے ہاتھ آ جائے اور یہ منافق اپنے دلوں میں جو کچھ چھپائے ہوئے ہیں اس پر پشیمان ہیں۔

(۵۳) آخری آیت میں منافقین کے انجام کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے جب سچے مسلمانوں کو فتح و کامرانی نصیب ہو جائے اور منافقین کا معاملہ الم نشرح ہو جائے تو مومنین تعجب سے کہیں گے کہ کیا یہ منافق لوگ وہی نہیں ہیں کہ دعویٰ کرتے تھے اور قسمیں کھاتے تھے کہ وہ ہمارے ساتھ ہیں اب ان کا یہ انجام کیوں ہوا ہے۔ اور اسی نفاق کی وجہ سے ان کے تمام اعمال باطل اور نابود ہو گئے کیونکہ ان کا سرچشمہ پاک اور خالص نیت نہ تھی اور اسی بنا پر وہ اس جہان میں بھی اور دوسرے جہان میں بھی خسارے میں ہیں۔

(۵۴) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَنۡ يَّرۡتَدَّ مِنۡكُمۡ عَنۡ دِيۡنِهٖ فَسَوۡفَ يَاۡتِى اللّٰهُ بِقَوۡمٍ يُّحِبُّهُمۡ وَ يُحِبُّوۡنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ يُجَاهِدُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوۡنَ لَوۡمَةَ لَاۤئِمٍ‌ ؕ ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ‌ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ	اے ایمان والو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا وہ خدا کا کوئی نقصان نہیں کرے گا خدا آئندہ ایک ایسا گروہ لے آئے گا جسے وہ دوست رکھتا ہے اور وہ لوگ بھی اسے دوست رکھتے ہیں جو مومنین کے سامنے متواضع اور کفار کے مقابلے میں طاقت ور ہیں وہ راہ خدا میں جہاد کرتے ہیں اور سرزنش کرنے والوں کی سرزنش سے نہیں ڈرتے۔ یہ خدا کا فضل و کرم ہے وہ جسے چاہتا ہے اور اہل سمجھتا ہے عطا کرتا ہے اور خدا کا فضل وسیع ہے اور خدا جاننے والا ہے۔

تفسیر

منافقین کے بارے میں بحث کے بعد مرتدین کے سلسلے میں گفتگو ہے کہ جو قرآن کی پیشین گوئی کے مطابق اس دین سے خارج ہو جائیں گے لیکن خدا ان کے دین نیز مسلمانوں اور اسلامی معاشرے کی تیز رفتار پیش رفت کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے کیونکہ خدا آئندہ اس دین کی حمایت کے لئے ایک اور گروہ کو مبعوث کرے گا۔ یہاں قرآن ایک کلی قانون کے طور پر مسلمانوں کو ہشیار

کرتا ہے۔

اس کے بعدان لوگوں کی جو یہ عظیم کار رسالت انجام دیں گے یہ صفات بیان فرمائی گئی ہیں۔

پہلی یہ کہ وہ خدا کے عاشق ہوں گے اور اس کی خوشنودی کے سوا انہیں کوئی فکر دامن گیر نہ ہوگی خدا انہیں پسند کرتا ہے اور وہ خدا سے محبت کرتے ہیں۔

دوسری اور تیسری صفت ان لوگوں کی یہ ہے کہ وہ مومنین کے لیے منکسر المزاج اور مہربان ہیں جبکہ دشمنوں اور ستم گروں کے مقابلے میں مضبوط سخت اور طاقت ور ہیں۔

چوتھی صفت ان کی یہ ہے کہ راہ خدا میں جہاد کرنا ان کے مسلسل پروگرام میں شامل ہے(يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ)۔

پانچویں خصوصیت ان کی یہ ہے کہ وہ فرمان الٰہی کی انجام دہی اور دفاع حق کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

آخر میں فرمایا گیا ہے ان امتیازات وخصوصیات کا حصول (انسانی کوشش کے علاوہ) خدا کے فضل وکرم کا مرہون منت ہے وہ جسے چاہتا اور اہل پاتا ہے عطا کرتا ہے۔ وہی ذات ہے جس کا دائرہ فضل وکرم بہت وسیع ہے اور جو اس کی لیاقت واہلیت رکھتے ہیں ان سے آگاہ ہے۔

(۵۵ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رَاكِعُوْنَ	تمہارا سرپرست اور رہبر صرف خدا اس کا پیغمبر اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نماز قائم کی ہے اور حالت رکوع میں زکوۃ ادا کی ہے۔

شان نزول

تفسیر مجمع لبیان اور دوسری کتب مین عبداللہ بن عباس سے منقول ہے

ایک روز میں چاہ زمزم کے پاس بیٹھا تھا اور لوگوں کو ارشادات رسول ﷺ سنا رہا تھا کہ اچانک ایک شخص قریب آیا اس کے سر پر عمامہ تھا اس نے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا جب میں پیغمبر اسلام ﷺ سے کوئی حدیث نقل کرتا تو وہ بھی قال رسول اللہ کہہ کر دوسری حدیث رسول ﷺ بیان کر دیتا۔

ابن عباس نے اس شخص کو قسم دی کہ وہ اپنا تعارف کروائے تو اس نے اپنے چہرے سے نقاب الٹ دی اور پکار کر کہا اے لوگو!

جو شخص مجھے نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں ابوذر غفاری ہوں ان کانوں سے میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے اور اگر میں جھوٹ بولوں تو میرے دونوں کان بہرے ہو جائیں رسول اللہ نے فرمایا

علی قائد ابررة و قاتل الکفرة منصور من نصره مخذول من خذله

یعنی............علی علیہ السلام نیک اور پاک لوگوں کے قائد ہیں اور کفار کے قاتل ہیں جو ان کی نصرت و مدد کرے خدا اس کی مدد کرے گا اور جو شخص ان کی نصرت و مدد سے ہاتھ کھینچ لے خدا بھی اس کی مدد سے ہاتھ کھینچ لے گا۔

اس کے بعد ابوذر نے مزید کہا

اے لوگو! ایک دن میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک سائل مسجد میں داخل ہوا اور لوگوں سے مدد طلب کی لیکن کسی نے اسے کچھ نہ دیا تو اس نے اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے کہا خدایا گواہ رہنا کہ میں نے تیرے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسجد میں مدد طلب کی ہے لیکن کسی نے مجھے جواب تک نہیں دیا ایسی حالت میں جبکہ حضرت علی رکوع میں تھے اپنے دائیں ہاتھ کی چھنگلی سے اشارہ کیا سائل قریب آیا اور انگوٹھی آپ کے ہاتھ سے اتار لی پیغمبر خدا نے جو حالت نماز میں تھے اس واقعہ کو دیکھا جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو سر آسمان کی طرف بلند کیا اور اس طرح کہا۔

خدایا! میرے بھائی موسیٰ علیہ السلام نے تجھ سے سوال کیا تھا کہ ان کی روح کو وسعت دے اور ان کے کام ان پر آسان کر دے اور ان کی زبان کی گرہ کھول دے تا کہ لوگ ان کی گفتار کو سمجھ سکیں نیز موسیٰ نے سوال کیا کہ ان کے بھائی ہارون کو ان کا وزیر اور یاور و مددگار قرار دے اور ان کے ذریعے ان کی قوت میں اضافہ فرما اور انہیں ان کے کاموں میں شریک کر دے خداوندا! میں محمد تیرا رسول اور برگزیدہ ہوں میرے سینہ کو کھول دے میرے کام مجھ پر آسان کر دے اور میرے خاندان میں سے علی علیہ السلام کو میرا وزیر بنا دے تا کہ اس کی وجہ سے میری کمر مضبوط اور قوی ہو جائے۔

ابوذر کہتے ہیں

ابھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کی دعا ختم نہیں ہوئی تھی کہ جبرئیل نازل ہوئے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: پڑھیے

حضور نے فرمایا: کیا پڑھوں؟

تو جبرئیل نے کہا:

پڑھیے۔" انما ولیکم اللّٰہ و رسولہ والذین امنوا۔۔۔۔"

تفسیر

آیۂ ولایت

یہ آیت لفظ "انما" سے شروع ہوتی ہے یہ لفظ لغت عرب میں حصر و انحصار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ارشاد ہوتا ہے تمہارے ولی سرپرست اور تمہارے امور میں حق تصرف رکھنے والی تین ہستیاں ہیں خدا اس کا رسول اور وہ جو ایمان لائے نماز قائم کی اور حالت رکوع میں زکوۃ دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ لفظ "رکوع" اس آیت میں نماز کے رکوع کے معنی میں ہے نہ کہ خضوع و خشوع کے معنی میں۔جب

رکوع کہا جائے تو اسی مشہور معنی میں یعنی نماز کے رکوع کے معنی میں ہوگا۔

واضح ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں ولی سے مراد ولایت بمعنی سرپرستی تصرف اور مادی وروحانی رہبری اور قیادت ہے خصوصاً جبکہ یہ ولایت ولایت الٰہی اور ولایت پیغمبرؐ کے ہم پلہ قرار پائی ہے اور تینوں کو ایک ہی لفظ کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

اسی طرح اس میں بھی شک نہیں کہ لفظ ''ولی'' اس آیت میں دوست یا مددگار کے معنی میں نہیں ہے کیونکہ دوستی اور مدد کرنے کے معنی میں ولایت نماز پڑھنے والوں اور حالت رکوع میں زکوۃ ادا کرنے والوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ تو ایک عمومی حکم ہے جو تمام مسلمانوں پر محیط ہے تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایک دوسرے سے دوستی رکھیں اور ایک دوسرے کی مدد کریں۔

اس طرح سے یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو حضرت علی علیہ السلام کی امامت وولایت پر نص قرآنی کی حیثیت سے دلالت کرتی ہے۔اس موقع سے متعلق کچھ اہم بحثیں ہیں جن پر ہم علیحدہ علیحدہ تحقیق کرتے ہیں۔

(۵۶) وَ مَنۡ یَّتَوَلَّ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَاِنَّ حِزۡبَ اللّٰہِ ہُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ ۠	اور جو لوگ اللہ اس کے پیغمبر اور صاحبان ایمان کی ولایت قبول کرلیں وہ کامیاب ہیں کیونکہ خدا کی حزب اور پارٹی ہی کامیاب ہے۔

تفسیر

یہ آیت گذشتہ آیت کے مضمون کی تکمیل کرتی ہے اور اسی کے ہدف کی تاکید وتعقیب کرتی ہے اور مسلمانوں کو بتاتی ہے کہ جنہوں نے خدا اس کے رسولؐ اور ان صاحبان ایمان کی ولایت، سرپرستی اور رہبری کو قبول کرلیا ہے کہ جن کی طرف گذشتہ آیت میں اشارہ کیا جاچکا ہے کہ وہ کامیاب ہوں گے کیونکہ وہ حزب خدا میں داخل ہوجائیں گے اور حزب خدا کامیاب وکامران ہے۔

اس آیت میں ولایت کے اس معنی پر ایک اور قرینہ موجود ہے جس کا ذکر گذشتہ آیت کے ذیل میں کیا گیا ہے یعنی ولایت بمعنی سرپرستی، تصرف اور رہبری کیونکہ حزب اللہ اور اس کا غلبہ حکومت اسلامی سے مربوط ہے نہ ایک عام اور معمول کی دوستی سے اور یہ خود اس بات پر دلیل ہے کہ آیت میں ولایت سرپرستی حکومت نیز اسلام اور مسلمانوں کی باگ ڈور ہاتھ میں لینے کے معنی میں ہے کیونکہ حزب کے مفہوم میں ایک طرح کی تشکیل وابستگی اور مشترک اہداف ومقاصد کی تکمیل کے لئے ایک اجتماع کا تصور پوشیدہ ہے۔

(۵۷) یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا دِیۡنَکُمۡ ہُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ وَ الۡکُفَّارَ اَوۡلِیَآءَ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ	اے ایمان والو! اہل کتاب اور مشرکین میں سے ان لوگوں کو اپنا دوست اور سہارا نہ سمجھو جو تمہارے دین کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے کھیل کود سمجھتے ہیں اور اگر ایمان دار ہو تو خدا (کے حکم کی مخالفت) سے ڈرو۔

(۵۸) وَ اِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ اتَّخَذُوْھَا ھُزُوًا وَّ لَعِبًا ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّایَعْقِلُوْنَ	جب تم اذان کہتے ہو اور لوگوں کو نماز کے لئے پکارتے ہو تو وہ لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے کھیل تماشہ سمجھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسا گروہ ہیں جو عقل و ادراک نہیں رکھتے۔

شان نزول

تفسیر مجمع البیان تفسیر ابوالفتوح رازی اور تفسیر فخر الدین رازی میں منقول ہے

رفاعہ اور سوید مشرکین میں سے تھے انہوں نے اظہار اسلام کیا اور پھر وہ منافقین کے ہم کاروں میں داخل ہو گئے بعض مسلمان ان دونوں سے میل جول رکھتے تھے اور اظہار دوستی کرتے تھے اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور انہیں اس راہ ورسم کے خطرے سے آگاہ کیا گیا تا کہ وہ اس عمل سے پرہیز کریں۔

دوسری آیت جو پہلی کا ضمیمہ ہے اس کی شانِ نزول یہ منقول ہے:

یہودیوں کا ایک گروہ اور کچھ عیسائی جب مؤذن کی اذان کی آواز سنتے اور نماز کے لئے مسلمانوں کا قیام دیکھتے تو تمسخر اور استہزاء شروع کر دیتے۔ لہٰذا قرآن مسلمانوں کو ایسے لوگوں سے دوستی کرنے سے پرہیز کا حکم دیتا ہے۔

تفسیر

اس آیت میں خداوند عالم دوبارہ مومنین کو حکم دے رہا ہے کہ منافقوں اور دشمنوں کی دوستی سے بچو البتہ ان کے جذبات و میلانات کو متحرک کرنے کے لئے یوں فرماتا ہے اے ایمان والو! جو لوگ تمہارے دین کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے کھیل کود سمجھتے ہیں وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین و منافقین میں سے ان میں سے کسی کو بھی دوست نہ بناؤ۔

آیت کے آخر میں ''وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنتُمْ مُّؤْمِنِينَ'' فرما کر تاکید کی گئی ہے کہ تقویٰ اور ایمان سے ایسے لوگوں کی دوستی مناسبت نہیں رکھتی۔

(۵۸) گذشتہ آیت میں منافقین اور اہل کتاب کی ایک جماعت سے دوستی کرنے سے روکا گیا ہے کیونکہ وہ لوگ احکام اسلام کا مذاق اڑاتے تھے اب اس آیت میں شاہد کے طور پر ان کے ایک عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب تم مسلمانوں کو نماز کی دعوت دیتے ہو تو وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے کھیل کود سمجھتے ہیں۔

اس کے بعد ان کے عمل کی علت بیان کی گئی ہے: ایسا اس لئے ہے کہ وہ ایک نادان گروہ ہے اور حقائق کے ادراک کی منزل سے بہت دور ہے۔

اذان شعائر اسلام میں سے ہے۔ روایات اہل بیت علیہم السلام میں ہے کہ اذان پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وحی کے ذریعہ تعلیم دی گئی تھی۔

(۵۹) قُلۡ یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ هَلۡ تَنۡقِمُوۡنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡنَا وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلُ ۙ وَ اَنَّ اَكۡثَرَكُمۡ فٰسِقُوۡنَ	کہہ دو اے اہل کتاب! کیا تم ہم پر اعتراض کرتے ہو (مگر ہم نے کیا کیا ہے) سوائے اس کے کہ ہم خدائے یکتا پر، جو کچھ اس نے ہم پر نازل کیا ہے اس پر اور جو کچھ اس سے پہلے نازل ہو چکا ہے اس پر ایمان لے آئے ہیں اور یہ اس بنا پر ہے کہ تم میں سے اکثر راہ حق سے منحرف ہو گئے ہیں۔
(۶۰) قُلۡ هَلۡ اُنَبِّئُكُمۡ بِشَرٍّ مِّنۡ ذٰلِكَ مَثُوۡبَةً عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ مَنۡ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَیۡهِ وَ جَعَلَ مِنۡهُمُ الۡقِرَدَةَ وَ الۡخَنَازِیۡرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوۡتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنۡ سَوَآءِ السَّبِیۡلِ	کہہ دو کیا میں تمہیں ایسے لوگوں کے بارے میں آگاہ کروں جن کا ٹھکانا اور جزا اس سے بدتر ہے وہ لوگ کہ جنہیں خدا نے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور ان پر اپنا غضب نازل کیا ہے اور انہیں مسخ کر دیا ہے اور ان میں سے بندر اور خنزیر بنائے اور جنہوں نے بت پرستی کی ہے ان کا ٹھکانا برا ہے اور وہ راہ راست سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

شان نزل

عبداللہ بن عباس سے منقول ہے

کچھ یہودی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے پاس آئے اور درخواست کی کہ اپنے عقائد انہیں بتائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں خدائے بزرگ و یگانہ پر ایمان رکھتا ہوں اور جو کچھ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، موسیٰ، عیسیٰ اور دوسرے پیغمبران خدا پر نازل ہوا ہے اسے حق سمجھتا ہوں اور ان میں تفریق نہیں کرتا۔

وہ کہنے لگے ہم عیسیٰ کو نہیں مانتے اور اس کی نبوت کو قبول نہیں کرتے انہوں نے مزید کہا ہم کسی دین کو تمہارے دین سے بدتر نہیں سمجھتے

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور انہیں جواب دیا۔

تفسیر

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ اہل کتاب سے پوچھیے اور کہئے کہ ہم سے کون سا کام سرزد ہوا ہے

کہ تم ہم میں عیب نکالتے ہو اور ہم پر تنقید کرتے ہو سوائے اس کے کہ ہم خدائے یگانہ پر ایمان لائے ہیں اور جو ہم پر اور گذشتہ انبیاء پر نازل ہوا ہے اس کے سامنے ہم سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

آیت کے آخر میں ایک جملہ ہے جو درحقیقت پہلے جملے کی علت اور سبب ہے اس میں کہا گیا ہے اگر تم توحید خالص اور تمام آسمانی کتب کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر ہم پر اعتراض کرتے ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم میں سے اکثر فسق اور گناہ سے آلودہ ہو چکے ہیں اور اگر کچھ لوگ پاکیزگی اور حق کا راستہ اپناتے ہیں تو یہ تمہاری نظر میں عیب ہے۔

(۶۰) زیر نظر دوسری آیت میں اہل کتاب کے تحریف شدہ عقائد' غلط اعمال اور جو سزائیں انہیں دامن گیر ہوئیں ان کا موازنہ سچے مومنین اور مسلمین کی حالت و کیفیت سے کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان دونوں گروہوں میں سے کون سا تنقید اور سرزنش کا مستحق ہے یہ دراصل متعصب اور ہٹ دھرم افراد کو متوجہ کرنے کے لئے ایک منطقی جواب ہے ارشاد ہوتا ہے! اے پیغمبرؐ! ان سے کہہ دو کیا خدائے یکتا اور آسمانی کتب پر ایمان لانا باعث سرزنش اور وجہ اعتراض ہے یا پھر خود ان کے برے اعمال جن کے سبب وہ خدائی سزاؤں میں گرفتار ہوئے ہیں انہیں کہہ دو کیا میں تمہیں ان لوگوں کے بارے میں آگاہ کروں جن کا معاملہ بارگاہ الٰہی میں اس سے بدتر ہے۔

اس کے بعد اس مطلب کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے وہ لوگ جو اپنے اعمال کی وجہ سے پروردگار کی آفت اور غضب کا شکار ہوئے ہیں انہیں بندر اور خنزیر کی شکل میں مسخ کر دیا گیا ہے اور وہ کہ جنہوں نے طاغوت اور بت کی پرستش کی ہے یقیناً ایسے لوگوں کی دنیا میں حیثیت و مقام اور آخرت میں ٹھکانا بدتر ہوگا اور وہ راہ راست اور جادہ مستقیم سے بہت گمراہ ہیں۔

(۶۱) وَ اِذَا جَآءُوۡكُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا وَ قَدۡ دَّخَلُوۡا بِالۡكُفۡرِ وَ هُمۡ قَدۡ خَرَجُوۡا بِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا كَانُوۡا يَكۡتُمُوۡنَ	اور وہ جب تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں لیکن وہ کفر کے ساتھ داخل ہوتے ہیں اور کفر کے ساتھ ہی نکل جاتے ہیں اور جو کچھ وہ چھپائے ہوئے ہیں خدا اس سے آگاہ ہے۔
(۶۲) وَ تَرٰى كَثِيۡرًا مِّنۡهُمۡ يُسَارِعُوۡنَ فِى الۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ وَ اَكۡلِهِمُ السُّحۡتَ ؕ لَبِئۡسَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ	تم ان میں سے بہت سوں کو دیکھو گے کہ وہ گناہ' تجاوز اور مال حرام کھانے میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں جو کام وہ انجام دیتے ہیں کس قدر برا ہے۔

(۶۳)لَوْ لَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ	(عیسائی اور یہودی علماء) انہیں گناہ آمیز باتوں اور مال حرام کھانے سے کیوں منع نہیں کرتے کس قدر برا ہے وہ عمل جو وہ انجام دیتے ہیں

تفسیر

پہلی آیت میں اہل کتاب منافقین کے بارے میں بحث مکمل کرتے ہوئے اوران کے چہروں سے نفاق کے پردے ہٹاتے ہوئے مسلمانوں کوآ گاہ کیا گیا ہے کہ جس وقت وہ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں لیکن کفر سے معمور دل کے ساتھ آتے ہیں اوراسی حالت میں تمہارے پاس سے اٹھ جاتے ہیں اور منطقی استدلال اورتمہاری باتیں ان کے دل پر کچھ اثر نہیں کرتیں۔

آیت کے آخر میں انہیں خطرے سے آ گاہ کرتا ہے کہ ان تمام پردہ پوشیوں کے باوجود جو کچھ تم چھپاتے ہو خدااس سے آ گاہ اور باخبر ہے۔

(۶۲)اس آیت میں ان کے نفاق کی کچھ اور نشانیاں بیان کی گئی ہیں ارشاد ہوتا ہے تم ان میں سے بہت سوں کو دیکھو گے کہ گناہ ظلم اور حرام خوری کی راہ میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں۔

یعنی گناہ اور ظلم کے راستے میں یوں قدم بڑھاتے ہیں گویا باعث فخر اہداف کی طرف بڑھ رہے ہیں اور بغیر کسی شرم کے کوشش کرتے ہیں کہ ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں۔

آیت کے آخر میں ان کے اعمال کی برائی تاکیداً ظاہر کرنے کے لئے فرمایا گیا ہے یہ لوگ کیسا برا اور قبیح عمل انجام دیتے ہیں۔

(۶۳) زیرنظر تیسری آیت میں ان کے علماء پر حملہ کیا گیا ہے جو اپنی خاموشی کے ذریعے انہیں گناہ کا شوق دلاتے تھے ارشاد ہوتا ہے عیسائی اور یہودی علماء انہیں گناہ آلودہ باتوں اور حرام خوری سے کیوں نہیں روکتے۔

علماء ایک فاسد معاشرے کی اصلاح کے لئے پہلے ان کے غلط افکار اور عقائد کی اصلاح کریں کیونکہ جب تک افکار و نظریات میں انقلاب نہیں آتا یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ ان کے عمل میں کوئی گہری اصلاح ہوسکے اس طرح سے آیت فاسد اور برے معاشرے کی اصلاح کے لئے علماء کونشاندہی کرتی ہے کہ کام فکرا نقلاب سے شروع کیا جائے۔

جیسے اصلی گناہ گاروں کی مذمت کی گئی ہے آیت کے آخر میں خاموش رہنے والے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر ترک کر دینے والے علماء کی بھی مذمت کی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے کتنا برا ہے وہ کام جو یہ انجام دیتے ہیں۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو لوگ امر بالمعروف و نی عن المنکر کی عظیم ذمہ داری کو پورا نہیں کرتے خاص طور پر علماء اور

دانشمندان کا انجام بھی اصلی گناہ گاروں کا سا ہوگا درحقیقت یہ لوگ ان کے جرم میں شریک شمار ہوں گے۔

مشہور مفسر ابن عباس سے منقول ہے وہ کہتے ہیں۔

"اپنی ذمہ داریوں کی پیمان نہ کرنے والے اور خاموش رہنے والے علماء کی مذمت میں یہ سخت ترین آیت ہے"۔

واضح ہے کہ یہ حکم خاموش رہنے والے یہودی اور عیسائی علماء سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ان تمام صاحبان فکر ونظر راہبروں اور علماء کے بارے میں ہے جو لوگوں کو گناہ سے آلودہ ہوتا دیکھیں اور انہیں ظلم وستم کی راہ پر تیز گام پائیں اور خاموش بیٹھے رہیں کیونکہ خدا کا حکم تو سب کے لئے برابر ہے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا

"گذشتہ قومیں اس بنا پر ہلاک اور نابود ہوگئیں کہ وہ گناہ کی مرتکب ہوتی تھیں اور ان کے علماء سکوت اختیار کر لیتے تھے اور نہی عن المنکر نہیں کرتے تھے اس حالت میں ان پر خدا کا عذاب سزائیں اور مصیبتیں نازل ہوتی تھیں پس اے لوگو! تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا کرو تا کہ تمہارا بھی وہی انجام نہ ہو"۔

(٦٤) وَ قَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ وَ لَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ؕ وَ اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَ يَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ	اور یہودی کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ تو زنجیر سے بندھا ہوا ہے انہی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور وہ اس بات کی وجہ سے رحمت الٰہی سے دور ہیں جبکہ اس (کی قدرت) کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں وہ جس طرح سے چاہے (بخشتا اور) خرچ کرتا ہے اور یہ آیات جو تجھ پر تیرے پروردگار کی نازل ہوئی ہیں ان میں سے بہت سوں کے طغیان اور کفر کو بڑھا دیتی ہیں اور ان کے درمیان ہم نے قیامت تک کے لئے دشمنی اور عداوت ڈال دی ہے اور جب بھی انہوں نے جنگ کی آگ روشن کی خدا نے اسے خاموش کر دیا اور وہ زمین میں فساد کے لئے کوشاں رہتے ہیں اور خدا فساد کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

تفسیر

اس آیت میں یہودیوں کی ناروا اور گناہ آلود باتوں کی ایک مثال پیش کی گئی ہے جبکہ گذشتہ آیت میں کلی طور پر ان کی ایسی

باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ تاریخ نشاندہی کرتی ہے کہ یہودی ایک زمانے میں اوج قدرت میں تھے اس وقت کی اہم آباد دنیا کے ایک حصے پر ان کی حکومت تھی حضرت داوَدؑ اور حضرت سلیمان بن داوَدؑ کے زمانے کو بطور نموونہ پیش کیا جاسکتا ہے بعد میں بھی زور وشور سے ان کی قدرت و طاقت موجود رہی لیکن ظہور اسلام کے ساتھ ہی خصوصاً حجاز میں ان کی قدرت کا آفتاب ڈوب گیا بنی نضیر بنی قریظہ اور خیبر کے یہودیوں سے پیغمبر اکرمؐ کی جنگوں کے باعث وہ انتہائی کمزور ہو گئے اس موقع پر ان میں سے بعض نے اپنی گذشتہ قدرت وعظمت کو مدنظر رکھتے ہوئے استہزاء اور مذاق کے طور پر کہا کہ خدا کا ہاتھ تو زنجیر سے بندھا ہوا ہے اور وہ ہم پر بخشش ونوازش نہیں کرتا (بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ بات کہنے والا فنحاص بن عاذورا تھا جو بنی قینقاع کا سردار تھا اور بعض نے نباش بن قیس کا نام لکھا ہے چونکہ دوسرے بھی اس کی گفتگو سے راضی تھے لہٰذا قرآن نے اس بات کی ان سب کی طرف نسبت دی ہے اور فرمایا ہے یہودیوں نے کہا کہ خدا کا ہاتھ زنجیر سے بندھا ہوا ہے۔

خدا تعالیٰ ان کے جواب میں پہلے تو اس عقیدے کی مذمت کرتا ہے فرمایا گیا ہے ان کے ہاتھ زنجیر سے بندھے ہوں اور اس نار وایات کی وجہ سے وہ رحمت سے دور ہوں۔

اس کے بعد اس غلط عقیدے کے بطلان کے لئے ارشاد ہوتا ہے خدا کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے اور جس پر چاہتا ہے لطف وعنایت کرتا ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے یہاں تک کہ ان کی گفتار اور عقائد سے پردہ کشائی کرنے والی یہ آیات ان پر مثبت اثر مرتب کرنے کی بجائے اور انہیں غلط راستے سے باز رکھنے کی بجائے ان میں سے بہت سوں کو ہٹ دھرمی کے چکر میں ڈال دیتی ہیں اور ان کا طغیان و کفر مزید بڑھ جاتا ہے۔

لیکن ان کی ان ناروا باتوں عقائد اور طغیان وکفر میں ہٹ دھرمی کے بدلے خدا نے اس جہان میں ان کے لئے سخت سزا مقرر کی ہے اور وہ یہ کہ ان کے درمیان قیامت تک کے لئے دشمنی اور عداوت ڈال دی ہے۔

آیت کے آخر میں آتش جنگ بھڑکانے کے لئے یہودیوں کی کوششوں اور خدا کی طرف سے مسلمانوں کو اس نابود کرنے والی آگ سے رہائی اور لطف وکرم کے بارے میں اشارہ ہے ارشاد ہوتا ہے جب انہوں نے آتش جنگ بھڑکائی تو خدا نے اسے خاموش کر دیا اور تمہیں اس سے محفوظ رکھا۔ یہ حقیقت میں پیغمبر اسلامؐ کی پر اعجاز زندگی کا ایک نکتہ ہے۔ قرآن مزید کہتا ہے وہ ہمیشہ روئے زمین میں فتنہ فساد کے بیج بونے کی کوشش کرتے ہیں۔ جبکہ خدا فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

(۶۵)وَ لَوۡ اَنَّ اَهۡلَ الۡكِتٰبِ اٰمَنُوۡا وَاتَّقَوۡا لَكَفَّرۡنَا عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ وَ لَاَدۡخَلۡنٰهُمۡ جَنّٰتِ النَّعِيۡمِ	اوراگراہل کتاب ایمان لائے اورانہوں نے تقویٰ اختیار کیا تو ہم ان کے گناہ بخش دیں گے اور انہیں (نعمات سے معمور) باغات بہشت میں داخل کردیں گے۔
(۶۶)وَ لَوۡ اَنَّهُمۡ اَقَامُوا التَّوۡرٰةَ وَ الۡاِنۡجِيۡلَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِمۡ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ لَاَ كَلُوۡا مِنۡ فَوۡقِهِمۡ وَمِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِهِمۡ ؕ مِّنۡهُمۡ اُمَّةٌ مُّقۡتَصِدَةٌ ؕ وَ كَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ سَآءَ مَا يَعۡمَلُوۡنَ ۚ	اوراگر وہ تورات، انجیل اور جو کچھ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے (قرآن کی صورت) میں نازل ہوا ہے اسے قائم رکھیں تو آسمان اور زمین سے رزق کھائیں گے ان میں سے کچھ لوگ میانہ رو ہیں لیکن ان میں سے اکثر برے اعمال انجام دیتے ہیں۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں اہل کتاب کے طور طریقوں اور طرزعمل پر تنقید کی گئی ہے اب ان دو آیات میں تربیتی اصول کے مطابق خدا تعالیٰ اہل کتاب میں سے منحرفین کو راہ راست پر لانے انہیں حقیقی راستے کی نشاندہی کرنے اور ان میں سے اقلیت جو ان کے غلط افعال میں ہم قدم نہ تھی ان کی تعریف کرنے کے لئے کہتا ہے اگر اہل کتاب ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کرلیں تو ہم ان کے گذشتہ گناہوں پر پردہ ڈال دیں گے اور ان سے صرف نظر کرلیں گے۔ نہ صرف ان کے گناہ بخش دیں گے بلکہ انہیں طرح طرح کی نعمتوں سے پر باغات جنت میں داخل کردیں گے۔ یہ تو معنوی اور اخروی نعمتوں کے بارے میں ہے اس کے بعد ایمان وتقویٰ کے گہرے اثر حتیٰ مادی زندگی میں اس کے اثر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے اگر وہ تورات اور انجیل کو قائم رکھیں اور زندگی کے دستور العمل کے طور پر انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے رکھیں اور جو کچھ پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوا ہے اس سب پر عمل کریں چاہے وہ گذشتہ آسمانی کتب ہوں یا قرآن اور ان میں تفریق وتعصب کو راہ نہ دیں تو آسمان وزمین کی نعمتیں انہیں گھیر لیں گی۔

اس میں شک نہیں کہ تورات اور انجیل کو قائم اور برپا رکھنے سے مراد ان کا وہ حقیقی حصہ ہے جو اس زمانے میں ان کے پاس موجود تھا نہ کہ ان کے تحریف شدہ حصے جو کم وبیش قرآن سے پہچانے جاتے تھے۔

حقیقت میں مندرجہ بالا آیت ایک مرتبہ پھر اس بات پر زور دے رہی ہے کہ آسمانی تعلیمات کی پیروی صرف بعد از موت کی زندگی کے اسباب مہیا کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ انسانوں کی تمام مادی زندگی کے لئے بھی مفید ہے یہ پیروی جماعتوں اور گروہوں کی صفوں کو منظم کرتی ہے توانائیوں کو مجتمع کرتی ہے نعمتوں کو بابرکت کرتی ہے وسائل کو وسعت دیتی ہے زندگی کو خوش حال بناتی ہے اور امن وامان پیدا کرتی ہے۔

ان عظیم مادی وسائل اور فراواں انسانی توانائیوں پر ایک نظر ڈالی جائے کہ جو آج کی دنیائے انسانیت میں تعلیمات انبیاء سے انحراف کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں تو ہم دیکھیں گے کہ سب تباہ کن ہتھیاروں بے سبب کشمکشوں اور ویران کن مساعی پر صرف ہو رہی ہیں آج دنیا کی جتنی دولت اور وسائل دنیا کی تباہی کے لئے استعمال ہو رہے ہیں وہ اصلاح وفلاح کے لئے استعمال ہونے والے وسائل سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں آج کس قدر دماغی صلاحتیں جو جنگی ہتھیاروں کی تیاری اور استعماری وسامراجی مقاصد کے لئے استعمال ہو رہی ہیں جو وسائل وذرائع صلاحیتیں اور توانائیاں فضول اور بے کار صرف ہو رہی ہیں ان کی نوع انسانی کس قدر ضرورت منداور محتاج ہے یہ سب نہ ہوتا تو دنیا آج خوب صورت زیبا اور رہنے کے قابل ہوتی۔

آیت کے آخر میں ان میں سے ایک نیک اقلیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے اگر چہ ان میں سے زیادہ تر تو بد کار ہی ہیں لیکن پھر بھی کچھ میانہ رو اور معتدل افراد ان میں موجود ہیں جن کا معاملہ خدا کے نزدیک اور مخلوق خدا کے نزدیک دوسروں سے مختلف ہے۔

اہل کتاب میں سے نیک اور صالح اقلیت کے بارے میں سورہ اعراف آیہ ۱۵۹ اور ۱۸۱ اور سورہ آل عمران آیہ ۷۵ میں بھی ایسی تعبیر دکھائی دیتی ہے۔

(۶۷) يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْکَ مِنْ رَّبِّکَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ	اے پیغمبر جو کچھ تیرے پروردگار کی طرف سے تجھ پر نازل ہوا ہے اسے کامل طور سے لوگوں تک پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو گویا تم نے اس کا کوئی کار رسالت سرانجام ہی نہیں دیا اور خداوند تعالیٰ تمہیں لوگوں کے ان تمام خطرات سے جن کا احتمال ہے محفوظ رکھے گا اور خداوند تعالیٰ ہٹ دھرم کفار کی ہدایت نہیں کرتا۔

تفسیر

انتخاب جانشین پیغمبرؐ ہی آخری کار رسالت تھا

اس آیت کا ایک مخصوص لب ولہجہ ہے جو اسے اس سے پہلی آیات اور اس کے بعد کی آیات سے ممتاز کرتا ہے اس آیت میں روئے سخن صرف پیغمبرؐ کی طرف ہے اور یہ آیت صرف انہی کی ذمہ داری کو بیان کرتی ہے" يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ "اے پیغمبر! سے اس آیت کی ابتدا ہو رہی ہے اور یہ آیت صراحت اور تاکید کے ساتھ پیغمبرؐ کو حکم دے رہی ہے کہ جو کچھ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دیں۔ اس کے بعد اس حکم کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے تاکید مزید کے طور پر اس خطرے سے متنبہ کرتا ہے کہ اگر تم نے یہ کام نہ کیا حالانکہ وہ ہرگز اس کام کی سرانجام دہی کو ترک نہ کرتے تو یہ ایسا ہوگا گویا تم نے کوئی کار رسالت سرانجام ہی نہیں دیا (وَاِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ) اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ کے اضطراب اور پریشانی کو دور

کرنے کے لئے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہتا ہے اس رسالت اور پیغام کی ادائیگی کے بارے میں تجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ خدا تمہیں ان کے خطرات سے محفوظ رکھے گا۔

اور آیت کے آخر میں ان لوگوں سے جو اس مخصوص پیغام کا انکار کریں اور اس کے خلاف ہٹ دھرمی کرتے ہوئے کفر اختیار کرلیں ایک تہدید اور سزا کے عنوان سے یوں کہتا ہے خدا ہٹ دھرمی کرنے والے کافروں کو ہدایت نہیں کرتا۔

اور اس حکم کی تعمیل اور اس رسالت کی تبلیغ نہ کرنے کی صورت میں پیغمبرؐ کو یہ تہدید کہ اگر تم نے اس حکم کے پہنچانے میں کوتاہی کی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے کوئی کار رسالت سرانجام ہی نہیں دیا جو قرآن میں صرف اسی آیت میں ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کونسا ایسا اہم مقصد و مطلب تھا جس کے پہنچانے کے لئے خداوند تعالیٰ اپنے پیغمبرؐ کو اتنی تاکید کے ساتھ حکم دے رہا ہے؟

آیہ تبلیغ کی شان نزول

اہل سنت کے علماء اور علماء شیعہ کی تحریر کردہ مختلف کتابوں میں خواہ وہ تفسیر کی کتابیں ہوں یا حدیث و تاریخ کی ان میں بہت زیادہ روایات ایسی ملتی ہیں جو صراحت کیساتھ اس حقیقت کی بیان کرتی ہیں کہ آیت مذکورہ حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے

واقعہ غدیر کا خلاصہ

پیغمبر اکرمؐ کی زندگی کا آخری سال تھا حجۃ الوداع کے مراسم جس قدر باوقار و پرشکوہ ہو سکتے اس قدر پیغمبر اکرمؐ کی ہمراہی میں اختتام پذیر ہوئے۔

نہ صرف مدینے کے لوگ اس سفر میں پیغمبرؐ کے ساتھ تھے بلکہ جزیرہ نمائے عرب کے دیگر مختلف حصوں کے مسلمان بھی یہ عظیم تاریخی اعزاز و افتخار حاصل کرنے کے لئے آپؐ کے ہمراہ تھے۔

سرزمین حجاز کا سورج دروں اور پہاڑوں پر آگ برسا رہا تھا لیکن اس سفر کی بے نظیر روحانی مٹھاس تمام تکلیفوں کو آسان بنا رہی تھی۔ زوال کا وقت نزدیک تھا آہستہ آہستہ جحفہ کی سرزمین اور اس کے بعد خشک اور جلانے والے غدیر خم کے بیابان نظر آنے لگے۔

جمعرات کا دن تھا اور ہجرت کا دسواں سال۔ آٹھ دن عید قربان کو گزرے تھے کہ اچانک پیغمبرؐ کی طرف سے ان کے ہمراہیوں کو ٹھہر جانے کا حکم دیا گیا مسلمانوں نے بلند آواز سے ان لوگوں کو جو قافلے کے آگے آگے چل رہے تھے واپس لوٹنے کے لئے پکارا اور اتنی دیر کے لئے ٹھہر گئے کہ پچھلے آنے والے لوگ بھی پہنچ جائیں آفتاب خط نصف سے گزر گیا تو پیغمبرؐ کے موذن نے اللہ اکبر کی صدا کے ساتھ لوگوں کو نماز ظہر پڑھنے کی دعوت دی۔ مسلمان جلدی

جلدی نماز پڑھنے کے لئے تیار ہو گئے لیکن فضا اتنی گرم تھی کہ بعض لوگ مجبور تھے کہ وہ اپنی عبا کا کچھ حصہ پاؤں کے نیچے اور باقی سر کے اوپر لے لیں۔ ورنہ بیابان کی گرم ریت اور سورج کی شعاعیں ان کے سر اور پاؤں کو تکلیف دے رہے تھے۔ اس صحرا میں کوئی سائبان نظر آتا تھا اور نہ ہی کوئی سبزہ یا گھاس صرف چند بے برگ و بار بیابانی درخت تھے جو گرمی کا سختی کے ساتھ مقابلہ کر رہے تھے کچھ لوگ انہی چند درختوں کا سہارا لیے ہوئے تھے اور انہوں نے ان برہنہ درختوں پر ایک کپڑا ڈال رکھا تھا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ایک سائبان سا بنا رکھا تھا لیکن گرم ہوا اس سائبان کے نیچے سے گزرتی ہوئی سورج کی جلانے والی گرم ہوا کو اس سائبان کے نیچے بھی پھیلا رہی تھی بہرحال ظہر کی نماز پڑھ لی گئی۔

مسلمان ارادہ کر رہے تھے کہ فوراً اپنے چھوٹے چھوٹے خیموں میں جا کر پناہ لیں جو انہوں نے اپنے ساتھ اٹھا رکھے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں آگاہ کیا کہ وہ سب کے سب خداوند تعالیٰ کا ایک نیا پیغام سننے کے لئے تیار ہوں جسے ایک مفصل خطبے کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دور تھے وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ملکوتی چہرہ اس عظیم اجتماع میں دور سے نہیں دیکھ پا رہے تھے لہٰذا اونٹوں کے پالانوں کا منبر بنایا گیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے اوپر تشریف لے گئے پہلے پروردگار عالم کی حمد و ثنا بجالائے اور خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے یوں خطاب فرمایا میں عنقریب خداوند تعالیٰ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے تمہارے درمیان سے جا رہا ہوں میں بھی جوابدہ ہوں اور تم بھی جوابدہ ہو تم میرے بارے میں کیا گواہی دو گے لوگوں نے بلند آواز میں کہا **"نشھدانک قد بلغت و نصحت و جھدت فجزاک اللّٰہ خیرا"** (یعنی ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے فریضہ رسالت انجام دیا اور خیر خواہی کی ذمہ داری کو انجام دیا اور ہماری ہدایت کی راہ میں سعی و کوشش کی خدا آپ کو جزائے خیر دے) اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیا تم لوگ خدا کی وحدانیت میری رسالت اور روز قیامت کی حقانیت اور اس دن مردوں کے قبروں سے مبعوث ہونے کی گواہی نہیں دیتے؟

سب نے کہا کیوں نہیں ہم سب گواہی دیتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا خداوندا گواہ رہنا

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزید فرمایا لوگوں! کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟

انہوں نے کہا جی ہاں۔

اس کے بعد سارے بیابان پر سکوت کا عالم طاری ہو گیا۔ سوائے ہوا کی سنسناہٹ کے کوئی چیز سنائی نہیں دیتی تھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا دیکھو! میں تمہارے درمیان دو گراں نمایاں اور گرانقدر چیزیں بطور یادگار کے چھوڑے جا رہا ہوں

تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟

حاضرین میں سے ایک شخص نے پکار کر کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ دو گرانما چیزیں کونسی ہیں؟

تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا پہلی چیز تو اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو ثقل اکبر ہے اس کا ایک سرا تو پروردگار عالم کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا تمہارے ہاتھ میں ہے اس سے ہاتھ نہ ہٹانا ورنہ تم گمراہ ہو جاؤ گے اور دوسری گرانقدر یادگار میرے اہل بیت ہیں اور مجھے خدائے لطیف وخبیر نے خبر دی ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ بہشت میں مجھ سے آ ملیں گے۔ ان دونوں سے آگے بڑھنے اور ان سے تجاوز کرنے کی کوشش نہ کرنا اور نہ ہی ان سے پیچھے رہنا کہ اس صورت میں بھی تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

اچانک لوگوں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اردگرد نگاہیں دوڑا رہے ہیں گویا کسی کو تلاش کر رہے ہیں جو نہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر حضرت علی علیہ السلام پر پڑی فوراً ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور انہیں اتنا بلند کیا کہ دونوں کی بغلوں کے نیچے کی سفیدی نظر آنے لگی اور سب لوگوں نے انہیں دیکھ کر پہچان لیا کہ یہ تو اسلام کا وہی سپہ سالار ہے کہ جس نے کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھا اس موقع پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز زیادہ نمایاں اور بلند ہو گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا

"ایها الناس من او لی الناس بالمومنین من انفسهم"

(اے لوگو! بتاؤ وہ کون ہے جو تمام لوگوں کی نسبت مومنین پر خود ان سے زیادہ اولیت رکھتا ہے؟)

اس پر سب حاضرین نے بہ یک آواز جواب دیا کہ خدا اور اس کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہتر جانتے ہیں۔

تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"خدا میرا مولا و رہبر ہے اور میں مومنین کا مولا و رہبر ہوں اور ان کے اوپر ان کی نسبت خود ان سے زیادہ حق رکھتا ہوں اور میرا ارادہ ان کے ارادے سے مقدم ہے"

اس کے بعد فرمایا:

" فمن کنت مو لاه فعلی مو لا " (جس جس کا میں مولا ہوں علی علیہ السلام بھی اس اس کا مولا و رہبر ہے)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جملے کی تین مرتبہ تکرار کی اور بعض راویوں کے قول کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ جملہ چار مرتبہ دہرایا اور اس کے بعد آسمان کی طرف سر بلند کر کے بارگاہ خداوندی میں عرض کی:

" اللّٰهم وال من والاه و عاد من عاداه واحب من احبه و بغض من البغضه و انصر من نصره و اخذل من خذله وادر الحق معه حیث دار "

(بارالہا! جواس کو دوست رکھے تو اس کو دوست رکھ اور جو اس سے دشمنی کرے تو اس سے دشمنی رکھ جو اس سے محبت کرے تو اس سے محبت کر اور جو اس سے بغض رکھے تو اس سے بغض رکھ جو اس کی مدد کرے تو اس کی مدد کر جو اس کی مدد سے کنارہ کشی کرے تو اسے اپنی مدد سے محروم رکھ اور حق کو ادھر پھیر دے جدھر وہ رخ کرے)

اس کے بعد فرمایا: **الا فلیبلغ الشاهد الغائب** یعنی تمام حاضرین آگاہ ہو جائیں اس بات پر کہ یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کو ان لوگوں تک پہنچائیں جو یہاں پر اس وقت موجود نہیں ہیں پیغمبر اکرم ﷺ کا خطبہ ختم ہو گیا پیغمبر پسینے میں شرابور تھے حضرت علی علیہ السلام بھی پسینے میں نہائے ہوئے تھے دوسرے تمام حاضرین کے بھی سر سے پاؤں تک پسینہ بہہ رہا تھا ابھی اس جمعیت کی صفیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئی تھیں کہ جبرئیل امین وحی لے کر نازل ہوئے اور تکمیل دین کی پیغمبر ﷺ کو ان الفاظ کے ساتھ بشارت دی

" الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی........ الخ"

آج کے دن میں تمہارے لیے تمہارے دین اور آئین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت کو تم پر تمام کر دیا۔ اتمام نعمت کا پیغام سن کر پیغمبر ﷺ نے فرمایا

"اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر علی اکمال الدین و اتمام النعمة و رضی الرب برسالتی والولایة لعلی من بعد "

(ہر طرح کی بزرگی و بڑائی خدا ہی کے لئے ہے کہ جس نے اپنے دین کو کامل فرمایا اور اپنی نعمت کو ہم پر تمام کیا اور میری نبوت و رسالت اور میرے بعد کے لیے علی علیہ السلام کی ولایت کے لئے خوش ہوا)

امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت کا پیغمبر ﷺ کی زبان مبارک سے اعلان سن کر حاضرین میں مبارک باد کا شور برپا ہوا لوگ بڑھ چڑھ کر اس اعزاز و منصب پر حضرت علی علیہ السلام کو اپنی طرف سے مبارکباد پیش کر رہے تھے معروف شخصیتوں میں سے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی طرف سے مبارک باد کے یہ الفاظ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں کہ انہوں نے کہا:

بخ بخ لک یا بن ابی طالب اصبحت و امیت مولائی و مولا کل مومن و مونة

(مبارک ہو مبارک ہو اے فرزند ابی طالب کہ آپ میرے اور تمام صاحبان ایمان مردوں اور عورتوں کے مولا اور رہبر ہو گئے)۔

یہ تھا حدیث غدیر کا خلاصہ جو اہل سنت اور شیعہ کتب میں موجود ہے۔

(۶۸)قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَسۡتُمۡ عَلٰى شَىۡءٍ حَتّٰى تُقِيۡمُوا التَّوۡرٰٮةَ وَ الۡاِنۡجِيۡلَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ‌ؕ وَ لَيَزِيۡدَنَّ كَثِيۡرًا مِّنۡهُمۡ مَّاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ طُغۡيَانًا وَّكُفۡرًا‌ ۚ فَلَا تَاۡسَ عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ	اے اہل کتاب تم کچھ وقعت نہیں رکھتے جب تک کہ تم تورات و انجیل اور اس کو جو تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے قائم اور برپا نہ کرو لیکن جو کچھ تجھ پر تیرے پروردگر کی طرف سے نازل ہوا ہے(نہ صرف ان کی بیداری کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ) ان میں سے بہت سوں کے طغیان اور کفر کو زیادہ کرتا ہے اس بناپر اس کافر قوم (اوران کی مخالفت) سے غمگین نہ ہو۔
(۶۹)اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِيۡنَ هَادُوۡا وَالصّٰبِـُٔوۡنَ وَالنَّصٰرٰى مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ	وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور یہودی صائبین اور عیسائی جو بھی خدائے یگانہ اور روز قیامت پر ایمان لے آئے گا اور عمل صالح بجالائے گا تو نہ ایسے لوگوں پر کوئی خوف طاری ہوگا اور نہ ہی وہ مخزون ومغموم ہوں گے۔

شان نزول

تفسیر مجمع البیان اور تفسیر قرطبی میں ابن عباس سے اس طرح منقول ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت پیغمبرﷺ کی خدمت میں آئی اور پہلا سوال یہ کیا کہ کیا آپ یہ اقرار کرتے ہیں کہ تورات خدائی طرف سے ہے پیغمبرﷺ نے اثبات میں جواب دیا۔انہوں نے کہا کہ ہم بھی تورات کو قبول کرتے ہیں لیکن اس کے علاوہ اور کسی چیز پر ایمان نہیں رکھتے (درحقیقت تورات ہمارے اور آپ کے درمیان قدر مشترک ہے لیکن قرآن ایسی کتاب ہے کہ جس پر صرف آپ ہی عقیدہ رکھتے ہیں تو کیا ہی اچھا ہو کہ ہم تورات کو تو قبول کرلیں اور اس کے علاوہ کی نفی کردیں)۔اس پر پہلی آیت نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا گیا۔

تفسیر

جیسا کہ ہم اس سورہ کی آیات کی تفسیر میں اب تک پڑھ چکے ہیں کہ ان میں قابل لحاظ حصہ اہل کتاب یہود ونصاریٰ کی وعدہ شکنیوں بحثوں سوالات اور اعتراضات ہی کے متعلق تھا یہ آیت بھی ان بحثوں کے ایک اور رخ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور ان کی اس کمزور منطق کا جواب دے رہی کہ جو یہ چاہتے تھے کہ تورات کو تو مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ایک متفق علیہ کتاب ہونے کی حیثیت سے قبول کرلیا جائے اور قرآن کو ایسی کتاب ہونے کی حیثیت سے کہ جس میں اختلاف پایا جاتا ہے چھوڑ دیا جائے یہ آیت انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہی ہے اہل کتاب تمہاری کوئی بھی وقعت نہیں ہوگی جب تک کہ تم تورات وانجیل اور تمام آسمانی کتابوں

کو جو تم پر نازل ہوئی ہیں بلا استثنا اور بغیر کسی تفاوت کے تسلیم نہ کرو گے۔

کیونکہ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ یہ تمام کتابیں ایک ہی مبدا سے صادر ہوئی ہیں اور ان سب کی اساس اور اصول بھی ایک سے ہیں اگر چہ ان میں سے آخری کتاب کامل ترین اور جامع ترین ہے اسی بنا پر لازم العمل ہے۔

لیکن قرآن پھر ایک مرتبہ ان کی اکثریت کی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگ نہ صرف ان آیات سے پند و نصیحت نہیں لیتے اور ہدایت حاصل نہیں کرتے بلکہ ان کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان کا کفر وطغیان بڑھتا ہی جاتا ہے۔

آیت کے آخر میں اپنے پیغمبر ﷺ کو اس منحرف اکثریت کی انتہائی سختی کے مقابلہ میں تسلی دیتے ہوئے کہتا ہے اس کافر جمعیت کی مخالفتوں سے غمگین نہ ہو کیونکہ اس کا نقصان خود ان ہی کی طرف لوٹ جائے گا اور تجھے اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔

یہ بات بھی صاف ظاہر ہے کہ اس آیت کے مفاہیم قوم یہود کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ مسلمان بھی اگر صرف اسلام کے دعویٰ پر ہی قناعت کریں اور تعلیمات انبیاء علیہم السلام کے اصول اور خاص طور پر اپنی آسمانی کتاب قرآن کو عملاً برپا نہ کریں تو ان کی کسی قسم کی کوئی حیثیت اور قدر و قیمت بارگاہ خدا میں ہوگی نہ انفرادی و اجتماعی زندگی میں اور وہ ہمیشہ زبوں حال زیردست اور شکست خوردہ رہیں گے۔

(۶۹) یہ آیت میں پھر نئے سرے سے اس حقیقت کو محل تاکید قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ تمام اقوام و ملل اور تمام مذاہب کے پیروکار بلا استثنا خواہ وہ مسلمان ہوں یا یہودی صائبین ہوں یا نصاریٰ صرف اسی صورت میں اہل نجات ہوں گے اور اپنے آئندہ سے خوف زدہ اور گذشتہ سے محزون و غمگین نہ ہوں گے جب کہ وہ خدا اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہوں گے اور نیک اعمال انجام دیں گے۔

یہ آیت حقیقت میں ان لوگوں کے لئے دندان شکن جواب ہے جو نجات کو کسی خاص ملت اور قوم میں منحصر سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے احکام میں ''تبعیض'' (بعض کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا) کے قائل ہو جائیں اور مذہبی دعوتوں کو قومی تعصّبات سے ملا دیں آیت کہتی ہے کہ راہ نجات ایسی باتوں کو برکنار رکھنے میں منحصر ہے۔

(۷۰) لَقَدۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ وَ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡهِمۡ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمۡ رَسُوۡلٌۢ بِمَا لَا تَهۡوٰٓى اَنۡفُسُهُمۡ ۙ فَرِيۡقًا كَذَّبُوۡا وَ فَرِيۡقًا يَّقۡتُلُوۡنَ ۚ	ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کی طرف رسول بھیجے لیکن جب بھی کوئی پیغمبر ان کی خواہشات نفسانی اور میلانات کے خلاف آتا تو بعض کی تو تکذیب کرتے اور بعض کو قتل کر دیتے۔

(۷۱) وَ حَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَ صَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَ صَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ	اور انہوں نے یہ گمان کرلیا تھا کہ اس کا کوئی بدلہ اور سزا نہ ہوگی لہٰذا وہ حقائق کو دیکھنے اور سچی باتوں کو سننے سے اندھے اور بہرے ہو گئے اس کے بعد (پھر وہ بیدار ہوئے اور) خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی اس کے بعد (دوبارہ خواب غفلت میں جا پڑے اور) ان میں سے بہت سے اندھے اور بہرے ہو گئے اور خدا ان کی کارگزاریوں پر خوب اچھی طرح مطلع ہے۔

تفسیر

سورہ بقرہ میں جو آیات گزر چکی ہیں ان میں اور اس سورہ کے شروع میں جو آیات گزری ہیں ان میں اس تاکیدی عہد و پیمان کی طرف جو خداوند تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے لیا تھا اشارہ ہو چکا ہے اس آیت میں دوبارہ اس عہد پیمان کی یاد دہانی کرتے ہوئے فرماتا ہے ہم نے بنی اسرائیل سے پیمان لیا اور ان کی ہدایت اور اس پیمان کو وفا کرنے کا مطالبہ کرنے کے لئے ان کی طرف پیغمبر بھیجے۔

پھر مزید کہتا ہے انہوں نے نہ صرف یہ کہ اس پیمان پر عمل نہیں کیا بلکہ جب بھی کوئی پیغمبر ان کے میلانات اور ہوا و ہوس کے خلاف کوئی حکم لاتا تو وہ اس کی مخالفت میں سخت ترین مقابلے اور جھگڑے پر اتر آتے تھے ان میں سے کچھ انبیاء کی تو وہ تکذیب کرتے تھے اور انہیں جھٹلاتے تھے اور جن انبیاء کی تکذیب کرنے پر اور ان کے اثرات کو روکنے پر قادر نہ ہوتے تھے انہیں قتل کر دیتے تھے۔

۷۱) اس آیت میں ان سرکشیوں اور جرائم کے باوجود ان کی بے جا خود فریبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ ان حالات کے باوصف وہ یہ گمان کرتے تھے کہ کوئی عذاب و سزا انہیں دامن گیر نہ ہوگی۔

جیسا کہ دوسری آیات میں تصریح ہو چکی ہے وہ خود کو ایک برتر قوم وقبیلہ سمجھتے تھے اور خود کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔

آخر کار اس خطرناک فریب خوردگی نے اور اپنے آپ کو برتر سمجھنے نے ایک قسم کا پردہ ان کی آنکھوں اور کانوں پر ڈال دیا تھا جس کی وجہ سے وہ آیات خدا دیکھنے سے اندھے اور کلمات حق سننے سے بہرے ہو گئے۔

لیکن جب انہوں نے اللہ کے عذاب کے نمونے اور اپنے برے اعمال کے انجام کا مشاہدہ کیا تو پشیمان ہوئے اور توبہ کر لی اور اس حقیقت کی طرف متوجہ ہوئے کہ خداوند تعالیٰ کی دھمکیاں یقینی اور سچ ہونے والی ہیں نیز وہ قطعاً کوئی برتر خاندان نہیں ہیں تو خدا نے بھی ان کی توبہ کو قبول کر لیا۔

مگر یہ بیداری اور ندامت و پشیمانی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی اور انہوں نے دوبارہ طغیان و سرکشی اختیار کر لی اور حق و عدالت کو ٹھکرانا شروع کر دیا اور ایک دفعہ پھر غفلت کے پردے کہ جو گناہ کے اندر ڈوب جانے کے آثار ہیں ان کی آنکھوں اور کانوں

پر پڑ گئے اور پھر وہ آیات حق دیکھنے سے اندھے اور حق کی باتیں سننے سے بہرے ہو گئے اور ان میں سے بہت سوں کی یہ حالت ہو گئی۔

آیت کے آخر میں ایک مختصر اور پر معنی جملے کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ خدا کسی وقت بھی ان کے اعمال سے غافل نہیں تھا اور تمام کام جو وہ انجام دیتے ہیں انہیں وہ دیکھتا ہے۔

(۷۲)لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَ قَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰهُ النَّارُ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ	جنہوں نے یہ کہا کہ خدا مسیح ابن مریم ہی ہے وہ یقیناً کافر ہیں (جبکہ خود) مسیح نے یہ کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل تم خدائے واحد و یگانہ کی عبادت کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی، کیونکہ جو شخص کسی کو خدا کا شریک قرار دے گا خدا نے اس پر جنت کو حرام کر دیا ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ظالموں کا کوئی یار و انصار نہیں ہے۔
(۷۳)لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْآ اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَ اِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ	جنہوں نے یہ کہا کہ خدا تین میں سے ایک ہے وہ بھی یقیناً کافر ہو گئے ہیں کیونکہ معبود یگانہ کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے اور اگر وہ اپنے اس قول سے دستبردار نہ ہوئے تو ان میں سے (اس عقیدہ پر قائم رہنے والے) کافروں کو دردناک عذاب پہنچے گا۔
(۷۴)اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ	کیا وہ خدا کے حضور توبہ نہیں کرتے اس کی طرف نہیں پلٹتے اور اس سے طلب بخشش نہیں کرتے جبکہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر

ان مباحث کے بعد کہ جو گذشتہ ایات میں یہودیوں کے انحرافات سے متعلق گزری ہیں یہ آیات اور ان سے بعد والی آیات عیسائیوں کے انحرافات کے متعلق بحث کرتی ہیں سب سے پہلے تو خدا اس آیت میں مسیحیت کے اہم ترین انحراف یعنی مسئلہ الوہیت مسیح اور تثلیث معبود سے بحث کرتے ہوئے کہتا ہے یقیناً جنہوں نے یہ کہا کہ خدا مسیح ابن مریم ہی ہے وہ کافر ہو گئے ہیں۔

اس سے بڑھ کر اور کیا کفر ہوگا کہ ہر جہت سے لامحدود خدا کو ایسی مخلوق کے ساتھ کہ جو ہر جہت سے محدود ہے ایک اور متحدہ

سمجھ لیا جائے اور مخلوق کی صفات کو خالق میں قرار دے لیا جائے جبکہ خود مسیح نے صراحت کے ساتھ بنی اسرائیل سے کہا کہ تم خدا یگانہ کی عبادت کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔

ساتھ ہی اس مطلب کی تاکید مزید اور ہر قسم کا شک وشبہ دور کرنے کے لئے مسیح نے مزید کہا کہ جو خدا کے لئے کوئی شریک قرار دے اس پر خدا نے جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم کی آگ ہے۔

پھر مزید تاکید اور اس حقیقت کے اثبات کے لئے کہ شرک وغلو ایک قسم کا کھلم کھلا ظلم ہے ان سے کہتا ہے کہ ستمگروں اور ظالموں کے لئے کوئی بھی مددگار نہ ہوگا۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ تاریخ مسیحیت یہ کہتی ہے کہ تثلیث کا قرن اول میں اور خصوصاً حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانے میں کوئی وجود نہ تھا۔ یہاں تک کہ موجودہ انجیلوں میں بھی تمام تر تحریفات کے باوجود تثلیث کے بارے میں ذرا سی بات بھی دکھائی نہیں دیتی اور خود مسیحی محققین بھی اس امر کا اعتراف کرتے ہیں۔

بنابریں مذکورہ بالا آیت میں حضرت مسیح علیہ السلام کی ثابت قدمی و پافشاری اور مسئلہ توحید کے بارے میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ مسیحیت کے موجود منابع اور کتب سے بھی ہم آہنگ ہے اور یہ بات قرآن کی عظمت کے دلائل میں سے شمار ہوتی ہے۔

(۷۳) ضمنی طور پر اس بات کی طرف بھی توجہ رہے کہ اس آیت میں جو موضوع زیر بحث ہے وہ مسئلہ غلو اور جناب مسیح علیہ السلام کی خدا کے ساتھ وحدت سے دوسرے لفظوں میں توحید در تثلیث کا معاملہ زیر نظر ہے لیکن بعد کی آیت میں مسیحیوں کے نقطہ نظر سے خداؤں کے تعدد یعنی تثلیث در توحید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے جنہوں نے یہ کہا کہ خدا تین "اقانیم" میں سے تیسرا "اقنوم" ہے وہ مسلماً کافر ہیں۔

قرآن قطعی طور پر ان کے جواب میں کہتا ہے خدائے یکتا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ خصوصاً لفظ "من" کا لفظ "الہ" سے پہلے آنا دوسرے معبودوں کی نفی کرتا ہے۔

دوسری مرتبہ پھر انتہائی سخت اور تاکیدی لب ولہجہ میں ان کو اس خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کہتا ہے اگر وہ اس عقیدے سے دستبردار نہ ہوں گے تو ان لوگوں کو جو اس کفر پر باقی رہیں گے ضرور دردناک عذاب پہنچے گا۔

(۷۴) ان آیات میں سے تیسری آیت میں دعوت دی گئی ہے کہ اس کفر آمیز عقیدے سے توبہ کرو یہ دعوت اس لیے ہے تا کہ خدا اپنی عفو وبخشش ان کے شامل حال کر دے لہٰذا کہا گیا ہے کیا وہ ان تمام باتوں کے بعد خدائے یکتا کی طرف نہیں پلٹتے اور اس شرک اور کفر سے مغفرت نہیں چاہتے حالانکہ خدا غفور ورحیم ہے۔

(۷۵)مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۗ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۗ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ۗ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ	مسیح ابن مریم فقط فرستادہ خدا تھے ان سے پہلے اور دوسرے بھی فرستادگان الٰہی ہی تھے ان کی ماں بھی بہت سچی خاتون تھیں وہ دونوں کھانا کھاتے تھے (لہٰذا تم کسی طرح سے مسیحی کی الوہیت کا دعویٰ اور اس کی ماں کی عبادت کرتے ہو) غور کرو کہ ہم کس کس طرح سے نشانیوں کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں اس کے بعد یہ دیکھو کہ وہ حق سے کس طرح باز رکھے جاتے ہیں۔
(۷۶)قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ۗ وَ اللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ	(اے رسول) کہہ دو کیا تم خدا کے سوا ایسی چیز کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہیں نقصان ہی پہنچا سکتی ہے اور نہ ہی تمہارے نفع کی مالک ہے اور خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔
(۷۷)قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ	(اے رسول) کہہ دو! اے اہل کتاب تم اپنے دین میں غلو (اور تجاوز) نہ کرو اور حق کے سوا کچھ نہ کہو اور ایسے لوگوں کی ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو جو اس سے پہلے خود بھی گمراہ ہو گئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیا اور سیدھے راستے سے منحرف ہو گئے۔

تفسیر

اس بحث کے بعد جو گذشتہ آیات میں حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں عیسائیوں کے غلو اور ان کی الوہیت کے اعتقاد سے متعلق گزری ہیں ان آیات میں واضح دلائل سے چند مختصر جملوں میں ان کے اس عقیدے کو باطل کرتا ہے۔

پہلے کہتا ہے کہ مسیح اور باقی انبیاء کے درمیان کیا فرق ہے کہ جس کی وجہ سے تم مسیح کی الوہیت کا عقیدہ رکھتے ہو۔ مسیح ابن مریم بھی خدا کے ایک رسول ہی تھے اور ان سے پہلے بھی خدا کی طرف سے رسول اور اس کے دیگر فرستادگان آتے رہے ہیں۔

اگر خدا کی طرف سے رسول ہونا الوہیت اور شرک کی دلیل ہے تو پھر باقی انبیاء کے متعلق بھی اسی چیز کے قائل کیوں نہیں ہوتے۔

اس کے بعد اس بات کی تائید کے لئے ارشاد ہوتا ہے اس کی ماں بہت ہی سچی خاتون تھیں۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اولاً تو وہ شخص کہ جس کی کوئی ماں ہے اور وہ ایک عورت کے شکم میں پرورش پاتا ہے۔اور بہت سی حوائج وضروریات رکھتا ہے وہ کس طرح خدا ہوسکتا ہے؟اور دوسرے یہ کہ اگر اس کی ماں قابل احترام ہے تو وہ اس بنا پر ہے کہ وہ بھی مسیح علیہ السلام کی رسالت کے دوران ان سے ہم آہنگ تھیں اور کار رسالت میں ان کی مددگار تھیں تو اس طرح سے وہ بھی خدا کی ایک خاص بندہ ہی تھیں لہٰذا ان کی ایک معبود کی طرح سے عبادت و پرستش نہیں کرنی چاہئے جیسا کہ عیسائیوں میں رائج ہے کہ وہ ان کے مجسمہ کے سامنے عبادت و پرستش کی حد تک خضوع کرتے ہیں۔

اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کی ربوبیت کی نفی کی ایک اور دلیل کی طرف اشارہ کرتے فرمایا وہ اور ان کی ماں دونوں کھانا کھاتے تھے۔تو جو شخص اتنا محتاج ہے کہ اگر چند دن اسے کھانا نہ ملے تو اس میں چلنے پھرنے کی بھی طاقت نہ رہے وہ کس طرح سے پروردگار یا خدا کے ہم پلہ ہوسکتا ہے۔

آیت کے آخر میں ایک طرف تو ان دلائل کے واضح ہونے کی طرف اشارہ ہے اور دوسری طرف ان واضح و آشکار دلائل کے مقابلہ میں ان کی ہٹ دھرمی سختی اور نادانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے ذرا دیکھو تو سہی کہ ہم کس طرح ان کے لئے دلائل کو وضاحت کے ساتھ کھول کھول کر بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد یہ دیکھو کہ وہ کس طرح حق قبول کرنے سے روگردانی کرتے ہیں۔

(۷۶) اس آیت میں گذشتہ استدلال کی تکمیل کے لئے فرمایا گیا ہے تمہیں معلوم ہے کہ مسیح خود سرتاپا احتیاجات بشری رکھتے تھے اور خود اپنے نفع ونقصان پر قادر نہیں تھے چہ جائیکہ وہ تمہارے نفع ونقصان پر قادر ہوں۔

اسی بنا پر وہ بارہا دشمنوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوئے یا ان کے دوست گرفتار ہوئے اگر لطف خدا ان کے شامل حال نہ ہوتا تو وہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔

آخر میں انہیں اس خطرے سے آگاہ کرتا ہے کہ خبردار کہیں یہ گمان نہ کر لینا کہ خدا تمہاری ناروا باتوں کو سنتا نہیں ہے یا وہ تمہارے باطن سے آگاہ نہیں ہے خدا سننے والا بھی ہے اور عالم ودانا بھی۔

(۷۷) انبیاء کے بارے میں غلو کے سلسلے میں روشن دلائل سے اہل کتاب کا اشتباہ واضح ہوجانے کے بعد پیغمبر کو حکم دیا گیا ہے کہ انہیں دعوت دو کہ وہ اس راستے سے عملی طور پر پلٹ آئیں۔فرمایا گیا ہے کہہ دو کہ اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور حد سے تجاوز نہ کرو اور حق کے علاوہ کوئی بات نہ کہو۔

البتہ عیسائیوں کا غلو تو واضح ہے باقی رہا یہودیوں کا غلو کہ اہل کتاب کا خطاب ان کے بارے میں بھی ہے تو بعید نہیں ہے کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو جو وہ عزیز علیہ السلام کی بارے میں کہتے تھے اور اسے خدا کا بیٹا سمجھتے تھے چونکہ غلو کا سرچشمہ عموماً گمراہ لوگوں کی ہوا وہوس کی پیروی کرنا ہے اس لیے اس گفتگو کی تکمیل کے لئے فرمایا گیا ہے کہ اس قوم کی خواہشات کی پیروی نہ کرو کہ جو تم سے پہلے گمراہ ہوئی اور انہوں نے بہت سے لوگوں کو بھی گمراہ کیا اور جو راہ مستقیم سے منحرف ہوگئے۔

یہ جملہ حقیقت میں ایک ایسی چیز کی طرف اشارہ ہے جو مسیحیت کی تاریخ میں بھی منعکس ہے کہ مسئلہ تثلیث اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں غلو مسیحیت کی ابتدائی صدیوں میں ان کے درمیان وجود نہیں رکھتا تھا بلکہ جب ہندوستان کے بت پرست اور

ان کی مانند دوسرے لوگوں نے دین مسیحیت اختیار کیا تو انہوں نے اپنے سابقہ دین میں سے باقی ماندہ ایک چیز یعنی تثلیث شرک کو مسیحیت میں شامل کر دیا لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ثالوث ہندی (تین خداؤں **بر هماء فیشنو، سیفا** پر ایمان) تاریخی لحاظ سے تثلیث مسیحیت سے پہلے تھا اور درحقیقت یہ اسی کی عکاسی ہے۔

(۷۸) لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ	جو لوگ بنی اسرائیل میں سے کافر ہو گئے ہیں انہیں حضرت داؤد و عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی۔ یہ اس بنا پر ہوا کہ وہ گناہ اور تجاوز کرتے تھے۔
(۷۹) كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ	وہ ان برے اعمال سے جنہیں وہ خود انجام دیتے تھے ایک دوسرے کو منع نہیں کیا کرتے تھے۔
(۸۰) تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ فِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ	تم ان میں سے بہت سے لوگوں کو دیکھو گے کہ وہ کافروں اور بت پرستوں کو دوست رکھتے ہیں اور ان سے راہ و رسم بڑھاتے ہیں انہوں نے کتنے برے اعمال اپنے (انجام اور آخرت) کے لئے آگے بھیجے ہیں کہ جن کا نتیجہ خدا کی ناراضگی تھی اور وہ ہمیشہ عذاب الٰہی میں رہیں گے۔

تفسیر

ان آیات میں اس بنا پر کہ اہل کتاب کو ان سے پہلے لوگوں کی اندھی تقلید سے روکا جائے ان کی بدبختی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے بنی اسرائیل کے کافروں پر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی ہے اور ان دو بزرگ انبیاء نے خدا سے درخواست کی ہے کہ وہ انہیں اپنی رحمت سے دور رکھے۔

اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ نسل بنی اسرائیل سے ہونا یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں میں سے ہونا کسی کی نجات کا باعث نہیں ہوگا جب تک ان کے اعمال کے ساتھ ہم آہنگی نہ پیدا کی جائے بلکہ خود ان انبیاء نے ایسے افراد سے نفرت کی ہے۔

آیت کا آخری جملہ بھی اس مطلب کی تائید کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ نفرت و بیزاری کا یہ اعلان اس بنا پر تھا کہ وہ گنہگار اور تجاوز کرنے والے تھے۔

(۷۹) اس کے علاوہ وہ لوگ کسی طرح بھی اپنے لیے کسی اجتماعی ذمہ داری کے قائل نہ تھے اور ایک دوسرے کو غلط کاری سے منع نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان میں سے نیک لوگوں کا ایک گروہ خاموشی سے اور سازشی انداز میں گنہگار لوگوں میں عملی طور پر شوق پیدا کرتا تھا۔

اس طرح ان کی زندگی کا لائحہ عمل بہت ہی پست اور ناپسندیدہ تھا۔

(۸۰) اس آیت میں ان کے ایک اور غلط عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تم ان میں سے بہت سوں کو دیکھو گے کہ وہ کافروں کے ساتھ محبت اور دوستی کی بنیادیں استوار کرتے ہیں۔

یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ان کی دوستی ایک عام دوستی کی طرح نہ تھی بلکہ وہ طرح طرح کے گناہوں سے مخلوط اور غلط اعمال و افکار کا شوق پیدا کرنے والی دوستی تھی لہٰذا آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے انہوں نے کیسے برے اعمال اپنی آخرت کے لئے آگے بھیجے ہیں کہ جن کا نتیجہ خدا کا خشم و غضب تھا اور وہ ہمیشہ کے لئے عذاب الٰہی میں مبتلا رہیں گے۔

(۸۱) وَ لَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ النَّبِيِّ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ	اگر وہ خدا پر اور پیغمبر پر اور جو کچھ اس کے اوپر نازل ہوا ہے اس پر ایمان لے آتے تو (ہرگز) انہیں اپنا دوست نہ بناتے لیکن ان میں سے بہت سے لوگ فاسق ہیں۔

تفسیر

اس آیت میں اللہ تعالیٰ انہیں اس غلط اور نادرست طریقہ عمل سے راہ نجات کی طرف رہنمائی کر رہا ہے کہ اگر واقعاً وہ خدا اور پیغمبر اور جو کچھ اس پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان رکھتے تو کبھی بیگانوں اور خدا کے دشمنوں سے دوستی نہ کرتے اور نہ ہی انہیں اپنے لیے سہارے کے طور پر منتخب کرتے۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان میں اطاعت خدا کرنے والے لوگ بہت ہی کم ہیں اور ان میں سے زیادہ تر فرمان خدا کے دائرہ سے خارج ہو چکے ہیں اور فسق کا راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔

(۸۲) لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدٰوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا وَّ اَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ	یقینی طور پر تم یہود اور مشرکین کو مومنین کی دشمنی میں سب لوگوں سے بڑھا ہوا پاؤ گے لیکن وہ لوگ کہ جو خود کو مسیحی کہتے ہیں انہیں تم مومنین کے ساتھ دوستی میں قریب تر پاؤ گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں کچھ دانشمند اور دنیا سے دور افراد موجود ہیں اور وہ حق کے مقابلے میں تکبر نہیں کرتے۔
(۸۳) وَ اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ	اور وہ جس وقت پیغمبر پر نازل ہونے والی آیات سنتے ہیں تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے (فرط شوق میں) آنسو جاری ہو جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے حق کو پہچان لیا ہے وہ کہتے ہیں؟ اے پروردگار! ہم ایمان لے آئے ہیں پس تو ہمیں حق کی گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔
(۸۴) وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَا جَآءَ نَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَ نَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ	ہم خدا پر اور اس حق پر جو ہم تک پہنچا ہے کیوں ایمان نہ لے آئیں جبکہ ہماری آرزو ہے کہ وہ ہمیں صالحین کے گروہ میں سے قرار دے
(۸۵) فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ	خدا نے انہیں ان ہی باتوں کی وجہ سے جنت کے ایسے باغات ثواب و جزا کے طور پر دیئے کہ جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے اور یہ نیکوکار لوگوں کی جزا ہے۔
(۸۶) وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۧ	اور وہ لوگ جو کافر ہو گئے اور انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا وہ اہل دوزخ ہیں۔

شان نزول

اسلام کے پہلے مہاجرین

یہ آیات پیغمبر اکرم ﷺ کے زمانے کے حبشہ کے بادشاہ نجاشی اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

اس سلسلے میں اسلامی روایات و تواریخ اور مفسرین کے اقوال سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ اس طرح ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ

کی بعثت اور عمومی دعوت کے ابتدائی سالوں میں مسلمان بہت ہی کم تعداد میں تھے۔ قریش نے قبائل عرب کو یہ نصیحت کر رکھی تھی کہ ہر قبیلہ اپنے قبیلہ کے ان لوگوں پر کہ جو پیغمبر اکرم ﷺ پر ایمان لا چکے ہیں انتہائی سخت دباؤ ڈالیں اور اس طرح مسلمانوں میں سے ہر کوئی اپنی قوم وقبیلہ کی طرف سے انتہائی سختی اور دباؤ میں مبتلا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کی تعداد جہاد آزادی شروع کرنے کے لئے کافی نہیں تھی۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے اس چھوٹے سے گروہ کی حفاظت اور مسلمانوں کے لئے حجاز سے باہر قیام گاہ مہیا کرنے کے لئے انہیں ہجرت کا حکم دے دیا اور اس مقصد کے لئے حبشہ کو منتخب فرمایا۔

مسلمانوں میں سے گیارہ مرد اور چار عورتیں حبشہ جانے کے لئے تیار ہوئے اور ایک چھوٹی سی کشتی کرایہ پر لے کر بحری راستے سے حبشہ جانے کے لئے روانہ ہو گئے یہ بعث کے پانچویں سال ماہ رجب کا واقعہ ہے۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ جناب جعفر بن ابو طالب بھی مسلمانوں کے ایک دوسرے گروہ کے ساتھ حبشہ چلے گئے۔ اب اس اسلامی جمعیت میں ۸۲ مردوں کے علاوہ کافی تعداد میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔

اس ہجرت کی بنیاد بت پرستوں کے لئے سخت تکلیف دہ تھی کیونکہ وہ اچھی طرح سے دیکھ رہے تھے کہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا کہ وہ لوگ جو تدریجاً اسلام کو قبول کر چکے ہیں اور حبشہ کی سرزمین امن وامان کی طرف چلے گئے ہیں مسلمانوں کی ایک طاقتور جماعت کی صورت اختیار کر لیں گے۔ یہ حیثیت ختم کرنے کے لئے انہوں نے کام کرنا شروع کر دیا اس مقصد کے لیے انہوں نے جوانوں میں سے دو ہوشیار فعال حیلہ ساز اور عیار جوانوں یعنی عمرو بن عاص اور عمارہ بن ولید کا انتخاب کیا بہت سے ہدیے دے کر ان کو حبشہ کی طرف روانہ کیا گیا۔ ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد وہ نجاشی کے دربار میں پہنچ گئے دربار میں باریاب ہونے سے پہلے انہوں نے نجاشی کے درباریوں کو بہت قیمتی ہدیے دے کر ان کو اپنا موافق بنا لیا تھا اور ان سے اپنی طرفداری اور تائید کرنے کا وعدہ لے لیا تھا۔

عمرو عاص نے اپنی گفتگو شروع کی اور نجاشی سے اس طرح ہمکلام ہوا۔

ہم سرداران مکہ کے بھیجے ہوئے ہیں ہمارے درمیان کچھ کم عقل جوانوں نے مخالفت کا علم بلند کیا ہے اور وہ اپنے بزرگوں کے دین سے پھر گئے ہیں اور ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہتے ہیں انہوں نے فتنہ وفساد برپا کر دیا ہے لوگوں میں نفاق کا بیج بو دیا ہے آپ کی سرزمین کی آزادی سے انہوں نے غلط فائدہ اٹھایا ہے اور انہوں نے یہاں آکر پناہ لے لی ہے ہمیں اس بات کا خوف ہے کہ وہ یہاں بھی خلل اندازی نہ کریں بہتر یہ ہے کہ آپ انہیں ہمارے سپرد کر دیں تاکہ ہم انہیں اپنی جگہ واپس لے جائیں۔

یہ کہہ کر ان لوگوں نے وہ ہدیئے جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے پیش کیے۔

نجاشی نے کہا:

''جب تک میں اپنی حکومت میں پناہ لینے والوں کے نمائندوں سے نہ مل لوں اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کر سکتا اور چونکہ یہ ایک مذہبی بحث ہے لہٰذا ضروری ہے کہ مذہبی نمائندوں ہی کو ایک جلسہ میں تمہاری موجودگی میں

دعوت دی جائے''۔

دوسرے دن ایک اہم جلسہ منعقد ہوا۔اس میں نجاشی کے مصاحبین اور عیسائی علماء کی ایک جماعت شریک تھی جعفر بن ابی طالب مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے موجود تھے اور قریش کے نمائندے بھی حاضر ہوئے نجاشی نے قریش کے نمائندوں کی باتیں سننے کے بعد جناب جعفر کی طرف رخ کیا اور ان سے خواہش کی کہ وہ اس سلسلے میں اپنا نقطہ نظر بیان کریں۔

جناب جعفر ادائے احترام کے بعد اس طرح گویا ہوئے پہلے ان سے پوچھیے کہ کیا ہم ان کے بھاگے ہوئے غلاموں میں سے ہیں؟

عمرو نے کہا: نہیں بلکہ آپ آزاد ہیں۔

جعفر: ان سے یہ بھی پوچھیے کہ کیا ان کا کوئی قرض ہمارے ذمہ ہے کہ جس کا وہ ہم سے مطالبہ کرتے ہیں؟

عمرو: نہیں ہمارا آپ سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔

جعفر: کیا ہم نے تمہارا کوئی خون بہایا ہے کہ جس کا ہم سے بدلہ لینا چاہتے ہو؟

عمرو: نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

جعفر: تو پھر تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟ تم نے ہم پر اتنی سختیاں کیں اور اتنی تکلیفیں پہنچائیں اور ہم تمہاری سر زمین سے جو سراسر مرکز ظلم و جور تھی باہر نکل آئے ہیں۔

اس کے بعد جناب جعفر نے نجاشی کی طرف رخ کیا اور کہا ہم جاہل اور نادان تھے بت پرستی کرتے تھے مردار کا گوشت کھاتے تھے طرح طرح کے برے اور شرمناک کام انجام دیتے تھے قطع رحمی کرتے تھے اپنے ہمسایوں سے برا سلوک کرتے تھے اور ہمارے طاقتور کمزوروں کے حقوق ہڑپ کر جاتے تھے۔

لیکن خداوند تعالیٰ نے ہمارے درمیان ایک پیغمبر کو مبعوث فرمایا جس نے ہمیں حکم دیا کہ ہم خدا کا کوئی مثل اور شریک نہ بنائیں اور فحشاء و منکر، ظلم و ستم اور قمار بازی ترک کر دیں۔ہمیں حکم دیا کہ ہم نماز پڑھیں، زکوۃ ادا کریں، عدل و احسان سے کام لیں اور اپنے وابستگان کی مدد کریں۔

نجاشی نے کہا: عیسیٰ مسیح علیہ السلام بھی انہی چیزوں کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔

اس کے بعد اس نے جناب جعفر سے پوچھا ان آیات میں سے جو تمہارے پیغمبر پر نازل ہوئی ہیں کچھ تمہیں یاد ہیں

جعفر نے کہا: جی ہاں!

اور پھر انہوں نے سورہ مریم کی تلاوت شروع کر دی اس سورہ کی ایسی ہلا دینے والی آیات کے ذریعہ جو مسیح علیہ السلام اور ان کی ماں کو ہر قسم کی ناروا تہمتوں سے پاک قرار دیتی ہیں جناب جعفر کے حسن انتخاب نے عجیب و غریب اثر کیا

یہاں تک کی مسیحی علماء کی آنکھوں سے فرط شوق میں آنسو بہنے لگے اور نجاشی نے پکارا کر کہا خدا کی قسم ان آیات میں حقیقت کی نشانیاں نمایاں ہیں۔

جب عمرو نے چاہا کہ اب یہاں کوئی بات کرے اور مسلمانوں کو اس کے سپرد کرنے کی درخواست کرے نجاشی نے ہاتھ بلند کیا اور زور سے عمر کے منہ پر مارا اور کہا خاموش رہو، خدا کی قسم! اگر ان لوگوں کی مذمت میں اس سے زیادہ کوئی بات کی تو میں تجھے سزا دوں گا۔

کئی سال گزر گئے پیغمبر ﷺ بھی ہجرت فرما گئے اور اسلام روز بروز ترقی کی منزلیں طے کرنے لگا عہد نامہ حدیبیہ لکھا گیا اور پیغمبر اکرم ﷺ فتح خیبر کی طرف متوجہ ہوئے۔

اس وقت جبکہ مسلمان یہودیوں کے سب سے بڑے اور خطرناک مرکز کے ٹوٹنے کی وجہ سے اتنے خوش تھے کہ پھولے نہیں سماتے تھے دور سے انہوں نے ایک مجمع کو لشکر اسلام کی طرف آتے ہوئے دیکھا تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ معلوم ہوا کہ یہ وہی مہاجرین حبشہ ہیں جو آغوش وطن میں پلٹ کر آ رہے ہیں جب کہ دشمنوں کی بڑی بڑی طاقتیں دم توڑ چکی ہیں اور اسلام کا پودا اپنی جڑیں کافی پھیلا چکا ہے۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے جناب جعفر اور مہاجرین حبشہ کو دیکھ کر یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا:

لاادری انا بفتح خیبر اسرام بقدوم جعفر ؟

میں نہیں جانتا کہ مجھے خیبر کے فتح ہونے کی زیادہ خوشی ہے یا جعفر کے پلٹ آنے کی۔

کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے علاوہ شامیوں میں سے آٹھ افراد کہ جن میں ایک مسیحی راہب بھی تھا اور ان کا اسلام کی طرف شدید میلان پیدا ہو گیا تھا پیغمبر ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے سورہ یٰسین کی کچھ آیات سننے کے بعد رونا شروع کر دیا اور مسلمان ہو گئے اور کہنے لگے کہ یہ آیات مسیحی کی سچی تعلیمات سے کس قدر مشابہت رکھتی ہیں۔ لہٰذا مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں تو مومنین نے خدا کی تحلیل و تمجید کی۔

تفسیر

یہودیوں کی کینہ پروری اور عیسائیوں کی نرم دلی

ان آیات میں ان یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان موازنہ کیا گیا ہے جو پیغمبر ﷺ کے ہم عصر تھے پہلی آیت میں یہودیوں اور مشرکین کو ایک ہی صف میں قرار دیا گیا ہے اور عیسائیوں کو دوسری صف میں ابتدا میں فرمایا گیا ہے مومنین کے سخت ترین دشمن یہودی اور مشرکین ہیں لیکن عیسائی مومنین سے زیادہ محبت کرنے والے ہیں۔

تاریخ اسلام اس حقیقت کی اچھی طرح گواہ ہے کیونکہ اسلام کے خلاف لڑی جانے والی بہت سی جنگوں کے میدان میں یہودی بلا واسطہ طریقہ سے دخیل رہے ہیں اور کسی عہد شکنی اور دشمنی سے باز نہیں آتے تھے ان میں سے بہت ہی کم افراد ایسے ہیں جو

حلقہ بگوش اسلام ہوئے جبکہ ہم اسلامی جنگوں میں بہت کم مسلمانوں کو عیسائیوں سے آمنا سامنا کرتے دیکھتے ہیں اور ہم یہ بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ ان میں سے بہت سے افراد مسلمانوں کی صفوں میں آملے۔

اس کے بعد قرآن اس روحانی فرق کی دلیل اور رہن سہن کے اجتماعی طریقوں کو چند جملوں میں بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ پیغمبر کے ہم عصر عیسائی کچھ ایسے امتیازات رکھتے تھے کہ جو یہودیوں میں نہیں تھے۔

پہلا امتیاز تو یہ ہے کہ ان میں علماء اور دانشمندوں کی ایک ایسی جماعت موجود تھی جو دنیا پرست یہودی علماء کی طرح حقیقت کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

نیز ان کے درمیان کچھ لوگ تارک دنیا بھی تھے کہ جواز روئے عمل لالچی یہودیوں کے بالکل برخلاف تھے اگر چہ وہ بھی کئی طرح کے انحرافات کے مرتکب تھے لیکن پھر بھی وہ ایک ایسی سطح پر تھے جو یہودیوں سے بالاتر تھی۔

ان میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جوحق کے قبول کرنے میں خاضع تھے اور اپنی طرف سے تکبر کا اظہار نہیں کرتے تھے جبکہ یہودیوں کی اکثریت دین اسلام کو قبول کرنے سے اس وجہ سے سرتابی کرتی تھی کیونکہ وہ خود کو ایک برتر نسل سمجھتے تھے اور دین اسلام یہودیوں کی نسل میں قائم نہیں ہوا تھا۔نصاریٰ کے برعکس یہودی اپنے آپ کو دنیا میں سب سے برتر سمجھتے تھے لہٰذا اسلام کو اس لئے قبول نہیں کیا نبی آخرالزمان ﷺ ان کی قوم میں سے نہ تھے۔

علاوہ ازیں ان میں سے ایک جماعت جیسے جناب جعفر کے ساتھی اور حبشہ کے عیسائیوں میں سے کچھ لوگ ایسے تھے کہ وہ جس وقت قرآن کی آیات کو سنتے تھے تو حق کے حاصل ہو جانے کی خوشی میں ان کی آنکھوں سے شوق کے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ اور وہ صراحت کے ساتھ علی الاعلان بغیر کسی لاگ لپیٹ کے پکار اٹھتے تھے پروردگارا! ہم ایمان لے آئے ہیں ہمیں حق کے گواہوں اور محمد مصطفیٰ ﷺ کے ساتھیوں اور یار و انصار میں سے قرار دے۔

(۸۴) وہ اس آسمانی کتاب کی ہلا دینے والی آیات سے اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ پکار اٹھتے کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم خدائے یکتا پر اور ان حقائق پر جو اس کی طرف سے لائے ہیں ایمان نہ لائے جبکہ ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں صالحین کے زمرے میں قرار دے۔

(۸۵) اس کے بعد دو آیات میں ان ہی دونوں گروہوں کے انجام اور جزا و سزا کی طرف اشارہ ہوا ہے پہلے فرمایا گیا ہے جن لوگوں نے صاحب ایمان افراد کے سامنے محبت کا اظہار کیا اور آیات الٰہی کے مقابلہ میں سر تسلیم خم کیا اور صراحت کے ساتھ اپنے ایمان کا اظہار کیا خداوند تعالیٰ اس کے بدلے میں بطور جزا و ثواب انہیں جنت کے ایسے باغات عطا فرمائے گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے اور نیکوکار لوگوں کی یہی جزا ہے۔

(۸۶) اور ان کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جنھوں نے دشمنی کا راستہ اختیار کیا اور کافر ہو گئے۔

(۸۷) يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ	اے ایمان والو! ان پا کیزہ چیزوں کو جو خدا نے تم پر حلال کر دی ہیں اپنے اوپر حرام نہ کرو اور حد سے تجاوز نہ کرو کیونکہ خدا حد سے تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔
(۸۸) وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ	اور خداوند تعالیٰ نے حلال اور پا کیزہ نعمات میں سے جو رزق تمہیں دے رکھا ہے انہیں کھاؤ اور اس خدا (کی مخالفت سے) ڈرا کرو۔ جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔
(۸۹) لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ	خداوند تعالیٰ تمہیں بے ہودہ (اور بے ارادہ) قسموں کی وجہ سے مواخذہ نہیں کرے گا لیکن وہ قسمیں کہ جنہیں (ارادہ کے ساتھ) تم نے محکم کیا ہو ان کے بارے میں مواخذہ کرے گا اس قسم کی قسموں کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے (کھانا ایسا ہونا چاہئے) جو تم عام طور پر اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو۔ یا دس مسکینوں کو لباس پہنانا ہے یا ایک غلام آزاد کرنا ہے اور جسے ان میں سے کچھ میسر نہ ہو وہ تین دن روزے رکھے یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسمیں کھاتے ہو تو اپنی قسموں کی حفاظت کرو اور انہیں نہ توڑو۔ خداوند تعالیٰ اسی طرح سے اپنی آیات کو تمہارے لیے بیان کرتا ہے تا کہ تم اس کا شکر بجالاؤ۔

شان نزول

درج بالا آیات کے بارے میں متعدد روایات نقل ہوئی ہیں منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ ایک دن پیغمبر ﷺ نے روز قیامت خداوند تعالیٰ کی عظیم عدالت میں لوگوں کی حالت و کیفیت سے متعلق کچھ بیان فرمایا ان بیانات نے لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا اور کچھ لوگ رونے لگے اس کے بعد اصحاب پیغمبر ﷺ میں سے ایک گروہ نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ کچھ لذائذ اور راحتوں کو اپنے اوپر حرام کر کے ان کی جگہ عبادت میں مشغول رہیں۔ ایک دن عثمان بن مظعون کی بیوی عائشہ کے پاس آئی وہ ایک جوان عورت تھی اور بڑی ہی حسین و جمیل تھی۔ عائشہ کو اس کی حالت پر تعجب ہوا اور کہنے لگی کہ تم اپنا

بناؤ سنگھار کیوں نہیں کرتی۔ اس نے کہا کہ بناؤ سنگھار کس کے لئے کروں میرے شوہر نے ایک عرصہ ہوا مجھے چھوڑ کر رہبانیت اختیار کر رکھی ہے یہ باتیں پیغمبر کے گوش گزار ہوئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمان جاری فرمایا کہ تمام مسلمان مسجد میں جمع ہوں۔ جب سب لوگ مسجد میں اکٹھے ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منبر پر تشریف لے گئے اور پروردگار کی حمد وثنا کے بعد فرمایا:

تم میں سے بعض لوگوں نے پاکیزہ چیزوں کو کیوں اپنے اوپر حرام کر لیا ہے میں اپنی سنت تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں جو اس سے روگردانی کرے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے میں رات کے ایک حصہ میں سوتا ہوں اور اپنی بیویوں سے مباشرت کرتا ہوں اور ہر روز روزہ بھی نہیں رکھتا۔

آگاہ رہو میں ہرگز تمہیں یہ حکم نہیں دیتا کہ عیسائیوں کے پادریوں اور راہبوں کی طرح دنیا ترک کر دو کیونکہ اس قسم کے مسائل اور اس طرح کی رہبانیت میرے دین میں نہیں ہے میری امت کی رہبانیت جہاد میں ہے

جن لوگوں نے یہ قسم کھا رکھی تھی کہ وہ ان چیزوں کو چھوڑ دیں گے وہ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کہا اے رسول خدا اس سلسلے میں ہم نے قسم کھائی تھی اب اس قسم کے سلسلے میں ہماری ذمہ داری کیا ہے تو مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں جن کے ذریعے انہیں جواب دیا گیا۔

تفسیر

حد سے تجاوز نہ کرو

اس آیت میں اور اس سے بعد کی آیات میں اہم اسلامی احکام کا ایک سلسلہ بیان ہوا ہے۔

پہلی آیت میں بعض مسلمانوں کی طرف سے کچھ نعمات الٰہی کی تحریم کی طرف اشارہ ہوا ہے اور انہیں اس کام کی تکرار سے منع کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے اے ایمان لانے والو! طیبات اور ایسے پاکیزہ امور جنہیں خدا نے تمہارے لیے حلال قرار دیا ہے اپنے اوپر حرام نہ کرو۔

یہ حکم بیان کر کے اسلام نے صراحت کے ساتھ رہبانیت اور ترک دنیا سے جیسے عیسائی پادری اور راہب کرتے ہیں اپنی بیگانگی کا اعلان کیا ہے اس کے بعد اس امر کی تاکید کے لئے کہتا ہے سرحدوں اور حد بندیوں سے آگے نہ بڑھو کیونکہ خدا تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

(۸۸) اس آیت میں نئے سرے سے اس مطلب کی تاکید کرتا ہے البتہ فرق یہ ہے کہ گذشتہ آیت میں تحریم سے نہیں کی گئی تھی اور اس آیت میں نعمات الٰہی سے جائز طور پر بہرہ ور ہونے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے ان چیزوں میں سے جو خداوند تعالٰی نے تمہیں بطور روزی دی ہیں حلال و پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔

ان مواہب و نعمات سے بہرہ ور اور مستفید ہونے کی شرط یہ ہے کہ اعتدال تقویٰ اور پرہیزگاری کو فراموش نہ کرو اسی لیے

فرمایا

''وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِی اَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُوْنَ''

یعنی خدا پر تمہارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تم اس کے تمام احکام کا احترام کرو ان سے نفع بھی اٹھاؤ اور اعتدال وتقویٰ کو بھی ملحوظ نظر رکھو۔

(۸۹) قسم اور اس کا کفارہ

قرآن اس آیت میں ان قسموں کے بارے میں کہ جو حلال کی تحریم یا اور چیزوں کے متعلق کھائی جائیں بطور کلی بحث کرتے ہوئے قسموں کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے پہلے کہتا ہے خداوند تعالیٰ تمہیں لغو اور فضول قسموں کے بارے میں نہ کوئی مواخذہ کرے گا اور نہ ہی سزا دے گا۔

لغو قسم سے مراد جیسا کہ مفسرین اور فقہا نے کہا ہے وہ قسمیں ہیں کہ جن کا ہدف ومقصد مشخص ومعین نہ ہو اور جو قصد اور ارادہ مصمم سے سرزد نہ ہوئی ہوں۔

احتمال یہ ہے کہ زیر نظر آیت میں لفظ لغو کا ایک وسیع مفہوم ہے یہاں تک کہ اس طرح کی قسم بھی اس میں شامل ہے دوسری قسم کی قسمیں وہ ہیں جو قصد وارادہ اور عزم مصمم سے کھائی جائیں اس قسم کی قسموں کے بارے میں قرآن زیر بحث آیت میں کہتا ہے خدا تمہارا ایسی قسموں کے بارے میں کہ جنکی گرہ کو تم نے محکم کر رکھا ہے مواخذہ کرلے گا اور تمہیں اس پر عمل کرنے کا پابند اور ذمہ دار ٹھہرائے گا۔

البتہ قسم کا حتمی ہونا اس کی درستی کے لئے اکیلا کافی نہیں ہے بلکہ جس طرح اوپر اشارہ ہوا ہے کہ قسم کا مضمون کم از کم کوئی امر مباح ہونا چاہئے اور یہ بھی جاننا چاہئے کہ خدا کے نام کے بغیر قسم معتبر نہیں ہے اسی بنا پر اگر کوئی شخص خدا کے نام کی قسم کھاتا ہے کہ وہ کوئی نیک عمل یا کم از کم کوئی مباح کام انجام دے گا تو واجب ہے کہ وہ اپنی قسم پر عمل کرے اور اگر اس نے قسم توڑ لی تو اس کا کفارہ دینا پڑے گا۔ قسم کا کفارہ وہی ہے جو محل بحث آیت کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔

اس قسم کی قسم کا کفارہ تین چیزوں میں سے ایک چیز ہے۔

پہلی چیز ہے دس مسکینوں کو کھانا کھلانا

البتہ اس بنا پر کہ کہیں اس حکم سے بعض لوگ یہ استفادہ نہ کریں کہ پست و بے قیمت غذا کفارے کے طور پر کھانے لگیں' تصریح کی گئی ہے کہ یہ کھانا کم از کم ایک متوسط غذا ہونا چاہئے جو عام طور پر اپنے گھر میں کھاتے ہیں۔

البتہ اس تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کیفیت کے لحاظ سے حد متوسط مراد ہے لیکن ممکن ہے کہ کیفیت کی طرف بھی اشارہ ہو اور مقدار وکمیت کی طرف بھی۔ جیسا کہ ایک روایت میں امام صادق علیہ السلام سے حد وسط کیفیت کے لحاظ سے اور ایک

روایت میں امام باقر علیہ السلام سے حدوسط کمیت کے لحاظ سے نقل ہوا ہے کہ جن کا خلاصہ دونوں لحاظ سے حدوسط بنتا ہے۔

یہ بات بغیر کہے ظاہر ہے کہ حدوسط کا مسئلہ دونوں لحاظ سے شہروں آبادیوں اور زمانوں کے اختلاف کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف ہوگا۔

دوسری چیز ہے دس محتاج لوگوں کو لباس پہنانا

البتہ آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ ایسا لباس ہونا چاہئے کہ جو عام طور پر ان کو ڈھانپ لے۔

اس سلسلے میں کہ کیا کیفیت کے لحاظ سے کم از کم کافی ہے یا یہاں بھی حدوسط کو ملحوظ رکھا جائے۔ آیت کے اطلاق کا تقاضا یہ ہے کہ ہر قسم کا لباس کافی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ تینوں چیزیں قیمت کے لحاظ سے بہت مختلف ہیں اور شاید یہ تفاوت اس بنا پر ہو کہ ہر شخص آزاد ہے کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق ان میں سے کسی ایک کو منتخب کر سکے۔

تیسری چیز ہے ایک غلام کو آزاد کرنا

لیکن چونکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جو ان میں سے کسی پر بھی قدرت نہ رکھتے ہوں لہٰذا اس حکم کے بعد فرماتا ہے اور وہ لوگ جو ان میں سے کسی تک دسترس نہیں رکھتے انہیں تین دن کے روزے رکھنا چاہیے۔

اس کے بعد تاکید کے طور پر قرآن کہتا ہے تمہاری قسموں کا کفارہ یہ ہے جو بیان کیا گیا ہے۔

لیکن اس بنا پر کہ کوئی شخص یہ تصور نہ کرے کہ کفارہ دینے سے صحیح قسم کا توڑنا حرام نہیں ہے کہتا ہے اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے اس طرح خدا تمہارے لیے اپنی آیات بیان کرتا ہے تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو اور ان احکام کے بارے میں کہ جو فرد و اجتماع کی سعادت و سلامتی کے ضامن ہیں اس کی حمد و سپاس کرو۔

(۹۰) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَ الۡمَيۡسِرُ وَ الۡاَنۡصَابُ وَ الۡاَزۡلَامُ رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ فَاجۡتَنِبُوۡهُ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ	اے ایمان لانے والو شراب قمار بازی بت اور ازلام (جو ایک قسم کی لاٹری تھی) پلید اور عملِ شیطان ہیں ان سے اجتناب کرو۔ تاکہ تم فلاح پاؤ۔
(۹۱) اِنَّمَا يُرِيۡدُ الشَّيۡطٰنُ اَنۡ يُّوۡقِعَ بَيۡنَكُمُ الۡعَدَاوَةَ وَ الۡبَغۡضَآءَ فِى الۡخَمۡرِ وَ الۡمَيۡسِرِ وَ يَصُدَّكُمۡ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ‌ ۚ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّنۡتَهُوۡنَ	شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور قمار بازی کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی ڈال دے اور تمہیں ذکر خدا اور نماز سے باز رکھے تو کیا تم (ان تمام نقصانات اور اس تاکیدی نہی کے بعد) اس سے رکو گے؟

(۹۲)وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ	اور خدا و پیغمبر کی اطاعت کرو اور اس کے فرمان کی مخالفت سے ڈرو اور اگر تم روگردانی کرو گے تو (سزا کے مستحق ہو گے اور) جان لو کہ پیغمبر کے ذمہ واضح ابلاغ کے سوا اور کچھ نہیں ہے (اور اس نے یہ فریضہ تمہارے سامنے انجام دے دیا ہے)۔

شان نزول

پہلی آیت کے بارے میں شیعہ وسنی تفاسیر میں مختلف شان نزول ذکر ہوئی ہیں جو تقریبا ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں من جملہ مسند احمد سنن ابی داؤد نسائی اور ترمذی سے اس طرح منقول ہے حضرت عمر جو تفسیر فی ظلال جلد سوم صفحہ ۳۳ کے مطابق شراب کے بڑے رسیا تھے دعا کرتے اور کہتے تھے خدایا کوئی واضح بیان شراب کے بارے میں ہم پر نازل فرما جب سورہ بقرہ کی آیت "و یسئلونک عن الخمر و المیسر" ۲۱۹ نازل ہوئی تو پیغمبر نے ان کے سامنے اس آیت کی تلاوت فرمائی لیکن وہ پھر بھی یہی دعا کرتے رہے اور کہتے رہے کہ خدایا اس بارے میں کوئی واضح تر بیان ہم پر نازل فرما یہاں تک کہ سورہ نساء کی آیت ۴۳ نازل ہوئی جو یہ ہے۔

" یا یها الذی امنوا الا تقربوا الصلوۃ وا نتم سکاری "

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ بھی ان کے سامنے پڑھی انہوں نے پھر بھی اپنی اسی دعا کو جاری رکھا یہاں تک کہ سورہ مائدہ کی آیہ زیر بحث کہ جس میں اس موضوع پر ایک غیر معمولی صراحت موجود تھی نازل ہوئی جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت حضرت عمر کے سامنے پڑھی تو انہوں نے کہا

انتهینا انتهینا

ہم اب شراب پینے سے رک گئے اب ہم شراب خوری سے رک گئے۔

تفسیر

شراب کے بارے میں قطعی حکم اور اس کے تدریجی مراحل

جیسا کہ ہم نے اس تفسیر کی جلد دوم میں سورہ نساء کی آیہ ۴۳ کے ذیل میں اشارہ کیا ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں شراب خوری اور مے نوشی کا بہت زیادہ رواج تھا اور یہ ایک عمومی وبا کی صورت اختیار کر گئی تھی یہاں تک کہ بعض مورخین کہتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت کے عربوں کے عشق کا خلاصہ تین چیزیں تھیں شعر و شراب اور جنگ۔

یہ بات واضح ہے کہ اگر اسلام چاہتا کہ اس عظیم عمومی وبا کے خلاف نفسیات اور معاشرے کے اجتماعی اصول کو مدنظر رکھے

بغیر برسر پیکار ہو جائے تو کامیابی ممکن نہ تھی لہٰذا اس نے مے نوشی کی بیخ کنی کے لئے تدریجی طریقہ اختیار کیا پہلے ان کے اذہان و افکار کو آمادہ کیا گیا پھر حرمت کا حکم نافذ کیا گیا کیونکہ مے نوشی کی عادت ان کی ایک فطرت ثانیہ بن چکی تھی پہلے مکی سورتوں میں بعض آیات میں اس کام کی برائی کی طرف کچھ اشارے کئے گئے جیسا کہ سورہ نحل کی آیت ۶۷ میں ہے

وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا حَسَنًا

(تم انگور اور کھجور کے درخت کے پھلوں سے مسکرات نشہ آور چیزیں اور پاکیزہ روزی فراہم کرتے ہو)

اس مقام پر لفظ "مسکر"، یعنی سکر اور اس شراب کو جو وہ انگور اور خرما سے حاصل کرتے تھے رزق حسن کے مدمقابل بیان کیا گیا ہے اور اسے ایک ناپاک اور آلودہ مشروب شمار کیا گیا ہے۔

لیکن شراب خواری کی بری عادت نے اس سے کہیں زیادہ جڑیں پکڑی ہوئی تھیں کہ اس کی ان اشاروں سے بیخ کنی ہو جائے اس کے علاوہ شراب ان کی اقتصادی درآمدات کے ایک حصہ کی ضامن بھی تھی لہٰذا جب مسلمان مدینے میں منتقل ہو گئے اور پہلی اسلامی حکومت کی تشکیل ہوئی تو شراب خوری کی ممانعت کے بارے میں دوسرا حکم قاطع تر صورت میں نازل ہوا تا کہ افکار کو شراب کی حرمت کے انتہائی حکم کے لئے اور زیادہ آمادہ کیا جا سکے یہ موقع تھا جبکہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۹ نازل ہوئی

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ

آیت میں بعض معاشروں مثلاً دور جاہلیت کے لیے شراب کے اقتصادی منافع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کے خطرات اور عظیم نقصانات کی جانب توجہ مبذول کروائی گئی ہے جو کہ اس کے اقتصادی منافع سے کئی درجے بڑھ کر ہیں

اس کے بعد سورہ نساء کی آیہ ۴۳ ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ

اس میں مسلمانوں کو صراحت سے حکم دیا گیا ہے کہ وہ مستی کی حالت میں ہرگز نماز نہ پڑھیں جب تک یہ نہ جانیں کہ وہ اپنے خدا سے کیا باتیں کر رہے ہیں۔

البتہ اس آیت کا مفہوم یہ نہیں تھا کہ نماز کی حالت کے علاوہ شراب پینا جائز ہے بلکہ مقصد وہی تدریجی طور پر اس کی حرمت کا حکم نافذ کرنا تھا دوسرے لفظوں میں یہ آیت نماز کی حالت کے علاوہ دوسری حالتوں کے سلسلے میں خاموش ہے اور صراحت سے کچھ نہیں کہتی۔

مسلمانوں کی احکام اسلام سے شناسائی اور اس عظیم معاشرتی روگ کو جو ان کے وجود کی گہرائیوں میں اتر چکا تھا جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے ان کی فکری آمادگی اس بات کا سبب بنی کہ آخری حکم مکمل صراحت اور قاطعیت سے نازل ہوا کہ جس کے بعد بہانہ سازی کرنے والے بھی اس پر اعتراض نہ کر سکیں اور وہ یہی زیر بحث آیت ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں مختلف تعبیرات کے ذریعے اس کام کی ممنوعیت پر تاکید کی گئی ہے۔

1۔آیت "یَاأَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا" کے خطاب سے شروع ہوئی ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس حکم کی مخالفت روح ایمان کے منافی ہے۔

2۔اس کے بعد لفظ "انما" جو استعمال ہوا ہے حصر و تاکید کے لئے ہے۔

3۔شراب اور قمار بازی کو انصاب وہ بت کہ جن کی کوئی مخصوص شکل وصورت نہیں تھی صرف پتھر کے ٹکڑے سے بنے ہوئے تھے کے ساتھ ساتھ ذکر کرتے ہوئے اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ شراب اور قمار بازی کا خطرہ اس قدر زیادہ ہے کہ وہ بت پرستی کے ہم پلہ قرار پایا ہے اسی بنا پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت میں ہے

شارب الخمر کعابد الوثن

شراب خوار بت پرست کی مانند ہے

4۔شراب قمار بازی اور اسی طرح بت پرستی اور ازلام جو ایک قسم کی لاٹری ہے یہ سب رجس و پلیدی کے طور پر شمار کیے گئے ہیں۔

5۔یہ تمام اعمال شیطانی اعمال میں سے قرار دیئے گئے ہیں۔

6۔آخر کار ان سے اجتناب کرنے کے بارے میں قطعی حکم صادر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

7۔اس آیت کے آخر میں قرآن کہتا ہے کہ یہ حکم اس بنا پر دیا گیا ہے تاکہ تم کامیابی اور فلاح حاصل کرلو۔یعنی اس کے بغیر کامیابی اور نجات ممکن نہیں ہے۔

(۹۱)8۔اس آیت میں شراب اور قمار بازی کے بعض واضح نقصان ذکر کیے گئے ہیں پہلے کہتا ہے کہ شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور قمار بازی کے ذریعے تمہارے درمیان عداوت و دشمنی کی تخم ریزی کرے اور تمہیں نماز اور ذکر خدا سے باز رکھے۔

9۔اس آیت کے آخر میں استفہام تقریری کے طور پر کہتا ہے کیا تم اس سے بچو گے اور رک جاؤ گے۔

یعنی کیا ان تمام تاکیدوں کے باوجود بھی ان دو عظیم گناہوں کو ترک کرنے کے بارے میں کوئی بہانہ جوئی یا شک وتردد کی گنجائش رہ گئی ہے لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمر تک بھی جو گذشتہ آیات کی تصریحات کو اس لگاؤ کی وجہ سے جو سنی مفسرین کی تصریح کے مطابق انہیں شراب سے تھا کافی نہیں سمجھتے تھے لیکن اس آیت کے نزول کے بعد کہنے لگے کہ یہ حکم کافی دوافی اور قناعت کنند ہے۔

(۹۲)11۔تیسری آیت میں اس حکم کی تاکید کے طور پر پہلے تو مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ خدا اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کریں اور اس کی مخالفت سے پرہیز کریں۔

اس کے بعد مخالفین کو دھمکی دیتا ہے کہ اگر انہوں نے پروردگار کے فرمان کی اطاعت سے روگردانی کی تو کیفر کردار اور سزا کے مستحق ہوں گے اور پیغمبر کی ذمہ داری اور فریضہ سوائے واضح ابلاغ و تبلیغ کے اور کچھ نہیں ہے۔

(۹۳)لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۧ	جولوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرنے لگے انہوں نے پہلے جو کچھ کھایا پیا اس پر کوئی گرفت نہ ہوگی بشرطیکہ وہ آئندہ ان چیزوں سے بچے رہیں جو حرام کی گئی ہیں اور ایمان پر ثابت قدم رہیں اور اچھے کام کریں پھر جس جس چیز سے روکا جائے اس سے رکیں اور جو فرمان الٰہی ہوا سے مانیں پھر خدا ترسی کے ساتھ نیک رویہ رکھیں اللہ نیک کردار لوگوں کو پسند کرتا ہے۔

شان نزول

کتب تفاسیر میں اس طرح آیا ہے کہ شراب و قمار بازی کی حرمت کی آیت کے نزول کے بعد بعض اصحاب پیغمبر ﷺ نے کہا کہ اگر ان دونوں کاموں کے یہ سب گناہ ہیں تو پھر ہمارے ان مسلمان بھائیوں کا کیا بنے گا جو اس آیت کے نزول سے پہلے مر چکے ہیں اور انہوں نے اس وقت تک ان دنوں کاموں کو ترک نہیں کیا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا گیا

تفسیر

اس آیت میں ان لوگوں کے بارے میں جواب دیتے ہوئے جو شراب اور قمار بازی کی حرمت کے نزول سے پہلے مر چکے تھے یا ان لوگوں کے بارے میں کہ جن کے کانوں تک ابھی تک یہ حکم نہیں پہنچا تھا اور وہ دور دراز کے علاقوں میں زندگی بسر کر رہے تھے فرمایا گیا ہے وہ لوگ جو ایمان رکھتے تھے اور عمل صالح انجام دیتے تھے اور یہ حکم ان تک نہیں پہنچا تھا اگر انہوں نے شراب پی ہے یا قمار بازی کی کمائی سے کھاتے رہے تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

اس کے بعد اس حکم کو اس بات کے ساتھ مشروط کرتا ہے کہ وہ تقویٰ اختیار کریں اور ایمان لے آئیں اور عمل صالح بجا لائیں۔

پھر اس امر کی تکرار کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے پھر تقویٰ اختیار کرو اور ایمان لے آؤ۔ اس کے بعد تیسری مرتبہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ اسی حکم کی تکرار کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے پھر تقویٰ اختیار کرو اور نیکی کرو۔

آیت کے آخر میں فرمایا: خدا نیک لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔

تقویٰ کے بارے میں تین مرتبہ کا یہ تذکرہ احساسِ ذمہ داری اور پرہیزگاری کے ایک ایک مرحلہ کی طرف اشارہ ہے۔

(۹۴)يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَىْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗۤ اَيْدِيْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ‌ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ	اے ایمان والو! خدا تمہیں شکار کی اس شرط پر کہ (جو تمہارے قریب آ جائیں اور) تمہارے ہاتھ اور نیزے ان تک پہنچ جاتے ہیں، آزمائے گا تاکہ معلوم ہو جائے کہ کون شخص غیب پر ایمان رکھتے ہوئے خدا سے ڈرتا ہے اور جو شخص اس کے بعد تجاوز کرے تو اس کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔
(۹۵)يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ‌ؕ وَ مَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًاۢ بٰلِغَ الْكَعْبَةِ	اے ایمان والو! حالت احرام میں شکار کو قتل نہ کرو اور جو شخص تم میں سے جان بوجھ کر اسے قتل کرے گا تو اسے چاہئے کہ اس کا معادل کفارہ جو پایوں میں سے دے، ایسا کفارہ کہ جس کے معادل ہونے کی دو آدمی تصدیق کریں اور وہ قربانی کی شکل میں (حریم) کعبہ میں پہنچے
اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَ بَالَ اَمْرِهٖ‌ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ‌ؕ وَ مَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ‌ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ	یا (قربانی کے بجائے) مساکین و فقرا کو کھانا کھلائے یا اس کے معادل روزے رکھے تاکہ اپنے کام کی سزا کا مزہ چکھ سکے۔ جو کچھ گذشتہ زمانے میں ہو چکا ہے خدا نے وہ معاف کیا اور جو شخص تکرار کرے خدا اس سے انتقام لے گا اور خدا توانا اور صاحب انتقام ہے۔
(۹۶)اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَ طَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِلسَّيَّارَةِ‌ۚ وَ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا‌ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ	دریا کا شکار اور اس کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے تاکہ تم اور مسافرین اس سے فائدہ اٹھائیں لیکن جب تک تم حالت احرام میں ہو تو صحرا کا شکار تم پر حرام ہے اور (خدا کی نافرمانی سے کہ) جس کی طرف تم محشور ہو گے ڈرتے رہو۔

شان نزول

بہت سی تفاسیر میں منقول ہے کہ جس وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمان حدیبیہ والے سال عمرہ کے لئے احرام باندھ کر چل پڑے تو انہیں راستے میں بہت سے وحشی جانوروں کا اس طرح سے سامنا ہوا کہ ان کے لئے آسان تھا کہ

ہاتھ یا نیزے سے انہیں شکار کرلیں یہ شکار اس قدر زیادہ تھے کہ بعض نے لکھا ہے کہ سواریوں کے دوش بدوش اور خیموں کے نزدیک آتے جاتے تھے تو اوپر والی آیات میں سے پہلی آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو شکار کرنے سے ڈرایا اور انہیں اس خطرے سے آگاہ کیا کہ یہ امران کے لیے ایک طرح کا امتحان ہے۔

تفسیر

حالت احرام میں شکار کرنے کے احکام

یہ آیات عمرہ اور حج کے احکام میں سے ایک حکم یعنی حالت احرام میں صحرائی اور دریائی جانوروں کے شکار کا مسئلہ بیان کرتی ہیں پہلے تو اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ جس کا حدیبیہ والے سال مسلمانوں کو سامنا کرنا پڑا تھا ارشاد ہوتا ہے اے ایمان والو! خدا تمہیں شکار میں سے ایک چیز کے ساتھ آزمائے گا ایسے شکار جو تمہارے اس قدر نزدیک ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ تم نیزہ اور ہاتھ کے ساتھ انہیں شکار کرسکتے ہو۔

اس کے بعد تاکید کے طور پر فرمایا ہے یہ ماجرا اس لیے ہوا تھا کہ وہ لوگ جو ایمان بالغیب کی بنا پر خدا سے ڈرتے ہیں دوسرے لوگوں سے ممتاز ہو جائیں۔

آیت کے آخر میں ان اشخاص کو کہ جو اس خدائی حکم کی مخالفت کرتے ہیں دردناک عذاب کی تہدید کی گئی ہے۔

(۹۵) آیت میں مزید صراحت اور قطعیت کے ساتھ اور بطور عموم حالت احرام میں شکار کے حرام ہونے کا حکم صادر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: اے ایمان لانے والو! حالت احرام میں شکار نہ کرو۔

اس کے بعد حالت احرام میں شکار کرنے کے کفارہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے جو شخص جان بوجھ کر شکار کو قتل کر دے تو اسے چاہئے کہ چوپاؤں میں سے ان جیسے جانور کفارہ میں دے یعنی انہیں قربانی کر کے ان کا گوشت فقراء و مساکین کو دے۔

یہاں مثل سے شکل و صورت اور مقدار میں ایک جیسا ہونا مراد ہے اس معنی میں کہ مثلاً اگر کوئی شخص کسی بڑے وحشی جانور مثلاً شتر مرغ کو شکار کرتا ہے تو اسے چاہئے کہ اس کا کفارہ اونٹ کی صورت میں دے؟ یا اگر ہرن کا شکار کرتا ہے تو کفارہ کے لیے بھیڑ بکری کی قربانی دے جو تقریباً اس جیسی ہے

ممکن ہے کہ بعض اوقات مثل کے معاملے میں کوئی شک و تردد پیدا ہو جائے لہٰذا قرآن نے حکم دیا ہے کہ یہ کام دو باخبر اور عادل افراد کے زیر نظر انجام پذیر ہو۔

اس سلسلے میں کہ یہ قربانی کہاں ذبح ہو حکم دیتا ہے کہ وہ قربانی اور ھدی کی صورت میں کعبہ کا ہدیہ بنایا جائے اور سرزمین کعبہ میں پہنچے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ ضروری نہیں کہ احتمال کفارہ قربانی کی صورت میں ہو بلکہ دو اور چیزوں میں سے بھی ہر ایک اس کی جانشین ہوسکتی ہے پہلا یہ کہ اس کے برابر رقم مساکین کو کھانا کھلانے میں صرف کی جائے۔ یا اس کے مساوی روزے رکھے۔

یہ کفارے تو اس بنا پر ہیں کہ وہ اپنے غلط کام کی سزا اور انجام کو دیکھ لیں۔

اور اس بنا پر کہ عموماً کوئی حکم بھی گذشتہ امور کو شامل نہیں ہوتا صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ خدا نے ان غلط کاریوں کو جو اس سلسلے میں گذشتہ زمانے میں تم نے انجام دی ہیں معاف کر دیا ہے۔

اور جو شخص ان بار بار کے ظہار کے خطرے اور کفارہ کے حکم کی پروانہ کرے اور پھر بھی حالت احرام میں شکار کا مرتکب ہو تو خدا ایسے شخص سے انتقام لے گا اور خدا توانا و صاحب قدرت ہے اور برمحل انتقام لیتا ہے۔

(۹۶) اس آیت میں دریائی شکار کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے حالت احرام میں دریائی شکار اور اسے کھانا تمہارے لیے حلال ہے۔ اس بارے میں کہ طعام اور کھانے سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس سے مراد وہ مچھلیاں ہیں جو شکار کیے بغیر مر جاتی ہیں اور پانی کے اوپر رہ جاتی ہیں جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ بات ٹھیک نہیں ہے کیونکہ مردہ مچھلی کا کھانا حرام ہے اگر چہ اہل سنت کی بعض روایات میں ان کے حلال ہونے کی صراحت موجود ہے۔

یہاں طعام سے مراد وہی خوارک ہے کہ جو شکار شدہ مچھلیوں سے تیار کی جاتی ہے کیونکہ آیت دو امور کو جائز قرار دے رہی ہے پہلے شکار کرنا اور دوسرے شکار شدہ کھانا کھانا۔

اس کے بعد اس حکم کے فلسفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے یہ اس بنا پر ہے کہ تم اور مسافر اس سے فائدہ اٹھا سکو۔

یعنی اس غرض سے کہ تم حالت احرام میں کھانے کے لئے زحمت و مشقت میں نہ پڑو اور ایک قسم کے شکار سے فائدہ اٹھا سکو یہ اجازت تمہیں دریائی شکار کے بارے میں دی جاتی ہے۔

دوسری مرتبہ تاکید کے طور پر حکم سابق کی طرف لوٹتے ہوئے فرمایا گیا ہے جب تک تم حالت احرام میں ہو صحرائی اور وحشی جانوروں کا شکار تم پر حرام ہے۔

آیت کے آخر میں ان تمام احکام کی تاکید کے لئے جو ذکر ہو چکے ہیں فرماتا ہے اس خدا سے ڈرو جس کی بارگاہ میں تمہیں قیامت کے دن محشور ہونا ہے۔

حالت احرام میں شکار کی حرمت کا فلسفہ

ہمیں معلوم ہے کہ حج و عمرہ ان عبادات میں سے ہے جو انسان کو عالم مادہ سے جدا کر کے ایک ایسے ماحول میں جو روحانیت معنویت سے معمور ہیں مستغرق کر دیتی ہے ساری زندگی مقررات، جنگ و جدول، جھگڑے فساد، جنسی ہوس رانیاں اور مادی لذت، حج و عمرہ کے مراسم میں کلی طور پر چھوڑنا پڑتی ہیں اور انسان ایک قسم کی شرعی الٰہی ریاضت میں مشغول ہو جاتا ہے یوں نظر آتا ہے کہ حالت احرام میں حرمت شکار بھی اسی مقصد کے تحت ہے۔

علاوہ ازیں اگر خانہ خدا کے زائر کے لئے شکار کرنا ایک مشروع اور جائز کام ہوتا تو اس آمد و رفت کے مدنظر رکھتے ہوئے کہ جو ہر سال اس مقدس سرزمین میں ہوتی ہے اس علاقہ کے بہت سے جانوروں کی نسل کہ جو خشکی اور پانی کی کمی کی وجہ سے پہلے ہی کم

ہے ختم ہوجاتی لہٰذا یہ حکم اس علاقے کے جانوروں کی نسل کی بقاء کے لئے ایک قسم کی حفاظت وضمانت ہے۔

خصوصاً اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ حالت احرام کے علاوہ بھی حرم میں شکار اور اسی طرح اس کے درختوں اور گھاس پھونس کا اکھاڑ نا ممنوع ہے اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ حکم زندگی کے ماحول کی حفاظت اور اس علاقے کے سبزہ زاروں اور جانوروں کو فنا و نابودی سے بچانے کے مسئلہ سے نزدیکی ربط رکھتا ہے۔

(۹۷)جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَ الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ الْهَدْيَ وَ الْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ	خدا نے کعبہ بیت الحرام کو لوگوں کے امر کے قیام کا ذریعہ قرار دیا ہے اور اس طرح حرمت والا مہینہ اور بے نشان قربانیاں اور نشان دار قربانیاں اس قسم کے (حساب شدہ اور دقیق) احکام اس لیے ہیں کہ تمہیں معلوم ہو کہ خدا جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے جانتا ہے۔
(۹۸) اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ؕ	جان لو کہ خدا شدید سزا دینے والا ہے اور اس کے باوجود وہ بخشنے والا مہربان ہے۔
(۹۹)مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ	پیغمبر کی ذمہ داری ابلاغ رسالت (اور احکام الٰہی پہنچانے) کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے اور وہ تمہارے اعمال کا جواب دہ نہیں ہے اور خدا جانتا ہے کہ تم کن چیزوں کو آشکار اور کن چیزوں کو مخفی رکھتے ہو۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں حالت احرام میں شکار کی حرمت کے بارے میں بحث تھی اس آیت میں مکہ کی اہمیت اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی اصلاح و ترتیب میں اس کے اثر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پہلے فرماتا ہے خدا نے بیت الحرام کو لوگوں کے امر کے قیام کا ذریعہ قرار دیا۔

چونکہ ضروری تھا کہ یہ مراسم جنگ کشمکش اور نزاع سے ہٹ کر امن و امان کے ماحول میں صورت پذیر ہوں حرام مہینوں وہ مہینے کہ جن میں جنگ مطلقاً حرام ہے کے اثر کی طرف اس موضوع میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

علاوہ ازیں اس نظر سے کہ بے نشان قربانیوں اور نشاندر قربانیوں قلائد کا وجود کہ جو مراسم حج وعمرہ میں مشغول ہونے کے دنوں میں لوگوں کو غذا مہیا کرتا ہے اور ان کی سوچ کو اس جہت سے آسودہ خاطر کرتا ہے اس پروگرام کی تکمیل میں مخصوص اثر رکھتا ہے

اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

آیت کے آخر میں اس طرح کہتا ہے کہ خدا نے یہ منظم پروگرام اس لیے مقرر کیے ہیں تا کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اس کا علم اس قدر وسیع ہے کہ جو کچھ آسمان میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ سب کو جانتا ہے اور وہ تمام چیزوں سے خصوصاً اپنے بندوں کی روحانی اور جسمانی ضروریات سے باخبر ہے۔

(۹۸) پھر اس آیت میں گذشتہ احکام کی تاکید لوگوں کو ان کے انجام دینے کی تشویق اور مخالفین اور نافرمانوں کی تہدید کے طور پر فرماتا ہے جان لو کہ خدا شدید العقاب ہونے کے ساتھ ساتھ غفور و رحیم بھی ہے۔

(۹۹) پھر مزید تاکید کے لئے فرماتا ہے اپنے اعمال کے جوابدہ خود تمہی ہو اور پیغمبر ﷺ کی ذمہ داری تبلیغ رسالت اور احکام خدا تم تک پہنچانے کے سوا کچھ نہیں۔

اس کے باوجود خدا تمہاری نیتوں سے اور تمہارے سب آشکار و پنہاں اعمال سے باخبر و آگاہ ہے۔

(۱۰۰) قُلْ لَّايَسْتَوِی الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ وَ لَوْ اَعْجَبَکَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۚ	کہہ دو کہ پاک و ناپاک کبھی برابر نہیں ہو سکتے اگرچہ ناپاکوں کی کثرت تجھے بھلی معلوم ہو خدا کی مخالفت سے پرہیز کرو اے صاحبان عقل و خرد! تا کہ تم فلاح و نجات حاصل کر سکو۔

تفسیر

اکثریت پاکیزگی کی دلیل نہیں

گذشتہ آیات میں مشروبات الکحل، قمار بازی، انصاب و ازلام اور حالت احرام میں شکار کرنے کی حرمت کے سلسلے میں گفتگو تھی چونکہ ہوسکتا ہے بعض لوگ ایسے گناہوں کے ارتکاب کے لئے کچھ معاشروں اور علاقوں میں اکثریت کے عمل کو دستاویز قرار دیں اور اس بہانے سے کہ مثلاً فلاں شہر کی اکثریت شراب پیتی ہے یا قمار بازی کرتی ہے یا یہ کہ لوگوں کی اکثریت فلاں قسم کے حالات میں حرمت شکار وغیرہ کی پرواہ نہیں کرتی لہٰذا وہ ان احکام پر عمل درآمد سے روگردانی کریں اور انہیں طاق نسیاں کر دیں تو اس بنا پر کہ یہ بہانہ اس مقام پر اور اس قسم کے افراد سے دیگر مواقع میں کلی طور پر چھین لیا جائے خدا ایک بنیادی کلیہ قاعدہ مختصر سی عبارت میں بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے اے پیغمبر! پاک و ناپاک کبھی برابر نہیں ہو سکتے اگرچہ ناپاک لوگوں کی زیادتی اور آلودہ لوگوں کی کثرت تجھے تعجب میں ڈال دے اور بھلی معلوم ہو۔

اس بناء پر درج بالا آیت میں خبیث وطیب ہر قسم کے پاک و ناپاک وجود کے معنی میں ہے چاہے وہ پاک و ناپاک کھانے کی چیزیں ہوں یا پاک و ناپاک افکار و نظریات ہوں۔

آیت کے آخر میں صاحبان فکر ونظر اور ارباب عقل وہوش کو مخاطب کرتے ہوئے تاکید کرتا ہے کہ خدا سے ڈرو تا کہ کامران وکامیاب ہو جاؤ۔

(۱۰۱) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَ اِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ	اے ایمان والو! تم ایسے مسائل کے متعلق سوال نہ کرو کہ اگر وہ تمہارے سامنے واضح ہو جائیں تو تمہیں برے لگیں اور اگر قرآن کے نزول کے وقت ان کے متعلق سوال کرو تو وہ تمہارے لیے آشکار ہو جائیں گے خدا نے تمہیں معاف کر دیا ہے اور خدا بخشنے والا اور حلیم ہے۔
(۱۰۲) قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ	تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں میں سے ایک گروہ نے ان چیزوں کے متعلق سوال کیا تھا اور پھر ان کی مخالفت کے لئے کھڑے ہو گئے تھے۔

شان نزول

مندرجہ بالا آیات کی شان نزول کے سلسلے علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے منقول ہے اور وہ یہ ہے۔

ایک دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ دیا اور حج کے بارے میں خدا کا حکم بیان کیا تو ایک شخص جس کا نام عکاشہ تھا اور ایک روایت کے مطابق سراقہ نے کہا کیا یہ حکم ہر سال کے لئے ہے اور ہر سال ہمیں حج بجالانا ہوگا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے سوال کا جواب نہ دیا لیکن اس نے اصرار کیا اور دو مرتبہ یا تین مرتبہ اپنے سوال کا تکرار کیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا وائے ہو تم پر کیوں اس قدر اصرار کر رہے ہو اگر تمہارے جواب میں میں ہاں کہہ دوں تو ہر سال تم پر حج واجب ہو جائے گا اور اگر ہر سال واجب ہو گیا تو اس کی انجام دہی کی تم میں طاقت نہیں ہوگی اور اگر اس کی مخالفت کی تو گنہگار ہو گے لہٰذا جب تک میں تم سے کوئی چیز بیان نہ کروں تم اس پر اصرار نہ کیا کرو۔

تفسیر

غیر مناسب سوالات

اس میں شک نہیں کہ سوال کرنا حقائق کو سمجھنے کی کلید ہے یہی وجہ ہے کہ جو کم پوچھتے ہیں کم جانتے ہیں آیات وروایات اسلامی میں بھی مسلمانوں کو تاکیدی حکم دیا گیا ہے کہ جو کچھ وہ نہیں جانتے پوچھیں لیکن چونکہ ہر قانون کا کوئی نہ کوئی استثنائی پہلو ہوتا ہے

لہٰذا تعلیم و تربیت کی یہ بنیاد بھی استثنا سے خالی نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض اوقات کچھ مسائل کا مخفی رہنا اجتماعی نظام کی حفاظت اور لوگوں کی مصلحتوں کے پیش نظر بہتر ہوتا ہے ایسے مواقع پر واقعیت اور حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھانے کے لیے جستجو کرنا اور پے در پے سوال کرنا نہ صرف یہ کہ فضلیت نہیں رکھتا بلکہ مذموم و ناپسندیدہ بھی ہے۔

قرآن زیرنظر آیت میں اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صراحت کے ساتھ کہتا ہے اے ایمان لانے والو! ایسے امور کے افشاء کے متعلق سوال نہ کرو کہ جو موجب رنج وتکلیف ہوں۔

لیکن اس سبب سے کہ بعض افراد کی طرف سے پے در پے سوالات کا ہونا اور ان کا جواب نہ دینا ممکن ہے دوسروں کے لیے شک وشبہ کا باعث بن جائے اور بہت سے مفاسد پیدا کر دے تو مزید کہتا ہے اگر ایسے مواقع پر زیادہ اصرار کرو گے تو آیات قرآن کے ذریعے تمہارے لیے افشاء ہو جائیں گے اور تم زحمت وتکلیف میں پڑ جاؤ گے۔

مزید ارشاد ہوتا ہے یہ خیال نہ کرو کہ اگر خدا کچھ مسائل بیان کرنے سے سکوت اختیار کرتا ہے تو وہ ان سے غافل تھا بلکہ وہ تمہارے لیے وسعت چاہتا ہے اور انہیں معاف کر دیا ہے اور خدا بخشنے والا حلیم و بردبار ہے۔

ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں

"ان اللّٰہ افترض علیکم فرائض فلا تضیعوھا و حد لکم حدودا فلا تعتدوھا و نھی عن اشیاء فلا تنتھکوھا و سکت لکم عن اشیاء ولم یدعھا نسیا نا فلا تتکلفوھا"

(خدا نے کچھ واجبات تمہارے لیے مقرر کیے ہیں انہیں ضائع نہ کرو اور کچھ حدود تمہارے لیے نافذ کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں سے منع کیا ہے ان کی پردہ دری نہ کرو اور کچھ امور سے خاموش رہا ہے اور ان کے پوشیدہ رکھنے کو اس نے بہتر سمجھا ہے اور یہ پوشیدہ رکھنا، نسیان اور بھول چوک کی وجہ سے ہرگز نہیں تھا۔ ایسے امور کے افشاء اور ظاہر کرنے پر اصرار نہ کرنا)

(۱۰۲) اس آیت میں اس آیت کی تاکید کے لئے فرمایا گیا ہے گذشتہ اقوام میں سے بھی بعض لوگ اسی قسم کے سوالات کیا کرتے تھے اور جب انہیں جواب دیا گیا تو مخالفت اور نافرمانی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس بحث کے آخر میں ہم یہ نکتہ پھر دہرانا ضروری سمجھتے ہیں کہ زیر بحث آیات کسی صورت میں بھی منطقی علمی تہذیبی اور تربیتی سوالات کی راہ لوگوں پر بند نہیں کرتیں بلکہ یہ پابندی منحصر طور پر صرف بے جا اور نامناسب سوالات اور ایسے امور کے متعلق جستجو سے مربوط ہے جس کے پوچھنے کی نہ صرف یہ کہ ضرورت و احتیاج نہیں ہے بلکہ ان کا چھپا رہنا ہی بہتر بلکہ بعض اوقات تو لازمی اور ضروری ہوتا ہے۔

(۱۰۳) مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّ لَا سَآئِبَةٍ وَّ لَا وَصِيْلَةٍ وَّ لَا حَامٍ ۙ وَّ لٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ	خدا نے کوئی "بحیرہ" "سائبہ" "و صیلہ" "حام" قرار نہیں دیا لیکن جو لوگ کافر ہو گئے انہوں نے خدا پر جھوٹ باندھا ہے اور ان میں سے زیادہ تر سمجھتے نہیں ہیں۔
(۱۰۴) وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ	اور جس وقت ان سے کہا جائے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کی طرف اور پیغمبر کی طرف آ ؤ تو وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے اپنے آباؤ اجداد سے پایا ہے وہ ہمارے لئے کافی ہے کیا ایسا نہیں ہے کہ ان کے آباؤ اجداد کچھ نہیں جانتے تھے اور انہوں نے ہدایت حاصل نہیں کی تھی۔

تفسیر

آیت میں پہلے تو چار غیر مناسب بدعات کی طرف اشارہ ہوا ہے جو زمانہ جاہلیت کے عربوں میں موجود تھیں انہوں نے کچھ جانوروں کے بارے میں کسی جہت سے علامت اور نشانی مقرر کر رکھی تھی اور ان کا گوشت کھانا ممنوع قرار دے رکھا تھا یہاں تک کہ ان کا دودھ کا پینا اون کاٹنا اور ان پر سواری کرنا جائز شمار نہیں کرتے تھے۔ یعنی عملی طور پر اس جانور کو بے کار اور فضول چھوڑ دیتے تھے۔

لہٰذا قرآن مجید کہتا ہے خدا ان احکام میں سے کسی کو بھی قانونی طور پر قبول نہیں کرتا نہ اس نے بحیرہ قرار دیا نہ سائبہ نہ وصیلہ اور نہ حام۔

باقی رہی ان چار قسم کے جانوروں کی تشریح اور وضاحت تو وہ یہ ہے۔

1۔ **بحیرہ**۔ اس جانور کو کہتے ہیں کہ جس نے پانچ مرتبہ بچہ جنا ہو کہ جن میں سے پانچواں بچہ مادہ یا ایک روایت کے مطابق نر ہو۔ ایسے جانور کے کان میں ایک وسیع سوراخ کر دیتے تھے اور اسے اس کے حال پر آزاد چھوڑ دیتے تھے اور اسے ذبح یا قتل نہیں کرتے تھے۔

2۔ **سائبہ**۔ وہ اونٹنی جس نے بارہ یا ایک روایت کے مطابق دس بچے جنے ہوں اسے آزاد چھوڑ دیتے تھے یہاں تک کہ کوئی اس پر سوار نہیں ہوتا تھا کبھی کبھار صرف اس کا دودھ دوہ لیتے اور مہمان کو پلاتے۔

3۔ **و صیلہ**۔ اس گوسفند کو کہتے تھے جس نے سات دفعہ بچہ جنا ہو اور ایک روایت کے مطابق اس گوسفند کو کہتے تھے جو دو بچوں کو ایک ہی مرتبہ جنم دے۔

4۔ **حام**۔ اس نر جانور کو کہتے ہیں جس سے مادہ جانوروں کی تلقیح اور جفتی میں استفادہ کیا جاتا ہے۔

اوپر والے چار عناوین سے مراد ایسے جانور تھے جنہوں نے حقیقت میں اپنے مالکوں کی زیادہ بار بار نتیجہ بخش طور پر خدمت کی ہو وہ بھی ان کی اس خدمت کے صلے میں ان جانوروں کے لئے ایک قسم کے احترام اور آزادی کے قائل ہو جاتے تھے۔

اس کے بعد فرماتا ہے کافر لوگ اور بت پرست ان چیزوں کی خدا کی طرف نسبت دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ قانون الٰہی ہے۔ ان میں سے اکثر اس بارے میں تھوڑا سا بھی غور و فکر نہیں کرتے تھے اور اپنی عقل کو کام میں نہیں لاتے تھے بلکہ دوسروں کی اندھی تقلید کرتے تھے۔

(۱۰۴) اس آیت میں ان کی بے تکی اور غیر مناسب تحریکوں کی دلیل و منطق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے جب ان سے یہ کہا جائے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کی طرف اور پیغمبر کی طرف آؤ تو وہ اس کام سے روگردانی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے لیے تو ہمارے بڑوں کے رسم و رواج اور ان کے طور طریقے اور دستور کافی ہیں۔

حقیقت میں انکی غلط کاریاں اور بت پرستیاں ایک دوسری قسم کی بت پرستی سے پھوٹتی تھیں وہ اپنے بزرگوں اور بڑے بوڑھوں کے لیے بے ہودہ رسم و رواج اور طور طریقوں کو بلا قید و شرط اختیار کرتے تھے گویا وہ صرف بڑوں اور آباؤ اجداد سے نسبت کو اپنے عقیدہ اور عادات و رسوم کی صحت و درستی کے لئے کافی سمجھتے تھے۔

قرآن صراحت سے انہیں جواب دیتا ہے کیا ایسا نہیں کہ ان کے آباؤ اجداد صاحب علم و دانش نہیں تھے اور انہیں ہدایت حاصل نہیں ہوئی تھی۔

اس حالت میں تو تمہارا معاملہ جاہل کا جاہل کی تقلید کرنے کا واضح مصداق ہے جو کہ عقل و خرد کے ترازو میں بہت ہی ناپسندیدہ فعل ہے۔

(۱۰۵) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ	اے ایمان والو! اپنے اوپر نظر رکھو جب تمہیں ہدایت حاصل ہو جائے تو ان لوگوں کی گمراہی جو گمراہ ہو چکے ہیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گی تمام چیزوں کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور وہ تمہیں اس عمل سے جو تم کیا کرتے تھے آگاہ کرے گا۔

تفسیر

ہر شخص اپنے کام کا جواب دہ ہے

گذشتہ آیت میں زمانہ جاہلیت کے لوگوں کی اپنے بڑوں کی اندھی تقلید کے متعلق گفتگو تھی قرآن نے واضح طور پر انہیں

ڈرایا کہ اس قسم کی تقلید عقل ومنطق کی رو سے درست نہیں ہے اس کے بعد فطری طور پر یہ سوال ان کے ذہن میں آتا تھا کہ اگر ہم ایسے مسائل میں اپنا معاملہ اپنے بزرگوں سے الگ کرلیں تو پھر ان کی سرنوشت کیا ہوگی علاوہ ازیں اگر ہم اس قسم کی تقلید سے دست بردار ہو جائیں تو ایسی ہی تقلید کرنے والے دیگر بہت سوں کے بارے میں کیا صورت ہوگی زیر نظر آیت اس قسم کے سوالات کے جواب میں کہتی ہے اے ایمان لانے والو! تم اپنے ہی جوابدہ ہوا گر تم ہدایت یافتہ ہوگئے تو دوسروں کی گمراہی چاہے وہ تمہارے اپنے بڑے ہوں یا ہم عصر دوست واحباب تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچائے گی۔

اس کے بعد قیامت حساب کتاب اور ہر کسی کے اعمال کے انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے تم سب نے خدا کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور تم میں سے ہر ایک کا حساب الگ ہوگا اور جو کچھ تم نے انجام دیا اس سے تمہیں آگاہ کیا جائے گا۔

(۱۰۶) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَ لَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ	اے ایمان لانے والوں! جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے تو وصیت کرتے وقت اپنے میں سے دو عادل افراد کو بلالو یا اگر تم سفر میں ہو اور تمہیں موت آ پہنچے (اور راستے میں تمہیں کوئی مسلمان نہ ملے) تو اغیار میں سے دو افراد اور اگر شہادت ادا کرتے وقت ان کے سچے ہونے میں شک کرو تو انہیں نماز کے بعد روک رکھو تا کہ وہ یہ قسم کھائیں کہ ہم حق کو کسی چیز کے بدلے فروخت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اگرچہ ہمارے رشتہ داروں کے بارے میں ہو اور ہم خدائی شہادت کو نہیں چھپاتے کہ مبادا ہم گنہگاروں میں سے ہو جائیں۔
(۱۰۷) فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَ مَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ ز اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ	اور اگر اطلاع حاصل ہو جائے کہ وہ دونوں گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں (اور انہوں نے حق کو چھپایا ہے) تو دو اور افراد کو جن پر پہلے گواہوں نے ظلم کیا ہے ان کی جگہ قرار پائیں گے اور خدا کی قسم کھائیں گے کہ ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی کی نسبت حق کے زیادہ قریب ہے اور ہم تجاوز وزیادتی کے مرتکب نہیں ہوئے اور اگر ہم نے ایسا کیا ہو تو ہم ظالمین میں سے ہوں گے۔

(۱۰۸) ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَنۡ یَّاۡتُوۡا بِالشَّہَادَۃِ عَلٰی وَجۡہِہَاۤ اَوۡ یَخَافُوۡۤا اَنۡ تُرَدَّ اَیۡمَانٌۢ بَعۡدَ اَیۡمَانِہِمۡ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاسۡمَعُوۡا ؕ وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ۠	یہ کام زیادہ سبب بنے گا کہ وہ حق کی گواہی دیں (اور خدا سے ڈریں) اور یا (لوگوں سے) ڈریں کہ (ان کا جھوٹ فاش ہو جائے گا اور) ان کی قسموں کی جگہ دوسری قسمیں لے لیں گے اور خدا (کی مخالفت) سے ڈرو اور کان دھر کر بات سنو اور خدا فاسقین کی ہدایت نہیں کرتا۔

شان نزول

درج بالا آیات کی شان نزول کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ مسلمانوں میں سے ابن ابی ماریہ نامی ایک شخص دو عرب عیسائیوں کی ہمراہی میں جن کے نام تمیم اور عدی تھے اور وہ دونوں بھائی تھے تجارت کے ارادے سے مدینہ سے نکلا اثنائے راہ میں ابن ابی ماریہ جو مسلمان تھا بیمار ہو گیا اس نے وصیت نامہ لکھا اور اسے اپنے سامان میں چھپا دیا اور اپنا مال اپنے دو ہمسفر عیسائیوں کے سپرد کرتے ہوئے وصیت کی کہ وہ اسے اس کے رشتہ داروں تک پہنچا دیں وہ مر گیا اس کے ہمسفر دونوں افراد نے اس کا مال و اسباب کھولا اور اس میں سے گراں قیمت اور زیادہ اہم چیزیں اٹھا لیں اور باقی مال وارثوں کو پہنچا دیا وارثوں نے جب سامان کھولا تو انہیں اس میں ان چیزوں میں سے جو ابن ابی ماریہ اپنے ساتھ لے گیا تھا کچھ چیزیں نہ ملیں اچانک ان کی نظر وصیت نامے پر بڑی انہوں نے دیکھا کہ تمام چوری شدہ مال کی تفصیل اس میں درج ہے انہوں نے ان دو ہمسفر عیسائیوں کے سامنے ماجرا پیش کیا انہوں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ جو کچھ اس نے ہمیں دیا وہ ہم نے تمہارے سپرد کر دیا مجبوراً انہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شکایت کی تو زیر نظر آیات نازل ہوئیں جن میں اس سلسلے میں حکم بیان کیا گیا۔

تفسیر

اسلام کے اہم ترین مسائل میں سے ایک حفظ حقوق اور لوگوں کے اموال اور مکمل عدالت اجتماعی کے اجراء کرنے کا مسئلہ ہے۔

پہلے اس بنا پر کہ وارثوں کے حقوق مرنے والے کے مال میں سے ضائع نہ ہوں اور پسماندگان یتیم اور چھوٹے بچوں کا حق پائمال نہ ہو صاحب ایمان افراد کو حکم دیتا ہے اور ان سے یہ کہتا ہے اے ایمان لانے والو! جب تم میں سے کسی کو موت آ گھیرے تو وصیت کرتے وقت دو عادل افراد کو گواہی کے لئے بلاؤ اور اپنا مال امانت کے طور پر ورثا کے حوالے کرنے کے لئے ان کے سپرد کر دو۔

یہاں شہادت سے مراد وہ شہادت ہے جو وصیت کے ساتھ وابستہ ہے یعنی یہ دونوں افرد وصی بھی ہیں اور گواہ بھی۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے اگر تم مسافرت میں ہو اور تم پر موت کی مصیبت آ پڑے اور مسلمانوں میں سے کوئی وصی اور شاہد

تمہیں نہ مل سکے تو اس مقصد کے لئے غیر مسلمانوں میں سے دو افراد کا انتخاب کرلو۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ غیر مسلموں سے یہاں صرف اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ ہی مراد ہیں کیونکہ اسلام مشرکوں اور بت پرستوں کی اہمیت کا کبھی قائل نہیں ہوا۔

پھر حکم دیتا ہے کہ گواہی دینے کے وقت رفع شک کی غرض سے ان دونوں افراد کو نماز کے بعد اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ اللہ کی قسم کھائیں۔ اور ان کی شہادت اس طرح سے ہونا چاہئے کہ وہ یہ کہیں کہ ہم اس بات پر آمادہ نہیں ہیں کہ حق کو مادی منافع کی خاطر بیچ ڈالیں اور ناحق گواہی دیں اگر چہ ہمارے رشتہ داروں اور عزیزوں کے بارے میں ہی کیوں نہ ہو۔ اور ہم کبھی خدائی گواہی کو نہیں چھپائیں گے کیونکہ اس طرح تو ہم گنہگاروں میں سے ہو جائیں گے۔

(۱۰۷) اس آیت میں ایسے موقع کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ دونوں گواہ خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں اور انہوں نے حق کے خلاف گواہی دی ہے جیسا کہ آیت کی شان نزول میں بیان ہوا ہے ایسے موقع کے لئے حکم یہ ہے کہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ وہ دونوں گواہ گناہ جرم اور تعدی کے مرتکب ہوئے ہیں اور انہوں نے حق کو پامال کر دیا ہے تو دوسرے دو آدمی ان لوگوں میں سے لیے جائیں گے جن پر پہلے گواہوں نے ظلم کیا ہے یعنی مرنے والے کے ورثاء میں سے اور وہ اپنا حق ثابت کرنے کے لئے گواہی دیں گے۔

آیت کے ذیل میں دوسرے دو گواہوں کی ذمہ داری یوں بیان کی گئی ہے وہ خدا کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی پہلے دو افراد کی گواہی کی نسبت زیادہ صحیح اور حق کے زیادہ قریب ہے اور ہم تجاوز اور کسی ظلم وستم کے مرتکب نہیں ہوں گے اور اگر ہم ایسا کریں تو ظالموں میں سے قرار پائیں گے۔

زیر بحث آیت کے آخر میں درحقیقت ان احکام کا فلسفہ بیان ہو رہا ہے جو شہادت کے سلسلے میں پہلی آیات میں گزر چکے ہیں کہ اگر اوپر والے حکم کے مطابق عمل ہو یعنی دونوں گواہوں کو نماز کے بعد جماعت کی موجودگی میں گواہی کے لئے طلب کریں اور ان کی خیانت ظاہر ہونے کی صورت میں دوسرے افراد ورثاء میں سے ان کی جگہ لے لیں اور حق کو واضح کریں تو یہ لائحہ عمل اس بات کا سبب بنے گا کہ گواہ گواہی کے معاملے میں غور وخوض سے کام لیں گے اور خدا کے خوف یا خلق خدا کے ڈر سے واقع کے مطابق گواہی دیں گے۔

درحقیقت یہ کام اس بات کا سبب بنے گا کہ ان میں خدا کے سامنے یا بندگان خدا کے سامنے زیادہ سے زیادہ باز پرس کا خوف پیدا ہو جائے اور وہ حق کے مرکز سے روگرداں نہ ہوں۔

آیت کے آخر میں تمام گذشتہ احکام کی تاکید کے لئے ایک حکم دیا گیا ہے۔

''پرہیزگاری اختیار کرو اور فرمان خدا کان لگا کر سنو اور یہ جان لو کہ خدا فاسق گروہ کو ہدایت نہیں کرتا''۔

(۱۰۹) يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ	اس دن سے ڈرو جس دن خدا پیغمبروں کو جمع کرے گا اور انہیں کہے گا کہ لوگوں نے تمہاری دعوت کا کیا جواب دیا تھا تو وہ کہیں گے ہمیں تو پتہ نہیں تو خود تمام پوشیدہ چیزوں کا جاننے والا ہے۔

تفسیر

یہ آیت حقیقت میں گذشتہ آیات کی تکمیل کرتی ہے کیونکہ گذشتہ آیات کے ذیل میں جو حق و باطل کی شہادت کے مسئلہ کے ساتھ مربوط تھیں تقویٰ اور حکم خدا کی مخالفت سے ڈرنے کا حکم دیا گیا تھا اس آیت میں کہتا ہے کہ اس دن سے ڈرو جس دن خدا پیغمبروں کو جمع کرے گا اور ان سے رسالت اور ان کی ماموریت کے بارے میں سوال کرے گا اور ان سے کہے گا کہ لوگوں نے تمہاری دعوت کا جواب دیا تھا۔

وہ اپنے کسی بھی قسم کے ذاتی علم کی نفی کرتے ہوئے تمام حقائق کو علم پروردگار کے ساتھ وابستہ کر کے کہیں گے خداوند ہمیں کوئی علم نہیں ہے تو ہی تمام پوشیدہ اور چھپی ہوئی چیزوں سے آگاہ ہے۔

اس طرح تمہارا ایسے علام الغیوب خدا اور ایسی عدالت سے سامنا ہوگا اس لیے تم اپنی گواہیوں میں حق و انصاف کو ملحوظ نظر رکھو۔

(۱۱۰) اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْکَ وَ عَلٰى وَ الِدَتِکَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّکَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۗ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَ اِذْ عَلَّمْتُکَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۚ وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًاۢ بِاِذْنِيْ وَ تُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَ اِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْکَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ	وہ وقت یاد کرو جب خدا نے عیسیٰ بن مریم سے کہا کہ اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمہاری والدہ پر کی ہے جب میں نے روح القدس کے ذریعے تیری تقویت کی کہ تو گہوارے میں اور بڑے ہو کر لوگوں سے گفتگو کرتا تھا اور جب میں نے تجھے کتاب وحکمت اور تورات وانجیل کی تعلیم دی اور جب کہ تو میرے حکم سے مٹی سے پرندے کی شکل بناتا اور اس میں پھونکتا تھا اور وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا اور مادرزاد اندھے اور برص کی بیماری والے کو تو میرے حکم سے شفا دیتا تھا اور مردوں کو بھی تو میرے حکم سے زندہ کرتا تھا اور جب میں نے بنی اسرائیل کو تجھے اذیت وتکلیف پہنچانے سے باز رکھا جب تو ان کے پاس واضح دلائل لے کر آیا تھا

فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ	لیکن ان میں سے کافروں کی ایک جماعت نے کہا کہ یہ تو کھلے ہوئے جادو کے سوا کچھ نہیں۔

تفسیر

مسیح علیہ السلام پر انعامات الٰہی

یہ آیت اور سورہ مائدہ کے آخر تک بعد والی آیات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سرگذشت اور ان نعمات سے مربوط ہیں جو آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی امت کو بخشی گئیں اور وہ یہاں پر مسلمانوں کی بیداری اور آگاہی کے لئے بیان ہوئی ہیں پہلے ارشاد ہوتا ہے وہ وقت یاد کرو جب خدا نے عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام سے فرمایا کہ تم اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمہاری والدہ پر کی ہے۔

اس کے بعد اپنی نعمات کا ذکر شروع کر دیا ہے پہلے کہتا ہے میں نے تجھے روح القدس کے ذریعے تقویت دی ہے۔

نعمات الٰہی میں سے دوسری نعمت تجھ پر یہ ہے کہ روح القدس کی تائید کے ذریعے تو لوگوں کے ساتھ گہوارے میں اور پختہ کار ہو کر گفتگو کرتا تھا۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ تیری گہوارہ کی باتیں بھی بڑے ہونے کے بعد کی باتوں کی مانند پختہ اور جچی تلی ہوتی تھیں اور وہ بچوں کی طرح بے وزن نہیں ہوتی تھیں۔

تیسری نعمت یہ ہے کہ میں نے تجھے کتاب وحکمت اور تورات وانجیل کی تعلیم دی۔

چوتھی نعمت یہ ہے کہ تو میرے حکم سے پرندے کی شکل کی ایک چیز مٹی سے بناتا تھا اس کے بعد اس میں پھونکتا تھا تو وہ میرے حکم سے ایک زندہ پرندہ ہو جاتی تھی۔

پانچویں نعمت یہ ہے کہ تو میرے اذن سے مادرزاد اندھے اور برص کی بیماری میں مبتلا شخص کو شفا دیتا تھا۔ اور تو میرے اذن سے مردوں کو بھی زندہ کیا کرتا تھا۔ اور بالآخر میری نعمتوں میں سے ایک اور نعمت تجھ پر یہ تھی کہ میں نے بنی اسرائیل کو تجھے نقصان پہنچانے سے اس وقت باز رکھا جب کہ ان کے کافر تیرے واضح اور روشن دلائل کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوئے اور انہیں کھلا جادو کہنے لگے میں نے اس تمام شور وغل اور سخت اور ہٹ دھرم دشمنوں کے مقابلے میں تیری حفاظت کی تاکہ تو اپنی دعوت کو آگے بڑھا سکے۔

یہاں پر ایک بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں چار مرتبہ لفظ باذنی میرے حکم سے دہرایا گیا ہے تاکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے غلو اور ادعائے الوہیت کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے یعنی جو کچھ وہ انجام دیتے تھے اگرچہ بہت عجیب وغریب اور حیرت انگیز تھا اور خدائی کاموں کے ساتھ شباہت رکھتا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی کام خود عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے نہیں تھا بلکہ یہ سب کام خدا کی طرف سے انجام پذیر ہوتے تھے وہ ایک بندہ خدا تھے اور خداوند تعالیٰ کے تابع فرمان تھے اور ان کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ خدائے لایزال کی قدرت سے تھا۔

(۱۱۱)وَ اِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَ بِرَسُوْلِیْ ۚ قَالُوْآ اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ	وہ وقت یاد کرو جب میں نے حواریوں کی طرف وحی کی کہ مجھ پر اور میرے بھیجے ہوئے پر ایمان لاؤ تو انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لے آئے اور تو گواہ رہ کہ ہم مسلمان ہیں۔
(۱۱۲)اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّکَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ	(وہ وقت کہ) جب حواریوں نے یہ کہا کہ اے عیسیٰ بن مریم! کیا تیرا پروردگار آسمان سے مائدہ نازل کرسکتا ہے تو اس نے (جواب میں) کہا اگر تم صاحبان ایمان ہو تو اللہ سے ڈرو۔
(۱۱۳) قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَ تَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَ نَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَ نَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ	وہ کہنے لگے (ہم یہ بات بری نیت سے نہیں کہتے بلکہ) ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل (آپ کی رسالت پر) مطمئن ہو جائیں اور ہم جان لیں کہ تو نے ہم سے سچی بات کہی ہے اور ہم اس پر گواہ ہو جائیں۔
(۱۱۴)قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَ اٰخِرِنَا وَ اٰيَةً مِّنْکَ ۚ وَارْزُقْنَا وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ	عیسیٰ نے عرض کیا اے خدا! اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے مائدہ نازل فرما تا کہ وہ ہمارے اول و آخر کے لئے عید قرار پائے اور تیری طرف سے نشانی ہو اور ہمیں روزی عطا فرما تو بہترین روزی دینے والا ہے۔
(۱۱۵)قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۧ	خداوند تعالیٰ نے (دعا قبول فرمالی) اور کہا: میں اسے تم پر نازل کروں گا لیکن جو شخص تم میں سے اس کے بعد کافر ہو جائے گا (اور وہ انکار کی راہ اختیار کرے گا) اسے میں ایسی سزا دوں گا کہ عالمین میں سے ویسی سزا کسی کو نہ دی ہوگی۔

تفسیر

حواریوں پر مائدہ کے نزول کا واقعہ

اس بحث کے بعد جو مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ کے بارے میں نعمات الٰہی کے سلسلہ میں گذشتہ آیات میں بیان ہو چکی ہے

ان آیات میں ان نعمات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو حواریوں یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزدیکی اصحاب وانصار کو بخشی گئی ہیں۔ پہلے فرماتا ہے اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے حواریوں کی طرف وحی بھیجی کہ مجھ پر اور میرے بھیجے ہوئے مسیح علیہ السلام پر ایمان لے آ ؤ تو انہوں نے میری دعوت کو قبول کر لیا اور کہا کہ ہم ایمان لے آئے خدایا گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں اور تیرے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔

(۱۱۲) اس کے بعد مائدہ آسمانی کے نزول کے مشہور واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے مسیح کے اصحاب خاص نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا کیا تیرا پروردگار ہمارے لیے آسمان سے غذا بھیج سکتا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے اس مطالبہ پر کہ جس میں ایسے ایسے معجزات وآیات دکھانے کے باوجود شک اور تردد کی بو آ رہی تھی غور کیا اور انہیں تنبیہ کی اور کہا کہ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو خدا سے ڈرو۔

(۱۱۳) لیکن انہوں نے جلد ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بتا دیا کہ ہمارا اس مطالبہ سے کوئی غلط مقصد نہیں ہے اور نہ ہی اس میں ہماری کسی ہٹ دھرمی کی غرض پوشیدہ ہے بلکہ ہماری تمنا یہ ہے کہ ہم اس مائدہ میں سے کھائیں اور آسمانی غذا کے کھانے سے نورانیت ہمارے دل میں پیدا ہوگی کیونکہ غذا مسلمہ طور پر روح انسانی پر اثر انداز ہوتی ہے اس کے علاوہ ہمارے دلوں میں راحت پیدا ہوگی اور اطمینان حاصل ہوگا اور یہ عظیم معجزہ دیکھنے سے ہم علم الیقین کی سرحد تک پہنچ جائیں گے اور یہ جان لیں گے کہ آپ نے جو کچھ ہم سے کہا ہے وہ سچ ہے تاکہ ہم اس پر گواہی دے سکیں۔

(۱۱۴) جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے اس مطالبہ میں ان کی حسن نیت سے آگاہ ہوئے تو ان کی درخواست کو بارگاہ خداوندی میں اس طرح سے بیان فرمایا کہ خداوند ہمارے لیے آسمان سے مائدہ بھیج جو ہمارے اول وآخر کے لئے عید ہو اور تیری طرف سے ایک نشانی شمار ہو اور ہمیں رزق عطا فرما کہ تو ہی بہترین روزی رساں ہے۔

(۱۱۵) خداوند تعالیٰ نے اس دعا کو کہ جو حسن نیت اور خلوص کیساتھ دل سے نکلی تھی قبول کر لیا اور ان سے فرمایا کہ میں اس قسم کا مائدہ تم پر نازل کروں گا لیکن اس بات پر بھی توجہ رہنی چاہئے کہ اس مائدہ کے اترنے کے بعد تمہاری ذمہ داری بہت سخت ہو جائے گی اور اس قسم کا واضح معجزہ دیکھنے کے بعد جس شخص نے راہ کفر اختیار کی تو اسے ایسی سزا دوں گا کہ عالمین میں سے کسی کو ایسی سزا نہیں دی ہو گی۔

(۱۱۶)وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَ لَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ	وہ وقت جب خداوند تعالیٰ عیسیٰ ابن مریم سے کہے گا کہ (اے عیسیٰ) کیا تو نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے علاوہ دو خدا بنالو وہ جواب دیں گے کہ تیری ذات پاک ہے مجھے کوئی حق نہیں ہے کہ ایسی بات کہوں جو میرے لائق نہیں ہے اگر میں نے کوئی ایسی بات کہی ہوگی تو اس کا تجھے ضرور علم ہوگا تو ان سب باتوں کو جانتا ہے کہ جو میرے نفس و روح میں ہیں لیکن میں جو کچھ تیری ذات پاک میں ہے اسے نہیں جانتا کیونکہ تو تمام اسرار اور پوشیدہ چیزوں سے باخبر ہے۔
(۱۱۷)مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ۚ وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ	مجھے تو نے جس کام پر مامور کیا تھا میں نے اس کے سوا ان سے اور کوئی بات نہیں کہی تھی میں نے تو ان سے یہی کہا تھا کہ اس خدا کی پرستش کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے اور میں تو اس وقت تک ہی ان کا نگران اور گواہ تھا جب تک کہ میں ان کے درمیان تھا اور جب تو نے مجھے ان کے درمیان سے اٹھالیا تو پھر تو ہی ان کا نگران تھا اور تو ہی ہر چیز پر گواہ ہے۔
(۱۱۸)اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ	(اس صورت میں) اگر تو انہیں سزا دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں بخش دے تو تو توانا و حکیم ہے

تفسیر

حضرت مسیح علیہ السلام کی اپنے پیروکاروں کے شرک سے بیزاری

یہ آیات قیامت کے دن خدا کی حضرت مسیح علیہ السلام سے گفتگو کے بارے میں ہیں۔

پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہے گا کہ کیا تو نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے علاوہ اپنا معبود قرار دو اور ہماری پرستش کرو۔

مسیح علیہ السلام اس سوال کے جواب میں انتہائی احترام کے ساتھ چند جملے کہیں گے۔

1۔ پہلے خداوند تعالیٰ کو ہر قسم کے شریک وشبیہ سے پاک بیان کرتے ہوئے کہیں گے اے خدا تو ہر قسم کے شریک سے پاک ہے۔

2۔ کس طرح ممکن ہے کہ میں ایسی بات کہوں جو میرے لیے شائستہ اور مناسب نہیں ہے۔

حقیقت میں نہ صرف اس بات کے کہنے کی وہ اپنے سے نفی کرتے ہیں بلکہ کہتے ہیں کہ بنیادی طور پر میں اس قسم کا کوئی حق ہی نہیں رکھتا اور اس قسم کی گفتگو میرے مرتبہ ومقام کے ساتھ ہرگز سازگار ہی نہیں۔

3۔اس کے بعد پروردگار عالم کے علم بے پایاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں میری گواہ یہ حقیقت ہے کہ اگر میں نے ایسا کہا ہوتا تو تجھے اس کا علم ضرور ہوتا کیونکہ تو اس سے بھی آگاہ ہے جو میری روح کے اندر ہے جب کہ میں اس سے بے خبر ہوں جو تیری ذات پاک میں ہے کیونکہ تو علام الغیوب ہے اور تمام رازوں اور پوشیدہ چیزوں سے باخبر ہے۔

(۱۱۷)4۔میں نے جو بات ان سے کہی ہے وہ صرف وہی تھی جس کے لئے تو نے مجھے مامور کیا تھا اور یہ کہ میں انہیں تیری عبادت کی طرف دعوت دوں اور ان سے کہوں کہ اس خدائے وحدہ لاشریک کی پرستش کرو کہ جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔

5۔اور جس وقت تک میں ان کے درمیان رہا ان کا نگران وگواہ تھا اور میں نے انہیں راہ شرک اختیار نہیں کرنے دی۔لیکن جب تو نے مجھے ان کے درمیان سے اٹھا لیا تو پھر تو ہی ان کا نگران ونگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔

(۱۱۸)6۔ان تمام باتوں کے باوجود پھر بھی حکم تو تیرا ہی چلے گا اور جو تو چاہے گا وہی ہوگا اب اگر تو انہیں ان کے اعظیم انحراف پر سزا دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور وہ تیری اس سزا سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکیں گے اور تیرا یہ حق تیرے نافرمان بندوں کے لئے ثابت ہے اور اگر تو انہیں بخش دے اور ان کے گناہوں کی طرف سے چشم پوشی کر لے تو تو توانا وحکیم ہے نہ تو تیری بخشش ہی کمزوری کی علامت ہے اور نہ ہی تیری سزا حکمت وحساب سے خالی ہے۔

(۱۱۹)قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ	خدا فرماتا ہے کہ یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو ان کی سچائی فائدہ بخشے گی ان کے لئے جنت کے باغات ہیں جن کے درختوں کے نیچے پانی کی نہریں جاری ہیں وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے خدا ان سے راضی وخوشنود ہوگا اور وہ خدا سے راضی اور خوشنود ہوں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

(۱۲۰) لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا فِيْهِنَّ ؕ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۧ	آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان تمام چیزوں کی حکومت اللہ ہی کے لئے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر

عظیم کامیابی

روز قیامت خداوند تعالیٰ کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے گفتگو جس کی تشریح گذشتہ آیات میں ہو چکی ہے کے ذکر کے بعد اس آیت میں ہم پڑھتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ اس گفتگو کے بعد یوں فرماتا ہے آج کا دن وہ دن ہے جس میں سچوں کو ان کی سچائی فائدہ دے گی۔

اس کے بعد سچوں کو ملنے والی جزا کے بارے میں یوں بیان کرتا ہے ان کے لئے بہشت کے باغات ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

اور اس مادی نعمت سے زیادہ اہم یہ ہے کہ خدا بھی ان سے راضی ہے اور وہ بھی خدا سے راضی ہیں۔

اور اس میں شک نہیں کہ یہ عظیم نعمت جو مادی اور معنوی نعمت کی جامع ہے بہت بڑی کامیابی شمار ہوگی۔

(۱۲۰) آخری آیت میں آسمانوں زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے پر خدا کی حاکمیت و مالکیت کی طرف اشارہ ہوا ہے اور اس کی قدرت کی عمومیت تمام چیزوں پر بیان ہوئی ہے۔

☆☆☆☆☆

☆☆☆